فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون
فتاویٰ حصاریہ
و
مقالاتِ علمیہ
مصنف
جمع و ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فسئلوا اهل الذكر إن كنتم لا تعلمون

فتاوی حصاریہ

و

مقالات علمیہ

مصنف

محقق العصر حضرت مولانا عبدالقادر حصاری رحمہ اللہ

کاوش و پیشکش

شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ

بانی دار الحدیث راجووال اوکاڑہ

جمع و ترتیب

حضرت مولانا ابراہیم خلیل حفظہ اللہ

آف محمد شاہ مقیم اوکاڑہ

ناشر

عبداللطیف ربانی مکتبہ اصحاب الحدیث

حافظ پلازہ مچھلی منڈی بالمقابل جامع مسجد چیتاں

اردو بازار لاہور

نام کتاب .... فتاویٰ حصاریہ ومقالات علمیہ

نام مصنف .... محقق العصر حضرت مولانا عبدالقادر حصاروی رحمہ اللہ

کاوش و کوشش .... شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف (راجووال)

نام مرتب .... مولانا ابراہیم خلیل مجروشاہ مقیم

طبع اول 2012ء

مطبع .... العربیہ پرانی انار کلی لاہور

قیمت مکمل سیٹ .... سات ہزار روپے

تعداد 600

مکتبہ اصحاب الحدیث

حافظ پلازہ مچھلی منڈی بالمقابل ہلال مٹھائی چوک، اردو بازار لاہور

042-37321823 - 0301-4227379

فہرست عنوانات جلد سوم

طہارت کے مسائل

مسجد کے مسائل

اذان کے مسائل

جماعت کے مسائل

اسلام میں نماز کی حیثیت

ننگے سر نماز کے مسائل

صف بندی کے مسائل

غسل جنابت کا طریقہ کیا ہے؟

سوال (۲۳) ہمبستری کے بعد غسل کا کیا طریقہ ہے؟ پوری طرح سمجھا کر لکھیں۔ جزاکم اللہ خیرا

جواب مختصر یہ بات ہے کہ اول استنجا کریں پھر وضو (پاؤں نہ دھوئیں) پھر سر پر تین بک پانی ڈال لیں۔ پھر تمام بدن پر پانی بہائیں کہ کوئی بال خشک نہ رہے۔ پھر الگ ہو کر پاؤں دھو لیں۔ اول بسم اللہ اور آخر میں کلمہ شہادت پڑھ لیں اور اس نیت سے غسل کریں کہ میں ناپاک ہوں۔ یہ پاک ہونے کے لیے غسل کر رہا ہوں۔ یہ دل میں ارادہ ہو' بس کافی ہے۔

کتبہ عبدالقادر حصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص۔۱۸۵

ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حنفیہ کا تقابل

بلا غسل جنبی کو نماز کا حکم

بخاری شریف ج۔۱' ص۔۵۰ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ اے ابو عبدالرحمٰن (یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) اس مسئلہ میں آپ کا کیا مذہب ہے کہ اگر کوئی شخص جنبی ہو جائے اور پھر وہ غسل کے لیے پانی نہ پائے تو نمازی نماز کے لیے کیا صورت اختیار کرے تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ جب تک پانی پا کر غسل نہ کرے تب تک نماز نہ پڑھے بلکہ دوسری روایت میں ہے: ان لم اجد الماء شهر الم اصلی یعنی "میں اگر جنبی ہو کر پانی نہ پاؤں تو خواہ مہینہ گذر جائے' میں نماز نہ پڑھوں گا۔" بخاری شریف کی بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مسلک تھا۔ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری حنفی حاشیہ بخاری پر لکھتے ہیں: وهذا مشهور عن عمرو وافقه عليه

عبداللہ بن مسعود یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مذہب مشہور ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ان کے موافق ہیں لیکن حنفیہ ان کے اس مسلک کو نہیں مانتے اور یہ کہتے ہیں کہ جنبی تیمم کرکے نماز پڑھ لے' نماز ترک نہ کرے۔

قدوری ص-۸ میں ہے' عذر لاحق ہو تو جنبی اور بے وضو کو تیمم کرنے کا حکم یکساں ہے کہ پانی نہ ملے تو تیمم کرلیں۔ اس پر یہ دلیل لکھی ہے جو حاشیہ میں درج ہے کہ ایک قوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ ہم جس علاقہ میں رہتے ہیں' وہ ریگستان ہے۔ بسا اوقات مہینہ یا دو مہینہ تک پانی نہیں ملتا۔ ہم میں کئی شخص جنبی ہوتے ہیں اور بعض عورتیں حائضہ ہوتی ہیں اور بعض نفاس والی ہوتی ہیں لیکن پانی نہ ملنے کی وجہ سے غسل نہیں کرسکتیں۔ تو اب کیا کیا جائے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی زمین کو لازم کرلو یعنی تیمم کرلو۔ (رواہ احمد) یہ روایت ضعیف ہے لیکن بخاری و مسلم میں صحیح حدیث ہے کہ تیمم سے نماز پڑھ لے۔ یہ مذہب اہل حدیث کا ہے لیکن حنفیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب چھوڑ دیا اور اہل حدیث کے موافق ہوگئے ہیں۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاسلام لاہور جلد-۲' شمارہ-۵۱ بمطابق ۱۸ مارچ فروری سنہ-۱۹۷۷ء

کنویں میں چوہا گر کر مرجائے تو پانی پاک رہا یا نہیں؟

سوال محترم حضرت مولانا عبدالستار صاحب امام جماعت غرباء اہلحدیث السلام علیکم' مزاج شریف۔ درج ذیل مسئلہ کا صحیح بروئے حدیث بتفصیل جواب تحریر فرما کر ارسال فرمادیں' ممنون ہوں گا۔

ایک کنویں میں جس کا پانی بارہ ہاتھ گہرا ہے۔ رات کے وقت ایک چوہا گر کر مر گیا۔ صبح کے وقت لوگوں نے وہ پانی لاعلمی سے پی لیا۔ پھر جب انہوں نے چوہے کو مرا ہوا کنویں سے نکالا تو اپنے کپڑے انڈیل دیئے اور پانی کو حرام قرار دیا یعنی کنویں کو بھی ناپاک سمجھا حالانکہ نہ کنویں کے پانی کا رنگ بدلا' نہ ذائقہ اور نہ ہی بو۔

بعض کم ہوا۔ مفتیوں نے یہ فتویٰ دیا کہ اس میں سے تیس ڈول پانی' بعض نے ساٹھ ڈول پانی اور بعض نے کنویں کا تمام پانی نکالنے کو کہا۔ اب آپ اس بات کا جواب دیں کہ آیا وہ کنواں شریعت کی رو سے واقعی ناپاک ہے اور اس کے پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے اور ناپاک ہونے کی کیا شرائط ہیں؟

علی محمد مہاجر موضع چدوی تحصیل و ضلع رحیم یار خاں

جواب کنویں میں چوہا وغیرہ گر جائے تو کنواں ناپاک نہ ہو گا کیونکہ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں مدینہ کے نواح میں بیر بضاعہ تھا جس میں حیض کے کپڑے' مردار کے گوشت' ہڈیاں گرتی تھیں۔ لوگ اس کنویں سے پانی پیتے تھے۔ آپ کو بھی اس سے پانی دیا جاتا تھا۔ آپ سے اس کا مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا ان الماء طهور لا ينجسه شئ کہ پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب تک رنگ یا بو یا مزہ نہ بدلے' اس کو کوئی چیز پلید نہیں کر سکتی۔ دیگر حدیث میں ہے کہ اذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث یعنی جب پانی پانچ مشک جمع ہو تو وہ کسی پلید چیز کے پڑنے سے پلید نہیں ہوتا۔

ان دلائل کی رو سے کنویں کا پانی چوہا گرنے سے ناپاک نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے اس کو ناپاک جان کر گھڑے انڈیل دیئے اور جن مفتیوں نے ناپاکی کا فتویٰ دیا' سب غلطی پر ہیں۔ اس کی کوئی دلیل قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ یہ غلو ہے' اللہ اس غلو سے بچائے' آمین۔ ہاں اپنی دلی کراہت دفع کرنے کے لیے کنواں صاف کر دے تو یہ جائز ہے۔ شرعاً اس کا کوئی حکم وارد نہیں ہے۔ محض قیاسات یا اقوال ہیں جو حجت نہیں۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری   الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص-۱۴۸

کثرت ریاح ادائیگی نماز میں باعث دشواری ہو تو کیا کرے؟

سوال محترم جناب مولانا امام صاحب زاد مجدہ السلام علیکم ورحمتہ اللہ' مزاج

شریف۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ باعث تکلیف دہی یہ کہ ایک مریض ہے جس کو ریاح بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ دیر تک وضو قائم نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ ایک وقت کی نماز بھی پڑھنی مشکل ہوتی ہے۔ بار بار وضو کرنا بھی باعث تکلیف ہے۔ ایسی حالت میں مریض مذکور کیا کرے؟ کیا ابتداء" وضو کر کے نماز شروع کرنے کے بعد اگر درمیان نماز وضو ٹوٹ جائے تو بلا وضو ہی نماز پوری کرے یا پھر وضو کرے۔ اگر دوبارہ وضو کرے تو پھر بحالت نماز وضو ٹوٹ جائے گا تو ایسی حالت میں نماز اور وضو ہی میں سب وقت گزر جائے گا۔ لہٰذا ایسی مجبوری کی حالت میں جو امر شرعا ہو' اس سے مطلع فرمایئے تاکہ مریض مذکور اس جھنجھٹ میں پڑ کر نماز ہی نہ چھوڑ بیٹھے۔

ایسی حالت بھی ہوتی ہے کہ وضو کرتے کرتے ہوا خارج ہو جاتی ہے اور ایک ہی وضو کرتے ہوئے کئی بار مکرر وضو کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وضو شروع کر کے پھر خواہ درمیان وضو یا درمیان نماز وضو ٹوٹتا رہے اور یہ ایک ہی وضو سے نماز پڑھتا رہے۔ بینوا بالکتاب والسنہ توجروا من اللہ تعالیٰ' فقط والسّلام۔

ڈاکٹر ایچ علی احمد خاں میرپور خاص

جواب آنحضور ﷺ کے وقت میں بعض عورتوں کو مرض استحاضہ تھا یعنی ہر وقت ان کو خون آتا رہتا تھا۔ انہوں نے آنحضور ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے ان کو ہر نماز کے لیے طہارت وضو وغیرہ کا حکم دیا تھا پھر وہ نماز پڑھتی رہیں' خواہ خون چلتا رہا' کوئی حرج نہیں ہوا۔ اس سے یہ مسئلہ ظاہر ہوا کہ جس کو خون' زخم یا ریح وغیرہ کا ایسا عارضہ ہو کہ وہ کسی وقت نہ تھمے تو اس کو ہر نماز کے لیے وضو کر کے اپنی نماز ادا کرتے رہنا چاہیے۔ پھر خواہ نماز میں خون' ریح وغیرہ خارج ہوتے رہیں' کوئی حرج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دین میں تنگی نہیں رکھی اور کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ اس مریض کو بے فکر ہو کر نماز ادا کرتے رہنا چاہیے۔ ہاں علاج کرائو کہ اللہ تعالیٰ شفا دے۔

کتبہ عبدالقادر انصاری   الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص ۱۴۷

جنبی اور حائضہ کو قرآن پڑھنے کی ممانعت

واضح ہو کہ صحیفہ اہلحدیث مطبوعہ ۱۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۸۵ھ میں ایک سوال شائع ہوا ہے کہ کیا حائضہ عورت قرآن شریف کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس کا صحیح اور باصواب جواب یہی ہے کہ حائضہ ہو یا جنبی قرآن مجید کی نہ تلاوت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کو ہاتھ لگا سکتے ہیں کہ احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ اس کی دلیل ایک تو وہ حدیث ہے جو بحوالہ دار قطنی صحیفہ میں سوال مذکورہ کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے لا یقرا الحائض ولا الجنب شیئا من القرآن۔ یعنی "حائضہ عورت اور جنبی قرآن سے کوئی چیز بھی نہ پڑھیں۔"

سوال کے جواب کا یہ پہلا حصہ بالکل صحیح ہے لیکن میر برہم علی صاحب نے دوسرے حصہ جواب میں سخت غلطی کھائی ہے' عفا اللہ عنہ ما اخطا فیہ۔ وہ فرماتے ہیں ہاں البتہ بطور وظیفہ بعض قرآنی آیات یہ لوگ پڑھ سکتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جواب پہلی دلیل کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں لفظ شیئا من القرآن ہے جو نکرہ ہے۔ ایک تو نکرہ خود عام ہے' دوسرا جب نفی میں آیا تو اصولاً یہ عموم کے لیے ہوتا ہے۔ پس جب قرآن پڑھنے کی حائضہ اور جنبی کے لیے مطلق ممانعت آگئی ہے کہ من حیث القرآن کسی آیت کی تلاوت اور قرات نہیں کر سکتے تو پھر کسی صریح دلیل کے بغیر یہ استثناء کیوں کیا ہے؟ شاید ہمارے عزیز القدر یہ جواب دیں کہ یہ استثناء میں نے اس حدیث سے کیا ہے انہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کل احیانہ کہ آنحضرت ﷺ اپنے جملہ اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر فرماتے رہتے تھے جو کہ جنابت اور غیر جنابت سب حالتوں کو شامل ہے۔ لیکن یہ جواب اور عذر غلط ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ اصول کے لحاظ سے پہلی حدیث خاص ہے اور دوسری عام ہے۔

نیل الاوطار ج-۲' ص-۲۲۹ میں ہے بناء العام علی الخاص واجب کما تقرر فی الاصول۔ اور ج-۲' ص-۱۴۳ میں ہے حمل المطلق علی المقید واجب علی

ماھو الحق فی الاصول۔ یعنی علم اصول میں یہ قاعدہ مقرر ہو چکا ہے کہ عام کی بناء خاص پر اور مطلق کی مقید پر رکھنی واجب ہے۔ پس اس اصول کی رو سے دونوں احادیث کے ملانے سے یہ مسئلہ صحیح ہوا کہ حائضہ اور جنبی قرآن سے کوئی شے نہیں پڑھ سکتے کہ یہ کلام الٰہی کی تعظیم اور ادب ہے اور باقی ذکر الٰہی تہلیل و تسبیح و تحمید و تکبیر ہر حالت میں کر سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں حائضہ کے متعلق یہ حکم ہے فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربوھن کہ حیض کی حالت میں مردوں کو عورتوں سے علیحدہ رہنا چاہیے اور ان کے قریب نہ جائیں' یہاں تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔" لیکن حدیث میں مردوں کو حائضہ کی بابت یہ حکم آگیا کہ صنعوا کل شیئی الا النکاح کہ حائضہ عورتوں سے سب چیزوں کا مخالطہ اور برتاؤ کھانا پینا مباشرت' مخالطت ملنا جلنا وغیرہ کر سکتے ہو صرف جماع اور مقاربت نہیں کر سکتے۔ تو قرآن کا مطلق حکم اس مقید پر محمول کرنا واجب ہے۔ ورنہ کلی طور پر حائضہ سے جدا رہنا اور اس کے ساتھ مل کر نہ کھانا اور نہ بیٹھنا بلکہ دور رہنا یہ بدعت ہے۔ اعاذنا اللہ منھا۔

بس اسی قاعدہ کی رو سے حائضہ اور جنبی جو ذکر الٰہی چاہیں کریں لیکن قرآن کی ایک آیت بلکہ نصف آیت تک بھی نہیں پڑھ سکتے' یہ قطعاً حرام ہے۔ اب اس کے دلائل سنیے۔

(۱) دار قطنی کی پہلی حدیث جو گزری۔

(۲) ابوداؤد میں ہے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج من الخلاء فیقرئنا القرآن ویاکل معنا اللحم ولم یکن یحجبہ او قال یحجزہ عن القرآن شیئی لیس الجنابۃ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آتے تو ہم کو قرآن بھی پڑھاتے اور ہمارے ساتھ مل کر کھانا بھی کھا لیا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے کوئی چیز نہیں روک سکتی تھی سوائے جنابت کے۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ جنبی کو قرآن سے رکاوٹ ہے۔ اس حدیث پر کوئی معترض جرح کرے گا تو اس سے بدرجہا قوی تر لے لے گا۔ جماعت غرباء کا کوئی عالم

اور مفتی اس حدیث پر کوئی جرح و قدح نہیں کر سکتا کیونکہ یہ حدیث صحاح میں سے سنن ابوداؤد کی ہے جس پر انہوں نے سکوت کیا ہے تو یہ حدیث قابل استدلال ہے۔

عون المعبود ج ۱ ص ۹۵ میں ہے وقد وردت احادیث فی تحریم القرآن للجنب وفی کلها مقال لکن تحصل القوة بانضمام بعضها ببعض لان بعض الطرق لیس فیه شدید الضعف وهو یصلح ان یتمسک به۔ یعنی جنبی کو قرآن پڑھنے کے بارہ میں حرام ہونے کی کئی احادیث وارد ہیں' سب میں جرح ہے۔ لیکن بعض میں سخت ضعف نہیں ہے۔ مجموعہ طرق بعض کو بعض قوی کرتے ہیں۔ اس لیے ان سے دلیل لی جا سکتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مندرجہ ذیل حدیث صحیح ہے جو مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۷۶ میں منقول ہے۔ باب قراءة الجنب میں ہے۔

(۳) ولعلی عند ابی یعلیٰ قال رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم توضا ثم قرا شیئا من القرآن قال هکذا لمن لیس بجنب فاما الجنب فلا ولا ایة۔ یعنی حضرت علی ﷜ نے کہا کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے وضو کیا پھر قرآن سے کچھ حصہ پڑھا۔ یہ اسی طرح حکم شرعی ہے۔ اس شخص کے لیے جو جنبی نہ ہو لیکن جنبی کے لیے جائز نہیں ہے اور وہ ایک آیت بھی نہیں پڑھ سکتا۔

علامہ ہیثمی فرماتے ہیں ورجاله موثقون۔ کہ اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں۔" پس مدعا ہمارا ثابت ہوا کہ ہر وقت کے ذکر میں قرآن داخل نہیں ہے۔ عام ذکر الٰہی سے قرآن کا ذکر مستثنیٰ ہے۔ جیسے حدیث میں ہے اذا قرا فانصتوا کہ جب امام قرات کرے تو مقتدی لوگ خاموش ہو جائیں۔ لیکن احادیث فاتحہ خلف الامام سے سورہ فاتحہ کا پڑھنا مستثنیٰ ہے کہ مقتدی ضرور پڑھ لیں کیونکہ یہ رکن نماز ہے اس کے بغیر نماز کا وجود نہیں۔ پس عام کو خاص پر مبنی کرنا اصولاً" واجب ہے" فتذکروا۔

عون المعبود میں ہے قال الخطابی فی الحدیث من الفقه ان الجنب لا یقرا القرآن وکذالک الحائض لا تقرا لان حدثها اغلظ من حدث الجنابة۔ یعنی ابوداؤد کی حدیث میں جو جنبی کو قرآن پڑھنے کی ممانعت آئی ہے نہ جنبی قرآن نہ پڑھے۔ اس حدیث سے یہ فقاہت حاصل ہوئی کہ حائضہ بھی نہ پڑھے۔ کیونکہ حائضہ کی

ناپاکی جنبی سے بھی زیادہ ہے۔

میں کہتا ہوں حدیث دار قطنی نمبر۱ سے دونوں کے لیے ممانعت ثابت ہے۔

(۴) مشکوٰۃ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ انہوں نے یہ بیان فرمایا کہ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتکئ فی حجری وانا حائض ثم یقرأ القرآن (متفق علیہ) یعنی نبی کریم ﷺ میری گود میں تکیہ لگائے ہوئے تھے اور قرآن کی تلاوت کرتے تھے دراں حالیکہ میں اس وقت حائضہ تھی۔

اس حدیث سے کئی مسائل ظاہر ہوئے۔ اول یہ کہ حائضہ سے مخالطت جائز ہے صرف جماع حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ نجاست گاہ کے قریب کوئی قرآن کی تلاوت کرے تو یہ درست ہے۔ تیسرا یہ کہ حائضہ خود قرآن نہیں پڑھ سکتی' سن سکتی ہے۔

مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ المفاتیح ج۱' ص۳۵۹ میں ہے۔ قال ابن دقیق العید فی ہذا الفعل اشارۃ الی ان الحائض لا تقراء القرآن لان قراتہا لو کانت جائزۃ لما توہم امتناع القراۃ فی حجرہا حتی احتیج الی التنصیص علیہما یعنی "علامہ دقیق العید مشہور محدث اور فقیہ نے اس حدیث پر یہ بیان کیا کہ اس حدیث میں اس بات پر اشارہ ہے کہ حائضہ قرآن نہ پڑھے۔ کیونکہ اگر حائضہ کو قرآن پڑھنا جائز ہوتا تو وہ حائضہ کی گود میں قرآن پڑھنے کی ممانعت کا وہم کر کے یہ تصریح نہ کرتی کہ حائضہ کی گود میں کوئی دوسرا پڑھے تو یہ جائز ہے۔

(۵) دار قطنی ص۴۴ میں ہے عن عبداللہ بن رواحۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان یقرا احدنا القرآن وہو جنب (اسنادہ صالح) یعنی رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ کوئی شخص جنبی ہونے کی حالت میں قرآن نہ پڑھے۔

(۶) دار قطنی میں ہے عن ابی بردۃ عن ابی موسٰی کلاہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا علی انی ارضی لک ما ارضی لنفسی واکرہ لک ما اکرہ لنفسی لا تقراء القرآن وانت جنب ولا انت راکع ولا انت ساجد ولا تصل عاقص شعرک ولا تدبج تدبیج الحمار۔ یعنی "ابوہریرہ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی ؓ سے فرمایا کہ میں تیرے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں اور وہی چیز تیرے لیے بری جانتا ہوں جو اپنے

نفس کے لیے بری جانتا ہوں۔ تم مت پڑھو قرآن دراں حالیکہ جنبی ہو اور نہ پڑھو قرآن کو رکوع کی حالت میں اور نہ سجدہ کی حالت میں اور نہ بالوں کو باندھ کر نماز پڑھو اور نہ سر کو رکوع میں گدھے کی طرح حد سے زیادہ جھکاؤ۔" اس سے جنبی کے لیے قرآن پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوئی۔

(۷) عن عبداللہ بن مالک الغافقی انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لعمر بن الخطاب اذا توضات وانا جنب اکلت وشربت ولا اصلی ولا اقرا حتی اغتسل۔ یعنی "عبداللہ بن مالک غافقی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ سمجھا رہے تھے کہ میں جنبی ہونے کی حالت میں وضو کر کے کھا پی لیتا ہوں لیکن جب تک غسل نہ کر لوں نماز اور قرآن نہیں پڑھتا۔" اس سے بھی معلوم ہوا کہ جنبی کو قرآن پڑھنا منع ہے۔

(۸) دار قطنی میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اقرؤا القرآن مالم یصب احدکم جنابۃ فان اصابۃ جنابۃ فلا ولا حرفا واحدا (ھو صحیح عن علی) یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک جنبی نہ ہو قرآن پڑھتے رہو' جب جنبی ہو جاؤ تو پھر ایک حرف بھی نہ پڑھو۔"

(۹) عن جابر قال لا یقرا الحائض ولا الجنب ولا النفساء۔ یعنی "جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حائضہ اور نفاس والی عورت اور جنبی قرآن نہ پڑھیں۔"

(۱۰) عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب لکھ کر دی' اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ لا یمس القرآن الا طاھرا۔ یعنی "قرآن کو وہی شخص ہاتھ لگائے جو پاک ہو۔"

ان دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ ناپاک مرد و عورت کو نہ قرآن پڑھنا جائز ہے اور نہ ہی ہاتھ لگانا۔ امید ہے کہ جناب مولانا میر بزم صاحب اپنی علمی بزم میں اس دوسرے حصہ کی اصلاح فرما کر حق کا اظہار کریں گے اور مزید بحث کا موقع پیدا نہ کریں گے۔ فقط

کتبہ العبد عبدالقادر حصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہل حدیث کراچی جلد ۔۵۳' شمارہ ۱۰' مورخہ یکم و ۱۶ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۴ھ

مروجہ گردن کا مسح وضو میں بدعت ہے

حضرات ناظرین صحیفہ اہل حدیث آپ کو معلوم ہے کہ جب سے زمانہ نبوت کو دوری ہوتی گئی ہے اسلام میں نئی نئی بدعتیں ایجاد ہوتی رہی ہیں یہاں تک کہ نماز جو ایک رکن اسلام ہے اس میں بھی بہت سی بدعات لوگوں نے ایجاد کر لی ہیں۔ چنانچہ وضو جو نماز کے لیے شرط ہے اس میں بھی مسح گردن مروجہ کی بدعت نکال لی ہے۔ آج ہم اسی مسئلہ گردن پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ متبع سنت ہوں گے وہ اس بدعت مروجہ کو ترک کر دیں گے۔ اور جس طرح آنحضرت ﷺ سے مسح گردن کا ثابت ہے اس طرح وہ عمل کریں گے۔ اب سنیئے!

"عن عبداللہ بن زید بن عاصمؓ فی صفة الوضوء قال ومسح رسول اللہ ﷺ برأسه فاقبل یدیه وادبر وفی لفظ بدأ بمقدم رأسه حتی ذهب بهما الی قفاه ثم ردهما حتی رجع الی المکان الذی بدأ منه ـ رواه الشیخان" (بلوغ المرام صفحہ ۵) یعنی عبداللہؓ بن عاصم صحابی آنحضرت ﷺ کی صفت وضو کو بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے سر کا مسح کیا تو آپ آگے سے ہاتھوں کو لے گئے اور پھر ان ہاتھوں کو پیچھے سے آگے کی طرف لائے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آپؐ نے مسح سر کا اگلے حصہ سے شروع کیا یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن تک لے گئے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ گردن کا مسح یہی ہے جو آپؐ نے کیا۔ یعنی مقدم عنق تک۔ اور جو روایتیں گردن کے مسح کی فقہاء نے ذکر کی ہیں وہ سب ضعاف روایتیں ہیں۔ جیسے "یمسح رأسه حتی بلغ القذال وما یلیه من مقدم العنق۔ رواه احمد" یا یہ حدیث "من توضاء ومسح عنقه لم یغل بالاغلال یوم القیمة ۔ رواه ابو نعیم فی تاریخ اصبهان" وغیرہ دیکھو۔ (نیل الاوطار جلد ۱ صفحہ ۱۴۲ مطبوعہ مصر)۔

اگر بالفرض ان کو حسن لغیرہ کا بھی درجہ دیا جائے اور قابل عمل سمجھا جائے تب بھی مروجہ مسح گردن کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جو مسح سر کے بعد ظاہر کفین سے گردن کا کی جاتی ہے اور اس کو مسح گردن سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہیئت موجودہ مسح گردن کا بدعت ہے۔ اس کا کسی روات صحیح یا ضعیف سے ثبوت نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ نوویؒ اپنی کتاب شرح المہذب میں لکھتے ہیں "لم یصح عن النبی ﷺ فیه شیئی ولیس هو بسنة بل بدعة" دیکھو (نیل الاوطار جلد ۱ صفحہ ۱۴۲) للعلامۃ

القاضی شوکانی) یعنی امام نووی فرماتے ہیں کہ مسح گردن کی کوئی روایت نبی ﷺ سے صحیح نہیں ہے اور یہ سنت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے۔

اور حضرت علامہ امام ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں "لم یصح عن النبی ﷺ انہ مسح علی عنقہ فی الوضوء بل ولاروی عن ذالک فی حدیث صحیح بل الاحادیث الصحیحۃ التی فیھا صفۃ وضوء النبی ﷺ لم یکن یمسح علی عنقہ ولھذا لم یستحب جمھورالعلماء کما لک والشافعی واحمد فی ظاھر مذھبھا ومن استحبہ فاعتمد علی اثر یروی عن ابی ھریرۃ او حدیث ضعیف نقلہ انہ مسح رأسہ حتی بلغ القذال ومثل ذالک لایصلح عمدۃ ولایعارض مادل علیہ الاحادیث ومن ترک مسح العنق فوضوء اصحیح باتفاق العلماء انتھی" دیکھو (فتاویٰ حافظ ابن تیمیہ حرانی صفحہ ۴۷ جلد ۱) یعنی وضو میں مسح گردن کا نبی ﷺ سے کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ جمہور علماء امام شافعیؒ امام مالکؒ امام احمدؒ نے اس کو مستحب بھی نہیں کہا۔ جس نے اس کو مستحب سمجھا ہے اس کو اعتماد اثر ابو ہریرہؓ اور حدیث ضعیف پر ہے یہ لائق اعتماد کے نہیں ہے۔ اور یہ معارض روایت صحیحہ کے ہے۔ پس جس نے گردن کا مسح نہ کیا اس کا وضوء باتفاق علماء صحیح ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے مطلق روایات مسح گردن کو ضعیف قرار دیا ہے اور ان کو صحیح روایات کے معارض قرار دیا ہے۔ مگر مروجہ مسح گردن کا جو ظاہر کفین سے بعد مسح سر کے گردن کا کی جاتی ہے اس کا نہ ضعیف حدیث سے اور نہ کسی اثر صحابی سے ثبوت ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے بھی اپنے رسالہ "تحفۃ الطلبہ فی مسح الرقبہ" میں اس مروجہ ہیئت مسح گردن کا انکار کیا ہے۔

اور ہمارے علامہ زماں مولانا وحید الزماں صاحب حیدرآبادیؒ نزل الابرار من فقہ النبی المختار جلد ۱ صفحہ ۱۷ میں لکھتے ہیں "ولم یصح فی مسح العنق حدیث واستحبہ الاحناف بظھر یدیہ ومسح الحلقوم بدعۃ" یعنی نبی ﷺ سے مسح گردن میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور احناف نے ظہر کفین سے گردن و حلقوم کا مسح کرنا جو مستحب لکھا ہے وہ بدعت ہے۔

فقیہ کفایہ لمن لہ درایہ

فقط والسلام۔

عبدالجبار سلفی کھنڈیلوی اوکاڑہ

صحیفہ اہل حدیث جلد ۳۵ شمارہ ۲۳،۲۴

مورخہ یکم و پندرہ ذوالحجہ ۱۳۷۶ھ۔

مولانا صاحب کھنڈیلوی سے خطاب

مسئلہ مسح گردن

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں ان سے ہمکلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

صحیفہ اہل حدیث مطبوعہ یکم و ۱۵ ذوالحجہ سنہ۔۱۳۷۳ھ میں مسئلہ گردن کے متعلق جناب حضرت مولانا المحترم عبدالجبار صاحب محدث کھنڈیلوی مدظلہ العالی حال مقیم

لوکاڑہ شیخ الحدیث کا ایک مضمون شائع ہوا ہے' جس میں حضرت والا نے حنفیہ کے مسح گردن مروجہ کو بدعت قرار دیا ہے اور آپ اس میں منفرد نہیں۔ دیگر علماء اہلحدیث کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ جماعت اہل حدیث کے مفتی اعظم حضرت فاضل اجل مولانا الحاج حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی اوام اللہ فیو ضہم وبرکاتہم کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ آپ نے نماز کے بارے میں ایک کتاب "کتاب الصلوۃ" کے نام سے شائع فرمائی ہے' اس کے حصہ اول میں وضو کا بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گردن کا مروجہ مسح بدعت ہے لیکن کمترین خادم العلماء کو اس کے بدعت ہونے میں تامل ہے کیونکہ اس بارے میں بعض روایات وارد ہیں جو اس کے بدعت ہونے سے مانع ہیں۔

مولانا الفقیہ رئیس الاحناف حضرت ملا علی قاری موضوعات کبیر ص۔ ۴۳ میں امام نووی پر تعاقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **قلت لکن رواہ ابو عبید القاسم عن القاسم بن عبدالرحمٰن عن موسی بن طلحة قال من مسح قفاہ مع راسه وقی عن الغل والحدیث موقوف الا انه فی الحکم مرفوع لان مثله لا یقال بالرای ویقویه ماروی مرفوعا من مسند الفردوس من حدیث ابن عمر لکن بسند ضعیف والضعیف یعمل به فی فضائل الاعمال اتفاقا ولذا قال ائمتنا ان مسح الرقبة مستحب لو سنة** ۔ یعنی "میں کہتا ہوں کہ مسح گردن کی حدیث کو ابو عبید قاسم نے قاسم بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت موسیٰ بن طلحہ سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے اپنی گردن کا مسح سر کے ہمراہ کیا' وہ گردن میں طوق پڑنے سے محفوظ رہے گا۔"

یہ حدیث گو موقوف ہے لیکن حکم مرفوع میں ہے کیونکہ ایسی بات قیاس سے نہیں کہی جا سکتی اور اس کو اس روایت سے بھی تقویت حاصل ہے' جو مسند الفردوس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً" مروی ہے۔ لیکن اس کی سند ضعیف ہے اور ضعیف احادیث پر عمل کیا جائے گا کیونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف بالاتفاق قابل عمل ہے۔ اسی لیے ہمارے اماموں نے کہا ہے کہ گردن کا مسح مستحب یا سنت ہے۔

ملا علی قاری کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ منتقی الاخبار میں ایک باب منعقد کیا گیا ہے "**باب مسح العنق**" یعنی یہ باب گردن کے مسح کے بیان میں ہے۔ پھر اس

کے تحت وہی حدیث ذکر کی ہے جو حضرت مولانا نے امام احمد کی روایت سے ذکر کی ہے۔ یمسح راسه حتی بلغ الی القفا وما یلیه من مقدم العنق۔ یعنی سر کا مسح کرتے تو گدی اور اس کے ماحول اور گردن کے شروع تک کرتے۔

اس سے گدی اور گردن کا مسح ظاہر ہے۔ پھر اس کی تائید میں علامہ شوکانی نے کئی ایک روایات ذکر کی ہیں جن میں "مسح قفاه مع راسه" یعنی سر کے ہمراہ گدی کا مسح کیا۔ "مسح عنقه" یعنی حضرت علی جب سر کا مسح کرتے تو گردن کا مسح بھی کرتے تھے۔

ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد علامہ شوکانی عالم ربانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وبجمیع هذا تعلم ان قول النووی مسح الرقبة بدعة وان حدیثه موضوع مجازفة یعنی ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ امام نووی کا یہ کہنا کہ گردن کا مسح بدعت ہے اور اس بارہ میں جو حدیث ہے وہ موضوع ہے محض اٹکل اور بے تکی بات ہے۔

پھر علامہ شوکانی نے امام نووی کی اس بات پر بھی بڑا تعجب ظاہر کیا ہے کہ وہ امام شافعی اور اصحاب شافعیہ سے اس مسح کا عدم ذکر نقل کرتے ہیں۔ حالانکہ امام رویانی نے جو اصحاب شافعی میں سے مشہور ہیں' اپنی کتاب المعروف بالبحر میں لکھا ہے قال اصحابنا هو سنة کہ ہمارے اصحاب شافعیہ نے مسح گردن کا سنت قرار دیا ہے۔

پھر امام نووی کا ابن الرفعہ نے بھی تعاقب کیا ہے کہ امام بغوی جو ائمہ حدیث میں سے ہیں' وہ اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں۔ اور پھر یہ کہا ہے کہ استحباب کا ماخذ حدیث یا کسی صحابی کا قول ہی ہو سکتا ہے۔ قیاس کو تو اس مسئلے میں مجال نہیں ہے۔

پھر علامہ حافظ ابن حجر سے نقل کیا ہے کہ حافظ صاحب نے فرمایا ہے بغوی کی استحباب مسح میں وہی حدیث دلیل ہے جو امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کی ہے جس کو ابن سید الناس نے شرح ترمذی میں بیہقی کی طرف نسبت کیا ہے اور کہا ہے "وفیه زیادة حسنة وهی مسح العنق یعنی "بیہقی کی روایت میں مسح عنق کی زیادتی اچھی ہے۔"

پھر علامہ شوکانی فرماتے ہیں: فانظر کیف صرح هذا الحافظ بان هذه الزیادة

المتضمنة لمسح العنق حسنة یعنی (اے مولوی عبدالجبار!) "آپ غور کر لیں کہ حافظ ابن حجر نے کیسے تصریح کی ہے کہ اس روایت میں مسح عنق کی زیادتی اچھی ہے۔"

پھر علماء ہادی اور قاسم گردن کا مسح سر کے بقیہ پانی سے کرنے کے قائل ہیں اور موید باللہ اور منصور باللہ تازہ پانی سے مسح کرنے کے قائل ہیں۔

یہ امام شوکانی کی تحقیق ہے جو ہر دو فاضلوں (مولانا کھنڈیلوی و حافظ روپڑی) کے خلاف ہے۔ اگر مجمع العلماء میں ہر دو فریق کی تحقیقات پیش کی جائیں تو میرا خیال یہ ہے کہ علامہ شوکانی کی تحقیق کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ علمی پایہ ان کا بہت بلند ہے۔ اور وہ محقق اہلحدیث ہیں جن کی قابلیت مسلم ہے۔ پس مؤلف منتقی و امام بغوی و حافظ ابن حجر و علامہ شوکانی بہ ہمراہ فقہاء حنفیہ و بعض اصحاب شافعیہ مسح گردن کے استحباب کے قائل ہیں۔ لہٰذا بدعت کا قول مجازفت ہے۔ پس مخاصمت و مجاحفت سے محاذرت فرما کر جرم بدعت سے مجاوزت فرمائیں۔

جب مقلدین سے ہماری مجاورت ہے تو مجاملت چاہیے۔ ہمارے علماء محاسبہ میں مجاہدہ کریں گے تو مقلدین محاسنہ سے کام لے کر مجاولہ کریں گے۔ جس نے خواہ مخواہ کا محاربہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے نقر جانی فرما کر تحقیقی مکالمہ فرمائیں جس سے مکاشفہ ہو جائے۔ اور یہ جو ظاہر کیا گیا ہے کہ روایات احادیث صحیحہ کے خلاف ہیں' قابل نظر ہے۔ کیونکہ کسی صحیح حدیث میں مسح گردن کی نفی وارد نہیں ہے بلکہ وہ ثبوت اور نفی سے ساکت ہیں۔ ساکت اور ناطق میں تعارض نہیں ہوتا' بلکہ ناطق مقدم ہوتا ہے۔

محلی ابن حزم میں ہے: واخذ الزیادۃ واجب۔ (ج۔۲' ص۔۳) یعنی "جس روایت میں کوئی زائد بات مذکور ہو اس کا لینا واجب ہے۔" نیز لکھا ہے: واخذ الزیادۃ فرض لا یجوز ترکہ لان الزیادۃ حکم قائم بنفسہ رواہ من علمہ ولا یغیرہ سکوت من لم یروہ عن روایتہ کسائر احکام کلھا ولا فرق۔ یعنی جن روایتوں میں کسی چیز کی زیادتی ہے' ان کا لینا واجب ہے اور ان کا چھوڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ زیادت حکم مستقل ہے' جس کو جس نے جان لیا اس نے روایت کر دیا۔ اور جن لوگوں

نے سکوت کیا ہے' وہ غیروں کو مضر نہیں ہے۔ جیسے تمام احکام کا یہی حال ہے۔ کما لا یخفی علی العلماء۔

مسح گردن کا ذکر احادیث صحیحہ میں نہیں ہے تو اس عدم ذکر سے عدم شے لازم نہیں ہے۔ اب دیگر روایات سے ثبوت ہو گیا' تو اس زیادت کو تسلیم کیا جائے گا۔ باقی رہا ان کا ضعاف ہونا' سو وہ استحباب کو مضر نہیں ہے۔ کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف روایت معتبر ہے۔ احکام میں معتبر نہیں ہے۔ کما لا یخفی علی اہل العلم باصول الحدیث۔

حضرت مولانا المحترم کی خدمت عالیہ میں مودبانہ عرض ہے کہ اس مسئلہ پر نظرثانی فرمائیں۔ باقی رہا یہ امر کہ ہیئت مروجہ بدعت ہے' سو عرض ہے کہ مسح گردن کا جب مستحب ہوا تو اس کے کرنے کی کیفیت منصوص نہیں ہے۔ جس طرح کوئی کر لے مسح کا اطلاق اس پر صحیح ہو گا۔

ظاہر کفین سے مسح اس لیے کیا جاتا ہے کہ باطن کفین کی تری ختم ہو جاتی ہے اور ظاہر کفین پر پانی کی تری موجود ہوتی ہے۔ اس لیے ظاہر کفین سے مسح کر لیا جاتا ہے' جس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ ہاں بندہ نے خود کبھی مسح گردن کا نہیں کیا۔ البتہ کرنے والوں کو منع کرنے اور بدعت کہنے سے پرہیز ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی جلد۔۳۶' شمارہ۱۰' مورخہ یکم محرم الحرام سنہ۱۳۷۵ھ

تہبند یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے اور وضو

واضح ہو کہ اخبار الاعتصام لاہور مطبوعہ ۲۸ جون سنہ۱۹۷۴ء میں بندہ عارف حصاری کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں یہ مسئلہ درج تھا کہ حقہ اور سگریٹ نوشی سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ جس کا ثبوت تین وجہ سے دیا گیا تھا۔ ایک وجہ یہ لکھی تھی کہ حقہ اور سگریٹ پینا گناہ ہے۔ اور وضو کے بعد گناہ کرنے سے وضو فاسد ہو جاتا

ہے۔ مثلاً جھوٹ بولے یا غیبت کرے یا اپنا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکائے تو وضو فاسد ہو جاتا ہے۔ اس کو دوبارہ وضو کرنا چاہیے۔ اس مسئلہ کے ثبوت میں دو دلیلیں پیش کی گئی تھی۔ ایک ابوداؤد مع عون المعبود جلد اول ص۔۲۴۳ سے یہ حدیث پیش کی تھی کہ ایک شخص کو آنحضرت ﷺ نے کپڑا (ٹخنوں سے) نیچے لٹکا کر نماز پڑھتے دیکھا تو اس کو یہ فرمایا اذھب فتوضا کہ جا وضو کر کے آ۔ وہ اسی حالت میں گیا اور وضو کر کے واپس آیا تو دوبارہ پھر حکم دیا اذھب فتوضا کہ جاؤ وضو کرو۔ آپ سے دوبارہ وضو کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو یہ فرمایا کہ مسبل ازار کی اللہ نماز قبول نہیں کرتا۔ اس حدیث سے یہ ظاہر ہوا کہ وضو کے بعد گناہ کرنا مفسد وضو ہے۔

دوسری حدیث تفسیر درمنثور سے یہ پیش کی گئی تھی کہ حضرت ابن عباس ﷺ بیان کرتے ہیں کہ دو شخصوں نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھی' وہ دونوں روزہ دار تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے اپنی نماز پوری کر لی تو ان دونوں شخصوں کو خطاب کر کے فرمایا اعیدوا وضوء کما وصلٰوتکما وامضیا فی صومکما واقضیا یوما اخر مکانہ یعنی تم دونوں وضو اور نماز کا اعادہ کرو اور یہ روزہ جاری رکھو لیکن دوسرے دن اس کی قضا کرنا۔" انہوں نے عرض کی یارسول اللہ کیا وجہ ہو گئی؟ آپ نے فرمایا قد اغتبتما فلانا کہ فلاں شخص کی تم نے غیبت کی ہے۔ اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ غیبت کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ اس گناہ سے وضو فاسد ہو گیا۔ نماز اور روزہ ہی بیکار ہو گئے

حقہ پینا اور سگریٹ پینا بھی گناہ ہے تو اس سے وضو فاسد ہو گیا۔ میرے اس مضمون پر جناب مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی مدظلہ نے اس کے حاشیہ پر ریمارک لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔ "حرام چیز کے کھانے کو نواقض وضو سے شمار کرنا کسی کا مذہب نہیں بخلاف اس کے صحیح ابن خزیمہ میں یہ عنوان موجود ہے باب ذکر الدلیل علی ان الکلام السئی والفحش فی المنطق لا یوجب الوضوء یعنی بری بات اور فحش کلامی کی وجہ سے وضو ضروری نہیں' اس کے تحت اس دلیل کا ذکر فرمایا ہے' ملاحظہ ہو جلد اول' ص۔۲۸۔

جناب مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف محدث بھوجیانی جمعیت اہلحدیث لاہور کے مشہور عالم اور مفتی ہیں۔ آپ کے زیر اہتمام اخبار الاعتصام جاری ہے لیکن افسوس

ہے کہ آپ اور آپ کے ہم مشرب علماء اس بدیہی مسئلہ میں سخت غلطی کھائے ہوئے ہیں۔ مصنف ابن ابی شیبہ جزء اول' ص ۳۷ میں ہے: عن انس قال توضواء من السکر فان له نثقلا کہ تم کسی نشہ آور چیز کے کھانے سے وضو کرو۔ کیونکہ وہ تمہارے لیے بوجھ اور گناہ ہے۔ نیز اسی صفحہ میں حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنے کا حکم کرتے تھے۔ وسقاهم مرة نبیذا اذ امرهم بوضوء فتوضواء یعنی ایک بار لوگوں کو نبیذ پلا دی تو ان کو وضو کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے وضو کیا۔ ان دونوں اثروں سے یہ ثابت ہوا کہ نشہ آور چیز کے کھانے سے وضو کرنا چاہیے۔ کھجوروں کا نبیذ بھی قدرے نشہ آور ہوتا ہے' اس کے پینے سے اور دیگر نشہ آور چیز کے پینے سے وضو کرنے کا حکم ہوا تو حقہ سگریٹ سے وضو کیوں نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں بندہ نے مرفوع احادیث سے یہ ثابت کیا تھا کہ ارشاد نبوی یہ ہے توضاؤا مما مست النار کہ جس چیز کو آگ پکائے اس کے کھانے پینے سے وضو کرنا چاہیے۔ اس عام حکم سے وہ مطعومات مخصوص ہیں جن کو کھا کر آپ نے یا خلفاء نے وضو نہ کیا۔ باقی اشیاء اس عموم میں داخل ہیں۔ مثلاً اونٹ کا گوشت اور دیگر بقولات جن سے بدبو آتی ہے' ان کے کھانے سے وضو کرنا ہوگا۔

مصنف ابن ابی شیبہ جزء اول' ص ۳۶ میں یہ حدیث ہے' جس میں یہ ذکر ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بکری کا گوشت کھایا تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے وضو کر لیا۔ اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا اکلنا رجسا؟ کیا ہم نے ناپاک اور پلید چیز کھائی ہے کہ اس سے تم وضو کر رہے ہو؟ اس سے ظاہر ہوا کہ طیبات کے کھانے سے وضو نہیں ہے۔ خبیثات مکروہات کے کھانے سے وضو کرنا پڑتا ہے۔

مسند احمد مع شرح جزء دوم ص ۱۰۳ میں ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں اور ابی بن کعب اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہم آپس میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے' ہم نے گوشت روٹی کھائی پھر میں نے تو پانی منگوایا تاکہ وضو کروں۔ ابی بن کعب اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آپ وضو کیوں کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ اس کھانے کی وجہ سے جو ہم نے کھایا ہے۔ انہوں نے فرمایا اتتوضاء من الطیبات "کیا آپ وضو کرتے ہیں پاکیزہ چیزوں کے کھانے سے۔" اس سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ

طیبات کے کھانے سے وضو نہیں ہے۔ مکروہات خبیثات کے کھانے سے وضو ہے۔

پس مولانا کا یہ کہنا کہ فقہاء حدیث سے کسی کا یہ مذہب نہیں' غلط ہو گیا۔ نیز جب بعض صحابہ و تابعین مما مست النار سے وضوء کرنے کے مطلق قائل ہیں تو مکروہات و خبیثات مما مست النار سے بطریق اولیٰ وضو ان کے نزدیک ضروری ہے۔ نیز جب تمباکو پینا گناہ ہے تو گناہ سے وضو کرنا کرانا ثابت ہے۔ کما تقدم و سیاتی عن قریب۔

اچھا ہم نے حسب ارشاد مولانا کے کتاب صحیح ابن حبان دیکھی تو وہاں وہ عنوان جس کی عبارت مولانا حنیف صاحب نے لکھی ہے موجود ہے لیکن وہ امام ابن خزیمہ کا ایک اجتہادی دعویٰ ہے جس کا ثبوت ان کی پیش کردہ دلیل سے بالکل نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ دعویٰ خاص ہے اور دلیل عام ہے' جس میں نماز و وضو کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ پس دعویٰ اور دلیل میں تقریب تام نہیں ہے۔ ایسا دعویٰ خارج ہوا کرتا ہے۔ ناظرین اہل علم ذرا انصاف کریں کہ دعویٰ یہ ہے کہ وضو کے بعد کوئی برائی اور فحش کلام کرے تو وضو نہ کرے۔ اور دلیل یہ دی ہے کہ اگر کوئی شخص غیراللہ کی قسم کھالے تو وہ لا الہ الا اللہ کہہ لے اور اگر کسی کو یہ کہہ دے کہ آؤ جوا کھیلیں تو وہ اس کے کفارہ میں صدقہ دے۔ اس میں وضو کے فاسد ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ تو مطلق بیان ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وقت زبان سے یہ الفاظ نکل دے تو اس طرح کفارہ دے۔ باب یا عنوان کسی محدث کا اس کا دعویٰ ہوتا ہے۔ اب جو دلیل اس کے تحت درج کرے گا اس پر غور کیا جائے گا کہ اس سے وہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر ثابت ہوا تو سر آنکھوں پر' ورنہ اس امام کی اجتہادی غلطی متصور ہو گی۔

مولانا حنیف صاحب کا استدلال تو اس حنفی مولوی کا سا ہے جس کے ساتھ میرا مناظرہ ہوا' جس کا مختصر بیان یوں ہے کہ ایک شخص امام مسجد نے غصہ میں آکر اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاق اکٹھی دے دیں۔ اس پر ایک دیوبندی مولوی نے فتویٰ لگا دیا کہ اس امام پر اس کی عورت حرام ہو گئی۔ وہ فوراً اس کو گھر سے نکال دے اور امامت سے یہ معزول ہے۔ اس کے پیچھے نماز جائز نہیں اور عورت اس پر قطعاً حرام ہے۔ بغیر حلالہ کے جائز نہیں ہو سکتی۔ اس مسئلہ پر اس گاؤں میں اختلاف برپا ہو

گیا کیونکہ وہاں تین مسلک کے لوگ تھے۔ ایک ہی مسجد میں سب نماز پڑھتے تھے۔ ایک اہلحدیث مذہب تھا' دوسرا دیوبندی' تیسرا جماعت اسلامی۔ اس گاؤں کے نمبردار نے بندہ سے فتویٰ طلب کیا تو ان کو ایک مجلس کی تین کے ایک ہونے کا فتویٰ دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ حلالہ مروجہ موجب لعنت ہے۔ اس پر مناظرہ مقرر ہو گیا تو بندہ نے اس گاؤں میں جا کر مناظرہ کیا۔

حنفی مولوی نے ابن ماجہ نکال کر پیش کی جس میں طلاق کے بیان میں ایک باب یوں درج ہے: باب من طلق ثلاثا فی مجلس واحد یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ جو شخص ایک مجلس میں تین بار طلاق دے دے تو اس کا کیا حکم ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں امام ابن ماجہ نے یہ حدیث ذکر کی ہے کہ عامر شعبی کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیس سے یہ کہا کہ آپ اپنی طلاق کا قصہ بیان کریں۔ انہوں نے یہ بیان کیا کہ میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دیں اور یمن کی طرف نکل گیا۔ (آنحضرت ﷺ نے ان کو جائز رکھا)

میں نے جواب دیا کہ امام ابن ماجہ نے جو باب باندھا ہے یہ ان کا اجتہادی دعویٰ ہے۔ انہوں نے اس کے ثبوت میں جو روایت ذکر کی ہے' اس میں نہ تو ایک مجلس کا ذکر ہے اور نہ تین طلاق یکبارگی دینے کا ذکر ہے' مجمل سی دلیل ہے۔ دعویٰ خاص من حیث الخاص اور دعویٰ مقید من حیث المقید کسی دلیل عام اور مطلق سے ثابت نہیں ہو گا کیونکہ اس طرح کی دلیل اور دعویٰ میں تقریب تام نہیں ہوتی جو مناظرہ کے اصول کی رو سے ضروری ہے۔ میں نے مسلم وغیرہ سے حدیث پیش کی کہ فاطمہ کو قیس نے تین طلاق متفرق سنت کے مطابق دی تھیں۔ دو طلاق دے کر یمن کو چلے گئے تھے' تیسری طلاق یمن سے بھیجی تھی۔

حنفی مولوی نے کھسیانہ ہو کر کہا کہ آپ کے پاس کون سی صریح دلیل ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک طلاق رجعی ہیں؟ میں نے جھٹ صحیح مسلم سے ابن عباس ؓ کی روایت پیش کر دی کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی اور شروع دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ اور ابو رکانہ ؓ والی حدیث پیش کی کہ انہوں نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ایک طلاق رجعی قرار

دے کر رجوع کرنے کا حکم دیا۔ ابو رکانہ ؓ نے رجوع کر لیا۔ میرے ان دلائل سے حنفی عالم لاجواب ہو گیا اور سب لوگوں نے میرے فیصلہ کو تسلیم کیا اور امام مسجد نے عورت سے رجوع کر لیا۔ اور وہ امامت پر بحال ہو گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی محدث کی محض تبویب سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ جب تک حدیث اس دعویٰ کے مطابق نہ ہو جو اس کے تحت میں ذکر کی گئی ہے۔ یہی حال امام ابن خزیمہ کا ہے کہ عنوان کچھ ہے اور دلیل کچھ ہے۔ جس میں نہ نماز کا ذکر ہے نہ وضو کا۔ صرف یہ مسئلہ حدیث میں مذکور ہے کہ اگر کوئی غیر اللہ کی قسم کھا بیٹھے تو وہ کلمہ پڑھ کر اپنے ایمان کی تجدید کرے۔ کیونکہ غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر کوئی قسم توڑ دے تو اس کا کفارہ دے دے' اس کو وضو فاسد ہونے نہ ہونے سے کیا تعلق ہے؟ ہاں ابن خزیمہ کے حوالے پر عبارت دیکھی تو اس سے مولانا حنیف کی ایک گونہ تردید ہو گئی ہے۔ وہ اس طرح کہ امام ابن خزیمہ نے یہ لکھا ہے: خلاف من زعم ان الکلام السیئ یوجب الوضوء یعنی "یہ خلاف ہے اس شخص کے جس کا خیال یہ ہے کہ برا کلام کرنے سے وضو کرنا واجب ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ بعض فقہاء برے کلام سے وضو کرنے کے قائل تھے۔ امام ابن خزیمہ نے ان کی تردید میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ اب مولانا حنیف صاحب کا یہ لکھنا غلط ہو گیا جو حاشیہ میں یوں لکھا ہے: "جہاں تک معلوم ہے فقہائے حدیث سے کسی نے ارتکاب کبیرہ کو نواقض وضو سے شمار نہیں کیا جیسا کہ حافظ ابن خزیمہ کی محولہ بالا تبویب سے بھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

ہم نے اندازہ کیا آپ کا علم اور رائے اور اندازہ غلط ہے۔ اب آپ اپنے مکتبہ سے مصنف ابن ابی شیبہ کی جزء اول کا ص-۹۰ نکالیں' وہاں عنوان یہ ہے: فی الوضوء من الکلام الخبیث والغیبۃ" یعنی "وضو میں کلام خبیث اور غیبت کرنے کا کیا حکم ہے یعنی کلام خبیث اور غیبت سے وضوء ہے۔"

اب مولانا عطاء اللہ صاحب پہلے یہ بتائیں کہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ جو امام احمد اور امام بخاری جیسے اکابر ائمہ کے شیخ الحدیث ہیں۔ وہ فقہاء حدیث میں شمار ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو آپ کا کلام مذکور باطل ہوا۔ آپ ذرا سنبھل کر حاشیہ آرائی کیا کریں پھر اس

کے ثبوت میں امام ابن ابی شیبہ نے جو دلائل ذکر کئے ہیں' ان میں سے چند یہ ہیں کہ "حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ نے فرمایا کہ میں برا کلام بول کر وضو کروں تو یہ مجھے بہت زیادہ محبوب ہے۔ اس بات سے کہ پاکیزہ کھانا کھا کر وضو کروں۔" دیگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ (عجیب بات ہے" "یعنی تمہارا عجیب حال ہے کہ پاکیزہ کھانا کھا کر تو وضو کر لیتے ہو لیکن اپنے بھائی کو کوئی کلمہ خبیثہ (گالی وغیرہ) کہہ دو تو کوئی وضو نہیں کرتے۔"

مخفی نہ رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ مسلک تھا کہ جو چیز مما مست النار ہوتی' اس سے وضو کرتی تھیں۔ چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ جزء اول' ص ۔ ۳۷ میں "امام زہری سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابو سلمہ ﷛ اور عمر بن عبدالعزیز ﷬ اگر کوئی چیز آگ پر پکی ہوئی کھا لیتے تو وضو کیا کرتے تھے اور امام زہری خود بھی مما مست النار سے وضو کیا کرتے تھے۔ پس شیخ کا دعویٰ باطل ہے ورنہ اکابر صحابہ کرام و تابعین عظام کبھی وضو مما مست النار سے نہ کرتے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ مذہب ہوا تو انہوں نے کہا کہ یہ عجیب حال ہے کہ طعام کھا کر تو وضو کر لو اور کلمہ خبیثہ کہہ کر وضو نہ کرو۔ یعنی کلمہ خبیثہ سے بھی ضرور وضو کرنا چاہیے۔ دیگر روایت محمد راوی سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ انصار کا ایک شیخ کسی مجلس انصار کے پاس سے گزرا تو ان کو کہا اعیدوا الوضوء تم وضو دوبارہ کرو کیونکہ بعض کلام تم ایسا کر بیٹھتے ہو جو ریاح سے بھی برا ہوتا ہے۔"

دیگر روایت ہشام محمد سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابو عبیدہ ﷛ سے دریافت کیا کہ وضو کون سی چیز سے دوبارہ کرنا پڑتا ہے؟ انہوں نے فرمایا من الحدث واذی المسلم یعنی "ایک تو ریح خارج ہونے سے وضو کرنا پڑتا ہے' دوسرا کسی مسلمان کو اذیت دینے والا کوئی کلمہ کہہ دینے سے۔" اس سے ظاہر ہے کہ اگر وضو کے بعد کسی کو گالی دے دی تو وضو دوبارہ کرنا چاہیے۔ دیگر یہ کہ محمد بن عجلان' حارث سے روایت کرتے ہیں۔ حارث نے کہا کہ میں ابراہیم کا ہاتھ پکڑے جا رہا تھا۔ فذکرت رجلا۔ "میں نے کسی شخص کا ذکر کر دیا۔" غیبت کر دی تو مجھے ابراہیم نے کہا ارجع فتوضا یعنی جا لوٹ جا وضو کر۔ فقد کانوا یعدون ھجرا" یعنی سلف

صالحین اس کو بری بات شمار کرتے تھے۔ (اس وجہ سے اس سے وضو کرتے تھے) ان تمام آثار کے مجموعہ سے امام ابوبکر بن ابی شیبہ کا دعویٰ ثابت ہو گیا۔ ان آثار کو ان دو احادیث سے ملا لیں جو ہم نے پیش کی تھیں تو ہمارا مسلک صحیح ثابت ہو گیا' فللّٰہ الحمد۔

پھر مولانا حنیف صاحب بندہ کی پیش کردہ حدیث مسبل ازار پر یہ تنقید کرتے ہیں کہ "امام شوکانی نے دلیل مسبل ازار والی کا بھرپور رد کیا ہے۔" میں کہتا ہوں کہ بندہ نے بفضلہ تعالیٰ آپ کا اور علامہ شوکانی کا بھرپور رد چکنا چور کر دیا ہے۔ اب اس کی تفصیل سنئے۔

امام شوکانی سے آپ نے حدیث مسبل ازار کی بابت یہ نقل کیا ہے: وفی اسنادہ مجھول فلا تقوم بہ الحجۃ ولا یصح الاستدلال بہ علی نقض الوضوء والمسبل ازارہ فکیف یستدل بہ علی ھذہ القضیۃ الکلیۃ التی تعم بہ البلوی۔ یعنی حدیث مسبل ازار کی اسناد میں مجہول راوی ہے۔ اس حدیث کے ساتھ دلیل قائم نہیں ہو سکتی اور مسبل ازار کے وضو ٹوٹنے پر اس سے استدلال کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سے کلیہ قاعدہ مقرر ہو۔ یہ تو عام بلویٰ ہے کہ لوگ اپنا تہبند عموماً نیچے کر کے چلتے اور نماز پڑھتے ہیں۔" یہ تمام کلام سراسر باطل ہے۔ اس حدیث کی اسناد حسن یا صحیح ہے ضعیف ہرگز نہیں ہے اور اس میں کوئی راوی مجہول نہیں ہے۔ حدیث مسبل ازار سنن ابوداؤد میں دو مقام پر درج ہے۔

ایک مقام جلد اول' ص۔۲۴۳ مع عون المعبود باب الاسبال فی الصلوۃ میں ہے۔ دوسرا مقام ابوداؤد مع عون المعبود جلد رابع' ص۔۱۰۰ کتاب اللباس میں ہے۔ دونوں مقام پر امام ابوداؤد نے سکوت کیا ہے' کوئی جرح نہیں کی۔ مقدمہ ابوداؤد میں ہے کہ جس پر امام ابوداؤد سکوت کریں وہ صحیح یا حسن ہو گی۔ دوسری بات یہ کہ امام نووی نے ریاض الصالحین کی کتاب اللباس میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور آخر میں یہ لکھا ہے رواہ ابوداؤد باسناد صحیح علی شرط مسلم۔ یعنی ابوداؤد نے اس حدیث کو شرط مسلم کی رو سے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔" تیسری بات یہ کہ عون المعبود ج۔۴' ص۔۱۰۰ میں ہے والحدیث سندہ حسن یعنی اس حدیث کی سند حسن ہے۔

ان صحیح شاہدوں کے علاوہ اس حدیث کی اسناد کی اندرونی حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک راوی ابو جعفر ہے جو حدیث کے تمام طرق میں پایا جاتا ہے۔ امام ترمذی اور منذری نے اس کو مجہول قرار دیا ہے لیکن یہ ان کی علمی غلطی ہے۔ چنانچہ عون المعبود جلد اول' ص۔۲۴۳ میں ہے: والصحیح ان ابا جعفر هذا هو المؤذن قال الحافظ فی التقریب ابوجعفر المؤذن الانصاری المدنی مقبول من الثالثة ومن زعم انه محمد بن علی بن الحسین فقد وهم۔ یعنی صحیح بات یہ ہے کہ یہ ابو جعفر مؤذن انصاری مدنی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے تقریب میں یہ صراحت کی ہے کہ ابو جعفر مؤذن انصاری مدنی ہے جو تیسرے طبقے کا مقبول راوی ہے۔ جس شخص نے اس کو محمد بن علی بن حسین گمان کیا ہے' وہ اس کا وہم ہے۔"

پھر آگے عون المعبود میں یہ لکھا ہے: وفی الخلاصة ابوجعفر الانصاری المؤذن المدنی عن ابی هريرة وعنه يحيى بن ابی كثير حسن الترمذی حديثه یعنی "خلاصہ میں یہ لکھا ہے کہ ابو جعفر انصاری مؤذن مدنی ہے جو ابو ہریرہ ﷛ سے روایت کرتا ہے اور اس سے یحییٰ بن ابو کثیر روایت لیتا ہے۔ امام ترمذی نے اس کی حدیث کو حسن کہا ہے۔" پھر عون المعبود میں یہ لکھا ہے: فابو جعفر هذا هو رجل من اهل المدينة يروى عن ابی هريرة وعطاء بن يسار وليس هو ابوجعفر الباقر محمد بن علی وكذا ليس هو ابوجعفر التميمی الذی اسمه عيسٰی و وثقه ابن معين یعنی "ابو جعفر جو ابوداؤد کی سند میں ہے' وہ ایک شخص اہل مدینہ سے ہے جو ابو ہریرہ ﷛ اور عطاء بن یسار سے روایت کرتا ہے۔ نہ وہ ابو جعفر باقر ہے نہ ابو جعفر تمیمی عیسیٰ ہے۔ ابو جعفر مدنی کو ابن معین نے ثقہ کہا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث مجمع الزوائد ج۔۵' ص۔۱۲۸ میں بھی ہے جو ان لفظوں سے ہے: عن عطا بن يسار عن بعض اصحاب النبی صلی الله عليه وسلم قال بينما رجل يصلی وهو مسبل ازاره قال له رسول الله صلی الله عليه وسلم اذهب فتوضاء ثم جاء فقال له رسول الله صلی الله عليه وسلم ثم اذهب فتوضاء ثم سكت عنه فقال انه كان يصلی وهو مسبل ازاره وان الله تبارك وتعالٰی لا يقبل صلوة عبد مسبل ازاره۔ (رواه احمد ورجاله رجال الصحيح) یعنی "عطاء بن یسار نے

بعض صحابہ سے روایت کیا کہ ایک شخص اپنا تہبند نیچے لٹکا کر نماز پڑھ رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کو حکم فرمایا جا وضو کر۔ وہ گیا وضو کر آیا۔ پھر حکم دیا کہ جا وضو کر' پھر وہ وضو کر آیا۔ آپ سے کسی نے کہا' یارسول اللہ! کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس کو وضو کرنے کا حکم دیا (حالانکہ وہ وضو سے تھا) آنحضرت ﷺ نے کچھ سکوت کیا پھر یہ فرمایا کہ وہ شخص اپنے تہبند کو نیچے چھوڑ کر نماز پڑھ رہا تھا اور تحقیق اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے شخص کی نماز قبول نہیں کرتا جو اپنے تہبند کو نیچے چھوڑ کر نماز پڑھے۔ اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی وہی ہیں جو صحیح بخاری کے راوی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث مسند احمد ج-۴' ص-۶۸ میں ہے۔ اس کی شرح میں اس کی اسناد سے جرح اڑائی گئی۔ اور حافظ ابن حجر سے یہ نقل کیا ہے وقال فی موضع اخر هذا ليس بمستقيم لان محمد بن علی لم يكن مؤذنا ولان ابا جعفر قد صرح بسماعه عن ابی هريره تتعين انه غيره" یعنی ابن حجر نے ایک اور مقام پر یہ لکھا ہے کہ ابو جعفر سے محمد بن علی مراد لینا درست نہیں ہے کیونکہ محمد بن علی مؤذن نہ تھے۔ ابو جعفر نے بعض طرق میں ابو ہریرہ ؓ سے اپنے سماع کی تصریح کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ابو جعفر اور ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس حدیث کی اسناد میں کوئی راوی مجہول نہیں اور یہ حدیث حسن یا صحیح ہے اور اس سے اس مسئلہ پر استدلال کرنا صحیح ہے کہ نماز میں اسبال ازار سے وضو اور نماز دونوں باطل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی تائید ابن مسعود ؓ کے اس اثر سے پائی جاتی ہے انه رای اعرابیا یصلی قد اسبل ازاره فقال المسبل ازاره فی الصلوٰة لیس من اللہ فی حل و حرم۔ یعنی ابن مسعود ؓ نے کسی اعرابی کو دیکھا کہ وہ مسبل ازار ہو کر نماز پڑھ رہا ہے تو فرمایا جو مسبل ازار ہو کر نماز پڑھتا ہے نہ وہ نماز کے احرام میں ہے اور نہ باہر ہے۔ یعنی اس کی نماز کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔

اس تصریح سے یہ ثابت ہوا کہ مسبل ازار کا وضو اور نماز فاسد ہیں۔ چنانچہ عون المعبود ج-۴' ص-۱۰۰ میں ہے والحديث يدل علی تشديد امر الاسبال وان اللہ

تعالٰی لا یقبل صلٰوۃ المسبل وان علیہ ان یعید الوضوء والصلٰوۃ۔ یعنی یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ تہبند لٹکانے والے پر سخت حکم لگایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا اور اس پر لازم ہے کہ وہ وضو اور نماز دونوں کا اعادہ کرے۔ چنانچہ اسی بنا پر دستور المتقی کے ص-۲۱ پر لکھا ہے: "ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے والوں کو ازسرنو وضو کرنا چاہیے۔ ایک ایسا شخص ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے سامنے نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے اس کی نماز تڑوا کر ازسرنو وضو کرنے کا حکم فرمایا۔

جناب مولانا حافظ سراج الدین صاحب جودھ پوری نے کتاب بنام صلوۃ الرحمٰن لکھی ہے۔ اس کے ص-۸ پر نواقض لکھتے ہوئے ص-۹ پر لکھتے ہیں: "اونٹ کا گوشت کھانے سے تہبند یا پاجامہ کو ٹخنے سے نیچے لٹکانے سے۔"

عام بلوی کا بہانہ اور عذر پس یہ احادیث صحیحہ کے مقابلہ میں لا شیئی ہے۔ امام ابن حزم محلی جزو اول' ص-۲۴۲ میں لکھتے ہیں: وقد مضی الکلام فی الفصل الذی قبل ھذا فی ابطال قول من تعلل فی رد السنن بان ھذا مما تعظم بہ البلوی۔ یعنی اس سے پہلی فصل میں کلام گزر چکا ہے جس میں اس شخص کے قول کو باطل کیا گیا ہے جو احادیث کے رد کرنے میں یہ علت بیان کرتا ہے کہ اس کام کا تو عام بلوی تھا۔

پھر جس طرح تین طلاق مجلس واحدہ کو تین ہی ٹھہرانے والے اس طائفہ اہلحدیث کو جو ایک کہتے ہیں کہ شاذ ہے اور اہل بدعت ہے اور ان کا مسلک اجماع کے خلاف بتاتے ہیں۔ اسی طرح مولانا حنیف نے اسبال ازار کو نواقض وضو سے نکال کر مذہب شاذ اور شیعہ زیدیہ کا ٹھہرا دیا ہے اور یہ ایسی تشبیہ ہے جیسے کوئی مولانا عطاء اللہ صاحب کو ہمیشہ ننگے پاؤں نماز پڑھتا دیکھ کر یہ حدیث پڑھ کر یہود سے مشابہ کہہ دے کہ فقہ کی کتاب شامی ص-۴۸۶ میں ہے: فی الحدیث صلوا فی نعالکم ولا تشبھوا بالیھود والنصاری۔ اور ابوداؤد میں بھی یہ روایت ہے: فخالفوا الیھود والنصاری فانھم لا یصلون فی نعالھم وخفافھم۔ یعنی یہود کی مشابہت نہ کرو بلکہ مخالفت کرو کہ جوتیوں سمیت نماز پڑھا کرو۔ وہ اپنے کنیسوں' گرجاؤں میں جاتے ہیں تو جوتیاں اتار کر پڑھتے ہیں۔ ہماری شبہہ منصوص ہے اور علامہ شوکانی کی اختراعی ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بہرحال ماهو جوابكم فهو جوابنا۔ جب حدیث صحیح ہے اور اصول النصوص تحمل علٰی ظواهرها پر ہمارا عمل ہے کہ نصوص شرعیہ اپنے ظاہر پر محمول ہوا کرتے ہیں تو کسی کی مشابہت کی ہم کو کچھ پرواہ نہیں ہے۔

نواب صاحب محدث بھوپالی اپنی کتاب "الجنة فی الاسوة الحسنة بالسنة" کے ص-۸۸ میں علماء مفتیان دین کو یہ ہدایت کرتے ہیں: فینبغی ان یفتی بلفظه النص مهما امکنه فانه یتضمن الحکم والدلیل مع البیان التام۔ یعنی مفتی کے لیے یہ لائق ہے کہ فتویٰ لفظ نص کے ساتھ دیا کرے کیونکہ نص شارع کی حکم اور دلیل دونوں کو متضمن ہوتی ہے۔ پس ہمارا استدلال نص سے ہے کہ اسبال ازار گناہ ہے اور یہ مفسد نماز ہے۔

مرعاۃ المفاتیح ج-۱' ص-۵۰۱ میں حدیث مسبل ازار کی تصحیح کے بعد یہ لکھا ہے: قیل انما امره بالوضوء لیعلم انه مرتکب معصیة۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ اس شخص کو وضو کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ وہ یہ معلوم کر لے کہ میں گناہ اور اللہ و رسول کی نافرمانی کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ (وضو کے بعد گناہ کرنا مفسد وضو ہے) نیز یہ لکھا ہے کہ "اس حدیث سے اس مسئلہ پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ تہبند نیچے چھوڑنا نماز کے مفسدات سے ہے۔ اس بنا پر کہ نماز کا عدم قبول رد کرنے کے مترادف ہے۔ جب مسبل ازار کی نماز مردود ہو گئی تو وہ باطل شمار ہو گی۔ پس بندہ اس مسئلہ میں منفرد نہیں ہے دیگر علماء و محدثین نے بھی بندہ سے اتفاق کیا ہے۔

مولانا شمس الحق صاحب مصنف عون المعبود وغیرہ مولانا عبدالجلیل صاحب محدث سامرودی' مولانا عبدالسلام صاحب محدث بستوی و مولانا محمد یونس صاحب محدث دہلوی' مولانا حافظ سراج الدین صاحب جودھ پوری' مولانا عبیداللہ صاحب محدث مبارک پوری بعض اہل بدعت اس پر اعتراض اور طعن و ملامت کرتے ہیں جن کی روش مولانا حنیف نے بلا تحقیق امام شوکانی کی تقلید میں پھنس کر اختیار کر لی ہے جو ان کی شان محدثانہ سے بعید ہے۔ ان کو اپنا حاشیہ نظر انداز کر کے اس مسئلہ پر نظرثانی کرنی ضروری ہے۔ لعل الله یحدث بعد ذالک امرا۔

ایک بریلوی کا طعن اور اس کا جواب ⇦ واضح ہو کہ کسی بریلوی مسلک

مولوی مہدی حسن صاحب علاج شاہ جہان پوری نے جماعت اہلحدیث کی تردید میں ایک کتاب بنام قطع الوتین شائع کی تھی۔ جس کا محققانہ جواب جناب حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب محدث سامرودی رحمۃ اللہ علیہ نے بنام "اظہار الحق المبین" المعروف "فقہ احناف کے اسراری گر" شائع کیا۔ اس کے ص ۹۵ پر بریلوی طعن نمبر۳۱ یوں درج ہے۔ "غیر مقلدین کے نزدیک ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے والے کا وضو ٹوٹ جاتا ہے جو شخص وضو کرے اور کہیں بدقسمتی سے اس نے نیچا پاجامہ پہن لیا تو اس کا وضو رخصت ہوا۔"

اس کا جواب جو مولانا سامرودی مرحوم نے ارقام فرمایا۔ وہ مولانا حنیف صاحب کی ضیافت طبع کے لیے درج ذیل ہے۔ چنانچہ مولانا سامرودی رقم طراز ہیں۔

بے ادب کرتے ہیں توہین حدیث نبوی
اہل بدعت کو اے خدا صاحب آداب بنا

حضرات! مولوی صاحب جس پر تمسخر اڑا رہے ہیں' وہ تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ دیکھو مشکوۃ باب الستر فصل ثانی: عن ابی ھریرۃ قال بینما رجل یصلی ازارہ۔ (الحدیث' رواہ ابوداؤد) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک وقت ایک آدمی تہبند لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جا وضو کر' پھر آیا (وضو کر کے) اور نماز پڑھی۔ اس پر ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے کیوں اسے وضو کرنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا وہ تہبند لٹکا کر نماز پڑھتا تھا اور اللہ تعالیٰ ٹخنے سے نیچے تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں فرماتا۔

شیخ عبدالحق شرح فارسی مشکوۃ میں فرماتے ہیں: "وظاہر در فہم چناں می آید کہ اسبال ناقض وضو باشد یا موجب کراہیت در آں اما شراح بیان آں چنیں کردہ اند۔" اس حدیث سے ظاہر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ تہبند ٹخنے سے نیچے لٹکانا ناقض وضو ہے یا موجب کراہیت۔ مگر شارحین نے اس کے خلاف اس طرح بیان تاویلیں کی ہیں۔"

حضرات! اب میں مولوی صاحب کی کتاب بہشتی زیور حصہ اول سے ایک بات لکھ دیتا ہوں' جس سے مولوی صاحب کے کلام کی پڑتال بخوبی ہو جائے گی۔ ملاحظہ ہو ص۔۳۵ (عقیدہ)

ایمان جب درست ہوتا ہے کہ اللہ رسول کو سب باتوں میں سچا سمجھے اور ان سب کو مان لے۔ اللہ رسول کی کسی بات میں شک کرنا یا اس کو جھٹلانا یا اس میں عیب نکالنا یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا ان سب باتوں سے ایمان چلا جاتا ہے۔

اب انصاف فرمایئے مولوی صاحب کے ایمان کا کیا حال ہے؟ آیا رہا یا گیا؟

حضرات! یہ مذہبی عصبیت و حمیت کا اصل ثمرہ ہے۔ یہاں تک مولانا محدث سامرودی کا فرمان ختم ہوا۔

اب بندہ عرض کرتا ہے کہ اگر اسی کے موافق بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر کوئی احادیث' حدیث نبوی کی بیجا تضعیف اور تکذیب کرتے تو پھر اس کو کیا کہا جائے' میرے خیال میں تو یہی کہنا مناسب ہے۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

حاصل کلام یہ کہ وضو کے بعد گناہ کبیرہ کرنے سے خواہ وہ زبان سے ہو یا ہاتھ وغیرہ سے کھانے میں یا پینے میں سب سے وضو فاسد ہو جاتا ہے۔ فقط

خادم عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی مورخہ یکم و ۱۵ شعبان و یکم رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۳ھ

حقہ و سگریٹ نوشی سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

ایک فتویٰ پر تعاقب

اخبار الاعتصام (۲۳ مئی سنہ ۱۹۷۳ء) میں ایک سوال کے جواب میں فتویٰ شائع ہوا ہے کہ حقہ نوشی اور سگریٹ پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس بارہ میں قرآن و حدیث میں کوئی صراحت نہیں آئی۔ تاہم حقہ و سگریٹ نوش کے لیے مسجد میں آنے کی ممانعت کر دی ہے۔ اس حدیث کی بنا پر جس میں لہسن و پیاز کھا کر مسجد میں آنے کو بوجہ بدبو منع فرمایا گیا ہے۔

لیکن اگر مولانا عفیف اس "قیاس" کو کچھ ذرا عام فرما دیتے تو حقہ و سگریٹ نوشی سے وضو ٹوٹنے کا حکم اچھی طرح برآمد ہو جاتا۔ جس طرح "اجتہادی" طور پر مسجد میں

جانے کی ممانعت کا حکم برآمد ہوا ہے۔ اب بندہ عارف حصاری عرض کرتا ہے کہ تمباکو نوشی سے وضو فاسد ہو جاتا ہے جس کی تین وجہ ہیں۔ اول یہ کہ حقہ اور سگریٹ میں آگ ہوتی ہے جن کو منہ میں رکھ کر کھینچ کر ان کا دھواں پیا جاتا ہے۔ ان احادیث متداولہ کی رو سے جن میں آگ سے پکی ہوئی چیزوں کے کھانے پینے کی وجہ دوبارہ وضو کرنے کا حکم ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کی تین احادیث منتقی الاخبار مع نیل الاوطار جلد اول' ص-۲۰۸ میں وارد ہیں جن سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ جس چیز کو آگ پکائے اس کو کھانے پینے سے وضو کرنا واجب ہے جبکہ نماز فریضہ ادا کرنی ہو۔

چنانچہ علامہ شوکانی عالم ربانی ان احادیث پر اپنی شرح میں یہ لکھتے ہیں:

والاحادیث تدل علی وجوب الوضوء مما مست النار یعنی "یہ احادیث اس مسئلہ پر دلیل ہیں کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کو استعمال کرنے پر وضو کرنا واجب ہے۔" یہ مسلمہ بات ہے کہ حقہ اور سگریٹ میں آگ ہوتی ہے جس کو حقہ و سگریٹ نوش استعمال کرتے ہیں بلکہ وہ آگ کا دھواں پیتے ہیں جو منہ کے ذریعہ پیٹ میں جاتا ہے تو بموجب ارشاد نبوی کے حقہ نوش کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کو دوبارہ وضو کرنے کا حکم ہے۔ باقی جن فعلی احادیث میں آنحضرت ﷺ کا بعض آگ کی پکی ہوئی چیزوں کو کھا کر وضو نہ کرنا آیا ہے' وہ خاص ہیں اور ان میں آپ کے فعل کا ذکر ہے۔ اس دلیل میں عموم نہیں۔ یہ حدیث قولی ہے جس میں عموم ہے جیسا کہ امام شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا ہے۔

نیز جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث منتقی کے ص-۲۰۰ میں ہے۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ بکری کا گوشت کھا کر وضو کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تو چاہے تو وضو کر لے اور اگر نہ چاہے تو نہ کر۔ پھر اس نے سوال کیا کہ کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کریں یا نہ؟ تو آپ نے فرمایا **نعم توضاء من لحوم الابل** "ہاں اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کرو۔" جب اونٹ کا گوشت کھانا ناقض وضو ہے تو حقہ اور سگریٹ جو سرے سے ہی بدترین اور بدبودار ہیں' ان کے پینے سے وضو کیوں نہ کیا جائے۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں **لان فعله صلی الله علیه وسلم لا یعارض القول**

الخاص بنا ولا ینسخه بل یکون فعله بخلاف ما امر به امراً خاصاً بالامة دلیل الاختصاص به۔ یعنی "آنحضور ﷺ کا فعل قول کے خلاف آجائے تو وہ قول کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ فعل قول کو منسوخ کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ بات ہے کہ امر امت کے لیے خاص ہے اور فعل آنحضرت ﷺ سے خاص ہے۔" پھر فرماتے ہیں ھذہ مسئلة مدونة فی الاصول مشهورة کہ "یہ مسئلہ تو علم اصول میں مدون ہے اور نہایت مشہور ہے۔" پھر اس پر مزید بحث کی ہے۔ تمباکو نہ یہ کہ صرف آگ پر پکا ہوا نوش کیا جاتا ہے بلکہ تمباکو پینا عین آگ ہی کا ہونا بصورت دھواں ہوتا ہے۔ جس کے حرام ہونے کی بھی ایک یہ دلیل ہے کہ آگ اور اس کا دھواں کھانا حرام ہے کیونکہ مضر ہے اور مضر اشیاء میں اصل حرمت ہے تو حقہ حرام ہے۔ یہ دوسری وجہ وضو کے ناقض ہونے کی ہے کہ حقہ سگریٹ پینا حرام اور گناہ ہے۔

پھر حقہ نوش کو بوجہ بدبودار چیز کھانے سے مسجد میں جانا منع ہے تو پھر اس کو نماز پڑھنا بطریق اولیٰ منع ہے۔ کیونکہ نمازی جب نماز میں قرآن پڑھتا ہے تو فرشتہ اس کے منہ پر منہ رکھ کر قرآن کو اپنے پیٹ میں داخل کرتا ہے۔ اس لیے آنحضور ﷺ نے یہ حکم دیا فطهروا افواهكم للقرآن۔ (ترغیب ج۱، ص۱۴۷) "کہ قرآن کے لیے اپنے مونہوں کو پاکیزہ کرو۔" پس جس شخص نے وضو کے بعد سگریٹ اور حقہ حرام پی کر اپنا منہ ناپاک کیا وہ نہ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ اول مسواک سے منہ پاک کرے پھر وضو کرے تب مسجد میں جائے اور نماز پڑھے۔

تیسری وجہ وضو فاسد ہونے کی یہ ہے کہ حقہ پینا، سگریٹ پینا حرام ہے۔ کیونکہ ایک تو اس میں تبذیر ہے، دوم تفتیر ہے، سوم بدبودار ہے، چہارم آگ اور دھواں کھانا پینا حرام ہے۔ جب حرام ہے تو اس کا استعمال گناہ کبیرہ ہے۔ وضو کے بعد جو شخص کبیرہ گناہ کرے تو اس کا وضو فاسد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد بمعہ عون المعبود ج۱، ص۲۴۳ میں حدیث ہے کہ ایک شخص کو آنحضرت ﷺ نے مسبل ازار ہو کر نماز پڑھتے دیکھا تو اس کو یہ فرمایا اذهب فتوضا کہ "جاؤ وضو کرو۔" وہ اسی طرح گیا اور وضو کر کے آیا تو پھر اس کو حکم دیا اذهب فتوضا "کہ جاؤ وضو کرو" پھر وہ آیا تو فرمایا

کہ مسبل ازار کی نماز قبول نہیں ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ وضو کے بعد گناہ کرنا مفسد نماز ہے اور مفسد وضو ہے۔

تفسیر در منثور ج-۶، ص-۹۴ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو شخصوں نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھی۔ وہ دونوں روزہ دار تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے نماز پوری کر لی تو ان دونوں کو یہ حکم فرمایا، **اعیدا وضوء کما صلوتکما وامضیا فی صومکما واقضیا یوم آخر مکانه**۔ یعنی "تم دونوں وضو اور نماز کا اعادہ کرو اور روزہ جاری رکھو لیکن دوسرے دن اس کی قضا دو۔" انھوں نے کہا کہ یارسول اللہ! کیا بات ہو گئی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا **قد اغتبتما فلانا** کہ تم دونوں نے باہم فلاں شخص کی غیبت کی ہے۔ اس دلیل سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ کسی مومن کی غیبت کرنا کبیرہ گناہ ہے جو عبادت کو ضائع کر دیتا ہے۔ دوسرا یہ ثابت ہوا کہ وضو اور نماز کبیرہ گناہ سے باطل ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کا وقت باقی ہو تو ان کا اعادہ کرنا چاہیے۔

پس ان احادیث سے یہ ظاہر ہوا کہ گناہ کبیرہ کرنے سے وضو باطل ہو جاتا ہے۔ حقہ اور سگریٹ پینا کبیرہ گناہ ہے۔ جس کے دلائل اپنے مقام پر موجود ہیں۔ تو گناہ کے بعد وضو کا اعادہ ضروری ہے کیونکہ جس طرح ظاہری نجاست سے پاک ہو کر عبادت نماز ادا کرنے کا حکم ہے۔ اگر نجاست بدن یا کپڑے پر لگی ہو تو نماز نہ ہو گی۔ اسی طرح باطنی نجاست سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ وضو سے گناہوں کا غسل ہو جاتا ہے۔ تب نماز ادا کی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب انسان وضو کرتا ہے **خرجت خطایاه من جسده** یعنی "اس کے گناہ اس کے بدن سے نکل جاتے ہیں۔" دوسری روایت میں ہے **یغسل الخطایا غسلا** کہ وضو گناہوں کو دھو دیتا ہے۔ تیسری روایت میں ہے **انصرف من خطیئة کیوم ولدته امه** کہ "متوضی گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن ماں نے اس کو جنا تھا۔" خلاصہ کلام یہ ہے کہ حقہ سگریٹ نوش کرنے سے وضو فاسد ہے۔ اس کا اعادہ ضروری ہے۔ یہ میری تحقیق ہے۔ اگر مفتیان لاہور اس کو منظور نہ کریں تو ان کی مرضی ہے، نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔

عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاعتصام لاہور جلد-۲۵، شمارہ-۴۸ مورخہ ۲۸ر جون سنہ-۱۹۷۴ء

مسجد کے مسائل واحکام

مسجد زمین کا بہترین قطعہ ہے: حدیث جبرائیل میں ہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے خیر البقاع بیوت اللّٰہ فی الارض (طبرانی) یعنی بہتر مقام زمین میں اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں خیر البقاع المساجد یعنی بہترین مقامات مسجدیں ہیں۔

مسجد اللہ تعالیٰ کا محبوب مقام ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احب البلاد الی اللّٰہ تعالٰی مساجدھا یعنی شہروں میں سب سے زیادہ محبوب جگہ نزدیک اللہ کے مسجدیں ہیں۔ (رواہ مسلم)

مسجد کو تعمیر کرنے والے مومن ہیں: قرآن سورہ توبہ میں ہے انما یعمر مساجد اللّٰہ من امن باللّٰہ والیوم الاخر واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللّٰہ فعسٰی اولٰئک ان یکونوا من المھتدین○ مسجدوں کو صرف وہی لوگ تعمیر اور آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور دن آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نمازیں قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ تحقیق وہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔

مسجد تعمیر کرنے والے اولیاء اللہ ہیں: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول ان عمار بیوت اللّٰہ ھم اھل اللّٰہ عزوجل رواہ الطبرانی فی الاوسط (ترغیب) یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' آپ فرماتے تھے کہ مسجدوں کو تعمیر کرنے والے اولیاء اللہ ہیں اور اہل اللہ ہی اولیاء اللہ ہیں۔

فتح البیان میں ہے کہ تعمیر مساجد یعنی مسجد بنانا اس میں امور داخل ہیں۔ ترمذی میں حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ کوئی شخص مسجدوں کی خبرگیری کرتا ہے تو تم سب مسلمان گواہی دو کہ وہ مومن ہے اس لیے کہ تحقیق اللہ نے فرمایا کہ مسجدوں کو مومن ہی آباد کرتے ہیں۔

مسجد بنانے کی فضیلت: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے کہ من بنی لِلّٰہِ مسجدا بنی اللّٰہ لہ بیتا فی الجنۃ (بخاری مسلم) یعنی جس شخص نے اللہ کی رضامندی کے لیے مسجد بنائی' اللہ تعالیٰ اس کے لیے بہشت میں گھر بنائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ہے من بنی لِلّٰہِ مسجدا یذکر فیہ بنی لہ بیتا فی الجنۃ (رواہ ابن ماجہ' ابن حبان) یعنی جس نے اللہ کے لیے مسجد تعمیر کی کہ اس میں اس کا نام لیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور دیگر اکابر صحابہ ابوذر' عبداللہ بن عمرو' انس' ابن عباس' عائشہ' ام حبیبہ' عمرو بن عبسہ' واثلہ بن اسقع' ابوہریرہ' جابر' معاذ' عبداللہ بن ابی اوفیٰ' ابن عمر' ابوموسیٰ' ابوامامہ' اسماء بنت یزید' رافع بن خدیج' عمران بن حصین وغیرہم رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے اور یہ حدیث مشہور ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے مسجدیں بناتے ہیں' ان کے مکانات بہشت میں تیار ہو جاتے ہیں۔

<u>مسجد بنانے کی کم از کم مقدار:</u> حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من بنی لِلّٰہِ مسجدا قدر مفحص قطاۃ بنی اللّٰہ لہ بیتا فی الجنۃ (بزار' طبرانی' ابن حبان) یعنی جس نے اللہ کے واسطے قطاۃ پرندہ کے گھونسلہ برابر بھی مسجد بنائی' اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھی جنت میں گھر بناتا ہے۔

پرندہ کے گھونسلہ کے اندازہ کا یہ مطلب ہے کہ یشترک جماعۃ فی بناء مسجد فیقع حصۃ کل واحد منھم ذالک القدر (نیل الاوطار) یعنی جب مسلمانوں نے مسجد کی تعمیر مشترکہ طور پر اجتماعی صورت میں شروع کی اور ہر ایک کے حصہ میں پرندہ کے گھونسلے کے برابر جگہ آئی تب بھی ہر شخص حصہ دار کے لیے جنت میں گھر بنایا جائے گا سو یہ ایک دو اینٹ دینے یا لگانے سے بھی میسر ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں یہ ہے من بنی للّٰہ مسجدا صغیرا کان او کبیرا بنی اللّٰہ لہ بیتا فی الجنۃ یعنی جس نے اللہ کے واسطے مسجد بنائی چھوٹی یا بڑی اس کے واسطے جنت میں محل تیار ہو گا۔

<u>مسجد بنانے والوں کے مکانات کیسے ہوں گے؟:</u> حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا من بنی للہ مسجدا بنی اللہ لہ بیتا اوسع منہ (ترغیب) یعنی جس شخص نے اللہ کے لیے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے واسطے جنت میں بہت وسیع محل بنائے گا۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم مسجد بنا رہے تھے آنحضرت ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور سلام فرمایا اور کھڑے ہو کر یہ ارشاد فرمایا کہ من بنی مسجدا یصلی فیہا بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ افضل منہ (ترغیب) یعنی جس نے مسجد بنائی تاکہ اس میں نماز پڑھی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے واسطے اس سے بہترین اور افضل ترین گھر بنائے گا۔ (افضل کا مطلب نیل میں یہ ہے کہ ان فضلہ علی بیوت الجنۃ کفضل المسجد علی بیوت الدنیا فتذکر) یعنی اول تو جنت کی زمین اس زمین سے بہتر ہے کہ یہ ساتوں زمین جنت کے ایک کوڑا کی جگہ' ایک بالشت جگہ کی قیمت سے بھی کم ہیں اور برابری نہیں کر سکتی۔ پھر یہ تو مٹی کے مکان ہیں اور وہ سونا' چاندی اور موتیوں کے ہوں گے۔ بہرحال جنت کا مکان دنیا کے مکان سے ہر طرح بہتر اور افضل ہو گا۔

چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے من بنی بیتا یعبد اللہ فیہ من مال حلال بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ من در ویاقوت (ترغیب) یعنی جس شخص نے ایسا گھر بنایا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور وہ مال حلال طیب سے بنایا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے موتی اور یاقوت کا محل بنائے گا۔ اس حدیث سے محل کی کیفیت ظاہر ہوئی اور یہ مسئلہ بھی ظاہر ہوا کہ اسی مسجد بنانے کا ثواب ہے جس کو حلال اور طیب مال سے بنایا جائے۔ حرام مال سے مسجد بنائی ہوئی جیسے کنجریاں' بازاری عورتیں' سود خوار وغیرہ لوگ لگا کر بناتے ہیں' تو ایسے لوگوں کو یہ درجات میسر نہیں ہیں اور وہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کا عبادت خانہ بننے کے قابل نہیں ہیں۔ ان میں نمازیں نہ ہوں گی اور نہ ثواب ملے گا کیونکہ حدیث میں ہے ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا یعنی اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور وہ پاک چیز کو ہی قبول فرماتا ہے۔

مسجد صدقہ جاریہ ہے: آنحضور ﷺ نے فرمایا ان مما یلحق المومن من عملہ وحسناتہ بعد موتہ مسجد بناہ (ترغیب) یعنی ان اعمال اور نیکیوں کا ثواب جو مرنے کے بعد بھی مومن کو ملتا رہتا ہے' ایک مسجد کا ثواب ہی ہے جو موت کے بعد بھی ملے گا یعنی

صدقات جاریہ جن چیزوں سے حاصل ہے' ان میں سے ایک مسجد بھی ہے کہ جب تک قائم رہے گی ثواب ملتا رہے گا جیسے مصحف متروکہ موروثہ اور نہر لگا' کنواں' سرائے' ولد صالح' دینی کتب تصنیف کرنا یا شائع کردہ کا ملتا ہے۔

مسجد کی صفائی کرنے والے کا ثواب: بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک سیاہ فام عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ایک دن آنحضور ﷺ نے اس کو نہ دیکھا اور اس کا حال پوچھا (کیونکہ آپ غیب نہ جانتے تھے) تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ مرگئی ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے مجھے خبر کیوں نہ کی؟ پھر آپ اس کی قبر پر تشریف لائے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ دیگر روایات میں ہے کہ وہ مسجد میں سے تنکے' چیتھڑے چنا کرتی تھی۔ کوڑا اٹھایا کرتی تھی' مسجد صاف کیا کرتی تھی۔ اسی کے متعلق آپ نے یہ فرمایا کہ انی رایتھا فی الجنۃ تلتقط القذی من المسجد یعنی میں نے اس کو جنت میں دیکھا ہے کہ وہ مسجد میں سے کوڑا اٹھا رہی ہے۔ اس حدیث سے مسجد کی صفائی کرنے والوں کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

آنحضور ﷺ کا اس کا حال دریافت فرمانا اور اس کی موت پر جنازہ کی خبر نہ دینے پر زجر کرنا اور دوبارہ کئی دنوں کے بعد جنازہ پڑھنا اور پھر اس کو جنت میں دیکھنا' اس کے اس عمل کی فضیلت پر دال ہے پھر اسے جنت میں مسجد کی صفائی کرتے دیکھنا' اس عمل کے افضل ہونے کا ثبوت ہے اور یہ کہ یہ عمل موجب جنت ہے اور مسجد کی صفائی کرنے والے (بشرطیکہ فی سبیل اللہ صفائی کریں) جنتی ہیں۔

مسجد کی صفائی جنتی بیویوں کا مہر ہے: قرآن کریم میں ہے وزوجنا ہم بحور عین کہ ہم نے متقین کا حوروں سے نکاح کر دیا ہے۔ اور حدیث میں ہے واخرجوا القمامۃ منھا کہ تم مسجدوں کی صفائی کرو' کوڑا کرکٹ نکالو واخراج القمامۃ منھا مھور الحور العین اور مسجدوں سے کوڑا نکالنا' صفائی کرنا حور عین کا مہر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو مسجد کی صفائی نہیں کرتے یا کرواتے ان کی حوروں کا مہر ان کے ذمہ ہوگا اور بغیر مہر کے کسی عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا۔

مسجد کی صفائی عظیم الشان عمل ہے: ایک حدیث میں وارد ہے من اخرج اذی من المسجد بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ (ابن ماجہ) یعنی جس نے مسجد سے بری چیز نکال دی' اللہ تعالیٰ اس کے واسطے جنت میں گھر بناتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ فرمایا رسول

اللہ ﷺ نے کہ میرے سامنے میری امت کے ثواب پیش کیے گئے یہاں تک کہ وہ کوڑا بھی جس کو آدمی مسجد سے نکال دے۔ پس اس سے مسجد کی صفائی کا عمل بڑا مقبول ثابت ہوا۔ (ترغیب)

مسجد کے بنانے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کا حکم: سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نتخذ المساجد فی دیارنا وامرنا ان ننظفھا (احمد وترمذی) یعنی ہم کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم اپنے محلوں کی مسجدیں بنائیں اور یہ حکم دیا کہ ان کو صاف ستھرا رکھیں۔

اپنے گھروں میں مسجد بنانے کا حکم: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببناء المساجد فی الدور وان تنظف وتطیب (احمد وترمذی) یعنی ہم کو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ گھروں میں مسجدیں بنائی جائیں اور ان کو صاف وپاک رکھا جائے۔

سڑکوں اور عام گذر گاہوں پر مسجد بنانے کا حکم: ایک حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے حکم فرمایا کہ ابنو المساجد تم مسجدیں بناؤ کیونکہ جس نے مسجد بنائی اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا یہی مسجدیں جو راستوں پر ہیں۔ فرمایا ہاں۔

ہر محلہ میں مسجد بنانے کا حکم: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث مروی ہے کہ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببناء المساجد فی الدور یعنی حکم کیا رسول اللہ ﷺ نے کہ تمام محلوں میں مسجدیں بناؤ۔ دور جمع دار کی ہے اور دار گھر کو کہتے ہیں۔ اس سے ہر گھر میں مسجد بنانے کا معنی بھی لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امام الدنیا فی الحدیث نے اپنی جامع صحیح بخاری میں باب منعقد کیا ہے کہ "باب المساجد فی البیوت" یہ گھروں میں مسجدیں بنانے کا باب ہے۔ پھر عتبان بن مالک کی حدیث لا کر گھر میں مسجد بنانا ثابت کیا ہے اور یہ نقل کیا ہے کہ وصلی البراء بن عازب فی مسجد فی دارہ جماعۃ یعنی براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے گھر کی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھی۔ اور حدیث عتبان رضی اللہ عنہ میں بھی دو رکعت نماز نفل جماعت سے پڑھنا مذکور ہے۔ اس سے گھر میں مسجد بنانا اور اس میں اہل بیت اور

جماعت سے نماز پڑھنا جائز ثابت ہوا۔

اور دوسرا معنی اس حدیث "فی الدور" کا یہ ہے کہ شہروں اور قصبوں کے محلوں میں مسجدیں بناؤ۔ پس ہر محلہ میں مسجد کا ہونا اور اس کا بنانا مشروع اور موجب ثواب ہے۔ چنانچہ دار قطنی باب تکرر المساجد میں یہ روایت ہے انه کان بالمدینة تسعة مساجد مع مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم یسمع اهلها تاذین بلال علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فیصلون فی مساجلهم (الحدیث) یعنی مدینہ منورہ میں بمع مسجد نبوی کے نو مسجدیں تھیں۔ عہد نبوی میں ہر مسجد والے بلال بڑٹڈ کی اذان سنتے اور اپنی اپنی مسجدوں میں نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ مسجد نبوی کے بہت قریب مسجد قبیلہ بنی نجار میں عمرو بن مبذول بڑٹڈ کی مسجد تھی اور دوسری مسجد بنی ساعدہ کی تھی' تیسری مسجد بنی عبید کی تھی' چوتھی مسجد بنی مسلمہ کی تھی' پانچویں مسجد بنی رائج کی تھی جو قبیلہ عبدالاشہل سے تھے' چھٹی مسجد بنی زریق کی تھی' ساتویں مسجد بنی غفان کی تھی' آٹھویں مسجد اسلم کی تھی' نائویں مسجد جھینہ کی تھی۔ اس روایت سے ایک شہر یا ایک قصبہ یا ایک گاؤں میں محلہ وار تکرار مساجد ثابت ہوا۔ ہاں مسجد وہاں بنانا چاہیے جہاں وہ آباد رہ سکے۔ مسجدیں بنا کر خالی چھوڑنا اور محض فخر اور ریا نمود کے لیے مسجدیں بنانا منع ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ لا یرید به رياء ولا سمعة یعنی جنت میں محل اس شخص کے لیے بنایا جائے گا جس نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے اور اس میں عبادت کرنے کرانے کی نیت سے مسجد بنائی اور ریا اور دنیا کی شہرت کا ارادہ نہ کیا اس لیے ہر حدیث میں لفظ "للہ" وارد ہے کہ اللہ کے واسطے مسجد بنائی جائے۔ بہرحال حدیث متذکرہ بالا سے گھروں اور محلوں اور قبیلوں میں نمازیں پڑھنے اور جماعت قائم کرنے کے لیے مسجدیں بنانا مشروع ہے۔

مسجد کو کسی شخص یا قبیلہ کی طرف نسبت کرنا جائز ہے: روایت مندرجہ بالا سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی مسجد کی شناخت کرانے کے لیے کسی شخص یا قبیلہ کی طرف منسوب کرنا جائز ہے۔ چنانچہ مدینہ کی مساجد اسی طرح مشہور تھیں۔ امام بخاری نے اپنی جامع میں ایک باب یوں منعقد کیا ہے "باب هل يقال مسجد بنی فلان" یعنی یہ کہنا جائز ہے کہ فلاں لوگوں کی مسجد ہے۔ پھر اس پر عبداللہ بن عمر بڑٹڈ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ

آنحضرت ﷺ نے گھوڑے دوڑانے کی شرط ٹھہرائی تو ان کی دوڑ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک رکھی۔ اگرچہ مسجدیں سب اللہ کی ہیں مگر کسی اعتبار سے ایسا کہنا جائز ہے۔ جیسے شہر کے اعتبار سے یہ کہا جاتا ہے کہ دہلی کی جامع مسجد' لاہور کی شاہی مسجد' مسجد قبا وغیرہ۔

تمام روئے زمین کی پہلی مسجد کون سی ہے؟: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ صحابہ نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ ای مسجد وضع فی الارض اولا؟ یعنی اے رسول اللہ! زمین میں سب سے پہلی مسجد کون سی بنائی گئی ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "المسجد الحرام" یعنی مسجد حرام' بیت اللہ۔ پھر سوال کیا "ثم ای" کہ پھر کون سی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "المسجد الاقصی" کہ پھر مسجد اقصیٰ بنائی گئی ہے۔ (مشکوٰۃ)

مسجد حرام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اور مسجد اقصیٰ کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے۔ ہر دو کے درمیان چالیس برس فرق رہا (زاد المعاد جلد ۱' ص ۸) مسجد اقصیٰ کی پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کے ذریعے تجدید کی تھی۔

آبادی میں سب سے پہلے مسجد تعمیر کرنی چاہیے: پاکستان میں بہت سے مہاجرین مسلمان ہندو بستیوں میں آ کر آباد ہوئے ہیں اور انہوں نے اب تک وہاں مسجدیں نہیں بنائی ہیں اور بعض لوگ بجائے مسجدوں کے ہندوؤں کے مندروں وغیرہ میں نمازیں پڑھ رہے ہیں اور جمعہ ادا کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ مسجدوں کا حکم نہیں رکھتے۔ یہ اسلام اور ایمان کی کمزوری کا موجب ہے۔ مسجدیں شعار اسلام ہیں' جہاں بھی مسلم آبادی ہو' وہاں فوراً ہی پہلے مسجد بنانی چاہیے۔ ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے اس دنیا میں تشریف لا کر آباد ہوئے تو پہلے مسجد ہی بنائی' یعنی بیت الحرام۔ اس کی پہلی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام کی رکھی ہوئی ہے۔ پھر اس کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا تھا تو یہ دعا فرمائی تھی ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوۃ۔ لفظ بیتک الحرم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد حرام کے اس وقت ظاہری اور باطنی نشانات موجود تھے۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اپنے عہد حکومت میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر شروع کی۔ جس میں جنوں سے کام کراتے رہے اور پھر آپ فوت ہو گئے تو جنوں نے اس مسجد کی تکمیل کی۔ جس کا مفصل

قصہ تفاسیر و تواریخ میں موجود ہے۔

آنحضرت ﷺ کی پہلی مسجد: آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ کے قریب بستی قبا میں رونق افزا ہوئے تو یہاں بھی سب سے پہلا کام جو آپ نے سرانجام دیا وہ تعمیر مسجد کا تھا۔ آپ نے مسجد قبا کی بنیاد رکھی۔ پہلی اینٹ آپ نے رکھی پھر حضرت ابوبکر صدیق نے رکھی پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما نے رکھی۔ پھر دیگر صحابہ کرام نے رکھی۔ پھر تعمیر شروع کر دی۔ یہاں تک پہلی مسجد مکمل ہو گئی جو عہد نبوت کی پہلی مسجد ہے جس کی قبولیت کا حکم لے کر جبرائیل علیہ السلام آیا کہ لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیہ یعنی وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے کہ آپ اس میں قیام فرمائیں۔ اس مسجد میں آپ ہر ہفتہ میں ایک بار تشریف لاتے تھے اور دو رکعت نفل پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ مسجد قبا میں نماز پڑھنا مثل عمرے کے ہے۔ پھر قبا سے مدینہ پہنچ کر بھی آپ نے پہلا کام جو کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے زمین خریدی اور آپ نے صحابہ کرام کی جمعیت میں وہاں مسجد تعمیر کی جو اب تک مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بنیاد بھی آنحضرت ﷺ نے خود رکھی تھی اور پھر تعمیر کرانے میں بھی خود اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمان جہاں قیام کریں' وہاں سب سے پہلے اپنی عبادت اور دین کا مرکز تیار کریں۔ یہ شعار اسلام ہے' جس میں دیگر شعائر اذان' جماعت' قرآن وغیرہ کی اشاعت ہوتی ہے۔

تعمیر مسجد میں اشتراک عمل و تعاون: صحیح بخاری میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک باب تجویز کیا ہے کہ مسجد کی تعمیر میں ایک دوسرے کا تعاون اور مدد کرنا اور معمار اور بڑھئی وغیرہ سے مسجد اور منبر کا کام کرانا چاہیے اور ذکر کیا ہے کہ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم مسجد نبوی بناتے وقت ایک ایک اینٹ اور کوئی دو دو اینٹ اٹھاتے تھے بلکہ خود بنفس نفیس آنحضرت ﷺ اور خلفاء اور صحابہ کرام جو سب داعیان اسلام اور امت کے سردار تھے' مسجد کی تعمیر کا کام کرتے رہے۔ کوئی معمار تھا' کوئی اینٹ ڈھونے کا کام کرتا تھا' کوئی گارا لانے کا' کسی نے زمین خرید کر دے دی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ طلق رضی اللہ عنہ کو مٹی پر رہنے دو' وہ تمہارے لیے مٹی پانی اچھی طرح لاتا ہے۔ ایک حدیث میں یہ ہے کہ آپ نے ایک عورت کو فرمایا تو اپنے غلام بڑھئی کو حکم کر کہ وہ مجھے لکڑی کا منبر بنا دے۔ میں اس پر وعظ

کے لیے بیٹھا کروں گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسجد بنانا کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے بلکہ یہ جماعتی اور اجتماعی کام ہے جو سب مسلمانوں کے اشتراک سے سرانجام پاتا ہے۔ مسجد حرام حضرت آدم علیہ السلام اور ملائکہ نے بنائی اور مسجد اقصیٰ کے بنانے میں جنوں کا اشتراک عمل تھا۔ پھر حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کی معیت اور جبرئیل امین کی رہنمائی میں مسجد حرام کی تعمیر فرمائی۔ پس مسجد جو اللہ کا گھر ہے' اس کے بنانے میں تمام مسلمانوں کا تعاون ضروری ہے۔

مسجد میں نقش و نگار کی ممانعت: مشکوٰۃ میں حدیث ہے عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما امرت بتشیید المساجد قال ابن عباس لتزخرفنھا کما زخرفت الیھود والنصاری (رواہ ابوداؤد) یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مسجدوں کو مزین اور معلا کرنے کا (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں دیا گیا ہوں۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم مسجدوں کی زینت کرنے لگو گے جیسے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے عبادت خانوں کی کی تھی

اس حدیث اور اس کی مثل دیگر احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسجد بالکل سادہ بنانی چاہیے۔ اس میں بیل بوٹے اور نقش و نگار نہ ہونا چاہیے۔ جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسجد سادہ بنائی' جس میں پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے دور حکومت میں اس سادگی کو قائم رکھا پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو متغیر کیا اور بہت وسیع کیا اور پتھر منقش لگائے اور چھت ساگوان کی ڈالی۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا اور طعنہ دینے لگے کہ عہد نبوی میں یہ طریقہ تعمیر نہ تھا مسجد کچی اینٹوں اور کھجور کی شاخوں کی تھی۔ تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انکم اکثرتم وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من بنی مسجد ایبتغی بہ وجہ اللہ بنی اللہ لہ مثلہ فی الجنۃ (بخاری) یعنی تم بہت باتیں بنا رہے ہو۔ میں نے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے مسجد بنائے' اللہ تعالیٰ اس کے لیے ویسا ہی گھر جنت میں بنائے گا یعنی جیسے وہ مسجد تمام شہر اور محلوں سے ممتاز ہو گی' ویسا ہی اللہ تعالیٰ اس کا گھر مشہور اور سب سے ممتاز بنائے گا گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حدیث قولی سے اس کا جواز نکالا اور یہ آپ کا اجتہاد تھا

پس تحقیق یہ ہے کہ ایسی زینت یا ایسے نقش و نگار جنہیں دیکھ کر نمازی کی توجہ ادھر ہو جائے اور خشوع و خضوع جاتا رہے' ممنوع ہے۔ ورنہ محض زینت سفیدی صفائی وغیرہ یا اچھے سے اچھا سامان خرید کر لگانا ممنوع نہیں ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اب مسجدوں کے بارہ میں یہ رسم عام ہو رہی ہے کہ انہیں حد سے زیادہ مزین کیا جاتا ہے۔ رنگ برنگ کے پتھر اور مصالحے لگائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کے بیل بوٹے اور انواع و اقسام کے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں جن پر ہزاروں روپیہ خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ امور ممنوع اور غیر مشروع ہیں۔

یہ بدعت عہد بنو امیہ سنہ ۸۸ھ میں پیدا ہوئی۔ قبطی و رومی کاریگر تھے جنہوں نے صرف قبلہ والی دیوار پر سنتالیس (۴۷) ہزار اشرفی خرچ کر دی تھی۔ (جذب القلوب) ولید خلیفہ نے یہ مسجد چار سال میں بنوا کر مکمل کی تھی پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ سے مل کر بطور فخریہ کہا کہ دیکھئے آپ کے والد کی تعمیر کی ہوئی مسجد اور اس ہماری بنائی ہوئی مسجد میں کتنا نمایاں فرق ہے۔ صاحبزادہ عثمان نے بہت عمدہ جواب دیا کہ میرے والد مرحوم نے مسجد تعمیر کی تھی اور آپ کی یہ عمارت یہود و نصاریٰ کے کنیسوں کی مانند ہے۔ (جذب القلوب باب ہفتم)

حدیث میں مسجد کو زخرف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زخرف کا مطلب مزین اور مطلا کرنے کے ہیں۔ نیل الاوطار میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اذا حلیتم مصاحفکم وزخرفتم مساجدکم فالدمار علیکم یعنی جب تم مصحفوں کو مطلا کرو گے اور مسجدوں میں گلکاری اور نقش و نگار کرو گے تو تم پر ہلاکت وارد ہو گی۔

مسجد کی عمارت زیادہ بلند نہ ہونی چاہیے: ابن ماجہ میں حدیث وارد ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اراکم ستشرفون المساجد کما شرفت الیہود کنائسھا کما شرفت النصاریٰ بیعھا یعنی میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم عنقریب مسجدوں کو بہت بلند بنانا شروع کر دو گے جیسے یہود اور نصاریٰ اپنے کنیسے اور گرجاؤں کو بلند ترین بناتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جیسے گلکاری اور زینت ممنوع ہے' ایسے ہی عمارت کو بلند کرنا بھی ممنوع ہے۔ جس حدیث میں تشیید کا ذکر ہے کہ میں تشیید مساجد کے لیے مامور نہیں ہوا۔ اس تشیید کا معنی نیل الاوطار میں رفع البناء و تطویل عمارت بھی ساتھ ہی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشینگوئی فرمائی تھی کہ تم مسجدوں کو مزین اور بلند کرو گے اور

اس وقت تمہاری دینی حالت بری ہو گی' یہ پوری ہو گئی اور آپ کا معجزہ ظاہر ہوا۔ فان تزویق المساجد والمباھاۃ بزخرفتھا کثر من الملوک والامراء فی ھذا الزمان بالقاھرۃ والشام وبیت المقدس باخذ اموال الناس ظلما وعمارتھم بھا المدارس علی شکل بدیع یعنی مسجدوں میں نقش و نگار کر کے زینت دار کرنا اور پھر ان پر باہم فخر کرنا بادشاہوں اور حاکموں میں رواج پذیر ہے۔ اگر اس زمانہ میں اس کا نظارہ کرنا ہو تو قاہرہ اور ملک شام میں جایئے' وہاں لوگوں پر ظلم اور دباؤ ڈال کر چندے لیتے ہیں اور عجب شکل کے مدرسے اور مسجدیں بناتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات تو علامہ شوکانی نے اپنے زمانہ کی لکھی ہے۔ اب دور حاضر میں تو تمام ممالک میں یہ وبا پھیلی ہوئی ہے۔

مسجدوں پر فخر کرنا ممنوع ہے: مشکوۃ میں حضرت انس بڑٹھ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ من اشراط الساعۃ ان یتباھی الناس فی المساجد یہ علامات قیامت سے ہے کہ لوگ مسجدوں کے بارہ میں فخر کریں گے' یعنی لوگ قرب قیامت کے بڑی بڑی مسجدیں بنائیں گے اور ان کو خوب آراستہ کریں گے اور پھر باہم فخر کریں گے کہ ہم نے ایسی ایسی مسجد بنائی۔ دوسرا کہے گا کہ ہماری مسجد اس سے بہترین ہے۔ اس پر اتنے ہزار روپیہ لگایا گیا ہے اور اس میں یہ یہ خوبیاں ہیں اور کچی اور سادہ مسجدوں کو حقیر سمجھ کر اپنی بلند اور مزین مسجدوں کی تعریف کریں گے۔ یہ گناہ ہے اور علامات قیامت سے ہے۔ اور یہ خبر آپ کی صحیح اور حق ثابت ہوئی۔ چنانچہ آج اس دور میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دیہات' قصبات اور شہروں میں لوگ باہم فخر کر رہے ہیں اور شہرت کے لیے مسجدیں بنا رہے ہیں۔

مسجد کی طرف چلنے والوں کی فضیلت: مشکوۃ میں حدیث وارد ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے بشر المشائین فی الظلم الی المساجد بالنور التام یوم القیامۃ یعنی اندھیرے میں مسجدوں کی طرف چلنے والوں کو خوشخبری دو کہ ان کو قیامت کے دن پورا پورا نور عطا ہو گا۔

نیز ترغیب میں حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد کی طرف چلا جس میں جماعت ہوتی ہے' پس اس کے ایک قدم پر ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے اور دوسرے قدم پر ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ دیارکم تکتب آثارکم یعنی

تم اپنے اپنے گھروں میں ٹھہرے رہو جہاں سے مسجد کو چلو گے تمہارے قدموں کے نشان لکھے جائیں گے۔ اور دیگر حدیث میں یہ ہے کہ جو شخص وضو کر کے مسجد کی طرف چلا اور نماز کا انتظار کیا تو لکھنے والا اس کے ہر قدم کے عوض دس نیکیاں لکھتا ہے۔ پس گھر سے وضو کر کے مسجد کو جانا افضل ہے۔ اور ایک اور حدیث میں ہے کہ فلان الی المسجد فصلی فی جماعۃ غفرلہ یعنی جو مسجد کو آیا اور جماعت سے نماز پڑھی تو وہ بخشا گیا۔

مسجد میں جانا جہاد فی سبیل اللہ ہے: آنحضرت ﷺ نے فرمایا الغدو والرواح الی المسجد من الجہاد فی سبیل اللہ (ترغیب) یعنی صبح اور شام کو مسجد کی طرف جانا جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ یعنی ایسا شخص مجاہد ہے جو جدوجہد کر کے مسجد کی طرف آتا ہے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ المشاؤن الی المساجد فی الظلم اولئک الخواصون الی رحمۃ اللہ تعالی یعنی جو اندھیرے میں مسجدوں کی طرف چلنے والے ہیں وہ رحمت الٰہی میں غوطہ لگانے والے ہیں۔

نمازی اور مجاہد کا ضامن اللہ ہے: حدیث میں ہے تین شخصوں کا اللہ ضامن ہے۔ اگر وہ زندہ رہیں تو ان کو رزق دے اور ہر مشکل میں کام آئے اور اگر مرجائیں تو ان کو جنت میں داخل کرے۔ ایک وہ شخص جو گھر میں سلام کہہ کر داخل ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو روز مسجد کی طرف (نماز پڑھنے کے لیے) جاتا ہے۔ تیسرا وہ جو جہاد کرنے کے لیے نکلا ہے۔ (ترغیب)

نمازی زائرین الٰہی ہیں: آنحضور ﷺ نے فرمایا من توضا فی بیتہ فاحسن الوضوء ثم اتی المسجد فھو زائر اللہ وحق علی المزور ان یکرم الزوار (ترغیب) یعنی جس شخص نے اپنے گھر میں اچھی طرح وضو کیا اور پھر وہ مسجد کو آیا تو وہ اللہ کی زیارت کرنے والا ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں داخل ہوا ہے) اور اس شخص پر جس کی کوئی زیارت کو آئے یہ حق ہے کہ اس کی عزت کرے (پس اللہ تعالیٰ بھی اس زائر نمازی کی عزت کرے گا) پس مسجدوں کے نمازی زائرین الٰہی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس نازک دور میں لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ خانقاہوں میں مردوں کی زیارت کرنے جاتے ہیں اور مسجدوں میں حاضری دے کر اللہ تعالیٰ کی زیارت نہیں کرتے۔

مسجد سے دل لگانے والوں کی فضیلت: حدیث صحیح میں یہ وارد ہے کہ سات شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا ان میں ایک وہ ہے کہ قلبہ معلق بالمساجد یعنی وہ شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہتا ہے یعنی وہ بار بار نماز کے لیے مسجد ہی میں جاتا ہے۔ اور دوسری حدیث میں یہ ارشاد ہے کہ جو شخص مسجدوں میں نماز اور ذکر الٰہی کے لیے رہنا اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر بہت ہی خوش ہوتا ہے اور تیسری حدیث یوں آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "من الف المسجد الفه اللّٰہ" یعنی جس نے مسجد سے محبت کی' اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان کا بھیڑیا ہے۔ تم باہمی اختلاف سے بچو وعلیکم بالجماعة والعامة والمسجد اور جماعت بندی اور عام لوگوں کو اور مسجد کو لازم پکڑو۔ دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ بیشک مسجدوں میں میخوں کی طرح ہروقت گڑے رہنے والوں کے فرشتے ہم نشین ہوتے ہیں۔ اگر وہ غائب ہوتے ہیں تو فرشتے ان کو تلاش کرتے ہیں اور اگر وہ بیمار ہو جاتے ہیں تو فرشتے ان کی عیادت کو جاتے ہیں اور اگر کسی کام میں لگیں تو فرشتے ان کی مدد کرتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں یوں آیا ہے کہ المسجد بیت کل تقی یعنی مسجد ہر متقی شخص کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ اس شخص کی کفالت کرتا ہے جس کا مکان مسجد ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے راحت اور رحمت اور صراط پر سے گذار کر جنت میں پہنچائے گا (ترغیب).

مسجد میں داخلہ کے آداب: مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں قدم پہلے رکھنا چاہیے اور یہ دعا پڑھنی چاہیے۔ بسم اللّٰہ والصلوة والسلام علی رسول اللّٰہ رب اغفرلی وافتح لی ابواب رحمتک اور جب نکلیں تو پہلے بایاں پاؤں مسجد سے نکالیں اور یہ دعا پڑھیں بسم اللّٰہ والصلوة والسلام علی رسول اللّٰہ رب اغفرلی اسئلک من فضلک - ایک حدیث میں داخل ہوتے وقت صرف اللّٰھم انی اسئلک من فضلک - ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے مسجد میں داخل ہونے کے وقت یہ کہا اعوذ باللّٰہ العظیم وبوجهه الکریم وسلطانه القدیم من الشیطان الرجیم تو شیطان کہتا ہے کہ آج تمام دن یہ شخص مجھ سے محفوظ رہا

اور جب مسجد میں داخل ہوں تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھیں۔ بعض

علماء اس کو واجب کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں اس کا حکم وارد ہے۔ فرمایا اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس (مشکوٰۃ) یعنی جب مسجد میں کوئی شخص داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔ اس کا نام تحیۃ المسجد ہے۔ اگر جمعہ کے دن خطبہ ہو رہا ہو تو پھر بھی یہ دو رکعت پڑھ کر خطبہ سنے۔ اگرچہ خطبہ سننا فرض ہے مگر نبی کا حکم ماننا بھی فرض ہے۔ آپ نے خطبہ کی حالت میں بھی ان دو رکعتوں کے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اگر مسجد میں وضو سے داخل ہو تو زیادہ ثواب ہے لیکن بے وضو داخل ہونا بھی جائز ہے مگر بیٹھنا نہ چاہیے۔ اگر بیٹھے گا تو پھر دو رکعت اس سے پہلے پڑھنی لازم ہوں گی' فتذکر۔

مسجد سے محبت کا ثمرہ: بخاری و مسلم کی صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے لیے مہمانی تیار کرتا ہے اور ایک روایت طبرانی میں ہے کہ قیامت کے دن سب لوگ گھبرائیں گے مگر وہ نہ گھبرائے گا اس پر بوجہ محبت مسجد گھبراہٹ نہ ہو گی۔

مسجد جنت کا باغ ہے: مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا یعنی تم بہشت کے باغوں میں گذرو تو خوب میوے کھاؤ۔ آنحضرت ﷺ سے کہا گیا کہ ان کا میوہ کھانا کیا ہے؟ تو فرمایا "سبحان اللہ' والحمدللہ' لا الہ الا اللہ' واللہ اکبر" پڑھنا یعنی ان کلمات کا پڑھنا جنت کے باغوں کے پھل کھانے کا موجب ہے۔ پس مسجدوں میں ذکر الٰہی کرنا چاہیے اور غیر اللہ کے ذکر اور ورد سے بچنا چاہیے۔ ولا تدعوا مع اللہ احدا۔

گوشہ نشینی کی حقیقت: ایک حدیث میں ہے کہ صحابہ نے آنحضور ﷺ سے یہ کہا ائذن لنا فی الترھب فقال ان ترھب امتی الجلوس فی المساجد لا نتظار الصلوٰۃ یعنی آپ ہمیں راہب بننے کا حکم دیجئے۔ تب آپ نے فرمایا کہ میری امت کی رہبانیت مسجدوں میں نماز کے انتظار کے لیے بیٹھنا ہے۔

پس سابقہ امتوں میں جو لوگ دنیا کا شغل اور لذتیں ترک کر کے گوشہ نشینی یا چلہ کشی اختیار کر لیتے تھے اور عبادت کرتے رہتے تھے' میری امت پر یہ تکلیف نہیں ہے۔ ان کا نماز کے لیے مسجدوں میں حاضر ہونا اور انتظار میں بیٹھا رہنا ہی رہبانیت کا مقام ہے۔

نمازی کے لیے فرشتوں کی دعائیں: حدیث میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد کی طرف آیا اور اس نے نماز پڑھی اور پھر وہ نماز کی جگہ پر بیٹھا رہا تو جب تک اس نے کسی مسلمان کو ایذا نہ دی اور بے وضو نہ ہوا تب تک فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور وہ دعا یہ ہے اللّٰھم صل علیہ اللّٰھم ارحمہ (مشکوۃ) اور دوسری روایت میں یہ دعا ہے اللّٰھم اغفرلہ اللّٰھم تب علیہ۔

مساجد میں ممنوع کام: (۱) مسجد میں تھوکنا منع ہے۔ حدیث میں ہے کہ تھوکنا مسجد میں گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس کو دفن کر دینا ہے یا دھو کر صاف کر دینا ہے۔

(۲) گم شدہ چیز مسجد میں ڈھونڈنا اور لوگوں سے دریافت کرنا' پڑتال کرنا ناجائز ہے۔ آنحضور ﷺ نے کسی شخص کو ایسا کرتے سنا تو فرمایا "لا ردھا اللہ علیک" یعنی اللہ تجھے وہ چیز نہ دے کیونکہ مسجدیں ایسے کاموں کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔

(۳) متفرق احادیث سے یہ ثابت ہے کہ بدبودار چیزیں پیاز' لہسن' گندنا مولی کھا کر مسجد میں آنا منع ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بدبودار چیزیں کھانے والے ہماری مسجدوں میں نہ آئیں۔ وہ اپنے گھر بیٹھے رہیں کیونکہ جس سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے' فرشتوں کو بھی ایذا ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی خلافت میں یہی حکم نافذ کیا اور یہ فرمایا لقد رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا وجد ریحھما من الرجل فی المسجد امر بہ فاخرج الی البقیع (مسلم' نسائی' ابن ماجہ) یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ کسی آدمی سے مسجد میں پیاز' لہسن کی بدبو پاتے تو اس کو نکال دینے کا حکم فرماتے اور وہ بقیع کی طرف نکالا جاتا۔ بروئے قرآن مسجد سے کسی کو روکنا اور نکالنا بڑا ظلم ہے لیکن مسجد کے احترام اور نمازی لوگوں اور فرشتوں کی ایذا کو مدنظر رکھتے ہوئے نکالنا ضروری ہے کہ جو شخص کوئی بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آئے' اس کو نکال دیا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ سگریٹ نوش اور حقہ باز کا بھی یہی حکم ہے۔ چنانچہ حدیث الغاشیہ کے ص ۱۳۰ میں ہے مسجد میں پیاز' لہسن' گندنا وغیرہ بدبودار چیز کھا کر آنا منع ہے لیکن نام کے وہ مسلمان جو حقہ پیتے ہیں' ان کا منہ گویا سنڈاس ہو جاتا ہے۔ وہ مسجد میں آکر اپنی بدبو سے پاس کھڑے ہونے والوں کو سخت ایذا پہنچاتے ہیں۔ بعضے شرابی گنجیڑی بھنگیڑی بھی نماز پڑھتے ہیں' الخ۔

آج حقہ نوشی کی وبا بکثرت پھیلی ہوئی ہے اور اکثر نمازی ایسے ہی مسجدوں میں آتے ہیں۔ پس خواہ فرشتوں اور متقی نمازیوں کو مسجدوں سے نکال دو خواہ حقہ بازوں کو' دونوں فریقوں کو ایک مسجد میں جمع رکھنا جائز نہیں ہے۔ لیکن فرشتوں اور متقی نمازیوں کو نکالنا ظلم عظیم ہو گا اور مسجد کا احترام نہ رہے گا اس کی بے حرمتی ہو جائے گی اور وہ خراب ہو جائیں گی۔ حقہ بازوں کو نکال دینا چاہیے۔ (فتاویٰ عبدالحی جلد-۲' ص-۱۴۷)

(۴) مسجد میں دنیا کے جھگڑے کرنا اور باتیں کرنی ممنوع ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آخر زمانہ میں ایسے لوگ ہوں گے جن کی باتیں مسجدوں میں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ (ترغیب) اب مسجدوں میں ادھر ادھر کی باتیں دنیا کی ہو رہی ہیں۔ قصے کہانیاں اور ہر جگہ کے اخباروں کا عام طور پر ذکر ہو رہا ہے۔ یہ فتنہ علامات قیامت سے ہے۔

(۵) مسجد کو رستہ نہ بنایا جائے اور نہ اس میں ہتھیار نکالا جائے اور نہ کمان چڑھائی جائے اور نہ پتھر پھیلائے جائیں اور نہ کچا گوشت لے کر اس سے گزرا جائے اور نہ اس میں حد ماری جائے اور نہ قصاص لیا جائے اور نہ بازار بنایا جائے۔ مسجد میں خرید و فروخت کرنی منع ہے۔

(۶) مسجد میں نماز کے لیے آئے تو انگلیوں میں تشبیک نہ کرے۔ آپ نے کعب رضی اللہ عنہ کو اس حرکت سے منع فرمایا تھا۔

(۷) خلاف شرع اشعار' شرکیہ' بدعیہ' عشقیہ' قصے کہانیاں مسجد میں پڑھنے بالکل منع ہیں۔

(۸) حائضہ عورت اور جنبی شخص کو مسجد میں داخل ہونا اور وہاں رہنا ممنوع ہے۔

(۹) حدیث میں ہے کہ جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وشراءکم وبیعکم وخصوماتکم ورفع اصواتکم واقامة حدودکم وسل سیوفکم یعنی اپنی مسجدوں کو بچوں اور دیوانوں سے بچاؤ اور خرید و فروخت اور جھگڑوں اور آواز بلند کرنے اور حدیں قائم کرنے اور تلواریں کھینچنے سے محفوظ رکھو۔ (ترغیب)

اور یہ حکم دیا کہ دروازوں پر طہارت خانے بناؤ اور جمعہ کے دن خوشبو روشن کرو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں یہ حکم دیا تھا کہ ہر شہر کی مسجدوں میں خوشبو کی دھونی دی جائے۔ (زاد المعاد) مسجد میں خصومات کے فیصلے کرنے تو جائز ہیں لیکن آپس کے جھگڑے' بیہودہ بکواس' شور و شغب جائز نہیں ہے۔

(۱۰) مساجد میں ذاتی کام سرانجام دینا مثلاً دستکاری' صنعت' حرفت وغیرہ جائز نہیں ہے۔
(نووی شرح مسلم ج۱' ص-۲۱۰ نیز تفسیر جمل ج-۴' ص-۲۲۲)

سفر سے واپسی پر مسجد میں حاضری: مشکوٰۃ میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فاذا قدم بدا بالمسجد فصلی فیه رکعتین ثم جلس فیه یعنی جب آپ سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد میں جاتے تھے اور اس میں دو رکعت پڑھ کر بیٹھا کرتے تھے۔
اس سے ظاہر ہوا کہ مسافر سفر سے واپس آئے تو اس کے لیے سنت یہ ہے کہ پہلے مسجد میں حاضری دے اور وہاں نماز پڑھے۔ مگر مسجد کی یہ برکات وہی حاصل کر سکتا ہے جس کو مسجد سے محبت ہو' دوسرے کو یہ فیوض میسر نہیں ہو سکتا۔
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی دستور رہا کہ جب وہ سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد میں جاتے اور دو رکعت نماز ادا کرتے پھر گھروں میں جاتے۔ اس سے مسجد کی عزت و عظمت ظاہر ہوتی ہے کہ اپنے گھروں سے مسجد کو مقدم رکھا جائے اور وہاں پہلے حاضری دی جائے۔

اعتکاف کے لیے مسجد شرط ہے: حدیث میں ہے کہ لا اعتکاف الا فی مسجد جامع یعنی اعتکاف مسجد جامع کے بغیر نہیں ہے۔ اس کی تاکید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے ولا تباشروھن وانتم عاکفون فی المساجد یعنی تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو عورتوں سے ملاپ نہ کرو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ ہمیشہ مسجد میں اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔

مسجد میں جنازہ: حدیث میں ہے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ واللہ لقد صلی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی ابنی بیضاء فی المسجد سھیل واخیه (رواہ مسلم) یعنی اللہ کی قسم! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دو بیٹوں سہیل اور اس کے بھائی کا جنازہ مسجد میں پڑھا تھا پس جنازہ مسجد میں جائز ہے۔

مساجد کے درجات: تمام مساجد کا یکساں حکم نہیں ہے۔ سب کے درجات میں تفاوت ہے۔ مسجد حرام سب سے افضل ہے۔ اس میں ایک نماز کا ثواب لاکھ نماز کے برابر ہے۔ دوسرا نمبر مسجد اقصیٰ کا ہے' اس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نماز کے برابر ملتا ہے۔ تیسرا نمبر مسجد نبوی کا ہے' اس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نماز کے برابر ہے۔ چوتھا نمبر مسجد قبا کا

ہے' اس میں نماز پڑھنا مثل عمرہ کے ہے۔ پانچواں نمبر ہر مسجد جامع کا ہے' اس میں ایک نماز کا ثواب پانچ سو نماز کے برابر ہے۔ چھٹا نمبر محلہ کی مسجد کا ہے' اس میں ایک نماز کا ثواب پچیس نماز کے برابر ملتا ہے۔ مسجد کے ہنوز مسائل تو بہت باقی ہیں لیکن مضمون پہلے ہی زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اسی پر کفایت کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام مسلمانوں کو عمل کی توفیق بخشے۔ (آمین)

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

اہل حدیث سوہدرہ جلد ۹' شمارہ ۱۳ مورخہ یکم اپریل سنہ ۱۹۵۷ء

کیا مسجد کو اللہ کا گھر کہنا جائز نہیں؟

سوال: کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ ایک شخص سکول ماسٹر یہ کہتا ہے کہ مسجدوں کو اللہ کا گھر نہ کہو' یہ کہنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ اس میں سکونت نہیں رکھتا۔ گھر وہ ہوتا ہے جس میں کوئی سکونت اور قیام رکھے۔ جب اللہ کا قیام اور سکونت اس میں نہیں تو اس کا گھر نہ ہوا؟

الجواب ھو الموفق للصواب۔ الحمد للہ رب العالمین۔ اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔

واضح ہو کہ اسکولوں کے ماسٹر اور عدالتوں کے حکام اکثر انگریزی خواں' اسلامی تعلیم قرآن و حدیث سے بالکل جاہل ہوتے ہیں۔ اور مغربی تعلیم و تربیت کا ان کے دماغوں پر اثر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خلاف احکامِ شریعت محض اپنی خواہشات نفسانیہ کی بناء پر کام کرتے ہیں اور رائے و قیاس نفسانی سے کام لے کر عوام سے اور اپنے زیر اثر طلباء سے جاہلانہ گفتگو کرتے ہیں۔ حکومت اسلامیہ قائم نہ ہونے کا سبب بھی بعض ملحد لوگ ہیں۔ نہ یہ قرآن و حدیث کے احکام سے واقف ہیں اور نہ اسوہ حسنہ رسول اللہ ﷺ سے متعارف ہیں۔ ان کے دلوں پر طاغوتی تاثرات ہیں۔ اس لیے یہ لوگ اصل احکام کتاب و سنت سے اور علماء اسلام سے اور متدین اور متشرع لوگوں سے متنفر رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے حتی الوسع دور رہنے کی کوشش کریں۔ اس تمہید کے بعد ماسٹر جی کے خیالات فاسدہ کا مختصر جواب عرض کر رہا ہوں۔ تفصیل کے لیے فرصت نہیں ہے۔

مسجدوں کو اللہ تعالیٰ کا گھر کہنا جائز اور درست ہے۔ چنانچہ مسجد حرام جو تمام مساجد کی سردار ہے' اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا گھر فرمایا ہے۔ قرآن مجید سورہ بقرہ میں ہے وعهدنا الی ابراهیم واسمعیل ان طهرا بیتی للطآئفین والعاکفین والرکع السجودO اور حکم بھیجا ہم نے طرف ابراہیم اور اسماعیل کے کہ پاک رکھو گھر میرے کو واسطے طواف کرنے والوں کے اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رکوع سجود کرنے والوں کے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو اپنا گھر فرمایا ہے۔ اس لیے اس کو تمام مسلمان بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر کہتے ہیں۔ اور یہ نام منصوص ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ملت کے بانی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا قرآن میں مذکور ہے ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوۃ (الآیہ' سورہ ابراہیم۵) یعنی اے ہمارے رب! بیشک میں اپنی بعض اولاد (اسماعیل) کو اس ناقابل زراعت میدان میں "تیرے محترم گھر" کے پاس آباد کرتا ہوں تاکہ وہ نماز کو قائم کریں۔

اس دعا میں حضرت خلیل اللہ نے کعبۃ اللہ کو اللہ کا گھر قرار دیا ہے۔ اس لیے اس کو بیت اللہ کہتے ہیں۔ حالانکہ وہاں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک قیام اور سکونت نہیں رکھتی' وہ اس سے پاک ہے۔ پس یہ اضافت تعظیمی اور تشریفی ہے۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قرآن میں "ناقة الله" کہا گیا ہے۔ حالانکہ تمام اونٹنیاں اور کل جانور اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "روح الله" کہتے ہیں۔ حالانکہ تمام جان داروں کی روحیں اللہ تعالیٰ ہی کی بھیجی ہوئی ہیں۔ ایسا ہی خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں کہ وہ خاص کسی کا ملک نہیں ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ اور وہاں اس کی فیضان رحمت ہے۔ اس خصوصیت سے اس کو بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر کہتے ہیں۔ اسی طرح مساجد کو حدیث میں اللہ کا گھر کہا گیا ہے۔ چنانچہ کنزالعمال جلد-۴' ص-۲۴۳ میں ہے المساجد بیوت الله وقد ضمن الله لمن کانت المساجد بیته بالروح والراحة والجواز علی الصراط الی الجنة یعنی مسجدیں اللہ کا گھر ہیں اور یہ جن کا گھر ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مہمانی' آرام اور پل صراط سے گذار کر جنت میں پہنچانے کی ضمانت لی ہے۔

اس حدیث میں مسجدوں کو اللہ تعالیٰ کا گھر فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ مسجدیں خاص اللہ کے نام

پر بنائی گئی ہیں اور ان میں اس کی عبادت کی جاتی ہے اور خاص رحمت کا فیضان ہے۔ اس لیے تعظیما و تشریفا اضافت کر دی جاتی ہے کہ یہ اللہ کے گھر ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ مسجد کی چار دیواری میں انسانوں کی طرح سکونت رکھتا ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کیونکہ لیس کمثلہ شیئی اس کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق سے جدا عرش معلی پر بلا کیف مستوی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔ پس ماسٹر کا قول باطل ہے اور مسجدوں کو اللہ کا گھر کہنا جائز اور درست ہے۔ اسی طرح مسجد اللہ یا مساجد اللہ یعنی اللہ کی مسجدیں کہنا بھی روا ہے۔ جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ وہاں رکوع، سجدہ اور نماز وغیرہ نہیں پڑھتا۔ انسان نمازیں پڑھتے ہیں۔ مسجدیں اللہ کا ملک ہیں اور وہاں خاص اسی کی عبادت ہوتی ہے۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی جلد۔۳۳، شمارہ۔۲۳، مورخہ ۱۵ ذوالحجہ سنہ ۷۴ھ

مسجد کا رخ کعبہ ہونا چاہیے یا سمت کعبہ؟

سوال: مسجد تعمیر کرتے وقت مسجد کا رخ سمت کعبہ ہونا چاہیے یا کعبہ عین فرض ہے؟ کیونکہ یہاں پر مسجد تعمیر ہونی ہے' کعبہ رخ میں الجھن ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ سمت کعبہ ہونا چاہیے' کچھ کہتے ہیں کعبہ عین فرض ہے۔ آپ اس پر روشنی ڈالیے۔ جواب سے جلد از جلد سرفراز فرمائیں اور حضرت امام صاحب سے دریافت فرما کر تحریر کریں تاکہ مسجد کی تعمیر شروع کی جائے۔

جمعدار مرزا عبدالقدیر بیگ لاہور

جواب: حدیث شریف میں اہل مدینہ کو آپ نے یہ فرمایا کہ مابین المشرق والمغرب قبلة یعنی تمہارے لیے مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے یعنی مشرق اور مغرب کے درمیان جہت قبلہ کو متوجہ ہو جاؤ۔

جب دونوں کے درمیان قبلہ بتلایا تو وسط کو لے لینا چاہیے' یہ حکم اہل مدینہ کو تھا۔ اہل عراق و خراسان کا قبلہ جنوب و شمال کے درمیان تھا۔ اسی طرح ہماری سمت ہے کہ ہم مشرق اور مغرب کے درمیان ہیں تو ہمارا قبلہ جنوب شمال کے درمیان مغرب کی طرف ہے۔ ہم کو وسط کا خیال کرنا چاہیے۔ باقی بیت اللہ تو ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ جو شخص اس کے پاس ہو گا اس کو تو عین بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اور جو دور ہو کر اس سے غائب ہو گا اس کو صرف سمت اور جہت کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ عین قبلہ تو کسی کے سامنے نہیں آسکتا' یہ محال ہے۔ یہ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ جہاں نماز کھڑی ہے' وہاں سے قبلہ عین اس کی پیشانی کے سامنے واقعہ ہے؟ ہاں سب جہت کا اندازہ رکھتے ہیں۔ پس آپ صاحبان وسط کا اندازہ کر کے جنوب شمال کے درمیان مسجد تعمیر کر دیں کہ مغرب کی طرف قبلہ رخ ہو۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری۔ فتاویٰ ستاریہ نمبر۔۴' ص۔۱۲۸

کیا صاحب اہل و عیال حجرہ مسجد کے بالاخانہ کو آباد کر سکتا ہے؟

سوال: انقلاب سے پہلے ایک مسجد موجود تھی اور اس مسجد کے پاس ہندو کی متروکہ سفید زمین تھی' جس کو ایک مسلمان نے کارخانہ کی خاطر الاٹ کرا لیا اور ہم نے اس مسلمان سے مسجد کی خاطر کچھ زمین طلب کی اور اس نے تھوڑی سی زمین دے دی اور ہم نے اس زمین پر ایک حجرہ تعمیر کر لیا تاکہ مستورات جمعہ کی نماز ادا کریں اور مسجد کا ضروری سامان اس میں رکھا جائے اور طالب علم اور مسافر اس میں ٹھہر سکیں۔ اب جماعت نے متفقہ رائے سے امام کی رہائش کی خاطر اس حجرہ کی چھت پر مکان تعمیر کر لیا ہے اور امام صاحب کی رہائش کرا دی ہے۔ امام صاحب متاہل ہیں۔ اب مسئلہ قابل دریافت یہ ہے کہ امام صاحب کی رہائش اس پر جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب: حجرہ پر امام مسجد یا خادم کے لیے مکان بنانا درست ہے بلکہ مسجد پر یا مسجد کے اندر بھی کسی طرف امام یا خادم کے لیے مکان بنانا درست ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خادم مسجد نبوی کے لیے مسجد نبوی میں حجرہ بنایا تھا۔ اس کا رہنا سہنا وہیں تھا۔ (جامع ترمذی ص-۴۳) نیز صفحہ-۲۷ میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے بعض مسجد میں بعض لوگوں کے فائدہ کے لیے خیمہ لگوا دیا تھا' وہ مدت تک اس میں رہے۔

الغرض اندرون مسجد یا تحت مسجد یا بالائے مسجد کوئی مکان بنانا مسجد کی مصلحت کے لیے تو یہ درست اور جائز ہے۔ حجرہ پر مکان بنانے کے جواز میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ ھذا ماظھر لی والعلم عنداللہ وعلمہ اتم۔

کتبہ عبدالقادر حصاری غفرلہ الباری۔

فتاوٰی ستاریہ جلد چہارم ص-۱۸۵

کیا مسجد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتی ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و شریعت اسلام کہ چھوٹے گاؤں میں جس کی آبادی پچاس گھروں کی ہے' اس میں ایک مسجد ہے۔ وہ مسجد گاؤں کے عین درمیان میں واقع ہے لیکن ملک کے دستور کے مطابق ہر گھر اپنی حفاظت کے واسطے عام پناہ کے طور پر کانٹوں کی بڑی باڑ اپنی رہائش کے گرد لگا لیتا ہے۔ اسی طرح یہ مسجد بھی ایک شخص کے مکان کے اندر ہے' جس کے چاروں طرف کانٹوں کی بڑی باڑ ہے جس سے گاؤں کے دوسرے آدمی اس میں اپنی فرض نماز ادا نہیں کر سکتے۔ جس کی وجہ سے مسجد ویران ہے۔ آبادی بڑھ جانے سے مسجد درمیان میں گھر کر رہ گئی ہے۔ اب مالک مکان نے یہ سوچا کہ اس مسجد کو اس جگہ سے شہید کر کے گاؤں کے کسی بیرونی حصہ میں بنائی جائے' جس سے کم از کم گاؤں اور غیر آدمی بھی اللہ کی عبادت کر سکے۔ لہذا کلام الٰہی اور حدیث رسول سے صحیح جواب عنایت فرمائیں کہ اس مسجد کو ایک جگہ سے شہید کر کے دوسرے مقام پر بنائی جائے یا کہ اس کو شہید نہ کیا جائے اور دوسری بنائی جائے۔ عین احسان ہو گا۔

عبدالمنان محمد معرفت پاک فلور مل سکرنڈ ضلع نواب شاہ سندھ ۷-۱۰ نومبر ۱۹۵۷ء

جواب: جو مسجد کسی جگہ مسجد کی نیت اور عمل عامہ سے بن کر مسجد کہلا چکی ہے' وہ اب ہمیشہ قیامت تک مسجد رہے گی اور قیامت کو مسجد کے حکم میں اٹھے گی۔ اس کو نہ بدل سکتے ہیں اور نہ ویران کر سکتے ہیں۔ اگر اس کو ویران کریں گے تو خود ویران ہوں گے۔ اس مسجد کے متعلقین اس مسجد میں ہمیشہ نماز پڑھیں' اس کو آباد رکھیں۔ اگر دور والے دوسری مسجد بنا لیں تو یہ جائز ہے مگر یہ شرط ہے کہ پہلی مسجد بے آباد نہ رہے۔ اگر پہلی بے آباد ہوئی تو دوسری ناجائز ہو جائے گی۔ اگر آبادی بڑھ جائے اور یہ مسجد آباد رہے تو پھر دوسری جائز ہو گی ورنہ نہیں۔ اس مسئلہ پر سب علماء کا اجماع ہے کہ مسجد نہ بدلنی جائز ہے اور نہ ویران کرنی جائز ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری۔ فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص ۱۷۶

رنڈیوں کی بنوائی ہوئی مسجد کا کیا حکم ہے؟

سوال: مسجد کے اوپر کنجر (یعنی رنڈی) اور کافر شخص کا مال لگانا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ ایک رسالہ نے یہ دیا ہے کہ جائز ہے۔ شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ اگر کوئی کافر یا رنڈی فاحشہ عورت اپنے پیسے سے کنواں کھدوائے تو برابر اس کا پانی پینا جائز ہے یا مسجد بنوا دے تو برابر اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کنواں کھدوانے یا مسجد بنوانے سے اسے کچھ فائدہ اخروی نہ ہو گا اس کے عوض بوجہ کفر و شرک دنیا میں ہی دے دیا جائے گا۔

جواب: یہ فتویٰ سراسر غلط اور خلاف شریعت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے مهر البغي خبيث یعنی رنڈی فاحشہ کی کمائی حرام ہے۔

مسجد اللہ تعالیٰ کا پاک گھر ہے جہاں جنبی داخل نہیں ہو سکتا اور نہ حائضہ عورت جا سکتی ہے۔ پھر اس پر ناپاک مال لگانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ ترغیب میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من اكتسب مالا من مالم فوصل به رحمه او تصدق به او انفقه في سبيل الله جمع ذالك كله جميعا فقذف في جهنم یعنی جس شخص نے گناہ کے ذریعہ سے مال کمایا۔ پھر اس کے ساتھ صلہ رحمی کی یا اس کو صدقہ کیا' یا اللہ کے رستہ میں خرچ کیا تو اس سب کو جمع کر کے مع اس شخص کے جہنم میں پھینکا جائے گا۔

اگر کنجر کے مال حرام سے مسجد بن کر مسجد کا حکم رکھتی تو اس کے لیے موجب جنت ہوتی۔ مگر اس حدیث سے ظاہر ہے کہ وہ انفاق فی سبیل اللہ موجب عذاب ہوا' جس سے ظاہر ہے کہ وہ مسجد' مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ ناپاک ہے جس کو گرانے کا حکم ہے۔ تفسیر مدارک میں ہے كل مسجد بني مباهاة او رياء و سمعة او لغرض سوى ابتغاء وجه الله او بمال غير طيب فهو لا حق بمسجد الضرار۔ یعنی جو مسجد فخریا ریاء اور شہرت کے لیے یا اللہ کی رضا کے سوا کسی اور غرض کے لیے یا مال حرام سے تعمیر کرائی گئی ہو' وہ مسجد ضرار کے ساتھ ملحق ہے۔ یعنی جیسے مسجد ضرار مسجد کا حکم نہیں رکھتی۔

ترغیب و ترہیب میں یہ حدیث ہے کہ انه من اصاب مالا من حرام فلبس منه جلبابا يعني قميصا لم تقبل صلوته حتى ينحي ذالك الجلباب عنه یعنی جس شخص نے مال

حرام سے قمیص بنوا کر پہنی تو جب تک وہ قمیص بدن سے اتاری نہ جائے گی' تب تک اس شخص کی نماز قبول نہ ہو گی۔ حرام حکمی نجاست ہے۔

یعنی اس سے جو چیز تیار ہو گی وہ نجس ہو گی تو پھر نجس جگہ میں نماز کیسے ہو سکتی ہے۔

زانیہ کا کسب حرام ہے تو اس کا مال مکسوبہ بھی حرام ہے۔ مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ہے مھر البغی خبیث ای حرام اجماعا لانها تاخذه عوضا من الزنا المحرم وسیلة الحرام حرام وسماه مهرا مجازا لانه فی مقابلة البضع یعنی مہر زانیہ کا خبیث ہے یعنی حرام ہے۔ اجماعاً کیونکہ زانیہ نے زنا کے عوض لیا ہے جو حرام ہے۔ وسیلہ حرام کا حرام ہوتا ہے۔

شیخ عبدالحق دہلوی شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں انه حرام قطعا یعنی زانیہ کی اجرت قطعاً حرام ہے۔

جب کوئی شخص فی سبیل اللہ مسجد بناتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے۔ جب تک اللہ کی ملک نہ ہو گی وہ مسجد کا حکم نہیں رکھے گی۔ پس مال حرام سے بنائی ہوئی مسجد اللہ کا ملک نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے ان اللّٰه طیب لا یقبل الا طیبا یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے' وہ پاک چیز کو قبول کرتا ہے۔ بلکہ موطا میں پاک مال سے صدقہ کرنے کے بارے یہ الفاظ آئے ہیں انما یضعها فی کف الرحمٰن کہ جس نے پاک مال سے صدقہ دیا اس نے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ کنجری کا خبیث اور حرام مال اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا تو وہ مسجد اللہ کی نہ ہو گی۔

میں اپنی تائید میں ایک شہرہ آفاق اور مقبول آنام بزرگ ہستی کا فتویٰ پیش کرتا ہوں۔ یہ وہ ہیں جن کے والد بزرگوار جناب زبدۃ العارفین حضرت مولانا عبداللہ الغزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جن کے ہاتھ پر مولانا عبدالوہاب دہلوی مرحوم نے خود بھی بیعت کی تھی اور بیعت کی ہدایت بھی کی تھی۔ فتویٰ فارسی میں ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

○ --- سوال --- ○

علماء اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک مسجد بہت مدت سے گری ہوئی ہے۔ صرف سفید زمین باقی تھی تو اس جگہ ایک فاحشہ زانیہ عورت نے اپنے زنا کے مال سے اس حیلہ کے ساتھ مسجد تیار کی ہے کہ روپیہ کسی مسلمان یا ہندو سے بغیر سود کے قرض لے۔ بعد ازاں قرض مذکور کو اپنے حرام کے روپیہ سے ادا کرے' کیا جائز ہے یا نہیں؟ اور ایسی مسجد

تیارہ شدہ میں نماز گزارنی بلا کراہت شرعی جائز ہو گی یا نہیں اور اس مسجد میں پانچوں نمازوں کے ادا کرنے کا ثواب دوسری مسجدوں میں جو پاک اور حلال مال سے بنائی گئی ہیں' ادا کرنے کے برابر ہو گا یا نہیں؟ اور بنانے والے کو ثواب آخرت مرتب ہو گا یا نہیں؟ اور ایسی مسجد کو جو عورت مذکورہ نے بنائی ہے' گرا کر اس کے بدلہ میں پاک و حلال مال سے اس جگہ مسجد بنائی جائے یا نہ؟

○ --- جواب --- ○

اگر لباس کا کچھ حصہ یا سارا لباس ناپاک ہو تو اس میں نماز جائز نہیں۔ اسی طرح اگر مسجد کا کچھ حصہ یا ساری مسجد حرام مال سے بنائی گئی ہو تو وہ حکم مسجد کا نہیں رکھتی۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جس نے دس درہم کو کوئی کپڑا خریدا اور ان میں ایک درہم حرام کا ہے تو جب تک وہ کپڑا اس پر رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرے گا۔ پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کانوں میں انگلیوں کو داخل کر کے کہا کہ اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیث فرماتے ہوئے نہ سنا ہو تو اللہ کرے میرے یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں اور اس مسجد کے بنانے والے کو کچھ ثواب نہیں۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا مگر پاک کو اور چونکہ وہ مسجد حکم مسجد نہیں رکھتی تو اس میں نماز پڑھنا دوسری پاک مسجدوں میں نماز پڑھنے کے برابر کیونکر ہو گا اور اس مسجد کو گرا کر اس کی تعمیر کرانا مصداق جاء الحق وزھق الباطل (حق آیا اور باطل گیا) کا ہو گا اور حیلہ سازی سے حرام کو حلال کرنا موجب غضب الٰہی کا ہے۔ جیسا کہ اصحاب السبت پر غضب نازل ہوا تو ان کو بندر بنا دیا۔ اور جو شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ اور مولوی عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ کا اس بارہ میں فتویٰ ہے' وہ اس پر محمول ہے کہ وہ قرض مال حرام سے فائدہ اٹھانے کی نیت سے اس قرض کو حیلہ بنا دے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (احمد عبدالجبار غزنوی)

نیز واضح رہے کہ مجموعۃ الفتاویٰ کے ص ۱۰۱ میں بھی ایک سوال درج ہے کہ فاحشہ عورت کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب بھی احادیث لکھ کر یہ دیا ہے کہ "نماز در مسجد مذکورہ جائز نیست کہ' مال خبیث و حرام است و لباس' حرام موجب عدم قبول نماز است"

پھر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ کپڑے مغصوب اور مکان مغصوب میں نماز صحیح نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسجد کو حلال مال سے خریدے تب بھی حرمت رفع نہ ہو گی اور آیت کے خلاف ہے۔ لا تتبدلوا الخبیث بالطیب یعنی نہ بدلو پلید کو بدلے پاک کے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت عارف باللہ نے زانیہ کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد میں نماز ناجائز قرار دی ہے اور اس کو مسجد کے حکم سے خارج کر دیا ہے۔ یہ فتویٰ عین تقویٰ پر مبنی ہے۔

کتبہ عبدالقادر عارف انصاری

الاعتصام لاہور جلد ۱۵ شمارہ ۷ مورخہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۶۳ء

مسئلہ محراب فی المسجد کی تحقیق عمیق

مسجدوں میں محراب موجہ بنانے کا عام رواج ہے جو چیز رواج اور رسم بن جائے خواہ شرعاً وہ گناہ اور بدعت ہو تو اس کی قباحت عام بلکہ خاص کے دلوں سے چلی جاتی ہے۔ مثلاً میلاد کا عام رواج ہے جو صریحاً محدث اور بدعت ہے۔ اب اس کو سیرت نبوی کے نام سے اہل حدیث اور دیوبندی بھی بجالا رہے ہیں۔ اب یہ بدعت ہر جگہ عام طور پر پھیل رہی ہے۔

اسی طرح سود کا عام رواج ہو رہا ہے اور اس کے مختلف شعبے بن گئے ہیں۔ کہیں بینک کی صورت میں بیاج کا معاملہ ہو رہا ہے اور کہیں کمپنیاں مختلف ناموں سے بنی ہوئی ہیں جن میں سود کا کاروبار ہو رہا ہے۔ بیمہ کمپنی بھی اسی قبیل سے ہے۔ جب کوئی گناہ اور رسم سرکاری عمل میں آجائے اور ملک کے رؤسا اس میں شریک ہوں تو پھر علمائے اسلام بھی اس کے جواز کی کوشش کرنے لگ جاتے ہیں اور پھر حیلہ بہانہ' جوڑ توڑ کر کے دلائل لے آتے ہیں۔ علماء اہل حدیث میں بھی یہ بیماری جاری و ساری ہے۔ ایک کسی رسم کے جواز کا فتویٰ دے دیتا ہے تو بھیڑ چال سے سب اسی پر دستخط کرتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی حق و باطل کی چھان بین نہیں کرتا الا ماشاء اللہ۔

اگر کوئی شخص عام آراء وغیرہ کے خلاف کچھ بولے یا کچھ کہے تو اس کو متشدد قرار دے کر حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اب مسئلہ محراب فی المسجد کو لیجئے کہ یہ رسم تمام مسجدوں میں رواج پکڑ گئی ہے۔ کوئی مسجد اہل حدیث یا حنفیہ وغیرہ کی محراب موجہ سے خالی نہیں ہے۔ الا ماشاء

الا کسی مخلص سلفی اہل حدیث کی کوئی مسجد اس بدعت سے خالی ہو تو ممکن ہے' مگر وہ قلیل کالمعدوم ہے۔ لغات الحدیث کتاب الراء کے ص-۳۳ میں جناب مولانا وحید الزمان محدث لکھنوی رقم طراز ہیں کہ "کان علی یکسر المحراب اذا راٰھا فی المسجد" یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں محراب دیکھتے تو اس کو توڑ ڈالتے تھے۔ مسجد میں محراب بنانا خلاف سنت ہے۔ اب اکثر لوگوں نے اس کو اختیار کر لیا ہے' الا ماشاء اللہ۔

ایک جماعت اہل حدیث نے چند مسجدیں مطابق سنت کے بنائی ہیں جن میں نہ محراب ہے نہ منبر۔ صرف جمعہ کے دن لکڑی کا منبر رکھا جاتا ہے پھر اٹھا دیا جاتا ہے۔ مولانا مرحوم کو یہ بات سولہ آنے صحیح اور درست ہے کہ اکثر مسجد خلاف سنت ہیں' محراب' جنازہ' مٹی کے منبر نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ ہمارے علماء نے عام رواج سے متاثر ہو کر محراب وغیرہ کی بدعت کو مسنون و مشروع قرار دے دیا ہے۔ نعوذ باللہ منہم ومن افواھہم۔

اخبار الاعتصام مطبوعہ ۱۰ فروری سنہ ۱۹۷۸ء کے شمارہ ۲۸ عنوان فتاویٰ میں محراب کے متعلق حضرت مولانا عبداللہ صاحب غازی دام اللہ بقاءہ کا یہ فتویٰ شائع ہوا ہے کہ "مسجد میں محراب بنانا درست ہے۔ بیہقی نے سنن کبریٰ میں ایک روایت میں ذکر کیا ہے فدخل ای النبی المحراب ثم رفع یدیہ بتکبیرہ۔ مصنف عون المعبود لکھتے ہیں مالفظہ القاری المحاریب من المحدثات فیہ نظر لان وجود المحراب زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یثبت فی بعض الروایات پھر یہ روایت پیش کی ہے۔ اس لئے ہماری مساجد میں جو محراب ہیں' وہ بدعت نہیں"

میں کہتا ہوں کہ یہی روایت بیہقی کی لے کر دیگر علماء اہل حدیث جن کے فتوے فتاویٰ ثنائیہ جلد اول ص-۲۹۳ تا ۲۹۶ میں درج ہیں' محراب کو جائز بلکہ قرآن و حدیث سے ثابت لکھا ہے جو بالکل غلط ہے کہ محراب مروجہ کا قرآن اور حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ جن علماء نے محراب مروجہ کا ثبوت قرآن و حدیث میں بتایا ہے' وہ مزلۃ الاقدام میں آ کر گر پڑے ہیں اور جن علماء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے' وہ تحقیق کے میدان میں پھسلنے سے محفوظ اور ثابت قدم رہے ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

علامہ ملا علی قاری نے "مرقاۃ شرح مشکوۃ" میں یہ لکھا ہے لان المحاریب من المحدثات بعدہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن ثم کرہ جمیع من السلف اتخاذھا

والصلوۃ فیھا الخ۔ یعنی مسجدوں میں محرابیں بدعات میں داخل ہیں جو زمانہ نبوی کے بعد بنائی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے جماعت سلف نے ان کا بنانا اور ان میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے۔"

علامہ قاری کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ فی الواقع محراب المسجد عہد نبوی کے بعد کی ایک پیداوار ہے۔ چنانچہ علامہ علقمی الکوکب المنیر شرح جامع صغیر جلد اول ص ۲۰۰ میں یہ فرماتے ہیں قال شیخنا ومن خطه فقلت ان قوما خفی علیھم کون المحاریب فی المساجد بدعة وظنوا انه کان فی مسجد النبی صلی اللہ علیه وسلم فی زمنه ولم یکن فیه ولا فی زمن الخلفاء انما احدث اولا بمائة الثانیة یعنی ہمارے شیخ امام سیوطی نے فرمایا اور ان کے خط سے ظاہر ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ایک قوم پر محرابوں کا مسجدوں میں بدعت ہونا مخفی رہا اور وہ گمان کرتے رہے کہ مسجد نبوی میں محراب تھا حالانکہ زمانہ نبوی میں بالکل محراب نہ تھا اور نہ خلفاء راشدین کے زمانے میں تھا۔ بلکہ بعد ان کے پہلی صدی کے آخر تک اس موجہ محراب کا وجود نہ تھا۔ پھر دوسری صدی کے شروع میں یہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح علامہ ابن النجار تاریخ مدینہ منورہ مطبوعہ مکہ مکرمہ کے ص ۸۲ میں لکھتے ہیں مات عثمان بن عفان رضی اللہ عنه ولیس للمسجد شرافات ومحراب فاول من احدث الشرافات والمحراب عمر بن عبدالعزیز یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وفات پا گئے' مسجد میں ان کے زمانہ میں نہ کوئی بالا خانے تھے اور نہ محراب تھی۔ پس اول وہ شخص جس نے محراب ایجاد کیا ہے' عمر بن عبدالعزیز ہے۔

علامہ سمہودی مورخ المدینۃ الوفاء الوفاء جلد اول ص ۳۶۳ میں لکھتے ہیں لم یکن فی عھدہ صلی اللہ علیه وسلم ولا فی عھد الخلفاء بعدہ وان اول من احدث عمر بن عبدالعزیز فی عمارۃ الولید" یعنی عہد نبوی اور عہد خلفاء میں محراب نہ تھی۔ اس کو عمر بن عبدالعزیز نے ولید بن عبدالملک کے عہد میں جبکہ انہوں نے مسجد نبوی بنوائی تو محراب بنا دی۔

نیز علامہ سمہودی وفاء الوفاء کی فصل تاریخ عشرین فرماتے ہیں "اتخذ عمر فی المسجد فی زیادۃ الولید المحراب والشرفات والمنائر اسند یحیی بن عبدالمھیمن عن عباس قال مات عثمان ولیس فی المسجد شرفات ولا محراب" یعنی عمر بن

عبدالعزیز نے جب کہ ولید نے مسجد بنوائی تو محراب اور بالا خانے بنا دیئے سند یحییٰ کی عباس بڑھو سے آئی ہے کہ حضرت عثمان بڑھو فوت ہو گئے تھے' ان کے عہد میں بالا خانے اور محراب نہ تھے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد اول ص ۲۷۵ میں کرمانی شارح بخاری سے نقل کیا ہے کہ اس بیان سے معلوم ہوا کہ مسجدوں کی محرابیں نوپید اور حادث ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نہ ہی آپ نے اور نہ ہی خلفاء اربعہ نے محراب بنائی۔ امام سیوطی کتاب الوسائل میں لکھتے ہیں "اول من احدث المحراب المجوف عمر بن عبدالعزیز حین بنی المسجد النبوی" یعنی پہلے وہ شخص جنہوں نے جوف دار محراب بنائی' عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ جنہوں نے مسجد نبوی تعمیر کی تو محراب تعمیر کرا دی۔ (بحوالہ تعلیق عبدالحی جلد اول ص ۲۳۲)

نیز اسی حوالہ میں امام سیوطی سے یہ نقل کیا ہے "وانما حدثت فی اول المائۃ الثانیۃ مع ورود الحدیث بالنہی عن اتخاذہ وانہ من شان الکنائس وان اتخاذہ فی المسجد من اشراط الساعۃ" یعنی دوسری صدی کے شروع میں یہ ایجاد ہوئی ہے۔ حالانکہ اس سے ممانعت کی حدیث آچکی ہے اور یہ گرجوں کا طریقہ ہے اور اس کا مسجد میں ہونا قیامت کی علامات سے ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مورخین اہل مدینہ اور دیگر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ عہد نبوی میں مسجد نبوی میں کوئی محراب نہ تھی۔ جب عہد نبوی میں محراب کا وجود ہی نہ تھا تو آنحضور ﷺ نے اس میں داخل کیا ہونا تھا۔ جناب مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری تو بایں قیاس کہ مینار کی طرح محراب بھی علامت مسجد ہے' اس لیے جائز کہتے ہیں مگر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں محراب نہ تھی۔ چنانچہ فتاویٰ ثنائیہ جلد اول ص ۳۹۳ میں فرماتے ہیں "ہاں اس میں شک نہیں کہ زمانہ رسالت میں محراب نہ تھے' جیسے مینار بھی نہ تھے۔"

جب فاضل امرتسری کو اپنے کتب خانے میں محراب موجہ کا ثبوت نہ مل سکا تو مولانا عبداللہ صاحب ثانی امرتسری کو ثبوت کہاں سے مل گیا؟ انہوں نے مصنف عون المعبود کی تقلید کر کے یہ لکھ دیا اور خود تحقیق نہ کی اور لطف یہ ہے کہ خود جلسوں میں جا کر مقلدین حنفیہ کے مقابلہ میں تقریریں کرتے ہیں کہ تقلید حرام اور گمراہی ہے۔ اگر مولانا عبداللہ

صاحب یہ کہیں کہ تقلید تو بلا دلیل کسی کے قول کو لینے کا نام ہے۔ میں نے تو مصنف عون المعبود کی بات بیہقی کی روایت کی بناء پر لی ہے۔ یہ بادلیل پیروی ہے جو تقلید نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس طرح تو مقلدین حنفیہ بھی اپنے اماموں کے اقوال کی تقلید کرتے ہیں تو ان کے ثبوت میں دلائل لاتے ہیں جو کتب اصول اور کتب فقہ ہدایہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ مگر وہ دلائل کی حقیقت کو نہیں سمجھتے نہ روایت کی رو سے ان کی تحقیق کر سکتے ہیں اور نہ درایت کی رو سے۔ بس محض حسن ظنی سے قول اور دلیل لے لیتے ہیں کہ ہمارے فقہاء نے اس حدیث کو لیا ہے۔ ہم بھی اسی پر اعتماد کر لیتے ہیں گو وہ دلیل تار عنکبوت سے زیادہ کمزور ہے۔ چنانچہ رفع یدین سنت موکدہ ہے۔ جو احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ مقلدین اس کو نہیں مانتے اور ترک رفع یدین کے بارے میں دلائل ضعیفہ رکیکہ سے کام لے کر اپنا تقلیدی الو سیدھا رکھتے ہیں اور اپنے خیال میں مسائل تقلیدی کی بادلیل پیروی کر رہے ہیں۔ یہی حال مسئلہ محراب میں مولوی عبداللہ صاحب علی کا ہے کہ جس حدیث کا سہارا لے کر محراب بنانی درست اور سنت بنا دی ہے اس کی تحقیق روایت اور درایت کی رو سے نہیں کی۔ اور مصنف عون المعبود کی تقلید سے اس روایت پر اعتماد کر لیا ہے۔ اب ہم سے اس حدیث بیہقی کی تحقیق معلوم کریں اور پھر اپنے فتوے پر غور کریں کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے کہ اس میں بدعت کو سنت بنا دیا گیا ہے۔ مولانا کو جلسوں میں جا کر تقریریں کرنے کا ملکہ و محاورہ تو حاصل ہے جس کی بابت دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تبلیغی شان کو اور زیادہ بلند کرے مگر مسائل کی تحقیق میں مہارت نہیں کہ یہ علیحدہ شعبہ ہے۔ اس میں جامع العلوم اور کثیر مطالعہ اور محنت و مشقت سے کتب شریعہ کی ورق گردانی کرنے والے شخص کی ضرورت ہے' جس کو دلائل کی حقیقت معلوم کرنے اور ان کی تنقید کرنے کی مہارت تامہ حاصل ہو۔

حدیث سنن بیہقی کی محدثانہ تحقیق: مولوی عبداللہ صاحب نے حدیث سنن بیہقی سے جو استدلال کیا ہے' اس کی دو طرح سے تحقیق ضروری ہے۔ ایک روایت کی رو سے' دوم درایت کی رو سے۔ اگر روایت اور درایت کی رو سے حدیث صحیح اور اس کی دلالت دعویٰ پر قائم ہوئی تو فتویٰ صحیح ورنہ غلط اور دعویٰ خارج ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ عون المعبود کی منقولہ حدیث سنن کبریٰ بیہقی جلد ۲ ص ۴۰ باب

رفع الیدین علی السور ابن السنۃ میں درج ہے جو بطریق محمد بن حجر الحضرمی عن سعید بن عبدالجبار بن وائل عن ابیہ عن امہ عن وائل بن حجر قال حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنھض الی المسجد فدخل فی المحراب ثم رفع یدیہ الحدیث الی آخرہ اس حدیث کو علامہ ہیثمی مؤلف مجمع الزوائد نے بھی جلد اول ص ۱۳۴ مطبوعہ مصر باب "صفت الصلوٰۃ" میں ذکر کیا ہے لیکن پھر اس پر ریویو اس طرح کیا ہے "فیہ محمد بن حجر قال البخاری فیہ بعض النظر قال الذہبی لہ مناکیر" یعنی اس روایت کی اسناد میں ایک راوی محمد بن حجر ہے' جس کے بارے میں امام بخاری نے جرح کی ہے۔ اس میں بعض النظر ہے۔ اور امام ذہبی نے میزان میں لکھا ہے کہ اس کی روایتیں منکر ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ امام بخاری نے اپنی کتاب تاریخ کبیر بخاری مطبوعہ حیدر آباد میں محمد بن حجر کی بابت فیہ نظر لکھا ہے تو یہ صحیح ہے۔ اور میزان میں امام ذہبی نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ جس راوی کی بابت امام بخاری فیہ نظر کہہ دیں تو وہ روایت فاسد ہو جاتی ہے' قابل استدلال نہیں رہتی۔ دوسرا راوی اس روایت کی اسناد میں سعید بن عبدالجبار ہے جو بالاتفاق ضعیف ہے۔

میزان میں لکھا ہے "قال النسائی لیس بالقوی" یعنی امام نسائی نے کہا کہ یہ علم حدیث میں قوی نہیں ہے۔ اور تزکیۃ الشریعہ جلد اول ص ۳۰ میں ہے "سعید بن عبدالجبار قال ابو احمد الحاکم یروی الکذب" یعنی ابو احمد حاکم نے کہا کہ سعید بن عبدالجبار جھوٹی احادیث روایت کرتا ہے۔ یہ حالت تو سند کی ہے' باقی عبدالجبار بن وائل کی یہ روایت ابوداؤد وغیرہ متعدد کتب حدیث میں آئی ہے کسی میں فدخل فی المحراب کلمات نہیں ہیں۔ یہ بتاتی اور بہار کی اسی روایت میں ہے جو انہی مجروح راویوں میں سے کسی کی کارستانی ہے۔

سماع کی روایت سب پر مقدم ہے جن میں یہ الفاظ نہیں ہیں' پس یہ الفاظ مخدوش ہیں۔

اگر روایت کے لحاظ سے یہ حدیث تسلیم کی جائے تو درایت کے لحاظ سے ایک تو اس وجہ سے مخدوش ہے کہ سنن ابوداؤد وغیرہ میں الفاظ فی المحراب کے نہیں ہیں۔ جہاں اس صفت نماز میں "فاستقبل القبلۃ فکبر" کے الفاظ ہیں۔ دوم مورخین اہل مدینہ جو مسجد نبوی کے کوائف سے پورے واقف کار تھے' وہ محراب موجب کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ آخر مشاہدہ اور تاریخ بھی کوئی چیز ہے اور اہل علم میں کچھ حقیقت رکھتی ہے۔ اس لئے مجمع

الزوائد میں یہ روایت لا کر لفظ محراب کی تفسیر یوں کر دی "یعنی موضع المحراب" کہ آنحضرت ﷺ اس جگہ داخل ہوئے جہاں اب محراب موجہ کی جگہ ہے۔ ان لفظوں سے تفسیر لفظ یعنی سے کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ عہد نبوی میں مسجد کے اندر محراب موجہ کا وجود نہ تھا کہ تاریخ مسجد نبوی کی اس کے وجود سے انکار کرتی ہے۔ پھر روایت مخدوش ہے' تو تاویل سے تاریخ کے ساتھ مطابقت کرنی پڑے گی۔

چنانچہ وفاء الوفا جلد اول ص ۲۶۷ میں ہے "والمراد بمحرابه صلى الله عليه وسلم مكان صلوته فانه لم يكن في زمنه صلى الله عليه وسلم محراب" یعنی آپ کے محراب سے مراد آپ کی نماز کی جگہ یعنی مصلیٰ ہے۔ کیونکہ عہد نبوی میں محراب نہ تھی اور لغت میں امام کی صدر مجلس اور مقام نماز کو بھی محراب کہا جاتا ہے۔ اس سے موجہ محراب مراد نہیں ہوتی۔

علامہ جوہری لغوی نے صحاح میں لکھا ہے "المحراب صدر المجلس منه محراب المسجد" یعنی محراب سے مراد امام کا صدر مقام ہے۔ اور مسجد کے محراب موجہ کو بھی اسی وجہ سے محراب کہا جاتا ہے۔ قاموس جو لغت کی مشہور کتاب ہے' اس میں محراب کی تشریح مقام من المسجد سے کی گئی ہے۔ یعنی مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ' کیونکہ محراب موجہ مجوف کا عہد نبوی میں وجود نہ تھا ہاں جہاں امام کھڑا ہو' وہ جگہ دیگر مواضع مسجد سے کچھ ممتاز اور شاندار ہو۔ کیونکہ محراب لغت میں اکرم جگہ کو کہتے ہیں جو مجلس کے صدر میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کو قبلے کی دیوار میں گول دروازہ کی طرح اور مجوف کمان کی طرح نہ بنانا چاہیے۔ جیسا کہ موجہ محراب بنے ہوئے ہیں کہ اس میں مشابہت نصاریٰ کی پیدا ہو جاتی ہے۔

مجمع البحرین میں ہے کہ محراب اس بالاخانہ کو کہتے ہیں جو مسجد میں بنی اسرائیل کے لوگ بنایا کرتے تھے اور وہ ایک اونچا مقام ہوتا۔ اس لیے عالی شان محل کو بھی محراب کہتے ہیں اور محراب مسجد کے اس مقام کو بھی کہتے ہیں جہاں پر امام اکیلا کھڑا ہوتا ہے کیونکہ وہ مقام بہ نسبت اور مقاموں کے زیادہ شاندار اور اشرف ہوتا ہے۔

تفسیر فتح البیان میں ہے "كلما دخل عليها زكريا المحراب يعني الغرفة والمحراب في اللغة اكرم موضع في المجلس قاله القرطبي (الى قوله) وكذالك يقال لكل محل

من محل العبادة محراب" یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمان کہ جب حضرت مریم پر حضرت زکریا محراب میں داخل ہوتے یعنی بالاخانہ میں جاتے۔ محراب لغت میں مسجد کی اس جگہ کو کہتے ہیں جو بہت عزت والی ہوتی ہے اور اسی طرح ہر جگہ عبادت کا نام محراب رکھا گیا ہے کہ وہاں شیطان کے ساتھ جنگ کیا جاتا ہے۔ جب ہر مقام نماز کا نام محراب ہے اور امام کے مصلیٰ کو جو دیگر مواضع سے اکرم جگہ ہے' اس کو بھی محراب کہا جا سکتا ہے۔

فتاویٰ ثنائیہ جلد اول ص ۲۴۳ میں ہے قال اسدی المحراب المصلی یعنی امام اسدی نے کہا کہ قرآن میں جو حضرت زکریا کی بابت آیا ہے کہ وہ محراب میں نماز پڑھتے تھے' اس سے مراد نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ پس وائل کی حدیث میں فدخل المحراب آیا ہے۔ اس سے وہ مقام نماز کا مراد ہے جہاں آنحضرت ﷺ نماز میں کھڑے ہوا کرتے تھے تو وہ جگہ صدر مقام تھا اس لیے اس کو محراب کہا گیا ہے وہ جگہ ممتاز اور شاندار ہو تو یہ ممکن ہے۔ مگر محراب مجوف ہونے سے تاریخ کے شواہد انکار کرتے ہیں۔ اس لیے دیوار والا مجوف محراب جس کا تمام رواج ہے' ہرگز مراد نہیں ہو سکتا۔ جب لغت میں مصلیٰ اور مقام نماز کا جو مخصوص ہو' اس کو محراب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو پھر لفظ محراب سے مروجہ محراب جو مجوف اور کمان کی طرح دیوار میں بنایا جاتا ہے' مراد لے کر مورخین اہل مدینہ کی تکذیب کرنا کوئی عقلمندی نہیں بلکہ علمی شان کے خلاف ہے۔ علامہ سمہودی مشہور مورخ وفاء الوفاء کے ص ۲۴۳ میں فرماتے ہیں "المسجد الشریف لم یکن له محراب فی عهده صلی الله علیه وسلم ولا فی عهد الخلفاء" یعنی مسجد شریف میں عہد نبوی اور عہد خلفاء میں محراب موجود نہ تھا فتح الباری جلد اول ص ۲۷۵ میں رئیس المحققین حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں "لم یکن لمسجده محراب" یعنی رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں محراب نہ تھی۔ مولوی عبداللہ صاحب نے شاید خود عون المعبود کا مطالعہ نہیں کیا۔ فتاویٰ ثنائیہ دیکھ کر تقلیداً عبارت لکھ دی۔ اگر مطالعہ کر لیتے تو عون المعبود میں علامہ قسطلانی کا یہ قول خاص بھی ملاحظہ فرما لیتے کہ وہاں یوں رواج ہے "ویسمی موقف الامام من المسجد محرابا" یعنی مسجد میں جو جگہ امام کے کھڑے ہونے کی ہے اس کا نام محراب ہے۔ پس مروجہ محراب حدیث میں مراد لے کر اہل تاریخ کی تکذیب روا نہیں ہے۔ یوں کہہ دو کہ آنحضرت ﷺ اپنی نماز کی جگہ میں داخل ہوئے۔ پس یہ ٹھیک ہے۔

چنانچہ علامہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر جلد۔۲۰ ص۱۳۴ میں فرماتے ہیں "اما المحراب فھو مقدم کل مجلس ومصلی" یعنی محراب ہر مجلس کے سامنے کی جگہ اور نماز پڑھنے کی جگہ کا نام ہے۔ حدیث وائل میں بھی مروا لیں تو محراب کے مجوزین کا فتویٰ نیست و نابود ہو جاتا ہے اور مقام نماز کا مروا لینا ضروری ہے کیونکہ عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدین میں محراب مروجہ کا وجود ہی نہ تھا۔ جب وجود نہ تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس میں داخل کیا ہونا تھا؟ تو محض مقام نماز مروا لینا متعین ہوا۔ یہی حق اور ثواب ہے۔ اگر کوئی اس کے خلاف کہے تو وہ دلیل صحیح پیش کرے۔

فتاویٰ غزنویہ کے ص۴۰ پر ایک سوال ہے جس کا جواب حضرت مولانا عبدالجبار صاحب محدث غزنوی رحمہ اللہ نے دیا ہے۔ وہ سوال و جواب فارسی میں ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

سوال: اس زمانہ میں جو مسجدوں میں محراب ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی تھے یا نہیں؟

(السائل عبدالودود بن مولوی محمد اسحاق لدھیانوی)

جواب: اس زمانہ کی مسجدوں میں جو محراب ہیں' رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں نہ تھے۔ ہجرت کی دوسری صدی میں یہ محراب تو پیدا ہوئے۔ سیوطی رحمہ اللہ نے اوائل میں لکھا ہے کہ واقدی نے محمد بن ہلال سے روایت کی ہے کہ پہلا وہ شخص جس نے محراب نکالا ہے' عمر بن عبدالعزیز ہے جبکہ اس نے مسجد نبوی کو بنایا۔ سمہودی نے وفاء الوفاء باخبار دارالمصطفیٰ میں لکھا ہے کہ مسجد شریف (یعنی مسجد نبوی) کا محراب نہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھا نہ آپ کے بعد خلفاء کے زمانے میں۔ پہلا وہ شخص جس نے محراب نکالا عمر بن عبدالعزیز ہے۔ جس زمانہ میں کہ ولید امیر تھا اور سیوطی رحمہ اللہ نے "اعلام الاریب فی بدعۃ المحاریب" میں لکھا ہے کہ تحقیق ایک قوم پر محرابوں کا مسجد میں بدعت ہونا پوشیدہ ہوا اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ محراب مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی تھا حالانکہ ہرگز نہ آپ کے زمانہ میں اور نہ خلفاء کے زمانہ میں اور نہ ان کے زمانے میں جو خلفاء کے بعد ہوئے۔ پہلی صدی تک بلکہ محراب تو دوسری صدی کے شروع میں نکلا۔ باوجودیکہ حدیث شریف میں محراب کے بنانے کی ممانعت ہے اور تحقیق محراب تو یہودیوں کی عبادت گاہوں میں ہوتا ہے۔ اور تحقیق محراب کا مسجد میں بنانا قیامت کی نشانیوں سے

ہے

ملا باقر آگاہ نے بیضا الانام میں لکھا ہے کہ سلف صالحین سے جماعت کا دہرانا اور محرابوں کا بنانا اور اماموں کا چاروں طرف کعبہ میں ہونا ثابت نہیں ہے۔ اور یہ تکرار بوجہ حوادث و نوائب زمانہ کے ہے۔ اور یہ محراب مکہ مکرمہ میں سنہ ۸۰۱ھ میں نئے نکلے اور یہ دوبارہ جماعت مکہ مکرمہ میں سنہ ۸۱۱ھ میں جاری ہوئی اور خانہ کعبہ کے دوسرے محراب کا بننا سنہ ۸۴۰ھ کے بعد وقوع میں آیا۔ اس زمانے کے کوشش کرنے والے عالموں نے ہرچند اس سے منع کیا مگر کچھ کارگر نہ ہوا۔ پس عام لوگوں کے گمان میں یہ باطل خیال پختہ ہو گیا کہ یہ ایک اچھا کام ہے۔ جو حرمین والوں نے اس کو پسند کیا ہے' انتہی۔ غرض کہ محرابوں کا اس طور پر بنانا جو اس زمانے میں مروج ہے' نبی ﷺ کے زمانہ میں نہ تھا بلکہ شروع اس کا نصاریٰ سے ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور محرابوں کا تو پیدا ہونا تابعین کے زمانہ میں ہوا اور بہت سے صحابہ سے بھی اس پر انکار ثابت ہے۔

ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں موسیٰ جہنی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت ہمیشہ بھلائی پر رہے گی جب تک کہ وہ اپنی مسجدوں میں نصاریٰ کی طرح مذابح یعنی محراب نہ بنائیں گے۔ اور طبرانی اور بیہقی نے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تحقیق نبی ﷺ نے فرمایا کہ بچو تم ان مذابح یعنی محرابوں سے اور ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ کہا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بچو تم ان محرابوں سے اور ابن ابی شیبہ نے عبید بن ابی جعد سے روایت کی ہے کہ کہا اس نے محمد ﷺ کے اصحاب کہتے تھے کہ مسجدوں میں مذابح یعنی طاقیں بنانا قیامت کی نشانیوں سے ہے اور بزار نے اپنی مسند میں معتبر راویوں کے ساتھ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ محراب یہودیوں کے عبادت خانوں کے ہوتے ہیں تو تم اہل کتاب سے مشابہت نہ کرو یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ محراب میں نماز پڑھنی مکروہ جانتے تھے اور ابن ابی شیبہ نے کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تحقیق کعب رضی اللہ عنہ نے محرابوں کو مسجدوں میں برا جانا ہے۔

سیوطی رحمہ اللہ نے ان روایتوں کو تفسیر در منثور اور رسالہ بدعت محاریب میں ذکر کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صراط مستقیم میں لکھا ہے کہ حنفیوں نے کہا ہے کہ محراب میں قیام بھی مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ اہل کتاب کے فعل سے مشابہت ہے بسبب خاص

کرنے امام کے مکان کو بخلاف اس صورت کے کہ قیام باہر ہو اور سجدہ محراب میں اور یہ ظاہر مذہب امام احمد ﷫ وغیرہ کا بھی ہے' انتہی۔ پس اب مذکورہ بالا روایتوں اور اہل علم کے قولوں سے ثابت ہوتا ہے کہ محراب حکم مسجد کا نہیں رکھتا اور قیام اس میں مکروہ ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ قیام مسجد میں ہو اور سجدہ محراب میں' فقط۔

میں کہتا ہوں کہ اگر بندہ کسی مسئلہ کا حکم بیان کرے تو میرے معاصرین اہل علم یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ مولوی حصاری کا تشدد ہے۔ حالانکہ عارف حصاری کسی مسئلہ میں منفرد نہیں ہے بلکہ ہر مسئلہ میں ایک جماعت محققین علماء کی میرے ساتھ ہے۔ خاندان غزنویہ میں حضرت مولانا سید عبدالجبار محدث غزنوی مرحوم کی مقدس ہستی محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک مشہور آفاق ہستی تھے' جن کے فرزند ارجمند جناب' مولانا سید محمد داؤد صاحب محدث غزنوی امیر جمعیت اہل حدیث پاکستان تھے۔ جن کی یادگار اب مولانا ابوبکر صاحب غزنوی ہیں۔ حضرت العلام غزنوی کے فتویٰ کے سامنے مولوی عبداللہ صاحب ثانی کے فتویٰ کی کوئی وقعت نہیں ہے لیکن بندہ آپ کی تائید مزید کے لیے دیگر محققین کے ارشادات بھی پیش کر دیتا ہے تاکہ مجوزین محراب کو انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے اور وہ آمنا وصدقنا کہہ دیں۔

مولانا وحید الزمان صاحب محدث لکھنوی کا ارشاد: جناب مولانا وحید الزمان صاحب محدث لکھنوی بھی اس علم میں نہایت مشہور تھے۔ ان کا علمی کارنامہ سب کو معلوم ہے۔ صحاح ستہ کا ترجمہ انہی کا کیا ہوا' اہل حدیث میں مروج ہے۔ وہ اپنی کتاب مستطاب لغات الحدیث کی جلد کتاب الذال کے ص۸ میں یوں رقمطراز ہیں "کان علي اذا رای المحاریب في المساجد کسرها ویقول کانها مذابح الیهود" یعنی حضرت علی ﷛ جب مسجدوں میں محرابیں دیکھتے تو ان کو توڑ ڈالتے اور یہ فرماتے یہ تو گویا یہودیوں کی قربان گاہیں ہیں۔ مترجم کہتا ہے کہ محراب سے مراد وہ اونچی عمارت ہے جو امام کے لیے مسجد میں درمیانی حصہ میں بنائی جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں نہ مسجد میں محراب تھی' نہ کوئی (مٹی کا) منبر اینٹ یا پتھر کا بنا ہوا تھا۔ خطبہ کے وقت لکڑی کا منبر رکھتے پھر اس کو اٹھا ڈالتے۔ اب بھی سنت یہی ہے کہ مسجدوں میں محراب اور منبر (مٹی کا) نہ بنائیں مگر کون سنتا ہے۔ لوگ رسم و رواج کے پابند ہو گئے ہیں' الا ماشاء اللہ۔

میں کہتا ہوں کہ کوئی اور شخص نے یا نہ نے مولوی عبداللہ صاحب ثانی

جو جامع مسجد جڑانوالہ کے خطیب ہیں' وہ انشاء اللہ ضرور سنیں گے کیونکہ اکثر وہ اتباع سنت پر جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ اب اگر مولانا اس کے برعکس یہ دعویٰ کریں کہ محراب مسجد نبوی میں تھی اور یہی سنت ہے تو میری یہ درخواست ہے "ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین۔"

جناب مولانا عبدالحی صاحب فقیہہ لکھنوی کا فتویٰ: فرقہ حنفیہ میں جناب مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی شہرہ آفاق ہیں جن کی تصانیف کثیرہ عرب و عجم میں درج ہیں جو بڑی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک "مجموعہ فتاویٰ عبدالحی" مشہور ہے۔ اس کی جلد اول ص ۲۳۰ میں محراب کا فتویٰ بہت مفصل درج ہے' جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ مولانا لکھنوی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ

محرابوں میں فقہاء کی عبارتیں مختلف ہیں۔ بعض اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کا وجود زمانہ نبوی میں تھا اور بعض اس پر دلالت کرتی ہیں کہ محرابوں کی بناء محدث ہے۔ اور جو کچھ کتب احادیث سے ظاہر ہوتا ہے' یہ ہے کہ جس طرح اب محرابیں بنی ہیں' یوں زمانہ نبوی میں نہ تھیں بلکہ ان کی اصل نصاریٰ سے ہے۔ اور حضور سرور عالم ﷺ نے اس سے منع کیا ہے اور اس قطع کی محرابیں تابعین کے زمانہ میں حادث ہوئیں۔ اور ایک جماعت صحابہ نے اس کی مخالفت کی۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر درمنثور میں زیر آیۃ کریمہ "فنادته الملائكة وهو قائم يصلي في المحراب" تحریر فرماتے ہیں۔ طبرانی اور بیہقی نے اپنے سنن میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ان مذبحوں یعنی محرابوں سے بچو۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موسیٰ جہنی سے مروی ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ نے فرمایا ہے' میری امت جب تک اپنی مسجدوں میں نصاریٰ کے مذبحوں کی طرح مذبح نہ بنائے گی' اچھی رہے گی۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ابی مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سرور انبیاء علیہ السلام نے فرمایا ہے' ان محرابوں سے بچو۔

ابن ابی شیبہ نے عبید بن ابوالجعد سے روایت کی ہے کہ صحابہ کرام فرماتے تھے آثار قیامت سے یہ ہے کہ مسجد میں مذبح یعنی طاق (محراب) بنائے جائیں اور ابن ابی شیبہ نے ابی ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آثار قیامت سے یہ ہے کہ مسجدوں میں مذبح بنائے جائیں۔ اور کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسجد میں مذبح کا بنانا مکروہ ہے۔ اور سیوطی نے اعلام

الاراحیب میں لکھا ہے کہ لوگوں کو مسجد میں محراب کے بدعت ہونے کا علم نہیں اور ان کا خیال ہے کہ زمانہ نبوی میں مسجد نبوی میں محراب تھی۔ حالانکہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ہرگز محراب نہ تھی اور نہ خلفاء کے زمانہ میں تھی۔ پس سیوطی نے اس رسالہ میں اخبار اور آثار کا ذکر مع سند کیا ہے' منجملہ ان کے وہ اخبار ہیں جو در منثور میں منقول ہیں اور منجملہ ان کے یہ قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے "انما کانت المحاریب فی الکنائس فلا تشبہوا باھل الکتاب یعنی انہ کرہ الصلوۃ فی الطاق اخرجہ البزار فی مسندہ برجال ثقات" یعنی محرابیں وہ ہیں جو گرجوں میں ہوا کرتی ہیں۔ تم اہل کتاب کی مشابہت نہ کرو یعنی طاق میں نماز مکروہ ہے۔ اس کو بزار نے اپنی مسند میں ثقہ لوگوں سے نقل کیا ہے۔

پس متعدد محرابیں بنانا بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوا اور حرمین شریفین میں متعدد محرابیں بنائی گئیں تو اس زمانہ کے علماء نے منع کیا مگر بادشاہوں نے ان کی نہ سنی۔ ملا باقر آگاہ ایقاظ النیام میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے۔ سلف صالح میں جماعت کی تکرار اور محرابیں بنانا نہ تھا اور یہ تکرار جماعت حوادث زمانہ سے اور سنہ ۸۰۱ھ میں یہ محرابیں مکہ مکرمہ میں حادث ہوئی ہیں اور جماعت ثانیہ کا احداث سنہ ۹۲۸ھ میں ہوا اور محراب ثانی کا حدوث سنہ ۹۲۰ھ میں ہوا' انتہیٰ۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ تصور محاریب بلکہ نقش احداث محراب عصر نبوی اور عصر صحابہ میں نہ تھا پس ضروری ہوا کہ اس میں قیام سنت نہ ہو گا۔ اس لیے اکثر فقہاء اس کو "لا باس بہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں یعنی اس کا ترک کرنا اولیٰ ہے۔ البتہ صف پر امام کا تقدم اور اس کا ممتاز ہونا احادیث مرفوعہ وغیرہ سے ثابت ہے۔" انتہیٰ مسلق الفتویٰ۔

مخفی نہ رہے کہ مذبح طاق' محراب کو کہتے ہیں اور تکرار جماعت سے مراد مذاہب اربعہ کی تکرار جماعت ہے جو چار محرابوں میں ہوتی تھیں۔ مذاہب اربعہ' تکرار جماعت' محرابیں جو چار مصلے تھے' یہ سب بدعات میں شمار ہیں۔ ان سب سے بچنا علماء نے واجب قرار دیا ہے۔ مگر وقتی حکومتیں اس گمراہی کا تعاون کرتی رہی تھیں' اس لیے جاری ہو گئیں۔ جیسے اب حکومتیں علماء اسلام کے خلاف جس رسم' بدعت بلکہ شرک کو ترقی دیں تو وہ جاری ہو جائے گا۔ علماء کا فتویٰ نہیں مانا جاتا اور یہ مقولہ مشہور ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم یعنی ملک کے لوگ اپنے بادشاہوں کے دین و مذہب پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تقلیدی امت مسلمانوں میں

شمار ہے اور میلاد مروجہ بدعت سیہ تہوار بن گیا ہے' نعوذ باللہ منہم

علماء کرام کی گزشتہ تصریحات اور دلائل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ محراب مروجہ کا مسجدوں میں بنانا بدعت اور نماز اس میں مکروہ اور وہ مسجد کا حکم نہیں رکھتا' اسے توڑ دینا چاہیے جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمل کیا اور اب بھی بحکم حدیث اس پر عمل واجب ہے کہ حدیث میں مرتبہ اول یہ ہے من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ یعنی جب کوئی شخص تم میں سے برا کام دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے۔ لیکن اگر فتنہ و فساد اور شر کا اندیشہ ہو تو زبانی الہام اور قلبی نفرت پر قناعت کرے کہ یہ گمراہی کا دور ہے۔ اس میں احکام شرعیہ پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اعتقادی طور پر تو اہل حدیث کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ محراب مروجہ بدعت ہے۔ جن علماء نے یہ تاویل کی ہے کہ جن احادیث اور آثار میں محراب کی ممانعت آئی ہے' اس سے مراد یہ ہے کہ نصاریٰ کی طرح محراب نہ بناؤ۔ سو ہمارے محراب ایسے نہیں ہیں لہٰذا یہ ممنوع نہیں ہیں' یہ کہنا سراسر غلط ہے۔

جن احادیث اور آثار میں ممانعت آئی ہے' اس سے نفس محراب بنانے کی ہی مراد ہے خواہ بعینہٖ نصاریٰ کی طرح ہو یا اس سے جدا ہو کہ نفس محراب کے احداث میں اہل کتاب سے مشابہت پائی گئی ہے۔ اگر کسی قوم سے مشابہت کسی کام میں منع کی گئی ہو تو اس سے کلی مشابہت بھی حرام ہوتی ہے اور جزوی مشابہت بھی حرام ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ نے خطاب فرما کر یہ حکم دیا ہے "ولا تکونوا کالذین آذوا موسٰی الآیۃ" یعنی تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جاؤ جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دی ہے۔ یہ نفس ایذا میں ممانعت ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ جن لفظوں سے اور جس طریقہ اور صورت سے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دی تھی ویسی ایذا مراد ہے تو یہ سمجھنا بے وقوفی ہے۔ کیونکہ اس تشبیہ سے ہیئت کذائیہ اور صورت معمولہ بنی اسرائیل مراد نہیں بلکہ اپنے پیغمبر کی مطلق دل آزاری مراد ہے۔ خواہ کسی لفظ سے یا فعل سے ہو کہ وجود ایذا کا ہر طرح سے موجود ہے۔

اسی طرح حدیث میں اس عورت پر لعنت آئی ہے جو مردوں کی طرح لباس پہنے اور ان کی مشابہت کرے۔ پس اگر تمام لباس مردانہ پہنا کہ جس سے مرد اور عورت کا امتیاز نہ رہا تب بھی حرام ہے اور اگر صرف پگڑی سر پر باندھ لی تب بھی منع ہے۔ اسی طرح اس مروجہ

لعنت آئی ہے جو عورت کی طرح لباس پہنے اور ان کی مشابہت کرے۔ اب اگر عورت کا پورا لباس پہن کر مشابہت کی اکھاڑوں اور تماشوں میں مرد اکثر ایسا کرتے ہیں کہ زنانہ لباس پہن کر عورت کی طرح ناچ کرتے ہیں' یہ بھی حرام ہے۔ اور جزوی مشابہت مثلاً مرد گھاگھرو پہنے تو یہ بھی حرام ہے۔ احادیث "خالفوا المشرکین' خالفوا المجوس' خالفوا الیھود' ولا تشبھوا بالیھود" میں ہر طرح کی مشابہت حرام ہے۔ کلی بھی اور جزوی بھی اور مشابہت کرنے والا حدیث من تشبہ بقوم فھو منھم کا مصداق ہو گا یعنی جس شخص نے کسی قوم سے مشابہت کی وہ اسی قوم سے شمار ہو گا

اہل کتاب نصاریٰ یہود نے اپنے عبادت خانوں اور مسجدوں میں محراب بنائے خواہ ان کی شکل اور ہیئت کچھ ہو جب ہم کو منع کیا گیا کہ تم نصاریٰ کی طرح محراب نہ بناؤ تو اس سے بعینہ نصاریٰ کی طرح محراب بنانا جس طرح حرام ہے' اس طرح نفس محراب بنانا خواہ ان کی شکل کا نہ ہو تو یہ بھی منع ہو گا کیونکہ یہ مشابہت جزوی ہے۔ اس لیے عہد صحابہ میں کسی مسجد میں محراب بنایا گیا تو انہوں نے اس کو برا سمجھا حالانکہ وہ نصاریٰ کی شکل کا نہ تھا پھر بھی اس میں نماز مکروہ سمجھی۔ چنانچہ مجمع الزوائد مطبوعہ ہند جلد اول ص ۳۸ میں بروایت بزار حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یوں ذکر کی ہے "انہ کرہ الصلوٰۃ فی المحراب" کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ محراب میں نماز پڑھنا مکروہ جانتے تھے۔ اس روایت کے آخر میں صاحب مجمع الزوائد لکھتے ہیں "ورجالہ موثقون" کہ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ اسی بناء پر بعض فقہاء حنفیہ نے محراب موجہ میں نماز پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ غزنویہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے "وقالوا ای الحنفیہ یکرہ القیام فی الطاق لانہ یشبہ مع اھل الکتاب" یعنی فقہاء حنفیہ نے محراب موجہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ یہ اہل کتاب کے عمل کے مشابہ ہے۔ (اقتضاء صراط مستقیم)

محراب موجہ کو طاق کہا جاتا ہے جو دیوار قبلہ میں مجوف شکل کا بنایا جاتا ہے۔ اس کی شکل گو اہل کتاب کے محراب کی نہ ہو تب بھی اس میں نماز پڑھنا بروئے روایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فقہاء حنفیہ مکروہ کہتے ہیں اور اس کو اہل کتاب کے منبع کے مشابہ کہتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوا کہ محراب کے منع ہونے میں نفس محراب کا احداث ہی اہل کتاب کی مشابہت کے لیے کافی ہے کہ یہ مشابہت جزوی ہے جو حرام ہے اور اس کی تائید روایت علی رضی اللہ عنہ سے بھی

لکھا ہے "وتكره المحاريب في المسجد و واجب كنها وقال على اما المحاريب فمحدثة وانما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقف وحده ويصف صف الاول خلفه" یعنی مسجدوں میں محراب بنانے مکروہ ہیں اور مسجدوں سے ان کا صاف کر دینا واجب ہے کہ محراب بدعت ہیں۔ آنحضور ﷺ اکیلے کھڑے ہو جاتے (محراب نہ تھا) اور پہلی صف آپ کے پیچھے کھڑی ہو جاتی تھی۔

پھر لکھا ہے "وروينا عن علي بن ابى طالب انه كان يكره المحراب في المسجد" یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں محراب بنانا برا جانتے تھے۔ "وعن كعب يكون في آخر الزمان قوم تنتقص اعمارهم يزينون مساجدهم ويتخذون لها مذابح كمذابح النصارى فاذا فعلوا ذالك صب عليهم البلاء" یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایک قوم ظاہر ہو گی جن کی عمریں ناقص ہوں گی اور وہ مسجدوں کو رنگین اور زینت دار کریں گے اور مسجدوں میں نصاری کی طرح محرابیں بنائیں گے۔ جب انہوں نے یہ کام کیا تو ان پر مصیبت در مصیبت نازل ہو گی۔ امام ابن حزم نے ان روایتوں سے مطلق محراب بنانا منع سمجھا ہے خواہ وہ نصاری کی شکل کا ہو یا دوسری شکل کا ہو۔ مراد احداث محراب ہے جس طرح نصاری نے مسجدوں میں محراب کا احداث کیا موجب سے محرابوں کی بدعت شروع ہوئی ہے۔ اس امت پر دن بدن بلائیں آتی رہتی ہیں۔ جب مسجد نبوی میں عہد نبوی اور عہد خلفاء میں محراب کا وجود نہ تھا اور ان کے بعد مسجد نبوی میں محراب کو نکالا گیا گیا ہے تو پھر اس کے بدعت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ گو مشابہ نصاری نہ ہو کہ احداث محراب میں جزوی مشابہت پائی گئی ہے جو کافی ہے اور محراب ناجائز ہے۔ اب اس کے عام رواج سے متاثر ہو کر بعض علماء نے اس کو جائز قرار دیا تو علماء اہل حق نے اس کی مخالفت کی اور اس کو ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ زرکشی نے یہ لکھا ہے کہ "والمشهور الجواز بلا كراهة ولم يزل عمل الناس عليه من غير نكير" یعنی مشہور مذہب جواز بلا کراہت کا ہے اور لوگوں کا عمل اس پر ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور کسی نے انکار نہیں کیا ہے۔ امام سیوطی نے زرکشی کا جواب رد کر دیا۔

چنانچہ امام سیوطی کے شاگرد رشید علامہ علقمی رحمہ اللہ جامع صغیر کی شرح "الکوکب المنیر" مطبوعہ مصر جلد اول ص ۱۷۰ فیض القدیر میں رقمطراز ہیں "قال شيخنا المذهب المختار

الکراھة لو رود النھی عن طرق ولا نقل فی المسئلة فی المذھب ومستندہ فی قولہ المشھور استمرار عمل الناس وھذا لیس بحجة مع ورود الحدیث بذمہ والنھی عنہ وکم من بدعة لم یزل عمل الناس علیھا۔" یعنی ہمارے شیخ سیوطی نے زرکشی کی تردید میں یہ فرمایا ہے کہ مختار مذہب محراب کے مسئلہ میں یہ ہے کہ یہ بنانا مکروہ (بکراھة تحریمہ) ہے' جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی ممانعت شارع سے آچکی ہے اور نہ ہی اس بارے میں کوئی روایت مذہبی وارد ہے اور زرکشی کی سند صرف یہ ہے کہ لوگوں کا عمل اس پر چلا آرہا ہے۔ یہ کوئی دلیل شرعی نہیں ہے جبکہ متعدد طریقوں سے حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہو چکی ہے۔ بہت سی بدعتیں ایسی ہیں کہ عام لوگوں کا عمل ان پر مسلسل چلا آرہا ہے۔ مگر یہ جواز کی دلیل شرعی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ زرکشی کا یہ کہنا کہ لوگوں کا تعامل اس پر جاری ہے" بالکل غلط ہے۔ علماء اہل حق ہر زمانہ میں اس پر انکار کرتے رہے ہیں۔ لیکن عوام میں عادت بھیڑ چال کی ہے کہ ایک دوسرے کے دیکھا دیکھی عمل شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے ایک گدھا سنگنے لگے تو دوسرے گدھے بھی سن کر سنگنے لگتے ہیں۔ کسی میں یہ لیاقت نہیں کہ پہلے کے بولنے کی وجہ معلوم کر سکے۔ ہمارے زمانے میں بعض حنفیہ نے جائز کہا تو بعض دیگر نے تردید کر دی اور بعض علماء اہلحدیث نے جائز کہا تو دیگر علماء نے اس کی تردید کر دی۔

چنانچہ مولوی عبداللہ غلائی نے جائز کہا تو بندے نے اس کی تردید کر دی ہے۔ مجھے زیادہ تعجب تو ان علماء اہل حدیث پر ہے جن کے فتوے فتاوی ثنائیہ میں جمع کیے گئے ہیں اور وہ یہ لکھتے ہیں کہ محراب قرآن و حدیث سے بنانا ثابت ہے۔ پھر بعض آیات قرآن سے نقل کر کے ان سے استدلال کیا ہے جو سراسر سینہ زوری ہے۔ اگر قرآن و حدیث سے محراب بنانا صریحا ثابت ہوتا تو اہل حدیث میں ہرگز اختلاف نہ ہوتا اور نہ فقہاء ہی اختلاف کرتے۔ قرآن میں جس محراب کا ذکر ہے' وہ اہل کتاب کا محراب ہے جس کو بالاخانہ اور چوبارہ کہتے ہیں اور بعض جگہ صرف مصلی مراد ہے۔ محراب موجبہ ہرگز مراد نہیں ہے۔

اچھا اگر قرآن میں محراب سے مراد مروجہ محراب مجوف ہے تو پھر یہ اہل کتاب کا محراب ہے۔ جس کو مجوزین نے تسلیم کیا ہے کہ ان کے مشابہ محراب بنانا ناجائز ہے تو پھر مروجہ محراب ان کے قول سے ہی ناجائز ہو گیا۔

قرآن میں ہے ام لهم شركاء شرعوالهم من الدين مالم يأذن به الله یعنی کیا ان کے لیے ایسے شریک ہیں جو دین میں ان کے لیے ایسی چیزیں مشروع کرتے ہیں جن کا اذن اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا اور آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد (مسلم) یعنی جس شخص نے ایسا کام کیا کہ اس پر ہمارا حکم وارد نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔" اس حدیث کے تحت امام نووی فرماتے ہیں: "هذا الحديث قاعدة عظيمة من قواعد الاسلام وهو من جوامع كلمه صلى الله عليه وسلم فانه صريح فى رد كل البدع والمخترعات۔ یعنی "یہ حدیث اسلامی اصول میں سے بڑا اصل اور قاعدہ عظیمہ ہے اور آنحضرت ﷺ کے جامع کلموں سے بڑا جامع کلمہ ہے جس سے تمام بدعات اور اختراعی امور کا صریح رد ہو جاتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں هذا الحديث مما ينبغى حفظه واستعماله فى ابطال المنكرات واشاعة الاستدلال به۔ (مسلم ج۔۲' ص۔۷۷) یعنی اس حدیث کو یاد کر لینا چاہیے اور جملہ منکرات کے باطل کرنے کے لیے اس کو استعمال کرنا اور اس کے ساتھ استدلال کرنے کی اشاعت کرنا نہایت مناسب ہے۔"

پس اس قاعدہ عظیمہ کی رو سے نماز مغرب کے لیے غروب آفتاب سے پہلے اذان کہنا بدعت ہے اور اس اختراعی امر کو سنت نبوی قرار دینا شرالامور میں سے ہے۔ لہذا بحکم نبوی تمام مسلمانوں کو اس سے بچنا واجب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ایاکم والمحدثات فان كل محدثة ضلالة (ترغیب) یعنی تم دین میں نئے کاموں سے بچو کیونکہ ہر کام نیا دین میں پیدا کرنا گمراہی ہے۔

اذان کی مشروعیت ⇦ (۱) شرعی اذان جو نماز کے اوقات میں کہی جاتی ہے اس کی تعریف یہ ہے "الاذان هو الاعلام بدخول وقت الصلوة بالفاظ مخصوصة" (نیل الاوطار ج۔۲' ص۔۴۰) یعنی شارع کے مقرر کردہ خاص الفاظ کے ساتھ نماز کا وقت آنے کی لوگوں کو اطلاع دینے کا نام اذان ہے۔"

حاشیہ مشکوۃ از مظاہر حق جلد اول' ص۔۲۳۸ میں ہے "اذان لغت میں بمعنی خبر کرنے کے ہے اور شرع میں کہتے ہیں خبر کرنے کو ساتھ آنے وقت نماز کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کے اوقات مخصوصہ میں" الخ۔ یاد رکھئے کہ اذان کا لفظ اسم مصدر ہے جو

اذن بالفتح سے مشتق ہے' جس کے معنی سننے کے ہیں تو اذان کے معنی سنانے کے ہوئے۔ چونکہ سنانے سے سننے والے کو خبر ہو جاتی ہے' اس لیے حاصل معنی خبر کرنا ہوا' یعنی لوگوں کو خاص آواز سے پکار کر یہ خبر کر دینا کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے کہ تم آجاؤ اس کو اذان کہتے ہیں۔ پس اس تعریف سے ہی یہ واضح ہو گیا کہ اذان شرعی وہ ہے جو نماز کا وقت ہو جانے کے بعد کہی جائے اور جو وقت ہونے سے پہلے کہی جاتی ہے وہ شرعی اذان نہیں ہے۔ بلکہ جھوٹی خبر ہے جو ناجائز ہے۔

فتح الباری ج۔۲' ص۔۳۸ میں علامہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ان الاذان اعلام عند دخول الوقت عمدۃ القاری۔ عمدۃ القاری ج۔۵' ص۔۱۴۲ میں علامہ خطابی سے منقول ہے: ان الاذان اعلام بورود وقت الصلوۃ والاقامۃ امارۃ القیام للصلوۃ۔ یعنی اذان نماز کا وقت آنے کی عام اطلاع ہے تاکہ لوگ حاضر ہو کر نماز پڑھ لیں اور تکبیر اس بات کی اطلاع ہے کہ نماز قائم ہو گئی ہے' جماعت میں شامل ہو جائیں۔

مؤذن کیسا ہونا چاہیے؟

واضح ہو کہ پانچ وقتی نماز کی اذان کے لیے مؤذن کا انتخاب کیا جائے۔ تو شرعی دستور کی رو سے مؤذن کے رفیع الصوت ہونے کے علاوہ اس کا شریف صالح اور متقی ہونا ضروری ہے۔ فاسق اور شریر شخص مؤذن بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کو ایک موقعہ پر فرمایا۔ اجعلوا مؤذنکم افضلکم فی انفسکم (بیہقی جلد' ص۔۴۲۶) مؤذن اپنے میں سے بزرگ ترین اور افضل شخص کو کیا کرو۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مؤذن کا سب سے افضل ہونا ضروری ہے۔

سنن ابی داؤد میں دوسری حدیث وارد ہے لیؤذن لکم خیارکم کہ تمہارے لیے اذان وہ لوگ دیا کریں جو سب سے بہترین ہوں۔ بعض لوگ امام کے لیے تو خیر الناس اور افضل ہونے کا انتظام کرتے ہیں مگر مؤذن کی بابت اہتمام نہیں کرتے۔ خصوصاً دیہات میں تو بہت برا حال ہے کہ جو ایرا غیرا نتھو خیرا آتا ہے' اذان کہہ دیتا ہے۔ کئی

ص ۳۲۱)۔

موذنوں کی گردنوں میں مسلمانوں کی نمازیں اور روزے معلق ہیں۔ وہ اگر اپنا فریضہ ٹھیک نبھائیں گے تو سب نمازیوں کی تعداد کے مطابق ان کو اجر ملے گا اور بہت سی نیکیاں ان کو حاصل ہوں گی۔ اذان اور موذنوں کی بڑی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ اس لیے سلف صالحین میں اس عہدہ کو بڑے بڑے علماء اور اتقیاء بڑی خوشی سے قبول کرتے رہے ہیں۔ جس کو اب حقیر اور موجب عار تصور کیا جاتا ہے۔

فتح الباری جز ۳ ص ۳۲۳ میں ہے: وصح عن عمر ولو اطيق الاذان مع الخليفى لاذنت۔ (رواہ سعید بن منصور) یعنی "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں فریضہ خلافت ادا کرنے کے ساتھ اذان دینے کا کام بھی انجام دے سکتا تو میں اذان دیا کرتا۔"

مجمع الزوائد میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ندمت ان لا اكون طلبت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم ليجعل الحسن والحسين مؤذنين۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط) یعنی "مجھے اس بات کی بڑی پشیمانی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست نہ کی کہ آپ امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو ہمیشہ کے لیے موذن مقرر کر دیں۔"

افسوس ہے کہ اب اشراف لوگوں اور خوشحال انسانوں نے اذان دینا حقیر اور کسر شان سمجھ لیا ہے اور انہوں نے بری الذمہ ہو کر یہ عہدہ غریب اور سفلہ لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔ جس پر یہ حدیث صادق آتی ہے جو آپ نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی کہ ان يكون بعدكم قوم سفلتهم مؤذنوهم۔ (رواہ بزار) یعنی "تمہارے بعد ایسی قومیں ہوں گی کہ ان کے موذن نیچ اور کمینہ لوگ ہوں گے۔" تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ "تحقیق یہ ہے کہ سابق زمانہ میں ائمہ موذنین اور خطیب ان کاموں کو حسبتاً للہ انجام دیتے تھے چنانچہ یہ کام قاضی، مفتی، محتسب اور عامل بھی کرتے تھے اور ہمارے ملک میں تو الٹا ہی حال ہے کہ جاہل، رذیل بلکہ بدتر موذن ہیں۔ حالانکہ جہاں بدتر موذن اور امام ہو، وہاں نماز نہ پڑھنا چاہیے۔ الا مجبوراً مضطراً۔"

چنانچہ منقول ہے عن مجاهد قال کنت مع ابن عمر فثوب رجل فی الظهر او العصر قال اخرج بنا فان هذه بدعة۔ (ابوداؤد) یعنی "حضرت مجاہد تابعی نے بیان کیا کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ تھا۔ ایک شخص نے ظہر یا عصر کی نماز میں تثویب کی تو ابن عمرؓ نے مجھے کہا نکل چل یہاں سے' کہ یہ بدعت ہے۔" اس حدیث سے ظاہر ہے کہ بدعت ایسی بری چیز ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جلیل القدر صحابی اس سے نفرت کر کے مسجد سے چلے گئے اور امام مجاہد اپنے ساتھی کو بھی نکال لے گئے حالانکہ اذان کے بعد مسجد سے نکلنا منع ہے لیکن بدعت کی وجہ سے یہ ممانعت ساقط ہو گئی۔ دوسری جگہ ہے اخرج بنا من عند هذا المبتدع ولم یصل فیه۔ وہاں نماز نہ پڑھی' لیکن اگر اقتدار رکھتا ہو تو اس بدعتی کو نکال دے پھر وہاں نماز پڑھ لے۔ جیسا کہ امام نووی نے شرح مہذب میں لکھا ہے روی ان علیا رای مؤذنا یثوب فی العشاء فقال اخرجوا هذا المبتدع من المسجد وعن ابن عمر مثله۔ (بحر الرائق بیان تثویب جلد اول' ص ۲۶۱) یعنی حضرت علیؓ نے مؤذن کو دیکھا کہ وہ عشاء کی نماز میں تثویب کر رہا ہے۔ فرمایا اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو۔

"تثویب" نماز کے بعد لفظ "الصلوۃ الصلوۃ" کہہ کر پکارنے کو کہتے ہیں' یہ بدعت ہے۔ اذان کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اہل بدعت کی مساجد میں جبکہ وہاں مؤذن امام وغیرہ بدعات کا ارتکاب کر رہے ہوں جانا اور وہاں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ لیکن اس عہد حاضر میں مداہن مولوی اہل بدعت سے سلام و مصافحہ کرتے اور میل جول رکھتے ہیں اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے اور اس کو اخلاق حسنہ تصور کرتے ہیں اور جو نفرت کرے اس کو سخت گو' بد اخلاق ٹھہراتے ہیں جو سراسر گمراہی ہے۔

بہرحال عہد حاضر کے مؤذنوں کا برا حال ہے کہ اذان سے پہلے بھی صلواتیں پڑھتے ہیں اور بعد میں بھی کئی بدعتیں کرتے ہیں۔ خصوصاً دیہات میں اکثر غیر متشرع ہیں۔ جب یہ مرض عام ہے تو بغیر کسی سیاسی قوت کے اس کی اصلاح مشکل ہے۔ اب اگر اذان دینے سے اس عہد کے فاسقین کو روکا جائے اور صالحین اذان کو اختیار نہ کریں تو اذان کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ چنانچہ بعض دیہات ایسے ہیں کہ وہاں اذان ہی

نہیں ہوتی' نمازی لوگ فرداً" فرداً" اپنی اپنی نمازیں پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ اب اگر مفتیان زمان جو غیر معصوم اماموں کو معزول کرنے کا فتویٰ دیتے ہیں اور حدیث اجعلوا ائمتکم خیارکم پڑھ کر سناتے ہیں" وہ مؤذنین فاسقین کی معزولی کا بھی فتویٰ دیں تو بس دیہات میں اذانوں کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ جن سے بادشاہ اہل اسلام کو شرعاً" قتل کرنا جائز ہو گا تو پھر عہد حاضر میں یہ فتویٰ دینا لازم ہے کہ نمازیوں کو صالح اور عالم مؤذن تلاش کرنا چاہیے۔ اگر نہ ملے تو کم از کم جس قوم کا جو مؤذن ہو' ان سے وہ بہتر ہونا چاہیے۔ اگر ایسا بھی نہ ملے تو جیسا ملے اذان پر مقرر کر دینا چاہیے۔ وہاں یہ اصول نافذ ہو گا کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ یعنی "اگر کامل چیز میسر نہ ہو تو ناقص کو بھی چھوڑا نہ جائے۔" اسی طرح بعض جگہ نابینے اشخاص دیہات میں مؤذن مقرر ہیں' یہ بھی جبکہ اس کے ساتھ بصیر یعنی بینا نہ ہو تو نابینا اذان نہیں دے سکتا کیونکہ اس کو نمازوں کے اوقات کا پورا علم اور پابندی مشکل ہے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم عہد نبوی میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی معیت اور ماتحتی میں مؤذن مقرر تھے۔ مستقل تمام نمازوں کے اوقات کے لیے کوئی نابینا مؤذن مقرر نہیں کیا گیا کہ اس کو استقبال قبلہ میں ہونا بھی مشکل ہے۔ امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں نابینا کی اذان کے جواز کا باب تو باندھا ہے' مگر اس کو مقید کر دیا ہے کہ باب اذان الاعمیٰ اذا کان لہ من یخبرہ یعنی "اندھے کی اذان کا بیان جبکہ ان کے لیے خبر دینے والا مقرر ہو۔" اس سے ظاہر ہے کہ اگر خبر دینے والا ساتھ نہ ہو تو اندھا مؤذن نہیں بن سکتا۔

مسلم شریف میں بھی جو باب باندھا گیا ہے' اس میں بھی اذا کان معہ بصیر کی قید ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں قال اصحابنا ویکرہ ان یکون الاعمیٰ مؤذنا وحدہ۔ ہمارے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ جب اندھے کے ساتھ بصیر کا التزام و اہتمام نہ ہو تو اس کو مؤذن مقرر کرنا مکروہ ہے۔ فقہاء حنفیہ نے بھی نابینا کی اذان کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اہل حدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔ مجمع الزوائد میں ہے کہ عن ابن مسعود قال ما احب ان یکون مؤذنوکم عمیانکم (رواہ الطبرانی فی الکبیر۔ (ج ۹' ص ۔ ۳۳) یعنی میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تمہارے مؤذن نابینے ہوں۔

سنن کبریٰ بیہقی ج ۱ ص ۴۲۶ میں ہے کہ عن ابی عروبۃ ان عبداللہ بن الزبیر کان یکرہ ان یکون المؤذن اعمیٰ. یعنی "عبداللہ بن زبیرؓ نابینے کو مؤذن بنانا مکروہ کہتے تھے۔"

خلاصہ بحث یہ ہے کہ مؤذن بینا، عقلمند اور متقی اور عالم اوقات و سنت ہونا چاہیے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: وینبغی ان یکون المؤذن صالحا تقیا عالما بالسنۃ المطھرۃ۔ لیکن آج جب کہ عام طور پر ایسے مؤذن بالخصوص قوم کو اپنے سے ملتزم ہو جو مؤذن میسر ہو جائے اسی کے ذریعے مسجد آباد رکھیں۔ ایسے موقع پر فقہاء کا یہ قاعدہ نافذ ہو گا الضرورات تبیح المحظورات کہ ضرورتیں ممنوع چیزوں کو بھی مباح کر دیتی ہیں۔ اسی بنا پر امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الام" میں فرمایا ہے کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ مؤذن محض ثواب جان کر اذان کہنے والے ہوں۔ امام وقت کو اگر ثواب جان کر کہنے والا مؤذن ملے تو تنخواہ پر کوئی مؤذن نہ رکھے۔ مگر یہ کہ بیت المال سے کچھ دے دیا کرے۔ میں کسی شہر میں مؤذن ایسا جو ثواب کی نیت سے اذان دیتا ہو، نایاب تصور نہیں کرتا۔ ہاں اگر ایسا نہ ملے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے کہ مؤذن کو وظیفہ مقرر کر کے رکھ لیا جائے لیکن بیت المال کے خمس سے حصہ دیا جائے۔

علامہ ابن عابدین الشامی میں لکھتے ہیں: اگر اذان و امامت وغیرہ کی وجہ سے امام و مؤذن وغیرہ دوسرے ذریعہ معاش سے مستغنی نہ ہو سکے تب تو اس کو بقدر ضرورت لینا جائز ہے اور اگر یہ ذمہ داریاں دوسرے ذریعہ معاش میں حارج نہیں ہیں تو مشاہرہ قبول کرنا چاہیے۔ (نظام مساجد ص [illegible])

امام ابن حزمؒ محلی ج ۳ ص ۱۴۵ میں فرماتے ہیں: ولا تجوز الاجرۃ علی الاذان فان فعل ولم یؤذن الا للاجرۃ لم یجز اذانہ ولا اجزأت الصلوۃ بہ. یعنی اذان پر مزدوری، تنخواہ لینی جائز نہیں ہے۔ اگر لے گا اور بغیر اجرت کے اذان نہ دے گا تو اس کی اذان ناجائز ہوگی اور اس اذان سے جو نماز پڑھے گا وہ کفایت نہ کرے گی۔

باوجود اس قدر سخت حکم لگانے کے یہ فرماتے ہیں: وجائز ان یعطیہ علی سبیل البر وان یرزقہ الامام کذلک. یعنی لوگ حسن سلوک کی نیت سے مؤذن کو کچھ دے دیں یا امام بیت المال سے کچھ دے دے تو جائز ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث میں ہے حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ مجھے میری قوم کا آپ امام مقرر کر دیں تو آپ نے ان کو امام مقرر کر دیا اور فرمایا کہ ضعیف، بوڑھوں کی رعایت رکھنا اور یہ فرمایا: اتخذ مؤذنا لا یاخذ علی اذانہ اجرا (الخوجہ الخمسة) یعنی مؤذن ایسا مقرر کرنا جو اذان پر مزدوری نہ لے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں: والعمل علی ھذا عند اہل العلم کرھوا ان یاخذ علی الاذان اجرا واستحبوا للمؤذن ان یحتسب فی اذانہ۔ یعنی اہل علم کا اسی حدیث پر عمل ہے کہ وہ اذان پر مزدوری، تنخواہ لینا مکروہ اور ناپسند سمجھتے ہیں اور ثواب کے لیے اذان دینا مستحب جانتے تھے۔

حنفیہ میں سے متقدمین نے اذان پر اجرت کو حرام کہا، جیسے تعلیم القرآن پر معاوضہ حرام کہا، پھر متاخرین نے ضرورت کے پیش نظر جائز کر دیا۔ اسی طرح امام کو اذان کا عہدہ لینا جائز نہیں ہے کہ مؤذن اور امام دو الگ الگ عہدے ہیں۔ دونوں کے لئے دو شخص الگ الگ مقرر ہونے چاہیں۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ اتخذ مؤذنا۔ یعنی "مؤذن مقرر کر لے۔"

اسی پر عہد نبوی اور عہد خلفاء میں تعامل تھا کہ امام اور مؤذن دو شخص الگ الگ مقرر چلے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا بھی دونوں کے لیے الگ الگ کی ہے: اللھم ارشد الائمة واغفر للمؤذنین۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی) یعنی اے اللہ! اماموں کو ہدایت دے کہ وہ اپنے فرائض کو پورے طور پر ادا کریں اور خود بھی پابند رہیں اور مؤذنوں کو بخش دے یعنی ان سے جو گناہ ہوا اور کسی طرح کی یا زیادتی اور اذان دینے میں سستی اور غفلت ہوئی تو وہ ان کو بخش دے۔

اس سے اذان اور امامت دو منصب ظاہر ہوئے۔ جس کے لیے دو شخص درکار ہیں۔ دونوں کو ایک ہی سنبھالنے کا مجاز نہیں ہے۔ امام بیہقی نے ایک حدیث سنن کبریٰ جلد اول، ص۔۴۳۳ میں نقل کی ہے کہ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یکون الامام مؤذنا۔ یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کو مؤذن بننے سے منع فرمایا ہے۔"

اس روایت کی اسناد ضعیف ہیں مگر تعامل سلف اس کو تقویت دے رہا ہے۔ لیکن

سفر میں یا جہاں دوسرا اذان دینے والا کوئی نہ ہو تو ایک ہی شخص دونوں کام کر سکتا ہے۔ اس لیے اہل دیہات کا یہ حال ہے کہ مسجد کی خادمی' تاذین و اقامت سب ایک ہی شخص نے سنبھال رکھی ہیں۔ مگر جہاں درس گاہیں ہیں یا دین کی عملی رونق اور آبادی ہے وہاں دو شخص علیحدہ علیحدہ مؤذن اور امام مقرر ہیں۔ یہی طریقہ مشروع اور معمول بہا سلف و خلف ہے کہ مؤذن اور امام کے الگ الگ فرائض ہیں اور وہ الگ الگ ہی درجے رکھتے ہیں۔ امام خلیفہ رسول اللہ ﷺ کا ہے اور مؤذن خلیفہ بلال رضی اللہ عنہ کا ہے۔ بلال سید المؤذنین ہے۔

تمام بحث اور مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ منصب تاذین بڑا عالی شان ہے جس کو آج حقیر سمجھ کر ادنیٰ لوگوں کو دیا جا رہا ہے اور خاندانی اشراف اس سے روگرداں ہیں۔ مجمع الزوائد اور سنن کبریٰ بیہقی میں ہے کہ قیس بن حازم کہتے ہیں کہ "ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے" انہوں نے ہم سے دریافت کیا کہ تمہارے مؤذن کون لوگ ہیں؟ ہم نے کہا کہ ہمارے خرید کردہ غلام اور آزاد کردہ غلام ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ کو افسوس سے اس طرح پھیر کر کہا کہ ہمارے غلام اور ہمارے آزاد کردہ غلام؟ یہی تو تمہارے میں بڑا بھاری نقص ہے۔ اگر میں خلافت کے ساتھ اذان کا فرض ادا کرنے کی طاقت رکھتا تو میں خود اذان دیا کرتا۔

اس سے اذان کی عظمت ظاہر کرنا مقصود ہے۔ بعض فقہاء نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ اس سے اذان اور امامت کا اکٹھا عہدہ لینا جائز ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ خلافت کبریٰ علیحدہ چیز ہے اور امامت صغریٰ علیحدہ ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

الاعتصام لاہور جلد-۲۱ شمارہ-۲۳'۱۴ مورخہ ۳۰ر اکتوبر' ۶ر نومبر سنہ-۱۹۶۹ء

دعاء اذان میں کلمہ "والدرجة الرفيعة" کی تحقیق

ابن السنی کی روایت کا محدثانہ جائزہ

احناف (مقلدین) نے جہاں اعتقادی اور عملی مسائل میں اختراع و احداث سے

کام لیا ہے' وہاں اذکار' اوراد' لوحیہ' مسنونہ میں بھی احداث فی الدین کا ارتکاب کیا ہے۔ مثلاً تعلیم محمدی کی رو سے سنت یہ ہے کہ جب اذان ہو تو سامع کو چاہیے جس مؤذن کے اذان کے کلمات کہے۔ مگر حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ کہے۔ اذان کا یہ جواب واجب ہے۔ جس سے اکثر لوگ غافل ہیں۔ وہ نام الٰہی سن کر جل جلالہ کہتے ہیں۔ پھر خاموش رہتے ہیں۔ جب اذان ختم ہو جاتی ہے تو کلمہ طیبہ لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ پڑھنے کے عادی ہیں۔ یہ طریقہ بدعت ہے۔ تمام کلمات اذان سوائے حیعلتین کے کہنے واجب تھے۔ پھر درود شریف پڑھنا واجب تھا۔ کیونکہ ایک تو آنحضرت ﷺ کا نام مبارک سنا گیا ہے اور دوم دعاء وسیلہ پڑھنی ہے اور دعا کی قبولیت درود پر موقوف ہے۔ درود کے بعد یہ دعاء پڑھنی ضروری ہے۔ اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلوٰۃ القائمۃ ات محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہ مقاما محمودن الذی وعدتہ۔

کتب صحاح ستہ حداول میں یہ دعا اسی قدر ہے۔ لیکن سنن بیہقی میں یہ الفاظ ایک روایت میں زائد مروی ہیں۔ "انک لا تخلف المیعاد۔" قال الحافظ فی الفتح زاد فی روایۃ البیہقی انک لا تخلف المیعاد۔

جو شخص اس سنت نبوی اور طریقہ مشروعہ پر عمل کرے گا تو اس کو مؤذن کے مساوی اجر ملے گا اور شفاعت نبی ﷺ کا مستحق ہو گا۔ یہ طریقہ قولی و فعلی سے ثابت شدہ ہے۔ جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اذان مغرب کے وقت ایک مخصوص دعا بھی مروی ہے۔

اب حنفیہ کا شرع محمدی میں اختراع و احداث ملاحظہ فرمائیے۔ فتاویٰ برہنہ جلد اول' ص ۲۲۱ میں ہے کہ "در فلاح ماشاء اللّٰہ کان وما لم یشاء لم یکن گوید۔" فتاویٰ عالمگیری جس کو پانچ سو (۵۰۰) علماء حنفیہ نے مرتب کیا ہے' اس کی جلد اول' ص ۲۱ میں ہے: وکان قولہ حی علی الفلاح ماشاء اللّٰہ کان ومالم یشاء لم یکن کذا فی المحیط السرخسی وھو الصحیح وکذا فی فتاوی الغرائب۔

خلاصہ ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ مؤذن جب حی الفلاح کہے تو سامع ماشاء اللّٰہ کان وما لم یشاء لم یکن کہے۔

اسی طرح فتاویٰ برہنہ جلد اول ص ٢٣١ میں ہے کہ در الصلوٰۃ خیر من النوم کہ صدقت وبررت مکرر را گوید و در دوم اللھم نبھنا من نومۃ الغافلین گوید (یعنی جب مؤذن الصلوٰۃ خیر من النوم کہے تو سننے والا صدقت وبررت کہے اور دوسری بار اسی کلمہ کے جواب میں یہ دعا پڑھے: اللھم نبھنا من نومۃ الغافلین۔ فتاویٰ عالمگیری میں بھی لکھا ہے کہ صدقت وبررت کہے۔

پھر برہنہ میں لکھا ہے کہ اقامت میں: اقامھا اللہ وادامھا ما دامت السموات والارض۔ بجواب قد قامت الصلوٰۃ کہے۔

عالمگیری میں بھی اسی طرح ہے کہ اذا بلغ قد قامت الصلوٰۃ یقول السامع اقامھا اللہ وادامھا ما دامت السموات والارض۔ پھر فتاویٰ برہنہ کی اسی جلد کے اسی صفحہ میں یہ لکھا ہے کہ شیخ التقریر گفتہ کہ بعد از فراغ گوید: اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلوٰۃ القائمۃ ات محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ وابعثہ المقام المحمود الذی وعدتہ انک لا تخلف المیعاد۔ یعنی شیخ التقریر میں یہ وارد ہے کہ اذان سے فراغت کے بعد یہ دعا پڑھے: اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ الخ۔

اس دعا میں الفاظ والدرجۃ الرفیعۃ زائد ہیں جو احادیث میں نہیں ہے۔

اب جاننا چاہیے کہ یہ تمام کلمات متقدمین حنفیہ کے اختراعیہ ہیں۔ احادیث نبویہ و آثار صحابہ میں ان کا ثبوت نہیں ہے۔ ہاں اقامت میں جواب صرف اقامھا اللہ وادامھا حدیث سے ثابت ہے۔ دعا اذان کا ثبوت ہے مگر اس میں کلمہ والدرجۃ الرفیعۃ کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ من ادعی فعلیہ البیان۔

کتاب تمییز الطیب من الخبیث کے ص ٨٥ میں ہے: الدرجۃ الرفیعۃ فیما یقال بعد الاذان قال شیخنا لم اره فی شیء من الروایات۔ یعنی "اذان کے بعد دعا میں "والدرجۃ الرفیعۃ" جو کہا جاتا ہے اس کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں ہے۔"

تلخیص الحبیر ص ٧٨ میں امام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ولیس فی شیء من طرقہ ذکر الدرجۃ الرفیعۃ۔ یعنی کلمہ والدرجۃ الرفیعۃ کا ذکر کسی روایت حدیث میں نہیں ہے۔ بعض علماء احناف کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس کلمہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ چنانچہ رد المحتار معروف شامی کے ص ٢٧٣ میں شرح منہاج ابن حجر سے نقل

کیا ہے: وزیادۃ والدرجۃ الرفیعۃ وختمہ بیا ارحم الراحمین لا اصل لھما۔ یعنی دعائے اذان میں والدرجۃ الرفیعۃ زیادہ کرنا اور اس کو یا ارحم الراحمین کے ساتھ ختم کرنا' دونوں بے اصل ہیں' جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

موضوعات کبیر ص ۳۸ میں علامہ علی قاری فرماتے ہیں: الدرجۃ الرفیعۃ فیما یقال بعد الاذان من الدعاء قال السخاوی لم ارہ فی شئی من الروایات۔ یعنی اذان کی دعاء میں جو کلمہ "الدرجۃ الرفیعۃ" عام طور پر کہا جاتا ہے' اس کا ثبوت کسی حدیث میں نہیں دیکھا گیا ہے۔

مذہب حنبلی کی کتاب "المقنع" جلد اول میں دعائے اذان لکھی ہے' اس میں یہ لفظ لکھا ہے' مگر اس کے حاشیہ پر محشی نے یہ لکھا ہے: قولہ الدرجۃ الرفیعۃ فلیست فی الصحیح ولم اقف علیہا فی شئی من کتب الحدیث۔ (ص ۲۵ کا حاشیہ) یعنی مؤلف مقنع نے جو کلمہ "الدرجۃ الرفیعۃ" لکھا ہے یہ صحیح بخاری یا دیگر صحیح حدیث میں نہیں ہے اور نہ اس کا ثبوت دیگر کتب حدیث سے مجھے ملا ہے۔

کتاب السنن والمبتدعات المتعلقۃ بالاذکار والصلوات کے ص ۳۳ میں ہے: "والدرجۃ الرفیعۃ" فی الثالثہ بدعۃ۔ یعنی دعائے اذان میں "والدرجۃ الرفیعۃ" پڑھنا بدعت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اہل علم پر یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ کلمہ "والدرجۃ الرفیعۃ" کا کسی روایت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی بناء پر حنفیہ کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے بہشتی زیور کے گیارہویں حصہ میں یہ دعا لکھی ہے تو اس کلمہ اختراعیہ کو حذف کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ دیگر کتب حنفیہ قدیمہ میں یہ کلمہ موجود ہے۔ اور دیگر مقلدین نے جو نماز کی کتابیں شائع کی ہیں' ان میں بھی یہ کلمہ درج ہے۔ حالانکہ یہ زیادتی یا اور اسی قسم کی اختراعیہ دعائیں اور کلمات بدعیہ حقیقیہ کی قسم میں داخل ہیں۔ کیونکہ اذکار و ادعیہ مسنونہ تو قیفی ہیں' ان میں کسی کو کمی بیشی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ بجواب حیعلتین کلمہ "ماشاء اللہ" کہنا بھی بے دلیل ہے۔ جس کا اعتراف مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے اپنی کتاب "نفع المفتی والسائل" میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: وذکرا لشیخ الدھلوی وغیرہ انہ لا اصل بقول ماشاء

اللہ والثابت بالاحادیث ہو الحوقلة فی الحیعلتین۔ یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ علماء نے ذکر کیا ہے کہ اذان کے جواب میں ماشاء اللہ کہنا بے اصل ہے۔

ایک اذان ہی میں حنفیہ نے کتنی تبدیلی کر دی ہے جو سراسر خلاف سنت ہے۔ اور پھر دعویٰ یہ ہے کہ ہم اہل سنت ہیں۔ قاضی عیاض نے اپنی کتاب شفا میں' جس کی تعریف میں حنفیہ رطب اللسان ہیں' یہ لکھا ہے: ومخالفة امره وتبديل سنته ضلال وبدعة متوعد من الله عليه بالخذلان والعذاب۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے حکم کی مخالفت اور آپ کی سنت میں تبدیلی گمراہی اور بدعت ہے۔ جس کی بابت اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت وعید' عذاب اور خواری کی وارد ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ عادل' راشد نے فرمایا کہ سن رسول الله صلى الله عليه وسلم و ولاة الامر بعده سننا ---- الاخذ بها تصديق بكتاب الله واستعماله طاعة لله وقوة على دين الله ليس لاحد تغييرها ولا تبديلها ولا النظر فى راى من خالفها من اقتدى بها فهو مهتد ومن انتصربها منصور ومن خالفها واتبع غير سبيل المؤمنين ولاه الله ماتولى واصلاه جهنم وساءت مصيرا۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے جو امور سنت ٹھہرا دیئے اور خلفائے راشدین نے ان کو نافذ کر دیا ہے' ان کو لینا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تصدیق ہے اور ان کا استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور دین الٰہی پر موقوف ہے۔ ان کو بدلنا اور ان کی ہیئت متغیر کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے اور نہ اس سنت کے مخالفین کی رائے پر غور کرنا چاہیے۔ جو لوگ ان امور مسنونہ کی اقتداء کریں گے' وہ ہدایت پائیں گے اور جو اس کی مدد کریں گے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کیے جائیں گے۔ اور جو ان کی مخالفت کریں گے اور غیر مسنونہ چیزوں کی اتباع کریں گے اور سلف صالحین کے طریقہ کے خلاف چلیں گے' وہ جہنم رسید ہوں گے۔

مزید افسوس یہ ہے کہ ہمارے بعض اہلحدیث بھائی باوجود اہل حدیث کہلانے کے دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ وہ بھی ان غیر معتبر فقہی کتابوں اور رسالوں سے متاثر ہو کر اس کلمہ کو جائز کہتے ہیں اور خود پڑھتے ہیں اور اپنی کتابوں میں اس کو لکھتے ہیں۔ اور یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ لفظ متوارث ہے۔ یعنی ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ حالانکہ کئی اکابر

اور دعائیں قرون ثلاثہ کے بعد متوارث بن گئی ہیں اور باوجود متوارث ہونے کے بدعات میں شمار ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے "نفع المفتی والسائل" میں لکھا ہے کہ قرآن ختم ہونے کے بعد دعاء کے لیے تراویح میں اختراع کیا بدعت ہے گو متوارث ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دعاء گنج العرش' دعاء سریانی' درود تاج' اور ہزارہ وغیرہ اب لوگوں میں متوارث بن گئے ہیں' مگر بدعت ہیں۔ کسی حدیث مرفوع یا موقوف یا تعامل صحابہ کرام سے ان کا ثبوت نہیں ہے اور ہر زمانہ کے محققین ان پر انکار کرتے چلے آئے ہیں۔ بس اسی طرح اس کلمہ "والدرجة الرفيعة" کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بے اصل اور بدعت ہے۔ کسی دلیل شرعی میں اس کا ثبوت نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک شخص نے دعاء ماثورہ پڑھی تو اس میں وبنبیک کی جگہ رسولک پڑھ دیا تو آپ نے فرمایا لا وبنبیک یعنی وبرسولک نہیں' اس جگہ وبنبیک ہے۔ اس پر علامہ شوکانی نے فرمایا کہ ان الفاظ الاذکار توقيفيه فی تعيين اللفظ و تقدير الثواب فربما كان فی اللفظ سر ليس فی الآخر۔ یعنی اذکار جو شارع سے منقول ہیں' وہ توقیفی ہیں۔ تعیین لفظ اور تقدیر ثواب شارع نے ٹھہرا دیا ہے۔ بسا اوقات جو لفظ شارع میں راز ہے' وہ دوسرے لفظوں میں نہیں ہوگا۔ لہٰذا سنت میں تبدیلی نہ کرنی چاہیے' خصوصاً اہلحدیث کو۔

<u>مولانا ابو عبدالجبار محمد جمل امرتسری سے تسامح</u> ⇐ امرتسر میں ایک مخلص عالم مولانا ابو عبدالجبار محمد جمل گزرے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب بنام "المرقاة فی احکام الصلوة" مشہور ہے اور فی الواقع اچھی کتاب ہے۔ مگر دعائے اذان میں انہوں نے باوجود عامل بالحدیث ہونے کے الفاظ "والدرجة الرفيعة" درج کر دیے ہیں۔ اور پھر حاشیہ کتاب میں اس کا ثبوت بھی دیا ہے کہ ابن السنی نے عمل الیوم واللیلہ میں زیادہ کیا ہے "والدرجة الرفيعة"۔

مولانا ممدوح کا حوالہ صحیح ہے۔ واقعی کتاب "عمل اليوم والليلة" میں ایک روایت درج ہے' جس میں یہ کلمہ مذکور ہے۔ میں نے اس روایت کی کتب اسماء الرجال اور کتب حدیث کی رو سے تحقیق کرنی شروع کی تو یہ روایت غلط ثابت ہوئی۔

مولانا محمد جمل مرحوم گو عالم تھے مگر انہوں نے اس روایت کو سطحی نظر سے ملاحظہ کیا' اور اس سے استدلال کر کے اپنی کتاب میں دعائے لاالٰہ میں یہ الفاظ نقل کر دیئے ہیں' جو مسامحت در مسامحت ہے۔

علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر باب نکاح الرقیق میں ٹھیک فرمایا ہے کہ کثیرٌ ما یقلد الساھون الساھین۔ یعنی بہت بھولنے والے ایسے ہیں جو بھولنے والوں کی تقلید کرتے چلے جاتے ہیں اور خود تحقیق نہیں کرتے۔

اکابر علمائے اہلحدیث سے اپیل ⇦ واضح ہو کہ امام حافظ ابن السنی کی کتاب "عمل الیوم واللیلۃ" میرے پاس موجود ہے' جو دائرۃ المعارف حیدر آباد (دکن) کی مطبوعہ ہے۔ اس کے آخر میں ایک اشتہار درج ہے' جس میں ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب دائرۃ المعارف کے افاضل اذکیا علماء کی تصحیح سے شائع کی گئی ہے' جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں' مولانا سید ہاشم ندوی' مولانا محمد ندوی' مولانا عبدالرحمان یمانی' مولانا محمد عادل قدوسی' مولانا سید احمد اللہ ندوی' مولانا سید حسن جمل اللیل المدنی' شیخ احمد بن محمد یمانی۔ یہ علماء وہ ہیں جو اپنے زمانے کے مشاہیر ہیں' جن کو جمل اللیل کی طفیل سے زیارت کی اور امید حاصل ہے۔

دائرۃ المعارف حیدر آباد (دکن) میں اکثر دینی کتابیں ان علماء کی زیر نگرانی اور تصحیح سے شائع ہوتی ہیں۔ چنانچہ مستدرک حاکم' سنن کبریٰ بیہقی وغیرہ حدیث کی کتابیں دائرۃ المعارف نے شائع کی ہیں۔ ان میں سے ایک امام ابن السنی کی "عمل الیوم واللیلۃ" بھی ہے جو انہی کی تصحیح سے ہندوستان میں شائع ہوئی ہے۔ پس ان مطبوعہ کتابوں میں متعمل عمداً نسخوں سے زیادہ یا کم الفاظ جو بھی طبع ہوئے ہیں' ان کے ذمہ دار یہی حضرات علماء کرام ہیں' چونکہ ابن السنی کی وہ روایت جو عمل الیوم واللیلۃ میں مذکور ہے' سند اور متن کے لحاظ سے مخدوش ہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ قلمی نسخوں یا مصر کے مطبوعہ نسخوں سے کرنا ضروری ہے' تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ روایت سند اور متن کی رو سے صحیح ہے یا غلط۔ اگر حیدر آباد کے مطبوعہ نسخہ کی عبارت تمام مصری نسخوں کے موافق ہے تو پھر اس کو قلمی نسخوں میں سہو کاتب پر محمول کیا جائے گا اور اگر موافق نہ ہوئی تو پھر اس میں دست تصرف نے کام کیا ہے' جس کی ذمہ داری حیدر آباد کے علمائے

جمعیت پر عائد ہوتی ہے۔

بنابریں یہ خادم المسلمین تمام اکابر علمائے اہلحدیث کی خدمت میں عموماً اور حضرت رئیس المحققین جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ اور جناب رئیس المحققین جناب حافظ محمد صاحب محدث گوندلوی اوام اللہ بقائہم اور جناب شیخ العلامہ مولانا عبدالجلیل صاحب محدث سامرودی مدظلہ العالی کی خدمت میں خصوصاً عرض کرتا ہے کہ اس روایت کا مقابلہ دیگر قلمی یا مطبوعہ نسخوں سے فرما کر اپنی اپنی تحقیق انیق سے جماعت اہلحدیث کو مستفید فرمائیں۔ یہ کار خیر اس قدر ضروری ہے کہ اس پر سنت اور بدعت کے ثبوت کا دارومدار ہے۔ اور محدثین محققین کی تحقیق کا راجح اور غیر راجح ہونا اس تحقیق پر موقوف ہے۔ لہٰذا اس کو معمولی سمجھ کر تساہل نہ فرمائیں۔ ضرور توجہ فرما کر اس پر اپنی رائے محققانہ کا اظہار کریں۔

سوف سعیکم یری ویکون سعیکم مشکورا۔

امام ابن السنی کی روایت پر تبصرہ ⇦ راقم الحروف نے روایت ابن السنی کی جو تحقیق کی ہے وہ اکابر علماء اہلحدیث کی عدالت میں پیش ہے۔ اس پر ذرا عمیق نظر سے غور فرمایا جائے کہ یہ درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو فھو المراد' ورنہ اس پر محققانہ تنقید فرما کر اس کو غلط ثابت کیا جائے گا پھر بندہ اپنی تحقیق واپس لے لے گا۔

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ کتاب "عمل الیوم واللیلہ" مطبوعہ حیدر آباد کی روایت جس میں الفاظ "والدرجۃ الرفیعۃ" درج ہیں' بالکل مخدوش ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔ اول اس روایت کی سند اور پھر متن پر غور کریں۔ چنانچہ وہ روایت بلفظہٖ درج ذیل ہے: حدثنا ابو عبدالرحمٰن اخبرنا عمرو بن منصور حدثنا علی بن عیاش حدثنا شعیب بن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال حین یسمع النداء اللّٰھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلوٰۃ القائمۃ ات محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ وابعثہ مقاما محمودن الذی وعدتہ حلت لہ الشفاعۃ یوم القیٰمۃ۔ (عمل الیوم واللیلہ ص ۴۷' مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد) یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اذان سن کر یہ دعا پڑھی: اللّٰھم رب ھذہ

الدعوة (آخر تک) تو اس شخص کے لیے میری شفاعت بروز قیامت حلال ہو جائے گی۔"

اس روایت منقولہ میں مجھے دو جگہ کلام ہے۔ اول سند مذکورہ کے راوی پر جس کے نیچے خط کشیدہ ہے اور دوم الفاظ "والدرجة الرفيعة" پر ہے۔ جو کہ اختراعی ہے۔ اس روایت میں یہ دونوں مقام مخدوش اور محل بحث ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ کتاب عمل الیوم واللیلۃ کے مؤلف ابوبکر احمد بن محمد السنی حافظ دینوری ہیں جو امام ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی کے شاگرد ہیں۔ چنانچہ اکمال فی اسماء الرجال ملحق بالمشکوۃ میں امام نسائی کے ترجمہ میں ہے: واخذ عنه الحديث خلق كثير منهم ابو القاسم الطبرانی وابو جعفر الطحاوی وابوبکر احمد بن اسحاق السنی الحافظ۔ امام نسائی سے بہت خلقت نے حدیث پڑھی ہے' جن میں سے خاص قابل ذکر یہ ائمہ ہیں۔ ابوالقاسم طبرانی' ابو جعفر طحاوی' ابوبکر احمد سنی حافظ۔ پھر مؤلف اکمال نے حافظ ابن سنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حافظ ابن السنی نے امام نسائی احمد بن شعیب سے علم حدیث حاصل کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ابن السنی امام نسائی صاحب سنن کے شاگرد ہیں اور وہ اپنی کتاب میں جہاں حدثنا ابو عبدالرحمٰن یا اخبرنا ابو عبدالرحمٰن کہتے ہیں' اس سے مراد امام نسائی ہی ہوتے ہیں۔

چنانچہ بعض جگہ صراحت بھی کر دیتے ہیں کہ حدثنا ابو عبدالرحمٰن النسائی (ص۔۲۵) اخبرنا ابو عبدالرحمٰن النسائی۔ (عمل الیوم واللیلۃ ص۔۲۲' ص۔۱۵)

اس تفصیل سے میرا مقصد یہ ہے کہ روایت مذکورہ بالا کی اسناد میں جو "حدثنا ابو عبدالرحمان" ذکر کیا گیا ہے' اس سے امام نسائی مراد ہیں۔ چنانچہ امام نسائی نے اس روایت کو اپنی سنن میں اسی سند سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ بالفاظہ یہ ہے: اخبرنا عمرو بن منصور قال حدثنا علی بن عیاش قال حدثنا شعیب عن محمد بن المنکدر عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من قال حین یسمع النداء اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة ات محمدن الوسيلة والفضيلة وابعثه مقاما محمودن وعدته الا حلت له شفاعتی یوم القيمة۔ (نسائی

شریف ص-۱۰) یہ روایت بمع سند و متن وہی روایت بعینہٖ ہے جو "عمل الیوم واللیلۃ" میں مذکور ہے۔ صرف اسناد و متن میں یہ فرق ہے کہ ابن السنی کی کتاب میں "حدثنا شعیب بن محمد بن المنکدر" مرقوم ہے۔ اور سنن نسائی میں "حدثنا شعیب عن محمد بن المنکدر" مذکور ہے۔ پس دونوں نقلوں پر اصلیت کے لحاظ سے غور کرنا چاہیے کہ کون سی صحیح ہے۔ سو یہ حقیقت ہے کہ نسائی کی نقل صحیح ہے اور ابن السنی کی غلط ہے۔ کیونکہ ابن السنی کی روایت میں شعیب کو محمد بن منکدر کا بیٹا قرار دیا گیا ہے حالانکہ شعیب اس کا بیٹا نہیں ہے۔ بلکہ شاگرد ہے جو اس سے روایت کرتا ہے۔ شعیب کے باپ کا نام دینار ہے۔

چنانچہ تقریب ص-۱۴۹ میں ہے: شعیب بن ابی حمزۃ الاموی مولاہم واسم ابیہ دینار ابو البشر الحمصی ثقۃ عابد۔ یعنی شعیب بن ابو حمزہ کے باپ کا نام دینار ہے اور کنیت اس کی ابو حمزہ ہے۔ پھر شعیب طبقہ سابعہ کا ہے، جو تبع تابعین کا طبقہ ہے۔ جس کو صحابہ سے ملاقات میسر نہیں ہوئی۔ پھر شعیب جابر صحابی سے بلا واسطہ روایت کس طرح کر سکتا ہے۔ وہاں محمد بن منکدر شعیب کا استاذ طبقہ ثالثہ کا راوی ہے جو تابعین کا طبقہ ہے۔ اس کو حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنھما سے ملاقات حاصل ہے۔ چنانچہ اکمال میں یہ تصریح ہے کہ اس نے جابر رضی اللہ عنہ سے سماعت کی ہے اور دیگر کتب صحاح میں محمد بن منکدر کی روایت جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اور شعیب کی کوئی روایت جابر رضی اللہ عنہ سے بلاواسطہ ثابت نہیں ہے۔ پس یہ سند سراسر مخدوش ہے۔

اگر اس روایت میں "شعیب بن محمد بن المنکدر عن جابر" کو صحیح قرار دیا جائے، جیسا کہ حیدر آبادی "عمل الیوم واللیلۃ" میں منقول ہے تو اس سے کئی غلطیاں لازم آئیں گی، جن کا بطلان ظاہر ہے۔

اول یہ کہ شعیب بن محمد المنکدر اسماء الرجال میں کوئی راوی موجود نہیں ہے۔ کتب اسماء الرجال کا مطالعہ کیا گیا، شعیب بن محمد بن المنکدر کوئی راوی نہیں ملا۔ من ادعی خلافہ فعلیہ البیان۔

دوم ابن السنی کی روایت امام نسائی سے ہے اور امام نسائی نے "شعیب عن محمد بن المنکدر" بیان کیا ہے، جس میں شعیب کا شاگرد ہونا ثابت ہوتا ہے۔ محمد کا

بیٹا' ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ابن السنی کی روایت صحیح سمجھی جائے تو نسائی کی روایت غلط ہو جاتی ہے' جو صحاح کی کتب ہے اور پھر نسائی اسناد ہے۔

سوم یہ کہ شعیب سے مراد ابوحمزہ کا بیٹا ہے' جس کا نام دینار ہے' کما فی التقریب۔ ترمذی شریف میں اس روایت کو امام ابوعیسیٰ ترمذی اپنے استاد سے لائے ہیں' فرماتے ہیں کہ ہم کو محمد بن سہل بن عسکر بغدادی اور ابراہیم بن یعقوب نے بیان کیا کہ علی بن عیاش نے ہم کو کہا: نا شعیب بن ابی حمزہ نا محمد بن المنکدر عن جابر یعنی "ہم کو شعیب بن حمزہ نے حدیث بیان کی وہ کہتے ہیں کہ ہم کو محمد بن منکدر نے حدیث بیان کی اور محمد بن منکدر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔" اس اسناد میں صاف وضاحت ہے کہ شعیب ابوحمزہ (دینار) کا بیٹا ہے۔ محمد بن منکدر کا نہیں اور جابر رضی اللہ عنہ سے محمد بن منکدر روایت کرتا ہے' شعیب نہیں۔

چہارم یہ کہ اگر ابن السنی کی روایت میں شعیب بن محمد کے علاوہ شعیب بن ابوحمزہ تسلیم کیا جائے تو بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ پھر امام ترمذی کا یہ فرمان غلط ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اس روایت پر یہ فرمایا ہے کہ لا نعلم احدا رواہ غیر شعیب بن ابوحمزۃ یعنی ہم جماعت محدثین نے شعیب بن ابوحمزہ کے علاوہ کسی راوی کو نہیں معلوم کیا۔ جس نے اس دعائے اذان کو بیان کیا ہو یعنی صرف شعیب بن ابوحمزہ ہی نے بیان کیا ہے۔

پنجم یہ کہ یہ سند کتب صحاح کی سندوں کے سراسر خلاف ہے۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو صحاح کی سندوں کا غلط ہونا لازم آتا ہے۔ بخاری شریف' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' ترمذی وغیرہ میں شعیب کو محمد بن منکدر سے روایت کرنے والا بیان کیا گیا ہے۔ کسی نے محمد بن منکدر کا بیٹا قرار دے کر جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا بیان نہیں کیا۔ چنانچہ نسائی اور ترمذی کا ثبوت تو گزر چکا۔ اب صحیح بخاری کا ثبوت ملاحظہ فرمائیے جو اصح الکتب ہے۔ حدثنا علی بن عیاش قال حدثنا شعیب بن ابی حمزۃ عن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبداللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من قال حین یسمع النداء اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلوۃ القائمۃ ات محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہ مقاما محمودا الذی وعدتہ حلت لہ شفاعتی

یوم القیمة (بخاری باب الدعاء عند النداء)

اس اسناد میں بھی شعیب بن ابی حمزہ محمد بن منکدر سے روایت کرنے والا ہے' اس کا بیٹا نہیں ہے اور جابر رضی اللہ عنہ سے شعیب نہیں روایت کرتا بلکہ محمد بن منکدر روایت کرتا ہے۔ پس ابن السنی کی روایت میں جو شعیب بن محمد بن منکدر عن جابر درج ہے۔ اگر یہ کسی کی سازش نہیں تو زبردست سہو ضرور ہے۔ ہاں ایک کمزور احتمال یہ بھی ہے کہ سہو کاتب ہو' بشرطیکہ قلمی نسخہ میں اسی طرح پایا جائے اور پھر ناقل نے اس سے اس طرح نقل کیا ہو۔ کاتب نے بجائے شعیب عن محمد کے شعیب بن محمد لکھ دیا ہو کہ عن کی بجائے بن لکھ دینا لغزش قلم ہو سکتا ہے۔ مگر آگے متن کی ذیل غلطی ہے جو اس پر دال ہے کہ لکاتہ یہ سہو کاتب نہیں' بلکہ عمداً یہ کارروائی کی گئی ہے' واللہ اعلم۔

ششم یہ کہ اگر ابن السنی کی یہ سند اسی طرح تسلیم کر لی جائے تو پھر "والدرجة الرفیعة" کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی اور اس سے استدلال صحیح نہیں ہو گا۔ کیونکہ پھر یہ روایت منقطع قرار پائے گی کہ شعیب کی ملاقات حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ شعیب بن ابو حمزہ تبع تابعی ہے' جو کسی صحابی سے نہیں ملا ہے۔ پس جس طرح سند کی غلطی کو سمجھا ہے' اس طرح ہی متن کی غلطی کو سمجھ لیں کہ روایت عمل الیوم واللیلة میں تو دعاء اذان میں کلمہ الفضیلة کے بعد "والدرجة الرفیعة" درج ہے۔ اور دیگر کتب حدیث میں جو شعیب سے بھی روایت اسی سند سے مذکور ہے' اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ جب سند ایک ہے' متن سب کا ایک ہے' صحابی جو مروی عنہ ہے وہ بھی سب کتب حدیث میں ایک ہے۔ خصوصاً نسائی کی روایت تو بعینہ ابن السنی کی روایت ہے۔ ان کی اسناد اور متن ہر دو میں اتحاد ہے۔ پھر ابن السنی میں الفاظ "والدرجة الرفیعة" کا ہونا' اور دیگر کتب حدیث میں نہ ہونا یہ صاف اس بات پر دال ہے کہ یہ روایت غلط ہے اور اس میں کسی کا تصرف ہے۔ یہ تصرف عمداً ہو یا سہواً ہو سکتا ہے کہ کاتب کو جو حنفی ہو گا' یہ دعا اس طرح یاد ہو گی' اس نے اپنی یاد والی اور ذہن نشین دعا لکھ دی ہو اور اصل متن پر غور نہ کیا ہو۔ اسی طرح تصحیح کرنے والے حنفی تھے' ان کو بھی یہ دعا اسی طرح یاد تھی۔ کسی نے غور نہ کیا کہ اصل

متن حدیث میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ یہ سب ساہون اپنے مذہبی بھائیوں ساہین کی تقلید کرتے چلے گئے۔ تقلید بری چیز ہے۔

بہرکیف کتاب عمل الیوم واللیلۃ کی روایت میں دو سخت ترین غلطیاں ہیں۔ اول اسناد میں اور دوسری متن میں ہے۔ اسناد میں شعیب عن محمد کی بجائے شعیب بن محمد ہو گیا' یا کر دیا۔ جس سے اسناد بجائے صحیح ہونے کے ضعیف ہو گئی اور متن میں "والدرجۃ الرفیعۃ" بڑھا دیا گیا یا بڑھ گیا۔ جو کسی روایت میں نہیں ہے۔ جس سے یہ دعاء کتب متداولہ کے خلاف ہو گئی ہے' اس لیے غلط ہے۔ ہاں اگر ابن السنی کی اسناد کتب صحاح کے علاوہ ہوتی تو پھر روات پر نظر کر کے یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کسی راوی کی زیادتی ہے۔ پھر اگر راوی ثقہ ہوتا تو اس کی زیادتی صحیح تصور کر لی جاتی۔ لیکن یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔ کیونکہ سب رواۃ نسائی والے ہیں۔ ان میں کوئی نیا راوی نہیں ہے تو پھر یہ زیادتی کس طرح صحیح کہی جا سکتی ہے۔

پس یہ ضرور ہے کہ اس کو یا تو کسی متعصب حنفی کی سازش کہی جائے یا لغزش کاتب قرار دی جائے۔ مگر احتمال اول غالب ہے کیونکہ مقلدین حنفیہ کا مذہب اکثر احادیث کے خلاف پڑتا ہے۔ یہ لوگ تقلید تو چھوڑتے نہیں قرآن و حدیث میں معنوی یا لفظی تحریف کرنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے مشفق دوست فاضل محترم مولانا محمد اشرف صاحب مدظلہ العالی نے گہری تحقیق سے کام لے کر حنفیہ کے کتب حدیث میں تصرفات ثابت کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو نتائج التقلید جو حضرت مولانا کی بڑی بے نظیر کتاب ہے' جس میں تقلید کا ستیاناس کر کے اس کے نتائج بد ظاہر کیے ہیں۔ کتاب نتائج التقلید کا ایک ایک نسخہ ہر اہلحدیث عالم کے پاس ہونا ضروری ہے۔ تاکہ کتب حدیث میں مقلدانہ تصرفات کا ہر ایک کو علم ہو جائے اور وہ تحقیق مسائل کے وقت کسی مقلد کے اس فریب سے دھوکہ نہ کھا جائے۔

بہرحال اس غلطی کے ذمہ دار دائرۃ المعارف کے علماء مصححین اور ناقلین ہیں جن کے اسماء گرامی پہلے درج ہو چکے ہیں۔ پس اب بھی علمائے حنفیہ کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ اس روایت کی اصلاح فرمائیں اور اس غلطی کا اعتراف کر کے اس سے بچنے کی لوگوں کو ہدایت کریں۔ ہاں اگر تنظیم اہلحدیث لاہور کے مضامین

نگاروں میں سے کوئی صاحب اس روایت کی صحت کا دعویٰ کریں تو پھر اس کو محدثانہ طریق سے ثابت کر کے دکھائیں۔ ہم ماننے کو تیار ہیں۔ ورنہ محدثین اور علمائے حنفیہ کی مختلف تصریحات سے ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ "والدرجة الرفیعة" کی زیادتی بالکل بے اصل ہے۔ اور اس کا کسی روایت مرفوع یا موقوف میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

چنانچہ تحفة الاحوذی شرح ترمذی (جلد اول' ص ۱۸۵) میں حضرت سید العلماء جامع کمالات صوری و معنوی' جناب مولانا عبدالرحمان صاحب محدث مبارک پوری فرماتے ہیں: قد اشتهر علی الا لسنة فی هذا الدعاء زیادتان' الاولی "انک لا تخلف المیعاد" فی اٰخره والثانیة "والدرجة الرفیعة" بعد قوله الفضیلة واما الاولی فقد وقعت فی روایة البیهقی کما عرفت واما الثانیة فلم اجدها فی روایة قال القاری فی المرقاة اما زیادة الدرجة الرفیعة المشهورة علی الا لسنة فقال البخاری لم اره فی شئی من الروایات۔ یعنی "دعائے اذان میں دو زیادتیاں زبانوں پر جاری اور مشہور ہیں۔ پہلی "انک لا تخلف المیعاد" اور دوسری "والدرجة الرفیعة" ہے۔ پہلی تو بیہقی کی روایت سے ثابت ہے اور دوسری کسی روایت سے بھی ثابت نہیں ہے۔ علامہ علی قاری حنفی نے بھی مرقاة میں یہ فرمایا ہے کہ "والدرجة الرفیعة" جو زبان زد عوام ہے' اس کی بابت امام بخاری کا یہ فرمان ہے کہ میں نے اس کو کسی روایت میں نہیں دیکھا ہے۔

جب تمام محدثین' متقدمین و متاخرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس زیادتی کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو پھر حیدر آبادی نقل روایت غلط ثابت ہوئی۔ اس سے علماء کو دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ جیسے مولانا محمد جمیل دھوکہ کھا گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایسے تصرفات اور غلطیوں سے محفوظ رکھے اور فریب کاروں کے دھوکہ سے بچائے' آمین۔ هذا ما عندی واللّٰه اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العالمین۔

الراقم عبدالقادر حصاری کان اللہ لہ

مدرس مدرسہ تقویة الاسلام ڈپ سنگھ والا

ریاست فرید کوٹ ضلع فیروز پور۔

صحیفہ اہل حدیث دہلی جلد ۲۱ شمارہ ۵، ۶ کے بابت ماہ جمادی الاولی و ثانی و ماہ رجب سنہ ۱۳۸۵ھ

و تنظیم اہل حدیث لاہور جلد ۱۳ شمارہ ۳۶، ۳۷، ۳۸ مورخہ ۱۶، ۲۳، ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۶۳ء

کلمہ "الصلوٰۃ خیر من النوم" اذان سحری میں مقرر ہے یا اذان فجر میں؟

رسالہ محدث لاہور ماہ محرم سنہ ۱۴۰۹ھ میں بیادہ عارف حصاری کا ایک مضمون اس عنوان سے شائع ہوا تھا کہ "کیا سحری کی اذان مسنون ہے؟" یہ مضمون مولانا ابوالبرکات احمد صاحب مفتی گوجرانوالہ پر تعاقب تھا کہ انہوں نے یہ لکھا تھا کہ عہد نبوی میں جو دو اذانیں موجود تھیں، ان میں پہلی اذان سحری کے لیے نہ تھی بلکہ تہجد کے لیے تھی۔

بیادہ نے اپنے مضمون میں جو صحیفہ اہل حدیث کراچی میں مسلسل شائع ہوا تھا، نہایت تفصیل کے ساتھ یہ شائع کر دیا تھا کہ اذان اول رات میں تھی اور یہ رمضان میں ہوتی تھی جو سحری کے لیے ہوتی تھی۔ فریقین میں اس مسئلہ پر مفصل بحث جاری رہی۔ مدیر محدث نے راقم السطور کے مضمون کا کاٹ چھانٹ کر بطور خلاصہ کے شائع کیا تھا اور خود ایں الفاظ تصدیق فرما دی تھی کہ مفتی گوجرانوالہ نے جو یہ لکھا کہ سحری کے لیے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرنا چاہیے' یہ امر بالمعروف کے ضمن میں داخل ہے۔ تب مدیر صاحب نے اپنے اداریہ نوٹ میں یہ لکھا تھا "حقیقت یہ ہے کہ اعلان کے مقصد ہی سے شریعت نے یہ اذان مقرر کی ہے اور اہم موقعوں پر اس کا استعمال سکھلایا ہے جو اعلان ہونے کے ساتھ عبادت بھی ہے۔

نبی ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں نماز کے علاوہ سحری کے لیے اور خطبہ جمعہ شروع ہونے سے قبل جمعہ کی تیاری کے لیے پہلی اذان کا ثبوت ملتا ہے۔ گویا صحابہ نے نبی ﷺ سے یہی سمجھا ہے کہ اگر کوئی اہم ضرورت ہو تو اعلان کے لیے الفاظ

مسنونہ کو ہی استعمال کرنا چاہیے۔ انتھیٰ کلامہ بلفظہ۔ یہ عبارت میرے مضمون کی جو محدث میں شائع ہوا تھا پوری تصدیق کرتی ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلفاء میں نماز کے علاوہ سحری کے لیے اذان تھی اور اعلان کے لیے بھی یہ طریقہ مسنون ہے۔

نیز لکھا تھا کہ اعلان کے لیے علاوہ الفاظ مسنونہ کے دیگر طریقے استعمال کرنے عبادت نہیں ہیں اور اذان کے علاوہ دیگر اعلانات سے ثواب وغیرہ کی فضیلتیں جاتی رہیں گی۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ مدیر محدث صاحب اذان سحری کو اعلان مسنون اور لاؤڈ اسپیکر کے اعلان کو غیر مشروع جانتے ہیں لیکن ماہ رمضان سنہ ۱۳۹۵ھ میں آکر اپنے اقرار سے بدل گئے اور اس میں یہ لکھا کہ پہلی اذان کا تعلق بھی فجری کے ساتھ ہے اور یہ لکھا کہ یہ اذان رمضان کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ یہ اذان تقریباً سارا سال ہوتی تھی اور پھر یہ لکھا کہ کلمہ الصلوٰۃ خیر من النوم فجر کی پہلی اذان میں مشروع ہے تاکہ لوگ نماز کے لیے تیاری کرلیں۔ اس لیے الصلوٰۃ خیر من النوم پہلی اذان میں موزوں ہے اور یہی احادیث سے ثابت ہے۔ پھر اپنے زعم کے مطابق چند روایات پیش کرکے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن بندہ کی تحقیق میں مدیر صاحب کے دونوں ہی مسئلے بالکل غلط ہیں۔ چنانچہ بندہ عارف حصاری نے انہی ایام میں ہر دو مسئلوں پر تعاقب کرکے ان کی تردید کردی تھی اور دفتر صحیفہ میں مضمون بھیج دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ڈاکیہ کی بھول سے میرا وہ مضمون غائب ہوگیا۔ چونکہ "الدین النصیحۃ" دین خیر خواہی کا نام ہے' اس لیے ان پر تعاقب کرنے کی ضرورت درپیش ہے۔ طبیعت اگرچہ علیل ہے' لہٰذا ہر دو مسئلوں پر تفصیل سے بحث کرنا دشوار ہے۔ البتہ دوسرے مسئلے پر کہ کلمہ الصلوٰۃ خیر من النوم اذان سحری میں ہے یا صبح کی اذان میں مقرر ہے۔ اپنا بیان عرض کرتا ہوں۔

پہلا مسئلہ تو مدیر محدث کے متعارض کلام سے ساقط الاعتبار ہوا تو دوسرے پر بحث ضروری ہے۔ واضح ہو کہ پہلی اذان جو رات کو ہوتی تھی یہ فجری نہیں ہے کیونکہ یہ فجر کے وقت میں نہیں ہوتی رات کو ہوتی ہے جس پر نص قطعی ناطق ہے ان بلالا یؤذن بلیل کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان کہتا ہے اس وقت تم کھاؤ پیو۔

اس لیے محدثین امام بخاری وغیرہ نے اس حدیث پر اذان قبل الفجر کے باب

باندھتے ہیں پس اس اذان کو فجر کی اذان کہنا تحکم اور سینہ زوری ہے۔
دوسری اذان جو فجر ہونے پر کہی جاتی تھی' وہ فجر کی ہے۔ کلمہ الصلوۃ خیر من النوم کہنا نماز فجر کی اذان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل ناطق ہیں۔

(۱) عون المعبود ص ۲۲۹ میں مسند احمد سے منقول ہے: لم یکن لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا مؤذن واحد فی الصلوات کلها فی الجمعة وغیرها یؤذن ویقیم۔ یعنی عام نمازوں جمعہ وغیرہ میں آنحضرت ﷺ کا صرف ایک ہی مؤذن تھا جس کا نام بلال تھا۔

(۲) ابوداؤد میں ہے: لم یکن لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا مؤذن واحد بلال۔

(۳) ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابیہ بیان کرتی ہے کہ میرا گھر مسجد کے ماحول میں تھا۔ فکان بلال یؤذن علیه الفجر فیاتی بسحر فیجلس علی البیت فینظر الی الفجر فاذا رای تمطی — ثم یؤذن۔ یعنی میرے مکان پر بلال فجر کی اذان کہتا تھا ایں طور کہ سحری کے وقت مکان پر آ کر بیٹھ جاتا اور فجر کی طرف نظر رکھتا تھا۔ جب دیکھتا کہ صبح صاف روشن ہو گئی تو اذان کہہ دیتا تھا۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ تمام نمازوں کے لیے مسجد نبوی میں صرف ایک ہی مؤذن تھا جس کا نام بلال ؓ تھا وہی صبح کی اذان کہتا تھا اور جن احادیث میں دو مؤذنوں کا ذکر ہے وہ قرائن سے ظاہر ہے کہ رمضان سے مختص ہیں۔ رمضان میں بلال ؓ سحری کی اذان دیتا تھا اور ابن ام مکتوم ؓ صبح پر تھا۔

(۴) عن عائشة قالت جاء بلال الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یؤذنه بصلوة الصبح فوجده نائما فقال الصلوۃ خیر من النوم فاقرت فی اذان الصبح (رواہ الطبرانی فی الاوسط) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک دن بلال ؓ نبی کریم ﷺ کی طرف آئے کہ آپ کو نماز کی بابت آگاہ کریں۔ پس بلال ؓ نے آنحضرت ﷺ کو سوتے ہوئے پایا تب بلال ؓ نے کہا الصلوۃ خیر من النوم پھر یہ کلمہ اذان صبح میں مقرر کیا گیا۔

اس حدیث سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ صبح کی اذان بلال ﷺ دیا کرتے تھے۔ دوسرا یہ ثابت ہوا کہ یہ کلمہ بلال ﷺ کے منہ سے نکلا اور نماز صبح کی اذان میں مقرر ہوا۔

(۵) مجمع الزوائد باب مشروعیۃ الاذان میں یہ حدیث ہے: عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما جعل الاذان الاول لتیسیر اهل الصلوۃ لصلوتهم فاذا سمعتم الاذان فاسبغوا الوضوء واذا سمعتم الاقامۃ فبادروا التکبیرۃ الاولی الحدیث۔ یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پہلی اذان تو نمازیوں کی آسانی کے لیے مقرر کی ہے کہ نماز کے لیے تیاری کرلیں جب تم یہ اذان سنو تو وضو اچھی طرح کرلو۔ اور جب اقامت سن لو تو تکبیر اولی میں جلدی ملنے کی کوشش کرو۔

اس حدیث میں نماز صبح کا کوئی ذکر نہیں ہے اور پہلی اذان اقامت کے مقابلہ میں ذکر ہوئی ہے تو اقامت دوسری اذان ہے۔ اس کو اقامت بھی کہتے ہیں اور اذان بھی کہا جاتا ہے۔

عون المعبود ص ۲۰۱ میں ہے: تعبیرہ بالاولی باعتبار الاقامۃ فانها ثانیۃ۔ یعنی اذان کو اولی باعتبار اقامت کے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اذان ثانیہ ہے۔

(۶) نسائی میں ابومحذورہ ﷺ کی اذان کا ذکر ہے: فعلمنی کما تؤذنون الان۔ ابومحذورہ ﷺ نے کہا حضور ﷺ مجھے اذان کی تعلیم دیجئے جیسا کہ آپ کے موذن اب اذان کہتے ہیں۔ تب آنحضور ﷺ نے اذان کی تعلیم دی تو یہ فرمایا الصلوۃ خیر من النوم - الصلوۃ خیر من النوم فی الاولی من الصبح قال وعلمنی الاقامۃ الحدیث۔ یعنی جب صبح کی پہلی اذان کہے تو دوبار کلمہ الصلوۃ خیر من النوم کہو پھر اقامت سکھلائی۔

اس حدیث میں پہلی اذان صبح کی باعتبار اقامت کے فرمایا گیا۔ اگر اقامت کے علاوہ فجر سے پہلے کوئی اذان ہوتی تو ابو محذورہ ﷺ دو اذانوں کا علیحدہ ذکر کرتے لیکن انہوں نے صرف اذان اور اقامت کی تعلیم کا ذکر کیا جس سے ظاہر ہوا کہ صبح کی اذان میں یہ کلمہ مقرر ہے۔ اور یہ اذان باعتبار اقامت کے پہلی ہے اور اقامت دوسری

اذان ہے۔ چنانچہ دار قطنی میں ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں یہ الفاظ ہیں۔ فاذا اذنت بالاولی من الصبح فقل الصلوٰۃ خیر من النوم مرتین واذا اقمت فقلها مرتین قد قامت الصلوٰۃ قد قامت الصلوٰۃ۔ یہاں بھی صرف اذان صبح اور اقامت کا ذکر ہے اور اذان اولی باعتبار اقامت کے ہے۔

(۷) مشکوٰۃ میں یہ حدیث مشہور ہے۔ بین کل اذانین صلوٰۃ الحدیث۔ یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ درمیان دو اذانوں کے نماز ہے۔" اس سے ثابت ہوا کہ اقامت پر بھی اذان کا اطلاق آیا ہے اور یہ باعتبار اذان اولی کے ثانیہ ہے۔

(۸) مشکوٰۃ میں سائب بن یزید کی حدیث ہے' وہ کہتے ہیں کان النداء یوم الجمعۃ اوله اذا جلس الامام علی المنبر علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وابی بکر وعمر فلما کان عثمان زاد النداء الثالث علی الزوراء رواہ البخاری۔ یعنی "جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا تھا۔ عہد نبوی و صدیقی و فاروقی میں یہی ایک اذان رہی۔ (یہی سنت نبوی اور سنت خلفاء ہے) تیسری اذان عہد عثمان میں زوراء پر بڑھائی گئی۔"

اس سے بھی ثابت ہوا کہ اذان اولی کے مقابلہ میں اقامت' اذان ثانیہ ہے اور اذان عثمانی تیسری ہے۔ پس اقامت پر اذان کا اطلاق ثابت ہو گیا۔ پس جس قدر روایات مدعی محدث نے پیش کی ہیں ان میں الصلوٰۃ خیر من النوم فی الاولی من الصبح وارد ہوا ہے۔ اس سے صبح کی اذان مراد ہے جو باعتبار اقامت کے پہلی ہے۔ اذان سحری کی تحلیل الفجر رات میں ہے' وہ صبح کی ہرگز نہیں ہے۔ اس میں کلمہ الصلوٰۃ خیر من النوم کہنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت العلام روپڑی صاحب نے کتاب الصلوٰۃ میں لکھا ہے کہ فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد الصلوٰۃ خیر من النوم دو مرتبہ زیادہ کرے۔ یہی تمام اہلحدیث علماء اور متقدمین محدثین کا مسلسل تعامل چلا آرہا ہے۔ سحری کی اذان میں اس کلمہ کے کہنے کا رواج نہیں ہے۔ یہ نئے مرکز کا جدید فتویٰ ہے جو مردود ہے۔ یہ ان کی سوء فہمی ہے کہ اذان قبل الفجر کو فجر کی پہلی اذان قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ کسی حدیث میں للفجر کا لفظ موجود نہیں ہے۔

فریقین بالاتفاق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اذان وقت فجر سے قبل رات میں یا سحری کے وقت ہوتی تھی جو احادیث سے واضح ہے۔ تو پھر اس کا نام سحری کی اذان یا فجر کی پہلی اذان دونوں طرح ٹھیک ہے۔ (محدث ص۔۲۲ مطبوعہ نومبر سنہ۔۱۹۷۱ء) اس عبارت میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ متنازعہ اذان رات کو سحری کے وقت ہوتی تھی۔ تو اس کو فجر کی پہلی اذان کہنا سینہ زوری ہے اور یہ محض اس لیے کہ اس اذان کو فجر کی پہلی اذان کہہ کر کلمہ تثویب کو اس میں ثابت کیا جائے۔ یہ صریح باطل ہے کیونکہ یہ کلمہ تثویب اذان صبح میں پہلے سے مقرر ہو چکا تھا' وہاں سے بدل کر دوسرے وقت کی اذان میں کہنا بدعت ہے۔ چنانچہ فتح الربانی شرح مسند کی تیسری جلد کے بیان اذان میں ہے کہ التثویب فی صلٰوۃ الفجر لقول سعید بن المسیب فادخلت ھذہ الکلمۃ فی التاذین الٰی صلٰوۃ الفجر واختلفوا فی محله فالمشهور انه فی صلٰوۃ الصبح فقط۔ یعنی "کلمہ تثویب نماز فجر کی اذان میں ہے کیونکہ حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا کہ یہ کلمہ صبح کی اذان میں داخل کیا گیا البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کون سے موقع پر کہا جائے تو مشہور یہ ہے کہ صرف صبح کی اذان میں کہا جائے۔"

پھر یہ لکھا والاحادیث لم ترد باثباته الا فی صلٰوۃ الصبح لا فی غیرھا۔ یعنی احادیث صرف نماز صبح کے بارہ میں وارد ہیں دیگر وقتوں کے بارہ میں نہیں۔

پس دوسرے وقت کی اذان میں یہ کلمہ کہنا بدعت ہے۔ چنانچہ فتح الربانی کے اسی مقام پر یہ لکھا ہے فالواجب الاقتصار علٰی ذالک والجزم بان فعله فی غیرھا بدعة۔ یعنی یہ واجب ہے کہ صرف اذان صبح میں اس کلمہ کے کہنے پر اقتصار کیا جائے اور یہ پختہ بات ہے کہ سوائے نماز صبح کے غیر وقت کی اذان میں کہنا بدعت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مشکوۃ میں خود بلال رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ عن بلال قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لا تثوبن فی شیئی من الصلوات الا فی صلٰوۃ الفجر۔ یعنی "حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ نماز صبح کے بغیر کسی نماز کے لیے کلمہ تثویب نہ کہا جائے۔" اس سے ظاہر ہوا کہ بغیر رمضان کے سال بھر میں بلال رضی اللہ عنہ ہی نماز صبح کی اذان پر مقرر تھے جن کو یہ کلمہ تثویب نماز صبح کے لیے بتایا گیا تھا۔

مرعاۃ المفاتیح جلد اول، ص ۳۲۵ میں ہے کہ فتح الودود میں ہے کہ حدیث بلال رضی اللہ عنہ میں تثویب سے مراد نماز صبح کی اذان میں کلمہ الصلوۃ خیر من النوم کہنا ہے۔ نیز لکھا ہے کہ الحدیث یدل علی مشروعیۃ قول المؤذن فی اذان الفجر الصلوۃ خیر من النوم انہ مخصوص بالفجر وخص بہ الفجر لکونہ وقت نوم وراحۃ۔ یعنی "حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث فجر کی اذان میں کلمہ تثویب کہنے پر دلالت کرتی ہے اور یہ فجری کے لیے مخصوص ہے کیونکہ یہ وقت نیند اور آرام کا ہوتا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ اقامت میں بھی کلمہ قد قامت الصلوۃ بہ نسبت اذان کے زائد ہے۔ اس لیے اقامت پر بھی تثویب کا اطلاق آیا ہے۔ پس ان دونوں تثویبوں پر (جو اپنے اپنے محل پر ہیں) اجماع ہے۔ مرعاۃ المفاتیح کے حوالہ مذکورہ میں ہے وکل من ھذین تثویب قدیم ثابت من وقتہ صلی اللہ علیہ وسلم الی یومنا ھذا۔ یہ دونوں تثویب عہد نبوی سے لے کر اب تک قدیم سے جاری اور ثابت ہیں۔

سحری کی اذان میں کہنا خلاف اجماع ہے جو قائلین کی اختراع ہے۔ ہاں جن ائمہ کے نزدیک اذان سحری قبل الفجر پر اکتفا کرنا جائز ہے، ان کے نزدیک اس اذان میں کلمہ تثویب کہنا جائز ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی اذان صبح کی ہے۔ لیکن یہ سنت کے خلاف ہے کیونکہ صبح کی اذان صبح ہو جانے پر کہنی مسنون ہے۔ ہاں رمضان میں سحری کے وقت ہے۔ لیکن پھر دو اذانوں کے دو مؤذن مقرر کرنے پڑیں گے۔ ایک سحری کا دوسرا صبح کا۔ علاوہ رمضان کے سال بھر دو اذان کہنے کا ثبوت نہیں پایا جاتا۔ رمضان کے ماسوا صبح کی اذان پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ مدینہ میں اور ابو محذورہ رضی اللہ عنہ مکہ میں مقرر تھے اور دونوں ہی کلمہ تثویب نماز فجر کے وقت کہتے تھے۔

ابن ماجہ میں حدیث ہے: قال بلال امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اثوب فی الفجر ونھانی ان اثوب فی العشاء۔ "حضرت بلال نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا تھا کہ فجر کے وقت کلمہ تثویب کہا کروں اور عشاء میں منع فرمایا۔" اس سے مترشح ہے کہ رات میں یہ کلمہ غیر مشروع ہے۔ اس لیے حضرت بلال رضی اللہ عنہ رات کے وقت یہ کلمہ نہ کہتے تھے۔ رمضان میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کے وقت رات میں تھی۔ اس لیے اس میں یہ کلمہ نہ تھا۔

مرعاۃ المفاتیح کے ص۳۲۹ میں ہے: ان دخول ھذہ الکلمۃ فی نداء الصبح کان بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم لبلال وکان ذالک شائعا فی اذان بلال واذان ابی محذورہ وغیرھا من المؤذنین۔ یعنی "یہ کلمہ تثویب صبح کی اذان میں حکم نبوی سے داخل ہوا ہے۔ حضرت بلال اور ابی محذورہ رضی اللہ عنہما اور دیگر مؤذنین ہمیشہ سے صبح کی اذان میں کہتے رہے ہیں۔"

نیز یہ لکھا ہے کہ فکون الصلوٰۃ خیر من النوم فی اذان الفجر اشھر عند العلماء والعامۃ۔ یعنی "یہ کلمہ تثویب فجر کی نماز میں ہونا علماء اسلام اور عام مسلمانوں میں بہت مشہور ہے۔" لیکن مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب روپڑی نے تمام علماء اسلام اور عامہ مسلمین کے خلاف سحری کی اذان میں اس کلمہ کے کہنے کا فتویٰ جاری کیا ہے جو خلاف اجماع امت ہونے اور خلاف احادیث ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

دار قطنی ص۹۰ میں ہے کہ عن انس قال من السنۃ اذا قال المؤذن فی اذان الفجر حی علی الفلاح قال الصلوٰۃ خیر من النوم۔ یعنی "حضرت انس ﷛ نے فرمایا کہ سنت یہ عمل ہے کہ فجر کے وقت جب مؤذن حی علی الفلاح کہے تو پھر یہ کہے الصلوٰۃ خیر من النوم۔

نیز دار قطنی میں ابو محذورہ ﷛ کی روایت یوں وارد ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ فاذنت بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الفجر یوم حنین فلما بلغت حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحق فیھا الصلوٰۃ خیر من النوم۔ یعنی "میں نے یوم حنین کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے سامنے اذان کہی۔ جب میں حی علی الصلوٰۃ' حی علی الفلاح کہنے پر پہنچا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہاں اس میں کلمہ تثویب (الصلوٰۃ خیر من النوم) ملا دو۔"

جب یہ احادیث صریح ہیں کہ یہ کلمہ اذان صبح میں مقرر ہے تو پھر رات کی اذان میں اس کے کہنے کا ثبوت کہاں سے آگیا؟ اس کے لیے مستقل ثبوت درکار ہے کیونکہ سحری کی اذان اور صبح کی اذان میں یہی کلمہ مابہ الامتیاز ہے جس اذان میں یہ کلمہ نہیں' وہ سحری کی اذان ہے اور جس میں یہ کلمہ کہا گیا' وہ صبح کی اذان ہے۔ تمام اہلحدیث کا

یہی تعامل ہے۔ لیکن ادارہ محدث لاہور اس نئی روشنی کے زمانے میں جدید مسلک پیدا کر رہا ہے۔ اس غلطی سے اس کو رجوع کرنا لازم ہے کہ یہ امر محدث ہے۔

جن روایات مندرجہ محدث میں "فی الاولی من الصبح" وارد ہے' اس اولی سے مراد اقامت سے پہلے کی اذان ہے۔ حاشیہ نسائی میں ٹھیک لکھا ہے کہ والمراد الاذان دون الاقامة۔ یعنی "ندائے اولی سے مراد اذان ہے' اقامت نہیں ہے۔" کیونکہ وہ دوسری اذان ہے۔

عون المعبود جلد اول' ص ۲۲۳ میں ہے کہ انما اطلق الاذان علی الاقامة لانها اعلام کالاذان۔ یعنی "اقامت پر اذان کا اطلاق اس لیے آیا ہے کہ اذان کی طرح اس میں بھی اعلام ہے۔" اب اس کی صریح دلیل سنئے۔ دار قطنی ص ۸۸ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یا ابا محذورة ثنی الاولی من کل صلوٰة وقل فی الاولی من صلوٰة الغداة الصلوٰة خیر من النوم۔ یعنی "اے ابو محذورہ! تم ہر نماز کی پہلی اذان کو دہرا کر کہا کرو اور نماز صبح کی پہلی اذان میں کلمہ تثویب (الصلوٰة خیر من النوم) کہا کرو۔"

اب رسالہ محدث والے غور فرمائیں کہ ہر نماز کی پہلی اذان کون سی ہے اور مکہ میں ابو محذورہ ؓ کی صبح کی کون سی پہلی اذان تھی؟ ہمارے نزدیک تو مطلب صاف ہے کہ پہلی اذان سے مراد اذان معروف اور اقامت اذان ثانی ہے کہ مکہ میں ابو محذورہ ؓ کی صبح کی ایک ہی اذان تھی' دوسری کا ثبوت نہیں ہے۔

اب صحابہ کرام کا بھی تعامل ملاحظہ فرمایئے۔ مشکوٰۃ کی شرح مرعاۃ المفاتیح جلد اول' ص ۴۲۹ میں ہے کہ عن عمر انه قال لموذنه اذا بلغت حی علی الفلاح فی الفجر فقل الصلوٰة خیر من النوم۔ یعنی "حضرت عمر فاروق نے اپنے مؤذن کو صبح کی اذان میں کلمہ تثویب کہنے کا حکم فرمایا تھا۔" مشکوٰۃ میں بھی ہے: فامر عمر ان یجعلها فی نداء الصبح۔ کیونکہ آنحضور ﷺ نے ابو محذورہ ؓ کو یہ فرمایا تھا فان کان صلوٰة الصبح قلت الصلوٰة خیر من النوم۔ "کہ صبح کی اذان میں کلمہ تثویب کہنا۔" پس حضرت بلال اور ابو محذورہ رضی اللہ عنہما دونوں کا صبح کی اذان میں تعامل عہد نبوی میں ثابت ہوا۔ حضرت انس ؓ کا فتویٰ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

مدیر محدث نے نسائی کی ایک روایت سے دھوکہ کھایا ہے' جس میں ابو محذورہ ؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: کنت اقول فی اذان الفجر الاول۔ "کہ عہد نبوی میں پہلی اذان فجر میں کلمہ تثویب کہتا تھا" اس سے بھی صبح کی اذان اقامت سے پہلی مراد ہے۔ کیونکہ ابو محذورہ ؓ مکہ میں ایک ہی اذان صبح کی کہتے تھے جو نماز صبح کے لیے ہوتی تھی۔ سحری کی اذان صبح کی نہیں ہے ورنہ دوسرے مؤذن کو دوسری اذان کی ضرورت نہ تھی۔

مسند احمد کی روایت میں ابو محذورہ ؓ کا بیان صاف ہے۔ کنت اؤذن فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صلٰوۃ الصبح فاذا قلت حی علی الفلاح قلت الصلٰوۃ خیر من النوم للاذان الاول۔

اس سے بھی واضح ہے کہ نماز صبح کی پہلی اذان باعتبار اذان اقامت کے ہے۔ پھر محدث والے دوسری چال چلے ہیں کہ جن احادیث میں اس کلمہ کا اذان فجر میں کہنا آیا ہے' یہ اس صورت میں ہے کہ جب صرف صبح کی ایک ہی اذان ہو۔ یہ توجیہہ سراسر باطل ہے' کیونکہ سحری کی اذان میں اس کلمہ کا ذکر نہیں ہے۔ تمام احادیث میں اذان فجر ہی کا ذکر ہے' جس میں شارع علیہ السلام نے اس کا تقرر کیا تھا۔ والسلام

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد ۵۴' شمارہ ۲ مورخہ ۱۹ محرم الحرام سنہ ۱۳۹۳ھ

سحری کی اذان کا ثبوت

اخبار اہلحدیث لاہور مطبوعہ ۱۳ دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء جلد اول' شمارہ ۲۷ کے ص ۵ پر چند سوالات و جوابات درج ہیں۔ جوابات جناب شیخ الحدیث مولانا ابو البرکات احمد صاحب گوجرانوالہ مدظلہ مفتی جمعیت اہلحدیث کی طرف سے شائع کیے گئے ہیں' جن کے آخر میں یہ لکھا ہوا ہے۔ "یہ جوابات حضرت الامیر کے مصدقہ ہیں۔ ان جوابات میں بعض جواب غلط ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے۔ چنانچہ پہلا سوال یہ ہے کہ رمضان المبارک میں جو سحری کی اذان کہی جاتی ہے اس کا ثبوت کیا ہے؟ اگر اذان کی

بجائے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے لوگوں کو بیدار کیا جائے تو کیا یہ جائز ہو گا؟ قرآن و سنت کی روشنی میں تحریر کریں۔"

اس سوال کا جواب جو مفتی صاحب نے صادر فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے: "نبی ﷺ کے دو موذن تھے۔ حضرت بلال اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما۔ حضرت بلال ؓ کی اذان کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ سحری کے لیے تھی یا فجر کے لیے۔ صحیح بات یہی ہے کہ وہ فجر کے لیے تھی۔ کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اذان سال بھر چلی تھی۔ لہذا خاص سحری کے نام پر اذان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لوگوں کو اسپیکر کے ذریعہ بیدار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ امر بالمعروف کے ضمن میں آجاتا ہے۔"

ناظرین کرام! ذرا غور کریں کہ اس فتویٰ کے مفتی صاحب مولانا ابو البرکات ہیں۔ جو غلط فتویٰ صادر کر کے سحری کی اذان کی برکات کو دفع کر رہے ہیں۔ جو ان کی کنیت کے اقتضاء کے سراسر منافی ہے۔ اور اذان کے قائم مقام اسپیکر کو امر بالمعروف کا لباس پہنا کر مشروع کر رہے ہیں جو اس آیت کا مصداق ہیں۔ ام لھم شرکاء شرعوالھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ۔ یعنی "کیا ان کے لیے ایسے شریک ہیں جو ان کے لیے بغیر اذن الٰہی کے کسی چیز کی شرع مقرر کرتے ہیں۔" اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اصل بدعت وہی ہے جو سنت کو اٹھا کر خود اس کی جگہ رائج ہو جائے اور جم جائے۔

چنانچہ سحری کی اذان سنت ہے جو جماعت اہلحدیث کے اکثر مقامات میں مروج ہے اور سلف صالحین میں عہد نبوی سے محدثین کے آخر زمانہ تک مروج رہی ہے۔ اب گوجرانوالہ کے مفتیان دین اس اذان کے ثبوت سے انکار کر کے اس کی بجائے اسپیکر کو مشروع بنا رہے ہیں' جو سراسر ضلالت ہے اور یہ ایسا ہے جیسے بسم اللہ مکتوبات پر مسنون ہونے کی جگہ پر عدد (۷۸۶) مشروع بنا لیا ہے اور اذان سحری کی بجائے صلواتیں کہنا' نقارہ بجانا اور دیگر رسمی چیزیں جیسے دھونہ' گولہ' سیٹی وغیرہ جاری کر دی ہیں' جو امور محدثہ ہیں۔

اسپیکر اگرچہ اذان کی آواز کو دور تک پہنچانے کے لیے مباح ہے۔ لیکن سحری یا کسی وقت کی اذان کو ہٹا کر اس کے قائم مقام اسپیکر کو مقرر کرنا بدعت اور ضلالت

ہے۔ پھر اس جواب پر تعجب یوں ہو رہا ہے کہ اس فتویٰ کے مفتی صاحب بھی شیخ الحدیث ہیں اور مصدق صاحب بھی شیخ الحدیث ہیں۔ ہر دو کا علم حدیث کی روشنی میں متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ سحری کی اذان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور اسپیکر امر بالمعروف کے رنگ میں جائز اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نعوذ باللہ من ھذالقول وسوء الفہم۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ان دونوں شیخ الاحادیث کو سحری کی اذان کا ثبوت ملا نہیں ہے۔ اب بندہ اس کا ثبوت پیش کرتا ہے' ملاحظہ ہو:

سحری کی اذان کی پہلی دلیل ⇐ بخاری شریف کتاب الصوم میں ہے: عن عائشة ان بلالا کان یؤذن بلیل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلوا واشربوا حتی یؤذن ابن مکتوم فانه لا یؤذن حتی یطلع الفجر۔ یعنی "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت بلال ﷺ رات میں اذان دیا کرتے تھے۔ پس فرمایا رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے کہ تم سحری کے وقت تک کھاتے پیتے رہو' یہاں تک کہ ابن ام مکتوم ﷺ موذن اذان دے۔ کیونکہ وہ فجر طلوع ہونے سے پہلے اذان نہیں دیا کرتے تھے۔"

یہ حدیث جامع صحیح بخاری کی ہے جس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا لقب حاصل ہے۔ یہ حدیث قطعی الثبوت ہے اور قطعی الدلالت ہے۔ اور مرفوع متصل ہے' جس سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہیں۔ جن سے کسی ذی علم اہل حق کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اول یہ کہ عہد نبوی میں دو موذن مسجد نبوی میں مقرر تھے۔ ایک حضرت بلال ﷺ جو سحری کے وقت اذان دیتے تھے۔ دوسرے ابن ام مکتوم ﷺ جو فجر طلوع ہونے پر اذان دیا کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ فجر سے پہلے سحری کے وقت اذان کہنا مسنون ہے۔ کیونکہ لفظ کان صیغہ ماضی کا ہے اور لفظ یؤذن صیغہ مضارع کا ہے۔ یہ علم قواعد عربیہ کی رو سے ماضی استمراری ہے۔ یعنی یہ تعامل عہد نبوی میں ہمیشہ سے جاری تھا۔

چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوۃ میں اذان کی اس حدیث پر یہ لکھا ہے کہ الاستمرار مستفاد من کان لا من المضارعة۔ نیز مرقاۃ جلد اول' ص۔۴۲۹ میں یہ لکھا ہے کہ والا ظهر ان ایراد المضارع یفید الاستمرار۔ یہ عبارت حدیث "ینادی بالصلوٰت" پر درج ہے۔ خلاصہ ان عبارتوں کا یہ ہے کہ لفظ کان اور صیغہ مضارع دونوں سے استمرار مستفاد ہے۔ چنانچہ یہ قاعدہ مفتی صاحب گوجرانوالہ کے مصدق حضرت علامہ گوندلوی صاحب مدظلہ العالی کو بھی مسلم ہے۔ چنانچہ انہوں نے بمقابلہ علماء حنفیہ کے اپنے رسالہ التحقیق الراسخ کے ص۔۵۲ میں رفع یدین کا دوام ثابت کرنے کے لیے اس مسئلہ کی تفصیل بیان کی ہے۔

پس اس قاعدہ کی رو سے ہمیشہ سحری میں اذان کا وجود ثابت ہو گیا۔ اور ان مفتیوں کا یہ قول باطل ہوا کہ سحری میں اذان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تیسرا امر یہ ثابت ہوا کہ سحری کی اذان کے وقت روزہ دار کو کھانا پینا مشروع ہے۔ جب فجر کی اذان ہو جائے تو پھر بند ہونا اور رک جانا چاہیے۔ چوتھا یہ کہ مسجد میں دو مؤذن مقرر کرنا مسنون ہے۔ ایک سحری کے وقت اذان دینے والا' دوسرا فجر طلوع ہونے پر اذان دینے والا۔ کیونکہ مسجد نبوی میں اسی طرح دو مؤذن مقرر تھے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل صحیح حدیث میں اس کی صاف صراحت موجود ہے۔ مسلم شریف جلد اول' ص۔۳۴۵ میں ہے کہ عن ابن عمر قال کان لرسول الله مؤذنان بلال و ابن ام مکتوم۔ یعنی "حضرت ابن عمر ﷺ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے دو مؤذن مقرر تھے۔ ایک حضرت بلال ﷺ (جو سحری کے وقت اذان دیتے تھے) دوسرے ابن ام مکتوم ﷺ (جو فجر کے وقت اذان کہتے تھے)"

دو مؤذن مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ سحری اور فجر کی اذانوں میں التباس لازم نہ پڑے کہ دو مختلف وقتوں میں دو مختلف شخصوں کی دو مختلف آوازوں سے سحری اور فجر میں امتیاز حاصل رہے۔ الحمد للہ اب جماعت اہلحدیث میں بھی یہ تعامل جاری ہے۔ مگر جمعیت گوجرانوالہ اس کی منکر ہے۔

اذان کی دوسری دلیل ⇐ مسلم شریف جلد اول' ص۔۳۴۹ میں یہ حدیث وارد ہے: عن عبدالله بن عمر قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان

بلالا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتٰی تسمعوا اذان ابن ام مکتوم۔ یعنی "ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ تحقیق یہ بات ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ تو رات کو سحری کے وقت اذان کہتا ہے۔ اس وقت میں تم کھاؤ پیو' یہاں تک کہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کی اذان سن لو' تو پھر رک جاؤ۔" اس حدیث سے بالبداہت سحری کے وقت اذان کا ہونا ثابت ہوا۔ اس سے انکار کرنا لاعلمی ہے' یا علم حدیث میں عدم ثقاہت ہے۔ ورنہ تمام علماء اہلحدیث اس کے مسنون ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن گوجرانوالہ کی جمعیت اس سنت کو مٹا کر اس کی بجائے اسپیکر کے اعلان کو شرع مقرر کرنا چاہتی ہے' جو صریح بدعت ہے۔

علم چندا نکہ بیشتر خوانی
چوں عمل از تو نیست نادانی

(یلیت قومی یعلمون)

علامہ ابن حجر فتح الباری میں حدیث کے الفاظ یؤذن بلیل کے افادات میں یہ لکھتے ہیں: وفیہ حجۃ من ذھب الٰی ان الوقت الذی یقع فیہ الاذان قبل الفجر ھو وقت السحور۔ یعنی "اس حدیث میں ان علماء کرام کی واضح دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ قبل از فجر جو اذان ہوتی تھی' وہ سحری کا وقت ہوتا تھا۔ یہ عام محاورہ ہے کہ جس وقت میں کوئی اذان ہو' اس وقت کی اذان کہلاتی ہے۔ مثلاً فجر کے وقت اذان ہو تو فجر کی اذان' ظہر کو ہو تو ظہر کی اذان۔ اسی طرح عصر کی اذان' مغرب کی اذان اور عشاء کی اذان۔ ٹھیک اسی طرح سحری میں جو اذان ہے وہ سحری کی اذان کہلاتی ہے۔ پس سحری کی اذان سے انکار کرنا سراسر نادانی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام محمد رحمہ اللہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کے پیش نظر یہ ارشاد فرماتے ہیں: کان بلال ینادی بلیل فی شھر رمضان لسحور الناس وکان ابن ام مکتوم ینادی للصلوٰۃ بعد طلوع الفجر فکذالک وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلوا واشربوا حتٰی ینادی ابن ام مکتوم۔ (مترجم موطاء امام محمد ص ۱۳۸) یعنی "حضرت بلال رضی اللہ عنہ لوگوں کے سحری کھانے کے لیے ماہ رمضان میں رات کو اذان دیا کرتے تھے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ طلوع فجر کے

بعد نماز فجر کے لیے اذان دیتے تھے۔" جیسا آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے اذان دینے تک تم کھاتے پیتے رہا کرو۔

رئیس الفقہاء والمتکلم علامہ امام ابن حزم محلی ج۔۲ ص۔۱۱۷ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں: ولا بدلها من اذان ثان بعد الفجر ولا یجزی لها الاذان الذی کان قبل الفجر لانه اذان سحور لا اذان للصلوٰۃ۔ یعنی "سحری کی اذان کے بعد دوسری اذان کا فجر ہونے پر کہنا ضروری ہے۔ پہلی اذان جو فجر ہونے سے پہلے کہی گئی ہے' نماز فجر کے لیے کفایت نہ کرے گی کیونکہ یہ اذان سحری کی ہے' نماز فجر کے لیے نہیں ہے۔

اذان کی تیسری دلیل ⇦ نسائی شریف جلد اول' ص۔۷۵ میں ہے کہ عن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال ان بلالا یؤذن بلیل لیوقظ نائمکم ولیرجع نائمکم۔ یعنی "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان کہتا ہے تاکہ سونے والے کو بیدار کر دے اور قیام کرنے والے کو لوٹا دے۔" اس حدیث سے بھی سحری کی اذان ثابت ہو گئی اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی کہ یہ سحری کی اذان سوتے ہوئے کو بیدار کرنے اور تہجد والے کو لوٹانے کے لیے ہے کہ دونوں سحری کھا لیں۔

اذان کی چوتھی دلیل ⇦ نسائی ص۔۷۶ میں یہ حدیث ہے: عن عائشة قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا اذن بلال فکلوا واشربوا حتّٰی یؤذن ابن ام مکتوم قالت ولم یکن بینهما الا ینزل هذا ویصعد هذا۔ یعنی "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب بلال رضی اللہ عنہ اذان کہے تو تم کھاؤ اور پیو' یہاں تک کہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے' پھر رک جاؤ۔" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دونوں اذان کا اندازہ بیان فرمایا کہ ایک مؤذن اذان کہہ کر منبر سے اترتا تھا تو اس کے بعد دوسرا مؤذن چڑھ جاتا تھا۔ یہ مبالغہ کے طور پر دو اذانوں کے درمیان وقفہ کو ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ مدت یسیر اور وقفہ قلیل تھا۔ اور مسنون امر بھی سحری کھانے میں یہ ہے کہ سحری دیر سے صبح کے قریب ہی کھانی چاہیے۔ اس حدیث میں الفاظ اذا اذن بلال سے ظاہر ہے کہ سحری اذان کے بعد کھانی چاہیے کیونکہ یہ جملہ شرطیہ ہے۔ اور جزاء اس کی جملہ کلوا واشربوا ہے۔ جس کی

حکایت اذان ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ بیان کی گئی ہے۔ پس سحری کی اذان کا وجود اظہر من الشمس ہے۔

اذان کی پانچویں دلیل ⇦ مسند احمد میں ہے کہ عن سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یمنعنکم من سحورکم اذان بلال ولا الفجر المستطیل ولکن الفجر المستطیر فی الافق۔ یعنی "سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو سحری کھانے سے بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور فجر کاذب جو اوپر کو سفیدی بلند ہونے والی ہے' روک نہ دے۔ لیکن جو سفیدی آسمان کے کناروں میں دائیں بائیں پھیل جاتی ہے' وہ صبح صادق ہے جو سحری کھانے سے مانع ہے۔"

اس حدیث پر یوں باب منعقد کیا گیا ہے: "باب وقت السحور واستحباب تاخیرہ" پس اس وقت سحور کا اور اس وقت میں اذان ہونے کا ثبوت پایا گیا ہے۔ جس سے مفتیان گوجرانوالہ کی عدم فقاہت ثابت ہو گئی۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ شیخ الحدیث بننے سے پہلے علم حدیث میں فقاہت حاصل کریں۔ سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مسلم میں بھی ہے۔

اذان کی چھٹی دلیل ⇦ مسند ابوداؤد طیالسی جلد اول' ص ۱۸۵ میں حدیث درج ہے کہ خبیب بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ مجھے میری پھوپھی انسبة نے یہ بیان کیا کان بلال و ابن ام مکتوم یؤذنان للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان بلالا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتی یؤذن ابن ام مکتوم فکنا تجس ابن ام مکتوم عن الاذان فنقول کما انت حتی نتسحر ولم یکن بین اذانیهما الا ان ینزل ھذا ویصعد ھذا۔ یعنی "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو شخص مؤذن مقرر تھے جو اپنے وقت پر اذان دیا کرتے تھے۔ ایک حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو سحری کے وقت اذان کہتا ہے' تم اس وقت کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے' تو پھر رک جاؤ۔ ہم ابن ام مکتوم کو اذان سے روک لیا کرتے تھے تاکہ ہم سحری کھا لیں۔ دونوں اذانوں کے درمیان تھوڑا سا ہی وقفہ ہوتا" کہ ایک اتر جاتا تھا"

دوسرا چڑھ جاتا تھا۔"

اس حدیث سے دو مؤذن ثابت ہو گئے۔ ایک سحری کے وقت کا اور دوسرا فجر کا۔ دونوں کی غرض الگ الگ تھی اور دونوں کے وقت بھی جدا جدا تھے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہما فرماتے ہیں: قالا لم یکن الاذان الاول لصلوٰة الفجر بل کان لغرض اٰخر بینه صلی اللّٰه علیه وسلم فی حدیث ابن مسعود بقوله یرجع قائمکم ویوقظ نائمکم۔ (مرعاۃ المصابیح جلد اول' ص-۴۲۴) یعنی "امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے فرمایا کہ پہلی اذان بلال رضی اللہ عنہ والی نماز فجر کے لیے نہیں ہوا کرتی تھی' بلکہ دوسری غرض کے لیے تھی۔ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا کہ تہجد پڑھنے والے کو لوٹانے کے لیے اور سونے والے کو بیدار کرنے کے لیے مقرر ہے۔"

استاذ ائمہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ موطاء میں ایک باب یوں منعقد فرماتے ہیں: "قدر السحور من النداء" جس کا ترجمہ مولانا وحید الزماں مرحوم یوں فرماتے ہیں "اذان کا سحر کے وقت ہونا" یہ ترجمہ بطور محاورہ ہے۔ لفظی ترجمہ یہ ہے "سحری کی اذان کے وقت کا اندازہ" پھر حدیث سے اس کا اندازہ ثابت کیا' جس سے ظاہر ہوا کہ فجر کی اذان محدثین اور فقہاء میں مسلم ہے۔

مولانا عبدالجلیل خاں صاحب محدث جھنگوی مدظلہ العالی اپنے رسالہ اذان سحور کے ص-۱۰ میں امام نووی سے اس کا اندازہ اور احادیث سحور کا مطلب یوں نقل کرتے ہیں۔ "علماء کرام نے ان احادیث کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ یقینی طور پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ فجر سے پہلے سحری کی اذان دیتے تھے اور اس کے بعد فجر کے انتظار میں بیٹھے ہوئے دعا وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ جب دیکھتے کہ فجر ہونے کے قریب ہے تو مینارہ سے اتر آتے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو طلوع فجر کی اطلاع دے دیتے تھے۔ پس ابن مکتوم رضی اللہ عنہ وضوء وغیرہ سے فارغ ہو کر مینارہ پر چڑھتے تھے اور پہنچتے ہی اذان دینی شروع کر دیتے۔ اس صراحت سے دو اذانیں اور ان کا اندازہ درمیانی ظاہر ہو گیا۔"

پھر مولانا موصوف جناب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی معتبر کتاب حجۃ اللہ جلد اول' ص-۱۹۲ سے عبارت نقل کر کے اس کا یوں ترجمہ لکھتے ہیں: "یہ امر

محبوب یہ بات بہتر اور کار ثواب ہے کہ امام ضرورت کے پیش نظر دو مؤذن ایسے مقرر کر دے جن کی آواز کو لوگ پہچان سکیں۔ اور امام اس امر کا اعلان کر دے کہ فلاں مؤذن رات کو سحری کے وقت اذان دیا کرے گا۔ پس تم اطمینان سے کھاتے پیتے رہنا' یہاں تک کہ دوسرا فلاں مؤذن فجر کی اذان دے۔ پہلی اذان قیام کرنے والے سحری کھانے والے اور سوتے ہوئے کی آگاہی کے لیے ہو گی تاکہ قیام کرنے والا اور سحری کھانے والا اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے اور سویا ہوا بیدار ہو کر نفلی نماز پڑھ لے اور سحری کا بندوبست کر لے۔"

شاہ صاحب محدث دہلوی' شیخ العرب والعجم نے بھی دو اذانوں کا وجود ثابت کر کے اہلیان مساجد کو ان کی تقرری کی ترغیب دے دی۔

میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو ان کی بہ نسبت ایک گجراتی مولوی بریلوی نے خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ کتاب جاء الحق گجراتی کے ص-۲۹۸ میں یہ لکھا ہے "مشکوۃ باب فضل الاذان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم بلال ؓ کی اذان سے رمضان کی سحری ختم نہ کر دو' وہ تو لوگوں کو جگانے کے لیے اذان دیتے ہیں۔ معلوم ہوا زمانہ نبوی میں سحری کے وقت بجائے نوبت و گولے کے اذان دی جاتی تھی۔ لہٰذا سوتے کو جگانے کے لیے اذان دینا سنت سے ثابت ہے۔" پس عصر حاضرہ کے مقلدین کا اہلحدیث کے سحری کی اذان دینے پر چڑنا اور اذان کی بجائے نقارہ بجانا' اسپیکر پر اعلان کرنا سنت کے صاف صاف بدعت' حماقت اور ضلالت ہے۔ لیکن اب اہلحدیث میں بھی نام نہاد مفتی اسپیکر پر اعلان کی بدعت ایجاد کر رہے ہیں۔

اذان کی ساتویں دلیل ⇐ سنن کبریٰ جلد اول' ص-۴۲۶ میں ہے کہ عن ابی محذورة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم امناء المسلمین علی صلاتهم سحورهم المؤذنون۔ یعنی "ابو محذورہ ؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ۔ مسلمانوں کے امین ان کی نماز اور سحری پر مؤذن لوگ ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ یے نماز کے وقت مؤذن مقرر ہوتا ہے اور وہ وقت ہونے پر اذان کہہ دیتا ہے' ایسے ا سحری پر مؤذن مقرر ہوتا ہے' جو سحری کے وقت اذان کہہ دیتا ہے۔

چنانچہ عہد نبوی میں مؤذنوں کی اس طرح تقرری ہوتی تھی۔ پس یہ عمل مسنون

ہے۔ اسی طرح کی روایت مجمع الزوائد جلد اول' ص-۳۳۲ میں ہے جو ابودردا سے مروی ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں: المؤذنون امناء الله علیٰ فطرهم وسحورهم۔ یعنی "مؤذن لوگ اللہ تعالیٰ کے امین ہیں' مسلمانوں کی افطاری و سحری پر۔" یہ حدیث پہلی روایت کی موید ہو گئی۔

نیز مشکوۃ میں یہ حدیث وارد ہے جو ان دونوں کی موید ہے: عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم خصلتان معلقتان فی اعناق المؤذنین للمسلمین صیامهم وصلواتهم رواه ابن ماجه مرسلا وقال القاری سنده حسن۔ یعنی "حضرت ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دو خصلتیں مؤذنوں کی گردنوں میں لٹکائی گئی ہیں' یعنی دو کام ان کے ذمہ لگائے گئے ہیں جو مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے ہیں۔ ایک روزوں کی سحری و افطاری' دوسری نمازوں کے وقتوں کا اعلام۔" کہ یہ دو کام بذریعہ شرعی اذان کے کرتے رہیں۔ روزہ کی تیاری و افطاری مؤذن کی اذان پر موقوف ہے۔ اگرچہ انقلاب زمانہ سے اب نئے انتظامات ہو گئے ہیں' مگر شارع کی طرف سے اذان کی ہی شریعت مقرر تھی۔ اب بھی اہل شرع اس کے پابند چلے آ رہے ہیں۔

نیل الاوطار ج-۲' ص-۳۹ میں فتح الباری سے نقل کیا گیا ہے کہ بعض حنفیہ نے سحری کی اذان کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ حقیقی اذان نہ تھی جو الفاظ اذان سے متعارف ہے۔ بلکہ وہ تذکیر و منادی کرتا ہے۔ کما یقع للناس الیوم۔ جیسا کہ آج کل لوگوں میں مروج ہے۔

میں کہتا ہوں جیسا کہ گوجرانوالہ کے مفتیان نے تجویز کیا ہے' اس کا جواب رئیس المحققین علامہ حافظ ابن حجر نے بہت عمدہ دیا ہے جو آب زر سے لکھ کر گوجرانوالہ کے محکمہ افتاء کے دروازہ پر آویزاں کرنے کے قابل ہے۔ چنانچہ امام شوکانی نے نقل کیا ہے: فقال الحافظ فی الفتح انه مردود لان الذی یصنعه الیوم محدث قطعا وقد توافرت الاحادیث علی التعبیر بلفظ الاذان فقط فحمله علیٰ معناه الشرعی مقدم ولان الاذان لو کان بالفاظ مخصوصة لما التبس علی السامعین۔ یعنی "حافظ صاحب نے فتح الباری میں حنفیہ کی اس تاویل مذکورہ کا یہ جواب دیا ہے کہ

یہ قول سراسر مردود ہے۔ کیونکہ لوگ جو آج کل اذان کے سوا سحری میں اور منادی کرا رہے ہیں، قطعی طور پر بدعت ہے۔ اور تحقیق احادیث جو سحری کی اذان کے بارہ میں وارد ہیں، وہ باہم ایک دوسری کو مضبوط کر رہی ہیں کہ سحری میں یقینی طور پر اذان کے الفاظ کے ساتھ ہی اذان ہوا کرتی تھی۔ لغوی معنی اور مجازی معنی پر شرعی معنی مقدم ہے۔ اور دیگر یہ کہ اگر سحری کی اذان الفاظ شرعیہ کے ساتھ نہ ہوتی۔ دیگر الفاظ مخصوصہ سے اعلان ہوتا تو سامعین پر دو اذانیں مشتبہ نہ ہوتیں، جس کی وجہ سے دونوں اذانوں کا حکم جدا جدا اپنانا پڑا۔"

حافظ ابن حجر کے کلام سے یہ ظاہر ہوا کہ اذان سحری کے علاوہ جو دیگر الفاظ سے اعلان اور اعلام کیا جاتا ہے یہ قطعی طور پر بدعت ہے۔ پس گوجرانوالہ کے مفتیان کا فتویٰ مردود ہوا، ہم نے الحمد للہ سات دلائل شرعیہ کے ساتھ سحری کی اذان کا مسنون اور مشروع ہونا ثابت کر دیا ہے، جن سے اہل انصاف کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ ۔

پردہ تم اپنے تعصب کا اٹھا دو دل سے
گر تمہیں ہے منظور جلوۂ جانان حدیث

تنبیہ: بعض روایتوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ پہلے اذان دیا کرتے تھے جو رات کو ہوتی تھی اور بلال رضی اللہ عنہ فجر کے وقت اذان دیتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری و مسلم کی متفق احادیث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیا کرتے تھے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ صبح کے وقت اذان دیا کرتے تھے۔ جب ان کو یہ بتایا جاتا تھا کہ اصبحت اصبحت۔ "صبح ہو گئی' صبح ہو گئی" اب اذان کہہ دو۔ چونکہ وہ نابینا تھے، اس لیے ان کو فجر کا علم بتانے سے ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ بعض وقت بعض صحابہ ان کو اذان سے روک لیتے تھے کہ ٹھہر جاؤ، ہم کو سحری کھا لینے دو پھر اذان کہنا۔

اچھا اگر یہ روایات مان لی جائیں کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سحری کی اذان کہتے تھے تب بھی ان کو معتبر نہیں ہے کیونکہ سحری کی اذان پھر بھی ثابت رہی کہ دو مؤذن تھے۔ ایک ان میں سحری کے وقت اذان کہا کرتا تھا۔

بہرحال یہ ہمارے سات دلائل ہیں جو مفتیان گوجرانوالہ کے سر پر سات افلاک کی طرح قائم کر دیے گئے ہیں۔ وبنینا فوقکم سبعا شدادا۔ جن میں مسئلہ سحری کا

سراج وھاج بن کر ضوفشاں ہے۔ سات ہی زمینیں اور سات ہی ہفتہ کے دن ہوتے ہیں۔ اس لیے مناسب طور پر ہم نے سات دلائل پر کفایت کی ہے' جو اہل درایت کے لیے قابل قبول ہیں۔ ؎

تیری رحمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

کیا سحری کی اذان ماہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے ⇦ اس مسئلہ میں محدثین کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض ائمہ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ اذان ماہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ نیل الاوطار میں ہے: **وقد اختلف فی اذان بلال بلیل هل کان فی رمضان فقط ام فی جمیع الاوقات فادعی ابن القطان الاول**۔ یعنی "حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی رات کی اذان میں اختلاف ہے کہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے یا ہمیشہ سب سال میں ہے۔ امام ابن القطان جلیل القدر محدث کا دعویٰ ہے کہ یہ اذان سحری کی رمضان کے ساتھ مخصوص ہے۔"

علامہ ابن دقیق العید بھی یہی کہتے ہیں۔ چنانچہ مرقاۃ جلد اول' ص-۴۳۵ میں ہے: **قال ابن دقیق العید قوله ان بلالا یؤذن بلیل فی سائر العام ولیس کذالک وانما کان فی رمضان --- بدلیل قوله کلوا واشربوا**۔ یعنی "ابن دقیق العید نے کہا کہ یہ خیال کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان کہتے تھے تو تمام سال ہی یہ عمل کرتے تھے۔ حالانکہ اس طرح ثابت نہیں ہے بلکہ وہ رمضان میں اذان کہتے تھے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ بلال رضی اللہ عنہ رات میں اذان دیتا ہے' تم اس وقت کھاتے پیتے رہو چونکہ سحری میں کھانا پینا رات ہی میں ہوتا ہے۔" اس لیے یہ اذان رات سے مخصوص ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ساتویں دلیل کہ مؤذنین سحور و نماز روزوں پر امین ہیں اور روزے اور نمازیں مؤذنوں کی گردنوں میں معلق ہیں۔ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اذان رمضان سے مخصوص ہے کیونکہ روزے عموماً رمضان میں ہی رکھے جاتے ہیں اور سحور و افطار کا رمضان ہی میں اہتمام ہوتا ہے۔

حنفی مذہب کے مشہور علامہ شوق نیموی اپنی کتاب آثار السنن میں تحریر فرماتے

ہیں: اما اذان بلال قبل طلوع الفجر فانما کان فی رمضان۔ یعنی "بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری رمضان ہی میں ہوا کرتی تھی۔" مرقاۃ المفاتیح جلد اول' ص۔۴۴۳ میں ہے: ادعی ابن القطان وابن دقیق العید ومحمد بن الحسن ان قولہ "ان بلالا یؤذن بلیل کان فی رمضان خاصۃ لا فی سائر العام۔ یعنی "امام ابن القطان اور علامہ ابن دقیق العید اور امام محمد بن حسن فقیہ عراقی کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ اذان رمضان کے ساتھ مخصوص ہے' تمام سال میں نہیں ہے۔" ان کے خلاف دیگر محدثین کا قول اور مسلک یہ ہے کہ یہ تمام سال سحری کے وقت مشروع ہے۔ رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں: لم یزل الاذان عندنا بلیل۔ (سنن کبریٰ بیہقی جلد اول' ص۔۳۸۵) یعنی "ہمارے ہاں مدینہ میں ہمیشہ سے یہ اذان رات میں ہوتی چلی آرہی ہے۔" علامہ عینی شرح بخاری ج۔۲' ص۔۱۵۱ میں قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ اذان سحری کے بارہ میں حنفیہ نے جو یہ لکھا ہے کہ رمضان کے ساتھ مختص ہے' بہت بعید بات ہے۔ اس لیے کہ یہ رمضان سے بالکل خاص نہیں ہے۔ اس اذان کا تو دائمی دستور تھا۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں بارہ مہینہ اس اذان پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے پھر اس کے جواب میں علامہ فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض حنفیہ پر بعید ہے' ہرگز درست نہیں ہے۔ کیونکہ حنفیہ یہ نہیں کہتے کہ یہ اذان ماہ رمضان سے مخصوص ہے۔ اس لیے کہ روزے رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ رمضان کے علاوہ بھی قضا و سنت اور نفلی روزے رکھے جاتے ہیں۔ کما ان الصائم فی رمضان یحتاج الی الایقاظ لاجل السحور فکذالک الصائم فی غیرہ بل ھذا اشد لان من یحیی اللیالی رمضان اکثر ممن یحیی لیالی غیرہ' الخ۔ یعنی' جیسے کہ رمضان میں روزے رکھنے والے سحری کھانے کے لیے بیدار ہونے والا زیادہ محتاج ہے' کیونکہ رمضان میں تو اکثر لوگ رات کو بیدار ہوتے ہیں' غیر رمضان میں نہیں۔"

مرعاۃ المفاتیح جلد اول' ص۔۴۴۳ میں اذان سحری کو رمضان کے ساتھ مخصوص کرنے پر اعتراض کرتے ہوئے یہ لکھا ہے: لان قولہ کلوا واشربوا یتاتی فی غیر رمضان ایضا --- وھذا لمن کان یرید صوم التطوع فان کثیرا من الصحابۃ فی زمنہ صلی اللہ علیہ وسلم کانوا یکثرون صیام النفل فکان قولہ فکلوا

واشربوا ...... ویدل علی ذلک مارواہ عبدالرزاق عن ابن المسیب مرسلا۔ یعنی "راوی نے جو حدیث میں یہ فرمان نبوی نقل کیا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے وقت تم کھاؤ پیو' یہ غیر رمضان میں بھی صادق آتا ہے کیونکہ یہ حکم ہر اس شخص کے لیے جو سحری کے وقت روزہ کا ارادہ رکھتا ہو۔ چنانچہ عہد نبوی میں بہت سے صحابہ کرام روزے رکھا کرتے تھے۔ پس ان لوگوں کے پیش نظر کلوا واشربوا کا حکم صادق آسکتا ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو عبدالرزاق نے ابن مسیب سے مرسلا" روایت کیا ہے۔" جو یہ ہے: بلفظ ان بلالا یؤذن بلیل فمن اراد الصوم فلا یمنعہ اذان بلال حتی یؤذن ابن ام مکتوم (ذکرہ علی المتقی فی کنز العمال ج-۴' ص-۳۱۱) یعنی "حضرت بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیتا ہے پس جو شخص روزہ کا ارادہ رکھتا ہو' اس کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان روک نہ دے' وہ برابر کھاتا رہے' یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے تو پھر رک جائے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ اذان بلال رضی اللہ عنہ کی رمضان کے مہینہ سے مختص ہو یا بارہ مہینہ میں اس کا کہنا مشروع ہو۔ بہرکیف یہ اذان سحری کی ہے۔ جو دلائل مبینہ شرعیہ اور تصریحات محدثین کرام سے ثابت ہو گئی۔ جس سے گوجرانوالہ کا فتویٰ غلط ہو گیا۔

مرعاۃ المفاتیح میں ہے: ھذہ الروایۃ تدل علی ان الوقت الذی یقع فیہ الاذان قبل الفجر ھو وقت السحور۔ (جلد اول' ص-۴۳۳) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت اس بات پر دلیل ہے کہ وہ وقت جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان قبل از فجر واقع ہوئی ہے' وہ وقت سحری کا تھا۔" جب وہ وقت سحری کا تھا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کی اذان کہلائے گی جو صبح کے لیے کفایت نہ کرے گی۔ صبح کے لیے دوسری اذان کہنی پڑے گی۔ چنانچہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اسی واسطے اذان دیا کرتے تھے جو صبح کی اذان کہلاتی تھی۔ ہاں بعض علماء حنفیین نے اذان بلال رضی اللہ عنہ کو بھی صبح کی اذان بایں وجہ لکھا ہے کہ یہ نماز صبح کی تیاری کرانے کے لیے ہے۔ نماز پڑھانے کے لیے نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کا نام کچھ رکھ لیں۔ سنت یہ امر ہے کہ مسجد میں دو مؤذن ہوں۔ ایک فجر ہونے سے پہلے اذان کہے' وہ سحری کا وقت ہو اور دوسرا

صبح ہونے کے بعد۔ وہ فجر کی اذان ہو گی۔ شرح نووی جلد اول' ص۳۵۰ میں ہے: فی هذا الحديث استحباب اتخاذ المؤذنين للمسجد الواحد يؤذن احدهما قبل طلوع الفجر والآخر عند طلوعه --- كما كان بلال وابن ام مكتوم يفعلان۔ یعنی اس حدیث سے ایک مسجد میں دو مؤذن مقرر کرنے مستحب ثابت ہوئے۔ ایک فجر سے پہلے (سحری کے وقت) اذان کہے۔ دوسرا فجر ہونے کے بعد کہے' جیسے حضرت بلال ﷺ اور ابن ام مکتوم ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔

اذان سحری اور اذان صبح کے درمیانی وقت کا اندازہ ⇐ اس مسئلہ میں علماء متقدمین کا اختلاف ہے کہ سحری کی اذان کس وقت کہنی چاہیے۔ کیونکہ اذان سحری میں یہ الفاظ مطلق وارد ہیں ینادی بلیل کہ بلال ﷺ رات کو اذان دیتے تھے۔ اصحاب شافعی یہ کہتے ہیں کہ یہ اذان سحری کے وقت کہنی چاہیے۔ بعض نے کہا کہ' رات کے نصف آخر میں کہنی چاہیے۔ چنانچہ امام نووی نے اس کو ترجیح دی ہے اور مخالف دلیلوں کی تاویل کی ہے۔ علامہ جوینی نے کہا کہ سردیوں میں رات کے ساتویں حصہ کے اخیر میں ہو اور گرمیوں میں ساتویں حصہ کے نصف میں ہونی چاہیے اور بعض علماء نے کہا کہ رات کے جس حصہ میں کہہ دی جائے' روا ہے۔ بعض نے کہا کہ عشاء کی نماز کا آخری وقت ختم ہو جانے کے بعد اس کا وقت ہے۔ یہ سب مختلف الاقوال فتح الباری' نیل الاوطار میں درج ہیں۔

پھر یہ کہنا کہ اس وقت کا اندازہ اس حدیث سے ظاہر ہے جس کو طحاوی اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ حضرت بلال ﷺ کی اذان اور ابن ام مکتوم ﷺ کی اذان میں زیادہ فرق نہ تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ ایک چڑھتا تھا اور دوسرا اترتا تھا۔ اور دونوں ایک بلند مکان پر اذان کہتے تھے۔ جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ پس اس روایت سے مطلق روایت مقید ہو گئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ حضرت بلال ﷺ کی اذان صبح کاذب میں ہوتی تھی۔ اور ابن ام مکتوم ﷺ کی اذان صبح صادق میں ہوا کرتی تھی۔

چنانچہ امام ابن حزم نے محلی ج۔۳' ص۱۱۹ میں یہ فرمایا ہے کہ نماز صبح کی تیاری کرانے کے لیے صبح صادق سے پہلے اذان دینا جائز ہے۔ اس اندازہ سے کہ پہلا مؤذن اپنی اذان پوری کر لے اور مینار یا بلند مکان سے نیچے اتر آئے اور دوسرا فجر طلوع

نے پر چڑھ جائے۔ حضرت مولانا وحید الزمان محدث لکھنوی مرحوم حاشیہ بخاری مترجم ج۔۳' ص۔۷۳ میں یہ لکھتے ہیں کہ تسہیل القاری میں اس مسئلہ پر بہت طول کیا ہے اور تمام دلائل پر بحث کر کے پھر فیصلہ کیا ہے کہ خاص صبح کی اذان طلوع فجر سے پہلے درست ہے' مگر دو شرطوں سے۔ ایک یہ کہ طلوع فجر سے ذرا پہلے دی جائے۔ اتنا پہلے کہ کوئی طہارت کر کے یا روزہ رکھنے والا روزہ رکھ لے' سحری کھا لے۔ سونے والا اٹھ اٹھے' نماز کے لیے تیار ہو جائے۔ تہجد والا وتر سے فارغ ہو جائے۔ اس کے لیے تخمینا" آدھ گھنٹہ کافی ہے۔ یہ نہیں کہ آدھی رات یا ۲ بجے یا ۳ بجے جیسے فقہاء کا قول ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ پھر طلوع فجر پر دوبارہ اذان دی جائے تاکہ لوگ نماز کے لیے نکلیں اور روزے والے کھانا پینا موقوف کر دیں اور فجر کی سنت ادا کریں۔

منتقی میں بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضرت انس اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کی اور پھر صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو دونوں چیزوں کے درمیان پچاس آیتوں کے پڑھنے کا اندازہ تھا۔ اس حدیث پر مولانا وحید الزمان حاشیہ بخاری میں فرماتے ہیں کہ پچاس آیتیں پانچ منٹ یا دس منٹ میں پڑھی جاتی ہیں۔ اس حدیث سے یہ نکلا کہ سحری کھانا صبح کے قریب ہی مسنون ہے' نہ بہت رات رہے۔ جیسے جاہل لوگ کیا کرتے ہیں۔ متاخرین نے اس کا اندازہ رات کے ساتویں حصہ سے کیا ہے اور بعضوں نے کہا کہ ۲۶ ہر تاریخ کو جب اخیر رات میں چاند نکلتا ہے یہ صبح صادق کا وقت ہے۔ اس وقت کو دیکھ کر اندازہ کر لیں۔

ابن حبان اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے انس! میں کھانے کا ارادہ کرتا ہوں' مجھے کوئی چیز لا کر کھلاؤ۔ تو میں کھجور لے آیا اور پانی کا برتن لے کر حاضر ہوا۔ یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد کا معاملہ ہے۔ پھر فرمایا اے انس! کسی آدمی کو دیکھ جو میرے ساتھ کھائے' پس میں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا' وہ آئے تو ہم نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ سحری کھائی پھر آپ کھڑے ہوئے اور دو رکعت سنت پڑھی پھر نماز صبح کے لیے گھر سے نکلے۔ کذا فی النیل۔

یہ حدیث نقل کر کے امام شوکانی لکھتے ہیں المدۃ التی بین الفراغ وبین السحور

والدخول فی الصلوٰۃ من قراءۃ خمسین ایۃ ھیی مقدار الوضوء۔ یعنی آنحضور ﷺ کے سحری کھا کر فارغ ہونے اور نماز میں داخل ہونے کا درمیانی فاصلہ پچاس آیتوں کا تھا۔ یہ اندازہ وضو کرنے کا ہے۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے: "باب قدرکم بین السحور وصلوٰۃ الفجر" سحری اور فجر کی اذان کے درمیان کتنا اندازہ ہونا چاہیے۔ پھر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ والی حدیث بیان فرما کر پچاس آیتوں کا اندازہ ظاہر کیا۔ پس سحری میں تاخیر کرنا سنت سے ثابت ہوا۔ یہی اہلحدیث کا مذہب ہے۔

منتقی میں یہ حدیث ہے: لا تزال امتی بخیر ما اخروا السحر۔ یعنی "میری امت ہمیشہ نیکی کے ساتھ رہے گی جب تک کہ سحری کھانے میں تاخیر کرتے رہیں گے۔" اس کو امام الدنیا فی الحدیث نے باب تاخیر سحور میں سحری کو تاخیر سے کرنا سنت ثابت کیا ہے۔ ہمارے ملک میں سحری کی اذان عام طور پر اڑا دی گئی۔ اس کی جگہ نقارہ، نوبت، توپ یا گولہ چھوڑنا، سپیکر پر اعلان کرنا اور صلواتیں پڑھنا وغیرہ جاری کیا اور تمام مساجد میں یہ کام ہونے لگا اور پہر رات لوگوں کو جگا کر سحری کھلا دی۔ وہ بہت رات رہے کھانے کھا کر پھر حقہ نوشی میں مشغول ہو گئے۔ باتیں مارتے رہے یا پھر سو گئے، جس سے صبح کی جماعت بلکہ بعض کی صبح کی نماز ہی چلی گئی۔ یہ سب خلاف سنت اور اپنا نفسانی طریقہ ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں سحری کا کھانا کھجور اور پانی تھا، جس سے جلدی فارغ ہو جاتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں خورد و نوش کا طریقہ دوسری قسم کا ہے کہ آٹا گوندھنا، روٹی پکانا، سالن تیار کرنا اور دیہات میں دودھ بلو کر لسی وغیرہ تیار کرنا پھر سحری کرنا۔

عربی شخص کا کھجور کھا کر پانی پینا اور ہمارے پنجاب کے لوگوں کا روٹی کھانا ہر دو میں بہت فرق ہے۔ بلکہ ملک عرب میں بھی یہ سب تکلفات بڑھ گئے ہیں۔ وہ بھی قسما قسم کے کھانے کھاتے ہیں، ان سب کے لیے اب پچاس آیات پڑھنے کا فاصلہ اور مدت ہرگز کفایت نہیں کر سکتی۔ اس لیے سحری کی اذان صبح سے تخمینہ دو گھنٹہ پہلے کہتے ہیں۔ جس کے بعد لوگ بیدار ہو کر سحری کا انتظام اور کھانا کھا کر فارغ ہوتے ہیں۔ پھر صبح کی اذان سن کر نماز فجر کے لیے آتے ہیں۔ یہ ضرورت اور وقتی اقتضاء سے تبدل و تغیر ہو گیا ہے جس سے کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں کھانا خواہ کسی وقت تیار کر لیا جائے

لیکن جب کھانا ہو تو صبح کے قریب کھائیں اور کھانا کھا کر پھر نماز صبح کے لیے مسجد میں آجائیں تو اقتضاء وقتی کے پیش نظر سحری کی اذان صبح سے آدھ گھنٹہ پہلے ہونی چاہیے۔ یہ وقفہ اذان بلال رضی اللہ عنہ اور اذان ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے درمیانی فاصلہ کے قریب ہی ہے' کوئی زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان کے بعد فوراً نہیں اترتے تھے اور نہ ہی ان کے بعد ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اسی مکان پر فوراً چڑھ جاتے تھے۔ یہ الفاظ ان یرقی ذاو ینزل ذا بطور مبالغہ کے بولے گئے ہیں۔ اگر اسی طرح عمل ہوتا تو پھر ان دو اذانوں کا فائدہ ہی کیا۔ اور اس طرح نہ دونوں رات میں ہی کی جائیں گی اور عین صبح میں بلکہ بین بین معاملہ ہو جائے گا تو اس کی توجیہہ وہی ٹھیک ہے جو امام نووی نے علماء سے نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ فجر سے پہلے اذان دیتے تھے پھر مکان پر بیٹھے دعا وغیرہ میں مشغول رہتے تھے اور صبح کا انتظار کرتے تھے۔ جب صبح ہو جاتی تو مکان کے نیچے اتر کر ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو آگاہ کرتے تھے۔ پھر ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ طہارت وضو سے تیاری کرتے اور پھر مکان پر چڑھ کر اذان کہہ دیا کرتے تھے۔

دونوں اذانوں کے درمیان فاصلہ کی مدت چونکہ تھوڑی سی تھی' اس لیے اس کو یوں بیان کر دیا کہ ایک اترتا تھا اور دوسرا چڑھ جاتا تھا۔ اگر ان کے ظاہری مطلب کو لیا جائے تو پھر اس پر عمل کرنا مشکل کیا غیر ممکن ہے۔ جس غرض کے لیے یہ اذان مشروع ہوئی وہ فوت ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض حنفیہ اس مشکل سے گھبرا کر اس حدیث سے دست بردار ہو گئے۔ چنانچہ مترجم مشکوۃ کے حاشیہ پر مظاہر حق کا خلاصہ مضمون ہے۔ اس پر وہ لکھتے ہیں' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ تور پشتی نے اس کو خاصہ رسول قرار دیا ہے تو ان کی یہ بات غلط اور سراسر باطل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ دینی احکام میں وحی الٰہی کے پابند تھے لیکن آپ اپنی امت کے لیے اسوہ حسنہ تھے۔ آپ کے اقوال و افعال کی امت کو اطاعت و اتباع کرنے کا حکم ہے۔ جو امور آپ کی ذات مقدس کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں ان کی کتاب و سنت میں صراحت آگئی ہے۔ مثلاً چار سے زیادہ نکاح اور بغیر اولیاء کے عورتوں سے نکاح اور روزہ وصال اور نیند آنے سے وضو کا نہ ٹوٹنا وغیرہ خاصہ نبی ہونے کا ثبوت آچکا ہے۔

اصول یہ ہے کہ الخصائص لا تثبت الا بالدلائل کہ خصائص نبویہ دلائل کے

بغیر ثابت نہیں ہو سکتے۔ پس اس پر کوئی دلیل ناطق نہیں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان پر کھاتے رہنا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ تھا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ خطاب فرمایا ہے کہ کلوا واشربوا حتٰی یؤذن ابن ام مکتوم کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد تم کھاتے پیتے رہو' یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو اذان دے تو پھر رک جاؤ۔ اب خاصہ کہاں رہا۔ علاوہ ازیں حدیث میں آیا ہے جس کو امام طحاوی اور امام احمد نے روایت کیا ہے کہ جب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ مکان پر اذان کہنے کا ارادہ کرتے تو بعض صحابہ کہتے فنقول کما انت حتٰی نتسحر۔ یعنی ہم کہتے کہ آپ ذرا اسی طرح ٹھہریے کہ ہم سحری کھا لیں۔ جب صحابہ کا تعامل اس پر موجود ہے تو پھر خاصہ کہاں رہا۔

پس مطلب وہی ہے جو امام نووی نے علماء سے نقل کیا ہے۔ اس صراحت سے گوجرانوالہ کا فتویٰ هبا منثورا ہو گیا کہ وہ سرے سے اذان سحری کے قائل نہیں ہیں۔ صرف ایک اذان کے قائل ہیں۔

کیا صرف ایک ہی اذان قبل فجر والی کفایت کر سکتی ہے؟ ⇦ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی کا بیان ہے کہ لم نری مؤذنین عندنا یؤذنون لها الا بعد دخول وقتها الا الفجر۔ یعنی "ہم نے مؤذنوں کو ہمارے ہاں وقتوں سے پہلے اذان دیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا مگر فجر کی اذان وقت سے پہلے کہتے ہیں۔"

امام بیہقی نے سنن کبریٰ کی پہلی جلد میں یوں باب منعقد کیا ہے: "باب السنة فی الاذان لصلٰوۃ الصبح قبل طلوع الفجر" یعنی سنت یہ ہے کہ نماز صبح کے لیے اذان طلوع فجر سے پہلے دی جائے۔ اس مسئلہ کے ثبوت میں امام بیہقی نے زیاد بن حارث صدائی والی حدیث پیش کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ نماز صبح کی اذان کا موقع آیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ اذان دو' میں نے اذان دے دی۔ جب میں نے تکبیر کہنے کا ارادہ کیا تو عرض کیا یارسول اللہ! کیا میں تکبیر کہہ دوں؟ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشرق کے کنارہ پر صبح دیکھنے لگے۔ پھر فرمایا ابھی تکبیر مت کہو' یہاں تک کہ جب صبح طلوع ہو تب کہنا۔ اس سے امام بیہقی نے یہ ثابت کیا کہ صبح سے پہلے اذان کہنی سنت ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔

نیل الاوطار میں اس روایت کے بعد یہ لکھا ہے لکن فی اسنادہ ضعف کما

قال الحافظ- یعنی یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے بیان کیا ہے- نیز یہ لکھا ہے یعنی یہ مخصوص واقعہ ہے جس میں عموم نہیں ہوتا اور یہ واقعہ سفر کا ہے- پس سنت ہونا ثابت نہ ہوا- ہاں سفر میں جبکہ دوسرا مؤذن نہ ہو تو جواز کی صورت بن سکتی ہے- امام مالک نے فرمایا کہ ہمارے مدینہ میں بھی یہ عمل جاری ہے-

شامی فقہ کی کتاب جلد اول' ص-۲۸۴ میں ہے: فان ابا یوسف یجوز الاذان قبل الفجر بعد نصف اللیل- یعنی قاضی ابویوسف فجر سے پہلے نصف رات کے بعد اذان دینا جائز کہتے تھے- تحفة الاحوذی شرح ترمذی میں لکھا ہے کہ وہ پہلے اپنے استاد ابوحنیفہ کے ساتھ تھے' پھر اس سے رجوع کر لیا اور یہ کہتے تھے لا باس ان تؤذن للفجر خاصة قبل طلوع الفجر- (جلد اول' ص-۱۸۰) یعنی خاص فجر کے لیے وقت ہونے سے پہلے اذان دینا جائز ہے- یہ اتباع حدیث کے لیے مسلک اختیار کیا ہے- امام ترمذی نے یہ کہا ہے- اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ رات کو فجر سے پہلے اذان دی جائے تو کفایت کرے گی یا صبح ہونے پر دوبارہ کہنی پڑے گی- امام مالک' امام شافعی' امام ابن مبارک' امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے کہ یہ اذان کافی ہے' اعادہ کی ضرورت نہیں ہے-

امام ابوحنیفہ اور امام سفیان ثوری اعادہ کے قائل ہیں کہ دوبارہ اذان دینا چاہیے اور وہ حدیث بلال' ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما دو اذانوں والی پیش کرتے ہیں- یہ مسلک صحیح ہے- اور اس پر سات دلائل پیش کر کے اس کو صحیح ثابت کیا گیا ہے- تحفة الاحوذی جلد اول' ص-۱۸۰ میں یہ لکھا ہے کہ کوئی حدیث صحیح مرفوع اس اکتفا پر دلالت نہیں کرتی- پس غالب مذہب عدم اکتفا ہے-

امام طحاوی نے بعض روایتوں کی بنا پر یہ کہا ہے کہ بلال ﷛ کی آنکھ میں نقص تھا' اس لیے وہ اذانیں قبل فجر دینے میں خطا کرتے تھے- سو اس کی حافظ ابن حجر نے تردید کر دی کہ بلال ﷛ ہمیشہ ہی اذان دیا کرتے تھے- اگر غلطی کرتے تو آنحضرت ﷺ ان کو ہمیشہ کے لیے مؤذن مقرر نہ کرتے-

خلاصہ تمام بحث کا یہ ہے کہ سحری کی اذان مسنون اور علماء متقدمین و فقہا میں مسلم ہے اور ہمارے عہد کے علماء اہل حدیث جو مفتیان دین و محققین اسلام تسلیم کئے

گئے ہیں' وہ بھی اذان سحری مسنون اور مشروع قرار دیتے ہیں۔ جن کے فتوے اور اسماء گرامی رسالہ اذان سحور مصنفہ مولانا عبدالجلیل خان صاحب محدث جھنگوی مدظلہ کے آخر میں درج ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ سحری کے وقت اذان کہنا قرآن مجید یا حدیث شریف سے ثابت ہے یا نہیں؟ سحری کی اذان اور فجر کی اذان میں کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟ بینوا وتوجروا۔

(عالی جناب حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب محدث جھنگوی کا فتویٰ)

جواب : سحری کے وقت اذان کہنا حدیث نبوی سے برابر ثابت ہے۔ بخاری شریف جو اہلحدیث اور اہل سنت والجماعت کے نزدیک قرآن حکیم کے بعد تمام کتابوں سے اصح اور اعلیٰ تسلیم کی گئی ہے' اس میں مندرجہ ذیل دو احادیث موجود ہیں۔

(۱) عن عبداللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یمنعن احدکم اذان بلال من سحورہ فانہ یؤذن بلیل لیرجع قائمکم ولینبہ نائمکم الحدیث۔ یعنی "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سن کر سحری کھانے سے مت رکو۔ اس لیے کہ وہ رات کے وقت اذان کہتے ہیں تاکہ سحری کھانے کے لیے سونے والے اٹھ جائیں اور قیام کرنے والا اپنے گھر لوٹ آئے۔"

علامہ طحاوی فرماتے ہیں: فقد اخبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذلک النداء کان من بلال لینبہ النائم ولیرجع الغائب (معانی الآثار جلد اول' ص-۸۳) یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اس لیے ہوتی تھی کہ سونے والا بیدار ہو جائے اور غیر حاضر حاضر ہو جائے اور یہ اذان نماز فجر کی نہیں تھی۔

(۲) عن عائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان قال ان بلالا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتی یؤذن ابن ام مکتوم۔ یعنی "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالتحقیق ارشاد فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کے وقت اذان کہتے ہیں' لہٰذا جب تک دوسرا مؤذن ابن ام مکتوم اذان نہ کہے تم برابر کھاتے پیتے رہو۔"

حدیث "فکان اذا نزل ھذا وارادھذا ان یصعد" کے تحت علامہ طحاوی فرماتے ہیں: تعلقوا به وقالوا کما انت تتسحر۔ (طحاوی ص-۸۰) اس حدیث شریف کی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ اذان سحور اور اذان فجر کے درمیان اتنا وقفہ ہونا چاہیے کہ سحری کھانے والا اطمینان کے ساتھ سحری کھالے۔

خلاصہ مقصد یہ ہے کہ سحری اور افطاری کے وقت گولے چھوڑنے' نقارے اور سیٹی وغیرہ بجانے رسمی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان رسمی چیزوں پر اذان کو ترجیح دیں۔ کیونکہ یہ سنت نبوی' شعار اسلام کار ثواب اور اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے شایان شان ہے۔

فقط (حررہ عبدالجلیل خان دہلوی)

(جناب مولانا محمد یوسف صاحب کلکتہ والوں کا فتویٰ)

ہمیں یہ سن کر افسوس ہوا کہ بعض حضرات اس اذان کو دینے سے روکتے ہیں اور فساد پر تل جاتے ہیں' ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول کی سنت کو زندہ کرنا اور عمل کرنا ہی تو اسلام ہے۔ پاکستان کی بنیاد بھی قرآن و سنت پر ہی رکھی گئی ہے۔ لہٰذا کسی کو کیا حق کہ منع کرے۔

علامہ شوق نیموی جو احناف کے بہت بڑے عالم ہیں۔ آثار السنن تصنیف خود میں اس اذان سحری کا ثبوت پیش کرتے ہیں' ملاحظہ ہو۔ اما اذان بلال قبل طلوع الفجر فانما کان فی رمضان۔ فرماتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان صبح سے پہلے رمضان میں ہوا کرتی تھی۔ مفتی محمد شفیع کا فتویٰ ہمارے سامنے ہے۔ انہوںؒ نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس کا ثبوت پیش کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جو لوگ اس کا انتظام کر سکیں وہ اذان دے سکتے ہیں۔ التباس نہ پڑنا چاہیے۔

میں گزارش کروں گا کہ جو احباب اذان دینے کو سنت سمجھتے ہیں جیسا کہ صحیح بخاری سے ثابت ہو چکا ہے اور احناف کے بڑے بڑے علماء بھی اس کے قائل ہیں تو ان کو اذان سے نہ روکا جائے اور جو لوگ اس حدیث سے انکار کرتے ہیں' کریں۔ کسی پر ہم جبر نہیں کر سکتے۔ جھگڑا فساد نہ کیا جائے۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی ہے۔ اس سے روکنا مداخلت فی الدین ہے۔ اور پاکستان کے بنیادی اصولوں سے دشمنی ہے۔

(جناب مولانا عبدالجبار صاحب مدرس دارالحدیث اوکاڑہ کا فتویٰ)

الجواب صحیح : سحری کی اذان صحیح بخاری سے ثابت ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یہ اذان دی جاتی تھی۔ جہاں مسلمانوں نے اور سنن کو چھوڑ دیا ہے' وہاں اس سنت کو بھی چھوڑ دیا اور جو لوگ اس سنت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں' ان کو منع کرتے ہیں بلکہ مقابلہ کرتے ہیں اور اس سنت کی جگہ گولے چلانا' ڈھول پیٹنا یا اور کوئی طریقہ ہندوؤں وغیرہ کا چلانا' سحری کے لیے علامات ٹھہرا رکھی ہیں۔ یہ سب بدعات اور خلاف سنت ہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ مسلمانو! ہر ایک دینی کام میں تمہارے نبی (ﷺ) کی پیروی اچھی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(کتبہ ابو محمد عبدالجبار سلفی المدرس بدار الحدیث الواقعہ بلدۃ اوکاڑہ)

(جناب مولانا ثناء اللہ صاحب شیر پنجاب مناظر اسلام امرتسری کا فتویٰ)

فتاویٰ ثنائیہ (جلد اول' ص-۴۰۹) میں سوال و جواب یوں درج ہے۔

سوال : رمضان شریف میں سحری کھانے کے لیے اذان دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر دیں تو سنت کے خلاف ہو گا یا نہیں؟

جواب : اذان دے سکتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت بلال ؓ صبح صادق سے پہلے اذان دیتے ہیں کہ تم نماز تہجد کے لیے اٹھ سکو۔

(جناب مولانا حافظ عبدالستار صاحب محدث دہلوی ؒ امام جماعت غرباء اہلحدیث کا فتویٰ)

الا جوبہ کلھا صحیحۃ۔ بیشک نبی علیہ السلام سے محبت رکھنا یہی ہے کہ آپ کی سنت سے محبت رکھی جائے۔ سحری کی اذان چونکہ سنت ہے' لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اس مردہ سنت کو زندہ کر کے محبت نبوی کا ثبوت دیں۔ فقط

(حررہ العاجز ابو محمد عبدالستار غفرلہ)

رسالہ سحور کی اذان کے بارہ میں جن علماء نے فتوے صادر کئے ہیں اور تصدیق فرمائی' ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ (فہرست اسماء مصدقین)

(۱) جناب عبدالوکیل صاحب خطیب کراچی۔ مجیب کا جواب واضح اور صحیح ہے۔ م

رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۶ھ۔ (۲) جناب ابوالفضل عبدالحنان صاحب کراچی' الجواب صحیح۔ (۳) جناب مولانا جعفر علی ٹونکی ثم البستوی "الجواب صحیح" (۴) مولانا ابو عمار عبدالقہار صاحب مدرس مدرسہ دارالسلام کراچی "الجواب صحیح" (۵) جناب مولانا ابو احمد غفرلہ دہلوی "الجواب حق والحق احق ان یتبع" (۶) جناب مولانا عبداللہ صاحب امیر قوم اوڈ جوہر آباد "بیشک جواب درست ہے" (۷) جناب مولانا محمد یوسف صاحب بخاروی امیر جماعت عارف والہ "الجواب صحیح" (۸) جناب مولانا عبدالرحمن صاحب مدرس مدرسہ دارالسلام کراچی "الجواب صحیح" (۹) جناب مولانا ابو محمد عبدالقہار سلفی مفتی جماعت غرباء اہلحدیث کراچی "نشان مہر" (۱۰) جناب مولانا حافظ عبدالحکم صاحب کرم الجلیلی نائب مدیر صحیفہ "الجواب صحیح"

بفضلہ تعالیٰ یہاں پاکستان کے دارالحکومت کراچی شہر میں حسب دستور جماعت غرباء اہلحدیث کی جامع مسجد محمدی نس روڈ اور چھوٹی مسجد نیپئر روڈ میں سحری کے وقت میں بھی لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے اور مردہ سنت کو زندہ کیا جاتا ہے۔ تلک عشرہ کاملہ۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد ۵۱' شمارہ ۲۳' ۲۴ مورخہ یکم و ۱۵ ذوالحجہ سنہ ۱۳۹۰ھ

مسئلہ اذان سحور اور مفتیان گوجرانوالہ

الٰہی سمجھ خدا کسی کو بھی نہ دے
دے آدمی کو موت پر یہ بد ادا نہ دے

واضح ہو کہ صحیفہ اہلحدیث مطبوعہ اول فروری سنہ ۱۹۷۱ء اور صحیفہ مجریہ ۱۵ فروری سنہ رواں میں "سحری کی اذان کا ثبوت" کے عنوان سے بحث کی گئی تھی۔ سحری کے وقت اذان دینا سنت ہے۔ اور عہد نبوی میں اس پر تعامل تھا۔ اور اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اس لیے کی گئی تھی کہ اخبار اہلحدیث لاہور مطبوعہ ۴ دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء میں امیر جمعیت اہلحدیث گوجرانوالہ مدظلہ کی تصدیق سے جمعیت اہلحدیث کے مفتی

مولانا ابو البرکات دام فیضہ کا یہ فتویٰ شائع ہوا تھا کہ خاص سحری کے نام پر اذان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ عہد نبوی کی اذان حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی فجر کے لیے تھی۔ اب لوگوں کو اسپیکر کے ذریعہ سحری کے لیے بیدار کرنا امر بالمعروف کے ضمن میں داخل ہے۔ اس کا کوئی حرج نہیں ہے۔ سحری کی اذان چونکہ جماعت اہلحدیث' خصوصاً غرباء اہل حدیث میں معمول بہ ہے اور اس کو مسنون سمجھا جاتا ہے اور سحری کے لیے بیدار کرنے کی دیگر چیزوں کو بدعت سمجھا جاتا ہے اور گوجرانوالہ کے شائع شدہ فتویٰ سے اذان سحری کا بدعت ہونا اور دیگر مروجہ چیزوں کا جائز ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ اس لیے اس فتویٰ پر تعاقب کیا گیا۔ جس میں سات دلائل پیش کر کے سحری کے وقت اذان دینا ثابت کر کے فتویٰ مذکور کی تردید سدید قابل دید و شنید کی گئی۔

الحمد للہ یہ تعاقب اہل انصاف لوگوں میں مقبول ہوا اور انہوں نے حق کا اعتراف کیا۔ اور "آمنا وصدقنا" کہا۔ یہی اہلحدیث کی شان ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ اپنی بے نظیر کتاب الاحکام فی اصول الاحکام کی جز اول ص۔۹۳ میں فرماتے ہیں کہ مومنین کو جب کتاب و سنت کی طرف بلایا جائے اور ان کو حکم سنا کر فیصلہ کیا جائے تو وہ یہ کہتے ہیں "سمعنا واطعنا" ہم نے یہ حکم خدا و رسول کا سن لیا اور مان لیا۔ ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں وھذا جواب اصحاب الحدیث الذین شھدھم اللہ تعالٰی وقولہ الحق انھم مؤمنون وانھم مفلحون وانھم ھم الفائزون۔ یعنی سمعنا واطعنا سے جواب دینے والے اہلحدیث ہیں جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے کہ یہی جماعت مومنین کی ہے اور یہی فلاح پانے والی اور فائز المرام ہے۔ لیکن میرے تعاقب مدللہ سے ان حضرات نے انحراف کرتے ہوئے سمعنا وعصینا کہہ کر مقابلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ اخبار اہلحدیث مطبوعہ ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۷۱ء شمارہ۔۱۴ تا شمارہ ۱۶ تین شماروں میں سمعنا وعصینا کی تفصیل شائع کر دی ہے۔ راقم الحروف عارف حصاری نے نہایت اطمینان و عرفان سے پڑھا اور خوب غور و تامل کیا لیکن سوائے عصیان و طغیان کے کچھ معلوم نہ ہوا۔ ہاں یہ ظاہر ہوا کہ مغیلی جمعیت میں ہٹ دھرمی پوری طرح گھر کر چکی ہے۔ تب ہی صاف سیدھی بات کے سمجھنے میں قصور کرتے چلے گئے

ہیں' جس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کا نور' دور ظلمت بدستور قائم ہے۔

اب راقم السطور ان کے کلام کو لفظ منکرین اذان سحور اور اپنے کلام کو لفظ اہل نور سے معنون کر کے جواب عرض کرتا ہے شاید کہ رب غفور وشکور ان کو ہدایت سے معمور فرما کر اپنی درگاہ میں منظور فرما لے۔ وما ذالک علی اللہ العزیز۔

منکرین اذان سحور: یہ اذان جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی ہے سحری کے لیے یا کھانا تیار کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ فجر کے لیے ہے۔

اہل نور — بڑے بڑے علماء خطا میں آپڑے
مذہب باطل میں بھی دیکھے ہیں عالم بڑے

حدیث شریف میں یہ آیا ہے کہ اذا اذن بلال فکلوا واشربوا یعنی "جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دے تو تم کھاؤ پیو۔" اب آپ کی مرضی ہے کھانا پہلے سے تیار کیا ہوا کھا لو یا تیار کر لو۔ حکم اس وقت کھانا کھانے کا ہے۔ اب یہ کھانا صبح سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان پر کھانا ہے تو اسے سحری میں اذان کا ہونا اور اس اذان پر کھانا کھانا ثابت ہو گیا۔ اگر اس اذان کو صبح کی اذان کہو گے یا صبح کے لیے کہو گے تو یہ سراسر جھوٹ ہو گا۔ کیونکہ ایک تو وہ صبح کا وقت نہیں ہے' دوسرے صبح کی اذان پر کھانا کھانے کا حکم دینا جائز نہ تھا کہ قرآن نے صبح کے وقت کھانا بند کر دیا تھا۔ اس لیے آپ حضرات کے مذکورہ قول میں فتور ہے۔ اس کو دور کرو تاکہ فہم صحیح کا نور میسر ہو۔

منکرین اذان سحور: دونوں اذانوں کے درمیان فاصلہ صرف چند لمحے کا تھا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آیا ہے۔

اہل نور — پردہ تم اپنے تعصب کا اٹھا دو دل سے
گر تمہیں منظور ہے جلوۂ جانان حدیث

حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں چند لمحوں کا ذکر نہیں ہے۔ صرف بطور مبالغہ دو مؤذنوں کے اترنے چڑھنے کا ذکر ہے۔ یہ کنایہ ہے' مدت یسیرہ سے کہ جس میں کھانا کھایا جا سکے۔ اگر کھانا نہ کھایا گیا تو یہ مطلب اور حکم لغو ہو جائے گا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سوئے ہوئے کو بیدار کرنے اور تہجد سے واپس لوٹانے کے لیے

شروع ہوئی اور اس اذان پر یہ حکم صادر ہوا کہ جب بلال ؓ اذان دے تو تم کھانا کھاؤ اور پانی پیو۔

منکرین اذان سحور: اسپیکر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں موجود نہیں تھا اور اب وہ موجود ہے۔ اس کے ذریعہ وقت کے اعلان کرنے سے تمام شہریوں کو فائدہ ہو گا۔

اہل نور: عہد نبوی میں اسپیکر تو نہ تھا لیکن زبان تو موجود تھی۔ اس کے ذریعہ اعلان اور منادی ہو سکتی تھی۔ جیسے بعض نمازوں کے لیے الصلوٰۃ جامعۃ سے اعلان کیا جاتا تھا اور یہ اعلان اور منادی بھی عہد نبوی میں کرائی گئی کہ سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہ ہو گی اور یہ اعلان بھی کرایا گیا لا یدخل الجنۃ الا نفس مومنۃ (او کما قال) کہ مومن کے بغیر جنت میں کوئی نفس داخل نہ ہو گا۔

جب سحری کا اعلان امر بالمعروف میں داخل ہے اور امر بالمعروف اس وقت زبان سے ہوا کرتا تھا تو سحری کا اعلان بھی کر دیتے۔ لیکن نہ کیا تو اب اس کو کرنا بدعت ہوا۔ جس کا فتوٰی مفتیان جمعیت شائع کر کے فتور پیدا کر رہے ہیں۔ اور ہم نور کی طرف رغبت دیتے ہیں کہ اذان کہو اور کھلاؤ کیونکہ عہد نبوی میں سحری کے وقت اذان ہوتی تھی۔ جس پر یہ حکم صادر ہوا کہ جب بلال ؓ اذان دے تو تم کھاؤ پیو اور جب ابن ام مکتوم ؓ اذان دے تو پھر رک جاؤ۔ اب دیگر اعلان سے کیا فائدہ؟ ہاں بدعت سے ایمان کا نقصان ہے۔

منکرین اذان سحور: اس کے باوجود ہم نے اسپیکر کے اعلان کو مسنون یا مستحب نہ لکھا تھا"

اہل نور:

حج کعبہ بھی کیا اور گنگا کا اشنان بھی
راضی رہے رحمٰن بھی' خوش رہے شیطان بھی

ایک طرف اسپیکر کے اعلان کو امر بالمعروف کے ضمن میں داخل بھی کر رہے ہیں جو درجہ مستحب کا ہے اور ادھر انکار بھی کر رہے ہیں کہ یہ مستحب نہیں ہے۔ جب مسلمانوں کی خیر خواہی اور امر بالمعروف ہے تو پھر کار ثواب ہے اور ہر کار ثواب کرنا

مستحب کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر یہ کہنا کہ ہم مستحب نہیں کہتے' یہ کہاں کی ثقاہت ہے۔

اچھا ہم ان مفتیوں سے یہ کہتے ہیں کہ اسپیکر سے ماہ رمضان میں بیدار کرنے کے لیے بار بار اعلان کرنا حکم شرعی ہے یا غیر شرعی؟ نص ہے یا اختراعی؟ اگر کہو کہ شرعی اور نص ہے تو وہ نص اور حکم شرع سے پیش کریں اور اگر اختراعی اور غیر شرعی ہے تو پھر بدعت ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اب آپ صاحبان اس آیت کے ضمن میں آگئے ام لهم شركاء شرعوالهم من الدين مالم ياذن به الله۔ یعنی "کیا واسطے ان کے ایسے شریک ہیں جو ان کے لیے ایسی چیزوں کی شریعت سازی کرتے ہیں جس کی شریعت بنانے کا اللہ تعالیٰ نے اذن نہیں دیا۔" فتفکروا۔

منکرین اذان سحور: آخر ہم نے فجر کے لیے ہونے کو ترجیح دی ہے۔ اس کی بین دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ اسے حضرت مولانا عارف صاحب کا تبصرہ پیش کرنے کے بعد مع حوالہ پیش کی جائے گی۔

اہل نور: ناظرین اہل علم حضرات! مفتیان جمعیت گوجرانوالہ کے اس وعدہ و ثیقہ کو یاد رکھیں کہ انہوں نے اس کلام میں مندرجہ ذیل چیزوں کا وعدہ کیا ہے۔ (۱) فجر کے لیے ہونا (۲) بین دلیل (۳) مع حوالہ پیش کرنا۔ اس وعدہ و ثیقہ پر انہوں نے انشاء اللہ تعالیٰ تک نہیں کہا۔ پس اگر وعدہ ایفاء نہ کیا تو پھر ان پر وعدہ خلافی کا جرم عائد ہو گا۔

منکرین اذان سحور: ہم سمجھتے ہیں کہ سحری کے لیے سات یا دس دلائل جو جناب نے پیش کیے ہیں وہ اس قسم کے ہیں کہ بعض بدعتی حضرات نبی ﷺ کے لیے علم الغیب ثابت کرنے کے لیے قرآن کی سو آیات پڑھ کر سنا دیتے ہیں (تا آخر) لاہور کے ایک صاحب نے قل ھو اللہ احد پڑھ کر ثابت کر دیا' الخ۔

اہل نور: مفتیان جمعیت کی مرضی ہے کہ وہ ہمارے پیش کردہ دلائل اور طرز استدلال کو ان بدعتیوں کے مشابہ بنائیں جو سورہ قل ھو اللہ احد سے سید الانبیاء ﷺ کا علم غیب ثابت کرتے ہیں' یا اس سے بھی ہلکا بنائیں۔ لیکن یہ تو آپ صاحبان تسلیم کر چکے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ سحری کے لیے تھی یا فجر کے لیے۔ اب سوچئے کہ وہ علماء کون ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ

اذان سحری کے لیے تھی۔

نیز یہ لکھا ہے آیا سحری کے لیے یا فجر کے لیے؟ یہ دونوں امر مختلف فیہ ہیں۔ اس سے علماء اسلام کے دو گروہ ظاہر ہو گئے۔ ایک اذان سحری کے قائلین اور دوسرے اذان فجر کے قائلین۔ اب بتایئے اگر کوئی شخص آپ صاحبان سے علم الغیب کا مسئلہ دریافت کرے کہ سید الانبیاء ﷺ کا علم الغیب کلی تھا یا نہیں؟ تو آپ کیا اس وقت بھی حسب عادت یہی جواب دیں گے کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے' کلی علم غیب تھا یا نہیں۔ دونوں امر مختلف فیہ ہیں۔ اگر نہیں دیں گے اور ابھی تک میرا حسن ظن قائم ہے کہ ایسا غلط بلکہ باطل جواب نہیں دیں گے۔ کیونکہ علم غیب کے خاصہ خدا ہونے میں تمام علماء اہل اسلام متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے۔

اچھا اب اس بات پر غور کرو کہ جب یہ مسئلہ اذان سحری کا اختلافی ہے تو پھر سحری کی اذان ہونے کے کون سے علماء قائل ہیں؟ آپ نے یہ لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ' امام محمد رحمہا اللہ کا حوالہ دیا ہے۔ دو تو یہ ہو گئے پھر آپ نے مولانا انور شاہ کے حوالہ سے جو عبارت پیش کی ہے اس میں دو یہ ہیں۔ "امام ابن القطان' ابن دقیق العید" اب یہ چار ہو گئے۔ تیسری قسط میں امام طحاوی کا بھی ذکر ہے۔ اب یہ پانچ ہو گئے۔ انہوں نے صاف کہا ھو لغیر الصلوٰۃ۔ چھٹے امام ابن حزم کو بھی ساتھ شمار کر لو کیونکہ ان کا ارشاد بھی یہ ہے کہ انہ لم یکن للصلوٰۃ "سحری والی اذان نماز کے لیے نہ تھی۔" نیز محلی ج-۳' ص-۱۱۷ میں صاف طور پر یہ فرماتے ہیں: لانہ اذان سحور لا اذان للصلوٰۃ۔ یعنی "حضرت بلال ؓ کی اذان سحری کی تھی نماز فجر کے لیے نہ تھی" اور علامہ عینی بھی سحری کی اذان کہتے ہیں' فجری نہیں کہتے مگر وہ رمضان کے ساتھ مختص نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ دیگر مہینوں میں بھی نفلی روزے رکھتے تھے' اس لیے تمام سال سحری میں کہتے تھے۔ علامہ عینی نے ابوحنیفہ کے ساتھ علامہ ثوری کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ اور ہم نے مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے بھی ثبوت دے دیا تھا۔ یہ آٹھ فقہاء ہیں و احادیث نبویہ کو خداداد فقاہت سے خوب سمجھتے ہیں۔

امام ابن القطان شیخ الاسلام اور امام الجرح والتعدیل ہیں اور مستقل مجتہد ہیں جن کا علم حدیث اور فقاہت شہرۂ آفاق ہے۔ اگر زیادہ تسلی کرنی ہو تو امام ذہبی کی مشہور

کتاب تذکرۃ الحفاظ میں ان کے مناقب پڑھ کر دیکھو۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد ہر دو کا اصحاب الرائے ہونا علیحدہ امر ہے۔ ان کی فقاہت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں فقیہ العراق مشہور ہیں۔ امام ابن دقیق العید بھی کوئی معمولی عالم نہیں بلکہ مشہور مجتہد اور محدث ہیں۔ تدریب الراوی ص ۵۴۲ میں ہے **قال الذھبی "اعلمھم بعلل الحدیث والاستنباط ابن دقیق العید"** امام ذہبی جو نقد رجال میں مسلمہ امام اور نقاد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ محدثین میں حدیث کی علتوں کو سمجھنے اور احادیث سے مسائل کے استنباط کرنے میں ابن دقیق العید بہت زیادہ عالم ہیں۔ بستان المحدثین میں ان کی بہت مدح لکھی ہے کہ از کیاء زمانہ سے وسعت علم میں بالاتر تھے۔ مذہب مالکی اور مذہب شافعی کے استاد کامل تھے۔ لوگوں کا یقین تھا کہ ہر سو سال پر جس عالم کے ظہور کا وعدہ ہے وہ یہی ہیں یعنی مجدد تھے۔

امام نووی نے ان کو ایک خط لکھا تھا جس میں ایک شعر تھا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہر زمانہ میں ایک مقتدا اور پیشوا ہوتا ہے' اس زمانہ میں آپ بیشک یکتا ہیں۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کریں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ کس قدر دقائق اور حقائق کو ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کشف خواطر و قلوب اور کشف وقائع و حوادث دونوں مساوی عطا فرماتے تھے۔"

اسی طرح امام ابن حزم بھی رئیس الفقہاء والعقلاء' مجتہد اندلس مشہور ہیں۔ آپ کے بھی مناقب کثیرہ ہیں جو اہل علم سے مخفی نہیں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شیخ العرب والعجم کا تو کہنا ہی کیا ہے کہ تمام علماء اہل حدیث اور احناف کے علوم کی سندیں انہیں تک منتہی ہوتی ہیں۔

المختصر آٹھوں علماء فقہاء ہیں۔ یہ سب عارف حصاری کی پیش کردہ سات احادیث سے بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کو رمضان کی سحری کے ساتھ مختص کرتے ہیں اور اس کو صبح اور نماز صبح کی اذان نہیں کہتے تو کیا پھر یہ سب ہی ان بدعتیوں جیسے ہیں جو سورہ اخلاص سے غیب نبوی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

بندہ عارف حصاری تو حق کو رجال کے ساتھ نہیں پہچانا کرتا۔ کتاب و سنت کی رو سے جو حق ہو' اس کے ساتھ آدمیوں کو پہچانا کرتا ہے۔ سو دلائل کی رو سے حق بات

یہ ہے کہ بلال ﷺ کی اذان سحری کے وقت ہوا کرتی تھی اور وہ سحری کی تھی۔ اگر ان سے بھی تسلی نہیں ہوئی تو ایک مشہور محدث اور اہلحدیث فقیہ کا فیصلہ سنئے۔ اور پہلے آٹھ فقہاء کے ساتھ ان کو نواں شمار کر لیجئے۔ وہ حضرت امام امیر صنعانی ہیں جن کو امیر یمانی بھی کہتے ہیں۔ وہ سبل السلام جلد اول' ص۔۱۲۳ میں فرماتے ہیں: وفی الحدیث شرعیة الاذان قبل الفجر لا لما شرع له الاذان فان الاذان شرع لما سلف للاعلام بدخول --- الوقت ولدعاء السامعین لحضور الصلوٰة وهذا الاذان قبل الفجر قد اخبر صلی اللّٰه علیه وسلم بوجه شرعیة بقوله لیوقظ قائمکم ویرجع نائمکم واذا سمع الاذان فلیس الاعلام بدخول بوقت ولا بحضور الصلوٰة۔ یعنی حدیث اذان بلال ﷺ میں فجر سے پہلے اذان دینے کی مشروعیت کا ذکر ہے کہ یہ اذان اس لیے مشروع نہیں کی گئی ہے کہ اس سے مقصود وقت کا اعلان کرنا ہے اور سامعین کو نماز کے لیے بلانا ہے۔ جیسا کہ اذان کا عام طور پر مقصد ہوتا ہے کہ نماز کے لیے حاضر ہوں۔ بلکہ اس اذان کا مقصد جو سحری کے وقت کہی گئی ہے' یہ ہے جس کو خود نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ لوگوں کو جگایا جائے کہ وہ بیدار ہو کر سحری کھا لیں (اور سحری کے وقت جو مؤذن مقرر ہے' اس کی بابت لوگوں کو اطلاع کر دی کہ یہ رات کو اذان دیتا ہے) اور تہجد والا واپس لوٹ جائے۔ (سحری کھا لے) پس یہ اذان وقت کی بابت اطلاع دینے کی نہیں ہے اور نہ نماز کے لیے حاضر ہونے کے بارہ میں ہے۔

پھر مکرر لکھتے ہیں لان بلالا لم یکن یؤذن للفریضة کما عرفت بل المؤذن لها واحد وهو ابن مکتوم۔ یعنی حضرت بلال ﷺ فرض نماز کے لیے اذان دیتا تھا جیسا کہ تم کو معلوم ہو چکا ہے بلکہ فرض کی نماز کے لیے علیحدہ مؤذن مقرر تھا اور وہ ایک ہی تھا جو ابن مکتوم ﷺ تھا۔

اس وضاحت سے یہ خیال باطل ہوا کہ صبح کے لیے دو مؤذن مقرر تھے۔ ایک اس بات کے لیے کہ لوگوں کو آگاہ کر دے کہ نماز فجر کا وقت قریب ہے تم اس کے لیے تیاری کر لو اور دوسری نماز کی طرف بلانے کے لیے تھی۔ یہ خیال اذان کی وجہ مشروعیت کے خلاف ہے۔ اس میں صبح کی تیاری کا ذکر نہیں ہے اور نہ لفظ فاصبح یا للفجر کے الفاظ موجود ہیں۔ بلکہ حدیث اذا اذن بلال فکلوا واشربوا سے صاف

ثابت ہے کہ یہ اذان سحری کے لیے تھی ورنہ یہ شرط اور جزاء لغو ہو جائے گی اور پھر یہ حدیث صاف صریح ہے کہ سحری کے لیے مؤذن مقرر تھے جو وقت سحری کے امین تھے۔

چنانچہ ارشاد ہے امناء المسلمین علی صلاتھم وسحورھم المؤذنون۔ کہ "مسلمانوں کے امین وہ مؤذن ہیں جو ان کی نماز پر اور سحری پر مقرر ہیں۔" چنانچہ سحری کی اذان پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ مقرر تھے اور صبح کے لیے ابن مکتوم رضی اللہ عنہ تھے۔ اگر مفتیان گوجرانوالہ کے نزدیک سحری پر کوئی مؤذن مقرر نہ تھا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤذنوں کو سحری پر امین کیوں کہا۔

اس کا جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو گی مبارک تمہیں

مولانا ابوالبرکات صاحب اپنے امیر جمعیت (نہ امیر شریعت) سے مشورہ کر کے یہ جواب دیں کہ سحری پر کون مؤذن تھے' جن کو مسلمانوں کا امین کہا گیا ہے؟ کیونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تو صبح کی اطلاع دینے کے لیے تھے۔ (بقول شما) پھر سحری پر کون تھے؟ اور اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں حاضر ناظر جان کر بھی بتا دیں کہ ہمارے دلائل میں جب دلیل سحری کلوا واشربوا۔ اذان' مؤذن' صبح کا دوسرا مؤذن صاف مذکور ہیں۔ جن سے ہمارا مدعا روز روشن کی طرح ثابت ہے تو ان دلائل کی مناسبت اہل بدعت کی دلیل غیب' قل ھو اللہ احد سے کس طرح ہے؟ اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔

منکرین اذان سحور: فتویٰ میں بتایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سال بھر جاری رہتی تھی۔

اہل نور: یہ فتویٰ گوجرانوالہ سے کسی کی تقلید سے صادر ہوا تھا۔ یہ آسمانی وحی نہ تھا کہ ہمارے لیے حجت شرعی ہوتی۔ دلائل کے قرائن صاف دال ہیں کہ یہ مختص رمضان سے ہے۔ آپ حضرات نے تمام بحث میں یہ ثابت نہ کیا کہ یہ سال بھر کے لیے تھی۔

منکرین اذان سحور: مسئلہ صرف یہ تھا کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کے لیے تھی یا فجر کے لیے؟ آپ کی پیش کردہ حدیث میں للسحور کا لفظ نہیں اور نہ آپ کی طویل بحث میں للسحور ہے یعنی سحری کے لیے۔

للہ نور ۔ آنکھیں اگر ہوں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور ہے کیا آفتاب کا

رفع یدین نماز میں کرنا سنت واجبہ ہے جو احادیث صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے۔ مقلدین حنفیہ اس کو سنت نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ دائمًا یا علی الدوام کا لفظ دکھاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رفع یدین کرتے رہے۔ حالانکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں رفع یدین کرتے رہے اور نماز ہمیشہ پڑھتے رہے تو رفع یدین کرنا ہمیشہ ثابت ہو گیا۔ کیونکہ ترک رفع ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح منکرین اذان سحور کا یہ مطالبہ بیجا اور عذر لنگ ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان میں لفظ للسحور دکھاؤ اور خود اس اذان بلال رضی اللہ عنہ کو صبح کی قرار دیتے ہیں اور کسی دلیل میں للفجر کا لفظ نہیں دکھاتے۔ کیونکہ احادیث میں "لیل" کا لفظ وارد ہے۔ سنو! فتور نہ ڈالو فقاہت سے کام لو۔

اب آپ حضرات کو جو شیخ الحدیث اور محدث کہلاتے ہیں' نہایت وضاحت سے سمجھایا جاتا ہے تاکہ عوام بھی سمجھ لیں۔ اول یہ کہ سحری کھانے کا حکم ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسحروا فان فی السحور برکة۔ یعنی "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سحری کھایا کرو کیونکہ اس میں برکت ہے۔" دیگر حدیث جو مجمع الزوائد میں ہے جس میں یہ ارشاد ہے تسحروا من اخر اللیل۔ یعنی "سحری آخر رات میں کھاؤ۔"

دیگر حدیث یہ ملا لو اذا اذان بلال فکلوا واشربوا۔ "جب بلال رضی اللہ عنہ اذان دے تو سحری کھاؤ پیو۔" بلال رضی اللہ عنہ کب اذان دیتا ہے؟ ان بلالا یؤذن بلیل۔ "بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیتا ہے۔" کیونکہ اذان دیتا ہے؟ لیوقظ نائمکم ویرجع قائمکم۔ "تاکہ سوئے ہوئے کو بیدار کر دے اور قیام کرنے والے کو لوٹا دے۔" یہ بیدار ہو کر اور نوافل سے لوٹ کر کیا کریں گے؟ یہ اس حکم پر عمل کریں گے اذا اذن بلال فکلوا واشربوا۔

"کہ جب بلال رضی اللہ عنہ اذان دے تو تم کھاؤ پیو۔" لوگ کب تک کھاتے پیتے رہیں؟ تب یہ فرمایا حتّٰی یؤذن ابن ام مکتوم۔ "ابن ام مکتوم کی اذان تک کھاتے پیتے رہیں۔" ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کب اذان دیتا تھا؟ فرمایا لا یؤذن حتّٰی یطلع الفجر۔ "ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ طلوع فجر کے وقت اذان دیتا ہے۔"

یہ دونوں مؤذن ایک سحری کے وقت اذان دینے پر اور دوسرا صبح ہونے پر اذان دینے پر مقرر تھے۔ ہاں دونوں مؤذن اپنے اپنے وقت پر اذان دینے پر مقرر تھے؟ ہاں مقرر تھے۔ اور یہ سحور اور وقت نماز ان مؤذنوں کے پاس امانت تھے۔ جیسے ارشاد ہے امناء المسلمین علٰی صلوٰتہم وسحورھم المؤذنون۔ یعنی "مسلمانوں کے امین ان کی نماز پر اور سحری پر مؤذن ہیں۔" یعنی مسلمانوں نے ان کو یہ اوقات بطور امانت سپرد کئے ہیں۔ جو مؤذن سحری کا ہے وہ سحری کا وقت ہونے پر اذان دے اور نماز صبح کا مؤذن صبح ہونے پر اذان دے۔ اپنے اپنے وقت کی پابندی کریں۔ کوئی خیانت نہ کرے' سحری کا مؤذن رات کے آخر وقت اذان کہے اور صبح کا مؤذن صبح ہونے پر اذان دے۔ سحری اور نماز فجر کے درمیان کتنا فاصلہ ہو؟ بخاری شریف میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے تسحرنا مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم قام الی الصلوٰۃ قلت کم کان بین الاذان والسحور قال قدر خمسین اٰیۃ۔ یعنی "ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر نماز صبح کی طرف کھڑے ہو گئے۔ کہا اذان سحور اور اذان فجر کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ کہا پچاس آیتیں پڑھنے کے بقدر۔"

یہ واقعہ حال کا بیان ہے' یہ حکم نہیں کہ ہمارا ہمیشہ یہی اندازہ رہے۔ ان کا حال بھی مختلف اوقات میں مختلف کھانوں سے وقت کا اندازہ کم و بیش ہو جاتا تھا۔ ان کا کھانا اکثر محض کھجور پانی تھا۔ جیسے مجمع الزوائد میں ہے کہ سحری کے وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا قربی الینا الغداء المبارک یعنی السحور۔ یعنی "ہمارے لیے سحری کا مبارک کھانا حاضر کرو۔" وربما لم یکن الا تمرتین۔ "کہ بسا اوقات صرف دو ہی کھجوریں ہوا کرتی تھیں۔" اور تمر کو بہترین کھانا فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہے کہ عن جابر ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال نعم السحور التمر۔ "سحری کا اچھا کھانا کھجور ہے۔"

جب ایسا مختصر کھانا کھایا تو سحری اور نماز کا فاصلہ پچاس آیات کا قدرے کم بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر روٹی' سالن' چاول' حلوہ' مچھلی' گوشت وغیرہ کھایا گیا تو نہ کوئی صحابی' تابعی اتنی دیر میں کھا سکتا ہے اور نہ کوئی عالم' مفتی' محدث وغیرہ کھا سکتے ہیں۔

قرآن مجید کی پچاس آیات کتنی ہی ترتیل سے پڑھے پھر بھی روٹی کھانے میں پندرہ بیس منٹ ضرور خرچ ہوں گے۔ اس لیے ہم نے اذان سحور اور اذان صبح کا اندازہ آدھ گھنٹہ لکھا تھا۔ یہی تسہیل القاری میں درج ہے۔ پچاس آیات پانچ منٹ سے دس منٹ تک قاری ختم کر سکتا ہے۔ اتنی دیر میں کھجور' انگور تو کھائے جا سکتے ہیں' دیگر کھانے نہیں کھائے جا سکتے۔ اسی طرح حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور اذان ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا درمیانی فاصلہ جو ان الفاظ سے بیان ہے قدر ما ینزل هذا ویرقی هذا۔ (مسند احمد) یہ بھی بطور مبالغہ ہے اور مختلف اوقات میں سے کسی وقت کا ذکر ہے' دائمی نہیں ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل روایتوں سے درمیانی فاصلہ زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔

مجمع الزوائد ج۔۳' ص۔۱۵۲ میں ایک طویل حدیث میں کسی وفد کا ذکر ہے' اس میں ان کا یہ بیان ہے کہ کان بلال یاتینا بسحورنا وانا لمستدفؤن فنکشف سجف القبة فیستنیرلنا طعامنا۔ (رواہ البزار والطبرانی) یعنی "حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہم کو سحری کا کھانا لا کر دیتے۔ ہم گرم معلوم کرتے تو قبہ کا پردہ کھول دیتے تاکہ کھانا ظاہر ہو جائے۔" اب غور کر لو کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سحری کا کھانا لا کر دیتا ہے' وہ قبہ کا پردہ اٹھا کر اس کو معلوم کرتے ہیں۔ گرم ہے تو سرد کرتے ہیں پھر کھاتے ہیں۔ یہ کتنا فاصلہ ہو جاتا ہے؟

نیز مجمع الزوائد میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا کہ مسجد میں دیکھو اگر کوئی شخص ہے تو اس کو بلاؤ۔ میں گیا تو وہاں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں موجود تھے۔ میں نے دونوں کو بلایا' وہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے ان سب صاحبان کے سامنے کھانا حاضر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھایا اور ان دونوں بزرگوں نے بھی کھایا۔ پھر مسجد کی طرف گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو نماز پڑھائی۔

اس حدیث سے بھی احباب اہل علم کو اندازہ لگانا چاہیے کہ دونوں اذانوں کے

درمیان (سحری اور فجر کے) کتنا فاصلہ تھا کہ ایک شخص کو مسجد کی طرف بھیجنا اور دو شخصوں کو بلا کر لانا' پھر سب کے سامنے گھر سے کھانا لا کر رکھنا' پھر ان سب کا کھانا اور پھر فارغ ہو کر سب کا سنت فجر پڑھنا' پھر نماز فجر کی طرف جانا۔ یہ پچاس آیتوں کا اندازہ ہے یا زائد کا؟ تجربہ کر کے بتائیں کہ مفتیان گوجرانوالہ کھانا شروع کر دیں اور کسی حافظ قاری کو قرآن کی تلاوت شروع کرا دیں پھر بتائیں کہ کتنی دیر ہو گئی ہے۔

علاوہ ازیں یہ سنو کہ جس حدیث میں یہ لفظ ہیں: كان يصعد هذا وينزل هذا کہ ایک اترتا اور دوسرا چڑھتا تھا۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں فنتعلق به فنقول كما انت حتى نتسحر۔ (مجمع الزوائد) ہم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو روک لیتے تھے کہ (ابھی اذان نہ کہے) ٹھہریے کہ ہم سحری کھالیں۔

اب مفتی صاحبان بتائیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان ہو چکی ہے۔ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان کہنے جاتے ہیں تو بعض صحابہ ان کو روک لیتے ہیں کہ وہ ان کے سحری کھانے تک اذان نہ کہیں۔ اس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہاں ہوتے تھے؟ اگر کہو گے کہ وہ اذان دے کر اپنے ٹھکانے پر چلے جاتے تھے پھر تو یہ مقولہ غلط ہو جائے گا کہ يصعد هذا وينزل هذا۔ اگر کہو گے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس مکان بلند پر بیٹھے رہتے تھے اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے آنے کا انتظار کرتے تھے' جیسے امام نووی نے علماء محدثین سے یہ معنی نقل کیا ہے تو پھر مفتیان جمیعت کا اس توجیہہ کی تکذیب کرنا غلط ہوا۔ حالانکہ یہ بالکل صحیح ہے۔

اچھا اور سنو! اور یاد رکھو کہ مسند احمد اور طحاوی میں یہ حدیث ہے: انیسہ بنت خبیب رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا اذن ابن ام مكتوم فكلوا واشربوا واذا اذن بلال فلا تاكلوا ولا تشربوا قالت وان كانت المراة ليبقى عليها من سحورها فتقول لبلال امهل حتى افرغ من سحوري۔ یعنی جب حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے تو اس وقت کھاؤ پیو اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دے تو پھر نہ کھاؤ اور نہ پیو۔" حضرت انیسہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ اگر کسی عورت کا سحری کا کھانا باقی ہوتا تو وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کہتی کہ بلال رضی اللہ عنہ ذرا ٹھہرنا' ابھی اذان نہ کہنا کہ میں سحری سے فارغ ہو لوں۔ اس حدیث کی سند جید ہے۔ (فتح الربانی جزء عاشر

ص-۲۷)

اس کے علاوہ مجمع الزوائد ج-۳' ص-۱۵۳ میں ہے کہ ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں تسحر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃ وعندہ قوم فجآء علقمۃ علاثۃ العامری فدعالہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم براس فجاء بلال لیؤذن بالصلوٰۃ فقال رویدک یابلال یتسحر علقمۃ- (رواہ الطبرانی فی الکبیر) یعنی "آنحضرت ﷺ نے ایک رات سحری کھا لی اور آپ کے پاس ایک قوم تھی- علقمہ عامریؓ آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس کے لیے ایک سری منگوائی تاکہ وہ سحری کھا لیں- اتنے میں حضرت بلالؓ آگیا تاکہ فجر کی اذان دے- تب آنحضور ﷺ نے حضرت بلالؓ سے کہا کہ بلالؓ ذرا ٹھہر جاؤ کہ علقمہؓ سحری کھا لے-" یہ واقعہ حضرت بلالؓ کی نوبت کا ہے-

علامہ عینی نے ان مختلف روایتوں میں بھی تطبیق دی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بلال اور عمرو بن ام مکتوم رضی اللہ عنہما کے درمیان رات کو اذان دینے کی باری مقرر فرما دی تھی- آنحضرت ﷺ نے بعض راتوں میں اذان دینے کا بلالؓ کو حکم فرمایا- جب بلالؓ اذان دے کر اتر آتا تو ابن ام مکتومؓ چڑھ کر فجر کی اذان دیتے- جب حضرت ابن ام مکتومؓ کی باری ہوتی تو وہ سحری اذان دے دیتے- پھر بلالؓ صبح کی اذان کہہ دیتے تو دونوں کے بارہ میں آپ کا ارشاد ہر ایک کی باری میں یہ صحیح ہوا کہ بلالؓ رات کو اذان دیتے ہیں تم کھاؤ پیو' یہاں تک کہ ابن ام مکتومؓ اذان دے اور ابن ام مکتومؓ رات کو اذان دیتے ہیں تم کھاؤ پیو' یہاں تک کہ بلالؓ اذان دے تو تم کھانے پینے سے رک جاؤ- یہ لوگوں کو سمجھا دیا گیا کہ اذانیں دو ہوں گی- پہلی میں کھاؤ پیو کہ وہ سحری کی ہے اور دوسری میں رک جاؤ کہ وہ صبح کی ہے- رات میں اذان دینے کا ترجمہ ہم سحری میں اذان دینے کا کرتے ہیں' یہ بالکل درست ہے- یہ محاورہ کا ترجمہ اور مرادی معنی ہیں- رات کو سحری ہوتی ہے اور اس میں کھانے کا حکم تھا- پھر سحری کا ترجمہ کیسے غلط ہو سکتا ہے-

ان احادیث سے یہ مسئلہ بھی ظاہر ہوا کہ جب مؤذن اذان صبح کی دینے کو ہو اور وہ صبح کا اول وقت ہو تو سحری کھانے والا جس نے ابھی سحری نہ کھائی ہو' وہ مؤذن کو

روک سکتا ہے کیونکہ حرام کھانا اس وقت ہوتا ہے جب مشرق کی طرف دائیں بائیں خوب اسفار ہو جاتا ہے۔ علامہ عینی نے جو مختلف احادیث میں بلال اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما کی باری مقرر ہونے کی تطبیق دی ہے۔ یہی تطبیق امام ابن خزیمہ اور امام ابن حبان اور ضیغمی نے دی ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الربانی شرح مسند احمد جلد عاشر ص ۳۱)

امام ابن عبدالبر وغیرہ اس کو مقلوب الرائے کہتے ہیں کہ یہ راوی کو وہم ہوا ہے۔ امام حافظ ابن حجر بھی اسی طرف مائل تھے۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ میں نے صحیح ابن خزیمہ کو ملاحظہ کیا تو اس میں دو سندوں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ مروی ہے کہ بلال ﷺ صبح کے وقت اور ابن ام مکتوم ﷺ رات کے وقت اذان کہتے تھے۔ اس لیے راوی کے وہم کا احتمال بعید ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کسی کا وہم اور مقلوب کہنے کی ضرورت نہیں۔ احادیث دونوں طرف صحیح وارد ہیں۔ بعض فضلاء نے ان مختلف احادیث میں یوں مطابقت کی ہے کہ دراصل حضرت بلال ﷺ پہلے صبح کی اذان دیا کرتے تھے۔ چنانچہ بروایت ابوداؤد یہ حدیث عروہ سے مروی ہے کہ بنی نجار کی ایک عورت نے بیان کیا کہ حضرت بلال ﷺ میرے مکان پر جو سب سے بلند تھا' آکر بیٹھا کرتے تھے۔ فاذا رای الفجر تمطی ثم اذن۔ یعنی "جب بلال ﷺ دیکھتے کہ فجر صاف اور روشن ہو گئی' تب اذان کہتے تھے۔" چنانچہ دیگر حدیث میں ہے کہ کسی سائل نے آنحضرت ﷺ سے نماز کے اوقات کی بابت سوال کیا فامر صلی اللہ علیہ وسلم بلالا فاذن حین تطلع الفجر۔ تب آنحضور ﷺ نے بلال ﷺ کو حکم دیا کہ اذان کہے۔ تب بلال ﷺ نے صبح طلوع ہونے پر اذان کہی۔

ان احادیث سے ظاہر ہوا کہ حضرت بلال ﷺ صبح کی اذان پر مقرر تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے ابن ام مکتوم ﷺ کو سحری کی اذان پر مقرر کر دیا۔ فتح الربانی میں ہے ثم اردف ابن ام مکتوم فکان یؤذن بلیل واستمر بلال علی حالتہ الاولی۔ یعنی "پھر ابن مکتوم ﷺ کو بعد میں مقرر کیا وہ سحری کے وقت اذان دینے لگے اور بلال ﷺ بدستور صبح کے وقت اذان کہتے رہے۔" پس انیسہ حاتن رضی اللہ عنہا کی حدیث اس

زمانہ کی ہے پھر مؤذنوں میں ردوبدل کیا گیا کہ بلال رضی اللہ عنہ کو سحری کے وقت اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو فجر کے وقت پر مقرر کر دیا پھر ہمیشہ اسی طرح تعامل جاری رہا۔ صحیحین کی احادیث اس استمرار پر دال ہیں۔ تمام احادیث مختلفہ کی یہ تطبیق بھی ٹھیک ہے' صحیح روایات کی تکذیب بھی نہیں ہوتی۔

ہم نے جو اپنے پہلے مضمون میں دوام اور استمرار پر زور دیا ہے' اس سے یہی آخری عہد کا تعامل مراد ہے کہ آخری زمانہ میں بھی تعامل رہا کہ بلال رضی اللہ عنہ سحری کی اذان اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ صبح کی اذان کہتے رہے۔ بہرحال باری باری اذانیں ہوں یا پہلے زمانہ میں' ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ رات کی اذان پر مقرر ہو اور بلال رضی اللہ عنہ صبح کی اذان پر پھر ردوبدل ہوا کہ بلال رضی اللہ عنہ سحری کے وقت اذان دینے پر مقرر ہوئے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ صبح پر مقرر ہوئے تو ان سب صورتوں سے ہمارا مدعا ثابت ہے کہ رمضان میں دو مؤذن مقرر تھے۔ ایک سحری پر اور دوسرا صبح کی نماز پر اور اذانیں دو تھیں۔ ایک سحری کی اور دوسری صبح کی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ ردوبدل کیوں ہوا کہ بلال رضی اللہ عنہ کو سحری پر اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو صبح پر کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ کہ بلال رضی اللہ عنہ صبح ہونے سے پہلے اذان کہہ دیتے تھے' ابھی کھانے کا وقت ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دن بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لیے اذان کہہ دی تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **یابلال انک لتؤذن اذا کان الصبح ساطعا فی السماء ولیس ذالک الصبح انما الصبح ھکذا معترضا ثم دعا بسحور فتسحر۔** یعنی "اے بلال رضی اللہ عنہ تم اذان اس وقت کہتے ہو کہ جب صبح آسمان میں اوپر کو چڑھتی ہے' وہ صبح نہیں ہے۔ صبح وہ ہے جو کناروں میں پھیل جاتی ہے پھر آپ نے سحری کا کھانا منگوایا اور پھر کھایا۔" تب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو صبح پر مقرر کر دیا۔ وہ نابینا تھے' جب ان کو یہ کہا جاتا کہ اب صبح ہو گئی ہے تو اس وقت وہ اذان کہتے۔ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد اتنا وقفہ ہوتا تھا کہ انسان بخوبی سحری کھا لے۔

چنانچہ مسند احمد میں یہ حدیث ہے کہ خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کے وقت یہ کہا کہ اے انس! میں روزہ کی نیت کر لیتا ہوں' میرے لیے کوئی چیز کھانے کے لیے لاؤ۔ تب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھجور

اور پانی لے کر حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت بلال ﷺ کی اذان ہو چکی تھی پھر آنحضور ﷺ نے فرمایا یاانس انظر انسانا" یاکل معی۔ "اے انس ﷺ کسی آدمی کو دیکھ بھال کر لاؤ جو میرے ساتھ کھانا کھائے۔" حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں تب میں زید بن ثابت ﷺ کو بلا کر لایا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے ستو کا شربت پی لیا ہے' میرا بھی ارادہ روزہ کا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میری نیت بھی روزہ کی ہے۔ تب دونوں نے سحری کر لی' پھر دو رکعت نماز سنت فجر پڑھی' پھر گھر سے نکلے تو نماز قائم کی گئی۔ (مسند احمد مع فتح الربانی ج-۱۰' ص-۳۲)

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوا کہ بلال ﷺ کی اذان کے بعد اتنا وقفہ ہوتا تھا کہ انسان کسی کو بلا کر اس کے ساتھ کھانا کھا سکتا تھا۔ پس یہ کہنا کہ ایک موذن اترتا تھا' دوسرا چڑھتا تھا۔ یہ کنایہ مدت قلیلہ سے ہے کہ زیادہ مدت نہ ہوتی تھی۔ میں نے سب احادیث کو بیان کر کے دو اذانوں کا ثبوت اور ان کا درمیانی فاصلہ ظاہر کر دیا ہے۔

اب بھی اگر کوئی نہ سمجھے اور ضد کرے تو پھر اس سے اللہ تعالیٰ سمجھے۔ **فتنکروا ولا تکونوا من الغابرین۔**

منکرین اذان سحور: آپ کے پیش کردہ تمام دلائل میں لفظ "بلیل" "رات میں موجود ہے۔ مگر اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ بلال سحری کے وقت اذان دیتا ہے۔"

اہل نور: آپ اپنی فقاہت کو بالائے طاق رکھ کر محدثین کی فقاہت سے سبق حاصل کریں کہ امام ابن حزم فرماتے ہیں **لانه اذان سحور لا اذان صلوٰة** "کہ یہ اذان سحری کی تھی نماز صبح کی نہ تھی۔" حافظ ابن حجر **"یؤذن بلیل"** پر فرماتے ہیں **وفیه حجة لمن ذهب الی ان الوقت الذی یقع فیه الاذان قبل الفجر هو وقت السحور۔** یعنی اس حدیث میں ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ وقت جس میں بلال ﷺ نے اذان کہی تھی سحری کا وقت تھا۔

نیز یہ بدیہی امر ہے کہ بلال ﷺ رات کے وقت اذان کہتے تھے اور وہ ایسا وقت تھا جس میں کھانے پینے کا حکم تھا تو پھر اس میں کیا شک رہا کہ یہ اذان سحری کی تھی۔ کیونکہ سحری کے وقت کہی گئی۔ امام ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند طیالسی میں تعجیل فطر

اور وقت سحور کا باب باندھا ہے۔ اس میں یہ حدیث ہے کان بلال وابن ام مکتوم یؤذنان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان بلالا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتّٰی یؤذن ابن ام مکتوم فکنا نحبس ابن ام مکتوم عن الاذان فنقول کما انت حتّٰی نتسحر ولم یکن بین اذانیھما الا ان ینزل ھذا ویصعد ھذا۔ (طیالسی جلد اول' ص-۱۸۶) یعنی "نبی کریم ﷺ کے دو مؤذن تھے۔ ایک بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان کہتا ہے' اس وقت تم کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے تو پھر رک جاؤ۔ راوی کہتا ہے کہ ہم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اذان دینے سے روک لیا کرتے تھے' ذرا ٹھہر جاؤ کہ ہم سحری کھا لیں۔ اور دو اذانوں میں اندازہ یوں سمجھ لو کہ ایک اترتا تھا اور دوسرا چڑھتا تھا۔"

اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ آنحضرت ﷺ کے دو مؤذن تھے۔ ایک سحری کا' دوسرا صبح کا۔ دوسرے یہ کہ سحری کے وقت اذان دینا سنت ہے۔ تیسرا یہ کہ دونوں اذانوں کے درمیان وقفہ قلیل ہی تھا' صرف اتنا کہ آدمی کھانا کھا لے۔ اگر کسی نے نہ کھایا ہو تو کھانا کھانے تک مؤذن کو صبح کی اذان دینے سے روک رکھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اترنے چڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ دو اذانوں کے درمیان مدت قلیلہ تھی۔ جس میں صرف کھانا کھایا جا سکے۔ ظاہر لفظوں سے صرف اترنا' چڑھنا سے یوں مراد لینا کہ دوسرا چڑھ جاتا اور پہلا اتر آتا۔ یہ ایک کھیل معلوم ہوتا ہے اور اس سے دو مؤذن مقرر کرنے اور ایک کی اذان پر کھانا کھانے کا حکم دینا اور دوسرے کی اذان پر روک دینا عبث ہو جاتا ہے۔

منکرین اذان سحور: آپ کے پیش کردہ سات افلاک جو وزن میں سبع شداد تھے اور آپ کے فرمان کے مطابق میرے اور حضرت العلامہ الحافظ محمد صاحب امیر جمعیت کے سر پر گرائے گئے تھے' وہ پانی کے بلبلے نکلے اور ہوا میں ہبا منثورا بن کر منتشر ہو گئے۔

لالی نور: یہ سات افلاک آپ حضرات کے سر پر گرائے نہیں گئے بلکہ سائبان کی طرح سروں پر قائم کئے گئے اور آپ صاحبان کی زندگی تک سر پر رہیں گے۔ جیسے ہی

اسرائیل کے سروں پر کوہ طور قائم کیا گیا تھا لیکن گرایا نہیں گیا تھا۔ جیسے یہ ارشاد ہے
واذ نتقنا الجبل فوقهم کانه ظلة وظنوا انه واقع بهم خذوا ما اٰتیناکم بقوة واذکروا
ما فیه لعلکم تتقون۔ بنی اسرائیل نے بھی گرنے گرانے کا ظن کیا تھا حالانکہ وہ
صرف احکام منوانے کے لیے تھا۔ اسی طرح ہمارے سات دلائل سات افلاک کی طرح
"کانهن ظلة" سائبان کی طرح آپ حضرات کے سروں پر قائم ہیں تاکہ آپ حضرات
ان کو فقاہت سے کام لے کر مان لیں۔ آپ نے جو میری عبارت نقل کی ہے اس میں
گرانے کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ ہیں۔ "مفتیان گوجرانوالہ کے سر پر سات
افلاک کی طرح قائم کر دیئے گئے ہیں۔" اس عبارت میں گرانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔
جب آپ اردو عبارت نہیں سمجھ سکتے اور اتنی فقاہت کمزور ہے تو کتاب و سنت کو کیا
سمجھیں گے۔

منکرین نوان سحور: آپ باوجود کہ حنفی مذہب کو برا سمجھتے ہیں اور احناف کو مشرک
سمجھتے ہیں۔ پھر آپ کا اس مسئلہ میں علماء احناف کے اقوال سے استدلال ہی اس بات کا
بین ثبوت ہے' الخ۔

اہل نور: آپ کا یہ ظن فاسد اور زنانہ طعن تین وجہ سے لغو بلکہ باطل ہے۔ اول یہ
کہ بندہ نے اصل استدلال سات احادیث سے کیا ہے اور پھر بطور تائید و تشریح فقہاء
محدثین اور فقہاء اہل رائے کے اقوال پیش کئے تھے اور مفتیان مذہب اہلحدیث مولانا
یوسف صاحب کلکتوی اور مولانا عبدالجبار صاحب محدث کھنڈیلوی' مولانا عبدالستار
صاحب محدث دہلوی اور مولانا عبدالجلیل صاحب محدث جھنگوی وغیرہ کے فتوے ذکر
کئے۔ جب امام ابن القطان اور امام ابن حزم' علامہ ابن دقیق العید وغیرہ ائمہ اہلحدیث کا
ذکر تھا پھر بطور تائید فقہاء عراق کا ذکر کر دیا کہ اہلحدیث اور اہل رائے کا متفقہ مسلک
ظاہر ہو جائے۔ تو اس میں کیا قباحت لازم آگئی۔

آپ میرے اس تائیدی ذکر کو شرعی استدلال خیال کر رہے ہیں۔ حالانکہ کتب
حدیث کی شرحیں فتح الباری' تعلیق' سبل السلام' نیل الاوطار وغیرہ ملاحظہ کریں کہ
فقہاء اہل عراق کے ناموں سے ان کا مسلک بغرض تائید یا تردید ذکر کیا گیا ہے۔ نیز علماء
کرام اسلام کے کسی مسئلہ کی صداقت پر بعض وقت انگریزوں اور اہل ہنود' گرونانک

وغیرہ رشیوں' منیوں کے اقوال بھی ذکر کر دیتے ہیں' لہٰذا یہ طعن لچر ہے۔ دوسرا یہ کہ بندہ نے ائمہ متبوعین پر کوئی فتویٰ کفر و شرک کا نہیں لگایا' یہ ظن باطل ہے۔ ہاں البتہ عہد حاضرہ کے ان مقلدین پر جو مشرکانہ عقائد اور کافرانہ افعال رکھتے ہیں حکم لگایا ہو گا۔

امام ابوحنیفہ' امام محمد تو تقلید شخصی اور تعیین مذہب سے منع کر گئے ہیں۔ ہمارا روئے سخن ان مقلدین کی طرف ہے جو تقلید شخصی پر جمود رکھتے ہیں۔ چنانچہ امام ابن حزم یہ فرماتے ہیں والذی لا شک فیه ان من بلغته هذه الاٰثار وصحت ثم استجاز خلاف ما صح عن رسول الله صلی الله علیه وسلم اتباعا لقول ابی حنیفة ومالک فهو کافر مشرک حلال الدم والمال لا حق بالیهود والنصاری۔ یعنی "وہ بات جس میں کچھ شک نہیں ہے' یہ ہے کہ جس شخص کو کسی مسئلہ پر صحیح احادیث پہنچ جائیں' پھر ان احادیث کا خلاف اپنے امام کے قول کی تقلید کی وجہ سے کرے اور اس کو درست سمجھے تو وہ کافر و مشرک ہے' جس کا امام المسلمین کو قتل کرنا مباح ہے اور اس کا مال لوٹنا بھی جائز ہے اور وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ ملحق ہے۔"

پس اس طرح جو مقلدین تقلید شخصی پر جمود رکھتے ہیں اور احادیث نبویہ کو نہیں مانتے' ان کے حق میں وہ فتوے ہیں جن کو آپ نے دبا رکھا ہے۔ شاید آپ ایسوں کو مومن موحد جانتے ہوں گے۔

تیسری وجہ اس خیال کے باطل ہونے کی یہ ہے کہ سب ائمہ متقدمین اہلحدیث کے نزدیک یکساں ہیں' وہ سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ کسی سے کوئی عداوت رکھتے ہیں اور نہ کسی ایک سے عقیدت و محبت رکھ کر دوسرے اماموں سے متنفر ہیں۔ بلکہ جس کا قول کسی حدیث صحیح اور قوی دلیل سے مدلل دیکھتے ہیں اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں مطلقہ عورتوں کی عدت ثلاثۃ قروء آئی ہے۔ یہاں قروء سے کیا مراد ہے' اس میں ائمہ دین کا باہم اختلاف ہے۔ امام شافعی وغیرہ اس سے مراد طہر لیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ وغیرہ اس سے مراد حیض لیتے ہیں۔ اہلحدیث سب کی سن کر امام ابوحنیفہ کے مسلک کو پسند کرتے ہیں اور مطلقہ کی عدت حیضوں کے ساتھ شمار کرتے ہیں اور بھی بہت سے مسائل ہیں کہ ان میں امام شافعی کے موافق ہیں اور بعض

مسائل میں اہلحدیث چاروں اماموں کے خلاف ہیں۔ جیسے مجلس واحدہ کی طلاق ثلاثہ۔ پس ٹھیک اسی طرح مسئلہ ما نحن فیہ میں مسلک امام ابن قطان' ابن دقیق العید' امام ثوری' امام ابوحنیفہ' امام محمد' امام ابن حزم وغیرہ کا صحیح اور حق ہے کہ سحری کی اذان رمضان کے ساتھ مختص ہے۔ اور رمضان میں دو اذانیں اور دو مؤذن مقرر ہونے چاہئیں اور بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کے وقت ہوا کرتی تھی اور وہ سحری کھانے کے لیے تہجد والے کو گھر کی طرف لوٹاتے کہ سحری کھا لے اور سوئے ہوئے کو بیدار کر کے سحری کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہوا کرتی تھی۔ علاوہ رمضان کے سال کے کسی مہینے میں اس کا رائج رہنا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ ثبوت مدعی کے ذمے ہے۔

منکرین اذان سحور: ان کی پہلی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کے ترجمہ میں "تم سحری کے وقت کھاتے پیتے رہو" کے ترجمہ پر الفاظ موجود ہیں مگر حدیث کے الفاظ میں قطعاً" سحری کے ترجمہ پر دال کوئی لفظ نہیں ہے۔

اہل نور: اللہ کے بندو! ضد' تعصب اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر کتب حدیث اور قرآن کے تراجم دیکھو۔ ان میں بعض ترجمے لفظی اور بعض محاورہ کے طور پر مرادی معنی درج ہیں۔ مثلاً قرآن مترجم ثنائی میں سورہ بقرہ کا وہ رکوع جس میں رمضان کے روزوں کا بیان ہے نکالیں۔ اس میں آیت احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم کا ترجمہ یوں لکھا ہے "تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں عورتوں سے جماع کرنا حلال کیا گیا۔"

اب کوئی احمق یہ کہے کہ ترجمہ غلط ہے کیونکہ آیت میں رمضان کا کوئی ذکر نہیں ہے صرف لیلۃ الصیام کا لفظ ہے۔ لیلہ ایک رات کو کہتے ہیں۔ لفظ لیالی نہیں ہے۔ اس لیے راتوں کا لفظ بھی غلط ہے اور صیام کا لفظ ہے رمضان کا نہیں ہے۔ تو یہ اعتراض اس احمق کا غلط ہو گا۔ کیونکہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے بامحاورہ مرادی معنوں کی رو سے ترجمہ کیا ہے۔ ایسے ہی ہمارے مخالف کا اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ جب یہ الفاظ ہیں ان بلالا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا۔ کہ بلال رضی اللہ عنہ سحری کے وقت اذان دیتا ہے تم اس وقت کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دے تب رک جاؤ۔ بتاؤ یہ بامحاورہ مرادی معنوں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس میں کیا غلطی ہے؟ کیا

بلال ؓ رات کے وقت اذان نہ کہتا تھا؟ راوی جھوٹ بولتا ہے؟ کیا وہ سحری کھانے کا وقت نہ تھا؟ اگر نہ تھا تو پھر حکم نبوی کی تکذیب ہو گئی' یہ کفر ہے۔ نیز محدثین کا اس حدیث پر باب وقت سحور باندھنا غلط ہوا اور یہ کہنا غلط ہوا کہ جب اذان ہوتی تھی' وہ وقت سحور کا تھا۔ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر لیل کا ترجمہ سحری کر دیا تو کون سا کفر لازم آگیا؟ لیل سے مراد رات کا آخری حصہ ہے اور وہی وقت سحری کا ہوتا ہے۔ بلکہ قبل فجر سب وقت سحری کا ہے۔

سنن ابوداؤد میں امام ابوداؤد نے بلال ؓ کی اذان پر یوں باب منعقد کیا ہے: "باب وقت السحور" یعنی سحری کے وقت کا بیان۔ پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے: لا یمنعن احد کم اذان بلال من سحوره فانه یؤذن .... لیرجع قائمکم وینبه نائمکم۔ یعنی نہ منع کر دے تم میں سے کسی کو بلال ؓ کی اذان سحری کھانے سے کیونکہ وہ تہجد والے کو لوٹانے اور سوئے ہوئے کو بیدار کرنے کے لیے ہے۔ (تاکہ سحری کر کے روزہ رکھ لیں)

اب مفتیان گوجرانوالہ یہ بتائیں کہ اس حدیث میں سحری کے وقت کا کہاں بیان ہے؟ سوائے اس بات کے کہ جب بلال ؓ اذان دیتا تھا تو وہ وقت سحری کا تھا اور وہ اذان ہی اس لیے تھی کہ سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کر دے کہ وہ سحری کھا لیں۔ اور قیام کرنے والے گھر کو لوٹ جائیں۔ اور وہ سحری کھا لیں۔ اگر کہو کہ یہ اذان فجر کے لیے تھی تو یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اس حدیث میں للفجر کا کہیں ذکر نہیں۔ فجر کے لیے تو الگ مؤذن مقرر تھا۔ وہ اذان کہتا تو لوگ نماز کو جاتے تھے۔

بخاری میں ابن ام مکتوم ؓ کے بارہ میں یہ لکھا ہے وکان رجلا اعمٰی لا ینادی حتٰی یقال له اصبحت اصبحت۔ یعنی "ابن ام مکتوم ؓ نابینا تھے' وہ اذان نہ دیتے تھے جب تک ان سے یہ نہ کہا جاتا کہ صبح ہو گئی' صبح ہو گئی۔"

امام بخاری نے اپنی جامع صحیح بخاری میں دو باب باندھے ہیں۔ ایک اذان بعد الفجر کا اور دوسرا اذان قبل الفجر کا۔ دونوں کے ثبوت میں وہی حضرت بلال اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما والی حدیث ذکر کی ہے۔ جس سے دو اذانوں اور دو مؤذنوں اور دو وقتوں میں اذان کہنے کا ذکر ہے۔ قبل الفجر سحری کا وقت ہے اور بعد الفجر نماز فجر کا۔ بلال ؓ

کی اذان سحری کے وقت میں ہے۔ اس میں سحری کھانے کا حکم ہے اور دوسری صبح اور صبح کی نماز کے لیے ہے۔ اس وقت کھانا منع کیا گیا۔

منکرین اذان سحور: عارف صاحب نے اپنے عقیدے کے برخلاف حنفی مسلک اختیار کر کے امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا حوالہ دیا ہے لیکن امام محمد صاحب کے دونوں دعوے کو...... حتی خود علماء احناف' الخ۔

اہل نور ۔ بے نیازی حد سے گذری بندۂ خدا کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

یہ الزام غلط ہے کہ میں نے اپنے عقیدے کے خلاف حنفی مسلک اختیار کیا بلکہ اہلحدیث اور فقہاء اہل عراق سب کا متفقہ مسلک ہے۔ چنانچہ امام ابن القطان اہلحدیث ہیں۔ امام ابن حزم اہلحدیث ہیں۔ امام ابن دقیق العید اہلحدیث ہیں۔ امام ثوری اہلحدیث ہیں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اہلحدیث ہیں۔ علاوہ ان کے سب محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ بلال ﷺ کی اذان فجر سے پہلے سحری کے وقت ہوتی تھی' صبح کے وقت نہ تھی۔

امام ابوحنیفہ اور امام محمد اگر کوئی مسئلہ کسی حدیث سے ثابت کر دیں گے اور کوئی حدیث صحیح اس کے خلاف ناطق نہ ہوگی تو اس کو ہم تسلیم کریں گے۔ یہی اہل حدیث کا سب ائمہ کے ساتھ برتاؤ ہے۔ ہمارے خلاف آپ حضرات مفتیان گوجرانوالہ کئی مسائل عقائد اور فروع میں اہل رائے سے متفق ہیں۔ جیسا کہ بندہ ان پر تعاقب کرتا رہا ہے کہ یہ مسائل اہلحدیث کے خلاف ہیں۔ باقی رہا یہ کہنا کہ دیگر ائمہ نے فقہاء عراق کی مخالفت کی ہے تو ان کے نام مع دلیل پیش کریں' ودونہ خرط القتاد۔

منکرین اذان سحور: خود علماء احناف نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ جناب انور شاہ صاحب نے فیض الباری' الخ۔

اہل نور ۔ کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینہ تصویر میں

مولانا انور شاہ صاحب' امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں

بالکل سچ ہیں اور دیوبندی اور بریلوی علماء سب نام کے مقلد ہیں۔ حقیقت میں اعتقادی اور عملی مسائل میں ائمہ اہل عراق کے سخت خلاف ہیں۔ تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں کیونکہ مضمون پہلے ہی طویل ہو گیا ہے۔ ایک علامہ انور شاہ نے خلاف کہہ دیا تو آپ نے سب علماء احناف پر یہ حکم لگا دیا۔ حالانکہ علامہ عینی اور علامہ طحاوی اپنے ائمہ سے متفق ہیں۔ علاوہ ان کے علامہ مولانا یوسف صاحب گلکوی جو شہرۂ آفاق اہلحدیث تھے' وہ سحری کی اذان کے قائل اور فاعل تھے۔ حالانکہ احناف کے سخت خلاف تھے' وہ اپنے فتویٰ میں یہ حوالہ بیان فرماتے ہیں کہ علامہ شوق نیموی جو احناف کے بہت بڑے عالم ہیں' آثار السنن تصنیف خود میں اذان سحری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: اما اذان بلال قبل طلوع الفجر فانما کان فی رمضان۔ فرماتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان صبح سے پہلے رمضان ہی میں ہوا کرتی تھی۔

مفتی محمد شفیع صاحب کا فتویٰ ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت پیش کیا ہے۔ پس جو حنفی اپنے اماموں کے موافق کے خصوصا جب دلیل بھی ساتھ ہو تو وہ مقلد ہے اور جو خلاف کے اور ان کی تردید کرے وہ غیر مقلد ہے۔ علامہ انور شاہ صاحب دائیں طرف سے مقلد اور بائیں طرف سے غیر مقلد تھے اور بعض وقت بالکل آزاد چلتے تھے۔ انور شاہ صاحب مقلد تھے اور امام ابوحنیفہ اور امام محمد دونوں مجتہد ہیں تو مجتہد کے مقابلہ میں مقلد کا قول باطل ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب نے لکھا ہے کہ مقلد کو اپنے امام کا قول بس ہے۔ یہ مسلک جو ہمارے حنفیہ سے مخصوص نہیں ہے۔ فتح الربانی میں ہے: فقیل انہ یشرع من وقت السحور ورجحہ جماعۃ من اصحاب الشافعی۔ یعنی "یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اذان سحری کے وقت دینا مشروع ہے۔ ایک جماعت علماء شافعیہ نے اس مسلک کو ترجیح دی ہے۔"

مرعاۃ المفاتیح جلد اول' ص-۴۴۳ میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر لکھا ہے کہ وتدل علی وقت الذی یقع فیہ الاذان قبل الفجر ہو وقت السحور۔ یعنی "یہ روایت اس وقت پر دلالت کر رہی ہے جس میں واقع ہوئی ہے کہ یہ وقت سحری کا ہے۔" اور نسائی کے حاشیہ سلفیہ جلد اول' ص-۲۷ حاشیہ نمبر-۱۳ میں

یہ لکھا ہے: ھذا الامر للاباحۃ والرخصۃ وبیان بقاء اللیل بعد اذان بلال۔ یعنی "حدیث میں جو حکم آیا ہے کہ کھاؤ پیو یہ اباحت اور رخصت کے لیے ہے اور اس میں یہ بیان ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد رات باقی ہے۔"

ان دونوں عبارتوں سے جو دو اہلحدیث فاضلوں کی ہیں۔ یہ واضح ہوا کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کے وقت ہوتی تھی اور اس اذان کے بعد رات باقی ہوتی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کے وقت ہوتی تھی۔ اس کو سحری کی اذان کہنا جائز ہے اور اس کو سنت کہنا بھی کہ یہ عہد نبوی کا معمول بہ ہے۔

منکرین اذان سحور: امام ابن القطان اور ابن دقیق کے دعوے کو بھی دعویٰ بلا دلیل قرار دیا کیونکہ انہوں نے کوئی دلیل نہیں پیش کی۔ علامہ الدہر الحافظ ...... تردید کی ہے۔

نقل نور: یہ غلط بات ہے کہ انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی' ان کی دلیل حدیث ہے۔ ان بلالا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا۔ (بخاری) کہ "بلال رضی اللہ عنہ رات میں اذان دیتا ہے جو سحری کا وقت ہے' اس میں تم کھاؤ پیو۔"

عموماً کھانا پینا رمضان میں ہی سحری کے وقت ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اذان سحری کے رمضان کے ساتھ مخصوص ہو گئی۔ اور دنوں میں ثابت نہیں ہے تو خصوصیت ظاہر ہے۔ دوسرا یہ کہ بلال رضی اللہ عنہ رمضان میں ہی سحری کے وقت' رمضان سے خارج صبح کے وقت کہتے تھے۔ چنانچہ یہ حدیث اس پر ناطق ہے۔ عن امراۃ من بنی نجار قالت کان بیتی من اطول بیت حول المسجد فکان بلالا یاتی بسحر فیجلس علیه ینظر الی الفجر فاذا راہ اذن اسنادہ حسن اخرجه ابوداؤد۔ (درایۃ ص۔۱۴) یعنی بنی نجار کی ایک عورت کا بیان ہے کہ میرا گھر مسجد کے ماحول میں سب سے زیادہ بلند تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ سحری کے وقت اس پر آکر بیٹھ جاتا تھا اور فجر کا انتظار کرتا تھا۔ جب دیکھ لیتا کہ فجر ہو گئی تو اذان کہہ دیتا تھا۔"

نیز یہ حدیث دلیل ہے ان بلالا قال الصلوۃ خیر من النوم حین وجد النبی صلی اللہ علیه وسلم راقدا فقال ما احسن ھذا یابلال اجعله فی اذانک۔ (درایۃ ص۔۵۹) یعنی "بلال رضی اللہ عنہ نے صبح کی اذان میں الصلوۃ خیر من النوم" کہہ دیا دراں

حالیکہ آنحضرت ﷺ سو رہے تھے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا اچھا کلمہ موقع محل کا ہے۔ اس کو اذان فجر میں مقرر کر لو۔" چنانچہ کیا گیا جو آج تک جاری ہے۔ اذان سحری میں یہ کلمہ نہیں ہے۔ اذان فجر میں ہے جس کو بلال ؓ کہا کرتا تھا۔

چنانچہ دوسری روایت میں یہ ہے عن بلال انہ کان یؤذن فی الصبح فیقول حی علی خیر العمل فامرہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان یجعل مکانھا الصلٰوۃ خیر من النوم۔ (اخرجہ الطبرانی) یعنی "بلال ؓ نے ایک دن اذان صبح میں حی علی خیر العمل کہہ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ اس کلمہ کی بجائے الصلٰوۃ خیر من النوم کہا کرو۔" چنانچہ یہ کلمہ اسی دن سے آج تک جاری ہے۔ دیگر یہ روایت اس کی مؤید ہے۔

حضرت بلال ؓ کا بیان ہے: عن بلال کنا لا نؤذن للصلٰوۃ الفجر حتی نری الفجر۔ رواہ الطبرانی ..... باسناد ضعیف۔ (درایۃ ص۔۴۳) "بلال ؓ کہتے ہیں کہ ہم نماز فجر کے لیے اذان اس وقت کہا کرتے تھے جب فجر کو دیکھ لیتے تھے کہ ٹھیک ہو گئی ہے۔" یہ حدیث گو ضعیف ہے مگر تاکید کے لیے کافی ہے۔

ایک روایت مرسل امام حسن بصری سے بھی اس کی مؤید ہے کہ انہوں نے کسی مؤذن کی اذان سنی جو فجر سے پہلے رات میں تھی' تب انہوں نے یہ فرمایا علوج ینادی الربوک وھل کان الاذان علی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الا بعد ان یطلع الفجر۔ یعنی "عجمی مرغ بولے اذان تو عہد نبوی میں فجر طلوع ہونے کے بعد ہوا کرتی تھی۔"

ان تمام دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ بلال ؓ فجر کی اذان فجر طلوع ہونے کے بعد کہا کرتے تھے۔ یہ علاوہ رمضان کے دیگر مہینوں میں تھا۔ رمضان کی بابت بلال ؓ کی اذان کا رات میں ہونا ثابت ہو چکا ہے جو سحری کی اذان ہے۔

پس خواہ مخواہ جلیل القدر محدثین کے دعوے کو بے دلیل کہنا سراسر تحکم ہے۔ پنجابی کا ایک مقولہ مشہور ہے "ذات دی چھوٹی کرلی شہتیراں نال جپھے" مفتیان گوجرانوالہ ادنیٰ درجہ میں ہو کر امام ابن القطان اور ابن دقیق العید ایسے ثقیہ کی تغلیط کر رہے ہیں اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد اور شاہ ولی اللہ رحمھم اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں

مولوی انور شاہ صاحب دیوبندی مقلد کو پیش کر رہے ہیں۔

منکرین اذان سحور: علامۃ الدھر الحافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری جلد ثانی ص۔۸۲ میں اس کی تردید کی ہے۔

لال نور: امام حافظ ابن حجر بھی ابن القطان اور ابن دقیق العید تیمیہ اور امام ابن حزم' امام محمد وغیرہم کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ آپ لوگ حدیث انزلوا الناس منازلھم کہ "لوگوں کو ان کے مراتب پر اتارو" کو مدنظر رکھا کرو۔

یوں ہی مفتی اور علامہ بن کر غلط فتوے دینے لگے ہیں۔ کسی پنجابی شاعر نے آپ ایسوں کے بارے میں جو ائمہ محققین کی تردید کرنے بیٹھ گئے' یہ شعر کہا ہے۔

ہاتھیاں نال جو گڑھدا گھتے کملی پاولیانی
سیمرغاں دی ریس کریندی عاجز چڑیا نمانی

اچھا سنو جی! حافظ علامہ ابن حجر نے اذان سحری کی تردید نہیں کی بلکہ یہ لکھا ہے کہ جو حدیث ان بلالا یؤذن بلیل کے اقوات میں ہے وفیہ حجۃ لمن ذھب الی ان الوقت الذی یقع فیہ الاذان قبل الفجر ھو وقت السحور۔ یعنی "یہ حدیث بلال رضی اللہ عنہ کی (کلوا واشربوا والی) ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جس وقت بلال رضی اللہ عنہ اذان کہتا تھا وہ وقت سحری کا تھا' فجر کا نہ تھا۔" جب سحری کا وقت تھا تو اذان سحری کی ہو گئی۔ اس کو فجر کی اذان کہنا بے وقوفی ہے۔

اچھا سنو! حافظ ابن حجر اذان سحری کا انکار نہیں کرتے۔ وہ صرف "نیہ نظر" اس بات پر کہتے ہیں کہ یہ اذان رمضان سے مخصوص نہیں۔ کیونکہ روزے رمضان کے علاوہ بھی رکھے جاتے ہیں۔ اذان تمام سال سحری کے وقت ہونی چاہیے۔

علامہ عینی بھی قاضی عیاض سے یہ نقل کرتے ہیں اذا لم یختص ھذا بشھر رمضان وانما اخبر من عادتہ فی اذانہ ولا نہ العمل المنقول فی سائر الحول بالمدینۃ الخ۔ یعنی یہ رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس حدیث میں تو صرف اس کی عادت کا بیان ہے۔ ورنہ "عمل منقول" مدینہ میں تمام سال اسی طرح پر جاری ہے۔

میں کہتا ہوں کہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں ہر سال یہ اذان سحری کی کہلائے گی جو ہمارا دعویٰ ہے۔ یہ سحری کی اذان سے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔

منکرین اذان سحور: ضلع جھنگ کے مفتی اعظم صاحب وغیرہ کے فتاویٰ کی طرف رجوع کیا لیکن فتوئی کا دارومدار صرف نووی کے ایک بلا دلیل دعوے پر ہے' جس کی تردید بعد کے قیصوں الخ۔

اہل نور: مفتیان ضلع جھنگ اور دیگر مفتیان کراچی کے فتوے بطور تائید پیش کیے تھے۔ یہ جھوٹ ہے کہ ان فتووں کو دلائل شرعی بنا کر پیش کیا تھا۔ بلکہ ایسے ہی یہ فتوے پیش کیے تھے جیسے آپ حضرات نے مولانا انور شاہ کو اپنا پشتیبان بنا کر ان کا قول فیض الباری سے پیش کیا تھا۔

امام نووی کی تحقیق کو بے دلیل بتانا بھی چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ کچھ عقل سے کام لو۔

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجہ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

امام نووی نے خود اپنی رائے سے کوئی بات اس مقام پر نہیں کی بلکہ قال العلماء معناہ الخ' لکھا ہے۔ پس علماء سے مراد محدثین کرام ہیں۔ ظاہر ہے کہ علماء سے جہلا مراد نہیں ہو سکتے۔ پھر بلا دلیل تنقید کیوں کر رہے ہیں۔ ہم اس کا ثبوت پیش کر چکے ہیں کہ کلام راوی میں مبالغہ ہے' ورنہ اذان سحری اور اذان فجر میں کھانا کھانے کا وقت ہوتا تھا۔ چنانچہ الفاظ کان یصعد ھذا وینزل ھذا کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہیں فنتعلق بہ فنقول کما انت حتٰی نتسحر (مجمع الزوائد ج-۳' ص-۱۵۳) یعنی "ہم مؤذن فجر کو ٹھہرا لیتے اور کہتے کہ ذرا ٹھہریئے ہم سحری کر لیں۔" جب اذان سحری اور اذان فجر میں اتنا وقفہ ہو گا تو پھر بلال رضی اللہ عنہ بیکار نہیں بیٹھا کرتے تھے۔ ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور جب صبح ہو جاتی تو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اطلاع کرتے کہ صبح ہو گئی۔ پھر وہ آکر اذان کہہ دیتے تھے۔ ان تمام روایتوں کے مجموعے سے علماء نے یہ معنی سے [illegible] جہلاء کیوں انکار کرتے ہیں۔

منکرین اذان سحور: عبارت امام نووی صاحب کی ہے اور ترجمہ علامہ مفتی صاحب جھنگوی کا ہے۔ یاد رہے کہ ترجمہ میں سحری کی اذان کا لفظ ہے۔ مگر امام نووی کے کلام میں یہ نہیں۔ قارئین کرام غور فرمائیں کہ ایک صاحب نے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے حدیث کے درمیان کتنی الخ۔

اہل نور۔

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

کتاب و سنت کی عبارات عربیہ کا ترجمہ عوام کو سمجھانے کے لیے لفظی نہیں کیا جاتا' محاورہ کے طور پر سب نصوص کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے یہ بات سمجھائی گئی ہے۔

حدیث کے الفاظ کے مطابق امام نووی نے ان بلالا کان یؤذن قبل الفجر کے الفاظ لکھے ہیں۔ قبل فجر سحری ہی کا وقت ہے جس میں کلوا واشربوا کا حکم وارد ہے پھر سحری کی اذان لکھنے میں کون سا حرج ہو گیا۔

دیگر امور جو مفتی گوجرانوالہ نے ذکر کیے ہیں جو امام نووی کے کلام سے مستفاد ہیں' ان کی بابت ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حدیث میں مدت یسیر کا بیان راوی نے بطور مبالغہ ذکر کیا ہے ورنہ وقفہ اس بیان سے زیادہ تھا جو دیگر روایات سے ظاہر ہے۔ پس جو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ سحری کی اذان ہم نے فجر کے لیے ہونے کو ترجیح دی ہے' اس کی بین دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ اسے حضرت مولانا عارف صاحب حصاری کا تبصرہ پیش کرنے کے بعد مع حوالہ پیش کی جائے گی۔ وہ یہی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے کہ وہ فرماتی ہیں دونوں اذانوں کا اندازہ یہ تھا کہ ایک مؤذن اترتا اور دوسرا مؤذن چڑھ جاتا تھا۔

بس اس سے اذان پہلی فجر کے لیے ثابت ہو گئی۔ یہ خیال اور قول دیگر نصوص کے پیش نظر بالکل باطل ہے۔ نیل الاوطار جلد ثانی' ص ۱۹ میں یہ حدیث منقول ہے:

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاانس انی ارید الطعام اطعمنی شیئا فجئتہ بتمروانآء فیہ مآء وذالک بعد ما اذن بلال قال یاانس انظر

رجلا یاکل معی فدعوت زید بن ثابت فتسحر معہ (الحدیث) (ابن حبان ونسائی)
حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کھانا کھانے کا ارادہ رکھتا ہوں' تم مجھے کھانا کھلاؤ۔ پس میں کھجور اور ایک برتن میں پانی لے آیا۔ یہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد کا قصہ ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ باہر کسی شخص کو دیکھو جو میرے ساتھ آکر کھانا کھائے۔ پس میں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا تو زید رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی۔

اب ناظرین اہل علم غور کریں کہ بعد اذان بلال رضی اللہ عنہ کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا طلب کرنا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا گھر سے کھانا لانا اور پھر انس رضی اللہ عنہ کو حکم دینا کہ وہ کسی کو بلا کر لائے۔ پھر انس رضی اللہ عنہ کا زید رضی اللہ عنہ کو بلا کر لانا' پھر دونوں کا باہم مل کر کھانا۔ کیا یہ سب کام بلال رضی اللہ عنہ کے اترنے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے چڑھنے کے درمیان میں سرانجام پا سکتے ہیں؟ دیانتداری سے جواب دیں۔

اچھا یہ تو کھجور اور پانی سے سحری تھی۔ اگر اس وقت دیگر صحابہ بحکم کلوا واشربوا اذان بلال رضی اللہ عنہ کے بعد دوسری قسم کا کھانا کھائیں مثلاً گوشت روٹی وغیرہ تو وہ کھا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پس یہ مدت یسیر دونوں اذانوں کے درمیان جو وقفہ تھا اس کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا۔ جیسا عام طور پر ہمارا بھی باہمی گفتگو میں ایسا محاورہ مبالغہ کے ساتھ بولا گیا ہے۔ مثلاً بہت لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ذرا دو منٹ ٹھہر جا' میں آتا ہوں۔ وہ آدھ گھنٹہ یا پندرہ منٹ لگا دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے میں یہ کام چٹکی میں کر دوں گا حالانکہ اس پر گھنٹہ لگا دیا۔ کوئی کہتا ہے ٹھہر جاؤ میں ابھی اسی وقت آتا ہوں' وہ دو گھنٹہ کے بعد آتا ہے۔ احادیث اور اقوال صحابہ میں بھی ایسے محاورات مل سکتے ہیں۔ مگر تتبع اور استقراء کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ حدیث میں مدت یسیر کو مبالغہ سے اترنے چڑھنے کے ساتھ بیان کیا گیا ورنہ یہ کوئی بازی گری کا کھیل نہیں ہے۔

حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب محدث بھوجیانی مدظلہ نے اس حدیث کے سمجھنے میں مفتیان گوجرانوالہ پر فوقیت حاصل کی۔ جو نسائی کے حاشیہ پر تعلیقات سلفیہ کے حاشیہ نمبر۔۱۵' ص۔۲۳ میں یہ تشریح کر دی تريد قلة ما بينهما من المدة لا

التحدید۔ یعنی اس سے مراد قلیل مدت مابین دو اذانوں کے ہے۔ تحدید مراد نہیں کہ واقعی ہمیشہ ایک اترتا' دوسرا چڑھتا تھا اور ہمیشہ اتنا ہی وقت ہوتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے ورنہ اترنے چڑھنے کے وقت میں کوئی شخص کھانا نہیں کھا سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ گوجرانوالہ کے مفتیان کے منہ پر کوئی مشین لگی ہو کہ بجلی کا کرنٹ دبانے سے تمام کھانا فی الفور حلق سے اتر کر شکم میں پہنچ جاتا ہو' واللہ اعلم بالصواب۔

منکرین اذان سحور: احناف کے اقوال اور امام نووی کی بعید اور بے دلیل تاویل سے متاثر ہو کر ہمارے علماء نے بھی مکھی پر مکھی ماری ہے کہ سحری کے لیے اذان ہے۔

اہل نور: علماء احناف اور فقہاء محدثین ابن القطان' ابن دقیق العید فقیہہ الامت ابن حزم مجدد ملت وغیرہ نے جو کچھ احادیث اذان سحری سے سمجھا' بالکل ٹھیک سمجھا اور ہمارے علماء نے اس حق کو قبول کیا۔ آپ ان کی صحیح تصدیق کو گستاخانہ لہجہ میں مکھی پر مکھی مارنا قرار دے رہے ہیں۔

منکرین اذان سحور: پھر اس پر عجیب و غریب تاویل کے ذریعہ دونوں اذانوں کے درمیان ایک گھنٹہ' دو گھنٹہ اور تین گھنٹہ کا فاصلہ پیدا کیا ہے تاکہ ثابت کیا جائے کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کے لیے تھی تاکہ عورتوں کو بیدار کر کے کھانا تیار کروایا جا سکے۔

اہل نور: یہ تغیر و تبدل ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ہوا ہے۔ جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم گدھوں' گھوڑوں' اونٹوں' خچروں کی سواری کرتے رہے اور صحابہ کرام کا بھی یہی تعامل تھا۔ تو اب مفتیان گوجرانوالہ سائیکل' موٹر' ریل' جہاز وغیرہ نئی ایجادات کی سواریوں پر سوار ہو رہے ہیں۔ تو یہ ان کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اس کو سمجھ لیں۔ ہاں کھانا پینا صبح کے قریب ہونا چاہیے اور اذان سحری کھلانے پلانے کے لیے ہے۔ اس لیے حکم ہوا کہ جب بلال رضی اللہ عنہ اذان دے تو کھاؤ پیو اور جب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے تو رک جاؤ اور مؤذنوں کو سحری و افطاری پر امین قرار دیا گیا جیسا کہ ہم اپنے مضمون میں پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں سے کھانا کھایا

ہے لیکن اب منکرین گوجرانوالہ انگریزوں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے چمچوں سے کھاتے ہیں۔ تو یہ انقلابات زمانہ سے ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہم آپ کو کب مجبور کرتے ہیں کہ گھنٹہ دو گھنٹہ فاصلہ ٹھہراؤ۔ آپ سنت پر عمل کریں کہ دونوں اذانوں کے درمیان قلیل فاصلہ کہ صرف کھانا کھایا جا سکے' مقرر رکھو۔ لیکن کبھی کبھی گدھوں پر سوار ہو کر گوجرانوالہ کے بازاروں میں بھی چلایا کرو' کہ یہ قرآن سے بھی ثابت ہے' فتفکروا۔

منکرین اذان سحور: معلوم ہوا کہ یہ اذان بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کے لیے تھی۔ چونکہ فجر کا وقت غفلت اور نیند کا ہے۔ اس لیے فجر ہونے سے چند منٹ پہلے بلال رضی اللہ عنہ اذان کہا کرتے تھے تاکہ خواب غفلت سے سونے والے بیدار ہو جائیں اور جو لوگ اٹھے ہوتے ہیں اور پیشاب پاخانہ کو گئے ہوئے ہوتے ہیں' ان کو لوٹایا جائے۔ نیز اگر کوئی تہجد میں مشغول ہو تو اس کو لوٹایا جائے۔ نیز اگر کوئی تہجد میں مشغول ہو تو اس کو بھی لوٹایا جائے۔

اہل نور: آپ نے امام نووی پر الزام لگایا تھا کہ انہوں نے کئی باتیں بے دلیل اپنی طرف سے حدیث میں داخل کر دیں۔ آپ کے اصول سے یہ آپ نے بھی کیا ہے کہ یہ باتیں حدیث بلال رضی اللہ عنہ میں نہیں ہیں' آپ نے اپنی طرف سے ٹھونس دی ہیں۔ **اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم** (الآیہ) اور آیت کبر مقتا عند اللہ ان **تقولوا مالا تفعلون** کے مصداق ہو گئے۔ نہ یہ ذکر ہے کہ یہ اذان فجر کے لیے تھی اور نہ پیشاب پاخانہ گئے ہوئے کو لوٹانے کا ذکر ہے۔ بلکہ شرح مسلم میں یہ لکھا ہے **سحور ان اراد الصوم** یعنی بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سے سوتے ہوئے کو جگانا تاکہ سحری کر لے۔ پس یہ اذان سحری کی ہو گی۔ **غائبکم** کا لفظ احتمالی ہے۔ اس سے باہر باغ میں رہنے والا بھی مراد ہو سکتا ہے اور گھر سے مسجد میں گیا ہوا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ اذان سحری کے لیے تھی تاکہ سویا ہوا بیدار ہو کر اور تہجد والا نوافل سے فارغ ہو کر سحری کھا لے کیونکہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں **اذا اذن بلال فکلوا واشربوا**۔ (نسائی) یعنی "جس وقت بلال رضی اللہ عنہ اذان دے تو تم کھاؤ پیو۔" پس جو اذان کی وجہ نائم کے الفاظ اور تہجد گزار کے لوٹانے کی وارد ہے' وہ اس حکم کی تعمیل

کے لیے ہے نہ کہ صبح کی نماز کے لیے کیونکہ صبح کے لیے دوسری اذان تھی۔ تقیہ الامت ابن دقیق العید کا یہ فرمان واجب الایقان بالکل درست ہے۔ انما کان فی رمضان ...... بدلیل قولہ کلوا واشربوا۔ یہی علامہ ابن حزم مجدد ملت نے فرمایا کہ فجر کے بعد دوسری اذان کا ہونا ضروری ہے۔ قبل از فجر جو اذان ہوتی ہے' وہ فجر کے لیے کفایت نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ یقینی طور پر سحری کی اذان ہے' نماز کی اذان نہیں ہے۔ (محلی ص-۱۱۷)

آپ صاحبان نے صبح سے چند منٹ پہلے مان لیا ہے۔ حالانکہ موذنوں کا اتار اور چڑھاؤ تین منٹ کا ہے تو ان چند منٹوں کا اندازہ اس قدر کہ نائم بیدار ہو کر اور تہجد گزار نفلوں سے فارغ ہو کر حکم کلوا واشربوا پر عمل کر سکے۔ کیونکہ اذا اذن بلال شرط ہے اور کلوا واشربوا اس کی جزا ہے۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ جزا کا تحقق' شرط کے تحقق کے بعد ہوتا ہے۔ تو اذان بلال ﷺ کے بعد کھانا کھایا جاتا ہے تو کھانا پندرہ بیس منٹ کھایا جائے گا' جس کا اندازہ ہم نے آدھ گھنٹہ کیا تھا۔ تسہیل القاری میں بھی یہی درج ہے' فانظر۔

ظاہر ہے کہ نائم اٹھ کر پیشاب وغیرہ کر کے ہاتھ منہ دھوتا ہے پھر کھانا کھاتا ہے تو یہ کام کم از کم آدھ گھنٹہ میں ہو گا۔ فتامل فیہ۔

منکرین اذان سحور: فقہاء محدثین کا مذہب یہ ہے کہ وہ فجر کے لیے ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر فتح الباری جزء ثانی' ص-۸۳ میں علامہ طحاوی کے قول لا للصلوۃ کے تعاقب الخ۔

لال نور: یہ تعاقب غلط ہے۔ حافظ صاحب نے جو باتیں لکھی ہیں وہ ان کی وجدانی دلیل ہے۔ یہ باتیں حدیث سے قطعاً ثابت نہیں ہیں۔ امام نووی' امام ابن حزم' فقیہ ابن دقیق العید' امام محمد ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین' ابن حجر سے فائق ہیں۔ وہ خود ان کی تصریحات کا خوشہ چین ہے۔ آپ انزلوا الناس منازلھم پر عمل کریں۔ پھر جن علماء کے اقوال مفتیان نے نقل کیے ہیں کہ سحری کے وقت کی اذان نماز فجر کے لیے تھی' یہ سراسر حدیث کے خلاف ہے۔ چنانچہ سبل السلام سے ہم یہ نقل کر چکے ہیں کہ امیر صنعانی نے فرمایا کہ اس اذان کا مقصد جو سحری کے وقت کہی گئی ہے' یہ ہے

جس کی خود نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ یہ اذان اس لیے ہے کہ جو سوئے ہوئے ہیں' وہ بیدار ہو جائیں اور تہجد گذار لوٹ جائیں (سحری کھالیں)

پس یہ اذان وقت کی بابت اطلاع دینے کی نہیں ہے اور نہ نماز کے لیے حاضر ہونے کی ہے۔ اس کے لیے دوسری اذان مقرر ہے۔ ایک نماز کے دو مؤذن ہمیشہ کے لیے ثابت نہیں ہیں۔ من ادعی فعلیه البیان۔ بلکہ اور دنوں میں طلوع فجر کے بعد اذان دیتا تھا۔ چنانچہ بنی نجار کی عورت کا بیان گذر چکا۔ فاذا رأی الفجر تمطی ثم اذن۔ یعنی بلال رضی اللہ عنہ اس وقت اذان کہتے جب صبح صاف روشن ہو جاتی۔ دیگر حدیث کہ کسی سائل نے اوقات نماز کی بابت پوچھا فامر بلالا فاذن حین تطلع الفجر۔ تو آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ بلال رضی اللہ عنہ اذان کہے' پس بلال رضی اللہ عنہ نے فجر طلوع ہونے پر اذان کہہ دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ علاوہ رمضان کے نماز فجر کے لیے دو مؤذن نہ تھے۔ یہ صرف مخصوص رمضان سے ہے کہ رمضان کے دنوں میں دو مؤذن' ایک سحری کے لیے بیدار کرنے کو اور دوسرا نماز کے لیے وقت بتانے کو کہ نماز کے لیے حاضر ہو جاؤ۔ باقی یہ جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ پہلی اذان بلال رضی اللہ عنہ والی نماز کے لیے کفایت کر سکتی ہے کہ امام شافعی وغیرہ کا یہ قول ہے۔ یہ سراسر حدیث کے خلاف ہے کیونکہ حدیث سے دوسری اذان ثابت ہے۔ اگر پہلی کفایت کرتی تو دوسری کی ضرورت نہ تھی۔ پس جو علماء محدثین اذان بلال رضی اللہ عنہ کو فجر کی اذان قرار دیتے ہیں' وہ اسی پر کفایت کے قائل ہیں' جس سے ان کے قول کا بطلان صاف نمایاں ہے۔ ان محدثین کے مسلک پر ان فقہاء محدثین امام ابن حزم' امام ابن دقیق العید' امام ابن قطان وغیرہ کے مسلک کو ترجیح ہے۔

اور ابن حجر وغیرہ کا مسلک جس پر مفتیان گوجرانوالہ خیمے لگائے بیٹھے ہیں' صاف مرجوح ہے کہ ظاہر احادیث کے خلاف ہے۔ مفتیان گوجرانوالہ کی ستم ظریفی ہے کہ ہم سے تو اذان سحری کے لیے للسحر کی قید طلب کرتے ہیں اور خود جو اس اذان کو کبھی للفجر کہتے ہیں اور کبھی للصلوۃ کہتے ہیں لیکن اس کا ثبوت کسی حدیث سے پیش نہیں کرتے بلکہ مقلدین کی طرح محض اقوال الرجال سے کام لے رہے ہیں کہ ابن حجر نے یوں کہا' شوکانی نے یوں کہا۔ بھلا یہ بتاؤ کہ سحری کے وقت جو اذان قبل الفجر ثابت

ہے' اس کو کسی عالم کے قول پر کس طرح مقید کر سکتے ہیں۔ وہ تو اسی وقت کی کہلائے گی جس وقت میں ہو رہی ہے' فجر کی نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ فجر کے وقت میں نہیں کہی گئی اور نہ نماز کے لیے ہو سکتی ہے کیونکہ نماز کا وقت نہیں ہے۔ پھر اگر سحری کی فجر اور نماز کے لیے تھی تو دوسری فضول ہے' واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

محیفہ اہل حدیث کراچی جلد۔۵۱' شمارہ۔۸' ۹' ۱۰' ۱۱' ۱۲' ۱۳ و جلد۔۵۲' شمارہ۔۲۰ تا ۲۲۔

کیا سحری کی اذان مسنون ہے؟

کیا اذان کی بجائے لاؤڈ سپیکر پر اعلان درست ہے؟

مسئلہ الف: رمضان المبارک میں جو سحری کی اذان کہی جاتی ہے اس کا ثبوت کیا ہے؟

مسئلہ ب: اگر اذان کی بجائے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کر کے لوگوں کو بیدار کیا جائے تو کیا یہ جائز ہو گا؟ کتاب و سنت کی روشنی میں تحریر کریں۔

مفتی صاحب کا جواب ⇦ "نبی ﷺ کے دو مؤذن تھے حضرت بلال اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ سحری کے لیے تھی یا فجر کے لیے؟ صحیح بات یہی ہے کہ وہ فجر کے لیے تھی۔ کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان سال بھر چلتی تھی۔ لہذا خاص سحری کے نام پر اذان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لوگوں کو سپیکر کے ذریعہ بیدار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ امر بالمعروف کے ضمن میں آجاتا ہے۔"

ناظرین کرام! یہ فتویٰ کتاب و سنت کی رو سے صحیح نہیں ہے بلکہ امر بالمعروف کے نام پر اذان مسنونہ کی بجائے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنا بدعت ہے۔ اصل بدعت وہی ہے جو سنت کی جگہ رائج ہو جائے۔ لہذا اذان سحری کی بجائے درود و صلوۃ پڑھنا' نقارہ بجانا اور دیگر رسمی چیزیں دھونسہ' گولہ' سیٹی وغیرہ بدعت ہیں۔ البتہ اذان مسنونہ کو دور تک پہنچانے کے لیے لاؤڈ سپیکر کا استعمال درست ہے۔

میں پہلے سحری کی اذان کا ثبوت پیش کرتا ہوں پھر اس کی بجائے لاؤڈ سپیکر پر دیگر اعلانات کا بدعت ہونا ثابت کروں گا۔

(۱) عن عائشة ان بلالا كان يؤذن بليل' فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم كلوا واشربوا حتى يؤذن ابن ام مكتوم فانه لا يؤذن حتى يطلع الفجر- (بخاری کتاب الصوم)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں' حضرت بلال ﷛ رات کے وقت اذان دیا کرتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' تم سحری کے وقت کھاتے پیتے رہا کرو یہاں تک کہ مؤذن ابن ام مکتوم اذان دے' وہ طلوع فجر سے پہلے اذان نہیں دیا کرتے تھے۔

اس صحیح حدیث (قطعی الثبوت' قطعی الدلالت) سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہیں۔

(الف) عہد نبوی میں دو مؤذن مسجد نبوی میں مقرر تھے۔ ایک حضرت بلال ﷛ جو سحری کے وقت اذان کہتے تھے اور دوسرے ابن ام مکتوم ﷛ جو طلوع فجر پر اذان دیا کرتے تھے۔

(ب) فجر سے پہلے سحری کے وقت اذان کہنا مسنون ہے اور یہ بھی کہ یہ تعامل عہد نبوی میں جاری رہا کیوں کہ لفظ "کان یؤذن" ماضی استمراری ہے۔

(ج) سحری کی اذان کے وقت روزہ رکھنے والے کو کھانا پینا درست ہے جبکہ فجر کی اذان سے کھانا پینا بند ہو جاتا ہے۔

(د) مسجد میں دو مؤذن مقرر کرنے مسنون ہیں۔ ایک سحری کے وقت اذان دینے والا' دوسرا فجر طلوع ہونے پر اذان دینے والا۔ یہ اس لیے ہے کہ دو مختلف آوازوں سے اذان سحری اور فجر کا امتیاز ہو جائے۔ عن ابن عمر قال كان لرسول الله مؤذنان بلال و ابن ام مكتوم- (مسلم جلد اول' ص-۲۱۵)

(۲) عن عبد الله بن عمر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان بلالا يؤذن بليل فكلوا واشربوا حتى تسمعوا اذان ابن ام مكتوم- (مسلم جلد اول' ص-۳۴۹) حضرت ابن عمر ﷛ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ بلال ﷛

تو رات کے وقت اذان دیتا ہے۔ اس لیے تم کھاتے پیتے رہو حتیٰ کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی اذان سن لو۔

(۳) عن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان بلالا یوذن بلیل لیوقظ نائمکم ولیرجع قائمکم۔ یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آپ سے روایت کیا ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان کہتا ہے تاکہ سونے والے کو بیدار کرے اور قیام کرنے والا واپس لوٹ جائے۔" اس حدیث میں اذان سحری کا مقصد بیان کیا ہے۔ امام محمد بن الحسن الشیبانی (موطا امام محمد مترجم ص۔۸۳) اور حافظ ابن حزم المحلی (جلد۔۲ ص۔۱۷۱) نے وضاحت کی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ سحری کے وقت اذان دیتے تھے۔

(۴) عن عائشة قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اذن بلال فکلوا واشربوا حتی یؤذن ابن ام مکتوم قالت ولم یکن بینھما الا ینزل ھذا ویصعد ھذا۔ (النسائی جلد اول' ص۔۷۲) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک موذن اذان کہہ کر اترتا تھا تو دوسرا اذان کے لیے چڑھ جاتا تھا۔

اس حدیث میں دو اذانوں کا درمیانہ وقفہ (مبالغتاً" ذکر ہے۔ وقت کے اندازہ سے مقصد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ سحری دیر سے کھاتے تھے یعنی پہلی اذان پر کھانا شروع کرتے جبکہ فوری طور پر دوسری اذان فجر ہو جاتی۔

(۵) عن سمرة بن جندب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یمنعکم من سحورکم اذان بلال ولا الفجر المستطیل ولکن الفجر المستطیر فی الافق۔ (مسند احمد' مسلم) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو سحری کھانے سے بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور صبح کاذب جس میں سفیدی بلندی کی طرف اٹھنے والی ہوتی ہے' نہ روکے لیکن وہ صبح جس میں سفیدی دائیں بائیں پھیلتی ہے' سحری کھانے سے مانع ہے۔

اس حدیث پر امام احمد نے یوں عنوان لکھا ہے: "باب وقت السحور واستحباب تاخیرہ" یعنی سحری کا وقت اور اس کو دیر سے کھانے کا استحباب۔ اور موطا میں امام مالک نے ایک باب یوں باندھا ہے: "قدر السحور من النداء" یعنی اذان کے ذریعہ سحری کا اندازہ۔

خبیب بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے میری پھوپھی انیسہؓ نے بیان کیا:

(۶) كان بلال و ابن ام مكتوم يؤذنان للنبي صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان بلالا يؤذن بليل فكلوا واشربوا حتى يؤذن ابن ام مكتوم فكنا نحبس ابن ام مكتوم عن الاذان فقلنا كما انت حتى نتسحر ولم يكن بين اذا نيهما الا ان ينزل هذا ويصعد هذا۔ (مسند ابی داؤد الطیالسی جلد اول' ص-۱۸۵) یعنی نبی ﷺ نے دو شخص مؤذن مقرر کر رکھے تھے (جو اپنے اپنے وقت پر اذان دیا کرتے تھے) ایک بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ۔ نبی ﷺ نے فرمایا بلال رضی اللہ عنہ رات کو (سحری کے وقت) اذان دیتا ہے' تم اس وقت تک کھاؤ پیو' یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے۔ ہم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے کہتے' ٹھہر جاؤ کہ ہم سحری کھا لیں۔ دونوں اذانوں کے درمیان اتنا تھوڑا وقفہ ہوتا تھا کہ ایک اترتا تو دوسرا چڑھ جاتا۔

مولانا عبدالجلیل صاحب جھنگوی نے اپنے رسالہ اذان سحور کے ص-۱۰ میں امام نووی سے نقل کیا ہے کہ "علماء کرام نے اس کی صورت یہ بتائی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فجر سے پہلے سحری کی اذان دے کر ذکر دعا وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ جب دیکھتے کہ فجر ہونے کے قریب ہے تو اتر آتے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اطلاع دیتے جو پو پھٹنے پر اذان دیتے۔"

مولانا موصوف نے حجۃ اللہ البالغہ جلد اول' ص-۱۴۳ سے نقل کیا ہے کہ: "امام دو مؤذن ایسے مقرر کرے جن کی آواز لوگ پہچانتے ہوں اور لوگوں کے لیے امام اس کا تفصیلاً اعلان کر دے۔" (ملخصاً)

(۷) عن ابی محذورة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امناء المسلمين على صلاتهم وسحورهم المؤذنون- (السنن الكبرىٰ للبيهقى جلد اول' ص-۴۲۶) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی نمازوں اور سحریوں پر امین ان کے مؤذن ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے: المؤذنون امناء الله على فطرهم وسحورهم- (مجمع الزوائد جلد اول' ص-۳۲۳) اور مشکوٰۃ میں ہے: عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خصلتان معلقتان فى اعناق المؤذنين للمسلمين صيامهم

وصلوتهم - (رواه ابن ماجه وقال القاری سنده صحیح) یہ دونوں احادیث پہلی کی مؤید ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اذان نماز کی طرح اذان سحری کے لیے بھی مؤذن مقرر ہوتا ہے۔ جیسا کہ عہد نبوی میں تھا اور یہی عمل مسنون ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام محمد فرماتے ہیں کہ پہلی اذان نماز فجر کے لیے نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ دوسری غرض سے تھی جس کو نبی ﷺ نے لیرجع قائمکم ویوقظ نائمکم سے بیان فرمایا ہے۔ (مرعاۃ المفاتیح جلد اول' ص۔۴۴۳)

اذان مسنونہ کی بجائے لاؤڈ سپیکر پر اعلان وغیرہ بدعت ہے ⇦ نیل الاوطار (ج۔۲' ص۔۴۹) میں فتح الباری شرح البخاری سے نقل کیا ہے کہ "بعض حنفیہ نے اذان سحری کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ (اذان سحری) حقیقی اذان نہ تھی جو الفاظ مقررہ سے متعارف ہے بلکہ وہ تذکیر اور منادی کرنا تھا۔ کما یقع للناس الیوم۔ (جیسا کہ آج کل مروج ہے)"

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ: "یہ بدعت ہے' حقیقت یہ ہے کہ اس اذان کے متعلق وارد احادیث باہم اس کے لفظ اذان کے ساتھ ہونے کو مضبوط کر رہی ہیں اور شرعی معنی (اذان کے الفاظ مسنونہ) مراد لینا لغوی اور مجازی معنی سے مقدم ہے۔ نیز اگر اذان سحری الفاظ مسنونہ کے ساتھ نہ ہوتی تو سامعین پر اس کے اذان فجر ہونے کا شبہ نہ ہوتا۔ (جس کے زائل کرنے کے لیے وضاحت فرمائی)

عبدالقادر عارف حصاری

محدث لاہور جلد۔۱' شمارہ۔۳ محرم سنہ۹۱ھ بمطابق مارچ سنہ۱۹۷۱ء

نماز جمعہ کی دو اذانیں

حضرات! مولانا حافظ عنایت اللہ صاحب گجراتی اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی دام اقبالہم نے اپنے سابقہ خیال کو چھوڑ کر انقلاب زمانہ اور نئی روشنی کے علماء کی روش اختیار کرتے ہوئے علماء سلف و خلف کے خلاف اس بات کے قائل ہو

گئے ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے عہد نبوی میں دو اذانیں مقرر اور مسنون تھیں، وہی اب تک چلی آرہی ہیں۔ اور اسی طرح ہر جگہ شہر اور گاؤں میں ان کو جاری رکھنا مشروع ہے۔ چنانچہ مولانا اول الذکر نے ایک رسالہ بنام "قرع اللاذنین" لکھ کر اپنے تجدد خیال کا بڑے زور اور تعلی سے اظہار کیا ہے اور حضرت ثانی الذکر نے اخبار الاعتصام میں مذاکرہ علمیہ کے انداز سے اپنے عندیہ کو ظاہر کر کے اپنے سابقہ فتوے کو باطل ظاہر کیا ہے اور ہر دو صاحبان اپنے اجتہادی سیلاب میں بہہ کر بزبان حال یہ مقتل کر رہے ہیں ۔

پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

مضمون مندرجہ ذیل میں ان حضرات کے خیالات و مقالات کو بادلائل باطل قرار دے کر نماز جمعہ کے لیے ایک اذان کا مسنون ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔ اہل علم حضرات باحسان نظر ملاحظہ فرما کر انصاف کریں کہ ان حضرات کا دعویٰ کہاں تک سچا ہے۔

انصاف کیجئے ذرا دیکھ بھال کے
کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

جمعہ کی ایک اذان کا قرآن سے ثبوت! ⇦ سورہ جمعہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ **یاایھا الذین اٰمنوآ اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللّٰہ وذروا البیع**۔ یعنی "اے مومنو! جب تم کو جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دے کر بلایا جائے تو اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف جلد حاضر ہو جاؤ اور خرید و فروخت، کام کاج بالکل چھوڑ دو۔"

اس آیت کریمہ میں نماز جمعہ کے لیے اذان دینے کی شرط ذکر کر کے یہ حکم دیا ہے کہ اس کو سن کر نماز کے لیے حاضر ہو جاؤ۔ **ذکر اللّٰہ** سے مراد بھی نماز ہے۔ کیونکہ جس چیز کے لیے اذان دی گئی ہے اسی چیز کے لیے حاضر ہونے کا اس میں حکم ہے اور وہ نماز ہے۔ نماز تمام کی تمام ذکر اللہ ہے۔ خطبہ میں بھی ذکر اللہ تو ہے، مگر وہ تمام ذکر اللہ نہیں ہے۔ اس میں خطیب کا کلام بھی ہے۔ ذکر اور تذکیر میں باہم فرق ظاہر ہے۔ نیز خطبہ نماز سے ملحق ہے، اصل نماز ہی ہے جس کے لیے اذان مشروع ہوئی

ہے اور آیت میں بھی ندا للصلوٰۃ مذکور ہے، للخطبہ نہیں ہے اور نہ خطبہ اور وعظ کے لیے شرع میں کوئی نظیر ملتی ہے کہ کبھی اذان دے کر وعظ اور نصیحت کے لیے بلایا گیا ہو حالانکہ وعظ اور خطبے بغیر نماز کے بھی شارع علیہ السلام سے ثابت ہیں۔ کما لا یخفٰی علٰی اھل العلم۔

اذان کی تعریف ہی شرع میں یہ ہے: الاذان ھو الاعلام بدخول وقت الصلوٰۃ بالفاظ مخصوصۃ۔ (نیل الاوطار ج۔۲، ص۔۳۹) یعنی الفاظ مخصوصہ شرعیہ سے نماز کے وقت کی اطلاع دینے کا نام اذان ہے۔ پس وقتی اذان وہ ہے جو نماز کے وقت کی اطلاع دینے کے لیے کہی جائے۔ خطبہ اور وعظ کے لیے اذان دینے کا حکم نہ شرع میں ہے اور نہ وقتی اذان جمعہ کے دن خطبہ کے لیے ہے۔ بلکہ وہ نماز جمعہ کے لیے ہے۔ آیت "اذا ناریتم الی الصلوٰۃ" میں بھی نماز ہی کے لیے اذان کا ثبوت ہے۔ پس نماز جمعہ کی وقتی اذان قرآن سے ثابت ہے جو عند المنبر ہے۔

نماز جمعہ کا وقت ⇐ نماز جمعہ کے وقت میں ائمہ دین نے اختلاف ذکر کیا ہے۔ بعض بعد الزوال کے قائل ہیں۔ جمہور کا یہی مذہب ہے اور بعض سورج چڑھنے کے بعد اول النہار سے لے کر تا آخر وقت ظہر کے قائل ہیں۔ امام احمد وغیرہ بعض ائمہ کا یہی مذہب ہے۔ میری تحقیق میں ازروئے دلائل یہی راجح ہے۔ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب نزل الابرار ص۔۱۵۲ میں فرماتے ہیں: ووقتھا من حین ارتفاع الشمس قدر رمح الی انتھاء وقت الظھر۔ یعنی "جمعہ کا وقت سورج بقدر ایک نیزہ چڑھ جانے سے لے کر آخری وقت ظہر تک ہے۔" اس لیے منتقی میں یوں باب منعقد کیا ہے: "باب ماجاء فی التجمیع قبل الزوال وبعدہ" یعنی یہ باب زوال سے پہلے اور بعد میں جمعہ پڑھنے کے بیان میں ہے۔

الروضۃ الندیہ ص۔۶۴ میں ہے کہ قبل زوال جمعہ کفایت کرنے پر صحیح احادیث وارد ہیں۔ چنانچہ حدیث انس رضی اللہ عنہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز جمعہ پڑھ کر پھر قیلولہ کیا کرتے تھے۔ اور قیلولہ دوپہر کے وقت قبل زوال سونے کا نام ہے۔ جیسا کہ علماء لغت نے اس کی صراحت کی ہے۔ زوال کے بعد سونے کو شرع یا لغت میں قیلولہ نہیں کہتے۔ پس آنحضور ﷺ جمعہ پڑھ کر پھر دوپہر کو سو جایا کرتے تھے۔ ایسا ہی حدیث سہل

بن سعد رضی اللہ عنہ میں ہے کہ ہم قیلولہ اور صبح کا کھانا جمعہ کے بعد سرانجام دیتے تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ نصف النہار سے قبل جمعہ پڑھ لیتے تھے اور کھانا اور دوپہر کے سونے کا کام نماز جمعہ کے بعد کرتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صاف وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ پڑھ لیا کرتے تھے اور ہم صحابہ جمعہ کے بعد اپنے اونٹوں کی طرف جاتے تھے اور ان کو راحت دلاتے۔ اس وقت سورج ڈھلتا تھا۔ اس حدیث پر "الروضۃ الندیہ" میں لکھا ہے کہ وھذا فیہ التصریح بانھم صلوھا قبل زوال الشمس وقد ذھب الی ذالک احمد بن حنبل وھو الحق۔ یعنی اس حدیث میں صاف تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے زوال شمس سے قبل جمعہ پڑھا تھا۔ یہی مذہب امام احمد کا ہے اور یہی ازروئے دلائل حق ہے۔

نیل الاوطار ج۔۳، ص۔۲۶۱ میں علامہ شوکانی فرماتے ہیں: واصرح من ھذا حدیث جابر المذکور فی الباب فانہ صرح بان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی الجمعۃ ثم یذھبون الی جمالھم فیریحونھا عند الزوال ولا ملجئی الی التاویلات المتعسفۃ التی ارتکبھا الجمھور۔ یعنی سب احادیث سے زیادہ صریح حدیث جابر رضی اللہ عنہ کی ہے، جس میں صاف یہ صراحت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت نماز جمعہ پڑھ لیا کرتے تھے کہ صحابہ اپنے اونٹوں کی طرف جا کر ان کو راحت دلاتے تھے اور یہ زوال کا وقت ہوتا تھا اور جمہور کی ان تاویلوں کی طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے جو بجروی سے کی گئی ہیں۔

باقی رہے وہ دلائل جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال کے بعد جمعہ پڑھا ہے۔ سو وہ ہمارے خلاف نہیں اور ان سے یہ حصر ثابت نہیں ہے کہ جمعہ صرف زوال کے بعد ہے اور اس سے پہلے جائز نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جمعہ کا وقت ممتد ہے جو نیزہ بھر سورج چڑھنے سے لے کر آخری وقت ظہر تک ہے۔ آپ نے کبھی بعد الزوال جمعہ پڑھا اور کبھی اول النہار قبل الزوال پڑھ لیا۔ گاہے چنیں وگاہے چناں۔ اس لیے حدیث انس رضی اللہ عنہ میں یہ وارد ہے کہ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اشتد البرد بکر بالصلوٰۃ واذا اشتد الحر ابرد بالصلوٰۃ یعنی الجمعۃ (بخاری) کہ جب سخت سردی ہوتی تو آپ نماز جمعہ سویرے پڑھ لیا کرتے تھے اور جب گرمی سخت

ہوتی تو نماز جمعہ ٹھنڈی کر کے پڑھتے تھے۔ اس حدیث میں نماز سے مراد نماز جمعہ ہے۔ جیسا کہ راوی اعلم بالمراد نے ذکر کیا ہے۔ اگر یہ تفسیر صحیح نہیں تو کسی مفسر کی صحیح تفسیر پیش کریں۔ ورنہ عموم صلوۃ سے بھی ہمارا استدلال درست ہو گا۔

نیل الاوطار میں ہے کہ واستدلا لهم بالاحاديث القاضية بانه صلى الله عليه وسلم صلى الجمعة بعد الزوال لا ينفى الجواز قبله۔ الخ یعنی احادیث نماز جمعہ بعد زوال پڑھنے پر دلالت کرنے والیاں زوال سے قبل کے جواز کی نفی نہیں کرتیں۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ جمعہ کا وقت اول النہار سے آخر ظہر تک ہے تو جمعہ کی نماز کی جب تیاری کریں گے قبل از زوال یا بعد الزوال تب ہی اذان کہیں گے لیکن اذان سے پہلے جمعہ کے شوق کے لیے حاضر ہونا افضل ہے۔ اس لیے حدیث ساعات میں اس کی فضیلت وارد ہے کہ پہلی ساعت میں جو آئے گا اس کو اونٹ کی قربانی کا ثواب ملے گا اور جو دوسری ساعت میں حاضر ہو گا اس کو گائے کی قربانی کا ثواب ملے گا اور جو تیسری ساعت میں آئے گا اس کو دنبہ' بکری کی قربانی کا درجہ ملے گا اور جو چوتھی ساعت میں آیا' اس کو مرغی کی قربانی کا اجر ملے گا اور پانچویں ساعت میں آنے والے کو انڈے کی قربانی کا ثواب ہو گا۔ یہ ساعات قبل از زوال ہیں جن میں آنا موجب اجر ہے۔ بعد از زوال آنے والے کو یہ اجر میسر نہ ہو گا۔ تو جمعہ کے وقت دو ہو گئے۔ ایک وقت فضیلت اور دوم وقت ادا۔

تبکیر و تہجیر ⇦ صحابہ کہتے ہیں "كنا نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة" یعنی ہم سویرے اول النہار جمعہ پڑھتے تھے اور جمعہ کے بعد دوپہر کو سوتے تھے۔ (بخاری شریف)

نیز بخاری میں حدیث ہے: كنا نصلى مع النبى صلى الله عليه وسلم الجمعة ثم تكون القائلة۔ یعنی ہم نبی ﷺ کے ہمراہ جمعہ پڑھتے اور پھر دوپہر کو سوتے تھے۔

جمعہ کی ساعات ⇦ نسائی (باب وقت الجمعہ) میں جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کا دن بارہ گھنٹہ کا ہے۔ جو بندہ مسلمان اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے' اللہ تعالیٰ اس کو دے گا۔ تم ڈھونڈو اس کو اخیر گھنٹے میں بعد عصر کے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جمعہ کے دن کی بارہ گھڑیاں ہیں جو اول النہار سے آخر دن

تک ہیں۔ ان سے تبکیر کے مراتب ظاہر ہو جاتے ہیں کہ پانچ گھڑیوں تک تبکیر ہے پھر چھٹی گھڑی میں خطیب آجاتا ہے اور ایک حدیث میں چڑیا کا بھی ذکر ہے۔ اس لحاظ سے چھ گھڑیاں ہو جاتی ہیں اور ساتویں میں خطیب آجاتا ہے۔ لیکن نیل الاوطار میں ہے: فخروج الامام عند انتهاء السادسة۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ جمعہ قبل الزوال درست ہے اور اسی وقت آنحضرت ﷺ نے پڑھا ہے۔ حدیث بیکر پر حافظ ابن حجر نے ان لوگوں کا رد کرتے ہوئے جو ان ساعات کو بعد الزوال کہتے ہیں' یہ لکھا ہے کہ وفیه رد علٰی من زعم ان الساعات المطلوبة فی الذهاب الی الجمعة من عند الزوال لانهم كانوا يتبادرون الى الجمعة قبل القائلة۔ یعنی اس حدیث میں ان لوگوں کا رد ہے جو جمعہ کی طرف جانے کو ساعت مطلوبہ عندالزوال بیان کرتے ہیں کیونکہ صحابہ جمعہ کی طرف دوپہر کے سونے سے پہلے ہی جایا کرتے تھے۔ پس نماز جمعہ کا قبل از زوال ہونا ثابت ہو گیا۔ نووی شرح مسلم میں ہے: لا شئی من الهدی والفضیلة لمن جآء بعد الزوال۔ یعنی قربانی وغیرہ کی فضیلت اور اجر بعد زوال کے نہیں ہے۔ جن کے نزدیک جمعہ کی نماز بعد از زوال ہے' ان کے نزدیک بھی یہ ساعات مفصلہ قبل از زوال ہیں۔ کیونکہ زوال کے بعد ان کے نزدیک اذان کا وقت ہے۔

اس لیے تحفة الاحوذی میں ہے: ولا فضیلة لمن اتی بعد الزوال لان النداء یکون حینئذ ویحرم التخلف بعد النداء (جلد اول' ص ۳۵۹) یعنی زوال کے بعد آنے میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت اذان ہو گی اور اذان کے بعد پیچھے رہنا حرام ہے۔ اس لیے عہد نبوی میں لوگ قبل از زوال آجاتے تھے۔

فرشتے مسجد کے دروازوں پر اول النہار آجاتے ہیں۔ مشکوٰۃ باب التبکیر میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اذا کان یوم الجمعة وقفت الملٰئكة علٰی باب المسجد یکتبون الاول فالاول۔ یعنی "جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر سب کے نمبوار نام لکھتے ہیں۔ جو سب سے پہلے آتا ہے' اس کا پہلے اور جو اس کے بعد آتا ہے پھر اس کا نام لکھتے ہیں۔"

نسائی میں حدیث ہے: تقعد الملائكة یوم الجمعة علٰی ابواب المسجد یکتبون الناس علٰی منازلهم۔ یعنی "ملائکہ جمعہ کے روز مسجدوں کے دروازوں پر آکر

بیٹھ جاتے ہیں اور لوگوں کو ان کے درجوں کے موافق ترتیب وار لکھتے ہیں۔" دوسری حدیث میں یہ ہے کہ فاذا خرج الامام طویت الصحف فاستمعوا الخطبة۔ یعنی "جب امام آجاتا ہے تو رجسٹروں کو لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے لگتے ہیں۔" حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے جمعہ کے روز غسل کیا اور سویرے مسجد میں پہنچ گیا اور پیادہ چلا اور امام کے قریب آبیٹھا اور کوئی لغو حرکت نہ کی تو اس کے لیے ہر قدم کے بدلہ میں ایک سال کے اعمال کا ثواب ہو گا۔ روزوں کا بھی اور نمازوں کا بھی۔ (ترغیب)

پس یہ درجات اور قربانی کا ثواب حاصل کرنے کو لوگ عموماً سویرے ہی مسجد نبوی میں آجاتے تھے۔ نور اللمعه فی خصائص الجمعه للسیوطی ص-۳۰ میں ہے کہ عبداللہ بن نوفل، مخبرہ بن نوفل جو قریش قاریوں میں سے تھے، وہ جمعہ کے لیے سویرے ہی آجاتے تھے، جب کہ سورج نکل آتا تھا اور وہ ساعت مقبولہ کی تلاش کرتے تھے۔ اسی طرح مدینہ کے عوالی میں رہنے والے سویرے آجاتے تھے۔

جمعہ کے دن دوپہر کو بھی نماز درست ہے ⇦ امام شافعی نے مسند میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ذکر کیا ہے اور ابوداؤد نے قتادہ رضی اللہ عنہ سے مرسلاً روایت کیا ہے اور بیہقی نے کتاب المعرفۃ میں ابوسعید اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت کیا ہے اور شافعی نے کتاب الجمعہ میں اسانید مختلفہ سے روایت کیا ہے کہ نصف النہار کو نماز پڑھنا حرام ہے مگر جمعہ کے دن نہیں۔

اس حدیث کے تمام طرق اور اسانید مل کر حسن لغیرہ ہو جاتے ہیں (سراج منیر شرح جامع صغیر ص-۳۷۷) اور عمل محدثین و محققین کا اس کا مؤید ہے اور احادیث جبکہ بھی اس کی مؤید ہیں اور جمعہ کے دن صحابہ کا نماز جمعہ پڑھ کر سایہ تلاش کرنا تو دیواروں کا سایہ نہ ملنا، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ قبل از زوال سے لے کر بعد از زوال تک جائز ہے۔

بخاری شریف میں بعض صحابہ کی شہادت ہے کہ ثم ننصرف ولیس للحیطان ظل نستظل به یعنی "ہم جمعہ پڑھ کر فارغ ہوتے تو دیواروں کا سایہ نہ ہوتا کہ جس میں ہم آرام کرتے۔"

آپ غور کریں کہ جمعہ کے لیے قربانی وغیرہ کا ثواب بھی قبل از خروج امام حاصل کرتا ہے اور نوافل بھی پڑھتے ہیں۔ پھر امام نے آکر منبر پر بیٹھنا ہے پھر اذان ہوتی ہے' پھر امام نے خطبہ پڑھنا ہے جس میں قرآن بقدر سورہ "ق" یا سورہ "ملک" پڑھے گا۔ حمد و ثنا' درود' دعا کرے گا' تذکیر و وعظ کرے گا جس سے آواز بلند ہو گا اور غصہ ظاہر ہو گا اور خطبہ میں کوئی شخص آیا تو اس سے دو رکعت تحیۃ المسجد بھی پڑھائے گا پھر نماز جمعہ پڑھے گا جس میں سورہ جمعہ اور منافقون وغیرہ پڑھے گا پھر فارغ ہو کر دعا مانگے گا۔ اب اگر یہ تمام کام بعد از زوال ہوں تو عادۃ" اور تجربہ سے یہ محال ہے کہ دیواروں کا سایہ نہ ہو۔ اور پھر دوپہر کے کھانے اور سونے کا وقت ابھی باقی رہ جائے۔ کوئی عالم اہلحدیث اس طرح عمل کر کے اور پھر تمام امور سرانجام دے کر دکھائے تو سہی۔ ہاں اگر قبل از زوال جمعہ شروع اور زوال ہوتے ہی تمام امور سے فراغت ہو جائے تو یہ احادیث صادق آسکتی ہیں کہ وما نجد فيئا نستظل به کہ جمعہ سے فارغ ہو کر ہم زوال کے بعد کا سایہ اس قدر نہ پاتے کہ جس میں کھڑے ہو کر آرام کر سکتے' فتذکر۔

صحابہ کا اول النہار جمعہ پڑھنا ⇦ نیل الاوطار میں ہے کہ عبداللہ بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ صلى بنا عبدالله ابن مسعود الجمعة ضحى وقال خشيت عليكم الحر۔ یعنی "عبداللہ بن مسعود نے ہم کو چاشت کے وقت جمعہ پڑھایا اور یہ کہا کہ میں تمہارے لیے دوپہر کی گرمی سے ڈرتا ہوں۔" اور سعید بن سوید کے طریق سے یہ مروی ہے کہ صلى بنا معاوية الجمعة ضحى۔ یعنی "سعید نے کہا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہم کو چاشت کے وقت جمعہ پڑھایا۔" (کذا فی فتح الباری)

نیل الاوطار میں ہے وكذلك روى عن جابر وسعيد بن زيد كما في رواية احمد التي ذكرها المصنف وروى مثل ذلك ابن ابي شيبة في المصنف عن سعد بن ابي وقاص۔ یعنی اسی طرح حضرت جابر اور سعید بن زید اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ منتقی مع نیل الاوطار ج۔۳' ص۔۲۰۹ میں ہے کہ عبداللہ بن سیدان سلمی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جمعہ میں حاضر ہوا تو آپ کا خطبہ اور نماز جمعہ دوپہر سے پہلے ختم ہوئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے ساتھ جمعہ پڑھا تو آپ کا خطبہ اور نماز جمعہ نصف النہار میں ادا ہوئے۔

(یہ جو معارضہ کیا جاتا ہے کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے زوال شمس کے وقت جمعہ ادا کیا۔ یہ ہمارے خلاف اور ان آثار کے منافی نہیں ہے کیونکہ وقت ممتد ہے اور ہم دونوں طرح سے ادا کرنے کے قائل ہیں۔ گاہے چنیں و گاہے چناں۔)

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جمعہ ادا کیا تو آپ کا خطبہ اور نماز زوال شمس کے وقت تھے۔ فما رایت احدا عاب ذلک ولا انکرہ رواہ الدارقطنی والامام احمد فی روایۃ ابنہ عبد اللہ واحتج بہ وقال وکذلک روی عن ابن مسعود وجابر وسعید ومعاویۃ انہم صلوھا قبل الزوال۔ یعنی عبداللہ بن سیدان کہتے ہیں کہ میں نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی وقت جمعہ ادا کرنے پر عیب یا انکار کیا ہو۔

پس یہ اجماع صحابہ ہے کیونکہ نماز جمعہ شعار اسلام سے ہے جو مسجد نبوی میں سب کے سامنے قبل از زوال پڑھا گیا ہے' جس سے کسی نے انکار نہیں کیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ وہ احادیث جو تبکیر پر دال ہیں' ان سے قبل زوال جمعہ پڑھنا مراد ہے۔ پس تعامل صحابہ شاہد ہے اور جمہور جو تاویل باطلہ سے ان احادیث کی تکذیب کرتے ہیں' وہ قابل التفات نہیں ہے۔ در مع الحق حیث دار۔

عید اور جمعہ کا اجتماع اور تداخل ⇦ عید جمعہ کے دن آجائے تو دو عیدیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ جمعہ بھی عید ہے۔ لقولہ علیہ السلام ان ھذا یوم عید جعلہ اللہ للمسلمین (الحدیث' رواہ ابن ماجہ) یعنی دن عید کا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

جمعہ کے دن عید الفطر یا عید الاضحیٰ آجائے تو جمعہ فرض نہیں رہتا' اس کی رخصت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد امارت میں دو عیدیں جمع ہو گئیں (عید اور جمعہ) ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے عید کے لیے نکلنے میں تاخیر کر دی کہ دن بہت چڑھ گیا۔ پھر عید کے لیے باہر نکلے اور خطبہ دیا پھر منبر سے اترے اور نماز پڑھی اور لوگوں کو جمعہ نہ پڑھایا۔ وہب بن کیسان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ واقعہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے سنت کے مطابق کام کیا ہے۔ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے عطاء سے

یہ روایت کیا ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عیدالفطر اور جمعہ دونوں جمع ہو گئے تو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دونوں عیدیں ایک دن میں جمع ہو گئی ہیں پھر دونوں کو اکٹھا کر کے پڑھا۔ پس سویرے اول النہار صرف دو رکعات پڑھ لیں اور اس پر کوئی نماز زیادہ نہ کی' یہاں تک کہ عصر کے وقت نماز عصر پڑھ لی۔ ان دونوں کی سندیں صحیح ہیں جو قابل حجت ہیں۔

ان روایتوں سے ظاہر ہوا کہ جمعہ کے دن عید آجائے تو جمعہ کی فرضیت ساقط ہے اور وہ عید میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی مسجد میں جا کر صبح کی دو سنتیں پڑھ لے تو تحیة المسجد کی دو رکعت کی جگہ وہ کافی ہو جاتی ہیں۔ جمعہ اور عید دونوں اکٹھا لوا کرنے اور ایک نماز کا دوسری میں داخل کرنے پر تمام صحابہ کا اجماع سکوتی ہے کیونکہ اجماع سکوتی کی تعریف یہ ہے کہ ایک مجتہد کوئی مسئلہ عام ظاہر کرے یا کوئی کام بلوئی عام میں کرے اور اس پر دیگر مجتہدین سکوت کریں اور انکار نہ کریں تو وہ اجماع سکوتی ہے اور صحابہ کا اجماع بالاتفاق حجت ہے۔

پس نماز عید اور جمعہ کا تداخل بالاجماع صحیح ہے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا تعامل اور صحابہ کی تصدیق ان کا ذاتی فعل نہیں ہے بلکہ وہ سنت نبوی ہے۔ (نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ہم جمعہ پڑھیں گے۔ ہاں جو لوگ دور سے آتے ہیں' ان کے لیے رخصت ہے کہ جمعہ پڑھنے نہ آئیں) چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اصاب السنة فرما کر اس کی تصدیق کی ہے۔ جب جمعہ کی رخصت ہو گئی تو ظہر بھی باقی نہ رہی کیونکہ جمعہ کے دن نماز جمعہ مستقل فرض ہے۔ اگر وہ ساقط ہو جائے تو ظہر فرض ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس واسطے ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ظہر نہ پڑھی اور عصر کی نماز پڑھ لی تھی۔

نیل الاوطار ج-۳' ص-۲۸۳ میں ہے: ظاهره انه لم يصل الظهر وفيه ان الجمعة اذا سقطت بوجه من الوجوه المسوغة لم يجب على من سقطت عنه ان يصلى الظهر۔ یعنی اس حدیث کی ظاہر دلالت یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ظہر نہیں پڑھی.....

جب جمعہ کو عید قرار دیا گیا اور نماز عید نماز جمعہ کی جگہ کفایت کر گئی تو اس کا وقت بھی وہی ہو گا جو عید کا ہے۔ چنانچہ مولانا وحید الزماں مرحوم نے نزل الابرار

ص-۱۵۲ پر لکھا ہے ووقتها من حين ارتفاع الشمس قدر رمح الى انتهاء وقت الظهر-

خطبہ جمعہ داخل نماز جمعہ نہیں ہے ⇦ بعض علماء خطبہ جمعہ کو نماز جمعہ کا جزء قرار دے کر داخل نماز جمعہ ٹھہرا رہے ہیں- حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے- خطبہ جمعہ داخل نماز جمعہ نہیں ہے- چنانچہ فتاویٰ نذیریہ جلد اول' ص-۳۲۷ پر اس کی تصریح موجود ہے اور فتح الربانی وغیرہ سے یہ نقل کیا ہے کہ خطبہ جمعہ کے فرض ہونے اور اس کے داخل نماز ہونے پر کتاب و سنت سے کوئی دلیل صحیح وارد نہیں ہے- ہاں آنحضرت ﷺ کا خطبہ پڑھنا اور اس پر استمرار اور مداومت فرمانا ثابت ہے لیکن یہ وجوب کی دلیل نہیں ہے- چنانچہ نماز عید کے خطبہ میں بھی یہ ثابت ہے لیکن وہ بالاتفاق واجب نہیں ہے- اگر خطبہ جمعہ نماز جمعہ کی جزء قرار پاتا تو خطبہ کے فوت ہونے پر نماز جمعہ بھی فوت ہو جاتی یا دو رکعت جن کے قائم مقام خطبہ قرار دیا جاتا ہے' پھر قضاء" پڑھنی پڑتی- حالانکہ یہ تعامل احادیث مرفوعہ سے ثابت نہیں ہے بلکہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ جس نے ایک رکعت پالی اس نے جمعہ پا لیا' فتدبر-

اس سے ظاہر ہے کہ اس کے لیے خطبہ جمعہ داخل نماز جمعہ نہیں ہے اور نہ اس پر کتاب و سنت سے کوئی دلیل ناطق ہے اور جن اقوال سے خطبہ جمعہ کو داخل نماز جمعہ سمجھا جاتا ہے' وہ قابل حجت نہیں ہیں- فرض ثابت کرنے کے لیے قطعی دلیل کی ضرورت ہے' ودونه خرط القتاد-

ایک اذان جمعہ کا ثبوت احادیث سے ⇦ بخاری شریف "باب الاذان یوم الجمعة" میں ہے عن السائب بن يزيد قال كان النداء يوم الجمعة اوله اذا جلس الامام على المنبر على عهد النبي صلى الله عليه وسلم وابى بكر وعمر- یعنی "سائب بن یزید ؓ نے بیان کیا کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی ہر سہ زمانوں میں جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا تھا-" فتح الباری میں ابن خزیمہ کی روایت سے اتنا جملہ زیادہ ثابت ہے- كان ابتداء النداء الذى ذكره الله فى القرآن يوم الجمعة- یعنی جس اذان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے' اس کی ابتداء دن جمعہ اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر جلوس فرماتا تھا-

یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ جمعہ کے دن عہد رسالت اور زمانہ صدیق و فاروق میں صرف ایک ہی اذان تھی اور وہ اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر جلوس کرتا تھا اور یہ اذان پہلی تھی اور یہ وہی اذان تھی جس کا ذکر قرآن میں سورہ جمعہ کی آیت نومی میں ہے۔ اسی کا ثبوت ہم نے شروع مضمون میں قرآن سے دیا ہے۔ پس قرآن اور حدیث مطابق ہو گئے۔

اذان عثمانی دوسری اذان ہے ⇦ چنانچہ صحیح بخاری میں بھی حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان التاذین الثانی یوم الجمعة امر به عثمان حین کثر اهل المسجد وکان التاذین یوم الجمعة حین یجلس الامام۔ یعنی "جمعہ کے دن دوسری اذان (جو اب اذان مسنون سے پہلے ہے) کا حکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس وقت دیا جب نمازیوں کی کثرت ہو گئی اور آبادی بڑھ گئی ورنہ دن جمعہ کے اذان وہی تھی جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت ہوتی تھی۔

اس حدیث سے جمعہ کے دن دو اذانیں عہد عثمانی میں بن گئی ہیں۔ ایک منبری اذان' یہ تو پہلی ہے اور ایک عثمانی' یہ دوسری ہے۔ اذان منبری باعتبار مشروعیت کے پہلی ہے اور اذان عثمانی باعتبار احداث و اجراء کے دوسری ہے۔ لیکن وجود کے لحاظ سے اس کو پہلے کہا جاتا ہے۔ کیونکہ منبری سے یہ پہلے کہی جاتی ہے اور منبری اذان کے بعد کہنے کی اور بڑھانے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہاں بعض روایات میں راویوں نے اذان عثمانی کو اول بھی کہہ دیا ہے۔ سو یہ اسی اعتبار سے کہا ہے کہ منبری اذان سے پہلے کہی جاتی ہے۔ چنانچہ نیل الاوطار ج۔ ۳' ص۔ ۲۴۳ میں ہے: فی روایة فامر عثمان بالنداء الاول۔ یعنی عثمان رضی اللہ عنہ نے اذان اول کا حکم دیا۔ اس پر امام شوکانی فرماتے ہیں واولا باعتبار کون فعله مقدما علی الاذان والاقامة۔ یعنی اس روایت میں اذان اول اس کو اس اعتبار سے کہا ہے کہ یہ اذان منبری اور اقامت نماز سے پہلے کہی جاتی ہے۔

پس باعتبار وجود اب پہلی ہے اور باعتبار مشروعیت کے دوسری ہے۔ اس لیے ابن عمر رضی اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ الاذان الاول یوم الجمعة بدعة۔ یعنی اذان منبری سے پہلے جو اذان کہی جاتی ہے' یہ بدعت ہے۔ (نیل الاوطار ج۔ ۳' ص۔ ۲۴۳)

تکبیر یعنی اقامت کو بھی اذان کہتے ہیں ⇦ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی جامع

صحیح بخاری میں یہ باب منعقد کیا ہے کہ "باب کم بین الاذان والاقامۃ" یعنی ازان اور تکبیر کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیے۔ اس کے ثبوت کے لیے یہ حدیث ذکر فرمائی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بین کل اذانین صلٰوۃ لمن شاء۔ یعنی "ہر دو ازانوں کے درمیان نماز ہے جو شخص پڑھنا چاہے پڑھ لے۔"

اس حدیث میں دو ازانوں سے مراد ایک تو ازان معروف ہے اور دوسری اقامت یعنی نماز کی تکبیر مراد ہے جس کے کلمات مثل ازان ہیں اور وہ بلند آواز سے کہی جاتی ہے اور اس سے مسجد کے نمازیوں کو اعلام کرنا مقصود ہے۔ اسی مشابہت کی بنا پر اس کو لفظ ازان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر ازانین سے مراد ازان معروف اور اقامت نہ ہو تو حدیث کی باب سے مطابقت نہیں ہوتی اور اس حدیث سے بھی اس کی تائید ہے۔ فرمایا: ما من صلٰوۃ مفروضۃ الا وبین یدیھا رکعتان۔ یعنی "ہر نماز فرض سے پہلے دو رکعت ہیں۔"

اب دونوں احادیث کا مطلب یہ ہوا کہ ازان کے بعد فرض نماز قائم کرنے سے پہلے نفلی نماز کم از کم دو رکعت ہے جو شخص پڑھنا چاہے' وہ پڑھ لے۔ بڑا نازک موقعہ خطبہ جمعہ کا ہے جس کا سننا فرض ہے۔ اس وقت بھی ازان جمعہ عندالمنبر کے بعد جبکہ خطبہ ہو رہا ہو' کوئی شخص نمازی آجائے تو اس کو بھی قبل از تکبیر دو رکعت پڑھنی پڑھیں گی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین۔ علاوہ ازیں ازان مغرب کے بعد بھی نازک وقت ہے۔ اس وقت بھی صحابہ ازان کے بعد نماز مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھ لیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کنا بالمدینۃ فاذا اذن المؤذن لصلٰوۃ المغرب ابتدروا السواری فرکعوا رکعتین۔

بہرکیف حدیث بین کل اذانین صلٰوۃ میں ازانین سے مراد ازان اور اقامت ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اقامت کا شمار ازانوں کے ساتھ ہو تو اس کو بھی ازان سے تعبیر کر لیا جاتا ہے۔ تنقیح الرواۃ جلد اول' ص ۱۱۸ میں ہے: واکثر علی ان المراد بالاذانین الاذان والاقامۃ لان الاذان یطلق علی الاقامۃ۔ یعنی "اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ ازانین سے ازان اور تکبیر مراد ہے کیونکہ ازان کا اطلاق

اقامت پر کیا جاتا ہے۔

خود حافظ عنایت اللہ صاحب گجراتی نے اپنے رسالہ "قرع اللازئین" کے ص-۵ پر ایک حدیث ذکر کی ہے جس میں لفظ اذان اور اقامت وارد ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اذان سے الصلوٰۃ جامعۃ مراد ہے۔ عرفی اذان مراد نہیں ہے اور اقامت سے صف بندی مراد ہے۔"

بس اسی طرح احادیث اذان جمعہ میں اذان عثمانی کی مختلف تعداد وارد ہے۔ کسی میں اس کو اذان اول کہا گیا ہے۔ کسی میں ثانی اور کسی میں ثالث۔ ان میں محدثین نے یہ مطابقت دی ہے کہ حدیث میں اقامت کو بھی اذان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے اذان عثمانی کو اذان ثالث کہا گیا ہے۔

تیسری اذان جمعہ کی نماز کے لیے اقامت کہنا ہے ⇦ بخاری شریف میں ہے' حضرت سائب ﷺ فرماتے ہیں: فلما کان عثمان وکثر الناس زاد النداء الثالث علی الزوراء۔ یعنی "حضرت عثمان ﷺ خلیفہ ہوئے اور لوگوں کی آبادی بڑھ گئی تو انہوں نے تیسری اذان زوراء پر بڑھا دی۔"

طبرانی کی روایت میں فامر بالنداء الاول علی دار له یقال لها الزوراء۔ یعنی "حضرت عثمان ﷺ نے پہلی اذان زوراء پر کہنے کا حکم دیا۔"

سائب بن یزید ﷺ سے ہی تیسری روایت ہے کہ ان التاذین الثانی یوم الجمعة امر به عثمان حین کثر اهل المسجد۔ یعنی "جمعہ کے دن دوسری اذان کہنے کا حضرت عثمان ﷺ نے حکم دیا جبکہ مسجد میں آنے والے بڑھ گئے۔

اب ان تین روایتوں کی تطبیق محدثین اور فقہاء نے یہ دی ہے کہ ولا منافاة لانه سمی ثالثا باعتبار کونه مزیدا علی الاذان والاقامة واولا باعتبار کونه مقدما علیهما وثانیا باعتبار الاذان الحقیقی لا الاقامة۔ (تنقیح الرواۃ جلد اول' ص-۲۴۳) یعنی "ان روایتوں میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اذان عثمانی کو تیسری اذان اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ یہ اذان منبری اور اقامت پر زائد ہے۔ اس لحاظ سے اس کا تیسرا درجہ ہے اور دوسری اس اعتبار سے کہ جمعہ کی اذان حقیقی پہلی ہے کیونکہ اس کو شارع علیہ السلام نے پہلے مشروع کر کے جاری کیا۔ اس شمار میں اقامت کو مد نظر

نہیں رکھا گیا' صرف اذانوں کا شمار کیا گیا۔ اور پہلی اس کو اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ یہ اذان جمعہ اور اقامت پر مقدم ہے۔"

نیل الاوطار ج۔۳' ص۔۲۴۳ میں ہے: ولا منافاة لانه سمی ثالثا باعتبار کونه مزیدا و اولا باعتبار کون فعله مقدما علی الاذان والاقامة وثانیا باعتبار الاذان الحقیقی لا الاقامة۔ اسی طرح فتح الباری وغیرہ دیگر کتب حدیث میں ہے۔ مولانا احمد علی حنفی سہارنپوری صاحب حاشیہ بخاری میں عینی سے ناقل ہیں کہ لن عثمان ھو زاد الاذان الثالث الذی ھو الاول فی الوجود ولکنه ثالث باعتبار شرعیته باجتهاد عثمان وموافقة سائر الصحابة له بالسکوت وعدم الانکار فصار اجماعا سکوتیا والاذان الثالث فی الوجود ھو الاقامة۔ (کذا فی العینی جلد اول' ص۔۴۴) یعنی "تیسری اذان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہلوائی ہے' جو وجود میں پہلی ہے اور اجتہادی مشروعیت کے لحاظ سے تیسری ہے اور گنتی میں وجود کے لحاظ سے اقامت تیسری ہے۔" عینی میں اسی طرح ہے۔

اس تصریح کے بعد اب گنتی یوں ہے۔ اذان عثمانی پہلی اور اذان منبری مسنون دوسری اور اقامت تیسری ہے۔ اور مشروعیت کے لحاظ سے شمار اس طرح ہے۔ اذان منبری پہلی اور اقامت دوسری اور اذان عثمانی تیسری۔ پس یہ شمار دو اعتبار سے ہے۔ اصل اذان پہلی وہ ہے جو عند جلوس الامام علی المنبر ہے۔ چنانچہ بخاری کی حدیث میں صاف الفاظ یہ ہیں:

ان الاذان یوم الجمعة کان اوله حین یجلس الامام یوم الجمعة علی المنبر فی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وابی بکر وعمر۔ یعنی "بیشک عہد نبوی میں پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب جمعہ کے دن امام خطبہ کے لیے منبر پر بیٹھتا تھا اور ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کے زمانہ میں بھی اسی طرح ہوتا تھا۔"

اس پر مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم حاشیہ بخاری میں فرماتے ہیں کہ "تیسری اذان اس کو اس لیے کہا کہ تکبیر بھی اذان ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد سے پھر یہی طریقہ جاری ہو گیا کہ جمعہ میں ایک پہلی اذان ہوتی ہے پھر جب امام منبر پر جاتا ہے تو دوسری اذان دیتے ہیں پھر نماز شروع کرتے وقت تیسری اذان یعنی تکبیر کہتے ہیں۔ گو

حضرت عثمان کا فعل بدعت نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ وہ خلفاء راشدین میں سے ہیں مگر انہوں نے یہ اذان ایک ضرورت سے بڑھائی کہ مدینہ کی آبادی دور دور تک پہنچ گئی تھی اور خطبہ کی اذان ان سب کے جمع ہونے کے لیے کافی نہ تھی۔ آتے آتے ہی نماز ختم ہو جاتی مگر جہاں یہ ضرورت نہ ہو (جیسے دیہات میں یا جہاں تعدد جمعہ ہے مثلاً شہر اور قصبہ میں) وہاں بموجب سنت نبوی صرف خطبہ ہی کے وقت اذان دینا چاہیے اور خوب بلند آواز سے نہ کہ جیسا جاہل لوگ خطبہ کے وقت آہستہ سی اذان دیتے ہیں۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نکالا تیسری اذان (عثمانی) بدعت ہے۔ (مسجد میں بدعت ہے ضرورت کے وقت خارج از مسجد جائز ہے۔) یعنی ایک نئی بات ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نہ تھی۔ اب اس سنت نبوی کو سوائے اہلحدیث (غرباء) کے اور کوئی بجا نہیں لاتے۔ جہاں دیکھو سنت عثمانی کا رواج ہے۔" الخ

میں کہتا ہوں کہ پہلے تو عمل بدلا تھا' اب عقیدہ بھی بدل گیا ہے کہ یہ کہنے لگے ہیں کہ اذان عثمانی اذان نبوی ہے۔ جو مستقل چلی آ رہی ہے۔ اذان عثمانی تو اور ہی تھی جو بند ہو گئی تھی۔ کیسا غلط اور باطل عقیدہ ہے جس کا اسلامی دنیا میں کوئی ایک بھی قائل نہیں ہے۔ مرزا قادیانی کی طرح سب سے علیحدہ اور انوکھی بات ہے۔

حضرت عطاء تابعی فرماتے ہیں: ولا یؤذن غیر اذان واحد۔ "کہ ایک اذان کے علاوہ اور دوسری کوئی اذان نہ تھی" اور اذان عثمانی کو وہ ایک پکار تصور کرتے ہیں' جس سے لوگوں کو بلایا جاتا تھا' اذان معروف نہ تھی۔ اگر مستقل دو اذانیں ہوتیں تو حضرت عطاء صرف ایک اذان نہ فرماتے' فتذکر۔ امام بخاری نے جمعہ کے دن ایک مؤذن کے اذان دینے کے بارے میں باب باندھا ہے۔ اس کے تحت ذکر فرماتے ہیں کہ ولم یکن للنبی صلی اللہ علیہ وسلم مؤذن غیر واحد وکان التاذین یوم الجمعۃ حین یجلس الامام۔ یعنی "ایک مؤذن کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا کوئی مؤذن نہ تھا اور وہ جمعہ کے دن اس وقت اذان کہتا تھا جس وقت امام منبر پر بیٹھتا ہے۔"

اس سے یہ ظاہر ہے کہ جمعہ کے دن اذان ایک ہی تھی کیونکہ مؤذن دو ہوتے تو اذانیں دو ہوتیں۔ جیسے رمضان میں سحری اور اذان صبح کے لیے دو مؤذن تھے۔ چنانچہ

حدیث میں ہے: کان لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مؤذنان۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے دو مؤذن تھے۔" ایک بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ۔ تاکہ مغالطہ نہ پڑے۔ اب اگر جمعہ کی بھی دو اذانیں مستقل ہوتیں۔ ایک نماز کی اور دوسری خطبہ کی تو مؤذن بھی ضرور دو ہوتے۔ تاکہ پہلی اور دوسری اذان کا فرق نمایاں ہوتا اور مغالطہ نہ پڑتا۔ اذ لیس فلیس۔ فافهم وتدبر ولا تکن من المعاندین۔

دو اذان کے قائلین کے چند مغالطات اور ان کے جوابات ⇦ جمعہ کے دن دو اذانیں مستقل اور بمع اذان عثمانی تین اذان کا ثبوت کسی حدیث میں اور قول صحابی اور قول تابعی میں یا اقوال ائمہ محدثین ہرگز موجود نہیں ہے۔ البتہ اذان عثمانی رائج ہونے کے بعد دو اذانیں جمعہ کے دن عام ملک میں مستقل صورت اختیار کر گئیں، جن کی علماء اسلام یوں تفصیل کرتے چلے آئے ہیں کہ اذان عندا لخطبہ مسنون اذان اور وقتی ہے اور اس سے پہلے جو اذان ہوتی ہے یہ اذان عثمانی اور بوجہ مسجد میں داخل ہونے کے "ہشامی" ہے۔ پھر اس کو بعض بدعت اور بعض سنت خلفاء قرار دیتے رہے ہیں۔ لیکن دو اذانوں کے سنت نبوی ہونے کا کوئی شخص سلف صالحین اور ائمہ متقدمین میں سے قائل نہیں ہوا۔ اب جبکہ یہ رواج پختہ ہو گیا۔

بعض علماء نے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ جمعہ کے دن دو اذانیں مستقل مشروع اور سنت نبوی ہیں۔ جیسے نماز ظہر احتیاطی شک اور تردد کی بنا پر متاخرین علماء حنفیہ نے ایجاد کی تھی۔ جب اس کا رواج پھیل گیا تو ایک حنفی نے جمعہ کے دن چھ نمازیں مستقل ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ چنانچہ احتیاط الظہر کے نام سے ایک کتاب مولوی محمد حسن فیض پوری حنفی نے شائع کی ہے۔ جس میں اس کی تفصیل ہے۔ ایسا ہی دو اذانوں کے قائلین نے کیا ہے۔ اس مذہب کے موجد مولوی حافظ عنایت اللہ گجراتی ہیں اور مؤید مولوی عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی ہیں، جو پہلے خود یہ فتویٰ دے چکے ہیں کہ جمعہ کے دن ایک ہی اذان سنت نبوی ہے جو عندا لخطبہ ہے اور پہلی اذان عثمانی ہے۔ مگر اب ان کو حافظ عنایت اللہ صاحب نے اپنے سانچہ میں ڈھال لیا ہے۔

بہرکیف یہ مذہب نیا پیدا ہو رہا ہے، جس کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔ البتہ یہ لوگ عالم ہیں اور عالموں کا یہ شیوہ ہے کہ جس خیال پر جم جائیں، اسی کے مطابق کتاب

و سنت کے نصوص کو اپنے خیالات اور توجیہات کا لباس پہنا کر ان کو دلائل کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں جو حقیقت میں وہ مغالطات ہوتے ہیں۔ جیسے عموماً غالی مذہب کے لوگوں کی عادت ہے۔ مثلاً مرزائی اور بریلوی غالیوں کی یہی عادت ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کو اپنے اختراعی خیالات میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ کما لا یخفی علی اہل العلم۔ یہی ان حضرات نے کیا ہے کہ اپنی تحریروں میں عوام کے سامنے اپنے دعویٰ پر دلائل دیتے ہیں جو صاف مغالطات ہیں۔ چنانچہ چند مغالطات کا پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔ تمام مغالطات کے ذکر کرنے اور جواب دینے کے لیے تو مستقل کتاب کی ضرورت ہے' جس کو شائع کرنے کے لیے بندہ کے پاس مالی وسعت نہیں ہے' ورنہ ان کا جواب کوئی مشکل نہیں ہے۔

پہلا مغالطہ ⇦ آیت جمعہ میں نداء سے مراد علماء محدثین و فقہاء نے اذان وقتی عندالخطبہ مراد لی ہے۔ اذان اول جس کو اذان عثمانی کہا جاتا ہے مراد نہیں لی۔ مگر مستقل دو اذانوں کے قائلین کے دماغوں میں اذان وقتی اور اذان خطبہ دو اذانیں سمائی ہوئی ہیں' اس لیے وہ مجبور ہیں کہ علماء محدثین کی تصریحات کو پس پشت ڈال کر اپنا اختراعی مطلب مراد لیں۔

چنانچہ مولانا گجراتی صاحب لکھتے ہیں: "جن ذی علموں نے اس سے مراد اذان خطبہ مراد لی ہے' ان کے دماغوں سے چونکہ اذان وقت نکل چکی ہوئی ہے' اس لیے وہ اس بیان پر مجبور ہوئے مگر ہمارے نزدیک چونکہ اذان وقت ثابت ہے اس لیے ہم مجبور نہیں کہ آیت کے صریح بیان میں کسی قسم کا کوئی تصرف کر سکیں (تا آخر) پس اذان سے وہ اذان مراد ہے جو کہ نزول آیت کریمہ سے پیشتر متعارف ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اذان وقت ہے۔ اذان خطبہ تو اس کے نزول سے پیشتر ہرگز متعارف نہیں کہ وہ بعد میں مشروع ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ ہرگز مراد نہیں ہے۔" (قرع الاذنین ص ۳۸)

جب انسان گمراہ ہوتا ہے تو پہلے علماء سلف پر زبان درازی کرتا ہے۔

ہر کہ خدا خواہد پردہ کس درد
میلش اندر طعنہ پاکاں برد

چنانچہ جتنے فرقے گمراہ ہیں' انہوں نے ایسا ہی کیا ہے پھر اس اختراعی مسئلہ کو

رواج دینے والے بغیر اس کے کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مولانا گجراتی صاحب علماء سلف کے دماغوں سے اذان وقتی نکل گئی' بتلاتے ہیں۔ حالانکہ اذان وقتی وہی ہے جو عندا لخطب ہے۔ اس کے علاوہ جمعہ کے دن کوئی اذان وقتی ثابت نہیں ہے۔ ہاں اذان عثانی ہے جو گجراتی دماغ میں اذان وقتی بن کر منقش ہو گئی ہے۔ تفسیر ابن کثیر مصری جزء رابع' ص-۳۶۶ میں ہے: المراد بهذا النداء هو النداء الثانی الذی یفعل بین یدی رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا خرج فجلس علی المنبر فانه کان حینئذ یؤذن بین یدیه فهذا هوالمراد۔ یعنی "آیت جمعہ میں نداء سے مراد دوسری اذان ہے جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے کہی جاتی تھی جبکہ آپ منبر پر جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔"

پھر فرماتے ہیں: فاما النداء الاول الذی زاده امیر المؤمنین عثمان بن عفان فانما کان هذا لکثرة الناس کما رواه البخاری حیث قال عن السائب بن یزید قال کان النداء یوم الجمعة اوله انا جلس علی المنبر علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکر و عمر۔ یعنی "اس منبری اذان سے پہلے جو اذان ہے' اس کو امیرالمومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے زیادہ کیا جبکہ لوگوں کی آبادی بڑھ گئی تھی۔ جیسا کہ امام بخاری نے سائب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جمعہ کے دن پہلی اذان عہد نبوی اور صدیقی اور فاروقی میں منبری تھی' پھر عثمان رضی اللہ عنہ نے زوراء پر اذان بڑھائی ہے۔"

پھر حافظ ابن کثیر نے حضرت مکحول سے نقل کیا ہے کہ ان النداء کان فی الجمعة مؤذن واحد حین یخرج الامام ثم تقام الصلوٰة وذالک النداء الذی یحرم عنده الشراء والبیع اذا نودی به۔ یعنی "جمعہ کے دن اذان ایک ہی تھی جب امام نکلتا تھا پھر تکبیر نماز کے لیے ہوتی تھی اور یہ وہی نداء ہے جس کے نزدیک خرید و فروخت حرام ہو جاتی ہے۔ فامر عثمان ان ینادی قبل خروج الامام حین یجتمع الناس۔ یعنی "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا کہ لوگوں کے جمع ہونے اور امام کے نکلنے سے پہلے اذان کہی جائے۔

ان عبارتوں سے صاف واضح ہے کہ عہد نبوی اور صدیقی اور فاروقی میں اذان صرف ایک ہی تھی اور وہی آیت جمعہ میں مراد ہے اور دوسری اذان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

نے بڑھا کر اس سے پہلے کر دی ہے۔ یہ عبارتیں ایسی صاف اور بین ہیں کہ مولانا گجراتی کو دیگر عبارتوں کی طرح ان میں تاویل اور ہیر پھیر کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تفسیر جامع البیان میں آیت جمعہ پر لکھا ہے کہ اذن لها عند قعود الامام على المنبر۔ یعنی نماز کی وقت اذان امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت کی جاتی تھی۔ اسی طرح تمام تفاسیر معتبرہ میں لکھا ہے۔ مغنی ابن قدامہ (ج۔۲' ص۔۲۹۷) میں اذان عندا لخطبہ پر لکھا ہے: وهذا الاذان الذى يمنع البيع ويلزم السعى۔ یعنی "یہی وہ اذان ہے جو نماز کی طرف چلنا اور سعی لازم کرتی ہے اور بیع کو حرام کرتی ہے۔" اور شرح میں لکھا ہے: واما قوله هذا الاذان الذى يمنع البيع ويلزم السعى فلان الله تعالى امر بالسعى ونهى عن البيع۔ یعنی "مصنف نے جو یہ لکھا ہے کہ اذان سے وہ اذان مراد ہے جو بیع کو حرام اور سعی کو لازم کرتی ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اذان کہی جائے تو بیع چھوڑ کر نماز جمعہ کی طرف چلو۔

اسی طرح سب علماء نے لکھا ہے۔ لیکن مولانا گجراتی ان تمام علماء کے دماغوں کو قاصر قرار دے کر خود مجمع البلاغ کے مدعی بنتے ہوئے آیت جمعہ سے اذان منبری مراد نہیں لیتے بلکہ اس سے پہلی اذان مراد لیتے ہیں جس کا وجود عہد نبوی میں نہ تھا اور آج اس چودھویں صدی میں ان کو یہ الہام ہوا ہے جو بالکل مردود ہے۔ کیونکہ اذان وقتی یہی اذان منبری ہے۔ دو اذانیں عہد نبوی میں رائج ہونا کسی صریح دلیل سے ثابت نہیں ہیں اور نہ کوئی اس کا قائل ہوا ہے۔

تفسیر خازن (ج۔۴' ص۔۲۶۵ مصری) میں ہے: واراد بهذا النداء الاذان عند قعود الامام على المنبر للخطبة لانه لم يكن فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم نداء سواه كان اذا جلس صلى الله عليه وسلم على المنبر اذن بلال۔ یعنی "آیت جمعہ میں نداء سے مراد وہ اذان ہے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت دی جاتی ہے کیونکہ عہد نبوی میں اس اذان کے سوا نماز جمعہ کے لیے اذان نہ تھی۔ نبی ﷺ منبر پر بیٹھتے تھے تو بلال رضی اللہ عنہ اذان کہتے تھے۔ پھر خازن میں حدیث سائب رضی اللہ عنہ مذکور ہے' جس سے یہ دعویٰ ثابت کیا گیا ہے کہ عہد نبوی میں ایک ہی اذان تھی۔

مغالطہ دوم ⇦ گجراتی بزرگ لکھتے ہیں۔ "اذان سن کر اسے اسعد بن زرارہ ؓ کی اذان یاد آجایا کرتی تھی جسے انہوں نے اپنے قائم کردہ جمعہ میں پکارا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اذان وقت ہے جو کہ سنہ ۱ھ میں شروع ہوئی۔ اذان خطبہ تو سنہ ۳ھ میں شروع ہوئی ہے۔" (ص ۱۷)

جمعہ کے دن دو اذانوں کا وجود زوال کے بعد ثابت ہی نہیں ہے اور یہ تاریخی ثبوت کسی مستند کتاب سے منقول نہیں ہے' صرف اپنا ذاتی اندازہ ہے جو ناقابل سماعت ہے۔ وہی اذان وقت' اذان عندالخطبہ ہے اور کعب ؓ کا اسعد بن زرارہ ؓ کے لیے جو ترحم عند سماع الاذان ہے' اس میں کوئی تصریح نہیں ہے کہ وہ کون سی اذان کے وقت ترحم کرتے تھے۔ عثمانی اذان کے وقت یا اذانِ خطبہ کے وقت یا آپ کی مزعومہ اذان کے وقت' کیونکہ تینوں کا تعلق جمعہ سے ہو سکتا ہے اور کعب ؓ کو اسعد ؓ کی اذان یاد نہیں آیا کرتی تھی بلکہ جمعہ یاد آیا کرتا تھا' کیونکہ ترحم کے بعد "لانه جمع بنا" صاف مذکور ہے۔ پس جب تک آپ عہد نبوی میں دو اذانوں کا ہونا کسی صریح دلیل سے ثابت نہ کریں اور اذان وقت جمعہ کا سنہ ۱ھ میں ہونا اور اذان عندالخطبہ کا سنہ ۳ھ میں ہونا کسی صحیح تاریخ سے ظاہر نہ کریں اور کعب ؓ کا ترحم کسی خاص اذان کے وقت ثابت نہ کریں اور کسی صریح لفظ سے ترحم کرنا اذان اسعد ؓ یاد آنے پر ظاہر نہ کریں' تب تک یہ آپ کا مغالطہ تصور ہو گا یا ذوقی دلیل ہو گی۔ شرعی دلیل متصور نہ ہو گی۔ اکثر آپ کے دلائل وجدانی ہیں۔ آپ نے کوئی صریح دلیل کسی دعویٰ متنازعہ پر پیش نہیں کی ہے۔

مغالطہ سوم ⇦ مولانا گجراتی صاحب نے فتح الباری اور صحیح ابن خزیمہ وغیرہ سے سائب بن یزید ؓ کی ایک روایت بایں الفاظ ذکر کی ہے: کان الاذان علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکر وعمر اذانین یوم الجمعة۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) ہر سہ کے زمانہ میں جمعہ کے دن دو اذانیں ہوا کرتی تھیں۔" (ایک اذان وقت' ایک اذان خطبہ) (ص ۸۶)

یہ حدیث ظاہر میں تو دلیل بن سکتی ہے مگر جملہ روایات کے الفاظ سامنے رکھنے سے اور محدثین کی تشریحات ساتھ ملانے سے یہ مطلب غلط ہو جاتا ہے اور پھر یہ دلیل

دلیل معتبر نہیں رہتی بلکہ مغالطہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اقامت کو بھی بعض جگہ اذان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے' کیونکہ وہ بھی اعلام ہے۔ چنانچہ مجمع الزوائد جلد اول' ص-۳۳۱ میں ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:
انما الاذان الاول لتیسر اہل الصلٰوۃ لصلٰوتھم (الی آخرہ) واذا سمعتم الاقامۃ فبادروا التکبیرۃ الاولی - اس میں اذان کو اول باعتبار اقامت کے کہا کہ وہ اذان دوسری ہے۔ چنانچہ گجراتی رسالہ اذان کے ص-۵ میں ایک حدیث بایں الفاظ مذکور ہے: ثم اذن مؤذن واقیمت الصلٰوۃ- اس پر مولوی گجراتی نے ص-۶ پر لکھا ہے:
"اذان سے "الصلٰوۃ جامعہ" مراد ہے۔ عرفی اذان ہرگز مراد نہیں ہے۔"

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث مذکور میں اذانین سے دو اذانیں عرفی مراد نہیں ہیں' بلکہ یہ اقامت کو اذان کہا گیا ہے اور نفس اعلام میں اشتراک ہونے کے باعث اقامت کو اذان عرفی سے ملا کر تغلیباً اذان کہہ دیا ہے۔ جیسے فرمایا: بین کل اذانین صلٰوۃ۔ اذان اور اقامت کے درمیان نماز نفل ہے۔

امام ابن خزیمہ اس حدیث اذانین یوم الجمعہ کو لا کر اپنی صحیح میں یہ فرماتے ہیں:
قال ابن خزیمۃ قولہ اذانین یرید الاذان والاقامۃ یعنی تغلیبا او لاشتراکھما فی الاعلام کذا فی فتح الباری- یعنی "امام ابن خزیمہ نے فرمایا کہ حدیث میں اذانین سے مراد ایک اذان عرفی اور دوسری اقامت مراد ہے اور اس کو اعلام میں اشتراک ہونے کے باعث یا تغلیباً اذان کہہ دیا ہے۔"

تحفۃ الاحوذی میں ہے: والمعنی کان الاذان فی العھد النبوی وعھد ابی بکر وعمر اذانین احدھما حین خروج الامام وجلوسہ علی المنبر والثانی حین اقامۃ الصلٰوۃ فکان فی عھدھم الاذانان فقط ولم یکن الاذان الثالث والمراد بالاذانین الاذان الحقیقی والاقامۃ- (جلد اول' ص-۳۶۸) یعنی "عہد نبوی اور عہد ابوبکر و عمر میں دو اذانیں تھیں- ایک امام کے نکل کر منبر پر بیٹھنے کے وقت اور دوسری نماز کھڑی کرنے کے وقت- مراد اذانین سے اذان حقیقی اور اقامت ہیں- یہی دو اذانیں تھیں' تیسری اذان عثمان اس وقت نہ تھی-"

تفسیر مظہری ص ۲۸۱ میں حدیث سائب رضی اللہ عنہ پر لکھا ہے: وتسمیتہ ثالثا باعتداد الاقامۃ ثانیا۔ یعنی "حدیث میں تیسری اذان بڑھانے کا جو ذکر ہے' یہ تیسری بوجہ اقامت کو دوسری اذان شمار کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔" اہلحدیث علماء اور حنفی علماء کا اس پر اتفاق ہے۔ کسی عالم نے سوائے حضرت گجراتی کے اس حدیث اذانین میں دو عرفی اذانیں مراد نہیں لیں' جس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ دو اذانوں کا عہد نبوی میں ہونا ثابت نہیں ہے۔ دوم حدیث سائب رضی اللہ عنہ میں پہلی اذان' اذان منبری کو قرار دیا گیا ہے' جس کے بعد کوئی اذان نہیں ہے' صرف اقامت ہے۔ اور پھر عہد عثمانی میں جو اذان بڑھائی ہے' اس کو پہلی بایں طور کہ اذان وقتی عندالخطبہ سے پہلے کی گئی' کہا گیا ہے اور دوسری باعتبار پہلی مشروع اذان عندالخطبہ کے کہہ دیا گیا ہے اور تیسری باعتبار اقامت یعنی تکبیر کے قرار دیا گیا ہے۔ صرف مولوی گجراتی صاحب اپنے دعوے میں متفرد ہیں' جن کا قول شاذ ہے جو از قسم مردود سے ہے۔

چوتھا مغالطہ زوال کے بعد دو یا تین اذانوں کا کوئی وقت نہیں ⇦ مولانا گجراتی صاحب اور مولانا کھنڈیلوی صاحب کا یہ متفقہ مذہب ہے کہ نماز جمعہ کا وقت بعد الزوال ہے اور وقتی اذان بھی زوال کے بعد ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ کب پڑھتے تھے۔ اس کے متعلق گجراتی حضرت لکھتے ہیں: "صحاح ستہ ودیگر کتب حدیث میں مختلف الفاظ کے ساتھ انس اور جابر رضی اللہ عنہما سے اس مضمون کی بکثرت روایتیں موجود ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جمعہ کی نماز پڑھا چکتے تو ہم بعض ضروری کاموں کے لیے چلے جایا کرتے تھے اور ابھی دیواروں کا سایہ مشرقی جانب ڈھل کر اتنا بھی نہ بڑھا ہوتا کہ ہم جانے والے اس میں چل سکیں۔" (ص ۳۱)

میں کہتا ہوں کہ بروایت بخاری حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ کان یصلی الجمعۃ حین تمیل الشمس۔ یعنی "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سورج جھکنے (زوال) کے بعد نماز پڑھتے تھے۔" اور مسلم میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ کنا نجمع مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا زالت الشمس۔ یعنی "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ زوال شمس کے وقت جمعہ ادا کرتے تھے۔ دوسری روایت

سلمہ ﷺ میں ہے: وما نجد للحیطان فیئا" نستظل بہ۔ یعنی "جمعہ سے فارغ ہو کر لوٹتے تو اتنا سایہ نہ ملتا کہ اس میں ہم کھڑے ہو سکیں۔" حضرت جابر ﷺ کی یہ شہادت ہے کہ کان یصلی ثم نذھب الی جمالنا فنریحھا۔ "ہم جمعہ پڑھ کر چلے جاتے اور اپنے اونٹوں کو راحت ولاتے۔" اس پر حسن بن عباس ﷺ نے دریافت کیا کہ کون سے وقت جمعہ پڑھتا اور راحت ولاتا ہوتا؟ کہا جعفر نے کہ زوال شمس میں۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ حین تزول الشمس یعنی النواضح۔ (مسلم جلد اول' ص-۲۸۳) یعنی "جب سورج ڈھلتا تھا تو ہم نماز سے فارغ ہو کر اونٹوں کو راحت ولا رہے ہوتے۔" امام نووی فرماتے ہیں کہ ان الصلوٰۃ کانت بعد الزوال متصلۃ بہ۔ یعنی ان احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز جمعہ زوال شمس ہوتے ہی پڑھ لیا کرتے تھے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ جب عندالزوال متصل ہی نماز جمعہ ہوئی تو اذان وقتی کب تھی؟ قبل الزوال یا بعدالزوال؟ اگر قبل الزوال تو یہ باطل ہے' کیونکہ اذان سے مقصود اعلام وقت ہے اور وقت ابھی ہوا ہی نہیں ہے۔ ہاں جن کے نزدیک جمعہ کا وقت ممتد ہے' از قبل الزوال تا بعد الزوال تو ان پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے مخاطب اس کے قائل ہی نہیں ہیں اور اگر بعد الزوال اذان ہوئی جیسے مولانا کھنڈیلوی صاحب نے ایک عام حدیث ذکر کی ہے کہ کان بلال یؤذن اذا دحضت الشمس۔ یعنی "حضرت بلال ﷺ سورج ڈھلنے کے وقت اذان کہا کرتے تھے۔"

سو پھر سوال یہ ہے کہ اس اذان کے بعد ہی خطبہ شروع ہو جاتا تھا اور نماز پڑھتے تھے یا وقفہ اور انتظار کرتے تھے؟ اگر شق اول ہے تو ہمارا مسلک ثابت ہوا' اور یہی صحیح ہے اور احادیث مندرجہ بالا کے موافق ہے اور اگر شق دوم ہے تو یہ وقفہ اور انتظار کب تک تھا؟

مولوی گجراتی صاحب اپنا معمول بتلاتے ہیں کہ "میرے یہاں جمعہ کے روز ہمیشہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب پہلی اذان ہوتی ہے۔ لوگ رفتہ رفتہ اپنے اپنے درجوں میں آتے رہتے ہیں۔ پھر پورے ایک بجے دوسری اذان کے بعد میں خطبہ شروع کر دیتا ہوں جو کہ ۴۵ منٹ تک ختم ہوتا ہے پھر نماز شروع ہو جاتی ہے' جس سے دو بجے

تک سلام پھیر دیتا ہوں۔"

اس معمول پر ہمارے کئی سوال ہیں۔ اول یہ کہ مولوی گجراتی صاحب نے اپنے رسالہ میں اذان وقتی کے بعد مندرجہ ذیل امور' کام کاج انجام دینے جائز قرار دیئے ہیں اور یہ نمازیوں کے حقوق ہیں۔

پیشاب' پاخانہ' کھانا پینا' حجامت' غسل' تیل خوشبو لگانا' سنن و نوافل پڑھنا' خرید و فروخت چھوڑ کر بازار سے گھر آنا' شہر میں مختلف محلوں سے چل کر مسجد میں پہنچنا۔ یہ تمام کام خطبہ فوت ہونے سے پہلے پہلے کرنے ضروری ہیں۔

چنانچہ نبی ﷺ بعض موقعہ پر ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مسند احمد ج۔۵' ص۔۸۹ میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ربما خرج ورای الناس فی قلة فجلس ثم یؤبون ثم یقوم فیخطب قائما۔ یعنی "ربما اوقات ایسا ہوتا کہ آنحضرت ﷺ گھر سے نکلتے اور لوگوں کی حاضری کم دیکھتے تو کسی جگہ بیٹھ کر انتظار فرماتے۔ جب حاضری مناسب ہو جاتی تو پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔

اس حدیث میں کسی اذان کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ راوی نے ایک مسئلہ کے بیان پر اکتفا کیا کہ امام مسجد میں حاضرین کی تعداد کم معلوم کرے تو کچھ انتظار کرے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ اذان وقتی ایک ہی تھی جو خطبہ کے وقت تھی۔ لوگ خطبہ سے پہلے اذان سے آجایا کرتے تھے۔ اگر کسی دن کم ہوتے تو آپ کچھ انتظار فرماتے تھے۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ کان الناس یتنابون الجمعة من منازلھم والعوالی۔ یعنی "لوگ لگاتار جمعہ کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ مدینہ کے گھروں سے بھی اور مدینہ کے گرد و نواح کی بستیوں سے بھی' جن کو عوالی کہتے ہیں۔" اور ان کی ادنیٰ حد چار میل اور زیادہ آٹھ میل تک تھی۔ اب ان تمام لوگوں کو اذان وقتی تو سنائی نہ دے سکتی تھی۔ یہ جمعہ کو عید جان کر شوق عبادت کے لیے پے در پے آتے تھے۔ جب آنے میں کچھ دیر لگتی تو آپ انتظار فرما لیتے تاکہ کچھ مجمع ہو جائے۔ اس سے حضرت گجراتی صاحب کا اعتراض اٹھ گیا کہ منبر پر امام اکیلا کیا کرے گا۔ ہم کہتے ہیں وہی کرے گا جو حضور ﷺ نے کیا۔ باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ یہ انتظاری اذان وقتی کے بعد کیا کرتے تھے؟ یہ سراسر غلط بلکہ جھوٹ ہے۔

زاد المعاد جلد اول ' ص—۱۴۰ میں ہے: ویاخذ بلال فی الاذان فاذا فرغ منه قام النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فخطب من غیر فصل بین الاذان والخطبة۔ یعنی "حضرت بلال ؓ اذان کہتے تو ان کے فارغ ہوتے ہی نبی کریم ﷺ اسی وقت خطبہ شروع کر دیتے تھے' درمیان میں فاصلہ نہ کرتے تھے۔" اور بحوالہ مجمع الزوائد یہ روایت گزر چکی ہے کہ حضرت بلال ؓ اذان ہی اس وقت کہتے تھے جب حضور ﷺ منبر پر جلوس فرماتے تھے۔ جلوس منبر سے پہلے کوئی اذان نہ ہوئی تھی اور نہ اس کا کہیں ذکر ہے۔ اس لیے مجمع کم ہونے کی صورت میں جو لوگوں کا انتظار فرماتے تھے' یہ اذان سے پہلے بعض اوقات ہوا کرتا تھا۔

باقی مولوی گجراتی صاحب نے جو ایک اور روایت بحوالہ ابوداؤد و بیہقی وغیرہ ذکر کی ہے کہ آپ اذان سن کر مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اگر حاضری تھوڑی ہوتی تو بیٹھ کر لوگوں کا انتظار فرما لیا کرتے تھے۔ یہ جمعہ کے دن کا ذکر نہیں ہے بلکہ دیگر عام نمازوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان یخرج بعد النداء الی المسجد فاذا رای اهل المسجد قلیلا جلس حتی یری منهم جماعة ثم یصلی۔ چنانچہ "ثم یصلی" کے الفاظ صاف دلالت کر رہے ہیں کہ یہ اس نماز کا ذکر ہے' جس میں اس سے پیشتر خطبہ نہیں ہے ورنہ یہاں "ثم یخطب" کہا جاتا۔ جیسے ہماری نقل کردہ اوپر کی روایت میں ہے کہ ثم یقوم فیخطب قائما۔

حضرت علامہ گجراتی نے علامہ مشرقی بن کر یہاں دونوں احادیث کو جو دو موقعوں کی ہیں' ایک جگہ ذکر کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دیا ہے کہ موقعہ ایک ہے۔ جمعہ کے دن دو اذانیں تھیں۔ بایں طور کہ ایک کے بعد رسول اللہ ﷺ آکر مسجد میں انتظار کرتے' جب مجمع ہو جاتا تو آپ دوسری اذان کہلا کر خطبہ پڑھتے تھے۔ یہ سراسر باطل ہے۔ کما لا یخفی علی اهل العلم بالحدیث۔

بس اسی طرح ہی انہوں نے احادیث کے ہیر پھیر سے اور کئی موقعوں کی احادیث کو ایک موقعہ کی بنا کر اور کسی روایت کو کسی روایت سے ملا کر اور کہیں معنوں اور مطلب میں تحریف کر کے اپنا اختراعی مسئلہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس پر یہ

شعر پورا پورا صادق آتا ہے۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

پانچواں مغالطہ متعلقہ فقہاء حنفیہ ⇦ مولوی گجراتی صاحب نے علامہ مشرقی بن کر جیسے اہل حدیثوں کو مغالطہ دیا ہے' ویسے ہی حنفی مذہب کے لوگوں کو بھی مغالطہ اور دھوکہ دیا ہے کہ جمعہ کے دن عہد نبوی میں دو اذانیں تھیں۔ ایک وقتی اور دوسری منبری۔ اور آیت قرآنی میں اذان اول سے مراد اذان وقتی ہے' اذان عندالخطبہ مراد نہیں ہے۔

چنانچہ کہیں نور الانوار کی عبارت سے دھوکہ دیا ہے اور کہیں کبیری وغیرہ سے اور کہیں مولوی شبیر احمد عثمانی کا ذکر خیر کر دیا ہے تاکہ دیوبند کی مشہور ہستیوں کے نام سے فریب دے کر اس مسئلہ کو اجاگر کریں۔ حالانکہ مولوی گجراتی صاحب کا مذہب سب کے خلاف ہے اور اس کو کوئی بھی نہیں مانتا اور علامہ گجراتی نے ان عبارتوں سے جو مطلب اخذ کیا ہے وہ "تاویل الکلام بما لا یرغی به القائل" کا مصداق ہے۔

اب اس کی تفصیل اور اصل حقیقت سنیئے! ہدایہ میں لکھا ہے کہ اذا صعد الامام المنبر جلس واذن المؤذنون بین یدی المنبر بذالک جری التوارث ولم یکن علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا ھذا الاذان ولھذا قیل ھو المعتبر فی وجوب السعی وحرمة البیع۔ یعنی "جب امام منبر پر چڑھ کر بیٹھتا ہے تو مؤذن منبر کے سامنے اذان کہتے ہیں۔ اسی پر توارث چلا آرہا ہے اور عہد نبوی میں کوئی اذان نہ تھی صرف یہی اذان منبری ہی تھی۔ اس لیے یہ کہا گیا ہے کہ سعی الی ذکر اللہ اور حرمت بیع میں اسی اذان کا اعتبار ہے۔"

ہدایہ کے حاشیہ فتح القدیر (جلد اول' ص۔۴۲۳) میں ہدایہ کی اس عبارت پر لکھا ہے کہ وقد تعلق بما ذکرنا من انه لم یکن علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاھذا الاذان۔ یعنی "ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے یہ بات تعلق رکھتی ہے کہ عہد رسول اللہ ﷺ میں جمعہ کے دن یہی منبری اذان ہی تھی۔"

حنفیہ اذان عثمانی کو اول کہتے ہیں اور اذان منبری کو ثانی کہتے ہیں اور ان میں یہ

اختلاف ہے کہ سعی الی ذکر اللہ اور حرمت بیع اذان اول عثمانی کے وقت ہوتی ہے یا اذان منبری کے وقت ہوتی ہے؟ اگر شق اول کو اختیار کرتے ہیں تو یہ عہد رسالت میں تھی۔ حالانکہ آیت وجوب سعی و حرمت بیع عہد نبوی میں نازل ہو چکی تھی۔ اور اگر اذان منبری پر سعی اور حرمت بیع کا حکم لگاتے ہیں تو پھر سماع خطبہ و اداء سنت فوت ہوتے ہیں۔ جس چیز کی ضرورت کے لیے اذان عثمانی جاری ہوئی۔

تو مولانا اشرف علی تھانوی صاحب اپنی کتاب بوادر النوادر (جلد اول' ص۔۱۱۳) میں اس مشکل کو اس طرح حل کرتے ہیں کہ "فقہاء نے فرمایا ہے کہ جمعہ کی اذان اول سے بیع وغیرہ حرام ہو جاتی ہے اور اس پر آیت سورہ جمعہ سے استدلال کیا ہے۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ نزول آیت کے وقت یہ اذان اول نہ تھی۔ تو یہ آیت میں کیسے مراد ہو سکتی ہے اور جب مراد نہیں تو اس سے استدلال کیسے ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ مراد تو اس سے اذان ثانی ہی ہے لیکن اشتراک علت سے حکم متعدی ہو جائے گا' اذان اول کی طرف۔ پس آیت سے استدلال بواسطہ قیاس کے ہے اور کلام فقہاء کا یہی محمل ہے۔ فارتفع الاشکال"

بوادر النوادر کی جلد ثانی' ص۔۵۳۲ میں خلاصہ سے نقل کیا ہے کہ **ویکره البیع والشراء یوم الجمعة اذا اذان المؤذن والبیع جائز والاذان المعتبرة اذان الخطبة۔** یعنی "جمعہ کے دن خرید و فروخت ناجائز ہے۔ جب مؤذن اذان دے تو بیع جائز ہے اور حرمت بیع میں اذان وہ معتبر ہے جو عند الخطبہ ہے۔"

نیز کتب فقہ سے نقل کیا ہے کہ **یجب السعی وترک البیع بالاذان الاول لقوله تعالیٰ "فاسعوا الی ذکر الله وذروا البیع" واختلف المراد بالاذان الاول قیل الاول باعتبار المشروعیة وهو الذی بین یدی المنبر لانه کان اولا فی زمنه صلی الله علیه وسلم وزمن ابی بکر وعمر حتّٰی احدث عثمان الثانی علی الزوراء حین کثر لناس والاصح ان الاول باعتبار الوقت وهو الذی یکون علی المنارة بعد الزوال۔**

الخ یعنی "سعی اور ترک بیع پہلی اذان میں واجب ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب اذان ہو تو ذکر اللہ کی طرف چلو اور بیع ترک کر دو لیکن اذان اول کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض نے تو مشروعیت کا اعتبار کیا ہے کہ منبری اذان' اذان اول ہے

کیونکہ یہ عہد نبوی اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں یہی اول چلی آرہی ہے۔ اور اذان ثانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی کثرت کی وجہ سے (زوراء پر) بڑھا دی تھی۔ اور بعض نے وقت کے اعتبار سے پہلی مراد لی ہے کہ منبری اذان سے پہلے وقت ہونے پر مینارہ پر اذان کہی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اذان عثمانی اول اور اذان منبری ثانی ہو گئی۔"

حاشیہ شیخ وجیہ الدین جو شرح وقایہ پر ہے' اس میں ہے کہ اذن ثانیا بذالک جری التوارث من لدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الٰی ھذا الزمان الاذان امام المنبر۔ یعنی "دوبارہ اذان دی۔ یہی عہد نبوی سے اب تک متوارث چلی آتی ہے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت ہوتی ہے۔"

بہرکیف ان عبارات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اذان عثمانی جو عندالزوال کہی جاتی ہے' اس کو حنفیہ وقتی کہتے ہیں اور یہی پہلی اذان ہے اور اس کے بعد ہی سعی اور ترک بیع بالقیاس واجب کہتے ہیں اور اذان مشروع اذان منبری ہے جو اذان ثانی کہلاتی ہے۔ یہ عہد نبوی سے متوارث چلی آئی ہے۔ پس اذان عثمانی اور اذان منبری کے بغیر کوئی اور اذان وقتی مشروع نہیں ہے اور نہ فقہاء اس کے قائل ہیں۔

مولانا اشرف علی صاحب بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ "نودی" سے قرآن میں وہ اذان ہے جو نزول آیت کے وقت تھی یعنی جو امام کے سامنے ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اذان اول (عثمانی) صحابہ کے اجماع سے بعد میں مقرر ہوئی ہے لیکن حرمت بیع میں حکم اس کا بھی مثل حکم اذان قدیم کے ہے کیونکہ اشتراک علت سے حکم میں اشتراک ہوتا ہے۔ البتہ اذان قدیم میں یہ حکم منصوص و قطعی ہو گا اور اذان حادث میں یہ حکم مجتہد فیہ و ظنی ہو گا۔ اس سے تمام اشکالات علمیہ مرتفع ہو گئے۔"

پس حنفیہ کے نزدیک دو اذانیں جمعہ کے دن ہیں۔ ایک قدیم مسنون جو متوارث چلی آتی ہے۔ چنانچہ نزول آیت کے وقت یہی اذان تھی اور اسی پر سعی و ترک بیع واجب ہوئی۔ پھر عہد عثمانی میں اس سے پہلے ایک اور اذان جاری ہوئی' اس کو اذان حادث کہتے ہیں۔ پس جمعہ کے دن دو ہی اذانیں ہیں۔ ایک قدیم مسنون اور دوم حادث عثمانی' تیسری کوئی اذان وقتی نہیں ہے۔

اور مولانا گجراتی نے "نور الانوار" کی عبارت سے اذان وقتی کا دھوکہ دیا ہے۔ اس میں ایک تو نداء اول کا ذکر ہے جو علماء کے اجماع سے ثابت ہے۔ یہ تو وہی اذان عثمانی ہے کیونکہ اجماع علماء سے اس اذان کے بغیر اور کوئی اذان ثابت نہیں ہے۔ اذان منبری تو عہد نبوی کی ہے' اس کو اجماع سے کیا تعلق' یہ تو شرعی اذان ہے۔ فقہاء حنفیہ اجماعی اذان' اذان عثمانی کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ مولانا اشرف علی صاحب نے بیان القرآن میں لکھا ہے۔ پس اذان وقتی کون سی ہوئی؟ جس کا ذکر نور الانوار میں ہے۔ اسی طرح کبیری کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اس میں بھی اذان اول عثمانی کا ذکر ہے۔ آپ اذان عثمانی کو وقتی کہہ کر لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں جو دیانتداری کے بالکل خلاف ہے۔ اذان عثمانی کو حنفیہ وقتی کہتے ہیں مگر عہد نبوی کی قرار نہیں دیتے" فتفکر۔

چھٹا مغالطہ ⇦ کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ گھر سے روانہ ہوتے وقت یا کہ راستہ میں چلتے ہوئے اذان سن کر اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ دعا دیا کرتے تھے۔ اس روایت میں جس اذان کا ذکر ہے وہ اذان وقت ہے' اذان خطبہ ہرگز مراد نہیں۔ کیونکہ اذان خطبہ مسجد کے اندر ہوتی ہے' جو مسموع نہیں ہے اور ایک پاکباز صحابی کی بابت یہ خیال ممکن نہیں کہ تنگ وقت میں ہمیشہ آئے اور دفتروں میں نام درج نہ کرائے۔ سو یہ بھی ایک مغالطہ ہے کیونکہ اس روایت میں جس اذان کا ذکر ہے' اس کی کوئی تعیین نہیں ہے کہ وہ اذان عثمانی ہے یا عہد نبوی والی اذان ہے۔ جب احتمال ہوا تو دلیل نہ رہی۔۔۔!

دوم اذان بلال رضی اللہ عنہ باب المسجد پر تھی جو مدینہ میں برابر مسموع تھی کیونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ رفیع الصوت تھے۔ مسجد کے اندر بالکل نہ تھی۔ ابوداؤد "باب النداء یوم الجمعہ" میں حدیث ہے کہ: **عن السائب بن یزید قال کان یؤذن بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جلس علی المنبر علی باب المسجد وابی بکر وعمر۔** یعنی "حضرت سائب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عہد نبوی اور صدیقی اور فاروقی میں مسجد کے دروازہ پر اذان کہی جاتی تھی جبکہ امام منبر پر جلوس کرتا تھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ یوم الجمعہ کی یہی ایک اذان تھی جو وقتی تھی۔ اسی کو سن کر کعب رضی اللہ عنہ دعائے ترحم کرتے ہوں تو کوئی تعجب نہیں ہے اور نابینا شخص تھے جو معذور تھے۔ حالانکہ فضائل کے کام تو بڑے بڑے صحابہ چھوڑ دیتے تھے اور بعض شائق لوگ

کر بھی لیتے تھے۔ چنانچہ ابوداؤد باب الاقامتہ میں ہے: فاذا سمعنا الاقامة توضانا ثم خرجنا الی الصلٰوۃ۔ یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم اقامت سن کر وضو کیا کرتے تھے اور پھر نماز کی طرف گھروں سے نکلتے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بصیغہ جمع بہت سے صحابہ کی یہ عادت بیان کی ہے جن میں خود بھی شامل ہیں کہ ہم تکبیر سن کر وضو کرتے اور نماز کی طرف نکلتے تھے۔ بخاری شریف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اذا سمعتم الاقامة فامشوا الی الصلٰوۃ۔ یعنی جب تم اقامت سنو تو نماز کی طرف نکلو۔

اس سے ظاہر ہے کہ اذان سن کر مسجد میں فوراً حاضر ہونا واجب نہیں ہے۔ ہاں جماعت میں شامل ہونا واجب ہے۔ لیکن اگر کوئی پہلے ہی مسجد میں جا کر بیٹھ جائے اور سنت' نفل ذکر وغیرہ میں مشغول رہے اور جماعت کا انتظار کرے تو یہ افضل اور اولیٰ ہے اور موجب زیادت ثواب ہے۔ لیکن بعض اصحاب باوجود پاکباز ہونے کے ایسا عمل نہ کرتے تھے بلکہ وہ اقامت سن کر وضو کرتے اور پھر نماز کو نکلتے تھے جس سے تکبیر اولیٰ اور اس سے پہلے کے وہ سب کام جو موجب فضائل تھے' فوت ہو جاتے تھے۔

بس اسی طرح بعض صحابہ جمعہ کے دن سویرے آجاتے تھے اور بعض اذان منبری سن کر آتے تھے اور بعض خطبہ کے درمیان میں آتے تھے کہ سب جائز ہے۔ الدین یسر یعنی دین میں آسانی ہے۔

پھر کعب رضی اللہ عنہ کا اسعد رضی اللہ عنہ کو دعا دینا یہ جمعہ یاد آجانے پر تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے جمعہ قائم کیا تھا' نہ کہ اذان یاد آنے پر۔ ہاں اذان جمعہ سے جمعہ کا یاد آجانا مذکور ہے۔ سو اس اذان سے وہی اذان مراد ہے جو جمعہ سے مخصوص ہے اور وہ اذان منبری ہے کیونکہ اس کے علاوہ جمعہ کے دن اور کوئی اذان ہی نہ تھی یا پھر عہد عثمانی کا واقعہ ہو تو اذان عثمانی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ مغالطہ ہے اور کوئی خاص دلیل نہیں ہے' فتفکر۔

بس اسی طرح مولوی عنایت اللہ صاحب گجراتی کی تمام کتاب مغالطات سے پر ہے' انہوں نے صرف احادیث اور واقعات کو ایک خاص ترتیب دے کر اور مطلب اپنا اختراعی لے کر جمعہ کے دن دو اذانیں مستقل عہد نبوی سے ثابت کرنے کی بے سود

کوشش کی ہے۔ بس ان کا اور مولوی عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی کا ایک ہی نظریہ ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اذان خطبہ سے پہلے اذان وقتی نہ ہو اور لوگ اذان خطبہ سن کر آئیں تو خطبہ کس کو سنایا جائے؟ جس کا جواب ہمارے مضمون میں آچکا ہے۔ اب ہم ان سے ایک سوال کرتے ہیں اور ہر دو حضرات سے یہ درخواست ہے کہ اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

سوال پانچ وقتی نماز کی جماعت قائم کرنا اور جماعت سے نماز پڑھنا فرض ہے اور شعار اسلام ہے اور اس پانچ وقتی حاضری کے لیے اذان مقرر ہے جو ہر نماز کے وقت نمازیوں کو دعوت دیتی ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ لوگوں کو نماز کے وقت کا اعلام ہو جائے اور وہ اذان سن کر مسجد میں جمع ہو جائیں اور سنن و نوافل پڑھیں اور جماعت کا انتظار کریں۔ جب امام آجائے تو مؤذن تکبیر کہہ دے اور سب لوگ جو مسجد میں جمع ہیں، صف بندی کر لیں اور امام مصلے پر کھڑا ہو کر تکبیر کہہ دے اور لوگوں کو نماز پڑھائے۔ چنانچہ یہی معمول عہد نبوی سے لے کر اب تک تمام مساجد اسلامیہ میں متوارث چلا آرہا ہے لیکن صحیح حدیث میں یہ حکم وارد ہے کہ اذا سمعتم الاقامة فامشوا الی الصلوٰۃ۔ (الحدیث) یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کی تکبیر سنو تو نماز کے لیے چلو اور آہستگی اور سہولت کو لازم پکڑو اور دوڑو نہیں پھر جس قدر نماز ملے وہ پڑھ لو اور جو جاتی رہے اس کو پورا کر لو۔ چنانچہ صحابہ کرام اسی طرح عمل کرتے ہیں۔

نسائی باب "کیف الاقامة" میں حدیث ہے جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ فاذا سمعنا قد قامت الصلوٰۃ توضانا ثم خرجنا الی الصلوٰۃ۔ یعنی ہم جب مؤذن کا "قد قامت الصلوٰۃ" کہنا سنتے تو وضو کرتے پھر گھروں سے نماز کی طرف نکلتے تھے۔ اب یہ بتلائیں کہ جب اقامت سن کر وضو کر کے نماز کی طرف نکلنے کا حکم ہے تو امام نماز کن لوگوں کو پڑھائے گا؟ اور صف کن لوگوں کی درست کرے گا؟ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ دوڑ کر رکوع میں چلے گئے اور پھر جا کر صف میں ملے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تیری حرص بڑھائے۔ حالانکہ وہ مسبوق تھے۔ حرص تو ان کی زیادہ تھی جو پہلے سے موجود تھی تو اب اذان کا کیا فائدہ ہوا جبکہ اقامت سن کر نماز کی طرف آنے کا

حکم ہے۔ پس جو جواب آپ اس کا دیں گے وہی یوم الجمعہ کو آیت "اذا نودی للصلوٰۃ" کا ہے کہ اذان منبری سن کر وہ جمعہ کو آتے تھے۔

نیز اس کا بھی جواب دیں کہ مجمع الزوائد میں حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا انما جعل الاذان الاول لیتیسر اھل الصلوٰۃ لصلوٰتھم فاذا سمعتم الاذان فاسبغوا الوضوء واذا سمعتم الاقامۃ فبادروا التکبیرۃ الاولیٰ۔ یعنی جز ایں نیست کہ اذان اول اس لیے مقرر ہے کہ نمازیوں کے لیے نماز کی تیاری آسان ہو جائے۔ پس جب تم اذان سنو تو وضو خوب درست کر لو اور جب تم اقامت سنو تو پہلی تکبیر کی طرف جلدی کرو۔ اس حدیث میں پہلی اذان کون سی ہے؟ اور پہلی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری بھی ہو۔ تب یہ بتائیں کہ دوسری کون سی ہے؟ اگر تکبیر ہے تو مدعا ہمارا ثابت ہوا کہ تکبیر کو بھی اذان کہتے ہیں۔ یہی حدیث سائب ؓ میں موجود ہے اور اگر تکبیر کے علاوہ نمازوں کے لیے دوسری اذان ہے تو اس کا ثبوت دیں۔ یہ کہیں متوارث نہیں ہے۔ مگر خطرہ ہے کہ جمعہ کی طرح آپ حضرات اوقات خمسہ میں بھی زائد اذان کے قائل نہ ہو جائیں کہ اس کو وقتی اذان کہنے لگیں اور دوسری کو وضو کی اذان کہ یہ نماز کی تیاری کے لیے ہو۔ بہرحال آپ ان احادیث کا تسلی بخش جواب دیں۔ فقط والسلام۔

حررہ ابوعبدالشکور عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی جلد ۳۸' شمارہ ۱۷' ۱۸' ۱۹' ۲۰' ۲۱' ۲۲' ۲۴ و جلد ۳۹' شمارہ ۵

جمعہ کی دو اذانوں کے بارہ میں

"الاعتصام" مجریہ ۱۸/۲۵ ذوالحجہ سنہ ۱۳۷۵ھ میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی دام فیضہ کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نماز جمعہ کے لیے دو اذانیں سنت نبوی ہیں۔ ان سے پہلے مولانا حافظ عنایت اللہ صاحب گجراتی جو کسی وقت اس مسئلہ پر سبقت کر گئے ہیں' انہوں نے دعویٰ سے یہ لکھا ہے کہ جمعہ کے دن دو اذانیں مستقل مقرر ہیں۔ ایک اذان وقتی اور دوسری اذان خطبہ ہے اور اذان عثمانی کو وہ تیسری اذان قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ ایک وقت میں جاری

ہو کر پھر صدیوں سے بند ہے۔ ان دونوں حضرات سے پہلے ایک مولانا محمد حسن فیض پوری حنفی گزرے ہیں۔ انہوں نے "الاحتیاط الظہر" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا ہے' جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جمعہ کے دن چھ نمازیں مستقل فرض ہیں۔ ایک وقتی ظہر اور دوسرا جمعہ مستقل فرض ہیں۔ باقی عصر' مغرب' عشاء' فجر ہیں۔ اس دعویٰ کا انہوں نے دو طرح ثبوت پیش کیا ہے۔ ایک محدثانہ طرز سے اور دوسرا فقیہانہ اسلوب سے۔ اس رسالہ کا جواب بندہ نے اخبار "تنظیم اہلحدیث" روپڑ میں قسط وار لکھا تھا جو مکمل ہونے کے بعد دفتر تنظیم سے کتابی صورت میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔

ان علماء کے یہ دعوے تحقیق کی رو سے صحیح نہیں ہیں اور علماء سلف و خلف سے کوئی ان مسائل کا قائل نہیں۔ اس لیے خلاف احادیث ہونے کے علاوہ خلاف تعامل عہد نبوی اور اجماع امت ہیں۔

مولانا حافظ عنایت اللہ صاحب گجراتی پر تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہے کہ وہ علماء اہل حدیث سے اس مسئلہ میں کیوں منفرد ہوئے؟ کیونکہ ان کے مسلکی حالات منقلب ہوتے رہتے ہیں۔ تعجب البتہ مولانا کھنڈیلوی کے مضمون پر ہے کہ وہ ایک بہت بڑے عالم ہیں اور ان کو درس حدیث نبوی دیتے ہوئے مدت مدید اور عرصہ بعید گزر گیا ہے۔

حضرت مولانا کا دعویٰ یہ ہے کہ

"جمعہ کے دن زوال شمس کے بعد دو اذانیں سنت ہیں۔ ایک وقتی اذان' دوسری اذان خطبہ۔ یہ دو اذانیں عثمانی اذان کے علاوہ ہیں۔"

لیکن اس باب میں آپ کو مندرجہ ذیل سوالات پر غور کرنا چاہیے:

(۱) زوال شمس کے بعد دو اذان کا عہد نبوی میں ہونا کون سی حدیث نبوی یا اقوال صحابہ کرام سے ثابت ہے؟

(۲) جس حدیث نبوی یا اقوال صحابہ کرام سے آپ دو اذانیں مسنون ہونا ثابت کر رہے ہیں؟ کیا محدثین متقدمین یا متاخرین نے بھی ان سے یہی مراد لی ہے اور یہی مطلب سمجھا ہے جو آپ لے رہے ہیں؟

(۳) آیت جمعہ میں جس ندا کا ذکر ہے' اس سے مراد وقتی اذان ہے یا اذان خطبہ؟ اور جملہ مفسرین نے اس سے کون سی اذان مراد لی ہے؟ اگر وقتی اذان مراد ہے

اور اس سے سامعین پر سعی واجب ہوئی ہے تو اذان خطبہ کی کیا ضرورت پیش آئی جو زائد کی گئی؟ کیونکہ سعی اور ترک شغل تو اذان وقتی سے لازم ہوئے۔ پھر اس کا بیجا تا خالی از فائدہ ہوا۔ اگر آپ یہ فرمائیں کہ یہ حاضرین کے انصات اور سماع خطبہ کے لیے شروع ہوئی تو یہ بھی صحیح نہیں' کیونکہ اذان اعلام کے لیے اذان کی ضرورت نہیں ہے۔ انصات اور سماع تو خطیب کے خطبہ شروع کرنے پر حاضرین پر خود فرض ہو جائیں گے اور وہ بحکم واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا خود ہی خطبہ سنیں گے۔ بلند آواز سے اذان کہہ کر انصات کرانا چہ معنی؟

(۴) اذان وقتی اور اذان خطبہ کے مابین اندازہ کے طور پر کتنا وقفہ تھا؟

(۵) جب جمعہ کے لیے دو اذانیں مقرر تھیں تو پھر عہد عثانی میں تیسری اذان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور وہ اذان قبل الزوال تھی؟ یا بعد الزوال؟ اگر قبل الزوال تھی تو وقت سے پہلے تھی یا بعد میں؟ اور وقتی اذان اور عثانی اذان کے مابین کتنا وقفہ تھا؟ اور وقتی اذان اور عثانی اذان کہنے کا محل کون سا تھا؟

(۶) اقامت پر اذان کا اطلاق صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو جس حدیث میں اذان ثالث یا ندا ثالث کا ذکر ہے' اس سے مراد اقامت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر اقامت پر اذان کا اطلاق صحیح نہیں تو بین کل اذانین صلوٰۃ کا مطلب کیا ہو گا؟ اذان عرفی اور اقامت دونوں دعا نداء ہیں یا نہیں؟ اور اذان اور اقامت سے شیطان بھاگتا ہے تو اقامت بھی بلند آواز سے ہوئی یا نہیں؟ اور اقامت سے بھی اعلام ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اور صلوٰۃ کسوف وغیرہ میں جو الصلوٰۃ جامعۃ کہا گیا ہے اس کو بھی نداء کہا گیا ہے یا نہیں؟

(۷) نماز جمعہ مستقل فرض ہے یا ظہر کا بدل ہے؟

(۸) عید کے دن جمعہ آجائے تو جمعہ عید میں جذب کیوں ہو جاتا ہے؟ حالانکہ جمعہ فرض اور عید سنت ہے!

(۹) اگر جمعہ اور عید اکٹھے ہوں تو جمعہ کی رخصت ہو جاتی ہے لیکن کیا پھر ظہر بھی ساقط ہے یا پڑھنی پڑتی ہے؟ اگر ساقط ہے تو کس دلیل سے؟ جمعہ کا وقت علیحدہ سمجھا جاتا ہے اور عید کا علیحدہ؟ اور اگر ساقط نہیں تو پھر جمعہ کیوں ساقط ہے؟ یہ بھی تو ظہر کا

بدل ہے۔ نیز نفل سے فرض کیوں ساقط ہوا؟

(۱۰) جمعہ کا خطبہ ظہر کی دو رکعت کے قائم مقام ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام نے خطبہ کو قائم مقام کیوں ٹھہرایا ہے؟ اور یہ فرمایا ہے کہ جس سے جمعہ کا خطبہ رہ گیا' وہ ظہر پڑھے۔ اگر قائم مقام ہے تو پھر جس سے خطبہ رہ جائے اس کا جمعہ فوت ہوا یا نہیں؟ اگر نہیں تو قائم مقام کیا ہوا؟ اور اگر خطبہ ہونے سے جمعہ فوت ہو گیا' اس کو ظہر پڑھنی پڑے گی تو اس کا تعامل ائمہ دین سے ثابت کیجئے!

(۱۱) جو ظہر کا وقت ہے' وہی اگر جمعہ کا وقت ہے اور زوال شمسی پر ہی تمام امور مخصوصہ جمعہ اور اذانین اور خطبے اور نماز جمعہ ادا کرتے ہیں تو پھر روزانہ معمول کے مطابق غدا اور قیلولہ بھی قبل از جمعہ ہو جانا چاہئیں تھے کیونکہ ظہر بھی بعد از زوال بحکم اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس پڑھا کرتے تھے۔ پھر غدا اور قیلولہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بعد جمعہ کیوں رکھے گئے؟ جیسے فرمایا کنا نجمع مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا زالت الشمس اور فرمایا ماکنا نقیل و نتغدی الا بعد الجمعۃ۔ نیز جب جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے تو یہ کیوں عمل ہوا؟ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی الجمعۃ ثم نذھب الی جمالنا فنریحھا حین تزول الشمس۔ یہ نماز جمعہ قبل از زوال واقعہ ہوئی ہے۔

<u>مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی کا سابقہ فتویٰ</u> ⇦ کسی زمانہ میں دہلی میں اذان عثمانی کے متعلق سوال پیدا ہوا اور لکھ کر علماء اہل حدیث دہلی وغیرہ سے فتوے طلب کیے گئے۔ مولانا عبدالجبار صاحب سے بھی فتویٰ طلب کیا گیا تھا۔ آپ نے جو فتویٰ دیا اس کا آخری حصہ مسئلہ متنازعہ فیہ کے متعلق مندرجہ ذیل ہے:

"اذان ثالث جو عثمان رضی اللہ عنہ نے ایجاد کی تھی' وہ ایک وجہ سے تھی۔ وہ یہ کہ لوگوں کی کثرت ہو گئی۔ آپ نے ان کی آگاہی کے لیے اس اذان ثالث کو ایجاد کیا تھا۔ باقی مسنون اذان تو وہی ہے جو بوقت خطبہ دی جاتی ہے اور نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اذان کو مسجد کے باہر مقام زوراء پر دلوایا تھا۔ اب جو اس اذان کو مسجدوں میں دلواتے ہیں یہ بدعت ہے"

(ابو محمد عبدالجبار مدرس مدرسہ کھنڈیلہ)

(بحوالہ اقامۃ الحجۃ)

اس فتویٰ پر متعدد علماء اہل حدیث مثلاً مولانا احمد اللہ مرحوم و مولانا عبدالجبار سوکھپوری و مولانا عبیداللہ صاحب وغیرہ کے دستخط ہیں اور یہی مسلک علماء اہلحدیث کا ہے۔

الراقم عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد ۔ ۷ شمارہ ۔ ۳ مورخہ ۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء

جمعہ کی اذان

اذان کی تعریف ہی شرعی اصطلاح میں یہ ہے کہ الفاظ مخصوصہ شرعیہ سے نماز کے وقت کی اطلاع دینے کو کہتے ہیں۔ (نیل الاوطار) آیت اذا نودیتم الی الصلوٰۃ میں بھی اذان کا نماز ہی کے لیے مخصوص ہونا ظاہر ہے۔ خطبہ اور وعظ کے لیے نہ اذان موضوع ہے اور نہ مشروع ہے اور نہ اس کی کوئی نظیر ملتی ہے اور اذان کے کلمات حی علی الصلوٰۃ سے بھی نماز ہی کی دعوت ثابت ہو رہی ہے۔ پس خطبہ کے وقت کبری اذان نماز جمعہ ہی کے لیے ہے اور یہ وقتی اذان ہے۔ جامع البیان میں ہے کہ اذا نودی للصلوٰۃ اذن لها عند قعود الامام علی المنبر یعنی امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت جو نماز کے لیے اذان دی جائے تو اهتموا فی سیرکم الیها تم نماز کی طرف جانے کا اہتمام کرو۔

تفسیر ابن کثیر مصری جزو رابع' ص۔۳۶۶ میں ہے: المراد بهذ الندا هو الندا الثانی الذی یفعل بین یدی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا خرج فجلس علی المنبر فانه کان حینئذ یؤذن بین یدیه فهذا هو المراد فاما الندا الاول الذی زاد امیر المؤمنین عثمان بن عفان فانما کان هذا لکثرة الناس کما رواه البخاری حیث قال عن السائب بن یزید قال کان النداء یوم الجمعة اوله اذا جلس علی المنبر علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وابی بکر وعمر فلما کان عثمان بعد زمان وکثر الناس زاد النداء الثانی علی الزوراء۔ یعنی "جس ندا کا ذکر

آیت میں ہے اس سے مراد وہ اذان ہے جو امام کے منبر پر بیٹھ جانے کے بعد ہوتی ہے۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں بھی یہی اذان تھی۔ جب آپ گھر سے تشریف لا کر منبر پر بیٹھ جاتے تو آپ کے سامنے یہ اذان ہوتی تھی۔ اس سے پہلے کی اذان حضور ﷺ کے زمانہ میں نہ تھی' اسے تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے صرف لوگوں کی کثرت دیکھ کر بڑھائی تھی جو زوراء پر کہی جاتی تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں جمعہ کی اذان صرف اسی وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر خطبہ کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب آبادی بڑھ گئی تو آپ نے دوسری اذان ایک الگ مکان پر کہلوائی' جس کا نام زوراء ہے۔"

رئیس المفسرین حافظ ابن کثیر جو علم حدیث و تفسیر و تاریخ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور نہایت معتبر ہیں۔ وہ اس مسئلہ کو صاف واضح کر رہے ہیں کہ آیت قرآن سے منبری اذان مراد ہے اور یہی عہد نبوی میں مقرر تھی اور اس سے پہلے جو مروج ہے وہ اذان عثمانی ہے جو ایک ضرورت کی بنا پر بڑھائی گئی ہے۔ پھر بخاری شریف کی حدیث پیش کر کے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے ہیں کہ عہد نبوی و فاروقی میں بھی ایک اذان منبری تھی جو باعتبار مشروعیت پہلی ہے اور دوسری اذان جو باعتبار مشروعیت دوسری ہے اس کو کثرت آبادی کے سبب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑھایا ہے۔ پس دو اذانوں کے بغیر تیسری اذان عہد نبوی سے لے کر حافظ ابن کثیر کے زمانہ تک اور ان کے زمانہ سے لے کر اب ہمارے زمانہ تک بھی معدوم اور لاپتہ ہے۔ جس کو ہمارے یہ بزرگ وقتی اذان قرار دیتے ہیں۔ لیکن نہ اس کا ثبوت کسی نص سے دیتے ہیں اور نہ اقوال سلف سے اور نہ تاریخ سے اور نہ اس کا محل وقوع بتاتے ہیں کہ وہ کب اور کہاں کہی جاتی تھی۔ صرف ان کا وہم ہے کہ ظہر میں ہمیشہ بعد از زوال اذان ہوتی تھی۔ جمعہ کو بھی ضرور ہوتی ہو گی حالانکہ یہ وہم باطل ہے کیونکہ زوال کے بعد یہی اذان منبری تھی۔ اسی کو وقتی اذان کہتے ہیں اور جب اذان عثمانی رائج ہو گئی تو اس کو ہی اذان خطبہ کہنے لگے اور اذان عثمانی کو وقتی اذان تصور کر لیا پس قرآن میں جس اذان کا ذکر ہے وہ اذان منبری ہے۔ یہی وہ وقتی اذان ہے جس پر بیع و شراء حرام ہوتی ہے۔

چنانچہ حافظ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت سے باسنادہ مکحول سے یہ نقل کیا ہے کہ اذان صرف ایک ہی تھی۔ جب امام آتا تھا اس کے بعد صرف تکبیر ہوتی تھی۔ جب نماز کھڑی ہونے لگتی' اسی اذان کے وقت خرید وفروخت حرام ہو جاتی۔ مغنی ابن قدامہ ج۔۲' ص۔۲۹۷ میں اذان خطبہ پر لکھا ہے: **وهذا الاذان الذى يمنع البيع ويلزم السعى الا عن منزله فى بعدٍ فعليه ان يسعى فى الوقت الذى يكون مدركا للجمعة**۔ یعنی یہ ممبری اذان عند الخطبہ بیع کو حرام کرتی ہے اور نماز جمعہ کے لیے آنے کو لازم کرتی ہے۔ مگر جو شخص دور رہتا ہو کہ اذان نہ سن سکے تو اس پر ایسے وقت پر سعی لازم ہے کہ وہ جمعہ کو پا سکے پھر اس کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ **اما مشروعية الاذان عقيب صعود الامام فلا خلاف فيه فقد كان يؤذن للنبى صلى الله عليه وسلم قال السائب بن يزيد (الحديث' رواه البخارى)** یعنی "جمعہ کے دن شرعی اذان امام کے ممبر پر چڑھنے کے بعد ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بیشک وہ حضور ﷺ کے تشریف لانے پر کی جاتی تھی۔ جیسا کہ سائب بن یزید نے بیان کیا ہے اور اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ (کما مر)

پھر لکھتے ہیں: **اما قوله بهذا الاذان الذى يمنع البيع ويلزم السعى فلان الله تعالىٰ امر بالسعى ونهى عن البيع بعد النداء بقوله سبحانه اذا نودى الايه**۔ یعنی اذان ممبری بیع کو حرام کرتی ہے اور جمعہ کے جانے کو لازم کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں چلنے کا حکم فرمایا ہے اور اذان کے بعد بیع سے منع کیا ہے۔ جیسے اذا نودی آیت میں ارشاد ہے پھر لکھتے ہیں: **فلما من كان منزله بعيدا لا يدرك الجمعة بالسعى وقت النداء فعليه السعى فى الوقت الذى يكون به مدركا للجمعة لان الجمعة واجبة والسعى قبل النداء من ضرورة ادراكها مالا يتم الواجب الا به واجب كلاستسقاء الماء من البئر للوضو اذا لم يقدر علىٰ غيره**۔ یعنی "جو شخص مسافت بعید پر ہے کہ اذان کے بعد چلنے پر جمعہ کو نہیں پا سکتا۔ اس پر ایسے وقت پر سعی لازم ہو جاتی ہے کہ وہ جمعہ کو پا سکے کیونکہ جمعہ فرض ہے اور اس کی طرف چلنا جمعہ پانے کی ضرورت کے لیے ہے۔ کیونکہ یہ اصول ہے کہ جس چیز کے بغیر کوئی فرض پورا نہ ہوتا ہو' اس کا کرنا بھی فرض ہے۔ جیسے وضو نماز کے لیے فرض ہے

تو پانی کا حاصل کرنا بھی فرض ہے۔ اگر پانی کسی صورت سے نہ ملتا ہو اور صرف کنوئیں سے پانی مل سکتا ہو تو کنوئیں سے پانی نکالنا فرض ہے۔"

بعض امور کی توضیح ⇦ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل باتیں پہلے جان لینی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ پہلی اذان عند جلوس الامام وہی ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ چنانچہ فتح الباری میں حدیث نمبر۔۲ کان النداء یوم الجمعۃ اولہ اذا لجلس الامام علی المنبر پر لکھا ہے فی روایۃ ابی عامر عند ابن ابی ذئب عند ابن خزیمۃ کان ابتداء النداء الذی ذکرہ اللّٰہ فی القرآن یوم الجمعۃ یعنی جس اذان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے اس کی ابتداء جمعہ کے دن اس وقت ہوئی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ شرعی اذان جس پر سعی واجب اور بیع منع ہوتی ہے' عندا لخطبہ ہے۔ یہی اذان قرآن میں مذکور ہے اور یہی عہد نبوی و فاروقی و صدیقی میں تھی جو اب تک متواتر چلی آتی ہے۔ اس پر سب کا اجماع ہے۔

دوم یہ کہ تیسری اذان کا لفظ جو بعض روایتوں میں وارد ہے' اس سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے عوام کو یہ مغالطہ دیا ہے کہ اذان تیسری سے اذان عرفی حقیقی مراد ہے۔ اس سے تین اذانوں کا ثبوت ہوا۔ ایک وقت' دوم منبری اور سوم عثمانی۔ حالانکہ یہ خیال بالکل باطل ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں امام ابن خزیمہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: کان الاذان علی عھد رسول اللّٰہ وابی بکر و عمر اذانین یوم الجمعۃ قال ابن خزیمۃ قولہ اذانین یرید الاذان والاقامۃ یعنی تغلیبا' او لاشتراکھما فی الاعلام۔ یعنی عہد نبوی اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں جمعہ کے دن دو اذانیں تھیں۔ امام ابن خزیمہ نے فرمایا کہ اذانین سے اصل اذان اور دوسری اقامت (تکبیر) مراد ہے۔ اذان اور اقامت دونوں کو اذانین تغلیبًا کہہ دیا گیا ہے۔ جیسے سورج اور چاند کو قمرین کہہ دیتے ہیں اور ماں اور باپ کو ابوین کہہ دیتے ہیں یا اذان اور اقامت کا نفس اعلام میں اشتراک ہے۔ اس مناسبت سے اقامت کو بھی اذان سے تعبیر کر دیا ہے۔

پس بخاری کی جن روایتوں میں اذان ثالث یعنی تیسری اذان کا لفظ وارد ہے' ان میں دو اذانیں ایک اذان نبوی اور ایک عثمانی مراد ہیں اور ایک اقامت نماز مراد ہے۔

چنانچہ فتح الباری میں ہے (قولہ زاد النداء الثالث) فی روایۃ وکیع عن ابن ابی ذئب فامر عثمان بالاذان الاول ونحوہ للشافعی من ھذا الوجہ ولا منافاۃ بینھما لانہ باعتبار کونہ مزید الیسمی ثالثا وبکونہ جعل مقدما علی الاذان والاقامۃ یسمی اولا۔ یعنی "ان روایتوں میں کوئی منافاۃ نہیں ہے۔ ان کی مطابقت اس طرح ہے کہ اصل اذان اور اقامت پر اذان عثمان زائد ہے۔ اس لیے اس کو تیسری کہتے ہیں اور باین اعتبار کہ وہ اذان اور اقامت پر مقدم ہے اس کو اول بھی کہتے ہیں۔"

پھر لکھا ہے ولفظ العقیل الایۃ بعد مابین ان التاذین بالثانی امر بہ عثمان وتسمیتہ ثانیا ایضا متوجہ بالنظر الی الاذان الحقیقی لا الاقامۃ۔ یعنی دو بابوں کے بعد بخاری کی روایت عقیل میں یہ ذکر ہے' دوسری اذان کو عثمان رضی اللہ عنہ نے حکماً بڑھایا تھا تو اس روایت میں دوسری اذان حقیقی معنی کے لحاظ سے کہہ دیا اور اقامت کو بیان میں ساقط کر دیا کیونکہ وہ اصلاً" اذان معروف نہیں ہے' اقامت ہے۔

فتح الباری مصری ج۔۲' ص۔۳۱۹ میں ہے: الثانی توارد الشراح علی ان معنی قولہ الاذان الثالث' ان الاولین' الاذان والاقامۃ۔ یعنی احادیث کے شارحین متواتر یہ بیان کرتے آئے ہیں کہ اذان ثالث کا مطلب یہ ہے کہ اس سے دو پہلی اذان اور اقامت مراد ہیں۔ بعض روایتوں میں اذان عثمانی کو اول کہا گیا ہے۔

پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ احادیث اور علماء شارحین کی عبارتوں میں مختلف اعتبارات سے ان اذانوں کا شمار کیا گیا ہے' وجود کے اعتبار سے یوں شمار ہے کہ اذان عثمانی پہلی اذان ہے اور نبوی اذان دوسری ہے اور اقامت نماز یعنی تکبیر تیسری اذان ہے۔ مشروعیت کے لحاظ سے یوں شمار ہے کہ اذان نبوی پہلی اذان ہے اور اقامت نماز دوسری اذان ہے اور اذان عثمانی تیسری اذان ہے۔ اذان عرفی اور تکبیر کو اذانین کہنا حدیث کے محاورہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے کہ بین کل اذانین صلوۃ یعنی درمیان ہر اذان اور اقامت کے نماز ہے۔ اس حدیث پر اذانین سے مراد اذان عرفی اور اقامت ہے۔

اس لیے امام بخاری نے اس حدیث پر یوں باب منعقد کیا ہے: "باب کم بین الاذان والاقامۃ" یعنی اذان اور اقامت کے درمیان کتنی نماز ہے۔ پھر یہ حدیث ذکر کی

ہے جس کی تفسیر ابن حبان کی روایت میں یوں ہے کہ ما صلوٰۃ مفروضۃ الاوبین یدیھا رکعتان۔ یعنی ہر فرض نماز سے پہلے دو رکعت ہیں۔ جس سے ظاہر ہوا کہ اذان اور اقامت کے مابین کم از کم دو رکعت ہیں۔ بعض علماء نے اپنی علمیت کا ثبوت اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے جمعہ کی دو اذانیں مراد لی ہیں جو بالکل غلط ہے اور لفظ کل اس مطلب کو مسترد کرتا ہے اور یہ مطلب کسی مفسر اہل علم سے منقول نہیں ہے اور نہ حدیث کا یہ مورد ہے۔ محاورات شرعیہ اور علمیہ کو علماء سابقین نے جو بیان کیا ہے' وہ ہمارے لیے کافی ہیں۔ پس سنیئے! حیض اور نفاس دو الگ الگ خون ہیں۔ لفظی اور معنوی اور شرعی ہر طرح دونوں میں فرق ہے۔ لیکن تاہم بعض احادیث میں مناسبت کی وجہ سے حیض پر نفاس کا اطلاق وارد ہے۔ ایسے ہی اذان اور اقامت کے ذکر میں بعض جگہ اقامت کو بھی اذان سے تعبیر کر دیا ہے۔

تحفۃ الاحوذی جلد اول' ص۔۳۶۸ میں ہے کہ والمعنی کان الاذان فی العھد النبوی وعھد ابی بکر وعمر اذانین احدھما حین خروج الامام وجلوسہ علی المنبر والثانی حین اقامۃ الصلوٰۃ فکان فی عھدھم الاذانان فقطولم یکن الاذان الثالث والمراد بالاذانین الاذان الحقیقی والاقامۃ۔ یعنی عہد نبوی اور عہد ابوبکر اور عہد عمر (رضی اللہ عنہما) میں دو اذانوں کا مطلب یہ ہے کہ ایک امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت کی اذان اور دوسری نماز کی اقامت ہے۔ پس اس طرح دو اذانیں ہیں۔ دو اذانوں سے مراد حقیقی اذان اور تکبیر ہے اور تیسری اذان عرفی کا کوئی وجود نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ مجمع الزوائد میں ابن عباس ﷺ سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

انما جعل الاذان الاول لیستیسر اھل الصلوٰۃ لصلوٰتھم فاذا سمعتم الاذان فاسبغوا الوضوء واذا سمعتم الاقامۃ فبادروا التکبیرۃ الاولی۔ یعنی پہلی اذان نمازیوں کے لیے اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ نمازیوں کے لیے نماز کی تیاری کرنے میں سہولت ہو۔ پس جب تم اذان سنو تو خوب اچھی طرح وضو کر لو اور جب اقامت کو سنو تو تکبیر اولیٰ میں ملنے کی جلد کوشش کرو۔

اس حدیث میں اقامت کے مقابلہ میں اذان عرفی کو پہلی اذان کہا گیا ہے' جس سے ظاہر ہوا کہ ایک حیثیت سے اقامت دوسری اذان ہے۔ ایک مولوی صاحب نے

ایک حدیث نقل کی ہے جس میں اذن مؤذن واقیمت الصلوٰۃ فقمنا صفوفا کے الفاظ وارد ہیں۔ اس حدیث کے عربی معنی چھوڑ کر اذان سے الصلوٰۃ جامعۃ کہنا مراد لیا ہے اور اقامت سے صف بندی مراد لی ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

یہ دونوں متبادر الی الذہن نہیں ہیں اور نہ واقعہ کے مطابق ہیں اور الفاظ بھی اس کی مساعدت نہیں کرتے۔ صف بندی کے لیے علیحدہ فقمنا صفوفا وارد ہے' تو بہرحال انہوں نے اس حدیث کے ظاہر لفظوں کو پھیر دیا ہے پھر وہ محدثین کی اس مراد سے گریز کیوں کرتے ہیں کہ حدیث اذان میں اذان سے مراد اقامت ہے۔ یہی مولوی صاحب ایک جگہ پر دعویٰ کرتے ہیں کہ جب دونوں کو الگ الگ کر لیا جائے تو اذان کا ترجمہ اقامت نہیں ہے لیکن خود ہی الگ الگ ناموں کی تاویل باطل کرتے ہیں کہ اذان سے مراد کلمہ الصلوٰۃ جامعۃ ہے اور اقامت سے مراد صف بندی ہے۔ جب اذان کا لفظ الگ ہے اور اس سے صرف کلمہ الصلوٰۃ جامعۃ معنی مجازی مراد لے لیا ہے تو اقامت جس کے سب الفاظ اذان کے ہیں' اس پر اذان کا اطلاق کیوں منع ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حررہ عبدالقادر عارف الحصاروی

اخبار اہلحدیث سوہدرہ ۸/ نومبر سنہ ۱۹۵۷ء

الاعتصام کے فاضل مدیر سے چند علمی سوالات

اخبار الاعتصام مطبوعہ یکم جنوری سنہ ۱۹۵۷ء کے ص ۴' کالم ۳ میں چند سوالات و جوابات شائع ہوئے ہیں جو قابل تبصرہ و تنقید ہیں۔ ان میں جو واقعہ درج ہے' اس میں بارہ عدد جھوٹ ہیں۔ پھر جب سوال میں خاص جماعت اور مخصوص چک اور وہاں کے خطیب کا ذکر کیا گیا تھا۔ جس سے فریقین کا نزاع ظاہر ہوا تو اصول مفصلہ کی رو سے مفتی صاحب کا فرض منصبی یہ تھا کہ فریق ثانی اور مقامی جماعت سے بذریعہ مکتوب یا اخبار اصل واقعہ کی تحقیق فرماتے کہ بحکم آیت ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا اور

تحقیق کرنی واجب تھی جس کا مفتی صاحب نے خلاف کیا تو اب ان کو ارشاد الٰہی ولن لم تفعلوا فانه فسوق بکم واتقوا اللّٰه پر غور فرما کر فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین سے نتیجہ اخذ کرنا چاہیے۔

راقم الحروف سائل کی معاندانہ غلط بیانی اور مفتی صاحب کے فیصلہ کے دلائل اور حکم کو نظر انداز کرتا ہے۔ ان کے صرف ایک حکم پر جو مندرجہ ذیل ہے۔ چند سوالات پیش کرتا ہے جن کے جوابات دینا مفتی صاحب کا فرض منصبی ہے اور ان کے اخلاق کریمانہ سے توقع ہے کہ وہ ضرور بندہ کے سوالات کے جوابات بذریعہ اخبار شائع فرمائیں گے تاکہ بندہ راقم الحروف اور سائل اور دیگر ناظرین اخبار ان سے مستفیض ہو کر آنجناب کا شکریہ ادا کر سکیں۔ ہر سوال کا جواب مدلل طور پر محققانہ ہونا ضروری ہے۔ واضح ہو کہ آنجناب نے سائل کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا پہلی اذان مسجد کے باہر کی جائے۔ تب بھی بدعت ہے۔ یہ ارشاد فرمایا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اذان مسجد سے باہر ہی کہلائی تھی۔ اگر کوئی اس پر عمل کرے تو اس کو یہ حق ملنا چاہیے۔ یہ بدعت کے ضمن میں نہیں آتی۔ آپ کے اس عقیدہ و عمل و حکم شرعی پر بندہ کے مندرجہ ذیل سوالات ہیں۔ جن کا آپ کو حل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ آپ کو اور بندہ کو اذان عثمان رضی اللہ عنہ کی تحقیق کرنے میں آسانی ہو۔ چونکہ اذان پہلی جمعہ کے دن پاکستان میں خصوصاً اور دیگر ممالک میں عموماً رائج ہے۔ جس کو بعض سنت نبوی اور بعض سنت عثمانی اور بعض بدعت قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا اس اذان کی مسلمہ اور شرعی تحقیق ضروری ہے۔ پس سوالات یہ ہیں:

سوال نمبر۱ جمعہ کے دن خطبہ کی اذان سے پہلے جو اذان دی جاتی ہے۔ یہ عہد نبوی اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں رائج تھی یا نہیں۔ اگر اس اذان پر ان کا تعامل تھا تو اس کا ثبوت کیا ہے۔ باحوالہ جواب مدلل تحریر فرمائیں۔ کیونکہ ایک گجراتی عالم جو مدعی مذہب اہل حدیث ہے' اس کا عامل و قائل ہے۔ اگر ان تین زمانوں میں اس اذان کا وجود نہ تھا' انہوں نے باوجود داعیہ ہونے کے اس کو ایجاد نہ کیا تو کیا یہ سنت ترکیہ کہلا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کہلا سکتی ہے تو سنت نبویہ اور سنت صدیقیہ اور سنت فاروقیہ کے مقابلے میں سنت عثمان رضی اللہ عنہ کو کس دلیل سے ترجیح دی جا رہی ہے۔ جو

اگر سنت ترکیہ نہیں کہلا سکتی تو سنت ترکیہ کی تعریف کر کے پھر یہ بتایا جائے کہ انہوں نے باوجود داعیہ کے یہ اذان کیوں نہ جاری کی؟ سنت ترکیہ بیان کرنے سے پہلے اپنے استاد صاحب کا رسالہ "الاصلاح" کا مطالعہ فرما لیں اور اگر فرصت ہو تو پھر کتاب الاعتصام شاطبی کا مطالعہ بھی کر لیں تاکہ آپ کو اپنے اخبار الاعتصام میں سنت اور بدعت کے بارہ میں فتویٰ دینے میں راہ صواب میسر ہو۔

سوال نمبر۔۲ تین مقدس زمانوں کے تعامل کے خلاف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ اذان جاری کیوں کی؟ کیا یہ وقتی طور پر انتظامی تھی یا شرعی تھی؟ اگر انتظامی تھی تو ان کے بعد دیگر خلفاء کے زمانوں میں رائج کیوں رہی۔ اگر شرعی تھی تو کیا دین کامل ہو جانے کے بعد کسی خلیفہ کو عبادات میں کسی چیز کے بڑھانے' گھٹانے کا اختیار شارع نے دیا ہے؟ اور کیا اسوۂ حسنہ کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے کسی کو شریعت بنانے کا اختیار دے کر اسوۂ حسنہ بنایا ہے کہ لوگ پہلے اسوۂ حسنہ اور دوسرے اسوۂ حسنہ پر بھی عمل کرتے رہیں۔

سوال نمبر۔۳ جب اذان عثمانی جاری ہوئی تھی' اس وقت جمعہ میں توحد تھا یا تعدد؟ اگر تعدد تھا تو اس کا ثبوت درکار ہے؟ اگر تعدد کا ثبوت کسی دلیل صحیح اور قطعی سے نہیں ہے اور عہد عثمانی میں جمعہ سب شہروں میں عموماً اور مدینہ شریف میں خصوصاً ایک ہی تھا تو پھر تعدد جمعہ کی صورت میں ہر ہر مسجد میں دو دو اذانیں کہ اگر کسی شہر میں سو مسجد ہو تو سو اذان عثمانی اور دو سو ہوں تو دو سو اذان اور پانچ سو ہوں تو پانچ سو اذان ہوئی۔ کیا اذان عثمانی کی یہی کیفیت تھی۔ اگر یہی صورت اور ہیئت تھی تو اس کا ثبوت مع دلیل درکار ہے۔ اگر اس حقیقت سے ثبوت عہد عثمانی میں نہیں تھا تو پھر اب اس کو اذان عثمانی کہنا سراسر غلط ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ وجہ بیان کریں۔

سوال نمبر۔۴ عہد عثمانی میں جب پہلی اذان جاری ہوئی تو اس وقت ہی سب شہروں میں جاری ہو گئی تھی یا کسی شہر میں اس پر عمل جاری نہ ہوا تھا۔ کیا دیہات میں بھی جمعہ کی دو اذانیں ہوتی تھیں یا ایک پر ہی کفایت کی جاتی تھی۔ مدلل ثبوت مطلوب ہے۔

سوال نمبر۔۵ کیا اذان عثمانی پر کسی صحابی نے یا تابعی نے بدعت ہونے کا حکم

نکلا تھا یا نہیں؟

سوال نمبر-۶ سبل الاسلام جلد اول' ص-۲۲ میں اذان عید کے بارہ میں فعل ابن زبیر و معاویہ و خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہم لکھ کر پھر یہ لکھتا ہے' بل فعل ذالک بدعۃ- جب قرون ثلاثہ میں یہ عمل ہوا اور معاویہ و عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما خلفاء تھے تو پھر ان کے عمل کو بدعت کیوں کہا گیا؟

سوال نمبر-۷ سبل الاسلام جلد اول' ص-۲۲ میں یہ لکھتا ہے' ولا یصح منہ القیاس لان ماوجد لسببہ فی عصرہ ولم یفعل ففعلہ بعد عصرہ بدعۃ- کیا یہ اصول صحیح ہے اور آپ کو مسلم ہے؟ اگر مسلم ہے تو پھر اذان عثمانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایجاد کیوں کی؟ اگر یہ کہا جائے کہ پھر لوگوں کی کثرت ہو گئی تھی اور سبب دیگر پیدا ہوا جو عہد نبوی میں نہ تھا تو پھر یہ عرض ہے کہ جہاں یہ سنت اور سبب نہ ہو (مثلاً دیہات میں جہاں آبادی قلیل ہوتی ہے) تو پھر یہ اذان وہاں نہ ہونی چاہیے- کیونکہ یدور الحکم کما تدور العلۃ-

سوال نمبر-۸ سبل الاسلام جلد اول' ص-۲۲ میں (اذان عثمان کا ذکر کر کے پھر) یہ کہتا ہے ثم جعلہ الناس من بعدہ- اس کا مطلب کیا ہے؟ اور بحوالہ فتح البیان جو یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اذان عثمانی کو بند کرا دیا تھا- کیا یہ صحیح ہے-

سوال نمبر-۹ اگر کوئی شخص تعدد جمعہ کی وجہ سے اور سبل الاسلام جلد اول' ص-۲۵ میں یہ عبارت پیش نظر رکھ کر ان الاذان قبل الجمعۃ فھو محدث بعد وفاتہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا یسمیٰ اذانا شرعیا- یہ کہے کہ یہ اذان شرعی نہیں ہے اور بقول حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ یہ بدعت ہے- اس کو ترک کر کے صرف اذان نبوی' صدیقی' فاروقی پر اکتفا کرو- دیہات میں تو عہد عثمانی میں بھی اس پر تعامل ثابت نہیں- تو کیا اس کا قول صحیح ہے یا غلط ہے؟ اگر غلط ہے تو اس کی دلیل شرعی کیا ہے؟

سوال نمبر-۱۰ شہروں بلکہ دیہات میں بھی تعدد جمعہ اور اذان عثمانی متعدد ہے- بلکہ خانہ بدوش قوم جنگل میں جمعہ پڑتی ہے- تب بھی اذان عثمانی کہتی ہے اور لاؤڈ سپیکر شہروں' قصبوں' دیہات میں سب اذانوں پر بول رہا ہے- کیا اس ہیئت اور وصف سے اذان عثمانی کہی جاتی تھی؟ اور کیا کسی چیز کے اوصاف اور ہیئت اور کیفیت بدلنے

سے اس چیز کا حکم بدلتا ہے یا نہیں؟ الاعتصام شاطبی کا مطالعہ کر کے جواب دیں۔

سوال نمبر۱۱ اگر کسی امر مسنون یا مندوب کو عوام واجب و لازم سمجھ لیں یا کسی فرض کا جزو قرار دیں کہ اس کے تارک کو ملامت کریں اور عیب لگا دیں تو کیا اس کا ترک کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال نمبر۔۱۲ حدیث "علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین" میں سنت خلفاء سے مراد سنت نبوی ہے یا سنت کے سوا ان کا ذاتی عمل سنت ہے؟ اگر شق اول مراد ہے تو پھر اس کے مکرر ذکر کرنے سے کیا فائدہ اور اس کو سنت نبوی کے مقابلہ میں کیوں ذکر کیا؟ شق دوم مراد ہے تو پھر اس قاعدہ کا مطلب کیا ہے کہ معرفہ جب مکرر لایا جائے تو وہ عین اولیٰ ہوتا ہے۔ جیسے نور الانوار میں ہے المعرفة اذا اعیدت کانت الثانیة عین الاولی۔ اور نیز جب خلفاء کی سنت مستقل قابل اتباع ہے تو وہ شارع قرار پائے۔ حالانکہ قرآن یوں ناطق ہے: ام لهم شرکاء شرعوالهم من الدین مالم یاذن به الله اور آیت لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنه کہ اسوۂ حسنہ صرف رسول اللہ ﷺ کو قرار دیا ہے اور سنت خلفاء سے مراد چاروں خلفاء کا مشترکہ اور متفقہ تعامل مراد ہے۔ اور فعل سے زیادہ خلفاء کے قول کی اہمیت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر ہے تو پھر قول علی رضی اللہ عنہ کی بناء پر کہ لا جمعة ولا تشریق الا فی الجامع یعنی دیہات میں جمعہ نہیں ہے تو پھر جمعہ کیوں پڑھا جاتا ہے۔

سوال نمبر۔۱۳ اذان ثانی قبل الزوال کی جائے گی یا بعد الزوال؟ اگر بعد الزوال ہو تو پھر اس کا فائدہ کیا۔ بعد الزوال تو اذان خطبہ ہو گی اور اگر قبل الزوال کی جائے گی تو پھر یہ نماز جمعہ کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کسی نماز کی اذان قبل از وقت نماز جائز نہیں ہے۔ پھر یہ اذان وقتی ہے یا بے وقتی؟ اس اذان کے بارہ میں جو یہ وارد ہے کہ ثبتت الامر علی ذالک۔ یہ اثبات خاص مدینہ کے لیے وارد ہے یا تمام بلاد میں؟ اگر مدینہ سے خاص ہے تو پھر دیگر مواضع میں ناجائز ہوا اور اگر یہ اثبات و رواج تمام بلاد میں ہوا تو پھر یہ کیوں کہا گیا ہے کہ مکہ میں حجاج نے اور بصرہ میں زیاد نے جاری کی۔ اور کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بند کرا دی اور اہل مغرب میں جاری ہی نہیں ہوئی۔ دیگر یہ کہ مرعاة المفاتیح ج۔۲ ص۔۳۰۸ میں یہ لکھا ہے کہ مسجدیں بہت

ہو گئی ہیں اور جمعہ میں تعدد تو اب ایک اذان مسنون شرعی پر اکتفاء کرنا چاہیے- جب اس پر کوئی طعن ملامت کر کے ضروری قرار دے تو کیا یہ اذان بدعت ہو گی یا نہیں؟ اگر نہیں تو حضرت ابن مسعود ؓ نے ایک طرف دائیں کو ہمیشہ سلام پھیرنے کو شیطان کا حصہ کیوں ٹھہرایا تھا اور حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے باوجود استطاعت کے قربانی کیوں ترک کر دی؟ حالانکہ یہ شعار اسلام اور سنت واجبہ نبویہ تھی؟۔

ان سوالوں کے جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو گی مبارک تمہیں

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث لاہور جلد-۲' شمارہ-۱۳' مورخہ ۲۶/ مارچ سنہ-۱۹۷۱ء

نماز کے مسائل

مشرک عالم کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال : کیا مشرک مولوی کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟
لیس نائیک ڈی' او' آر' اے نیاز محمد نمبر ۸۷ ملٹری ڈینٹل سینٹر بنوں چھاؤنی۔
جواب : جو بھی مشرک بدعتی ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے۔ اگر شرک وبدعت سے محفوظ ہو اور تقلید نہ کرتا ہو تو نماز درست ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم

(۱) عذر کی بنا پر گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت (۲) قبرستان میں ہاتھ اُٹھا کر دعا کیسے کی جائے؟ (۳) مروجہ فاتحہ خوانی کا کوئی ثبوت نہیں (۴) معذور امام کی اقتداء کا حکم

سوال نمبر ۱ : ایک آدمی کا نچلا دھڑ اتنا کمزور ہے کہ سجدہ کرنے سے بھی قاصر ہے اور نماز بھی اشارے سے ادا کرتا ہے' چلنے کی بھی طاقت نہیں' مشکل سے بیٹھ کر وضو اور استنجاء کرتا ہے' راستہ کے درمیان میں ایک اینٹ کی بھی رکاوٹ آجائے تو عبور کرنا دشوار ہے' پھر قضائے حاجت بھی مسجد کے استنجاء ہی میں کرنی پڑتی ہے' جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے اور باہر جانے کی طاقت نہیں۔ اگر یہ مریض گھر میں ہی نماز ادا کر لے تو جائز ہے یا نہیں؟ عبداللہ بن ام مکتوم (صحابی رسول ﷺ) نابینے تو ضرور تھے لیکن چل پھر سکتے تھے اور

مذکورہ مریض تو چل بھی نہیں سکتا' اس کے متعلق تفصیل سے تحریر فرمائیں۔
سوال نمبر ۲ : زیارت قبور کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے یا نہیں؟
سوال نمبر ۳ : تعزیت کے وقت (یعنی مرنے والے کے گھر میں افسوس کے لیے جا کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے یا نہیں؟
سوال نمبر ۴ : جو آدمی سجدہ کرنے سے قاصر ہے' وہ اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے اور اشاروں سے نماز ادا کرنے والا جماعت بھی کروا سکتا ہے یا نہیں؟ اور بیٹھ کر جماعت کرانی جائز ہے کہ یا نہیں؟ اور مقتدی کس طرح کریں؟
سائل : محمد دین چک حسن آرائیں (لاہوریاں والا) ڈاک خانہ خاص تحصیل پاک پتن ضلع ساہیوال

جوابات : نمبر ۱ : ایسا معذور شخص گھر میں نماز پڑھ سکتا ہے' صحیح بخاری پارہ نمبر ۳ میں باب الرخصة في المطر والعلة ان يصلي في رحله (باب اس مسئلہ کے بیان میں کہ بارش اور کسی عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت ہے) کے تحت اس مسئلے کے ثبوت کے لیے امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری علیہ رحمۃ الباری نے دو احادیث ذکر کی ہیں' جن کا ترجمہ یہ ہے کہ نافع تابعی نے بیان کیا کہ ایک دن سخت سردی اور آندھی کی رات عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما نے اذان دی تو یہ کلمہ کہا الا صلوا في الرحال (یعنی حی علی الصلوٰۃ' حی علی الفلاح کی جگہ) کہ "لوگو اپنے گھروں میں نماز پڑھو" اس کے بعد یہ فرمایا کہ آنحضرت ﷺ سردی اور بارش کی رات میں مؤذن کو یہ حکم فرماتے کہ اذان میں یہ کلمہ کہو الا صلوا في الرحال "لوگو اپنے ٹھکانوں' مکانوں میں نماز پڑھ لو۔" اس حدیث میں سخت سردی یا بارش یا آندھی چل رہی ہو تو یہ کلمہ کہنے کا حکم ہے اور ایسے موقعہ پر نماز گھر میں پڑھنے کی اجازت ہے۔

اسی طرح ایسے موقعہ پر نماز جمعہ کی بھی رخصت ہے۔ چنانچہ دوسرا باب جمعہ کے بارہ میں لکھ کر یہ حدیث پیش کی کہ جمعہ کے دن بارش سے کیچڑ ہوا تو ابن عباس رضی اللہ عنھما نے مؤذن کو حکم دیا کہ الصلوٰة في الرحال کہہ دے' جب اس نے کہا تو اس پر اعتراض کیا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما نے فرمایا' ان هذا فعله من هو خير مني کہ "یہ عمل تو انہوں نے بھی کیا تھا جو مجھ سے بہت بہتر تھے" یعنی نبی کریم ﷺ۔ ابن عباس رضی اللہ

عتبان نے کہا کہ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ تم کو گنہگار کروں کہ تم کیچڑ میں چل کر آؤ اور گھٹنوں تک کیچڑ سے آلودہ ہو جاؤ۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بارش کے دن جمعہ نہ پڑھے تو یہ جائز ہے' اس کی رخصت ہے۔

دوسری حدیث یہ ذکر کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے امام تھے اور وہ اندھے تھے' انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ یارسول اللہ میں نابینا شخص ہوں' کبھی رات کو اندھیرا ہوتا ہے اور بارش کا پانی راستہ میں چلتا ہے' آپ ہمارے گھر تشریف لے چلیں' وہاں ایک جگہ پر آپ نماز پڑھ دیں تو میں اس جگہ کو اپنا مصلی (یعنی اپنی نماز کی جگہ) بنا لوں اور وہاں نماز پڑھ لیا کروں۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور یہ فرمایا کہ تم کون سی جگہ کو اپنی نماز کی جگہ بنانا چاہتے ہو؟ عتبان رضی اللہ عنہ نے گھر میں ایک مناسب جگہ بتلا دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں نماز پڑھ دی۔"

اس حدیث میں عتبان رضی اللہ عنہ نے تین عذر بیان کئے تھے۔ اندھا پن' اندھیری رات' راستہ میں پانی کا چلنا۔ آپ نے ان کے عذروں کو قبول کر کے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی حالانکہ وہ اپنی قوم کے امام تھے۔ سوال میں جس معذور شخص کا ذکر ہے وہ تو حضرت عتبان رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ معذور ہے' لہذا اس کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر میں مقام نماز مقرر کر کے وہاں نماز پڑھ لیا کرے۔ غور کرو کہ بارش کی وجہ سے لوگوں کو مسجد میں آنے کی تکلیف محسوس کی تو الا صلوا فی الرحال کہہ کر گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی' حالانکہ سب لوگ آسکتے تھے لیکن کیچڑ وغیرہ سے تکلیف تھی' تب رخصت مل گئی۔ لیکن کوئی شخص ہمت کر کے آئے تو یہ افضل ہے اور زیادہ ثواب ملے گا' یہ عزیمت ہے' وہ رخصت ہے۔

نمبر۲ : قبرستان میں اموات کے حق میں ہاتھ اٹھا کر دعا کر سکتا ہے۔ ویسے بھی کسی مسلمان کے مرنے کی خبر سنے تو اسی جگہ وضو کر کے دعا کر سکتا ہے اور یہ دعا ہاتھ اٹھا کر کر سکتا ہے۔ مسلم شریف میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر صحابی رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کی خبر سنی تو فرمایا پانی لاؤ' پانی لایا گیا' فتوضاء منه ثم رفع يديه ثم قال اللّٰهم اغفر لعبيد بن عامر حتى رايت بياض ابطيه (الحديث) (مسلم شریف جلد۲' ص ۳۰۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا پھر دونوں ہاتھ اٹھائے اس قدر کہ (حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا کہنا

ہے کہا میں نے دونوں بغلوں کی سفیدی دیکھی۔" یعنی ہاتھ اٹھانے میں مبالغہ فرمایا[1]

اور مسلم جلد ۱ ص ۳۱۳ میں طویل حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات جنت البقیع تشریف لے گئے فقام واطال القیام ثم رفع یدیہ ثلاث مرات ثم انصرف "وہاں بہت دیر تک قیام کیا پھر تین دفعہ ہاتھ اٹھائے اور دعاء کی پھر واپس پھر گئے۔" اس حدیث پر شرح مسلم میں لکھا ہے : فیه استحباب اطالة الدعاء وتکریره ورفع الیدین فیه وان دعاء القائم اکمل من دعاء الجالس فی القبور۔ یعنی "اس حدیث سے یہ ظاہر ہوا کہ لمبی دعاء مانگنا مستحب ہے اور دعاء مکرر مانگنا کہ تین بار دعاء کی اور دعاء میں دونوں ہاتھ اٹھانے بھی مستحب ہیں اور قبرستان میں دعا کرنا کھڑے ہو کر بیٹھ کر دعاء کرنے سے مستحب اور کامل ہے۔"

---

(1) الاعتصام : یہ ایک طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ سے مروی ہے۔ قصہ یوں ہوا کہ غزوہ حنین میں ان کے چچا حضرت ابو عامر اشعری ؓ کو دشمن کے ہاتھوں ایسا شدت سے تیر لگا کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اتنے میں حضرت ابو موسیٰ ؓ نے ان کے دشمن کا تعاقب کر کے اس کو تو ڈھیر کر دیا اور خود چچا کے پاس پہنچ گئے جو قریب المرگ تھے۔ انہوں نے وصیت کی بھتیجے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دے کر میرا سلام عرض کر کے درخواست کرنا یقول لک ابو عامر استغفر (ابو عامر ؓ نے کہا ہے کہ میرے لیے دعائے مغفرت فرمایئے) چنانچہ حضرت ابو موسیٰ ؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' سارا ماجرا سنایا اور چچا کی وصیت بھی بتائی' اس پر آنحضرت ﷺ نے وضو فرمایا اور ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی اللھم اغفر لعبید ابی عامر اور ہاتھ اٹھانے میں قدرے مبالغہ کرتے ہوئے یہ دعا بھی فرمائی اللھم اجعله یوم القیامة فوق کثیر من خلقک (یااللہ! اس کو قیامت کے دن بہت سے لوگوں سے اونچا درجہ عنایت فرما)

حضرت ابو موسیٰ ؓ نے عرض کیا حضور! میرے لیے بھی دعا فرمایئے' آپ نے دعائے مغفرت فرمائی' اللھم اغفر لعبد الله بن قیس ذنبه وادخله یوم القیامة مدخلا کریما الحدیث (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۰۳ باب فضائل ابی موسی وابی عامر الاشعریین) اس پس منظر میں مسئلہ زیر نظر کے لیے یہ استدلال محل نظر ہے۔ سیاق حدیث تو خصوصیت کا مشعر ہے' امام نووی نے دعا اور دعا میں رفع الیدین کا استحباب اس سے ثابت کیا ہے نہ کہ میت کے لیے بہیئت کذائی دعاء کا۔

امام نووی اس بات کی شرح میں لکھتے ہیں : فیه استحباب الدعاء واستحباب رفع الیدین فیه "میت کے حق میں دعا کرنا اور دعا میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے" (میت کے حق میں نووی کی عبارت کا یہ لفظی ترجمہ نہیں۔ عطاء اللہ حنیف) فاللھم وتدبر ھذا ما عندی واللہ اعلم (محمد عطاء اللہ حنیف)

نمبر ۳ : تعزیت کا مروجہ طریقہ اور گھر کے سامنے فرش بچھا کر تین دن بیٹھنا اور فاتحہ خوانی کا سلسلہ جاری رکھنا بدعت ہے۔ اس کا ثبوت قرون ثلاثہ سے نہیں پایا گیا۔ اس کا مفصل بیان میرے رسالہ فاتحہ خوانی میں ہے' اسی طرح اذان اور احکام جماعت میری کتاب الاذان میں درج ہیں۔

نمبر ۴ : اشاروں سے نماز پڑھنے والے اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو مستقل امام مقرر نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ تو معذور ہوتا ہے اور مقتدی غیر معذور' تو ان کو خواہ مخواہ اس کی اقتداء میں امام جیسے افعال کرنے پڑتے ہیں۔ ہاں کبھی امام پر حادثہ گذرے اور وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں کو بھی امام کی اقتداء میں بیٹھ کر نماز پڑھنی ہو گی۔ چنانچہ قولی حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ سواری سے گر پڑے تھے تو آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی تھی اور مقتدیوں کو بھی یہ حکم دیا تھا۔ اذا صلی الامام جالسا فصلوا جلوسا واذا صلی قائما فصلوا قیاما ولا تفعلوا کما تفعل اهل فارس بعظمائهم۔ یعنی "امام جب بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو اور جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم مقتدی بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور ایسا نہ کرو جیسے اہل فارس اپنے بزرگوں کی تعظیم میں کرتے ہیں۔"

یہ حدیث صحیح ہے' جو کتب حدیث میں متعدد سندوں سے مروی ہے اور قوی ہے اور گمراہ قوموں کی مشابہت سے روکتی ہے اور اس کے معارض جو آنحضرت ﷺ کی نماز واقعہ مرض الموت کے بارہ میں مروی ہے' وہ فعلی ہے اور متعدد وجوہ کا احتمال رکھتی ہے اور اس کی صورت ایسی ہے کہ وہ اصول کے خلاف ہے جس پر کسی نے عمل نہیں کیا اور نہ ہی کوئی کر سکتا ہے اور اگر کوئی اس پر اصرار کرے تو ایسی صورت سے عمل کرے جو مروی ہے۔ ولم یقل به احدنا هذا ما عندی واللّٰه اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

الاعتصام جلد ۲۹' شمارہ ۳۱' مورخہ ۳ مارچ سنہ ۱۹۷۸ء

مسلک اہلحدیث کی صداقت اور اہلحدیث کی امامت

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کا فیصلہ

اہل تعصب کا تخیل ⇦ بعض علمائے دیوبند علمائے اہلحدیث کی امامت و اقتداء کو ناجائز' مکروہ اور مذہب اہلحدیث کو باطل قرار دے کر اپنے بریلوی مقلد بھائیوں سے اتحاد (عقائد' مسائل اور تقلیدی مسائل میں) پیدا کر رہے ہیں۔

لیکن واضح ہو کہ اکابر علمائے حنفیہ کا فیصلہ ان دیوبندیوں کے سراسر خلاف ہے۔ ذیل میں تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

مولانا اشرف علی تھانوی اپنی کتاب "ضمان التکمیل" کے عشرہ طروس ص-۱۷۰ میں فرماتے ہیں: "مولانا عبدالحی لکھنوی فرید عصر کے تصنیف انفع ہے اور غیر مقلدین کی تصنیف اضر ہے۔" اس کے بعد تھانوی صاحب نے اہل حدیث کو اہل ہوا قرار دیا ہے اور عزیز الفتاویٰ جلد اول' ص-۱۵۸ میں ہے:

سوال اہل حدیث کے پیچھے حنفی المذہب کو اقتداء کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب اس میں تفصیل ہے۔ بعض صورتوں میں درست ہے اور بعض صورتوں میں مکروہ ہے یا درست نہیں۔ پس احتیاط اسی میں ہے کہ اقتداء ان کا نہ کیا جائے۔"

امداد المفتین ص۔۲۷۴ بحوالہ رسالہ المفتی جلد اول میں یہ فتویٰ لکھا ہے:
سوال جو لوگ آمین بالجہر کہتے ہیں' ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟
الجواب آمین بالجہر کہنے والے جو ہمارے دیار میں عام طور پر غیر مقلد ہیں' ان کے پیچھے بلا ضرورت نماز نہ پڑھنی چاہیے کیونکہ وہ وضو اور طہارت میں قواعد کے پابند اور محتاط نہیں۔"

اسی طرح بعض دیگر متعصبین لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مہتمم خیرالمدارس ملتان اپنے رسالہ کے ص۔۳۹ میں فرماتے ہیں: "اس زمانہ میں جو شخص ان چار مذہبوں سے (استخفافا") باہر ہوا' وہ بدعتی اور ناری بہتر فرقوں کے لوگوں میں سے ہے۔"

مولانا جالندھری نے جو عبارت طحطاوی سے نقل کی ہے' اس میں "استخفاف" کی قید نہیں ہے بلکہ علی الاطلاق حکم بدعت کا لگایا گیا ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ "جو شخص مرتبہ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو اس پر مذاہب مجتہدین میں سے کسی مذہب معین کی تقلید کا التزام واجب ہے۔" یہ تو اہل تعصب اور اہل غلو کا تخیل ہے۔

اکابر علمائے احناف کا فیصلہ ⇦ اب آیئے اکابر علمائے حنفیہ کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا عبدالحی دنیائے حنفیت میں تاج العلماء ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب ان کی تصدیق فرما چکے ہیں کہ "ان کی تصنیف انفع ہے۔"

مولانا عبدالحی صاحب سے کئی سوالات کیے گئے تھے۔ ان سوالات کی نقل میں طوالت ہو گئی۔ بندہ جوابات نقل کرتا ہے۔ اس سے ناظرین سوالات کو خود سمجھ لیں یا اصل میں ملاحظہ کر لیں۔

فتاویٰ عبدالحی جلد۔۲' ص۔۲۰۸ میں چند سوالات کے بعد یہ جوابات نمبروار درج ہیں۔

(۱) مسلمان ہونے میں حنفی وغیرہ ہونا شرط نہیں کیا گیا ہے اور نبی اکرم ﷺ اور

صحابہ کرام کے وقت میں مسلمان لوگ حنفی' شافعی وغیرہ کے نام سے موسوم نہ تھے۔ اماموں نے اپنے قول کی تقلید کی اجازت دی ہے۔ اس حالت میں جب خلاف قرآن و حدیث نہ ہو۔

زمانہ صحابہ اور تابعین کے مسلمان ان لوگوں سے اچھے تھے جو عامل' حدیث' قرآن و حدیث سے ناراض ہیں اور حضور سرور کائنات علیہ السلام نے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین رضوان اللہ علیہ اجمعین کے زمانے کو اچھا کہا ہے اور پچھلے زمانے میں جھوٹ اور گناہ پھیلنے کی خبردی ہے۔

(۲) مسجد بنانے والے کی ملکیت میں مسجد نہیں رہتی اور اس میں سب مسلمان بطور شرع نماز ادا کر سکتے ہیں اور ایک وقت اور ایک جماعت سے پڑھ سکتے ہیں۔ البتہ ایک مسجد میں ایک وقت میں دو جماعتوں سے نہیں پڑھ سکتے۔

(۳) مندرجہ سوال شخص مسلمان سنی ہے بشرطیکہ قرآن و حدیث پڑھنے کی قابلیت رکھتا ہو اور اس کو تخریب دین منظور نہ ہو۔ (یہ جواب اہلحدیث کے متعلق ہے)

(۴) آمین بالجہر کہنا حضرت سرور انبیاء ﷺ کا فعل ہے اور یہ اسلام کی بات ہے اور حدیث صحیح سے ثابت ہے۔ اور حنفی بھی اس مضمون کو لکھتے ہیں مگر اختلاف ہے اور بہت سے قدیم مسلمانوں کا یہ فعل ہے۔

(۵) آمین بالجہر کہنے سے کہنے والے یا اس کے ساتھیوں کی نماز کا ٹوٹنا یا نقصان وغیرہ ہونا حنفیوں کی کسی معتبر کتاب میں نہیں ہے۔

(۶) باوجود علم اس امر کے کہ آمین بالجہر کہنا فعل نبوی ہے۔ اس سے ناراض ہونا مسلمان کا کام نہیں ہے اور حدیث کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے اور امام یا عالم کا جو قول یقیناً قرآن و حدیث کے خلاف ہو' اس پر عمل کرنا اور قرآن و حدیث کو چھوڑنا مسلمان کا فعل نہیں ہے اور جو شخص حضور سرور انبیاء ﷺ کے حکم کو باوجود اس جاننے کے کہ یہ حکم نبوی ہے معیوب سمجھے' وہ مسلمان نہیں ہے اور عاملوں کو برا جاننا درست نہیں۔

(۷) امور و احکام مذہبی میں رسم و رواج کو دخل نہیں ہے اور زور سے آمین کہنے والا اگر اس کو اتباع شریعت منظور ہو فساد منظور نہ ہو تو حنفیوں کے ساتھ نماز پڑھ

سکتا ہے۔
(۸) جو شخص کسی کو مسجد میں نماز پڑھنے یا یاد الٰہی سے بغیر وجہ شرعی کے روکے' اس کو اللہ نے ظالم کہا ہے اور سخت عذاب کا موعود کیا ہے۔
(۹) آمین بالجہر کو منع کرنا امور مذہبی میں دست اندازی ہے اور آمین بالجہر کہنے والوں کا دینی نقصان ہے اور مسجد میں ہر مسلمان کو شرعی طریقے پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔"

ناظرین کرام! یہ جوابات صحیح ہیں جو بلا عصبیت دیئے گئے ہیں اور یہ کسی معمولی شخصیت کی طرف سے نہیں' ان سے ثابت ہوا کہ: اہلحدیث کا مسلک درست ہے اور ان کے اعمال حق ہیں۔ ان کے پیچھے نماز جائز اور درست ہے۔
پھر ص ۲۰۶ عربی عبارات فقہاء سے ثبوت دیا ہے' ان کے تراجم پیش کرتا ہوں' جو یہ ہیں:
(۱) جس نے جماعت اور جمعہ کو امام فاجر کی امامت کی وجہ سے چھوڑا وہ بدعتی ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک اصح یہ ہے کہ نماز اس کے پیچھے پڑھ لے اور اس کا اعادہ نہ کرے۔
(۲) اور پھر منتقی سے نقل کیا ہے کہ "حضرت امام ابوحنیفہ سے پوچھا گیا کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب کیا ہے؟ تو امام صاحب نے کئی مسائل بیان فرماتے ہوئے فرمایا: "اور یہ کہ ہر ایک نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھے۔"
(۳) اور شرح عقائد میں ہے کہ "ہر ایک نیک اور بد کے پیچھے نماز جائز ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ "صلوا الخ" اور علماء امت فاسقوں اور اہل ہواء و بدعت کے پیچھے بغیر کسی ناگواری کے نماز پڑھتے تھے۔" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ "شیعہ اس کے خلاف ہیں کیونکہ انھوں نے امامت صغریٰ میں ویسے ہی شرط لگائی ہے جیسے امامت کبریٰ میں۔" اور خوارج بھی اس کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک کافر فاجر ہیں۔
پس ثابت ہو گیا کہ امام اعظم امام ابوحنیفہ اور تمامی اہل سنت وجماعت کا بھی عقیدہ ہے کہ "ہر مومن کے پیچھے نماز جائز ہے اور جو شخص جمعہ اور جماعت امام کے

فاجر ہونے کی وجہ سے ترک کرے وہ مبتدع اور گمراہ ہے۔ شیعہ اور خارجی کا عقیدہ رکھتا ہے۔

اور ج-۳' ص-۲۰۵ میں قول سدید سے نقل کیا ہے' جس کا ترجمہ یہ لکھا ہے:
"بعض مسلمانوں کے پیچھے بعض کی نماز جائز ہے۔ جیسا کہ صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگ یعنی ائمہ اربعہ وغیرہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ باوجود ان مسائل اور دوسرے مسائل میں یہ لوگ مخالف تھے اور آپس میں تنازع تھا اور سلف میں سے کوئی اس کا قائل نہ تھا کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہ پڑھیں اور جو اس کا انکار کرے وہ بدعتی گمراہ اور مخالف کتاب و سنت و اجماع سلف امت و ائمہ ہے۔ صحابہ و تابعین و متاخرین میں سے بعض بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے اور بعض زور سے پڑھتے تھے اور بعض زور سے نہیں پڑھتے تھے۔ باوجود اس کے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔"

نیز ج-۳' ص-۲۰۰ میں مولانا عبدالعلی لکھنوی فرنگی محلی کی شرح مسلم الثبوت کی عربی عبارت لکھ کر ترجمہ یوں کیا ہے: "فضیلت رکھنے والے کے ہوتے ہوئے کم فضیلت رکھنے والے کی پیروی کرنا' اکثر کے نزدیک جائز اور کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اکثر حنابلہ ہیں اور اس مذہب کو ابن حاجب نے اختیار کیا ہے۔ اور مصنف نے بھی ان کی پیروی کی ہے اور امام احمد سے مروی ہے کہ ارجح پر نظر کرنا واجب ہے اور اسی مذہب کو قاضیہ نے اختیار کیا ہے۔ اور ایک امام کا مقلد مذہب مختار پر دوسرے کی بھی تقلید کر سکتا ہے۔ کیونکہ استقرار سے یہ بات ثابت ہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ سے لے کر اب تک ہر زمانے میں مستفتی کبھی ایک مجتہد سے اور کبھی دوسرے سے سوال کرتے تھے اور اگر کوئی شخص خاص مذہب کو اختیار کر لے تو اس پر اسی مذہب کا التزام بعض لوگوں کے نزدیک ضروری ہے۔ حتیٰ کہ بعض اس کے قائل ہیں کہ حنفی جب اپنے امام کے مذہب کو ترک کر دے تو اسے تعزیر کی جائے گی۔ حق یہ ہے کہ یہ تعصب ہے' اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ خود اپنی بنائی ہوئی بات ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے اور تیسیر شرح تحریر میں ہے کہ یہی اصح ہے۔ کیونکہ وہی چیز فرض ہے جسے اللہ تعالیٰ واجب کر دے۔

الحاصل کسی معین مذہب کی تقلید واجب نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کی جانب منتقل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ایسا بقصد لہوولعب و توہین مجتہدین نہ ہو۔ اور ایسا ہی بحرالعلوم مولانا عبدالعلی شرح مسلم الثبوت اور شرح تحریر میں لکھتے ہیں:
"اور عدم وجوب تقلید مذہب معین کو شرعاً محقق کرتے ہیں۔" (الی آخر)
پس اگر مختار اور اصح محققین کے نزدیک عدم وجوب اختیار مذہب معین ہے۔ مگر فی زمانہ عوام کے فتویٰ کے لیے یہی مختار ہے کہ مذہب معین کی تقلید واجب یا مستحسن کہی جائے۔ جیسا کہ بعض اس کے قائل ہیں۔ اور ہرگز عوام اس سے واقف نہ کئے جائیں کہ محققین کے مذہب معین کا اختیار کرنا واجب نہیں ہے۔ البتہ عالم ماہر متقی متدین جو تعصب سے خالی ہو' اگر اپنے مختار کو اختیار کرے تو یہ اس کے لیے اولیٰ اور احسن ہے۔
پھر کسی نے سوال کیا کہ منکرین تقلید کی اقتداء درست ہے یا نہیں؟ اور ان کو مسجدوں سے روکنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب مولانا لکھنوی نے فتاویٰ جلد۔۳' ص۔۳۱۵ میں یہ لکھا ہے: "ہوالمصوب' فی الواقع ایسے لوگوں کو مسجد سے ممانعت کرنا درست نہیں ہے۔ اور ان کی اقتداء درست ہے۔ بعض حنفیہ کے نزدیک مطلقاً اور بعض کے نزدیک بایں شرط کہ امام مقتدی کے مذہب کی مراعات کرے اور کسی امر مفسدہ مبطل صلوٰۃ کا استعمال کرے۔" واللہ اعلم۔
حررہ الراجی عفوربہ القوی محمد عبدالحی تجاوز اللہ عن ذنبہ الجلی والخفی۔ ناظرین کرام! اس سے زیادہ اور واضح فیصلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر تعصب کا علاج کوئی نہیں۔
کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد۔۱۳' شمارہ۔۲۷ مورخہ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۶۱ء

اہلحدیث کی اقتداء اور علماء احناف کا فیصلہ

ہفت روزہ "پیام اسلام" لاہور نے اہل اسلام حنفیہ کو یہ غلط پیام دیا ہے کہ "غیر مقلدین اہلحدیث کی امامت حنفی مذہب میں ناجائز ہے۔"

چنانچہ بعض علماء دیوبند کے فتاویٰ نقل کر کے دھوکہ دیا گیا ہے کہ "حنفی مذہب کا یہ فیصلہ ہے۔" اس کے متعلق میری عرض ہے کہ چودھویں صدی کے حنفی علماء کا یہ فیصلہ باطل ہے اور سلفی علماء حنفیہ کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ کسی عالم امام صلوٰۃ کی اقتداء دو وجہ سے ناجائز ہو سکتی ہے۔

ایک یہ کہ وہ گمراہ اور کافر ہو۔

دوم یہ کہ وہ نماز ایسے طریقہ سے پڑھتا ہو کہ اس کی نماز باطل اور فاسد شمار ہو۔

سو حنفی مذہب کی رو سے یہ دونوں وجہیں اہلحدیث میں نہیں پائی جاتیں۔ اول وجہ کے تو حنفی دیوبندی قائل ہیں یعنی وہ اہلحدیث کو کافر نہیں کہتے۔

ہاں بریلوی حنفی اہلحدیث کی تکفیر کرتے ہیں مگر ان کی حنفیت کا حال یہ ہے کہ:

وہ دیوبندی حنفیوں کو بھی کافر کہتے ہیں مگر ان کا فتویٰ

"کس نمے پرسد"

کے شمار میں ہے۔ باقی رہے اصلی حنفی تو وہ علماء اہلحدیث کو اہل حق میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ "تنظیم اہلحدیث" کی گذشتہ اشاعتوں میں مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم کے فتاویٰ سے اس کی صراحت ہو چکی ہے۔ مزید تسلی کے لیے ایک حوالہ اور پڑھ لیجئے کہ یہ علامہ بارع اصولی حنفی مولانا محمد ملقب بالمعین کا فیصلہ ہے جو "دراسات اللبیب" کے ص ۳۰۰ مطبوعہ کراچی میں درج ہے۔ وہ فرماتے ہیں: واما اصحاب الظواهر فهم اهل الحدیث خیر اهل الحدیث خیر اهل العمل علی الارض وخیار العلماء وسادات هذه الامة والفرقة الناجية ان شاء الله تعالٰی واهل السنة یقولون بوجوه الاستنباط جمیعها الا بالقیاس الخفی الذی یقول به اکثر الفقهاء الخ۔

یعنی "اصحاب الظواہر (جو ظاہر نصوص کتاب و سنت کے عامل ہیں) ہی اصل اہلحدیث ہیں اور بہترین اہل حدیث ہی روئے زمین پر بہترین عامل ہیں اور خیار العلماء

اور اس امت کے پیشوا یہی لوگ ہیں اور انشاء اللہ یہ اہلحدیث فرقہ ناجیہ ہیں اور اہل سنت ہیں جو نصوص شرعیہ سے استنباط مسائل کرنے کے تمام وجوہ کو مانتے ہیں۔ صرف فقہاء (حنفیہ) کے ایسے ظنی قیاسوں کو نہیں مانتے جو وہ اپنی طرف سے ایک علت پیدا کر کے پھر اس کو آگے بڑھا کر اس سے مسائل اختراع کرتے ہیں۔" (جن سے کتب فقہ حنفیہ بھری پڑی ہیں)

اس تشریح سے صاف ثابت ہوا کہ علماء احناف اہل انصاف اہل حدیث علماء کو اہل حق اور فرقہ ناجیہ میں شمار کرتے ہیں۔ جو لوگ اہل ظاہر کو غلطا" گمراہی پر کہتے ہیں۔ ان کی تردید کرتے ہوئے ملا محمد معین فرماتے ہیں: فکیف لا وفی اصحاب الظواهر مثل امام الائمة قبلة مشائخ السنة ابو عبدالله البخاری یعنی "اہل ظاہر کو باقی وغیرہ قبیح کلمے کہنے والے بعض حنفیہ کے کس طرح درست ہو سکتے ہیں کہ اصحاب الظواہر میں (بڑے بڑے ائمہ اہلحدیث جیسے) امام الائمہ جو تمام مشائخ اہل سنت کے قبلہ حضرت ابو عبداللہ البخاری جیسے ہیں' وہ ان میں شمار ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ فقہاء حنفیہ کی ایک اصطلاح ہے کہ وہ اس گروہ کو جو ظاہر کتاب و سنت سے تمسک کرتے ہیں' ان کو اہل الظواهر یا اصحاب الظواهر کہتے ہیں۔ جن کو محدثین کی اصطلاح میں اہلحدیث کہا جاتا ہے۔ بہرحال محدثین اور فقہاء کے نزدیک اہلحدیث فرقہ ناجیہ اور اہل سنت میں شمار ہیں۔ تفصیل کے لیے حضرت العلام محدث روپڑی مفتی اعظم پاکستان' مدظلہ العالی کی کتاب مستطاب "تعریف اہلحدیث" کے ہر دو حصے اول و دوم ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب بہت عمدہ ہے۔

جب اہلحدیث اہل سنت ثابت ہوئے اور بفضلہ تعالیٰ عقائد و اعمال میں اپنے طرز عمل سے عامل بالحدیث ہی ثابت ہیں' تو اب ان کی اقتداء کو مکروہ یا ناجائز جاننے والے اور کہنے والے کا گناہ اسی پر ہے۔

جامع ترمذی میں ہے: فاما من اقام السنة فانما الاثم على مزكرهما وباب ماجاء من ام قوما وهم له كارهون۔ یعنی "جو شخص سنت کو قائم کرے' پس گناہ اس شخص پر ہے جو اس کو اور اس کی اقتداء کو برا جانے۔"

اور اگر خدانخواستہ دیوبندی علماء اہلحدیث کو گمراہ اور فاسق تصور کر کے ان کی

اقتداء کو ناجائز کہتے ہیں تو بھی ائمہ حنفیہ کے نزدیک یہ تصور اور تقول باطل ہے۔ کیونکہ ائمہ حنفیہ نے فاسق کی اقتداء جائز رکھی ہے۔ چنانچہ شرح عقیدہ طحاویہ ص ۳۰۸ میں علامہ صدر الدین علی بن محمد عز الاوزاعی دمشقی حنفی المتوفی سنہ ۷۴۶ھ جو امام حافظ ابن کثیر کے تلامذہ سے ہیں' یہ فرماتے ہیں:

اعلم رحمک اللّٰہ وایانا انہ یجوز للرجل ان یصلی خلف من لم یعلم منہ بدعۃ وفسقا باتفاق الائمۃ ولیس من شرط الائتمام ان یعلم الماموم اعتقاد امامہ ولا ان یمتحنہ فیقول ماذا تعلقہ بل یصلی خلف المستور الحال۔ یعنی "اللہ تعالیٰ تم پر اور ہم پر رحم فرمائے تم یہ مسئلہ سمجھ لو کہ جس شخص کو امام نماز کی بابت کچھ علم نہ ہو کہ اس میں کوئی بدعت یا فسق ہے اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا تمام ائمہ کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے۔ اقتداء کی شرائط میں یہ شامل نہیں کہ مقتدی اپنے امام کا اعتقاد معلوم کرتا پھرے اور اس کا امتحان لیتا پھرے بلکہ چاہیے کہ وہ مستور الحال کے پیچھے نماز پڑھ لے' الخ۔

مبتدع اور فاسق کے پیچھے نماز جائز ہے ⇦ پھر فرماتے ہیں: ولو صلی خلف مبتدع یدعوا الی بدعۃ او فاسق ظاھر الفسق وھو الامام الراتب الذی لا یمکنہ الصلوٰۃ الا خلفہ کامام الجمعۃ والعیدین والامام فی صلوٰۃ الحج بعرفۃ ونحو ذلک فان الماموم یصلی خلفہ عند عامۃ السلف والخلف ومن ترک الجمعۃ والجماعۃ خلف الامام الفاجر فھو مبتدع عند اکثر العلماء۔ یعنی "اگر کسی نمازی نے ایسے بدعتی کے پیچھے نماز پڑھی جو اپنی بدعت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے یا ایسے فاسق کے پیچھے نماز پڑھی جس کا فسق صاف ظاہر ہے اور وہ امام مقرر کردہ ہے جس کو ہٹا نہیں سکتا۔ اسی کے پیچھے نماز پڑھنی پڑتی ہے' جیسے امام جمعہ اور عیدین کا ہے اور عرفات میں نماز حج کا امام ہے تو مقتدی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے۔ یہ ائمہ سلف اور خلف کا مذہب ہے۔ پس جو شخص ایسے امام کے پیچھے جمعہ و جماعت ترک کرے گا وہ اکثر علماء کے نزدیک خود بدعتی ہے۔"

صحیح حکم ⇦ پھر فرماتے ہیں: والصحیح انہ یصلیھا ولا یعیدھا فان الصحابۃ کانوا یصلون الجمعۃ والجماعۃ خلف الائمۃ الفجار (وکان الحجاج فاسقا"

ظالماً) وکذالک انس وکذالک عبداللّٰہ بن مسعود وغیرہ یصلون خلف الولید بن عقبۃ بن معیط وکان یشرب الخمر حتی انہ صلی بھم الصبح مرۃ اربعاً ثم قال ازیدکم فقال لہ ابن مسعود مازلنا معک منذ الیوم فی زیادۃ۔ یعنی "صحیح حکم یہ ہے کہ فاسق فاجر کے پیچھے نماز پڑھ لینی چاہیے اور اس کے پیچھے پڑھ کر پھر دوبارہ لوٹانا نہ چاہیے۔ کیونکہ صحابہ کرام جمعہ' جماعت فجار اور فاسق اماموں کے پیچھے ادا کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حجاج بن یوسف ظالم کے پیچھے نماز پڑھتے رہے اور اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی پڑھتے رہے۔ اور اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ ولید بن عقبہ کے پیچھے نماز پڑھتے رہے جو شرابی تھے۔ حتیٰ کہ اس نے ایک دن ان کو صبح کی چار رکعت پڑھا دیں اور کہنے لگا کیا میں تمہیں اور پڑھا دوں تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم آپ سے آج مسلسل زیادتی میں ہیں۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ حنفی مذہب کی تخم ریزی سب سے پہلے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے۔ غور فرمایئے آپ شرابی اماموں کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ شرح فقہ اکبر ص۹۰ میں بھی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ولید کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور وہ شرابی تھا۔ افسوس ہے کہ شرابیوں کی اقتداء میں نماز جائز ہو اور اہل حدیث کے پیچھے ناجائز۔

یہ فتویٰ تو بریلویوں کے اس فتویٰ کی مثل ہے کہ وہابی نکاح پڑھائے تو حرام ہے' نکاح نہ ہو گا۔ اور برہمن پڑھا دے تو جائز ہے' نکاح ہو جائے گا۔ (فتاویٰ رضویہ ص۱۰ کتاب النکاح احکام شریعت حصہ دوم' ص۲۴)

پس مقلدین کے ایسے ہی غلط اور خلاف عقل و نقل فتوے ہوتے ہیں جن کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

آں مقلد صد دلیل و صد بیاں
بر زباں آرد ندارد ہیچ جاں

بحرالرائق جلد اول' ص۳۴۹ مطبوعہ مصر باب الامامۃ میں ہے: وفی صحیح البخاری ان ابن عمر کان یصلی خلف الحجاج وکفی بہ فاسقا کما قال الشافعی وقال المصنف انہ افسق اھل زمانہ وقال الحسن البصری لو جاءت کل امۃ بخبیثاتھا وجئنا بابی محمد فغلبنا علیھم۔ یعنی "صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ ابن

عمر رضی اللہ عنہ حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے حالانکہ وہ پورا فاسق تھا۔ جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے اور مصنف کنزالدقائق نے فرمایا کہ حجاج اپنے زمانہ کے تمام فاسقوں سے بڑھ کر فاسق تھا۔ حتیٰ کہ امام حسن بصری نے یہ فرمایا ہے کہ اگر کل امتیں اپنی اپنی برائیاں پیش کریں اور ہم اکیلے حجاج کو پیش کریں تو ضرور ہم کل امتوں پر غالب آجائیں گے۔"

میں کہتا ہوں کہ علماء دیوبند اور مدیر "پیام اسلام" پر کس قدر افسوس ہے کہ ان کی معتبر کتابوں میں فاسقوں' ظالموں کی اقتداء میں نماز جائز لکھی ہے۔ مگر یہ لوگ علماء اہلحدیث کی خواہ وہ کتنا ہی متقی ہو' اقتدا ناجائز قرار دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق بخشے' آمین۔

مسئلہ اقتداء اہل حدیث پر لکھتے ہوئے ایسے ہی شرم محسوس ہوتی ہے جیسے صحابہ کرام کا ایمان ثابت کرنے پر ہو لیکن جس طرح اہل تشیع کے مجبور کرنے پر ایمان صحابہ کرام پر ہمیں بحث کی ضرورت پیش آتی ہے' بالکل اسی طرح آج کل کے متعصب مقلدین نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اہل حدیث علماء کی اقتداء (امامت) جائز نہیں۔ اس لیے اس موضوع پر بحث کی ضرورت ہوئی کہ عوام کتاب و سنت کی روشنی سے محروم نہ ہو جائیں۔

ع تعصب میں تمیز حق و باطل ہو نہیں سکتی

یاد رہے کہ اہل حدیث ہی حقیقی معنوں میں اہل سنت ہیں۔ چنانچہ محبوب سبحانی شیخ جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وما اسمهم الا اصحاب الحديث واهل السنة علىٰ ما بينا۔ (غنیہ ص-۲۱۳) اور یہ ایک گروہ ہے نہ تین نہ چار۔ نیز فرماتے ہیں: فاهل السنة طائفة واحدة (غنية الطالبين ص-۲۱۲) یعنی اہل سنت کا ایک ہی گروہ ہے جس کا نام اہلحدیث بھی ہے اور اہل سنت بھی۔

یہ گروہ سنت کے مقابلہ میں رائے کو لینا گمراہی سمجھتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عروہ نے کہا:

"اے ابن عباس! آپ نے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔"

فرمایا: "وہ کیسے؟"

عروہ نے کہا: آپ لوگوں کو فتویٰ دیتے ہیں کہ جب حاجی بیت اللہ کا طواف کر لیں تو احرام سے فارغ ہو جائیں حالانکہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما دسویں تک محرم رہتے اور لبیک پکارتے تھے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھذا ضللتم احدثکم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتحدثونی عن ابی بکر وعمر۔ یعنی "تم کو اسی بات نے گمراہ کیا ہے۔ میں تمہارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کرتا ہوں اور تم ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا ذاتی فعل پیش کرتے ہو۔ (حدیث رسول کے مقابلہ میں امتی کا قول و فعل اختیار کرنا گمراہی ہے) (شرح معانی الآثار طحاوی جلد اول' ص-۳۹۸)

افسوس ہے کہ عروہ کی طرح اہل حدیث کو جو عاملین بالحدیث ہیں' گمراہ سمجھا جا رہا ہے۔ حالانکہ بروئے قاعدہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سنت رسول کو چھوڑنے والے خود گمراہ ہیں۔

مسند دارمی ص-۴۳ میں ہے کہ امام ابن سیرین نے ایک شخص کے سامنے حدیث رسول پیش کی' اس نے کہا فلاں امام نے اس طرح کہا ہے اور فلاں بزرگ نے یوں فرمایا ہے۔

فقال ابن سیرین احدثک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقول قال فلان کذا وکذا لا اکلمک ابدا۔ یعنی "امام ابن سیرین تابعی نے فرمایا: میں نے حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کی ہے اور تو مجھے فلاں فلاں امام اور بزرگ کا قول سناتا ہے۔ آج کے بعد میں تم سے کبھی کلام نہ کروں گا۔ گویا تو نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی اور گستاخی کی ہے۔"

یہ لوگ جو احادیث کا خزانہ ہوتے ہوئے اقوال رجال کا ذخیرہ اٹھائے پھرتے ہیں' ان کی سزا سنیئے: امام وکیع نے فرمایا: "ہدی میں اشعار کرنا سنت ہے۔"

ایک شخص نے کہا: "امام ابراہیم نخعی تو اس کو مثلہ قرار دیتے ہیں۔"

امام وکیع نے فرمایا: اقول لک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتقول قال ابراھیم ما احقک ان تحبس ثم لا تخرج حتی تنزع عن قولک ھذا (ترمذی) یعنی "میں تجھے یہ کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اشعار کرنا چاہیے اور تو کہتا ہے ہمارے امام ابراہیم نخعی نے یوں فرمایا ہے کہ یہ مثلہ ہے (مثلہ حرام ہے)

بس تیری اس گستاخی کی سزا یہ ہے کہ تجھے قید کر دیا جائے اور پھر جب تک تو اس بے ادبی سے توبہ نہ کر لے تجھے رہا نہ کیا جائے۔"

اس لیے امام وکیع نے فرمایا: لا تنظروا الی قول اهل الرائے فی هذا فان الاشعار سنة وقولهم بدعة۔ یعنی "ان اہل الرائے کی بات مت دیکھو۔ اشعار سنت ہے اور ان کا مذہب بدعت ہے۔"

افسوس ہے کہ یہ اہل الرائے ہم اہل سنت' اہل حدیث کی اقتداء ناجائز رکھتے ہیں۔ حالانکہ ائمہ محدثین اور فقہاء ان لوگوں کو ایسا مجرم قرار دیتے تھے کہ ان سے سلام کلام نہ کیا جائے۔ اب چند مسائل کی رو سے ناظرین کرام کو امتحان کر لینا چاہیے کہ سنت رسول پر کون چلتا ہے؟ اور تارک سنت کون ہے۔ پس سنیئے:

"ہم اہل سنت اس امر کے قائل ہیں کہ محتضر (جس کو موت حاضر ہو اور وہ قریب المرگ ہو) کو عندالموت قبلہ رو لٹا دینا چاہیے کہ یہ سنت ہے۔ جس طرح قبر میں میت کو لٹایا جاتا ہے لیکن اہل الرائے کہتے ہیں: بیشک یہ سنت ہے مگر ہم اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اس کو چت لٹایا جائے کیونکہ قیاس یہ ہے کہ اس طرح روح آسانی سے نکل جاتا ہے۔" (ملاحظہ ہو شرح وقایہ)

اب فرمایئے یہ اہل سنت ہے اور نبی رؤف رحیم کی سنت کے مقابلہ میں اپنا قیاس چلانے والا کون ہے؟

بس ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
اب آیا ہے مزاج تیرا امتحان پر

اور سنیئے: بخاری شریف میں ہے طلحہ بن عبداللہ بن عوف نے کہا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی (بلند آواز سے) ہم نے وجہ پوچھی تو فرمایا: لتعلموا انها سنة (تاکہ تم جان لو کہ جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے) اب شرح وقایہ اور قاضی خاں کا فیصلہ سن لیں: ولا یقراء بفاتحة الکتاب۔ یعنی "نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ نہ پڑھنی چاہیے" فرمایئے اہل سنت کون ہیں؟

اورنگ زیب کے عہد میں جب پانچ سو علماء مقلدین نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ یہ

تو سنت کے خلاف ہو رہا ہے تو پھر یوں ارشاد ہوا: لو قرا فاتحہ بنیۃ الدعاء فلا باس (عالمگیری) یعنی اگر دعا کی نیت سے سورہ فاتحہ پڑھ لی تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

اسی اصول پر ہم کہتے ہیں کہ پھر سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے دعا اور ثناء کی نیت سے پڑھ لیا کریں تاکہ ہمیشہ کا نزاع ختم ہو جائے لیکن یہ بزرگ تسلیم نہیں فرماتے۔ حالانکہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم حنفی نے رسائل الارکان ص-۱۴۲ میں یہ لکھا ہے: اما لو قرا الفاتحۃ علٰی نیۃ الثناء فیخرج عن القرانیۃ فلا یلزم قراتان کما نقول لو قرا الفاتحۃ فی صلوۃ الجنازۃ علٰی نیۃ الدعاء لا باس بہ۔ یعنی "اگر سورہ فاتحہ کو امام کے پیچھے ثناء کی نیت سے مقتدی نے پڑھ لیا تو پھر یہ قرآن سے خارج سمجھی جائے گی۔ جیسے ہم حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر سورہ فاتحہ جنازہ میں دعا کی نیت سے کوئی پڑھے تو اس کا کوئی حرج نہیں ہے۔"

ناظرین غور فرمائیں! یہ ہاتھ الٹا کر کے کان کو پکڑنے کی مثال نہیں تو اور کیا ہے۔ بہرحال کچھ ہو اگر پڑھ لیں تو یہ بھی غنیمت ہے۔ مقلد بننا کوئی شرعی حکم نہیں ہے کہ حنفی امام تلاش کیا جائے۔ حکم یہ ہے کہ امام عامل بالسنۃ ہو۔ ملا علی قاری حنفی "شرح عین العلم" مطبوعہ عامرہ استنبول کے ص-۳۲۶ میں فرماتے ہیں: ومن المعلوم ان اللہ تعالٰی ما کلف احدا ان یکون حنفیا او مالکیا او شافعیا او حنبلیا بل کلفھم ان یعملوا بالسنۃ۔ یعنی "یہ بدیہی بات ہے جو سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی بننے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ سب سنت نبوی پر عمل کریں۔"

جب حنفی بننا شرعی حکم نہیں تو نئے مذہب پیدا کر کے الٹا اہلحدیث کی امامت کے خلاف فتویٰ دینا کہاں تک درست ہے؟ حنفی اہل حدیث کا اس امر پر معاہدہ اتفاق عہد انگریزی میں بھی ہو چکا ہے کہ سب اپنی اپنی جگہ تعصب اور عناد کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھیں اور غلو کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی تکفیر سے باز آجائیں اور باہم بھائی بھائی ہو کر رہیں تاکہ امن قائم ہو اور فساد پیدا نہ ہو۔

چنانچہ علماء حنفیہ اور اہل حدیث (دہلی اور لاہور وغیرہ) نے فتویٰ دیا کہ ہر فریق

دوسرے کے پیچھے نماز پڑھے۔ یہ اقتداء جائز ہے اور فساد سے باز آئے۔ اس فتویٰ اور باہمی معاہدہ کو عدالت کمشنری دہلی میں پیش کر کے تصدیق کرایا گیا' جس کی نقل درج ذیل ہے۔

نقل معاہدہ علمائے اہل حدیث و فقہ

مدخولہ عدالت کمشنری دہلی

الحمد لله رب العلمين والصلوة على رسوله محمد واله وصحبه اجمعين

امابعد!

چونکہ دہلی و دیگر امصار میں اکثر نافہم لوگوں نے مسائل فروعیہ میں تنازعات بے معنی برپا کر کے طرح طرح کے اشتہار اور رسائل مشتہر کیے ہیں۔ بارہا اشتہار و رسائل ہماری نظر سے گذرے۔ ہر چند بطور خود اس کے انتظام و امتناع چاہا مگر نادان لوگ باز نہ آئے اور خفیف امور پر نوبت بعداوت پہنچائی۔ ہر ایک فریق اپنے مخالف فریق کو گمراہ اور خارج از اہل سنت والجماعت تقریرا و تحریرا کہنے لگے۔ باہم فساد و عناد بڑھتا گیا اور یہاں کے فساد سے اور بلاد و قصبات میں نزاع و تکرار بین المسلمین واقع ہوئی اور نوبت .فوجداری پہنچی۔ حالانکہ یہ اختلاف سلف صالح سے چلا آیا ہے اور صحابہ کرام اور مجتہدین عظام میں فروعی مسائل میں اختلاف رہا ہے۔ لیکن باوجود اختلاف کے ان حضرات میں بغض و عناد اور فساد نہ تھا۔ ایک دوسرے کو خارج از اہل سنت والجماعت نہ سمجھتا تھا اور آپس میں محبت و اتحاد تھا اور آج کل لوگ انہیں فروعی مسائل کے اختلاف کے سبب اتفاقی حرمتوں میں مبتلا ہو رہے ہیں کیونکہ ضد اور کینہ اور عصبیت اور عداوت اور فساد بالاتفاق حرام ہے۔

جن مسائل مختلف فیہ میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں: نجاست آب' آمین بالجہر فی الصلوۃ' رفع یدین فی الصلوۃ' رفع سبابہ و دیگر مسائل اختلافیہ۔ بعض نے ان کو حرام سمجھا اور بعض نے مثل متوکدہ۔ غرضیکہ جادۂ اعتدال سے گذر گئے۔ ایک فریق دوسرے فریق کے افعال نماز میں طعن اور توہین سے پیش نہ آئے اور نماز ایک فریق

کی دوسرے کے پیچھے بہ شرط رعایت عدم مفسدات جائز ہے۔ پس جو شخص کرے اس کو منع نہ کیا جائے اور اس کے پیچھے بلاشبہ نماز پڑھنی چاہیے اور جو نہ کرے اس پر اعتراض نہ ہو۔ اور فاعل افعال مذکورہ اس کے پیچھے نماز پڑھے اور آپس میں محبت و اتحاد رکھے۔ کوئی کسی کو برا اور بدمذہب نہ جانے۔ مساجد میں کسی فریق کا کوئی فرد فریقین سے مانع و مزاحم نہ ہو۔ جیسا کہ طریقہ سلف کا تھا اور عمل در آمد متقدمین کا رہا ہے۔ عامل بالحدیث اپنے طور پر عمل کرے اور عامل بالفقہ اپنے طور پر ہر ایک مسجد میں ہر ایک اپنے عمل بجا لانے کا مجاز اور مختار ہے۔ پس ہم سب اس بات کا اشتہار دیتے ہیں کہ ہر واعظ اپنے وعظ میں دلائل تکراری و مسائل اختلافی وغیرہ بیان نہ فرمائیں۔ البتہ وقت تدریس حدیث شریف اس کے دلائل اور کتب فقہ کی تدریس کے وقت اس کے دلائل بیان کئے جائیں۔ اور طعن و تشنیع نہ کیا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر موقعہ پر تحریر پر سوائے دلائل کتب کوئی بات خلاف تہذیب نہ لکھی جائے۔ اب جو شخص کوئی اشتہار یا کتاب ایسے مضمون کی شائع کرے گا' جس میں مذاہب اربعہ یا محدثین علیہم الرضوان کی توہین شرعی ہو' اس کے تدارک کی حکام والا شان سے استدعا کی جائے۔

غرضیکہ جو آفات و فسادات' اشتہارات و رسائل اور تکرار امامت و اقتداء سے ہو رہے ہیں' ان کا انسداد بخوبی ہونا چاہیے کہ آئندہ ایسے تنازعات پیدا نہ ہو اور مسلمانوں کے قلب سے کینہ و عداوت بالکل جاتا رہے اور جس شخص کو کسی مسئلہ کا دریافت کرنا منظور ہو اس کو اختیار ہے کہ کسی دوسرے مولوی صاحب سے بھی دریافت کرے لیکن منازعت و تکرار نہ کرے۔

تحریر بتاریخ بست و ششم ماہ ذیقعدہ روز جمعہ سنہ ۱۲۹۸ھ

حسبنا اللہ بس ـــــــ حفیظ اللہ۔ حفیظ اللہ۔ از کان مسئولا۔ سید محمد نذیر حسین محدث (دہلوی) محمد یعقوب' محمد اسحاق' شرع رسول اللہ محمد ابراہیم خاں' خادم قاضی القضات ابو محمد زین العابدین محمد' حسن علی' محمد' عاشق علی' محمد علاؤ الدین' محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ' سید لطف حسین' محمد یونس' محمد غلام اکبر خاں محمدی السنی' محمدی لبنی محمد حمایت اللہ جیسری' مہر و دستخط جانشین مولانا حاجی نواب' قطب الدین' محمد عبدالقادر امیدوار شفاعت زشرف سید کونین شد شریف حسین' محمد جمیل' مولوی محمد عبدالحق

مدرس مسجد فتح پوری' محمد عبدالحق' سید محمد امام مسجد جہاں شاہ امام جامع مسجد دہلی حنفی' دستخط فقیر محمد یعقوب عفا اللہ عنہ ولد مولوی کریم اللہ صاحب دہلوی حنفی' محمد شاہ ذر دو جہاں' مولوی محمد شاہ صاحب' مدرس مدرسہ فتح پوری مؤلف کتاب مدار الحق و بلاغ المبین (اہل حدیث کے مقابل مشہور حنفی ہیں) محمد زین العابدین احمد' رحیم بخش' ابوسعید محمد حسین' محمد عبدالرب' مولوی محمد عبدالرب صاحب حنفی' غلام شریعت رسول الثقلین محمد لطیف حسین' جنگ علی خاں بہادر روشن' حافظ محمد امیر الدین' منیر الدولہ فیض رقم' دستخط محمد عبدالرشید ولد مولوی عبدالحکیم بقلم خود' دستخط ابوالنعیم محمد عبدالحکیم لکھنوی عفی عنہ بقلم خود' سید تلطف حسین' دستخط محمد سلیم اللہ بدایوانی بقلم خود' دستخط سید محمد اسماعیل عظیم آبادی بقلم خود' دستخط قادر بخش عفی عنہ بقلم خود' دستخط محمد عبدالمجید بقلم خود مہتمم مدرستہ القرآن الاعلام کلمتہ الرحمان' تصدیق و دستخط جناب مینجر جی کارڈن ینگ صاحب بہادر کمشنر دہلی دام اقبالہ۔

مصدقہ ۱۹ جنوری ۱۸۸۳ء نشان دستخط بحروف انگریزی۔ نقل مطابق اصل ہے۔

منقولہ از رسالہ دافع الفساد من بین العباد ص ۹ تا ۱۲ مصنفہ مولانا رحیم بخش مرحوم مصنف سلسلہ کتب اسلام لاہور۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد ۳۰' شمارہ ۳۸-۳۹' جلد ۳۰' شمارہ ۵ بمطابق ۵ مئی اور ۲۱ و ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۷۱ء

مسئلہ امامت

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک خطیب جس میں مندرجہ ذیل امور پائے جائیں' کیا وہ امامت اور خطابت کے قابل ہو سکتا ہے یا نہیں' مسلک اہلحدیث کی رو سے کیا فتویٰ ہے۔ بینوا بالکتاب والسنة توجروا عنداللہ فی الدنیا والآخرہ۔

(ا) جو خطیب ایسی مجالس کی صدارت کرے جو "ندائے غیر اللہ" کی بنیاد پر منعقد

ہوتی ہیں مثلاً نعرۂ رسالت اور نعرۂ غوثیہ۔

(۲) جو خطیب محض شخصی وقار اور مصالح کی خاطر کتاب و سنت کے تقاضوں کی پرواہ نہ کرے۔

(۳) جو خطیب تارک جماعت ہو۔ (بلا عذر شرعی)

(۴) جو خطیب مسنون کے بجائے فیشنی داڑھی رکھے اور خضاب لگائے۔

(۵) اور عید میلاد النبی کے جلوس کی قیادت کرے۔ اس خطیب کو جب ان امور کی طرف توجہ دلائی گئی تو انہوں نے اس کی قطعاً پرواہ نہ کی بلکہ الٹا بگڑے۔

خطیب جامع مسجد اہلحدیث انصاریاں گلی نمبر۔۱۴ وارڈ نمبر۔۷ جھنگ شہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الوہاب سوال مذکورہ سے ظاہر ہے کہ امام مذکور تارک جماعت داڑھی خلاف سنت' شرک کا معاون اور بدعات کا مرتکب ہے۔ ایسا شخص امامت اور خطابت کا قطعاً اہل نہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو قبلہ کی جانب تھوکنے پر رسول اللہ ﷺ نے امامت سے معزول کر دیا تھا۔ حالانکہ قبلہ کی جانب تھوکنا بظاہر اتنا بڑا جرم نہیں ہے' جتنا بڑا شرک و بدعت جرم ہے۔ اس لیے شرک اور بدعتی تارک نماز' مخالف سنت شخص امامت کے لائق نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی امام ہے تو اس کو امامت سے فی الفور معزول کر دینا چاہیے' جو لوگ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں' ان کی نماز بالکل ضائع ہوتی ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر حصاری

تنظیم اہل حدیث ۲۳ ؍ فروری سنہ ۱۹۶۸ء

ولد الزنا کی امامت

(الاستفتاء) مولانا سوال یہ ہے کہ کیا ولد الزنا کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یا ولد الزنا کو امام مقرر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مہربانی فرما کر محدثین و فقہاء کا اختلاف بوضاحت بیان فرمائیں۔

(سائل نذیر احمد چک نمبر ۶۸ گ ب لائل پور' موجودہ فیصل آباد)

الجواب الحمد للہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ زانی' زانیہ کے فعل زنا سے جو بچہ پیدا ہو' اس کو ولد الزنا یا ولد الحرام کہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ولد الزنا کے والد اور والدہ کا فعل زنا ہے۔ ان کے فعل سے پیدا شدہ بچہ کا نہ فعل ہے اور نہ اس کا یہ گناہ ہے۔ صرف ان مرد عورت کے نطفہ سے سنۃ اللہ کے مطابق رحم میں بچہ بن کر اپنے وقت پر پیدا ہو گیا' جیسے عموماً مرد عورت کے نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا یہ فعل حرام ہے' جس سے اس بچہ کے والدین گنہگار ہیں لیکن ان کے گناہ کا اثر بچہ کے ذمہ نہیں آسکتا۔ لقولہ تعالیٰ لا تزر وازرۃ وزر اخری۔

یہ بے گناہ بچہ جب تک بالغ نہ ہو گا مرفوع القلم ہے۔ لقولہ علیہ السلام رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستقیظ وعن الصبی حتی یشب (الحدیث) اور یہ بچہ فطرت پر ہے۔ ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ۔ اگر قبل بلوغت فوت ہو گیا تو کہا جائے گا کہ یہ اس زمرہ میں داخل ہوا جس کی بابت یہ ارشاد ہے کہ اللہ اعلم بما کانوا عاملین اگر بالغ ہوا تو پھر اس کے ذاتی ایمان و عمل کا جائزہ لیا جائے گا۔ اگر مسلمان ہے تو اس کا عقیدہ و عمل مطابق شرع ہے تو وہ مومن کیا ولی اللہ بھی ہو سکتا ہے' اس کی امامت روا ہو گی۔ اور اگر مخالف شرع' منکر اسلام ہے تو کافر ہے۔ اس کی امامت مردود ہو گی۔ یہی حال ہر انسان کا ہے کہ اس کے اسلام اور فلاح و نجات کا دارومدار اس کے ذاتی عقیدہ و عمل پر ہے۔ اگر اس نے کتاب و سنت کا علم حاصل کر لیا اور وہ اپنے علم پر عامل ہوا تو وہ صالح ہے' خواہ ولد ارشد ہو یا ولد الحرام ہو۔ اگر ولد الحرام نے قرآن حفظ کر لیا اور علم حدیث پڑھ لیا اور وہ عالم و حافظ بن گیا تو اس کی امامت بالاتفاق روا ہے اور اگر اس کا خاتمہ خیر پر ہوا تو وہ جنتی ہے۔

الغرض دنیا اور آخرت میں قانوناً" و شرعاً" و اخلاقاً" اور عرفاً" اس کے اپنے افعال پر احکام مرتب ہوں گے۔ ہاں وہ اپنے والد کا وارث نہیں ہو گا۔ ولد الزنا لا یرث ولا یورث (تجرید الاحادیث)

اگر کسی محلہ یا بستی یا شہر میں مسلمانوں کی جماعت آباد ہے' انہوں نے اپنی مسجد

میں کسی شخص کو امام مقرر کرتا ہے تو وہ انتخاب کے وقت شرعی دستور پر غور کریں گے۔ اگر ان میں ایک شخص ولد الزنا ہے اور وہ سب سے زیادہ عالم ہے' حافظ قرآن ہے' متقی صالح ہے تو شرعاً" وہ امامت کا حقدار ہے۔ دستور شرعی یؤم القوم اقرأھم لکتاب اللہ فاعلمھم بالسنۃ۔ آخر تک اس پر نافذ ہو گا۔ اگر حلالی زادے بے نماز ہیں یا بدعتی ہیں یا مشرک قبر پرست ہیں' تعزیہ پرست ہیں' ملحد مرزائی ہیں' منکر حدیث پرویزی ہیں یا فاسق فاجر ہیں' داڑھی منڈے' شرابی وغیرہ علانیہ فسق و فجور کرنے والے ہیں یا سید قریشی جاہل اور دین سے بے خبر ہیں تو امامت کا حق اس ولد الزنا کا ہے۔ وہ تمام اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ ہاں اگر ولد الزنا بھی جاہل ہے یا والدین کی طرح زنا ہی کا کام کرتا ہے تو پھر بیشک برا ہے اور وہ ناقابل امامت ہے۔

طبرانی میں یہ روایت ہے کہ ولد الزنا شر الثلاثۃ اذا عمل بعمل ابویہ یعنی "ولد الزنا ان تینوں میں کا ایک برا ہے جبکہ وہ اپنے والدین کا کام اختیار کرے۔" اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے والدین والا کام اختیار نہ کیا بلکہ علم دین حاصل کر کے متقی صالح ہو گیا تو پھر وہ برا نہیں ہے بلکہ نیک مسلمان ہے۔ محض والدین کا گناہ اس بیچارے بے گناہ کے ذمہ لازم نہیں ہو جائے گا۔ فردوس دیلمی کی ایک روایت بایں الفاظ تجرید الاحادیث میں مذکور ہے کہ ولد الزنا لیس علیہ من وزر ابویہ شیئی۔ یعنی ولد الزنا پر ماں باپ کا کوئی گناہ لازم نہیں ہے۔" یہ روایت خواہ کیسی ہو مگر اصول اسلام اس کا مؤید ہے۔ بعض لوگ ایک موضوع روایت پیش کرتے ہیں کہ ولد الزنا لا یدخل الجنۃ یعنی "ولد الزنا جنت میں داخل نہ ہو گا۔"

موضوعات ملا علی قاری میں ہے ولم یثبت بالسنۃ۔ یعنی یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ اور سفر السعادۃ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے: ھو باطل۔ ابن جوزی نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ ایک روایت یوں ہے ولد الزنا فلا شئی من نسلہ الی سبعۃ اباء الجنۃ۔ یہ بھی صاف مردود ہے۔ اس پر تذکرۃ الموضوعات ۱۸۰ میں لکھا ہے: وھو مخالف للاصول لقولہ تعالٰی ولا تزر وازرۃ وزر اخری۔ پھر لکھا ہے اگر ایسی کوئی روایت ہے تو اس کا مطابق اصول کے مطلب یہ ہے کہ ولد الزنا سے زنا کرنے والا اور ہمیشہ اس کا عادی مراد ہے۔ جیسے شیطان کو "ابو حرب" کہا جاتا ہے۔ مواظب

الزنا کو ولد الزنا کہا جاتا ہے۔

بعض لوگ یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے: "من تقدم قوما وهم له كارهون" چونکہ ولد الزنا کو لوگ ذلیل اور برا سمجھتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لیے اس روایت کی رو سے اس کی امامت درست نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے کراہت طبعی اور وجدانی مراد نہیں ہے بلکہ شرعی مراد ہے یعنی کراہت دینیہ جو سبب شرعی سے ہو' وہ معتبر ہے۔ طبعی مراد نہیں ہے۔ (نیل الاوطار) پس جس شخص کا کردار خراب ہو اس کو امام نہ بنایا جائے۔ اگر وہ باوجود نالائق ہونے کے زبردستی امامت کرائے گا تو اس کی نماز قبول نہ ہو گی۔ بہرحال ولد الزنا کی امامت شرعاً" روا ہے اور اس کی اقتدا درست ہے' اس کو عار دلانا ناجائز ہے اور اس کی امامت ناجائز ہونے پر کوئی شرعی دلیل ناطق نہیں ہے۔ فقہ کی بعض کتابوں میں ناچنے' لڑکے' ولد الزنا کی امامت محض قیاس و رائے سے مکروہ لکھی ہے' یہ سراسر باطل ہے۔ اس لیے علماء دیوبند نے ولد الزنا کی امامت کو درست لکھا ہے۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد اول' ص-۵۴ میں ہے' جواب نمبر-۳ے شامی میں منقول ہے اگر ولد الحرام اعلم و افضل ہو ولد ارشد سے' تو ولد الحرام کی امامت افضل ہے۔ فقط۔ (بندہ عزیز الرحمان دیوبند) اس فتویٰ سے ہماری تائید ہو گئی اور فقہ کی کتاب شامی کا فتویٰ ہمارے موافق ہوا۔ یعنی علماء اہل حدیث کا مسلک ہے۔ فقہ کی کتاب قدوری میں ناچنے' لڑکے' ولد الزنا کی امامت مکروہ لکھی ہے۔ اس پر توضیح ضروری کا محشی لکھتا ہے "لانه ليس له اب يعلمه فيغلب عليه الجهل فلو كان عنده علم لا كراهته" یعنی "یہ کراہت اس وجہ سے ہے کہ ولد الحرام کا باپ نہیں جو اس کو تعلیم دے۔ اس پر جہل غالب ہے' اس لیے مکروہ ہے۔" اگر علم حاصل کر لے تو پھر اس کی امامت میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں ولد الزنا کی کیا خصوصیت ہے۔ اگر کسی حلال زادہ پر جہالت غالب ہو گئی تو اس کی امامت بھی نادرست اور مکروہ ہو گی۔ امامت کے لیے اقرا و اعلم ہونا سب کے لیے ضروری ہے۔ ہر امام کا ذاتی کردار اور اس کا ایمان' علم و عمل

دیکھا جائے گا کہ کیا ہے؟ اگر صحیح ہے تو امامت بھی صحیح ہے۔ اگر اعتقاد اور عمل خراب ہے تو اس کی امامت بھی خراب ہے۔ دیگر اصول یہ ہے کہ ان کل من صحت صلوته لنفسه صحت لغیره۔ یعنی "ہر وہ شخص جس کی اپنی نماز صحیح ہے غیر کی نماز بھی اس کے پیچھے صحیح ہے۔" مگر بے وضو کی یا کافر کی نماز باطل ہے۔ اس لیے ان کی اقتداء بھی باطل ہے۔ نابینے اور لڑکے اور ولد الزنا کی اپنی نماز جبکہ ارکان و شروط سے ادا ہو صحیح ہے تو اس کی اقتداء بھی صحیح ہے۔ اب جو شخص ولد الزنا کی نماز اور اقتداء باطل قرار دے اس کے ذمہ اس دعوی پر دلیل شرعی لازم ہے۔ ودونه خرط القتاد نبؤنی بعلم ان کنتم صادقین۔ هذه ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری .عفی

اہل حدیث سوہدرہ بمطابق ۸ مئی سنہ ۱۹۵۸ء

اپنی جماعت نہ ہو تو نماز اپنی علیحدہ پڑھے یا دوسروں کی جماعت میں شامل ہو جائے؟

سوال جماعت سے نماز ادا کرنا تو بہت ضروری ہے مگر جہاں پر اپنی جماعت کا ایک آدمی بھی نہ ہو تو کیا پھر بھی بدعقیدہ مولوی کے پیچھے نماز نہ ہو گی یا پھر اکیلے آدمی کو کیا کرنا چاہیے؟

سائل مذکور

جواب ایسی جگہ سے ہجرت کرنی فرض ہے۔ حدیث ابوداؤد میں ہے کہ من جامع المشرک وسکن معه فانه مثله (او کما قال) یعنی جو مشرکوں کے ساتھ آباد ہو اور وہاں اسلامی احکام و شعار ادا نہ کر سکے تو وہ ان کی مثل ہے۔ تم جب تک وہاں رہو اکیلے نماز پڑھو' مشرک و بدعتی کے پیچھے نماز جائز نہیں۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص ۱۸۴

کسی عذر سے امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدی کس طرح کرے؟

سوال اگر امام معذور بیٹھ کر نماز پڑھائے تو کیا مقتدی بھی اس کی اقتداء میں بیٹھ کر نماز پڑھیں یا کھڑے ہو کر؟

جواب واضح ہو کہ گو اس مسئلہ میں علماء متقدمین اور متاخرین میں کافی اختلاف ہے۔ لیکن صحیح اور راجح یہ ہے کہ جب امام معذور بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں کو بھی امام کی اقتداء اور اہتمام کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہیے کہ مقتدی کے لیے امام کی متابعت فرض ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل قولی اور فعلی احادیث سے یہ حکم ثابت ہوتا ہے۔ منتقی الاخبار مع نیل الاوطار جزء ثالث کے ص ۲۲۹ میں یوں باب منعقد کیا گیا ہے باب اقتداء القادر على القيام بالجالس وانه يجلس معه یعنی اس مسئلہ کے بیان میں کہ جو شخص قیام کی قدرت رکھتا ہو وہ ایسے امام کی اقتداء کرے جو بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو بھی امام کے ساتھ بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہیے۔" پھر اس کے ثبوت میں متعدد احادیث درج کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے عن عائشة انها قالت صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى بيته وهو شاك فصلى جالسا وصلى وراءه قوم قياما فاشار اليهم ان اجلسوا فلما انصرف قال انما جعل الامام ليؤتم به فاذا ركع فلا فاركعوا واذا رفع فارفعوا او اذا صلى جالسا فصلوا جلوسا۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیمار تھے جس کی وجہ سے گھر میں بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے آپ کی اقتداء میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنی شروع کر دی تب آنحضرت ﷺ نے ان کو اشارہ سے سمجھایا کہ تم بیٹھ جاؤ (وہ بیٹھ گئے) پھر نماز کے بعد فرمایا کہ امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ نماز میں اس کی متابعت کی جائے تو جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سر اٹھائے تو تم بھی سر اٹھاؤ اور جب وہ بیٹھے تو تم بھی اس کے ساتھ بیٹھو۔"

دوسری حدیث میں بروایت انس ؓ یوں تفصیل آئی ہے کہ نبی کریم ﷺ گھوڑے پر سے گر پڑے جس سے آپ کا دایاں پہلو زخمی ہو گیا۔ ہم آنحضرت ﷺ کی عیادت کے لیے گئے تو نماز کا وقت آگیا۔ آپ نے ہم کو بیٹھ کر نماز پڑھانی شروع کی تو

ہم نے بھی بیٹھ کر آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ امام صرف اسی واسطے بنایا جاتا ہے کہ نماز میں اس کی متابعت کی جائے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور جب وہ سر اٹھائے تو تم بھی سر اٹھاؤ اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو اور جب امام بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو تو تم بھی اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھو۔

پھر تیسری حدیث انس رضی اللہ عنہ کی بخاری سے نقل کی ہے جس کے آخر میں بھی حکم ہے فاذا صلّی قائما فصلوا قائما وان صلّی قاعداً فصلوا قعوداً۔ یہ تینوں روایتیں صحیح اور قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں کہ امام کی متابعت فرض ہے۔ اگر وہ بیٹھ کر (کسی عذر سے) نماز پڑھے تو مقتدیوں کو بھی بیٹھ کر نماز پڑھنی ضروری ہے۔ اگرچہ وہ قیام پر قادر اور غیر معذور ہوں اگر وہ جالس امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھیں گے تو امام کی متابعت نہ ہو گی۔ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سن کر سمعنا واطعنا کا حکم ہے کہ ہم نے حکم سنا اور اب اطاعت کرتے ہیں۔

حافظ ابن حزم اپنی اصولی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام ص۔۹۳' ج ۱ میں فرماتے ہیں کہ مومنوں کو جب اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی طرف بلایا جائے تو وہ کہتے ہیں سمعنا واطعنا کہ ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سن لیا ہے' اب ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

مولانا اشرف تھانوی صاحب بہشتی زیور حصہ اول میں عقائد کا بیان لکھتے ہوئے عقیدہ نمبر۔۲۷ یوں لکھتے ہیں "ایمان جب درست ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سب باتوں میں سچا سمجھے اور ان سب کو مانے' اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات میں شک کرنا یا اس کو جھٹلانا یا اس میں عیب لگانا یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا ان سب باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے۔" اور عقیدہ نمبر۔۲۸ میں ہے کہ قرآن اور حدیث کے کھلے کھلے مطلب کو نہ ماننا اور اینچ پینچ کر کے اپنے مطلب بنانے کو معنی گھڑنا بے دینی کی بات ہے۔"

پس اہلحدیث اور حنفیوں پر فرض ہے کہ مذکورہ بالا احادیث پر عمل کریں کہ امام اگر معذور اور بیمار ہو اور وہ قیام نہ کر سکے تو بیٹھ کر نماز پڑھائے تو اس کی اقتداء میں

نماز پڑھنے والے نمازی اگرچہ قادر علی القیام ہوں' وہ بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں تاکہ امام کی متابعت پائی جائے۔ اگر امام کا خلاف کریں گے تو نماز ناقص ہو گی اور ان کو جماعت کا ثواب اور اجر نہ ملے گا۔ (ایسے اختلافی مسائل جن میں دونوں طرف دلائل بھی ہوں اور ائمہ مجتہدین بھی تو ایک طرف اتنا سخت رویہ مناسب نہ ہو گا) فتذکروا۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے تو ہم نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ جب آپ بیٹھے ہوئے تھے' آپ کی تکبیر حضرت ابوبکر ﷺ لوگوں کو سناتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے محسوس فرمایا کہ ہم آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں تو آپ نے ہمیں اشارہ سے سمجھایا تو ہم بیٹھ گئے اور بیٹھ کر آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب فارغ ہوئے تو ہم کو یوں خطاب فرمایا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ تم نے فارس اور روم کے لوگوں کا سا فعل کیا ہے۔ جو وہ اپنے بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کے بادشاہ بیٹھے ہوتے ہیں اور ان کے درباری ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ دیکھو آئندہ ایسا کام مت کرنا' تم اپنے اماموں کی متابعت کرو۔ اگر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھائیں تو ان کی اقتداء میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم ان کی متابعت میں بیٹھ کر نماز پڑھو۔ (نیل الاوطار ج۔۳' ص۔۱۷۰)

اس حدیث میں امام جالس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے منع فرما دیا گیا اور اس کی علت یہ بیان کی گئی کہ یہ عجم کے کفار فارس اور روم کی رسم تعظیمی ہے۔ اہل اسلام کو ان کی مشابہت سے بچنا چاہیے۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کی تعظیم کرنے کی نیت سے کھڑے نہ ہوئے تھے بلکہ یہ عام حکم الٰہی قوموالله قانتین۔ تم نماز میں اللہ کے لیے عاجز اور فرمانبردار بن کر کھڑے رہو' کے مطابق تھا لیکن چونکہ یہ ظاہری اور عملی مشابہت کفار کے ساتھ تھی' اس لیے منع کر دیا۔ پھر کسی نے اس طرح نماز نہیں پڑھی بلکہ عہد نبوی ﷺ میں امام جالس کی اقتداء میں صحابہ کرام بیٹھ کر ہی نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ نیل الاوطار ج۔۳' ص۔۱۷۲ میں ہے کہ وما اخرجه عبدالرزاق عن قيس بن فهد الانصاری ان اماما لهم اشتكى على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم

قال فكان يؤمنا جالسا ونحن جلوس قال العراقی اسنادہ صحیح- یعنی عبدالرزاق میں ہے کہ قیس بن فہد انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمارا امام بیمار ہوا تو وہ ہم کو بیٹھ کر امامت کراتا تھا تو ہم اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے- اس کی تائید نیل الاوطار میں بحوالہ ابوداؤد درج ہے- ان اسید بن حضیر کان یؤم قومه فجاء رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقیل یارسول اللّٰه ان امامنا مریض' فقال اذا صلّٰی قاعدا فصلوا قعودا- یعنی "حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے امام تھے وہ بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ ہمارا یہ امام بیمار ہے' بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے' ہم کو کیا حکم ہے؟ تو فرمایا کہ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو-"

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرام کا بھی تعامل یہ تھا کہ وہ امام جالس کی اقتدا میں بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے تھے- عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی عام صحابہ کا یہی تعامل رہا- سنن دار قطنی ص-۱۴۲ میں ہے کہ عبید بن رفاعہ نے بیان کیا کہ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو وہ اپنے مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے- وہ نماز سے فارغ ہوئے تو دریافت کرنے پر انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے مقتدیوں کو پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ میں نماز میں کھڑا ہونے کی طاقت نہیں رکھتا' اگر میری اقتداء میں تم نماز پڑھنا چاہتے ہو تو بیٹھ جاؤ کیونکہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ انما الامام جنة فان صلّٰی قائما فصلوا قیاما وان صلّٰی جالسا فصلوا جلوسا- دار قطنی کے اسی صفحہ میں جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی صحیح روایت مذکور ہے' اس پر علامہ مولانا شمس الحق مرحوم محدث ڈیانوی تعلیق مغنی شرح دار قطنی میں یہ فرماتے ہیں کہ وفی هذا الحدیث دلیل واضح علٰی ان المأموم یتابع الامام فی الصلٰوة قاعدا وان لم یکن المأموم معذورا- یعنی اس حدیث میں واضح دلیل ہے کہ مقتدی نماز میں امام کی اقتداء اور متابعت کرے- اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھے' اگرچہ مقتدی معذور نہ ہو-" پھر لکھتے ہیں کہ یہی مسلک ہے امام احمد' امام اوزاعی' امام اسحاق' امام ابن المنذر اور امام داؤد ظاہری کا-"

میں کہتا ہوں کہ عام محدثین کا بھی یہی مذہب ہے- امام دار قطنی کی احادیث

مذکورہ پر یوں تبویب ہے کہ باب کیفیۃ صلوٰۃ الصحیح خلف الجالس۔ یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ تندرست نمازی کی کیفیت بیٹھ کر نماز پڑھنے والے امام کے ساتھ کیا ہو۔" اس کے تحت کو احادیث و آثار لائے ہیں۔ اسی طرح منتقی میں امام مجد الدین ابن تیمیہ کی تبویب اس پر دال ہے کہ ان کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام ترمذی نے جامع ترمذی میں یہ باب منعقد کیا ہے باب ماجاء اذا صلّی الامام قاعدا فصلوا قعودا۔ یعنی "اس بیان میں کہ امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدیوں کو بھی بیٹھ کر پڑھنی چاہیے۔ پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث لائے ہیں اور اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ پھر یہ لکھتے ہیں کہ اس بارہ میں ان صحابہ کرام سے یہ حدیث مروی ہے اور یہی ان کا مذہب ہے۔ وقد ذھب بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی ھذا الحدیث منھم جابر بن عبداللہ و اسید بن حضیر و ابوھریرۃ وغیرھم۔ یعنی بعض صحابہ کرام جابر و اسید و ابوہریرہ وغیرہم رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے اور یہ فرمایا کہ اس مسئلے کے متعلق حضرت عائشہ اور ابوہریرہ' جابر' ابن عمر اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے بھی احادیث مروی ہیں۔ امام نسائی نے سنن نسائی ص-۹۵ میں یوں باب لکھا ہے: الائتمام بالامام یصلی قاعدا۔ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث لائے ہیں جو ابھی اوپر ذکر ہو چکی ہے۔

التعلیقات السلفیہ میں مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف اس جلوس مقتدی کو منسوخ کہنے والوں کی تردید کر کے فرماتے ہیں کہ ظاھر الحدیث وجوب الجلوس اذا جلس الامام یعنی "ظاہر حدیث سے وجوب معلوم ہوتا ہے کہ امام بیٹھے تو مقتدیوں کو بھی بیٹھنا چاہیے۔" پھر لکھا ہے یؤید عمل الصحابۃ بعدہ صلی اللہ علیہ وسلم فتاواھم بالجلوس خلف الامام الجالس ذکرہ الحافظ فی الفتح باسانید صحیحۃ یعنی "اس کی تائید عمل صحابہ اور ان کے فتویٰ سے ہوتی ہے۔ یہ آثار صحابہ سے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں صحیح سندوں سے ذکر کیے ہیں۔"

نیز ابوداؤد جلد اول' ص-۱۰۳ میں ہے کہ قال ابوداؤد اذا تنازع الخبر ان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نظر الی ما عمل بہ اصحابہ من بعدہ یعنی "جب دو احادیث متعارض ہوں تو پھر عمل صحابہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ ان کا کون سی

حدیث پر عمل ہے۔" بنابریں جب احادیث مذکورہ متعارض ہیں۔ حدیث واقعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر نماز مرض الموت میں آپ کی اقتداء میں پڑھی تو آپ بیٹھے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے تھے تو گذارش ہے کہ قولی اور فعلی حدیث میں تعارض ہے۔ لہٰذا امام ابوداؤد کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں تعامل صحابہ دیکھا جائے جو یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے امام کی اقتداء میں مقتدی بھی بیٹھ کر نماز ادا کریں۔ رہا واقعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تو کئی احتمالات رکھنے کے باعث وہ قابل حجت نہیں ہے۔

نیل الاوطار ج-۳' ص-۱۷۱ میں ہے کہ امام ابن حزم نے جابر' ابوہریرہ اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہم سے روایات نقل کی ہیں اور پھر یہ لکھا ہے "ولا یخالف لهم یعرف فی الصحابة۔ یعنی "ان صحابہ مذکورین کے خلاف کسی صحابی سے معلوم نہیں۔" یہ بحوالہ ابن حبان نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ وعن قیس بن فهد ایضا من الصحابة۔ کہ "قیس بن فہد صحابی سے بھی یہی روایت ہے۔" پھر جابر بن زید' ابوالشعثاء وغیرہ تابعین سے بھی یہی نقل کیا ہے اور مالک بن انس' ابوایوب سلیمان بن داؤد ہاشمی' ابوخیثمہ ' ابن ابی شیبہ' محمد بن اسماعیل اور دیگر اہل حدیث جیسے محمد بن نصر مروزی' محمد بن اسحاق بن خزیمہ وغیرہ۔

پھر امام ابن حبان نے فرمایا هو عندی ضرب من الاجماع الذی اجمعوا علی اجازته لان من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم اربعة افتوابه والاجماع عنده اجماع الصحابة ولم یروا من احد من الصحابة خلاف هو لاء الاربعة باسناد متصل ولا منقطع۔ تو یہ ابن حبان کے نزدیک اجماع صحابہ (سکوتی) ہوا' کیونکہ ان چار صحابہ کے خلاف کسی صحابی سے متصل یا منقطع اسناد سے کچھ مروی نہیں ہے۔

پھر یہ کہتے ہیں کہ فکان الصحابة اجمعوا علی ان الامام اذا صلّی قاعدا کان علی المامومین ان یصلوا قعودا۔ یعنی "گویا صحابہ کا اس مسئلہ پر اجماع ہو گیا کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدیوں پر یہ لازم ہے کہ وہ بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں۔" پھر لکھتے ہیں کہ جابر بن عبداللہ اور ابوالشعثاء کے فتویٰ کے خلاف کسی تابعی سے ضعیف سند سے بھی کوئی روایت نہیں آئی۔ فکان التابعین اجمعوا علی اجازته۔ یعنی "گویا تابعین کا بھی اس پر اجماع ہو گیا۔"

نیز امام شوکانی لکھتے ہیں: وروی عن عبدالرزاق انه قال ما رایت الناس الاعلی ان الامام اذا صلّی قاعدا صلّی من صلّی خلفه قعودا قال وهی السنة عن غیر واحد۔ یعنی "عبدالرزاق کا یہ قول منقول ہے کہ میں نے عام طور پر لوگوں کا یہ تعامل دیکھا ہے کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کے پیچھے لوگ بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہی طریق بہت سے اہل علم سے مروی ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اب یہ مسئلہ پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ امام اور مقتدیوں کو بصورت مذکورہ متفقہ طور پر بحالت جلوس نماز پڑھنی چاہیے کیونکہ دلائل حدیثیہ کے ساتھ صحابہ اور تابعین کا اجماع سکوتی اور امت اہل علم کی اکثریت بھی اس کے مؤید ہے۔ امام ابن حزم مجدد قرن خامس کا بھی یہی مسلک ہے۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وبمثل قولنا یقول جمهور السلف (نیل الاوطار ج-۳' ص-۱۷۱) یعنی "ہمارے مسلک کی طرح ہی جمہور سلف صالحین کا مسلک ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ جمہور سلف کا قول بھی وجوہ ترجیح سے ایک وجہ ہے۔ امام احمد رئیس الائمہ نے بھی اسی وجہ سے اس مسلک کو اختیار کیا ہے کہ چار صحابہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ زرقانی شرح موطا جلد اول' ص-۲۸۰ میں ہے کہ انکر احمد واسحاق وغیرهما دعوی النسخ وقالوا ان صلی الامام جالسا صلی المامومم كذالك ولو قدر علی القیام قال احمد وفعله اربعة من الصحابة بعد النبی صلی الله علیه وسلم جابر وابوهريرة واسید بن حضیر وقیس بن فهد۔ یعنی "جو لوگ احادیث حکم بالجلوس کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں امام احمد اور امام اسحاق وغیرہ محدثین اس کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر امام جالس ہو تو مقتدی بھی اسی طرح جالس ہو۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بعد چار صحابہ کا یہی عمل تھا۔" دیکھیے امام احمد نے تعامل صحابہ کی وجہ سے اس مسئلہ کو ترجیح دی ہے۔

واقعہ حدیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر مختصر بحث ⇦ جو لوگ مذکورہ احادیث کو منسوخ کہتے ہیں۔ ان کے پاس ایک ہی حدیث واقعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ دلیل ہے لیکن وہ محتمل الوجوہ ہے۔ باقی باتیں سب ظنیات ہیں جو قوی دلائل کے مقابلہ میں ناقابل تسلیم ہیں۔ علاوہ ازیں واقعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کتب حدیث میں مختلف الفاظ سے آیا ہے۔ چنانچہ

موطا میں یہ واقعہ بایں الفاظ ہے: ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم خرج فی مرضه فاتی فوجد ابابکر وهو قائم یصلی بالناس فاستاخر ابوبکر فاشار الیه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان کما انت فجلس رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الٰی جنب ابی بکر فکان ابوبکر یصلی بصلٰوة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وهو جالس وکان الناس یصلون بصلٰوة ابی بکر۔ (موطا' زرقانی ج-۱' ص-۲۷۹)
یعنی "رسول اللہ ﷺ اپنے آخری مرض میں گھر کے باہر نکلے' مسجد میں آئے تو دیکھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے ہیں کھڑے ہوئے' وہ آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ اسی حالت میں ٹھہرے رہو۔ اب آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک پہلو میں بیٹھ گئے۔ پس ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کی اقتدا کرتے تھے اور لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کرتے تھے۔"

جواب ⇦ اولاً" اس واقعہ محتملہ سے احادیث حکم بالجلوس قطعیہ کو منسوخ قرار دینا سراسر غلط ہے۔ ثانیاً" تطبیق ممکن ہو تو نسخ اختیار کرنے کو اہل اصول جائز نہیں رکھتے۔ جناب مولانا عبیداللہ صاحب محدث مبارک پوری مدظلہ العالی نے اپنی کتاب مرعاۃ المصابیح شرح مشکوۃ کی ج-۲' ص-۱۳۳ میں اس مسئلہ پر نہایت پسندیدہ بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ وغیرہ جن میں مقتدیوں کو اتباع امام جالس کا حکم وارد ہے' یہ امت کے لیے ایک قانون کلی اور تشریع ہے۔ اس کو مرض موت کے واقعہ جزئیہ محتملہ منکشف الحال سے منسوخ قرار دینا مشکل بات ہے۔

پھر مولانا انور شاہ صاحب سے (جن کو علماء حنفیہ دیوبندیہ سلام کا ایک "معجزہ" قرار دیتے ہیں) مولانا مبارک پوری نے بحوالہ فیض الباری ج-۲' ص-۲۲۲ میں لکھا ہے کہ نسخ کو ہمارا دل نہیں مانتا کیونکہ واقعہ نماز مرض الموت بہت احتمالات رکھتا ہے۔ ہم حنفیہ جو نسخ پر محمول مانتے ہیں انما حملنها علیه حفظا للمذهب فقط۔ (تو اس سے مقصود صرف اپنے مذہب کی حفاظت ہے) مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے باوجود مقلد ہونے کے بات بالکل کھری کہہ دی ہے۔ لیکن خود دوسری جگہ یہ بھی فرما دیا ہے کہ "مذہب کے تقید سے احادیث قطعیہ کا ترک کرنا جرم عظیم ہے" جیسا کہ راقم الحروف بحوالہ بہشتی زیور عقیدہ نمبر-۲۷' ۲۸ شروع میں ذکر آیا ہے۔

تشریعی قانون ⇐ تشریعی قانون جس کی طرف صاحب رعایہ نے اشارہ کیا ہے۔
مسند امام احمد جز خامس ص۔۲۸۳ اور شرح معانی الاثار طحاوی جلد اول' ص۔۲۳۵ کی ایک حدیث طویل کا ایک حصہ ہے' جو بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان الفاظ میں کیا ہے: فان من طاعة الله ان تطیعونی وان من طاعتی ان تطیعوا ائمتکم فان صلوا قعودا فصلوا قعودا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری اطاعت میں داخل ہے کہ تم اپنے اماموں کی اطاعت کرو کہ اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔

علاوہ ازیں گزشتہ صفحات میں ایک روایت گزر چکی ہے جس میں بیٹھے امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو فارس روم کے کفار کے مشابہ کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے ایک قانون کو ایک محمل الحالی قصہ سے کیسے منسوخ مانا جا سکتا ہے؟

اولاً" واقعہ امر کا متعین ہونا ضروری ہے کہ اس نماز مرض الموت میں آنحضرت ﷺ امام تھے۔ کیونکہ دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے آخری نماز ابوبکرؓ کے پیچھے مقتدی ہو کر پڑھی ہے۔ جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ ص۔۲۱۲ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے جو اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنھا سے مروی ہے۔ جس میں ایک قصہ کے آخری لفظ یہ ہیں: یابنیة ان اخر صلوة صلاها رسول الله صلی الله علیه وسلم خلفی فی ثوب واحد۔ یعنی اے میری بیٹی! آخری نماز جو رسول اللہ ﷺ نے میرے پیچھے پڑھی تھی وہ ایک کپڑے میں تھی۔"

ایسے ایک روایت موارد الظمان ص۔۱۰۹ پر ہے۔ عن عائشة قالت صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی مرضه الذی مات فیه خلف ابی بکر قاعدا۔ یعنی "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ نماز پڑھی جناب رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں پیچھے ابوبکرؓ کے بیٹھ کر۔" بعض علماء اس کو تعدد واقعہ پر محمول کرتے ہیں لیکن امام شافعی یہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک ہی نماز مرض الموت کا واقعہ ہے۔

ثانیاً" اذا تعارضا تساقطا کہ جب دو دلیلیں باہم معارض اور مخالف ہوں تو دونوں گر جاتی ہیں اور ان سے استدلال کرنا بیکار ہو جاتا ہے۔

ثالثاً" اگر تعدد واقعہ ہو تو کسی کا تقدم و تاخر یقینی معلوم نہیں۔ ہر دو طرف احتمال

ہے تو قاعدہ ہے کہ اذا جاء الاحتمال سقط الاستدلال۔ لہٰذا اس سے نسخ نہ ثابت ہو سکا۔

رابعاً" واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں خصوصیت کا بھی احتمال ہے جس کی طرف شرح معانی الآثار جلد اول' ص-۲۳۷ میں امام محمد بن حسن سے مذکور ایک قول سے راہنمائی ملتی ہے۔ جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ اس نماز میں متعدد کام ایسے ہی کیے گئے جو دوسرے کے لیے جائز نہیں ہیں۔ مثلاً آپ کا وہیں سے قرات شروع کرنا جہاں تک ابوبکر رضی اللہ عنہ پڑھ چکے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک ہی نماز میں امام بن کر پھر مقتدی بن جانا جو آپ کے بعد کسی کو جائز نہیں۔ (نہ کسی نے اس طرح عمل کیا اور نہ اب کوئی کرتا ہے) باتفاق المسلمین جو کسی کو درست نہیں ہے" لہٰذا اس وجہ سے بھی نسخ پر استدلال درست نہ رہا۔

میں کہتا ہوں کہ آپ کا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو باصرار امام بنا کر کھڑا کرنا اور پھر دو شخصوں کے کندھوں کے سہارے صفوں کو چیر پھاڑ کر آگے جا کر امام بننا اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ کھڑا کرنا حالانکہ دیگر نمازی موجود ہوں تو کوئی مقتدی امام کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ کا بغیر نماز پوری کئے اثنائے نماز میں صفوں کو پھاڑ کر واپس چلا جانا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نماز کو پورا کرنا وغیرہ ایسے امور ہیں جو کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں۔

خامساً" مولانا عبیداللہ مبارک پوری نے لکھا ہے کہ نسخ کا مدعی یہ ثابت کرے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بغیر دیگر صحابہ کرام جو مقتدی تھے' انہوں نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے' کیونکہ یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے کہ لوگ کھڑے تھے۔ جن روایتوں میں کھڑے ہونے کا ذکر ہے' وہ ضعیف ہیں۔

سادساً" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قیام سماع تکبیر کے لیے تھا کیونکہ آواز نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ بیمار ہونے کے کمزور تھی اور اجتماع کثیر تھا۔ سب کو سنائی دینا مشکل تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑا ہونا بھی اسی ضرورت کی بنا پر تھا ورنہ مقتدی کے کھڑے ہونے کا یہ مقام نہیں ہے۔

سابعاً" چلئے یوں ہی سہی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسرے مقتدی بھی کھڑے تھے لیکن سب کو مسلم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل ہونے سے پہلے حضرت

ابوبکر ﷛ آپ کے مقرر کردہ امام تھے جو کھڑے ہو کر نماز پڑھا رہے تھے اور مقتدی لوگ بھی سب کھڑے تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ مرض میں تخفیف ہونے پر تشریف لے آئے تو آپ کو ابوبکر ﷛ کی بائیں طرف بٹھا دیا گیا۔ اب آپ ابوبکر ﷛ کے امام ہو گئے اور ابوبکر ﷛ دیگر لوگوں کے امام ہوئے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یصلی قاعدا یقتدی ابوبکر بصلٰوۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم والناس یقتدون بصلٰوۃ ابی بکرا۔ (مشکوٰۃ) اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکر ﷛ نہ مستقل امام رہے اور نہ مقتدی ہوئے بلکہ بین بین حالت ہو گئی کہ من وجہ امام تھے اور من وجہ مقتدی ہوئے۔ پس جس موقعہ پر اس طرح کی صورت ہو تو وہاں اس ہیئت عجیبہ سے نماز پڑھ لیں اور جہاں یہ صورت نہ ہو بلکہ پہلے ہی امام مقرر کردہ راتب نماز کے لیے آ کر بیٹھ جائے تو پھر سب مقتدیوں کو اس کی اقتداء میں بیٹھ جانا ضروری ہو گا۔

ثامناً: یہاں قول اور فعل میں تعارض ہے اور قاعدہ مسلمہ ہے کہ ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ کے قول کو فعل پر اس وجہ سے ترجیح ہوتی ہے کہ فعل میں کئی احتمال ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ کتاب الاعتبار حازمی کے ص-۸ پر وجوہ ترجیحات میں سینتیسویں (۳۷) وجہ یہ لکھی ہے کہ ان یکون احد الحدیثین قولا والاٰخر فعلا فالقول ابلغ فی البیان۔ یعنی "قولی اور فعلی حدیث میں تعارض ہو تو قولی کو ترجیح ہے فعلی پر، کیونکہ وہ بیان مسئلہ میں واضح اور بلیغ ہے۔"

<u>خلاصہ بحث</u> ⇦ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر ان دو معارض احادیث میں ترجیح کی طرف جائیں تو بھی ہمارا مسلک راجح ہے ورنہ تطبیق ممکن ہے تو نسخ کا دعویٰ بہرصورت باطل ہے۔ اب تطبیق کی صورت جو محدثین نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ الفتح الربانی شرح مسند لاحمد ج-۵، ص-۲۸۸ میں ہے کہ امام احمد نے ان دونوں احادیث میں تطبیق دی ہے کہ اگر امام راتب ایسی بیماری میں نماز بیٹھ کر شروع کرے جس میں اس کو بیماری سے صحت یاب ہونے کی امید ہو تو مقتدی لوگ اس کے پیچھے نماز بیٹھ کر پڑھیں اور اگر امام راتب کھڑے ہو کر نماز شروع کرے تو مقتدی کھڑے ہو کر اس کی اقتدا کریں پھر اصلی امام آ جائے اور سابق اس کی اقتداء کرے تو سابق امام

اور مقتدی کھڑے ہو کر نماز پڑھیں۔ اگرچہ اصلی امام بیٹھ کر نماز پڑھے جیسے واقعہ مرض الموت میں ہوا۔ علامہ مصنف الفتح الربانی فرماتے ہیں کہ وھو جمع عن وجھہ کہ "یہ مطابقت نہایت اچھی ہے۔" نیل الاوطار ج۔۳' ص۔۱۷۰ میں امام شوکانی نے بھی اس کو پسند کیا ہے کہ صورت نسخ سے یہ بہت بہتر تطبیق ہے کیونکہ ان میں دو حالتیں مختلف ہیں۔ مرعاۃ المفاتیح میں بھی علامہ عبید اللہ محدث مبارک پوری نے بھی اس کو پسند کیا ہے اور امام ابن حزم نے بھی اسی کے قریب صورت اختیار کی ہے۔ بندہ بھی اسی کو درست سمجھتا ہے' واللہ اعلم۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد۔۲۶' شمارہ۔۲۵' ۲۶' ۲۷ مورخہ ۶ ار و ۲۳ ار و ۲۷ ار جون سنہ۔۱۹۷۵ء

نماز کی جماعت کے لیے کب اقامت کہنی چاہیے

سوال عام طور پر تمام مساجد اہل حدیث و غیر اہل حدیث میں یہ رواج ہے کہ نماز کے لیے تکبیر اس وقت کہی جاتی ہے جب کہ امام مصلے پر آجائے اور اس کے بغیر اقامت کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور بعض بزرگ کہتے ہیں کہ امام کے مصلے پر آنے سے پہلے ہی تکبیر کہی جانی چاہیے۔ احادیث کی رو سے کون سی بات صحیح ہے؟ مناسب یہ ہے کہ "الاعتصام" میں یہ تحقیق شائع کرا دی جائے۔

حافظ محمد اکرم رحمانی متعلم جامع سعیدیہ خانیوال

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین امابعد فاقول وباللّٰہ التوفیق۔ اس مسئلہ اقامت کی وضاحت سے پہلے بطور تمہید دو باتیں عرض کرتا ہوں۔ اول یہ کہ جب کوئی مسئلہ اور حکم کسی صحیح حدیث سے ثابت ہو اور مسلک کے عام اہل اسلام کا تعامل اور رواج اس کے خلاف ہو تو اس وقت عام رواج سے متاثر نہ ہونا چاہیے بلکہ حدیث صحیح نبوی اور تعامل صحابہ کا اتباع کرنا چاہیے۔ اہل حدیث کا مسلک یہی ہے۔ چنانچہ احکام الاحکام جلد اول' ص۔۴۳ میں ہے کہ لن یقولوا سمعنا واطعنا وھذا جواب اصحاب الحدیث الذین شھد لھم اللّٰہ تعالٰی وقولہ الحق انھم مؤمنون

وانهم مفلحون وانهم هم الفائزون۔ یعنی "مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول کا حکم سن کر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں۔" جماعت اہل حدیث کا یہی جواب اور مسلک ہے جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت دی ہے کہ یہی لوگ اہل ایمان ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو قیامت کو فلاح پائیں گے۔

احادیث صحیحہ کے مقابلہ میں رواج عامہ کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ خواہ تمام جہاں اس کے خلاف ہو۔ چنانچہ امام نووی شرح مسلم جلد اول' ص-۳۴۹ میں رقمطراز ہیں کہ واذا ثبت السنة لا تترک لترک بعض الناس واکثرهم اوکلهم لها۔ یعنی "جب کوئی سنت اور طریقہ شرعیہ کسی صحیح صریح حدیث سے ثابت ہو جائے تو پھر اس کو ترک نہ کرنا چاہیے بلکہ اس پر عمل درآمد کرنا چاہیے' خواہ اس طریقہ کو بعض لوگوں نے چھوڑ رکھا ہو یا اکثر نے ترک کر دیا ہو یا سب جہاں نے چھوڑ دیا ہو' کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔ ایسے موقعہ پر جو شخص کسی سنت نبوی پر عمل کرے گا تو اس کو شہادت کا درجہ میسر ہو گا۔ الحمدللہ اہل حدیث ہی یہ درجہ حاصل کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت کسی مسئلہ پر صحیح حدیث ناطق ہو اور پھر کوئی شخص اس کو کسی امام یا پیر یا علماء یا رواج عامہ کے خلاف عمداً" اور لاپرواہی سے ٹھکرا دے گا تو وہ بقول رئیس المجتہدین مجدد قرن خامس (حافظ ابن حزم) کافر و مشرک ہے۔ احکام الاحکام نمبر-۵' ص-۹۷۰ میں یہ فرماتے ہیں: والذی لا یشک فیه ان من بلغته هذه الآثار وصحت عنده ثم استجاز خلاف ماصح عن رسول الله صلی الله علیه وسلم اتباعا بقول ابی حنیفة ومالک فهو کافر مشرک حلال الدم والمال لاحق بالیهود والنصاری (وکذا قال الامام الشافعی فی الام۔ یعنی "جس شخص کو کسی مسئلہ میں احادیث صحیحہ پہنچ جائیں اور پھر وہ ان کو اپنے امام ابوحنیفہ یا امام مالک کے قول کی تقلید پر مجبور کرتا ہوا ٹھکرا دے گا تو وہ کافر مشرک ہے اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ لاحق ہے اور صحیح حکومت اسلامی ہو تو عدم توبہ کی صورت میں اس کا قتل جائز اور مال حلال ہے۔" لہٰذا اہل حدیث کو کسی حدیث صحیح سے انکار نہ کرنا چاہیے۔

تیسری یہ بات کہ جو طریقہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے بعد پیدا ہو اور

رواج پذیر ہو کر نئی شکل اختیار کر گیا' وہ بدعت ہے۔ خواہ یہ احداث ذاتی ہو یا صفاتی۔ ذاتی کی مثال یہ وظیفہ ہے یاشیخ عبدالقادر جیلانی شیئا اللہ۔ یہ وظیفہ اہل بدعت کرتے ہیں جس کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث اور ائمہ اربعہ کی فقہ میں نہیں ہے اور صفاتی کی مثال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جماعت کراتے وقت جب سلام پھیرتے تو اس وقت کبھی دائیں جانب پھر جایا کرتے تھے اور کبھی بائیں طرف۔ اب اگر کوئی شخص ہمیشہ دائیں طرف پھرتا رہے اور دائیں جانب پھرنا ناحق نہ سمجھے اور نہ ادھر پھرے تو اس نے نماز میں شیطان کا حصہ ملا لیا ہے۔ پس جس شرعی عمل کی ہیئت شرعیہ تبدیل ہو جائے تو پھر وہ بدعت ہو جاتا ہے۔ یہ تین باتیں ذہن میں رکھ کر اب مسئلہ مسئولہ کی تحقیق سنئے۔

(ا) مجمع الزوائد جلد-۲' ص-۵۷ میں ایک باب یوں منعقد کیا گیا ہے: باب اقامة الصلوة قبل مجئی الامام۔ یعنی "اس مسئلہ کا بیان کہ امام کے آنے سے پہلے نماز کی اقامت (تکبیر) کہی جائے۔" پھر اس کے ثبوت میں یہ قولی حدیث ذکر کی گئی ہے عن جابر بن سمرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا اقیمت الصلوٰة فلا تقوموا حتی ترونی رواه الطبرانی فی الاوسط والصغیر واسناده حسن۔ یعنی "جابر بن سمرہ ﷜ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب اقامت کہی جائے تو تم صف بندی کے لیے مت کھڑے ہو جب تک تم مجھے گھر سے نکلتے ہوئے نہ دیکھ لو۔" یہی حدیث جامع صحیح بخاری جلد اول' ص-۸۸ میں ہے۔ اس کے حاشیہ پر بحوالہ عینی شرح بخاری یہ لکھا ہے مذهب الجمهور الی انهم لا یقومون حتی یروه۔ یعنی جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ جب اقامت ہو جائے تو نمازیوں کو صف بندی اور نماز کے لیے کھڑا نہ ہونا چاہیے۔ جب تک امام کو مصلے کی طرف آتا ہوا نہ دیکھ لیں۔" اس حدیث سے صریح طور پر ثابت ہوا کہ امام کے مصلے پر آنے سے پہلے اور نمازیوں کی صف بندی سے پہلے اقامت کہنی چاہیے۔ کیونکہ جیسے اذان ان لوگوں کو باہر سے بلانے اور جمع کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے ایسے ہی اقامت جو اذان کے حکم میں ہے مسجد کے لوگوں اور امام کو جمع کر کے نماز پڑھانے کے لیے مشروع کی گئی ہے۔ یہ حدیث قوی ہے جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے کہ اقامت امام کے مصلے پر کھڑے ہونے

سے پہلے ہونی چاہیے۔

(۲) مسلم شریف جلد اول' ص-۲۲۰ باب متی یقوم الناس للصلوٰۃ میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا اقیمت الصلوٰۃ فقمنا فعدلنا الصفوف قبل ان یخرج الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الحدیث) یعنی "نماز کی اقامت ہو گئی تو ہم نے کھڑے ہو کر صفیں درست کر لیں قبل اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف نماز پڑھانے کے لیے تشریف لائیں۔" اس حدیث سے بھی امام کے مصلے پر آنے سے پہلے اقامت کہنی جائز ثابت ہوئی۔

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ صحیح مسلم میں اسی عنوان کے تحت یہ حدیث ہے عن ابی هريرة ان الصلوٰة كانت تقام لرسول الله صلى الله عليه وسلم فياخذ الناس مصافهم قبل ان يقوم النبى صلى الله عليه وسلم مقامه یعنی "نماز کی اقامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کہی جاتی تو لوگ اپنی صفوں کی جگہوں پر قائم ہو جاتے پہلے اس کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مصلے پر کھڑے ہوں۔" اس حدیث سے بھی اقامت کا پہلے ہونا اور نمازیوں کا بعد میں صفیں باندھنا اور پھر امام کا مصلے پر آنا ثابت ہوا۔

(۴) مسلم شریف میں مرض الموت کے ذکر میں ہے کہ عن انس قال لم يخرج الينا نبى الله صلى الله عليه وسلم ثلاثا فاقيمت الصلوٰة فذهب ابوبكر يتقدم (الحديث) یعنی "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آخری بیماری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تین دن ہماری طرف نہ نکلے اور ایک دن اقامت کہی گئی تو انتظار کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آگے ہو کر نماز پڑھائی۔" اس سے بھی امام کے مصلے پر آنے سے پہلے اقامت کہنی ثابت ہوئی۔ اس سے کوئی عالم محقق انکار نہیں کر سکتا کہ احادیث قولیہ اور فعلیہ سے ثابت شدہ یہ مسئلہ یوں ہی ہے۔

(۵) یہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا سمعتم الاقامة فامشوا الى الصلوٰة یعنی "جب تم اقامت سن لو تو نماز کی طرف چلو۔" اس سے ثابت ہوا کہ اقامت نمازیوں کے صف باندھنے سے پہلے اور امام کے مصلے پر کھڑا ہونے سے پہلے کہی جائے کیونکہ اقامت نمازیوں کو صف بندی کر کے نماز با جماعت پڑھنے کے لیے دعوت ہے۔

(۶) امام نسائی نے سنن نسائی (جلد اول' ص-۹۳) میں یوں عنوان قائم کیا ہے: اقیمت الصلوٰۃ فقمنا فعدلت الصفوف قبل ان یخرج الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی اذا .... امام فی ..... لا قبل ان ..... (الحدیث) یعنی "اقامت کہی گئی پھر ہم لوگ کھڑے ہوئے پھر صفیں درست کی گئیں۔ قبل اس کے کہ رسول اللہ ﷺ ہماری طرف.....

امام شوکانی نے مسئلہ زیر بحث سے متعلق روایات ذکر کر کے یہ لکھا ہے کہ انهم کانوا یعدلون الصفوف قبل خروجه صلی اللہ علیہ وسلم (نیل الاوطار جلد اول' ص-۴۸) "صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے صفیں درست کر لیتے تھے۔"

(۷) ترمذی جلد اول' ص-۳۱ میں ہے کہ نعمان بن بشیر ؓ کہتے ہیں کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسوی صفوفنا فخرج یوما فرای رجلا خارجا صدرہ من القوم فقال لتسون صفوفکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم۔ یعنی نبی کریم ﷺ (گھر سے تشریف لاتے تو) ہماری صفیں درست فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن تشریف لائے تو کسی شخص کو دیکھا کہ اس کا سینہ صف کے لوگوں سے باہر کو نکلا ہوا ہے۔ فرمایا کہ تم اپنی صفیں درست کیا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اختلاف ڈال دے گا۔"

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ صفیں پہلے کھڑی ہو چکی تھیں جبھی تو کسی شخص کا سینہ آگے کو نکلا ہوا دیکھ کر تنبیہ فرمائی گئی۔ ہاں بعض احادیث میں جو یہ آیا کہ اقیمت الصلوٰۃ فاقبل علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوجهه فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا۔ یعنی "نماز کھڑی ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی صفیں درست کرو اور آپس میں خوب مل جاؤ۔" تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ آپ اقامت کے بعد گھر سے نکلتے تو پھر صفوں کو دیکھ کر ان کو درست کرتے تھے۔ ان احادیث میں بالکل یہ ذکر نہیں ہے کہ اقامت سے پہلے آنحضرت ﷺ مصلے پر آ کھڑے ہو جاتے تھے پھر صفیں درست کرتے تھے۔ اس طرح دیگر روایات کی مخالفت لازم آتی ہے۔ فتدبروا۔

(۸) اقامت کے بعد آنحضرت ﷺ اپنے گھر سے آتے تھے تو لوگوں کی حالت دیکھتے تھے۔ اگر کوئی خلاف عمل کرتا تو اس کو روکتے تھے۔ چنانچہ مجمع الزوائد جلد-۲' ص-۷۵ میں یہ حدیث ہے کہ عن ابن عباس قال اقیمت صلوٰۃ الغداۃ فھضت لاصلی الرکعتین قبل الغداۃ فاخذ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بیدی فجذبنی وقال اتصلی الصبح اربعا - (رواہ الطبرانی فی الکبیر والبزار بنحوہ وابویعلٰی ورجالہ ثقات) یعنی "حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ (ایک دفعہ) نماز صبح کی اقامت ہو گئی (تاہم) میں نے کھڑے ہو کر صبح کی دو سنت پڑھنی شروع کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے آکر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچ لیا اور فرمایا کہ کیا تو صبح کی چار رکعت پڑھتا ہے؟" یعنی اقامت کے بعد فرضوں کا وقت ہے۔ اس وقت فرض دو ہیں چار نہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ مصلے پر نہ تھے' گھر سے آئے تھے۔ آپ نے ابن عباس ؓ کو دیکھا تو سنت فجر پڑھنے سے روک دیا۔ اگر آپ اس وقت مصلے پر ہوتے تو ابن عباس ؓ نماز سنت فجر نہ شروع کرتے بلکہ جماعت سے مل جاتے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ آنحضرت ﷺ گھر سے ابھی تک نہیں نکلے' میں سنت فجر پڑھ لوں۔ اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ اقامت ہونے کے بعد سنن مؤکدہ پڑھنا ناجائز ہے۔ مزید تائید دونوں مسئلوں کی اس حدیث سے ہوتی ہے: عن انس قال خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حین اقیمت الصلوٰۃ فرای ناسا یصلون رکعتی الفجر فقال صلاتان معا ونھی ان تصلیا اذا اقیمت الصلوۃ رواہ البزار (مجمع الزوائد ایضاً) یعنی "حضرت انس ؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب اقامت کہی گئی تو گھر سے نکلے تب لوگوں کو دیکھا کہ انہوں نے سنت فجر پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ اس پر ارشاد فرمایا کہ دو نمازیں اکٹھی شروع کر دی ہیں؟ اور آپ نے اقامت کے بعد سنت فجر پڑھنے سے منع فرما دیا۔ یہ حدیث مرسل بتائی گئی ہے مگر ہم نے اس کو بطور تائید پیش کیا ہے اور حدیث ضعیف سے تائید ہو سکتی ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ جب گھر سے نکلتے تو بلال ؓ آپ کو دیکھ کر اقامت کہہ دیتے تھے' اس سے ظاہر ہے کہ امام جب تک نہ آئے تو اقامت نہ کہنی چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا۔ ایک روایت میں ہے ولا

یقیم حتی یخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ بلال رضی اللہ عنہ اقامت اس وقت تک نہ کہتے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے نکلتے نہ دیکھ لیتے۔ یہ گاہے گاہے ہوتا تھا' ہمیشہ نہیں۔ قبل خروج امام اقامت کہنا بھی جائز ہے۔ جب یہ یقین ہو کہ امام اقامت سن کر آجائے گا اور امام کو نکلتے ہوئے دیکھ کر بھی اقامت درست ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض نے تمام احادیث مختلفہ کو ملا کر یوں تطبیق دی ہے کہ یجمع بین مختلف ھذہ الاحادیث بان بلالا کان یراقب خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حیث لا یراہ غیرہ الا القلیل فعند اول خروجہ یقیم ولا یقوم الناس حتی یروہ ثم لا یقوم مقامہ حتی یعدلوا الصفوف۔ یعنی "مختلف روایتوں کے درمیان مطابقت یوں دی جائے گی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکلنے کا انتظار کرتے اور نگاہ رکھتے تھے جہاں عام لوگوں کی نظر نہ جاتی تھی۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) حجرہ سے نکلنے شروع ہوتے تو بلال رضی اللہ عنہ فوراً اقامت کہنے لگتے اور لوگ صف اس وقت باندھتے تھے جب سب دیکھ لیتے کہ آپ مسجد میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مصلے پر کھڑے نہ ہوتے جب تک لوگ صفیں درست نہ کر لیتے تھے۔"

اس سے بھی رواج عامہ کی تردید ہو گئی کہ عہد نبوی میں کبھی اس طرح اقامت نہیں کہی گئی کہ صفیں باندھی گئی ہوں اور امام مصلے پر کھڑا ہو۔ پھر اقامت کہی گئی ہو اور مؤذن کے قد قامت الصلوۃ کہنے پر تکبیر تحریمہ کہی گئی ہو۔ اس کا کوئی ثبوت صحیح حدیث میں موجود نہیں۔ یہ محض قیاسی مذہب ہے جو کسی کی تقلید پر مبنی ہے' لہٰذا یہ مردود ہے۔

(۹) ہاں اس کے خلاف یہ روایت ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا کنا نقوم فی الصفوف علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویلا" قبل ان یکبر (ابوداؤد) یعنی "ہم عہد نبوی میں صفوں پر بہت دیر کھڑے رہتے تھے' ابھی امام نے تکبیر نہ کہی ہوتی تھی۔"

میں کہتا ہوں کہ پہلے کچھ عرصہ اسی طرح ہوا تو یہ لوگوں پر شاق گذرا تب یہ حکم دیا گیا کہ اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی قد خرجت یعنی "جب اقامت ہو جائے تو کھڑے نہ ہو (بیٹھے رہو) یہاں تک کہ مجھے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لو۔" یہ

حدیث قولی جو نہایت اصح ہے فیصلہ کن ہے کہ اقامت رسول اللہ ﷺ کے آنے سے پہلے ہی ہو جاتی تھی۔ آپ کچھ ٹھہر کر آتے تھے۔ جب تک نہ آتے لوگ بیٹھے رہتے۔ پھر آپ کی ذات مبارک حجرہ سے نمودار ہوتی تو سب لوگ کھڑے ہو کر صفیں باندھ لیتے تھے۔ تب آپ صفیں درست کر کے تکبیر تحریمہ مصلے پر آکر کہتے تھے۔ اور یہی میرا معمول ہے جو بفضلہ تعالیٰ صحیح احادیث سے ثابت ہے' فللہ الحمد۔

(۱۰) امام کے آنے سے پہلے صفوں پر کھڑے ہونے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ناپسند کیا' بیٹھ جانے کو ٹھیک کہا۔ چنانچہ عون المعبود جلد اول کے ص۔ ۲۱۳ میں ہے قال ابن الاثیر فی النھایۃ فی حدیث علی انہ خرج والناس ینتظرونہ للصلوۃ قیام علی صفوفھم فقال مالی اراکم سامدین یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کے لیے نکلے تو مقتدی آپ کے انتظار میں نماز کے لیے صفوں پر کھڑے تھے تو آپ نے فرمایا کیا بات ہے کہ تم کو غافلوں کی طرح کھڑے دیکھتا ہوں۔" اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اقامت کے بعد آیا کرتے تھے۔ نیز ان احادیث سے یہ ظاہر ہوا کہ اقامت اور امام کی تکبیر تحریمہ میں کچھ وقت کا فصل کرنا ضروری ہے۔ تکبیر کے بعد فوراً امام کا تکبیر تحریمہ کہنا اور اس کو ضروری جاننا بدعت ہے۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں باب باندھا ہے باب فی الصلوۃ تقام ـــــ الامام ینتظرونہ قعودا یعنی "یہ باب ــــــ کے بیان میں ہے کہ نماز کی اقامت کہی جائے اور ــــــ

(۱۱) سنن ابی داؤد میں ایک حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اقیمت الصلوۃ فعرض لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجل فحبسہ بعد ما اقیمت۔ یعنی "نماز کی تکبیر کہی گئی۔ پس ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا۔ اس نے آپ کے ساتھ اتنی سرگوشی کی کہ آپ کو دیر تک روک لیا۔ اس کے بعد کہ اقامت ہو چکی تھی۔" اس حدیث پر عون المعبود میں حافظ ابن حجر سے نقل کیا گیا ہے وفیہ جواز الفصل بین الاقامۃ والاحرام اذا کان الحاجۃ اما اذا کان بغیر حاجۃ فھو مکروہ۔ یعنی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی ضرورت کے لیے اقامت اور تکبیر کے درمیان فاصلہ کرنا جائز ہے۔ ہاں بغیر ضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے۔"

سنن ابوداؤد میں ایک روایت مرسل یوں وارد ہے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ

علیه وسلم حین تقام ما الصلوٰة فی المسجد اذا راهم قلیلا جلس لم یصل وان اراهم جماعة صلی۔ یعنی "تکبیر نماز کی کہی جاتی اور آنحضرت ﷺ مسجد میں ہوتے اور لوگوں کو تھوڑے دیکھتے تو بیٹھ جاتے اور نماز نہ شروع کرتے۔ جب دیکھتے کہ اب پوری جماعت بن گئی ہے تو پھر نماز شروع کر دیتے تھے۔" یہ حدیث مرسل تابعی کی ہے جو حنفیہ کے نزدیک حجت ہے۔ نور الانوار وغیرہ میں اس کی صراحت ہے۔

کتاب انہاء السکن کے ص۔۱۱ میں جمعیت علماء دیوبند کے رکن اعظم مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی لکھتے ہیں "مرسل الصحابی حجة بلا شک و عندنا مرسل التابعی ایضا" یعنی "صحابی کی مرسل روایت تو بلاشبہ حجت ہے اور مرسل تابعی کی بھی ہمارے حنفیہ کے نزدیک حجت ہے۔"

یہ حدیث مذکور سالم ابوالنضر تابعی کی ہے جو آنحضرت ﷺ سے روایت کرتا ہے تو یہ حدیث مرسل تابعی ہے جو حنفیہ پر حجت ہے۔ پس اس کا یہ مذہب کہ تکبیر میں جب مؤذن قد قامت الصلوة کہے تو امام پر واجب ہے کہ تکبیر تحریمہ کہہ دے' یہ مذہب باطل ہے۔ فصل کرنا جائز ہے۔ چنانچہ ابی داؤد میں ہے عن ابی بکرة ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم دخل فی صلاة الفجر فاوماء بیده ان مکا لکم ثم جاء وراسه یقطر فصلی بهم۔ یعنی ابوبکرہ ؓ نے بیان کیا کہ (ایک دفعہ) آنحضرت ﷺ نماز فجر میں داخل ہوئے۔ پھر آپ نے غسل جنابت یاد کر لیا تو آپ نے اپنے ہاتھ سے لوگوں کو اشارہ کیا کہ اسی طرح کھڑے رہو' اپنی جگہ پر۔ پھر آپ غسل کر کے آئے۔ اس وقت آپ کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔" اس حدیث سے یہی ثابت ہوا کہ عندالضرورت تکبیر مؤذن اور امام کی تکبیر تحریمہ کے درمیان فصل کرنا جائز ہے اور حنفیہ کا مذہب باطل ہے۔ نیز یہ کہ امام کے آنے سے پہلے اقامت جائز ہے۔

مخالف دلائل کا تجزیہ ⇐ بعض حنفیہ کچھ آثار پیش کرتے ہیں جو بمقابلہ احادیث نبویہ حجت نہیں ہیں اور بعض یہ روایت پیش کرتے ہیں: عن عبداللّٰه بن ابی اوفی قال کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا قال بلال قد قامت الصلوة فهض ـــــ فکبر۔ (مجمع الزوائد جلد۔۲' ص۔۹) یعنی "عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے کہ جب بلال ؓ قد قامت الصلوة کہتے تھے تو نبی کریم ﷺ سیدھے کھڑے ہو کر تکبیر

تحریمہ کہہ دیا کرتے تھے۔" یہ دلیل دلالت کے لحاظ سے تو بہت ٹھیک تھی لیکن یہ دو وجہ سے مردود ہے۔

اول یہ کہ یہ روایت نہایت درجہ کی ضعیف ہے۔ چنانچہ مجمع الزوائد میں اس روایت کے بعد یہ لکھا ہے۔ رواه الطبرانی فی الکبیر من طریق حجاج بن فروخ وهو ضعیف جدا۔ یعنی "اس حدیث کو طبرانی نے کبیر میں حجاج بن فروخ کے طریق سے روایت کیا ہے جو نہایت درجہ کا ضعیف ہے۔" امام ذہبی نے میزان میں اس روایت کا ذکر کر کے حجاج کے سبب اس کی منکر روایتوں میں شمار کیا ہے کہ اس کی علامت منکر روایتوں کے بیان کرنے کی ہے۔ (میزان جلد اول' ص-۲۱۵) دیگر یہ کہ یہ روایت طبقہ ثالثہ کی ہے جو روایات صحیحہ طبقہ اولیٰ و ثانیہ کے سراسر خلاف ہے' لہٰذا حجت نہیں ہے۔ تیسرا یہ کہ طبقہ ثالثہ کی روایات معمول بہا عندالمحدثین نہیں ہیں' خصوصاً جبکہ صحاح کے خلاف ہوں۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ زمانہ حاضرہ میں تمام مساجد اہل حدیث اور حنفیہ میں یہ تعامل چلا آتا ہے کہ امام جب مصلے پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے تو نمازی اپنی صفیں باندھ لیتے ہیں پھر مؤذن تکبیر کہہ دیتا ہے اور امام تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر دیتا ہے۔ یہ تعامل امت کثیرہ کا ہے پھر شاذ و نادر کوئی مولوی اس کے خلاف عمل کرے کہ امام ابھی گھر میں ہو اور تکبیر مؤذن پہلے ہی کہہ دے۔ پھر امام آکر نماز پڑھائے تو یہ ہرگز نہ مانا جائے گا پھر اگر امام گھر میں نہ ہو مسجد میں موجود ہو تو پھر ضرور اس کو مصلے پر کھڑا ہونا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرون ثلاثہ مشهود لها بالخیر کے بعد کسی زمانہ کا تعامل شرعی حجت نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ خلاف سنت صحیحہ ہو تو وہ تعامل سراسر باطل ہے۔ چنانچہ مرعاۃ المفاتیح ج-۲' ص-۸۶ میں ہے: والسنة الصحيحة المحكمة حجة وقاضية على التعامل لا ان التعامل قاض على السنة لا فرق عندنا فى ذالك بين عمل اهل المدينة وبين عمل غيرهم من البلاد الاسلامية یعنی "سنت اور حدیث محکم شرعی حجت ہے اور تعامل اہل زمانہ پر قاضی ہے اور تعامل کسی زمانہ کا سنت پر قاضی نہیں ہو سکتا ہے اور اہلحدیث کے نزدیک اس بات میں کوئی فرق نہیں ہے کہ تعامل اہل مدینہ کا ہو یا دیگر بلاد اسلامیہ کا وہ شرعی حجت نہیں ہو سکتا۔ اور

نہ سنت پر قاضی بھی ہو سکتا ہے۔" بندہ نے مضمون ہذا کی تمہید میں بھی یہ واضح کر دیا ہے کہ جب سنت صحیح ثابت ہو جائے تو اکثر یا کل لوگوں کے ترک کرنے سے وہ سنت متروک نہ کی جائے گی کہ اللہ و رسول کا حکم سب پر غالب ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ امام گھر میں نہ ہو بلکہ مسجد میں نمازیوں کے پاس ہو تب بھی مئوذن کو امام کے مصلے پر آنے سے پہلے تکبیر کہہ دینی چاہیے پھر تکبیر کے بعد لوگ صف باندھ لیں اور امام ہر صف کو درست کر کے مصلے پر آئے اور نماز کا احرام باندھ کر تکبیر تحریمہ کہہ دے۔

اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دیگر علماء محققین بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ چنانچہ مرعاۃ المفاتیح جلد اول' ص۔ ۴۴۷ میں ہے کہ حدیث ابوقتادہ پر یہ لکھتے ہیں وفیہ انہ اذا لم یکن الامام فی المسجد لا یقوم المؤتمون عند الاقامۃ الی الصلوٰۃ الا حین یرونہ والیہ ذھب الجمھور واما اذا کان ھو معھم فی المسجد فامستحب ان الاقامۃ یقوم الناس اذا اخذا المؤذن فی الاقامۃ وفیہ جواز والامام فی منزلہ اذا کان یسمعھا وتقدم اذنہ فی ذالک یعنی "اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر امام مسجد میں نہ ہو تو مقتدی اقامت سن کر کھڑے نہ ہوں مگر یہ کہ امام کو نماز کی طرف آتا دیکھ لیں تو پھر کھڑے ہو جائیں۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے اور جب امام مسجد کے اندر موجود ہو تو پھر مستحب یہ ہے کہ جب مئوذن اقامت کہے تو لوگ صفیں باندھ لیں اور اس حدیث ابوقتادہ ﷺ میں یہ مسئلہ بھی ہے کہ امام گھر میں ہو اور تکبیر سن سکتا ہو اور اس نے اذن دے رکھا ہو تو تکبیر کہنی جائز ہے۔

علاوہ ازیں فتاویٰ ثنائیہ جلد اول' ص۔ ۳۰۱' ۳۰۲ میں مندرجہ ذیل فتویٰ درج ہے جس سے اسی مسلک کی تائید پائی جاتی ہے۔ انصاف سے ملاحظہ کریں۔

سوال امام اور مقتدی شروع تکبیر سے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جائیں یا جب مکبر حی علی الصلوۃ پر پہنچے؟

جواب کسی حدیث میں' میں نے یہ ترتیب نہیں دیکھی۔ علماء کی دانست ہے جس پر عمل کرنا واجب ہے نہ حرام۔ (جب یہ تعامل ثابت نہیں تو اس کو مشروع جان کر کرنا بدعت ہوا)

عبدالقادر

تشریح یہ بریلوی علماء کی ایجاد ہے جو صحیح نہیں ہے۔ حدیث صحیح سے امام کا بعد تکبیر مؤذن یعنی تکبیر پوری کہنے کے بعد اپنی جگہ مصلے پر کھڑا ہونا اور تکبیر تحریمہ کہنا ثابت ہے اور مقتدیوں کا امام سے بھی پہلے اپنی اپنی جگہ پر کھڑا ہونا ثابت ہے۔ حی علی الصلوۃ سے نماز کا بلاوا ہے اور قد قامت الصلوۃ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لیے جلد آؤ کھڑی ہونے کو ہے۔ ماضی بمعنی مضارع ہے' اول کلام میں آتی ہے اور مجاز بالمشارف بھی مستلہ ہے۔ عن ابی هريره ان الصلوة كانت تقام لرسول الله صلى الله عليه وسلم فياخذ الناس مصافهم قبل ان ياخذ النبى صلى الله عليه وسلم مقامه - (رواه مسلم و ابوداؤد) وعن ابى هريره قال اقيمت الصلوة وعدلت الصفوف قياما قبل ان يخرج الينا النبى صلى الله عليه وسلم فخرج الينا فلما قام فى مصلاه- الحديث متفق عليه ولا خلاف بينه وبين الحديث الثانى اذا اقيمت الصلوة فلا تقوموا حتى ترونى قد خرجت اخرجه مسلم واصحاب السنن والبخارى مختصرا نيل الاوطار (ج-۳' ص-۲۴۳) لان المنع قبل الخروج من البيت والجواز بعد الخروج والخروج بعد رؤيتهم له صلى الله عليه وسلم- الغرض یہ کوئی مسئلہ شرعی نہیں ہے کہ مقتدیوں کے لیے لفظ قد قامت الصلوۃ کا سننے سے پہلے جماعت میں صفیں سیدھی کرنے کے لیے کھڑا ہونا حرام ہو جو ایسا کہتا ہے وہ غلطی پر ہے" (ابو سعید شرف الدین دہلوی) (فتاویٰ ثنائیہ جلد اول' ص-۴۸۶' طبع جدید)

اس فتویٰ میں احادیث کی عربی عبارتوں کے تراجم پہلے ہو چکے ہیں۔ پس اس مسلک پر قائم ہونا واجب ہے۔ والسلام

کتبہ ابو الشکور عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاعتصام لاہور جلد-۲۳' شمارہ-۳۱' ۳۲' ۳۳' ۳۴ مورخہ ۳ و ۱۰ و ۱۷ و ۲۴ مارچ سنہ-۱۹۷۲ء

جماعت کے لیے کب کھڑا ہونا چاہیے

سوال کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ عام طور پر اہلحدیث اور حنفیہ

میں یہ رواج ہے کہ جب نماز باجماعت شروع کرتے ہیں تو امام آکر مصلے پر کھڑا ہو جاتا ہے اور مقتدی لوگ صف باندھ لیتے ہیں پھر مؤذن اقامت کہتا ہے تب امام تکبیر کہہ کر نماز شروع کر دیتا ہے۔ لکھوی' غزنوی' روپڑی وغیرہ تمام خاندانوں کے اماموں اور علماء کا یہی دستور دیکھا گیا ہے اور یہی مساجد حنفیہ میں مشاہدہ کیا گیا ہے۔ تمام شہروں اور دیہات میں بھی یہی معمول ہے لیکن ایک عالم کا عمل دیکھا گیا کہ وہ اقامت سن کر اپنے گھر سے جو مسجد سے متصل ہے یا اپنے حجرہ سے جو مسجد سے قریب ہے' آتا ہے۔ جب وہ مسجد کو آرہا ہو تو لوگ صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تب وہ امام مصلے پر آکر صف کو دیکھ کر کہ درست ہے نماز کے لیے تکبیر کہتا ہے۔ یہی اس کا دائمی معمول ہے۔ اور اس نے مؤذن کو سمجھا رکھا ہے کہ جب وقت جماعت کا ہو' اس وقت تم اقامت کہہ دو اور لوگوں کو کہہ رکھا ہے کہ جب تم مجھے دیکھو تو کھڑے ہو کر صف بندی کر لو۔ اگر یہ امام مسجد میں کسی وقت موجود ہے تو پھر بھی مکبر اس امام کے مصلے پر کھڑے ہونے سے پہلے ہی اقامت کہہ دے گا اور امام بعد اقامت کے مصلے پر آئے گا اور لوگ صف بندی کر لیں گے تو پھر یہ امام تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر دے گا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ عام رواج اور تعامل اہلحدیث اور حنفیہ کا صحیح ہے یا اس عالم کا شاذونادر عمل درست ہے۔ بعض علماء نے اس عالم کے طرز عمل کو غلط قرار دیا ہے اور رواج عامہ کو درست بتایا ہے۔ لہٰذا اس بارہ میں کسی دلیل شرعی سے فیصلہ صادر فرمائیں کہ ان متضاد عملوں سے کون سا عمل صحیح ہے تاکہ اس پر عمل قائم رکھا جائے۔ بعض لوگ اس عالم امام کے اس عمل کو ناپسند کرتے ہیں۔

(السائل شیر محمد مؤذن چک نمبر۔۱۷۳ ای۔بی خلقہ عارف والا' ساہیوال)

الجواب بعون الوہاب وھو الموفق للصواب الحمد للہ رب العالمین۔ اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ عہد نبوی گذر چکا اور مدت دراز ہو گئی۔ یہ چودھویں صدی ہے جس میں کئی امور مسنونہ متروک ہو گئے اور بدعات رواج پکڑ گئیں۔ مثلاً آنحضور ﷺ بغیر صبح کے دیگر نمازوں میں سلام پھیرتے ہی معمولی سا ٹھہر کر چلے جاتے تھے لیکن صبح کی نماز کے بعد بیٹھے رہتے تھے۔ اب یہ رواج ہے

کہ تمام حنفیہ اور اکثر اہلحدیث سلام پھیر کر بیٹھے رہتے ہیں اور پھر امام اور مقتدی سب مل کر بہیئت اجتماعی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں۔ امام بلند آواز سے دعا کرتا ہے اور مقتدی لوگ آمین کہتے جاتے ہیں۔ اس موقع پر حنفی بھی آمین بالجہر کہتے ہیں اور پھر وہ سب دلائل بھول جاتے ہیں کہ آمین دعا ہے۔ یہ آہستہ کہنا چاہیے۔ اس طرح دعا کرنے کا عام رواج ہے۔

اگر کوئی شخص عالم امام ہو کر نماز پڑھائے اور اس طرح دعا مروجہ نہ مانگے تو لوگ اس کے انتظار میں بیٹھ کر اپنی دعا مانگنے لگتے ہیں اور اس عالم کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ عجیب مولوی ہے کہ دعا ہی نہیں مانگتا۔ حالانکہ یہ دعا مروجہ تعامل نبوی اور صحابہ سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے بدعت ہے۔ پس اسی طرح یہ تعامل حنفیہ کا جو اہلحدیثوں میں بھی پھیل گیا کہ امام مصلے پر آجائے اور صف باندھ لیں تو پھر اقامت کہتے ہیں' اس کا ثبوت نہیں ہے۔ اور یہ ایسا ہے جیسے کوئی مؤذن محلہ اور گاؤں کے لوگوں کو جمع کر کے پھر اذان کہے تو اس کو لوگ بیوقوف کہیں گے۔ اقامت مروج بھی بیوقوفی ہے۔ جب امام اور مقتدی سب تیار ہو کر کھڑے ہو گئے تو اب اقامت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اقامت تو مسجد کے لوگوں اور امام کو جمع کرنے کے لیے ہے۔ جیسے اذان محلہ کے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے ہے' مؤذن اپنے وقت پر اقامت کہہ دے جب امام اقامت سن کر یا کسی سے معلوم کر کے نماز پڑھانے کو آئے تو مقتدی جو پہلے مسجد میں متفرق طور پر بیٹھے ہیں یا قریب گھروں میں ہیں' سب جمع ہو جائیں اور تعامل نبوی اور صحابہ سے بھی یہی بات ثابت ہے کہ اقامت امام اور مقتدیوں کے جمع ہونے سے پہلے کہنی چاہیے۔

چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع صحیح بخاری میں یوں باب منعقد کیا ہے۔ باب متی یقوم الناس اذا رؤا عند الاقامة۔ یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ جب تکبیر ہو جائے تو لوگ امام کو دیکھ کر کھڑے ہوں۔ پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اقيمت الصلوٰة فلا تقوموا حتى تروني۔ یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تکبیر نماز کے لیے کہی جائے تو تم جب تک مجھے دیکھ نہ لو کھڑے نہ ہو۔" اس سے ظاہر ہوا

کہ اقامت رسول اللہ ﷺ کے آنے سے پہلے ہو جاتی تھی اور لوگ اقامت سن کر صف بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ تب حضور ﷺ نے لوگوں کو منع فرمایا کہ تم اقامت ہوتے ہی فوراً کھڑے نہ ہو جایا کرو بلکہ اس وقت کھڑے ہوا کرو جب مجھے گھر سے نکلتا ہوا دیکھو۔ آنحضور ﷺ گھر میں ہوتے تھے اور مؤذن کی تکبیر کے بعد نکلا کرتے تھے۔ چونکہ لوگوں کو آنحضرت ﷺ کے آنے تک کھڑے ہونے سے تکلیف پہنچتی تھی' اس لیے کھڑے ہونے سے منع کر دیا کہ تم کھڑے نہ ہو۔ جب مجھے آتا دیکھو تو پھر کھڑے ہو۔ اس سے امام اور مقتدیوں کے جمع ہو کر صف بندی کرنے سے پہلے تکبیر کہنا ثابت ہو گیا۔

صحیح مسلم میں مرض الموت کے ذکر میں ہے کہ عن انس قال لم یخرج الینا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثا فا قیمت الصلوٰۃ فذھب ابوبکر یتقدم الحدیث یعنی "حضرت انس ؓ نے بیان کیا کہ نبی اللہ ﷺ تین دن ہماری طرف نہ نکلے' اقامت کہی جاتی رہی تو انتظاری کے بعد حضرت ابوبکر ؓ آگے ہو کر نماز پڑھاتے رہے۔

نیز مسلم شریف میں باب متٰی یقوم الناس للصلوٰۃ یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ لوگ نماز کے لیے کب کھڑے ہوں' اس کے تحت یہ حدیث مذکور ہے کہ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ اقیمت الصلوٰۃ فقمنا فعدلنا الصفوف قبل ان یخرج الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الحدیث) یعنی "اقامت کہی گئی تو ہم نے صفیں کھڑے ہو کر درست کر لیں پہلے اس بات کے کہ آنحضور ﷺ ہماری طرف نکلیں۔ پس آنحضور ﷺ تشریف لائے۔

دوسری روایت میں ہے کہ عن ابی ھریرۃ قال اقیمت الصلوٰۃ وصف الناس صفوفھم وخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقام مقامہ (الحدیث) اسی طرح کئی روایتیں آئی ہیں کہ آنحضرت ﷺ مؤذن کی تکبیر کے بعد اپنے حجرے سے نکلتے تھے' چونکہ اقامت کے بعد لوگ صفیں باندھ لیتے اور آنحضور ﷺ اس کے بعد آتے تھے تو اس تکلیف کو محسوس کر کے آنحضور ﷺ نے یہ حکم نافذ فرمایا کہ اذا اقیمت

الصلوٰۃ فلا تقوموا حتٰی ترونی۔ یعنی "تکبیر ہو جانے کے بعد تم کھڑے نہ ہوا کرو' جب مجھے گھر سے نکلتا دیکھو تب کھڑے ہوا کرو۔" اس سے اقامت کے بعد امام کا آنا ثابت ہو گیا۔ پس اس عالم کا عمل صحیح ہے اور دیگر علماء جو رواج عامہ پر چل رہے ہیں' اس کا کوئی ثبوت میری نظر سے نہیں گزرا۔ جب کوئی پیش کرے گا تو دیکھ لیا جائے گا۔

ہاں امام نووی نے شرح صحیح مسلم جلد اول' ص-۲۲۱ میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت پیش کی ہے کہ کان بلال یؤذن اذا دحضت ولا یقیم حتٰی یخرج النبی صلی اللہ علیه وسلم فاذا خرج اقام الصلوٰۃ حین یراہ۔ یعنی بلال رضی اللہ عنہ جب زوال ہوتا تو اذان کہہ دیتے اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے نکلتے دیکھتے تو اقامت کہہ دیتے۔

قاضی عیاض نے ان مختلف روایتوں میں یوں تطبیق دی ہے: ان بلالا کان یراقب خروج النبی صلی اللہ علیه وسلم من حیث لا یراہ غیرہ الا القلیل فهذا اول خروجه یقیم ولا یقوم الناس حتی یروہ ثم لا یقوم مقامه حتٰی یعدلوا الصفوف۔ یعنی "حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خروج کی نگرانی اور دھیان رکھتے تھے۔ جب دیکھتے کہ آپ نے نکلنا شروع کیا' فوراً اقامت کہہ دیتے تھے۔ اس وقت بلال رضی اللہ عنہ کے بغیر کوئی اور نہ دیکھتا۔ پھر جب آپ مسجد میں داخل ہوتے اور لوگ آپ کو دیکھ لیتے تو کھڑے ہو کر صفیں باندھ لیتے تھے۔ اور آپ صفیں درست ہونے کے بعد اپنے مقام مصلے پر جا کر کھڑے ہوتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ گاہے بگاہے اس طرح کرتے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی گاہے بگاہے اس طرح کرتے تھے' بیان جواز کے لیے یا کسی عذر سے۔ لیکن یہ کسی روایت صحیحہ سے ثابت نہیں ہے جو رواج عام ہے کہ امام مصلے پر کھڑا ہو جائے اور صفیں درست ہو جائیں تو پھر اقامت کہے' یہ غلط ہے۔ ہاں اقامت کے بعد امام اور لوگوں کا اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہونا ٹھیک ہے کہ یہ اقامت کی تعمیل ہے۔ لیکن تعمیل پہلے اور اقامت بعد میں۔ یہ عقل و نقل کے خلاف ہے۔

امام نووی اور دیگر محدثین نے اماموں کے مختلف اقوال و مسلک ذکر کیے ہیں' جن سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں تو تعامل نبوی پر غور کرنا ہے' جن کا ارشاد ہے

صلوا کما رایتمونی اصلی۔ کہ "تم نماز اسی طرح ادا کرو جس طرح مجھے ادا کرتے دیکھا ہے۔" اور قرآن میں ارشاد الٰہی ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ یعنی فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ "تمہارے لیے اللہ کا رسول اسوہ حسنہ اور عمدہ نمونہ ہیں۔" ان کے مطابق عمل کرو۔

نیل الاوطار جزء ثانی' ص-۳۸۰ میں اس مسئلہ پر روایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہم کانوا یعدلون الصفوف قبل خروجہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (مسلم وغیرہ) یعنی "صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے حجرے سے نکلنے سے پہلے صفیں درست کر لیتے تھے۔"

اور دوسری روایت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ انہم کانوا ---- یقومون ساعۃ تقام الصلٰوۃ ولو لم یخرج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فنہاھم عن ذالک لاحتمال ان یقع لہ شغل فیبطئی فیہ عن الخروج فیشق علیہم الانتظار۔ یعنی "نماز کی اقامت کے بعد لوگ کچھ دیر کھڑے ہو جاتے تھے اور آنحضور ﷺ ابھی حجرہ سے نہ نکلے ہوتے تو آنحضور ﷺ نے صحابہ کو اپنے خروج سے پہلے کھڑے ہونے کو منع کر دیا کہ میرے باہر نکلنے سے پہلے تم کھڑے نہ ہو۔ جب مجھے دیکھو کہ میں باہر نکل آیا' تب کھڑے ہو کر صف باندھو۔ اور اس منع اور حکم کا سبب یہ ہے کہ مجھے اقامت کے بعد گھر میں کوئی ایسا شغل ہو جائے کہ آنے میں دیر ہو جائے تو پھر تم پر میرا انتظار تکلیف کا باعث ہو گا۔ اس لیے اقامت کے بعد میرے خروج سے پہلے تم کھڑے نہ ہونا۔ جب میں باہر نکلوں تب کھڑے ہونا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حدیث اذا اقیمت الصلٰوۃ فلا تقوموا حتی ترونی نہایت صحیح اور متفق علیہ ہے اور قولی ہے جو سب سے راجح ہے اور دیگر احادیث کے بعد کی ہے۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ ولعل قولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلا تقوموا حتی ترونی کان بعد ذالک۔ یعنی "آنحضور ﷺ کا یہ حکم کہ تم نہ کھڑے ہو مگر مجھے دیکھ کر شاید یہ حکم بعد کا ہے۔ پہلے لوگوں کا یہ عمل تھا۔ فیاخذ الناس مصافھم قبل خروجہ۔ یعنی اقامت کے بعد لوگ صفوں پر قائم ہو جاتے تھے' تب آپ نے منع کر دیا کہ میرے آنے اور گھر سے نکلنے سے پہلے مت کھڑے ہو۔

خلاصہ کلام اور حاصل مرام یہ ہے کہ اس عالم کا عمل سنت رسول کے مطابق ہے۔ اور دیگر علماء کا مروجہ عمل خلاف سنت ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد۔۵۱' شمارہ۔۲۰ مورخہ ۱۶/ رمضان المبارک سنہ۔۱۳۹۰ھ

الاستفتاء

سوال کیا حکم ہے شرح محمدی کا اس مسئلہ میں کہ نماز باجماعت میں جب صف بندی ہوتی ہے تو اس وقت ہر نمازی کو اپنے ساتھ کے نمازی کے قدم سے قدم اور ٹخنہ سے ٹخنہ ملانا چاہیے یا صرف اس کے برابر کھڑا ہونا اور دونوں کا آپس میں فرق رکھنا ضروری ہے؟ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ صف میں پاؤں سے پاؤں ملانا ضروری نہیں اور نہ ہی یہ کسی حدیث میں لکھا ہے۔ صرف اس کے برابر میں کھڑا ہونا کافی ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کی جائے اور اس کی دلیل شرعی لکھی جائے۔

(السائل علی حسین چک نمبر۔۲۵۱ ای۔بی ضلع ساہیوال)

(الجواب بعون الوهاب وهو الموفق للصواب)

الحمد للہ رب العالمین اما بعد فا قول وباللہ التوفیق! واضح ہو کہ جماعت کے وقت جب صف بندی ہو تو اس وقت صف سیدھی کرنا اور باہم پاؤں سے پاؤں ملانا ضروری ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اس طرح صف باندھو جس طرح فرشتے صف باندھتے ہیں۔ صحابہ نے کہا کہ فرشتے کیسے صف باندھتے ہیں؟ فرمایا کہ وہ پہلی صفوں کو پورا کرتے ہیں۔ وتیراصون فی الصف۔ اور صف میں آپس میں خوب مل جاتے ہیں۔

قاموس میں تیراصون کا معنی یہ لکھا ہے: رصه الزق بعضه ببعض وضم یعنی بعض شخص بعض کے ساتھ خوب مل جائے۔ یہ حدیث ابوداؤد میں ہے۔ اس کی کیفیت حضرت نعمان بن بشیر ؓ صحابی رسول ﷺ یوں فرماتے ہیں: فرایت الرجل یلزق منکبه بمنکب صاحبه ورکبته برکبته صاحبه وکعبه بکعبه۔ (ابوداؤد) یعنی جب

نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ صفیں درست کرو تو میں نے ہر نمازی شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے ساتھی کے کندھے سے کندھا اور گھٹنے سے گھٹنا اور ٹخنے سے ٹخنا ملا دیتا تھا۔ لغت میں الزاق کا معنی چمٹانا ہے اور لفظ "تیراصون" باب تفاعل سے ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ ہر نمازی دوسرے نمازی سے چمٹ جاتا تھا۔ یہی الزاق کا معنی ہے جس کی کیفیت جامع صحیح بخاری ص-۱۰۰ میں حضرت انس ﷺ سے یوں مروی ہے۔ وکان احدنا یلزق منکبه بمنکب صاحبه وقدمه بقدمه۔ یعنی "رسول کریم ﷺ کا حکم سن کر ہم میں سے ہر کوئی شخص اپنے ساتھی کے کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملا دیتا تھا۔"

امام الدنیا فی الحدیث حضرت امام بخاری رحمه اللہ نے اپنی جامع میں اس حدیث پر باب یوں منعقد کیا ہے: باب الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف۔ یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ صف میں نمازی کو دوسرے نمازی کے کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم چمٹانا چاہیے۔ اب الزاق اور تیراصون کے لفظوں پر غور کرنے اور دو صحابیوں کی کیفیت عملی بیان کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوا کہ صف میں ہر نمازی کو دوسرے نمازی کے کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم اور ٹخنہ ملانا چاہیے۔ پس یہ مسئلہ ثابت ہو گیا ہے جس پر مومنین کو آمنا وصدقنا کہنا فرض ہے اور کوئی حیلہ' بہانہ' رائے قیاس اپنی طرف سے چلانا یا اس پر طعن و تشنیع کرنا یا کوئی حجت بازی کرنا جائز نہیں ہے۔ اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ حکم و سنت نبوی اور تعامل صحابہ پر عمل کیا جائے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ پاؤں سے پاؤں ملانا' ٹخنہ سے ٹخنہ ملانا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ وہ علم حدیث سے اور اس مسئلہ کی تحقیق عمیق سے ناواقف ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ حق قبول کرنے کی توفیق بخشے' آمین۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص اہل سنت نہیں ہے ورنہ اس سنت سے انکار نہ کرتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

جلد۔۔۔' شمارہ۔۔۔' مورخہ

کیا نماز تراویح کے ساتھ نماز فرض پڑھنا جائز ہے؟

سوال: کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا اس مسئلہ میں کہ امام نماز تراویح پڑھا رہا ہے۔ اس حالت میں ایک شخص آیا جس نے نماز فرض عشاء کی ادا نہیں کی تھی۔ اب کیا وہ فرض عشاء کو اکیلا ادا کرے یا نماز تراویح کے امام کی اقتدا کر کے اس کے پیچھے نماز فرض ادا کرے؟ اگر نماز تراویح کے امام کی اقتدا کی' امام نے دو رکعت تراویح کے بعد سلام پھیر دیا تو چار فرض پڑھنے والا کیا کرے؟ مدلل جواب دیں۔

الجواب بعون الوہاب الحمد للہ رب العالمین اما بعد! واضح ہو کہ جب فرض نماز عشاء پڑھنے والا آئے تو اس کو چاہیے کہ جماعت کے ساتھ مل جائے' اکیلا نماز نہ پڑھے کیونکہ جماعت سے نماز واجب ہے۔ اس لیے بحکم وارکعوا مع الراکعین جماعت کے ساتھ شامل ہونا واجب ہے۔ جب امام دو رکعت پر سلام پھیر دے تو مفترض کھڑا ہو کر اپنی نماز پوری کرے جیسے مسافر امام کے پیچھے مقیم نماز پڑھتا ہے تو امام کے سلام پھیرنے پر اپنی بقیہ نماز پوری کرتا ہے۔

یہ مسئلہ کہ نماز تراویح کے پیچھے فرض نماز ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اس اصل پر متفرع ہے کہ مفترض کی نماز فرض متنفل کے پیچھے ادا کرنی جائز ہے یا نہیں؟ محدثین اور اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ مفترض کی نماز متنفل کی اقتداء میں جائز ہے۔ چنانچہ مشکوۃ کے باب من صلی صلوۃ مرتین کے تحت ایسی احادیث مذکور ہیں جن سے یہ مسئلہ بدیہی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نماز تراویح تطوع یعنی نفلی نماز ہے جس میں جماعت کرنا کرانا مشروع ہے تو نماز تراویح کے پیچھے نماز درست ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باجماعت ادا کر کے پھر اپنی قوم کے پاس جا کر ان کو عشاء کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ یہ حدیث مشکوۃ کے باب مذکور کی پہلی فصل میں ہے۔

دار قطنی ص-۱۰۲ میں ہے: ثم ینصرف الی قومه فیصلی بهم هی له تطوع ولهم فریضة۔ یعنی "حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ کر پھر اپنی قوم

کو جا کر نماز پڑھاتے تھے۔"

یہ نماز معاذ رضی اللہ عنہ کی نفلی ہوتی تھی اور قوم کے مقتدیوں کی فرض ہوا کرتی تھی۔ اس سے حنفیہ کا مذہب باطل ہوا کہ وہ کہتے ہیں کہ متنفل کی اقتداء میں فرض نماز جائز نہیں۔ ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ یہ اہل قیاس ہیں' کہتے ہیں کہ فرض بھاری ہیں اور نفل ہلکے ہیں' اس لیے جائز نہیں۔ گویا ان کے نزدیک مقتدیوں کی نماز امام کی نماز پر سوار ہو کر آسمان کی طرف سیر کرتی ہے۔ سو قیاس بمقابلہ نص مردود ہے۔

دوسری حدیث مشکوۃ کی دوسری فصل میں ہے کہ یزید بن اسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں صبح کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بموقعہ حج جماعت میں حاضر تھا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح سے فارغ ہوئے تو قوم کے آخری حصہ میں دو شخص علیحدہ بیٹھے تھے' جنہوں نے جماعت سے نماز نہ پڑھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان کو میرے پاس لاؤ' وہ لائے گئے دراں حالیکہ وہ کانپتے تھے کہ شاید ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہو۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے ہمارے ساتھ مل کر جماعت سے نماز کیوں نہ پڑھی؟ انہوں نے عرض کی کہ حضورا ہم اپنے ڈیرہ میں نماز صبح کی ادا کر کے آئے ہیں یعنی نماز فرض سے فارغ ہو چکے ہیں۔ تب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **فلا تفعلا** کہ آئندہ ایسا کام نہ کرنا۔ **اذا صليتما في رحالكم ثم اتيتما مسجد جماعة فصليامعهم** یعنی تم اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو اور پھر مسجد میں آؤ جہاں جماعت قائم ہے تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔ **فانها لكما نافلة**۔ یہ دوسری نماز تمہاری نفل ہو جائے گی۔ اس سے حنفیہ کا دوسرا مسئلہ رد ہو گیا کہ صبح کی نماز دوبارہ جماعت سے نہ پڑھی جائے۔ اور یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ جس شخص نے جماعت سے نماز نہ پڑھی ہو اور وہ جماعت کی حالت میں مسجد میں آجائے تو جماعت سے نماز پڑھے۔ پس اس حکم عام کی رو سے نماز فرض والا جب مسجد میں آیا تو اس کو بحکم **واركعوا مع الراكعين** وبحکم **ثم اتيتما مسجد جماعة فصليامعهم**۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنی پڑے گی۔ خواہ فرض نماز ہو یا تراویح ہو۔ یہ اصول شرعی عام ہے کیونکہ جماعت سے نماز پڑھنا فرض ہے۔ اسی طرح مشکوۃ میں تیسری حدیث ہے' اس میں بھی ایسا ہی واقعہ

ہے' جس میں آنحضرت ﷺ کا عام ارشاد ہے: "اذا جئت المسجد وكنت قد صليت فاقيمت الصلوة فصل مع الناس وان كنت قد صليت۔ یعنی "جب تم مسجد میں آؤ اور وہاں اقامت کے بعد نماز قائم ہے تو لوگوں کے ساتھ نماز جماعت سے پڑھو۔ اگرچہ تم اپنی نماز گھر میں پڑھ چکے ہو۔"

جب گھر میں نماز پڑھنے والے کو جماعت کے ساتھ دوبارہ پڑھنی پڑی تو جس نے فرض نماز ادا ہی نہیں کی تو اس کو بطور اولیٰ جماعت سے پڑھنا لازم ہے۔ نیز مشکوۃ میں حدیث ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مسئلہ دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں نماز پڑھ کر پھر مسجد میں آجائے اور جماعت کھڑی ہے تو وہ کیا کرے؟ میرے دل میں خلجان سا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہم نے یہ مسئلہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تھا تو فرمایا کہ جماعت سے نماز پڑھے۔ فذالك له سهم جمع۔ یہ اس کو جماعت سے نماز پڑھنے کا حصہ ہے۔ یہی میں کہتا ہوں کہ نماز تراویح کی جماعت قائم ہو تو فرض پڑھنے والا جماعت سے مل جائے۔ ذالك له سهم جمع۔

رہا یہ خدشہ کہ امام دوگانہ پر سلام پھیر دے تو چار رکعت والا کیا کرے؟ میں کہتا ہوں وہ اپنی نماز پوری کرے۔ اس نے جماعت کا ثواب اور فرض ادا کر لیا۔ اب آگے اس کا اختیار ہے کہ ان سے مل کر تراویح نماز ادا کرے یا علیحدہ پڑھے یا گھر جا کر نماز تراویح پڑھ لے' یہ سب درست ہے۔ ایک بار جماعت کا فریضہ ادا کرنا ضروری ہے' ورنہ تارک جماعت متصور ہو گا۔ اسی طرح اور دلائل بھی ہیں جن سے جماعت سے نماز پڑھنا واجب ثابت ہوتا ہے۔

حدیث میں ایک نماز کو دوبارہ پڑھنا منع آیا ہے۔ لیکن جس نے جماعت کا فریضہ باجماعت ادا نہ کیا ہو' اس کے لیے منع نہیں ہے۔ ہاں جو شخص جماعت سے پڑھ چکا ہو تو وہ دوبارہ نہ پڑھے' خواہ مسجد جماعت میں جائے یا اور جگہ' کیونکہ وہ حکم واركعوا مع الراكعين پر عمل کر چکا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نفل نماز کے پیچھے فرض نماز درست ہے۔ اور جس نے جماعت سے نماز نہ پڑھی ہو' اس کو جماعت سے نماز واجب ہے۔ هذا ما عندي والله

اعلم بالصواب۔

الراقم عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد ۲۲' شمارہ ۱۵ مورخہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۷۳ء

حنفیہ کی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تکرار جماعت میں مخالفت

مرعاۃ المفاتیح ج ۲' ص ۱۳۰ میں ہے' فقد روی ابن ابی شیبة فی مصنفه عن سلمة بن کھیل ان ابن مسعود دخل المسجد وقد صلوا فجمع بعلقمة ومسروق والاسود واسناده صحیح۔ یعنی "تحقیق ابن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے در آں حالیکہ لوگ نماز پڑھ چکے تھے تو انہوں نے علقمہ اور مسروق اور اسود کو ساتھ ملا کر نماز پڑھی۔"

اس امر سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں تکرار جماعت کے قائل و فاعل تھے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مسجد میں نماز پہلے باجماعت ہو چکی تھی لیکن مذہب حنفی اس کے خلاف ہے۔ وہ جماعت ثانیہ کو مسجد میں مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی کتاب بوادر النوادر جلد اول کے ص ۱۳۱ سے ۱۳۴ تک طویل بحث کی ہے اور آخر میں اس کا نتیجہ یہ لکھا ہے کہ "پس ترک ہی راجح ہے۔ یہ سب تحقیق ہے باعتبار حکم فی نفسہ کے۔"

مولانا تھانوی اکابر علماء حنفیہ دیوبند میں سے ہیں اور اس گروہ دیوبندیہ کے ان مشائخ سے ہیں جن کی مسلک طریقت میں بیعت کی جاتی ہے۔ مولانا نے جماعت ثانیہ کے بارہ میں کتب فقہ کے حوالوں سے مقلدانہ بحث کی ہے۔ کتاب و سنت کے دلائل شرعیہ کی رو سے کوئی بحث نہیں۔ صرف ایک حدیث طبرانی کبیر کی لکھی ہے' اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے گردونواح سے ہو کر آئے تو نماز کا ارادہ کیا۔ لوگوں کو دیکھا تو وہ جماعت سے نماز پڑھ چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر گئے' ان کو جمع کیا اور ان کو جماعت سے نماز پڑھائی۔ اس حدیث سے تکرار جماعت کے منع ہونے پر دلیل لینا متکلم فیہ ہے۔ تقریب میں ہے کہ معاویہ بن یحیٰی ابو مطیع واہی ہے۔ دار قطنی نے اس کو متروکین میں شمار کیا ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے کہ اس کی بعض روایتیں ایسی ہیں کہ ان میں اس کی

کسی نے متابعت نہیں کی۔ دوسرا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے مسجد میں کسی شخص کو نہ پایا تو گھروالوں کو جمع کر کے نماز جماعت سے پڑھی تو اس سے یہ ممانعت کیسے ثابت ہو گئی کہ اگر کئی آدمی مسجد میں پہلی جماعت کے بعد آگئے تو ان کو جماعت ثانیہ کرانی جائز نہیں ہے۔ اگر محض گھر میں جا کر نماز ثانیہ کرانا موجب کراہت ہے تو پھر مسجد میں اکیلے نماز پڑھنا بھی منع ہو گا اور سب کے لیے یہ سنت ہو گا کہ جو جماعت پہلی ہونے کے بعد وہ اکیلا بھی نہ پڑھے۔ ہر نمازی بعد میں آنے والا گھر جا کر جماعت سے نماز پڑھے۔ ولم یقل به احد۔

بخاری میں ہے کہ جاء انس بن مالک الی مسجد قد صلی فیه فاذن واقام وصلی جماعة۔ یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں آئے جس میں نماز پڑھی جا چکی تھی تو انہوں نے اذان و اقامت کہہ کر جماعت سے نماز پڑھی اور مولانا اشرف علی نے امام ابو حنیفہ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ اگر تین سے زیادہ آدمی ہوں تو مکروہ ہے واحد مکروہ نہیں ہے۔ (ص۔۳۳)

بہرحال مذہب حنفیہ حدیث اور تعامل صحابہ کے سراسر خلاف اور ان کے امام کے بھی خلاف ہے۔ مشکوۃ میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جماعت ہو چکی تھی تو ایک شخص آیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس پر صدقہ کرنے کا حکم کیا تو ایک صحابی نے اس سے مل کر جماعت سے نماز پڑھی۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاسلام لاہور جلد۔۲، شمارہ۔۳۴ مورخہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء

نماز باجماعت کا ترک کیسا ہے؟

سوال ایک شخص اہلحدیث کو موجودہ اوقات نماز پر اعتراض ہے کہ تاخیر سے نماز ہوتی ہے۔ بنابریں وہ گھر میں نماز پڑھ لیتا ہے۔ یہ شخص مقروض بھی ہے اور قرض ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی نماز اور نماز جنازہ کا کیا حکم ہے؟

سائل نور محمد

جواب تارک جماعت منافق ہے۔ ترغیب ترہیب جلد اول ص-۲۷۰ پر ہے عن ابی بن کعب قال صلی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوما الصبح فقال اشاھد فلان قالوا لا قال اشاھد فلان قالوا لا - قال ان ھاتین الصلوتین اثقل الصلوات علی المنافقین ولو تعلمون ما فیھما لا تیتموھما ولو حبوا علی الرکب - (رواہ احمد وابی داؤد وابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحما والحاکم)

اس حدیث سے مسجد میں امام کا نمازیوں سے حاضری لینا ثابت ہوا۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ تارک جماعت منافق ہے۔ ترغیب ص-۲۶۱ پر یہ حدیث ہے کہ "ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں اگر تم اپنے گھروں میں نمازیں (فرائض) پڑھو گے تو اپنے نبی کریم ﷺ کا باجماعت نماز پڑھنے کا طریقہ چھوڑ دو گے اور جب باجماعت نماز پڑھنا چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔"

ابوداؤد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں ولو ترکتم سنة نبیکم لکفرتم۔ "اگر تم اپنے نبی ﷺ کا (باجماعت نماز پڑھنے کا) طریقہ چھوڑ دو گے تو کافر ہو جاؤ گے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کہا کرتے تھے ولقد رایتنا وما یتخلف عنھا الا منافق معلوم النفاق۔ یعنی میں نے دیکھا (مسلمانوں کو) کہ جماعت سے پیچھے نہیں رہتا تھا مگر منافق، جس کا نفاق معلوم ہوتا۔

ولقد کان الرجل یوتی بہ یھادی بین الرجلین حتی یقام فی الصلوٰۃ۔ یعنی "یہ حکم سن کر سب لوگ آجاتے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص بیمار ہوتا تو اس شخص کو دو شخصوں کے درمیان کندھوں کے سہارے لا کر صف میں شامل کیا جاتا۔" جماعت سے نماز پڑھنا بحکم وارکعوا مع الراکعین فرض ہے۔ رکوع سے مراد نماز ہے کہ جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ جس طرح بعض احادیث میں لفظ "سجدہ" آیا ہے، تو اس سے مراد رکعت اور بعض مقامات پر نماز مراد ہے۔ اسی طرح قرآن میں بعض جگہ "سجود" سے نماز مراد ہے۔ پس "وارکعوا" سے نماز مراد ہے۔ تو راکعین کی معیت میں اس کو ادا کرنا فرض ہوا۔ کیونکہ الامر للوجوب۔ اس لیے تارک جماعت کو منافق اور کافر کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی نماز بغیر جماعت کے صحیح نہیں ہے۔ جیسے فاتحہ خلف الامام کے بغیر مقتدی کی نماز صحیح نہیں۔ اور نہ بغیر فاتحہ کے اکیلے کی نماز قبول اور صحیح ہے۔

فتح الباری پارہ-۳' ص-۲۱۰ میں مرفوع حدیث ہے: لا تقبل صلوٰۃ لا یقرا فیھا ام القرآن- ٹھیک اسی طرح جماعت کے متعلق یہ حدیث (جو ترغیب ص-۲۷۲ میں) ہے: عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سمع النداء بمقام لا یمنعہ من اتباعہ عذر قالوا وما العذر؟ قال خوف او مرض لم تقبل منہ الصلوٰۃ التی صلی- (رواہ ابوداؤد) یعنی "جو شخص اذان سن کر جماعت سے نماز نہ پڑھے' اس کی نماز قبول نہ ہو گی- مگر یہ کہ اس کو عذر (خطرہ) ہو جان یا مرض کا-"

دوسری حدیث ترغیب میں یوں ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من سمع النداء فلم یجبہ فلا صلوٰۃ لہ الا من عذر- (ابن ماجہ' ابن حبان' حاکم) یعنی "جس شخص نے اذان سنی پھر وہ جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی (انفرادی) نماز نہ ہو گی-"

ترغیب ص-۲۷۷ پر ایک حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ جوان مردوں کو حکم دوں کہ وہ ایندھن جمع کریں یعنی آگ کا ڈھیر تیار کر کے پھر میں قوم کے گھروں میں جاؤں اور ان کو آگ لگا کر جلا دوں-"

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ جماعت سے نماز پڑھنا فرض ہے- تفسیر ستاری پارہ اول' ص-۳۴۳ میں حضرت مولانا عبدالستار صاحب رحمہ اللہ آیت واركعوا مع الراكعين کے تحت رقم طراز ہیں کہ "اکثر علماء نے آیت ہذا سے نماز باجماعت کے فرض ہونے پر استدلال کیا ہے-"

میں کہتا ہوں ان میں ایک عارف حصاری ہے کہ میں جماعت سے نماز پڑھنا فرض جانتا ہوں- پس جو شخص بلا عذر شرعی گھر میں نماز پڑھتا ہے' اس کی نماز نہیں ہوتی- اور وہ جماعت کا تارک ہے اور تارک کافر اور منافق ہے- اس کو یہ ہدایت کریں کہ وہ توبہ کر کے جماعت میں شامل ہوا کرے-

رہا یہ عذر کہ اہلحدیث اول وقت پر نماز نہیں پڑھتے' پس یہ غلط ہے- ہم اہلحدیث تقریباً ہر نماز اول وقت پر پڑھتے ہیں- اس پر ------ یہ کہ نماز کے تین وقت ہیں- اول' اوسط اور آخر- اول وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے- جب تک اول اور اوسط وقتوں میں عام نماز پڑھ لے تو نمازی کا جماعت میں شامل ہونا فرض ہے- رہا قرض تو استطاعت رکھتے ہوئے قرض نہ دینا حقوق العباد میں صریح ظلم ہے- حضور ﷺ نے ایک مقروض شخص کا

جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا تھا جب تک ضمانت نہ ہو گئی' ادائیگی کی ضمانت کے بعد جنازہ پڑھا۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی جلد ۔۵۳' شمارہ ۔۷ مورخہ یکم ربیع الثانی سنہ ۔۱۳۹۳ھ

سوال حدیث میں ہے عورت کی نماز مسجد کی بجائے گھر میں افضل ہے۔ بیت اللہ شریف' مسجد نبوی اور بیت المقدس۔ ان تین مساجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت احادیث میں بہت بیان ہوئی ہے۔ اس لیے ہم اہل اسلام دور دراز سے سفر کر کے ان مساجد میں نمازیں پڑھ کر ثواب حاصل کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ فضیلت مردوں کے لیے خاص ہے یا عورتیں بھی اس کو حاصل کر سکتی ہیں۔ یعنی جب عورتیں مکہ مکرمہ جائیں تو ان کے لیے بیت اللہ شریف میں نماز پڑھنا بہتر ہے یا اپنی قیام گاہ میں؟ ثواب کس جگہ زیادہ ہو گا؟ اسی طرح عورتیں مدینہ منورہ جائیں تو ان کی نماز مسجد نبوی میں افضل ہے یا اپنی قیام گاہ میں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب بعون الوہاب الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين اما بعد فاقول وبالله التوفيق۔

خاص طور پر اس صورت مسئولہ کی وضاحت کسی دلیل شرعی میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے اصل مسئلہ (عورت کو مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا گھر میں) واضح کرنے سے یہ مسئلہ ظاہر ہو جائے گا' پہلے یہ جاننا چاہیے کہ نفس مسئلہ میں عورت کو مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ یہ اختلاف مابین العلماء ہے۔ بعض مطلق جائز رکھتے ہیں اور بعض نے جوان عورتوں کو منع کیا ہے اور عجائز یعنی بوڑھی عورتوں کو جائز رکھا ہے اور بعض نے مطلقاً" منع کیا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ فتنہ و فساد کا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عورتوں کو دین سیکھنے کے لیے جانے کی ضرورت تھی۔ اب وہ ضرورت نہیں رہی' اس لیے منع ہے۔ جب یہ مسئلہ مختلف فیہ ہوا تو اس میں حق معلوم کرنا ضروری ہے کہ مسائل مختلفہ میں حق ایک ہی بات ہوتی ہے۔ کیونکہ حق میں تعدد نہیں ہے۔ قرآن ناطق ہے فماذا بعد الحق الا الضلال

پس حق بات یہ ہے کہ عورتوں کو مسجد میں عشاء اور فجر کے وقت نماز پڑھنے کے لیے جانا جائز ہے۔

منتقی میں یہ حدیث وارد ہے: عن ابی هریرة ان النبی صلی الله علیه وسلم قال لا تمنعوا اماء الله مساجد الله ولیخرجن تفلات۔ (رواہ احمد و ابوداؤد) یعنی "نبی کریم ﷺ نے فرمایا لوگو! تم اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے منع نہ کرو۔ لیکن جب وہ نماز کے لیے مسجد کی طرف نکلیں تو خوشبو لگائے ہوئے نہ ہوں۔" دوسری حدیث منتقی میں یہ ہے: عن ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا استاذنکم نساؤکم باللیل الی المسجد فاذنوا لهن۔ (رواہ الجماعة الا ابن ماجة) یعنی "نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تمہاری عورتیں رات کو مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے اجازت طلب کریں تو تم ان کو اجازت دے دو۔" یہ حکم علی الاطلاق جوان بوڑھی ہر عورت کو شامل ہے کہ وہ خاوند سے اذن لے کر مسجد میں نماز پڑھنے جا سکتی ہے۔ تعامل عہد نبوی اور صحابہ میں یہی تھا کہ عشاء اور فجر میں عورتیں مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لیے جاتی تھیں۔

بخاری شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ سرور کائنات ﷺ نے عشاء کی نماز میں تاخیر فرمائی حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو آواز دے کر کہا نام النساء والصبیان کہ عورتوں اور بچوں کو نیند آرہی ہے' جلدی تشریف لائیے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔ اسی طرح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ عورتیں سلام پھیرتے ہی چلی جاتی تھیں اور رسول اللہ ﷺ اور دیگر لوگ جب تک اللہ چاہتا بیٹھے رہتے۔ پھر جب آپ کھڑے ہوتے تو سب لوگ بھی کھڑے ہو جاتے تھے۔

اور مسند احمد میں حدیث ہے: لا خیر فی جماعة النساء الا فی المسجد یعنی "مسجد کے علاوہ عورتوں کے لیے جمع ہونا ٹھیک نہیں ہے۔" حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے بلال رضی اللہ عنہ کو کہا نبی ﷺ نے فرمایا ہے: لا تمنعوا النساء حظوظهن من المساجد اذا استاذنکم۔ "کہ عورتوں کو مسجدوں میں ثواب کا حصہ حاصل کرنے سے مت روکو' جب وہ اذن طلب کریں تو منع نہ کرو۔" بلال رضی اللہ عنہ نے کہا قسم بخدا! ہم تو ان کو روکیں گے' نہ جانے دیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

اس کی طرف متوجہ ہوئے' اس کو سخت برا بھلا کہا اور سینہ میں مارا اور کہا میں تجھے رسول اللہ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں کہ عورتوں کو مسجد سے نہ روکو اور تو کہتا ہے ہم روکیں گے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد حضرت عبداللہ ؓ نے اپنے بیٹے سے آخر دم تک کلام نہ کی۔ اللہ اکبر صحابہ کرام میں اتباع رسول اللہ ﷺ کا جذبہ کتنا بلند تھا اور ان کی دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ جب اپنے بیٹے نے حدیث نبوی کا اپنی رائے سے مقابلہ کیا تو فوراً اس کا قطعی بائیکاٹ کر دیا۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ عورتوں کو خاوند کے اذن سے زینت اور خوشبو لگائے بغیر مسجد میں جانا جائز ہے۔ باقی رہا زمانہ ساز لوگوں کا یہ کہنا کہ اب فتنہ و فساد کا دور ہے' اس لیے عورتوں کو مسجد میں جانا منع ہے۔ تو یہ خیال بھی سراسر باطل ہے۔ عہد نبوی میں بھی ایسا فساد ہوا' تب بھی آپ نے عورتوں کو مسجد میں جانا منع نہ فرمایا۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ان امراۃ خرجت علی عہد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ترید الصلوۃ فتلقھا رجل فتجللھا فقضی حاجتہ منھا الحدیث۔ یعنی "عہد نبوی میں ایک عورت اپنے گھر سے مسجد میں نماز پڑھنے کو نکلی' راستے میں ایک شخص نے اسے پکڑ کر زنا بالجبر کیا اور بھاگ گیا۔" مفصل واقعہ ترمذی میں ہے۔ اس واقعہ کے باوجود آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع نہیں فرمایا تو اب مقلدین اور اہل الرائے حضرات کا حیلے بہانوں سے عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکنا باطل ہوا۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا گھر میں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے: عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تمنعوا نساءکم المساجد و بیوتھن خیرلھن۔ (رواہ ابوداؤد) یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی عورتوں کو مسجدوں میں نماز پڑھنے سے نہ روکو لیکن ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔" (مشکوۃ) دوسری حدیث منتقی میں عن ام سلمۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال خیر مساجد النساء قعر بیوتھن۔ (احمد) یعنی "نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں کی بہترین مسجدیں گھروں کا اندرونی حصہ ہے۔"

یہ دونوں احادیث اس مسئلہ پر بعبارۃ النص دلالت کرتی ہیں کہ بہ نسبت مسجد

کے عورتوں کو اپنے گھروں میں نمازیں پڑھنا بہتر اور افضل ہے۔ مشکوۃ میں بروایت ابوداؤد یہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آئی ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ المرأۃ فی بیتھا افضل من صلوتھا فی حجرتھا وصلوتھا فی مخدعھا افضل من صلوتھا فی بیتھا۔ (رواہ احمد) یعنی "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کی نماز اپنی کوٹھری میں افضل ہے' اس کے گھر سے اور اندر کی چور کوٹھری میں پڑھنی بہتر ہے اس کے گھر سے۔"

ان احادیث میں خیر اور افضل کا لفظ صاف ناطق ہے کہ عورت کو گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے اور گھر میں بھی جس قدر اندر کی کوٹھریوں میں نماز پڑھی جائے گی' جس سے ستر اور اخفا بڑھے گا' نماز میں فضیلت پائی جائے گی۔ یہ حکم عام ہے' خواہ مسجد حرام ہو یا بیت اللہ' مسجد نبوی ہو یا مسجد اقصیٰ۔

چنانچہ نیل الاوطار جلد ثالث' ص-۱۳۲ میں یہ حدیث وارد ہے: اخرج احمد والطبرانی من حدیث ام حمید الساعدیۃ انھا جاءت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یارسول اللہ انی احب الصلوۃ منک فقال صلی اللہ علیہ وسلم قد علمت وصلوتک فی بیتک خیر لک من صلوتک فی حجرتک وصلوتک فی دارک خیر لک من صلوتک فی مسجد قومک وصلوتک فی مسجد قومک خیر لک من صلوتک فی مسجد الجماعۃ قال الحافظ و اسنادہ حسن۔ یعنی "امام احمد اور طبرانی نے ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھا کروں۔ آپ نے فرمایا تو جانتی ہے کہ تیری نماز کوٹھری میں بہتر ہے' تیری اس نماز سے جو تو حجرے میں پڑھے اور حجرہ کی نماز بہتر ہے اس نماز سے جو گھر کے آنگن میں ادا کی جائے اور تیری آنگن کی نماز بہتر ہے اس نماز سے جو محلہ کی مسجد میں پڑھے اور محلہ کی مسجد میں تیری نماز بہتر ہے اس نماز سے جو جامع مسجد میں ہے۔" حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب جلد-۷' ص-۱۸۷ میں یہ روایت ذکر کی ہے اور اس کے آخیر میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: وصلوتک فی مسجد قومک خیر لک من صلوتک فی مسجدی قال فامرت فبنی لھا مسجدا فی اقصی شیئی من بیتھا الظلمۃ فکانت تصلی فی

فیہ حتی لقیت اللّٰہ عزوجل- یعنی "تیری وہ نماز جو محلہ کی مسجد میں پڑھی جاتی ہے' اس نماز سے بہتر ہے جو میری مسجد میں پڑھی جائے- راوی نے بیان کیا کہ حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد سن کر ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا کہ اس کے لیے گھر کے انتہائی اندرونی گوشہ میں (جہاں بہت اندھیرا تھا) مسجد بنائی جائے- چنانچہ اسی مسجد میں وہ آخری دم تک نماز پڑھتی رہی- حتیٰ کہ وہ فوت ہو کر اللہ عزوجل سے ملاقاتی ہوئی-"

امام شوکانی اس مسئلہ پر بحث کے بعد فرماتے ہیں صلٰوتھن علی کل حال فی بیوتھن افضل من صلٰوتھن فی المساجد- یعنی "ان نصوص سے ثابت ہوا کہ ہر حال میں عورتوں کی وہ نماز جو گھروں میں پڑھی جاتی ہے' اس نماز سے افضل ہے جو مسجدوں میں پڑھی جاتی ہے-"

اب اس وضاحت کے بعد سائل کی صورت مسئولہ کا حکم بھی خوب ظاہر ہو گیا کہ مسجد حرام' مسجد نبوی' مسجد اقصیٰ' مسجد جامع' مسجد محلہ' جن میں مردوں کے لیے (بہ نسبت گھروں میں نماز پڑھنے کے کئی درجہ فضیلت ہے) عورتوں کے لیے گھر میں نماز پڑھنا ان تمام مسجدوں میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور اس کی علت یہ ہے کہ عورت کے لیے ستر اور مردوں سے اخفاء ضروری ہے' وہ جس قدر بھی پایا جائے گا' نماز میں فضیلت پائی جائے گی-

باقی رہا حج بیت اللہ اور زیارت مسجد نبوی کا وقتی مسئلہ' سو اس میں یہ سمجھنا چاہیے کہ حج و عمرہ میں طواف کرنا ضروری ہے تو لامحالہ بیت اللہ اور حرم میں جانا پڑے گا تو حج اور عمرہ کرنے والی عورت کو مسجد میں جانا چاہیے- اسی طرح جو عورت مسجد نبوی میں گئی اور اس کا ارادہ روضہ نبوی کی زیارت کا بھی ہے تو وہاں پہنچنے پر اس کو مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا درجہ حاصل کرنا چاہیے- یہ ایک وقتی بات ہے- ہاں جب مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں مقیم ہو جائے تو اس کی قیام گاہ ان شہروں میں کسی جگہ مقرر ہو گئی' پھر اس کو اپنی پردہ دار قیام گاہ ہی میں نماز پڑھنا افضل ہے- ہاں کسی وقت ان مسجدوں کا ثواب لینے کے لیے جائے تو یہ جائز ہے- مگر افضل اپنے گھر اور قیام گاہ ہی میں ہے- آنحضرت ﷺ نے ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے ساتھ جماعت سے

مسجد نبوی میں نماز پڑھنے سے افضل اس نماز کو بتایا جو گھر کے کسی گوشہ میں پڑھی جاتی ہے۔ جس پر ام حمید رضی اللہ عنہا نے عمل کیا اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنی ترک کر دی۔

یہ میری ذاتی تحقیق ہے باقی اگر کوئی عالم اس کے خلاف مسلک رکھ کر کوئی ثبوت پیش کر دے گا تو بندہ رجوع کر لے گا ورنہ مسلک یہی صحیح ہے۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث جلد ۱۷، شمارہ ۲۲ سنہ ۱۹۶۵ء

سفر میں یا حضر میں جنگل یا آبادی میں اکیلا جماعت کرا سکتا ہے؟

سوال خالد، زید اور بکر تینوں کی اس مسئلہ میں نزاع ہے کہ اکیلا شخص جماعت کرا سکتا ہے یا نہیں؟ خالد مطلقاً" انکار کرتا ہے کہ اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا۔ کیونکہ اس کا کوئی صریح ثبوت نہیں۔ اکیلا ہونا، منفرد ہونا خود جماعت کے منافی ہے۔

زید کہتا ہے کہ صحرا یعنی جنگل میں اکیلا شخص اذان و اقامت کہہ کر جماعت کی نیت سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کے پیچھے فرشتے کھڑے ہو جائیں گے۔ آبادی یعنی شہر یا گاؤں میں جماعت کی نیت سے نماز نہیں پڑھ سکتا، کیونکہ اس پر کوئی دلیل نہیں اور نہ قرون ثلاثہ میں اس پر عمل ثابت ہوا ہے۔

صحرا میں بصورت جماعت اذان کہہ کر نماز پڑھنے کے ثبوت میں یہ حدیث ہے:

نسائی باب الاذان لمن يصلي وحده میں ہے عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يعجب ربک من راعي غنم في راس شظية الجبل يؤذن بالصلوة ويصلي فيقول الله عزوجل انظروا الى عبدي هذا يؤذن ويقيم الصلوة يخاف مني قد غفرت لعبدي وادخلته الجنة۔ یعنی " عقبہ بن عامر ﷺ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ بکریوں کے چرواہے پر تعجب کرتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر گذر اوقات کرتا ہے۔ اذان دیتا ہے، نماز پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، دیکھو میرا بندہ اذان دیتا ہے، نماز کی اقامت کہتا ہے، مجھ

سے ڈرتا ہے۔ میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا اور اس کو جنت میں داخل کر دیا۔"

اس حدیث میں اذان و اقامت کہہ کر نماز پڑھنے کا ثبوت ہوا۔

نیل الاوطار باب وجوب الاذان وفضیلته میں ایک روایت یہ ہے: لمخرج عبدالرزاق والمقدسی والنسائی فی المواعظ من سنته عن سلمان رفعه اذا کان الرجل فی ارض فی ای قفر فتوضا فان لم یجد الماء تیمم ثم ینادی بالصلوة ثم یقیمها ویصلیها الا ام من جنود الله صفا ورواه عبدالرزاق وابن ابی شیبة عن معتمر التیمی عن ابیه وروی نحوه البیهقی والطبرانی فی الکبیر - یعنی "عبدالرزاق اور مقدسی اور نسائی نے سلمان سے مرفوع روایت کیا ہے کہ جب کوئی شخص جنگل میں ہو۔ پس وضو کرے' اگر پانی نہ ملے تو تیمم کرے' پھر اذان دے پھر اقامت کہے اور نماز پڑھے تو اس نے غائبانہ لشکروں کی امامت کی جو صف باندھ کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اور اس حدیث کو عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ معتمر تیمی عن ابیہ سے روایت کیا ہے اور اسی کے قریب بیہقی نے اور طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے۔"

اس حدیث سے بطور جماعت اکیلے کا نماز پڑھنا بالصراحت ثابت ہوا۔

خالد نے اس استدلال پر یوں نقض کیا ہے کہ اس سے جماعت اصطلاحی' عرفی ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اس حدیث سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اکیلے کو اذان دینا اور اقامت کہنا سفر میں مشروع ہے اور اس سے غرض تشبہ بالمسلمین فی جماعتہم ہے۔ اور ملائکہ اور جن کے لیے اعلام ہے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ (اذان تو اس وقت کا اعلان ہوا' اقامت کیا ہوئی۔ یہ صاف دلیل ہے کہ یہ نماز باجماعت ہے اور عبدالرزاق وغیرہ کی صحت اس کی مؤید ہے) اور جنگل کی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید پر شاہد بنانا ہے۔ جیسے ابوسعید خدری ﷜ سے مروی ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی صعصعہ ﷜ سے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تجھے جنگل میں رہنا اور بکریاں چرانا پسند ہے۔ جب تو بکریاں چراتا یا جنگل میں ہو تو نماز کے لیے اذان دے' کیونکہ جہاں تک مؤذن کی آواز پہنچتی ہے' جن اور آدمی یا کوئی اور چیز آواز سنتی ہے تو وہ قیامت کے دن اس پر گواہ ہو گی۔ پھر ابوسعید ﷜ نے کہا کہ یہ مسئلہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے۔

اس لیے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ والحدیث یدل علی شرعیۃ الاذان للمنفرد فیکون مخالفا لقول من قال ان شرعیۃ الاذان تختص بالجماعۃ۔ یعنی "یہ حدیث اکیلے کے لیے اذان مشروع ہونے کی دلیل ہے۔ پس اس سے اس شخص کی تردید ہو گی جو کہتا ہے کہ اذان جماعت کے ساتھ خاص ہے۔"

عون المعبود باب الاذان فی السفر میں ہے: وفی الحدیث دلیل علی استحباب الاذان والاقامۃ للمنفرد۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ اذان اور اقامت اکیلے پر مستحب ہے۔

پس اس سے منفرد کے لیے سفر میں اذان دینے کا مسئلہ ثابت ہوا۔ اور جماعت کے ساتھ اذان کی خصوصیت نہ رہی۔ باقی جماعت کرنا کرانا اکیلے شخص کا ثابت نہیں ہوا۔ ہاں عبدالرزاق کے طریق سے کچھ ثبوت نکلتا ہے۔ مگر یہ غیر معتبر(ا) طبقہ کی کتابیں ہیں۔ جب تک اس کی اسناد سامنے نہ ہو اور اس کی تنقید نہ کی جائے قابل اعتماد نہیں۔

(ا) صرف عبدالرزاق کی روایت نہیں بلکہ مقدسی وغیرہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور مقدسی نے صحت کی شرط کی ہے۔ پھر یہ مسئلہ تو نسائی کی حدیث سے بھی ثابت ہے۔ اس حدیث سے تائید ہو گی اور تائید میں ضعیف حدیث بھی معتبر ہے۔

پھر کہتا ہے کہ جنگل ہو خواہ آبادی ہو منفرد جس کے ساتھ دوسرا شخص مل کر نماز پڑھنے والا نہ ہو جماعت کی نیت سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ہاں دوسرے شخص کو ملانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن جب نہ ملے تو معذوری ہے' نماز پڑھے۔ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی کوئی غائبانہ مخلوق کھڑی ہو جائے گی۔ جیسے عبدالرزاق وغیرہ کی روایت صریح اس امر پر دال ہے۔ چنانچہ عون المعبود باب الاذان فی السفر میں ہے: اذا اذن واقام تصلی الملائکۃ معہ ویحصل لہ ثواب الجماعۃ۔ یعنی "جب اذان دے اور اقامت کہے تو فرشتے اس کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اس کو جماعت کا ثواب مل جاتا ہے۔

جہاں اکثر آبادی ہندوؤں کی ہے۔ مثلاً ریاست بیکانیر و ریاست پٹیالہ وغیرہ میں وہاں بعض گاؤں میں صرف ایک آدھ گھر مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ ایسے موضع میں صرف ایک شخص ہی اذان و اقامت کہہ کر نماز باجماعت کی نیت سے پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ بہت

لوگ اس طرح پڑھتے ہیں' کسی نے منع نہیں کیا۔ پس اس پر اجماع ہے۔

خالد نے کہا کہ بکر کا مذہب زید سے بھی عجیب ہے جو بالکل غیر ثابت اور بے دلیل ہے اور اہلحدیث میں سے بعض لوگوں نے تو ایسا معمول بنایا ہے کہ مسجد میں جو شخص آتا ہے' وہی اقامت کہہ کر اپنی جماعت شروع کر دیتا ہے۔ خواہ اس کے ساتھ دوسرا آدمی ہو یا نہ ہو۔ اول تو جماعت ثانیہ میں نزاع تھا' دوم مسبوق کی امامت کا نزاع ہوا تھا۔ اب سوم منفرد کی امامت کا نزاع ہے۔ کھینچ تان کر اس کو بھی حدیث کا مسئلہ قرار دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس پر کوئی نص موجود نہیں ہے۔ اور نہ سلف صالحین کا یہ معمول تھا۔ اگر معمول ہوتا تو ضرور کتب حدیث سے منقول ہوتا۔

عون المعبود میں سے جو عبارت "يحصل له ثواب الجماعة" نقل کی ہے' اس میں اس سے پہلے لفظ "قیل" ہے جو تمریض کے لیے مستعمل ہے۔ اس سے اس مذہب کی تضعیف کر دی گئی ہے۔ نیز اس سے بھی جماعت اصطلاحی عرفی ثابت نہیں ہوتی بلکہ جماعت کا ثواب ملنا ثابت ہوتا ہے۔ وہ بھی جنگل میں ایسا کرنے والے کے لیے نہ کہ ہر ایک کے لیے' سو ثواب ملنا جماعت کا اور چیز ہے اور جماعت کا وجود اور چیز ہے' فتفکر۔

بکر نے کہا کہ نزاع تو آج ہر مسئلہ میں پڑ گیا ہے۔ ہمیں تو ظاہر حدیث اور ہر دلیل شرعی پر عمل کرنا چاہیے۔ موجودہ اختلاف کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ حدیث سے منفرد کے لیے اذان و اقامت و جماعت کے طور پر نماز پڑھنا ثابت ہو گیا ہے۔ چنانچہ روایت بیان ہو چکی ہے' پس اس کا ضعف ثابت کرنا آپ کے ذمہ ہے۔

باقی رہا آبادی و غیر آبادی کا سوال' سو یہ کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ جنگل میں بھی منفرد اس وقت اکیلا جماعت کی صورت میں اذان و اقامت کہہ کر نماز پڑھے گا' جب اس کو کوئی دوسرا نہیں ملے گا۔ شہر یا گاؤں میں بھی جہاں کوئی دوسرا نہیں ہوتا' اس کا حکم بھی وہی ہے۔ دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ باقی رہا سلف کا عمل' اگر ان سے منقول نہ ہو تو بھی کچھ حرج نہیں۔ جبکہ حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہو چکا ہے۔ مثلاً جنازہ علی الغائب حدیث سے ثابت ہے لیکن سلف کے عمل سے کچھ ثابت نہیں۔ مگر تاہم تمام اہل حدیث کا اس پر عمل ہے اور کسی نے انکار نہیں کیا اور مسئلہ ہذا میں تو

سلف کا عمل ثابت بھی ہے۔

چنانچہ بخاری باب "فضل الجماعۃ" میں ہے: وجاء انس بن مالک الی مسجد قد صلی فیہ فاذن واقام وصلی جماعۃ۔ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں آئے' جس میں جماعت ہو چکی تھی۔ پس اذان دی اور اقامت کہی اور جماعت سے نماز پڑھی۔

اور فتح الباری میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیس جوانوں کے ساتھ نماز پڑھنا نقل کیا گیا ہے' وہ واقعہ اس کے علاوہ ہے۔ کیونکہ اس میں تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اذان و اقامت کہنا مذکور ہے۔ اور اس میں ہے: فامر رجلا فاذن واقام۔ یعنی "ایک شخص کو حکم دیا پس اذان و اقامت کہی۔" سو یہ تعدد واقعہ پر دال ہے۔

یہ تعدد واقعہ کی دلیل نہیں کیونکہ حکم دینے والے کی طرف بھی نفس فعل کی نسبت جائز ہے۔ جیسے کہتے ہیں فلاں بادشاہ فلاں بادشاہ سے لڑتا ہے حالانکہ لڑنے والی فوج ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بخاری کی معلق روایت کو اسی لفظ "فامر رجلا" کے ساتھ موصول بیان کیا ہے گویا بخاری کے الفاظ اسی کا ملخص ہے۔

زید نے کہا جو چیز گاہے بگاہے ہو' اور اس پر عام عمل نہ دیکھا گیا ہو تو اس کی اور بات ہے لیکن جو پانچ وقت دن رات کام ہوتا ہو' اس کا نقل ہونا ضروری ہے ورنہ بات مخدوش ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جو روایت بخاری سے نقل کی گئی ہے' اس میں بھی منفرد کی جماعت کا ذکر نہیں بلکہ دیگر روایات جو موصولاً" فتح الباری میں مذکور ہیں' اس میں دوسرے شخصوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ پس استدلال باطل ہوا۔ اب ہم اپنے وہ دلائل بیان کرتے ہیں جن سے اکیلے کی نماز کی نفی نکلتی ہے لیکن آبادی میں نہ کہ جنگل میں کیونکہ وہ ثابت شدہ امر ہے۔

(۱) امام بخاری نے باب باندھا ہے "باب اثنان فما فوقھما جماعۃ" یعنی دو یا دو سے زیادہ جماعت ہے۔ اس کے تحت فتح الباری میں ہے: "ھذہ الترجمۃ لفظ حدیث" یہ ترجمہ حدیث کے لفظ کا ہے۔ پھر حدیث لکھ کر ظاہر کیا ہے کہ دو اور دو سے اوپر جماعت ہے۔ (اخرج ابن ماجہ)

پھر صاحب فتح الباری نے یہ حدیث لکھی ہے: انہ صلی اللہ علیہ وسلم رای

رجلا وحدہ فقال الا رجل یتصدق علٰی هذا فیصلی معه فقام رجل فصلی معه فقال هذان جماعة۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ فرمایا کوئی شخص نہیں جو اس پر صدقہ کرے۔ پس اس کے ساتھ نماز پڑھے۔ ایک شخص کھڑا ہوا' پس اس نے اس کے ساتھ نماز پڑھی' پھر فرمایا یہ دو جماعت ہیں۔"

اس حدیث سے صراحتاً ثابت ہو گیا کہ دو شخص جماعت ہیں۔ اس سے کم جماعت نہیں' وہ منفرد کہلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دو ہوں تو امام کے پیچھے کھڑے ہوں گے کیونکہ وہ جماعت ہیں اور اگر اکیلا ہو تو وہ پیچھے کھڑا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جماعت نہیں ہے بلکہ امام کے ساتھ کھڑا ہو گا تاکہ جماعت کا مصداق ہو۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا' ورنہ آپ یہ نہ فرماتے الا رجل یتصدق علی هذا۔ کوئی شخص نہیں جو اس پر صدقہ کرے۔ صدقہ اسی پر ہوتا ہے جو حاجت مند ہو۔ اگر اکیلا جماعت کرا سکتا ہے تو وہ دوسرے کا محتاج نہ رہا۔ پھر اس پر صدقہ کیسا؟ خاص کر جب اس کے پیچھے نوری فرشتے کھڑے ہوں۔ (علی زعمکم) تو پھر صدقہ کی ضرورت کیا ہوئی' فتذکر۔

حافظ ابن حجر نے اس بات کے تحت لکھا ہے: واستدل به علی ان اقل الجماعة امام ومامومٌ اعم من ان یکون المامومُ رجلا او صبیا او امراۃ۔ یعنی "اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ اقل جماعت دو ہیں اور مقتدی خواہ مرد ہو یا لڑکا ہو یا عورت ہو۔"

امام بخاری نے باب مذکور کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے: عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال اذا حضرت الصلوة فاذنا واقیما ثم لیؤمکما اکبرکما۔ یعنی "نبی ﷺ نے فرمایا جب نماز حاضر ہو تو دونوں اذان دو اور اقامت کہو اور امامت تم سے بڑا کرے۔"

اس حدیث سے بھی امام بخاری نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقل درجہ جماعت کا دو ہیں۔ پس وہ لوگ جو امام بخاری کے حکم کو حجت شرعی سمجھتے ہیں' ان کو لازم ہے کہ یہ مسئلہ تسلیم کریں کہ جماعت کم از کم دو شخصوں کی منعقد ہوتی ہے اور وہ مسجدوں میں

جو لگاتار منفردوں کی جماعتیں ہوتی ہیں بند کر دیں کیونکہ یہ تعامل ثابت نہیں ہے۔

(۴) صلوۃ الرجل مع الرجل ازکی من صلوته وحده وصلوۃ الرجل مع الرجلین ازکی من صلوته مع الرجل وما کانوا اکثر فهو احب الی الله عزوجل۔ یعنی "ایک مرد کی نماز دوسرے مرد کے ساتھ اکیلے کی نماز سے بہت پاکیزہ ہے اور ایک مرد کی دو مردوں کے ساتھ۔ ایک کی ایک کے ساتھ سے بہت پاکیزہ ہے اور جتنے زیادہ ہوں اتنا ہی اللہ عزوجل کو زیادہ محبوب ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ اقل درجہ جماعت کا صلوۃ الرجل مع الرجل ہے۔ اس سے کم درجہ جماعت نہیں۔ سبل السلام میں ہے: وفیه دلالة علی ان اقل صلوة الجماعة امام ومأموم۔

(۵) فتح الباری جزء ثالث ص۔۳۴ میں حدیث ہے: صلوۃ الرجل فی الجماعة تضعف علی صلوته فی بیته وفی سوقه خمس وعشرین ضعفا۔ یعنی "آدمی کی نماز گھر کی نماز اور بازار کی نماز سے پچیس گنا زیادہ ہے۔"

(یہ حدیث متن بخاری کی ہے۔ اگرچہ شرح کی طرف بھی اس کی نسبت ہو سکتی ہے کیونکہ شرح حامل متن ہوتی ہے مگر بخاری کی شان بڑی ہے اور شرح کی طرف نسبت کرنے سے پتہ نہیں چلتا کہ متن میں ہے۔ اس لیے بجائے شرح کے متن کی طرف نسبت کرنا بہتر تھا)

اس کے تحت لکھا ہے: واستدل بها علی ان اقل الجماعة امام ومأموم۔ یعنی اس حدیث کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے کہ اقل جماعت دو ہیں' امام اور مقتدی۔"

(اس سے مراد حافظ ابن حجر کی یہ حدیث نہیں کیونکہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اقل جماعت دو ہیں بلکہ حافظ ابن حجر کی مراد نمبر۔۴ کی حدیث ہے یعنی صلوۃ الرجل مع الرجل ازکی الحدیث۔)

نیز ص۔۱۳۴ میں لکھا ہے: ان اقل الجماعة امام ومأموم فلولا الامام ماسمی المأموم مأموما وکذا عکسه۔ یعنی "اقل جماعت امام اور مقتدی ہے۔ اگر امام نہ ہو تو مقتدی کو مقتدی نہیں کہہ سکتے اور اگر مقتدی نہ ہو تو امام کو امام نہیں کہہ سکتے۔

ص۔۱۳۴ میں ہے: روی ابن ابی شیبة باسناد صحیح عن ابراهیم النخعی

قال اذا صلی الرجل مع الرجل فھما جماعۃ۔ یعنی "ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر نماز پڑھے پس وہ دونوں جماعت ہیں۔"

عون المعبود ص۔۲۲۵ میں ہے۔ حدیث "یتصدق علی ھذا" پر لکھا ہے: قال المظھر سماہ صدقۃ کانہ یتصدق علیہ بثواب ستا و عشرین درجۃ اذلو صلی منفرد الم یحصل لہ الاثواب صلوۃ واحدۃ۔ یعنی "مظہر فرماتے ہیں ساتھ نماز پڑھنے کو صدقہ اس لیے کہا اس پر چھبیس (۲۶) نمازوں کا ثواب صدقہ کرتا ہے کیونکہ اگر اکیلا پڑھتا تو اس کو ایک ہی نماز کا ثواب ملتا۔"

اس تصریح سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ جماعت کا ثواب جو چھبیس درجہ ہے' یہ اسی شخص کے لیے ہے جو دوسرے آدمی سے مل کر جماعت سے نماز پڑھے' اکیلے کے لیے نہیں۔ اگر اکیلا جماعت کرا سکتا تو پھر دوسرے کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ دو کو جماعت قرار دینے کی ضرورت تھی کیونکہ پھر سب ہی جماعت ہوتے۔

(۶) عن ابی الدرداء قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من ثلاثۃ فی قریۃ ولا بد ولا تقام فیھم الصلوۃ الا قد استحوذ علیھم الشیطان فعلیک بالجماعۃ۔ یعنی "ابوالدرداء ؓ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے نہیں تین آدمیوں سے بستی اور جنگل میں جو نہ قائم کی جاتی ہو ان میں نماز مگر غالب ہوتا ہے ان پر شیطان۔ پس لازم پکڑو تم جماعت کو۔"

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اکیلا جماعت نہیں ورنہ اکیلے پر بھی یہ وعید ہوتی۔

(۷) امام نسائی نے کتاب الامامۃ والجماعۃ میں تین باب یوں باندھے ہیں۔ (۱) الجماعۃ اذا کانوا ثلاثۃ (۲) الجماعۃ اذا کانوا ثلاثۃ رجل وصبی وامراۃ (۳) الجماعۃ اذا کانوا اثنین۔ مگر یہ باب نہیں باندھا الجماعۃ اذا کانا منفردا۔ معلوم ہوا کہ منفرد کی جماعت نہیں۔

(۸) بخاری باب فضل الجماعت میں ہے: وکان الاسود اذا فاتتہ الجماعۃ ذھب الی مسجد آخر۔ یعنی "اسود سے جب جماعت کے ساتھ نماز فوت ہو جاتی تو دوسری

مسجد کی طرف چلے جاتے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اکیلا مسجد میں جماعت نہیں کرا سکتا۔ اگر ایک مسجد میں نماز نہ مل سکے تو دوسری مسجد میں چلا جائے کہ شاید وہاں مل جائے' اکیلا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی بنیاد نہ رکھے۔

(۹) وجاء انس بن مالک الی مسجد قد صلی فیہ فاذن واقام وصلی جماعۃ (بخاری) اس کے تحت فتح الباری میں اس کو موصولا" بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: فجاء انس فی نحو عشرین من فتیانہ۔ یعنی "انس قریباً اپنے بیس جوانوں میں آئے۔"

اور ایک طریق میں ہے ثم صلی بالصحابۃ۔ پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ پس یہ کہنا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اکیلے جماعت کرائی' صریح غلطی ہے۔ صلی جماعۃ کا لفظ ہی دلالت کر رہا ہے کہ اکیلے نماز نہیں پڑھی جماعت سے پڑھی۔

(۱۰) عن عبد الرحمن بن ابی بکرۃ عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقبل من نواحی المدینۃ یرید الصلوۃ فوجد الناس قد صلوا فمال الی منزلہ فجمع اہلہ فصلی بھم رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط وقال الہیثمی فی مجمع الزوائد رجالہ ثقات۔ (منقول از تحفہ الاحوذی) یعنی "عبد الرحمن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے باہر سے آئے' نماز کا ارادہ کرتے تھے۔ پس لوگوں کو پایا کہ وہ نماز پڑھ چکے تھے۔ پس اپنے گھر کو لوٹے' اپنے اہل و عیال کو جمع کر کے نماز پڑھی۔ اس کو طبرانی نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا ہے اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔"

یہ حدیث اس امر پر نص ہے کہ آبادی میں اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا۔ مسجد میں کوئی شخص نہ ملے تو اپنے گھر والوں کو ملا کر جماعت سے نماز پڑھے۔ تین آمین والی حدیث سے تو یہ حدیث زیادہ معتبر ہے۔ اس لیے تین آمین کے قائلین کو اپنی عادت مسجد میں اکیلے جماعت کرانے کی چھوڑ دینی چاہیے۔ مسجد میں کسی نمازی کو اپنے ہمراہ ملائیں یا اپنے گھر چلے جائیں۔ وہاں بیوی کو ساتھ ملا کر نماز پڑھیں۔ یہ نہیں کہ جو اکیلا آتا جائے' وہ اپنی جماعت کر کے کھڑا ہوتا جائے اور سمجھے کہ میرے پیچھے فرشتے کھڑے

ہیں۔ شاید ان کے خیال میں فرشتے مسجد کے دروازے پر انہی کے انتظار میں کھڑے رہتے ہوں گے کہ جب یہ اکیلے جماعت کے لیے آئیں اور ہم ان سے مل کر نماز پڑھیں۔ افسوس ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

تلک عشرۃ کاملۃ

یہ دس دلائل ہیں جن سے ثابت ہوا کہ آبادی میں اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا۔

خالد نے کہا کہ یہ سب دلائل میرے بھی موید ہیں۔ میرا بھی ان پر صاد ہے لیکن چونکہ آپ (زید) جنگل میں منفرد کی جماعت کے قائل ہیں۔ اس لیے آپ پر بھی یہ حجت ہیں۔ میں مزید ایک دلیل پیش کرتا ہوں جس سے خاص میرا مدعا ثابت ہوتا ہے۔

(اے)

(اے) اس حدیث میں تو صرف جنگل کی نماز کی اس نماز پر فضیلت بتلائی جو لوگوں کے ساتھ جماعت میں پڑھی جاتی ہے۔ خواہ جنگل کی نماز اذان جماعت کی صورت میں پڑھی جائے یا ویسے اس سے جنگل میں اذان جماعت کی صورت میں پڑھنے کی نفی نہیں ہوتی۔ پس اس کو اپنے خاص مدعاء کی دلیل کہنا ٹھیک نہیں۔

ابوداؤد میں ہے: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الصلوة فی جماعة تعدل خمسا وعشرین صلوة فاذا صلها فی فلاة فاتم رکوعها وسجودها بلغت خمسین صلوة قال ابوداؤد قال عبدالواحد بن زیاد فی هذا الحدیث صلوة الرجل فی الفلاة تضاعف علی صلوته فی الجماعة۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز باجماعت پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ جب جنگل میں پڑھے' پس رکوع اور سجدہ پورا کرے تو وہ پچاس نمازوں کو پہنچ جاتی ہے۔ ابوداؤد نے کہا کہ عبدالواحد بن زیاد نے اس حدیث میں یوں کہا کہ آدمی کی نماز جنگل میں اس نماز پر بڑھ جاتی ہے جو اس نے جماعت میں پڑھی ہے۔

والحکمة فی اختصاص صلوة الفلاة بهذا المزیة ان المصلی فیها یکون فی الغالب مسافر او السفر ظنه المشقة فاذا صلاها المسافر مع حصول المشقة تضاعف الی ذالک المقدار (انتهی بقدر الحاجة) یعنی "جنگل کی نماز کی اتنی فضیلت

اس لیے ہے کہ جنگل میں انسان اکثر مسافر ہوتا ہے اور سفر اکثر مشقت کا باعث ہے۔ پس باوجود مشقت کے مسافر اس کو پڑھے تو وہ اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔"

دیکھئے اس حدیث سے صاف ثابت ہوا کہ مسافر جنگل میں اکیلا نماز پڑھے تو اس کو پچاس نمازوں کا ثواب ملتا ہے جو جماعت کی نماز سے دگنا درجہ رکھتی ہے۔ پس اس کو جماعت کی ضرورت نہ رہی۔ جب جنگل میں اکیلا نماز نہ کرا سکا تو آبادی میں بطریق اولیٰ نہ کرائے گا۔

سوال تینوں شخصوں کا نزاع درپیش ہے' اس مسئلہ کا آپ محدثانہ تصفیہ فرمائیں۔

(عبدالقادر گنگوی حصاری)

جواب یہ بات تو تینوں فریق کے نزدیک مسلم ہے اور فی الواقع صحیح بھی ہے کہ اکیلے کی نماز نہیں بلکہ جماعت کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ دوسرا ساتھ ہو اور ابراہیم علیہ السلام کو جو امت کہا گیا ہے تو وہ صرف شرف کی بناء پر کہا گیا ہے یعنی وہ اکیلے اتنی شان رکھتے ہیں۔ جیسے ایک جماعت کی شان ہوتی ہے۔ یہاں نماز کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہاں جماعت سے مراد امام مقتدی ہے اور اکیلے کا امام مقتدی ہونا اس کا کچھ مطلب نہیں۔ پس کم سے کم دو ہونے ضروری ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ دوسرا کون ہو' انسان ہو یا جن یا فرشتہ ہو تو اس میں بھی تینوں فریق متفق ہیں کہ یہ جماعت ہے اور واقعہ میں بھی یہ صحیح ہے اور جماعت کا مفہوم بھی اس میں وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

اب نزاع صرف جن اور فرشتہ میں رہی۔ خالد کا خیال ہے کہ جن فرشتہ سے جماعت نہیں بنتی۔ زید کہتا ہے کہ جنگل میں بن جاتی ہے' گھر میں نہیں بنتی۔ بکر کہتا ہے کہ جب جنگل میں بن جاتی ہے تو گھر میں بھی بن جاتی ہے۔ یہ تینوں فریق کے نزاع کی تنقیح ہے۔

بکر کی دلیل چونکہ محض قیاس ہے۔ اس لیے قابل اعتناء نہیں۔ خاص کر جب قیاس بے محل ہو' کیونکہ یہ امر واضح ہے کہ فرشتوں کا یا جنوں کا ہمارے ساتھ نماز پڑھنا یہ غیبی شے ہے۔ جو خرق عادت کی قسم سے ہے اور ایسی اشیاء اپنے محل پر بند

رہتی ہیں۔ ان میں قیاس جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "درود پہنچانے کے لیے فرشتے مقرر ہیں' جہاں کوئی مجھ پر درود پڑھے فرشتے پہنچا دیتے ہیں۔" اس سے اہل بدعت استدلال کرتے ہیں کہ جب فرشتے مقرر ہیں تو وہ ہماری درخواستیں دعاء وغیرہ کے متعلق بھی آپ کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس لیے جیسے زندگی میں ان سے دعا وغیرہ کی درخواست ہو سکتی تھی' اب بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب ہماری طرف سے ان کو دو طرح سے دیا جاتا ہے۔ ایک اس طرح کہ یہ غیبی شے ہے جتنا آپ نے بتایا اتنے پر ہمارا ایمان اور عمل ہے۔ اس پر دوسری اشیاء کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ دوم سلف نے اس پر کیوں عمل نہیں کیا بلکہ سلف کا عمل اس کے خلاف ہے۔ حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں قحط سالی پڑ گئی تو حضرت عباس ؓ کو دعا کے لیے آگے کیا۔ رسول اللہ ﷺ سے درخواست نہیں کی۔ اسی طرح حضرت معاویہ ؓ نے یزید بن اسود جرشی ؓ کو آگے کیا۔ ملاحظہ ہو بخاری اور شرح مشکوٰۃ۔

ٹھیک اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے صرف جنگل میں جنوں یا فرشتوں کی شمولیت کی خبر دی ہے' گھروں کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ غیب کی شے ہے۔ اپنی طرف سے اس پر حاشیہ آرائی نہیں کر سکتے۔ علاوہ اس کے شاید جنگل میں شمولیت اس لیے ہو کہ جنگل کی نماز بہت فضیلت رکھتی ہے' جیسا کہ خالد کی پیش کردہ روایت سے ظاہر ہے۔ یہ فضیلت خواہ اس وجہ سے ہو جو امام شوکانی نے بیان کی ہے یا اس وجہ سے ہو کہ گھر کی نماز میں عموماً کسی کے لحاظ یا کسی کے دباؤ کا دخل ہوتا ہے یا کسی کی دیکھا دیکھی ہوتی ہے۔ نیز کئی طرح کی ریاکاری کا خدشہ ہے۔ برخلاف جنگل کی نماز کے کہ وہ ہر قسم کے نقائص سے بالاتر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ڈر سے رونے والے کے لیے قیامت کے دن عرش کے سایہ کی خوشخبری ہے۔ جو صرف سات شخصوں کے لیے ہے اور ممکن ہے کہ امام شوکانی کی اور ہماری دونوں وجہیں ہوں یا کوئی اور وجہ بھی ہو۔ بہرصورت جب جنگل کی نماز کو فضیلت ہے تو پھر گھر کی نماز کو اس پر قیاس کرنا مع الفارق ہے۔ خاص کر جماعت ثانیہ جو عموماً سستی کا نتیجہ ہے۔ پھر جماعت کے مفہوم پر نظر کی جائے تو اس کا چسپاں ہونا بھی واضح نہیں۔ مثلاً انسان کے ساتھ فرس (گھوڑے)

کو ملا دیا جائے تو یہ کوئی جماعت نہیں۔ اگرچہ دونوں جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح غیبی اور ظاہری چیز کا کچھ مطلب نہیں۔ عرفاً" اس کو جماعت نہیں کہا جا سکتا۔ جنگل کے متعلق چونکہ خلاف قیاس حدیث آگئی ہے۔ اس لیے "آمنا وصدقنا" گھر کے متعلق کوئی حدیث نہیں آئی اور خلاف قیاس پر قیاس نہیں ہوتا۔ پس یہ قیاس درست نہیں۔ پھر سلف سے کسی سے گھر میں اکیلے کی جماعت ثابت نہیں بلکہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ کوئی جماعت فوت ہونے کے وقت دوسری مسجد میں جاتا' کوئی گھر آکر اہل کے ساتھ نماز پڑھتا۔ خود رسول اللہ ﷺ کا یہی فعل اوپر ذکر ہو چکا ہے اور حدیث الا رجل یتصدق علیہ وغیرہ بھی اس بارہ میں صاف ہے کہ اکیلے کی جماعت نہیں۔ پس بکر کا مذہب بالکل باطل ہے اور احداث محدث ہے اور عقلاً" اور نقلاً" مردود ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کہیں ہندوؤں وغیرہ کے درمیان مسلمانوں کا ایک ہی گھر ہو تو اگر وہاں اس کا اہل و عیال ہے جن کے ساتھ اذان جماعت کا سلسلہ قائم رہ سکتا ہے تو بہتر ورنہ وہاں سے اس کو ہجرت کرنی چاہیے کیونکہ اکیلے کی جماعت معتبر نہیں۔ نیز اس تفصیل سے خالد کے مذہب کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ وہ بھی درست نہیں۔ بکر نے تو افراط کی جانب قدم رکھتے ہوئے بالکل آزادی دے دی تھی کہ سفر میں' حضر میں' جنگل میں' آبادی میں خواہ جماعت اولیٰ ہو یا ثانیہ ہو۔ ہر صورت میں اکیلے کی جماعت درست ہے۔ خالد نے اس کے مقابلہ میں تفریط کی طرف قدم رکھ کر حدیث سے ثابت شدہ جنگل کی جماعت سے بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ مسلمان کی یہ شان نہیں کیونکہ ؎

شان مسلم ہے اطاعت سید الابرار کی
ہے سر تسلیم خم طاقت نہیں انکار کی

رہا زید کا مذہب تو وہ بالکل درست ہے کیونکہ زید نے دو دعوے کیے ہیں۔ ایک یہ کہ گھر میں اکیلے کی جماعت صحیح نہیں۔ دوم یہ کہ جنگل میں صحیح ہے۔ سو یہ دونوں احادیث سے صراحتاً" ثابت ہیں۔ دوسرے دعویٰ کی دلیل تو نسائی اور عبدالرزاق کی حدیث ہے۔ اور پہلے دعویٰ کی دلیل کئی احادیث اور سلف کا عمل اور کتب محدثین کے

تراجم ابواب وغیرہ ہیں۔ یہ سب دلیلیں زید کے بیان میں گزر چکی ہیں۔ اور ان کے علاوہ جماعت کا مفہوم بھی زید کے حق میں ہے کیونکہ اکیلا جماعت نہیں۔ اور غیبی شے کے ملانے سے عرفاً" جماعت نہیں بنتی اور صراحتاً" اس کے مقابلہ میں کوئی آیت یا حدیث نہیں تاکہ اس کی وجہ سے اس مفہوم کا اعتبار نہ کیا جائے' جیسے جنگل میں نہیں کیا گیا۔ خاص کر جماعت ثانیہ میں اکیلے کی جماعت کو صحیح سمجھنا یہ سستی کا دروازہ کھولتا ہے۔ کیونکہ جماعت ثانیہ عموماً سستی کا نتیجہ ہے۔ بہت کم کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہے جس سے بغیر سستی کے اتفاقیہ طور پر جماعت اولیٰ فوت ہوتی ہے ورنہ کاروبار دنیا کے دھندے اور طبائع میں کچھ غفلت اس کا باعث ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ شرعی احکام مصالح اور حکم پر مبنی ہیں۔ ان میں وہ پہلو بھی اختیار نہیں کیا جاتا' جس میں خطرہ ہو۔ جماعت ثانیہ میں اگر دوسرا آدمی تلاش کرنا پڑے تاکہ اس کے ساتھ مل کر جماعت کا ثواب حاصل کرے تو یہ اس تھوڑی سی طبعی غفلت کا علاج ہو سکتا ہے کیونکہ دوسرا آدمی کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ اس فکر کی وجہ سے وہ پہلی جماعت کے پانے کی کوشش کرے گا اور اکیلے کی جماعت ہو جائے تو بتلایئے شرع نے اس میں مصلحت دیکھی یا شرعی مصلحت کے سراسر خلاف ہوا۔ ظاہر ہے کہ خلاف ہوا۔ پس شرع اس کی کس طرح اجازت دے سکتی ہے۔

اس طرح ایک شخص ہمیشہ ہندوؤں وغیرہ میں رہتا ہے۔ انہی کے ساتھ اس کا میل جول اور رات دن کا تعلق ہے۔ اگر اس کو جماعت کی خاطر دوسری جگہ جانے کا حکم نہ ہو بلکہ وہیں اکیلے کی جماعت ہو جائے تو بتلایئے اس پر بد صحبت کا اثر ہوتے ہوئے کیا نتیجہ نکلے گا۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ عموماً ایک آدھ ہندو میں رہنے والے کا برت برتاؤ کیا ہوتا ہے؟ پس یہ بھی کسی طرح قرین مصلحت نہیں کہ شریعت اس اکیلے کی جماعت کو صحیح قرار دے بلکہ ضرور اس کو وہاں سے ہجرت کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیشہ بد صحبت اور ترک جماعت کے اثر سے معاذ اللہ ارتداد تک نوبت پہنچ جائے۔ ہاں جنگل میں رہنے والے کے لیے یہ خطرات نہیں۔ اس لیے اس اکیلے کی جماعت ہو جاتی ہے بلکہ اگر جماعت نہ کرے ویسے ہی نماز پڑھ لے تو بھی اجازت ہے۔ کیونکہ مقصود جماعت سے فتنوں اور شیطانی تسلط سے حفاظت ہے۔ سو یہ اس کو حاصل ہے اور اسی

وجہ سے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر آبادی میں اذان جماعت مل سکے تو آبادی میں رہنا بہتر ہے یا جنگل میں۔ امام غزالی نے احیاء العلوم اور منہاج العابدین میں اس پر بہت بحث کی ہے۔ احادیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ فتنوں کے وقت جنگل میں رہنا بہتر ہے۔ غرض جنگل فتنوں سے محفوظ جگہ ہے اس لیے اس میں اکیلے کی جماعت معتبر ہے۔ آبادی میں اس کی اجازت دینا شرعی مصلحت کے خلاف ہے اور مفہوم جماعت کے بھی خلاف۔ احادیث کے بھی خلاف' عمل سلف کے بھی خلاف' کتب احادیث کے تراجم کے بھی خلاف۔ پس زید کا مذہب "عقلاً" "نقلاً" ہر طرح سے صحیح ہے۔ واللہ الموفق للصواب والیہ المرجع والمآب وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

فتاویٰ اہل حدیث جلد دوم' ص۔۲۵۲ تا ۲۶۵ مورخہ ۳ر ربیع الاول سنہ۔۱۳۷۹ بمطابق ۱۸ر اپریل سنہ۔۱۹۳۰ء

جو شخص آمین بالجہر اور رفع یدین کو برا سمجھے اس کی امامت کا کیا حکم ہے؟

اخبار "الاعتصام" لاہور میں ایک عنوان "باب الفتاویٰ" مقرر کیا گیا ہے' جس میں علمائے کرام کے فتوے درج ہوتے ہیں۔ خصوصاً آج کل جمعیتہ اہلحدیث کے مفتی اور امیر مولانا حافظ محمد صاحب محدث گوندلوی مدظلہ کے فتوے زیادہ شائع ہو رہے ہیں۔ یہ سلسلہ بہت اچھا اور عوام بلکہ خواص اہل علم کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ لیکن حضرت حافظ صاحب کا طرز بیان مقلدین فقہاء کا سا ہے کہ مسئلہ کی دلیل شرعی بہت کم بیان کرتے ہیں۔ نفس مسئلہ تحریر کر رہے ہیں' محدثانہ بیان ہونا چاہیے جیسے حضرت العلام مفتی اعظم محدث روپڑی رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ سب سے پہلے دلیل شرعی بیان فرما کر مسئلہ کی ایسی محدثانہ اور محققانہ وضاحت فرما دیتے تھے کہ ہر پڑھنے والا پوری طرح مطمئن ہو جاتا تھا۔

حضرت حافظ صاحب گوندلوی کے فتوے سے معرفت دلیل نہیں ہوتی تو ان کا فتویٰ تقلیداً قبول کیا جائے گا جو اہل حدیث کی شان نہیں ہے۔ کیونکہ تقلید کی تعریف یہ ہے: اخذ قول الغیر من غیر معرفة دلیلہ۔ (کسی کا قول' اس کی دلیل جانے بغیر لینا تقلید ہے) بعض اکابر علماء یہ سمجھتے ہیں کہ ہم علماء مشاہیر سے ہیں' ہمارا فتویٰ حسن ظن کی بنا پر بغیر دلیل کے بھی تسلیم کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اسی کا نام تقلید ہے۔ عوام تو اس پر قناعت کر سکتے ہیں مگر اہل علم بغیر دلیل کے ایسے فتووں کو مخدوش سمجھتے ہیں۔ مثلاً:

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے جو اکابر علمائے احناف سے تھے' سوال کیا گیا کہ ایک قرآن کا ثواب چند مردوں کو پہنچایا تو تمام کو ایک قرآن کا ثواب تقسیم ہو گا یا ہر واحد کو پورے ایک ایک قرآن کا ثواب حاصل ہو گا؟ تو اس کا جواب مولانا گنگوہی نے جو دیا وہ دو حرفی یہ ہے "تقسیم ہو کر پہنچتا ہے" (فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۲۵)۔ اسی طرح کا سوال اسی صفحہ پر یوں ہے کہ ایصال ثواب میں نیت سب اموات کی کرے تو سب کو برابر پہنچے گا یا تقسیم ہو کر پہنچے گا؟ مولانا اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں: "ثواب سب پر حصہ رسدی تقسیم ہو

گا جیسا کہ ظاہر ہے اور سب کو ہر واحد کو پورا ثواب' جیسا کہ مشہور ہے کوئی روایت صحیح اس کی بندہ کو معلوم نہیں۔

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دیوبند سے یہ سوال بھیج کر فتویٰ طلب کیا گیا تو انہوں نے یہ لکھا: "حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ نے جو فرمایا یہی حق ہے' ثواب تقسیم ہو کر پہنچتا ہے۔" (عزیز الفتاویٰ ص ۲۱۸)

ان مفتیان مذہب حنفی نے اپنے فتویٰ میں کوئی دلیل بیان نہیں کی' صرف فقہاء کی تقلید ہے کہ ثواب مُردوں کو تقسیم ہو کر ملتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے قرآن کے تین حروف "الم" پڑھے تو اس کو تیس نیکیاں حاصل ہوئیں۔ قاری نے یہ نیکیاں اپنے والدین کو ہبہ کر دیں اور ایصال ثواب کر دیا تو یہ نیکیاں درگاہ الٰہی میں پہنچ کر اس کے والدین کو مل گئیں جو تیس تھیں' وہ پندرہ پندرہ حصہ رسدی حاصل ہوئیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ایک کو تیس تیس دی گئیں تو پھر کل نیکیاں ساٹھ ہو جائیں گی اور ساٹھ نیکیاں دینے کا وعدہ کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے تو پھر برابر دونوں کو ملنے کا خیال بے دلیل ہو گا۔

یہ خلاصہ ہے ان دو حنفی مفتیوں کے مسلک کا اور کتب فقہ میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ چنانچہ شامی میں ہے: لو اهدى الى اربعة يحصل لكل منهم ربعه هكذا لو اهدى الربع لواحد وابقى الباقى لنفسه۔ "اگر کسی نے کسی چیز کا ثواب چار شخصوں کو ہبہ کیا تو ان میں سے ہر ایک کو چوتھا حصہ ملے گا۔" اسی طرح اگر کسی نے کسی چیز کا ثواب چوتھا حصہ کسی کو ہبہ کر دیا اور باقی اپنے نفس کے لیے رکھ لیا تو یہ بھی درست ہے یعنی ثواب میں تجزی ہو جاتی ہے۔

لیکن اس مسئلہ کو مولانا اشرف علی صاحب دیوبندی نے قبول نہ کیا' وہ عدم تجزی کے قائل ہوئے۔ چنانچہ بوادر النوادر جلد۔۱' ص۔۳۵۳ میں کسی کا یہ سوال ہے کہ اگر عمل نیک کا ثواب مُردوں کی روح کو بخشا جائے تو بخشنے والے کو کیا نفع ہوتا ہے؟ اس کا جواب مولانا اشرف علی تھانوی نے یہ دیا ہے کہ "ثواب بخشنے کے بعد بھی عامل اور موصل کے پاس ثواب رہ جاتا ہے۔" اسی طرح مُردوں کو ثواب تقسیم ہو کر ملتا ہے یا سب کو برابر ملتا ہے؟ اس کے جواب میں بھی مولانا اشرف علی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ "تقسیم کرنے کی کوئی دلیل وارد نہیں۔ طبرانی کی ایک روایت ہے جس سے یہ دونوں مسئلے ثابت ہوتے ہیں کہ

موصل کے پاس بھی ثواب باقی رہ جاتا ہے اور مُردوں کو بھی ثواب بغیر تجزی' ہر ایک کو پورا پورا ملتا ہے۔ چنانچہ وہ حدیث یہ ہے:

فی شرح الصدور بتخریج الطبرانی عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا تصدق احدکم بصدقۃ تطوعا فلیجعلھا عن ابویہ فیکون لھما اجرھا ولا ینتقص من اجرہ شیئا "ابو عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' ان نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی تمہارا نفل صدقہ کرے تو چاہیے کہ اس کو اپنے والدین کی طرف سے کر دے' اسی طرح سے عامل کے ثواب سے کوئی چیز کم نہ ہو گی' سب کو برابر اجر ملے گا" ص ۲۰۸

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں: "یہ حدیث نص ہے اس میں کہ ثواب بخش دینے سے بھی عامل کے پاس اپنا ثواب رہتا ہے۔"

پھر دوسرے سوال کے جواب میں اختلاف علماء کا ذکر کر کے اسی طبرانی کی حدیث مذکور سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جو حدیث طبرانی کی مذکور ہے' اس کو ظاہر الفاظ سے عدم تجزی پر دال کیا جا سکتا ہے' کیونکہ اجرھا کا مرجع صدقہ ہے جس کا حقیقی مفہوم کل صدقہ ہے نہ کہ جزء الصدقہ ہے ــــ اور لھما سے متبادر اور شائع اطلاق کے وقت کل واحد ہوتا ہے اور مجموعہ مراد ہونا محتاج قرینہ ہوتا ہے اور قرینہ کا فقدان ظاہر ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو پورے صدقہ کا اجر ملے گا اور دوسرے احتمالات مخالفہ غیر ناشی عن دلیل ہیں' اس لیے معتبر نہیں۔"

مولانا اشرف علی صاحب نے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ مکی سے بحوالہ رد المختار یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ سئل ابن حجر المکی عما لو قرا لاھل المقبرۃ الفاتحۃ ھل یقسم الثواب بینھم او یصل لکل واحد منھم ثواب ذالک کاملا فاجاب بانہ افتی جمع بالثانی وھو اللائق بسعۃ الفضل (شامی جلد ا' ص ۳۳۲) "ابن حجر مکی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی نے قبرستان میں جا کر سورۂ فاتحہ پڑھی' اس کا ثواب اہل قبور کو بخش دیا تو ثواب تقسیم ہو کر ہر ایک کو حصہ رسدی ملے گا یا ہر ایک کو پورا ثواب فاتحہ کا ملے گا؟؟ تو علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ علماء کی ایک جماعت نے دوسرے مسلک پر فتویٰ دیا ہے کہ ہر

میت کو پورا ثواب ملے گا اور فضل الٰہی اور رحمت ربانی کی وسعت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنے خزانہ رحمت سے سب کو برابر دے اور اس کے حصے بخرے نہ کرے۔"

مولانا اشرف علی صاحب نے اس کی تائید میں ایک حدیث مسلم کی بھی پیش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "جو شخص کوئی نیک طریقہ' عمل مسنونہ کسی جگہ جاری کر دے تو اس کو اس عمل کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کے عملوں سے کوئی چیز کم نہ ہو گی۔"

وجہ تائید ظاہر ہے کہ دوسرے شخص کی طرف تعدیہ ثواب سے بھی عامل کا ثواب کم نہیں ہوتا۔"

میں کہتا ہوں کہ مولانا اشرف علی صاحب اور علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کا قول صحیح ہے اور ہر دو احادیث طبرانی اور مسلم اس پر دال ہیں اور رحمت الٰہی کی وسعت بھی اسی کی مقتضی ہے اور مفتیان دیوبند کے فتوے بے دلیل ہونے کی وجہ سے غلط ہیں۔ اس سے مقصود بالاظہار یہ ہے کہ فتاویٰ اور مسائل میں علماء سے غلطیاں صادر ہو جاتی ہیں اور دیگر علماء اس کی اصلاح کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ ثنائیہ میں مولانا ثناء اللہ صاحب کے فتووں پر مولانا شرف الدین دہلوی رحمہ اللہ نے جابجا تعاقب کیے ہیں اور فتاویٰ نذیریہ میں بھی مولانا محدث مبارک پوری رحمہ اللہ کے اصلاحی تعاقب درج ہیں۔ پس کوئی مفتی معصوم نہیں ہے' ہر ایک سے غلطی ہو جاتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو چھ ماہ کے بعد بچہ پیدا ہونے پر رجم کا حکم دے دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی تردید کر دی۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ میں مہر کی بابت غلط مسئلہ بیان کیا تو ایک عورت نے کھڑے ہو کر فوراً اس کی تردید کر دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر ایک سے غلطی ممکن ہے اور اس کی اصلاح کم درجہ کا شخص بھی کر سکتا ہے۔ ہماریں جمعیتہ کے مفتی صاحب سے فتووں میں مسامحت ہو رہی ہے' اصلاح کی نیت سے اس کا اظہار ضروری ہے۔ مفتی صاحب کو چاہیے کہ وہ اپنے فتووں کو غلطی سے مبرا نہ سمجھیں بلکہ ان پر نظر ثانی فرما کر ان کی اصلاح کر دیا کریں' غلطی کا اقرار کرنے سے درجہ اور شان کم نہیں ہوتی بلکہ رجوع کرنے سے اجر ملتا ہے کہ یہ بھی اپنے نفس سے جہاد ہے۔

اب یہاں چند مسئلوں پر کچھ عرض کیا جاتا ہے' باقی پر پھر غور کیا جائے گا۔ الاعتصام جلد ۱۹' شمارہ ۵۱' مطبوعہ ۱۹/ جولائی سنہ ۱۹۶۸ء میں کسی نے سوال کیا کہ "جو لوگ رفع

الیدین اور اونچی آمین کہنے والوں کو برا سمجھتے ہوں' ان کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟
مفتی صاحب نے جواب دیا ہے کہ "احتیاط بہتر ہے۔"

یہ گول مول بات لکھ دی ہے' یہ فتویٰ نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھ لے تو جائز ہے مگر احتیاط کرے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھے تو یہ بھی درست ہے۔ یہ فتویٰ سراسر غلط اور دو رنگا ہے۔ بندہ حصاری مفتی صاحب کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ آپ کے فتوے قابل غور ہیں۔

سب کو خوش رکھنا یہ مذہب گورو نانک کا تھا۔ بعض صلح کل مدعیان اسلام کا مسلک ہے۔ وہ یہ شعر پڑھا کرتے ہیں"

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام!

اہلحدیث کا مسلک یہ نہیں' وہ ایک ہی رنگ صبغۃ اللہ کا رکھتے ہیں۔ محلی ابن حزم کا آپ مطالعہ کریں گے تو جان لیں گے کہ سب مذاہب ذکر کر کے کس طرح دلائل سے ایک راجح بات کو بیان کر کے باقی پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ سنئے! رفع یدین احادیث متواترہ سے اور آمین بالجہر احادیث صحیحہ سے سنت مستمرہ ثابت ہے جو متوکدہ ہے' اس سنت کو برا جاننے والا کافر ہے اور کافر کی اقتداء بالاجماع درست نہیں ہے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا مجموعہ فتاویٰ جلد ۲۔ ۱ عہد ہند میں میرے کتب خانہ میں تھا۔ اس کی جلد اول میں ایک ہی سوال کا جواب یہ دیا گیا تھا جو صغریٰ کبریٰ کی شکل میں تھا کہ رفع یدین سنت ہے' جو شخص سنت کو برا جانے وہ کافر ہے۔ یہ اصل فتویٰ ہے جس سے مفتی صاحب اغماض کر گئے۔ میں اس کو کمزوری ایمان اور کتمان حق سمجھتا ہوں' آپ اس پر نظرثانی کریں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کیدانی حنفی نے اپنی کتاب میں اشارہ بالسبابہ کو جو سنت متوکدہ ہے' حرام لکھ دیا ہے۔ اس پر ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ لکھ کر شائع کر دیا' جس کا نام "رفع السبابہ" ہے۔ اس میں علامہ قاری نے کیدانی کے الفاظ کو موجب تکفیر قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے : ومن القواعد المقرره ان تحريم المباح كفر فكيف تحريم السنة الثابتة عنه صلى الله عليه وسلم (ص۔ ۳۳) "قواعد شرعیہ مقررہ میں سے یہ قاعدہ ہے کہ کسی مباح شرعی کو حرام کہنا کفر ہے' چہ جائیکہ سنت ثابتہ کو حرام کہے۔" (تو اس کے کفر میں شک ہی

نہیں)

پھر علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ کیدانی کی تکفیر کے لیے یہ امر ہی کافی ہے کہ اس نے یہ کہہ دیا کہ اشارہ بالسبابہ حرام ہے جیسے اہلحدیث کرتے ہیں' محدثین کی جو دین کے ستون ہیں توہین کی ہے۔ سنت کو برا جاننے اور عاملین بالسنت کو برا کہنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور محدثین' ائمہ دین کی توہین لازم آجاتی ہے۔ اس لیے ایسے لوگ کافر ہیں کہ تقلید میں غلو کر کے احادیث صحیحہ سے اعراض کرتے ہیں۔ آیت اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض خواہش نفسانی سے حدیث وسنت نبوی کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ جیسے عموماً داڑھی منڈے ایسا ہی کرتے ہیں۔

شرح فقہ اکبر کے ص-۲۰ میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ فقہ کی کتب سے نقل کیا ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ خلیفہ مامون کے دربار میں یہ حدیث بیان کی گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کدو کو پسند فرماتے تھے' مجلس میں سے ایک شخص بولا کہ میں تو کدو کو پسند نہیں کرتا۔ فامر ابو یوسف باحضار النطع والسیف فقال الرجل استغفر اللہ مما ذکرتہ۔ یعنی "قاضی ابو یوسف نے حکم دیا کہ چمڑے کا بچھونا اور تلوار حاضر کرو' تاکہ اس شخص کو ذبح کیا جائے' تب وہ شخص پکار اٹھا کہ میں نے جو کچھ منہ سے بکا ہے' اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا ہوں۔"

شرح فقہ اکبر کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ عہد مامون میں وہی زندہ تھے' قاضی ابو یوسف نہ تھے۔ بہرحال اس واقعہ سے سنت نبوی کی اہمیت اور ائمہ دین کی غیرت مذہبی خوب ظاہر ہوتی ہے کہ وہ حدیث نبوی اور سنت رسول کی توہین' انکار' تحول' مذاق اور برا کہنے والوں کو کافر جانتے تھے۔

فقہاء نے کفریات کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ کسی نے برا کام کیا اور اس کو دیکھ کر کسی نے یہ کہا کہ اس نے یہ بہت اچھا کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ اسی طرح کسی نے نیک کام کیا اور اس کو دیکھ کر دوسرے شخص نے یہ کہا کہ اس نے بہت برا کام کیا تو وہ کافر ہو گیا۔

متواتر معنوی کے انکار کو علمائے احناف نے کفر لکھا ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ مردوں پر ریشم پہننا حرام نہیں ہے' یا نماز وتر کو اور قربانی کرنے کو ہم نہیں مانتے تو وہ کافر ہوا۔ پھر رفع

یدین کا ثبوت احادیث متواترہ سے ہے تو اس کا منکر اور اس کو برا کہنے والا کافر کیوں نہ ہو گا؟
مفتی صاحب نے رفع یدین کے ثبوت میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں قطعی الثبوت دلائل سے رفع یدین کا سنت ہونا ثابت کیا ہے اور اس کو آنحضرت ﷺ کا دائمی اور مستمر عمل ظاہر کیا ہے۔ لیکن اب اس کے برا جاننے والے کی اقتدا کو جائز ظاہر کر رہے ہیں اور صرف یہ کہتے ہیں کہ احتیاط بہتر ہے' یعنی اگر بچے تو اچھا ہے' ورنہ جائز ہے۔ لفظ بہتر مفضل اور مفضل علیہ کو چاہتا ہے جس سے جواز مستفاد ہے اس لیے یہ فتویٰ غلط ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے احکام فی اصول الاحکام جلد۔۲' ص۔۷۳ میں یہ لکھا ہے: ومن عمد فخالف ما صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلم لقلبه او بلسانه انه کحکمه علیه السلام فهو کافر سواء کان فیما اجمع علیه او فیما اختلف فیه قال اللہ تعالی فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم الایۃ۔ اگر کسی نے عمداً ایسی حدیث اور سنت نبوی کی مخالفت کی جو آنحضرت ﷺ سے صحیح سند سے آچکی ہے' پھر اس کو دل اور زبان سے تسلیم نہ کیا تو وہ کافر ہوا' جیسا کہ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "اے نبی! تیرے رب کی قسم' یہ لوگ کبھی مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافوں اور جھگڑوں میں تجھے اپنا حکم بنا کر تیرے فیصلوں کو دل وجان اور زبان سے تسلیم نہ کرلیں گے۔" پس رفع یدین کو برا جان کر تسلیم نہ کرنا کفر ہے۔

عبدالقادر عارف الحصاری

تنظیم اہلحدیث' جلد۔۲۱' شمارہ۔۲۱' ۲۲' ۲۳' مورخہ ۱۳ و ۲۰ و ۲۷ ستمبر سنہ۔۱۹۶۸ء

مقیم کی اقتداء میں مسافر کیا کرے؟

قصر کرے یا پوری نماز پڑھے؟

سوال: ہمارے گاؤں میں ایک مسافر مولوی صاحب تشریف لائے اور انہوں نے مقیم امام کی نماز ظہر کی پچھلی دو رکعتوں میں اقتداء کی اور پھر امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دیا اور اس کو اپنا دوگانہ سفر سمجھ لیا۔ اس پر مسافر مولوی صاحب سے ان کے عمل کی دلیل پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ یہ جائز ہے' کیونکہ میرے ذمہ صرف دو ہی فرض تھے۔ میں مسافر

ہوں' مسافر پر دو رکعت نماز فرض ہے۔ اس پر مسافر مولوی صاحب کو کہا گیا کہ آپ منفرد یا امام ہوتے تو نماز قصر پڑھ سکتے تھے' جب امام مقیم کی آپ نے اقتداء کی تو آپ کو پوری نماز پڑھنی چاہیے تھی' کیونکہ امام کی اتباع ضروری ہے۔ مسافر مولوی صاحب نے کہا کہ امام کی اتباع نماز کے اندر ہے' جب نماز سے امام باہر ہوا تو اس کی اتباع نماز میں نہ رہی' اب مقتدی آزاد ہے۔ اگر اس کے ذمہ کچھ ہے تو وہ ادا کرے گا ورنہ نہیں۔ مسافر کے ذمے دو رکعت سے زائد کچھ نہیں' اس لیے میں نے کچھ نہیں پڑھا۔ صوفی صاحب (امام نماز) نے کہا کہ اس کا ثبوت معلوم نہیں ہے' لہٰذا عرض ہے کہ اس مسئلہ کی دلائل شرعیہ کی رُو سے وضاحت فرمائی جائے' مہربانی ہو گی۔

(صوفی عبداللہ مسافر عفی عنہ' اٹک)

الجواب بعون الوھاب وھو الموفق للصواب' الحمد للہ رب العالمین اما بعد فاقول و باللہ التوفیق۔

واضح ہو کہ دیگر فروعی مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی علمائے اسلام میں مختلف فیہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر مسافر نے مقیم امام کی اقتداء کر لی تو اس کو اتمام نماز ضروری ہوا' اب وہ قصر نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اس کے مقابلہ میں امام ابن حزم رحمہ اللہ وغیرہ کا یہ مذہب ہے کہ مسافر پر دوگانہ فرض ہے' اگرچہ مقیم امام کی اقتداء کرے تب بھی دو فرض ہی پڑھے' زیادہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ تیسرا مذہب ان دونوں کے مابین ہے' وہ یہ ہے کہ اگر مسافر نے مقیم امام کی اقتداء میں ایک رکعت پائی تو اس نے امام کی نماز پائی' وہ پوری نماز پڑھے اور اگر ایک رکعت کامل نہ پائی بلکہ آخری حصہ سجدہ' تشہد وغیرہ میں ملا تو پھر وہ مسافر مقتدی نماز قصر پڑھ سکتا ہے۔

ان تینوں مذاہب میں میری تحقیق میں تیسرا مذہب راجح اور صحیح ہے' کیونکہ دلائل شرعیہ اسی پر ناطق ہیں۔ اول اور دوم مذہب پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں' اس لیے وہ ضعیف اور مرجوح ہیں۔ اب نمبروار دلائل اور تیسرے مذہب کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) مسلم شریف میں ہے کہ موسیٰ بن مسلمہ ہذلی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ كيف اصلي اذا كنت بمكة اذا لم اصل مع الامام فقال ركعتين سنة ابي القاسم صلى الله عليه وسلم۔ یعنی "جب میں مکہ میں امام کی اقتداء میں نماز نہ پڑھوں تو پھر کس

طرح نماز پڑھوں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پھر دوگانہ پڑھنا" حضرت ابو القاسم ﷺ کی سنت ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ امام کی اقتداء میں پوری نماز پڑھنی چاہیے' کیونکہ دوسری حدیث میں اس کی ذرا تفصیل ہے : اخرجه احمد بن حنبل فی مسنده عن ابن عباس انه سئل ما بال المسافر یصلی رکعتین اذا انفرد واربعا اذا ائتم بمقیم فقال تلک السنة۔ یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ مسافر جب اکیلا نماز پڑھتا ہے تو دوگانہ پڑھتا ہے اور جب مقیم کی اقتداء کرتا ہے تو پھر چار رکعت پڑھتا ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ طریقہ نبویہ یہی ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ جب مسافر مقیم کی اقتداء کرے تو شرعی طریقہ یہ ہے کہ وہ پوری نماز پڑھے' قصر نہ کرے' صحابہ کا بھی یہی طریقہ تھا۔

سنن بیہقی کبریٰ جلد۔۳' ص۔۱۵۷ میں ہے : عن ابن عمر انه کان اذا صلی مع الامام صلی اربعا واذا صلی وحده صلی رکعتین۔ (رواه مسلم) یعنی "ابن عمر رضی اللہ عنہما جب امام کے ساتھ نماز پڑھتے تو چار پڑھتے اور جب اکیلے پڑھتے تو دوگانہ پڑھتے تھے۔

(۲) بیہقی سنن کبریٰ جلد۔۳' ص۔۱۵۷ میں باسناده نقل کرتے ہیں : عن ابی مجلز قال قلت لابن عمر المسافر یدرک رکعتین مع صلوة القوم یعنی المقیمین اتجزیه الرکعتان او یصلی بصلوتهم قال فضحک وقال یصلی بصلوتهم۔ یعنی "ابی مجلز نے کہا کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ اگر مسافر مقیم لوگوں کے ساتھ جماعت میں آخر کی دو رکعت پالے تو کیا یہ وہی رکعت کفایت کر جائیں گی؟ یا ان کی طرح پوری نماز پڑھے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا کہ مقیم کی طرح پوری نماز پڑھے۔"

ان دلائل سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو مقیم امام کے پیچھے دوگانہ پڑھتے ہیں۔ بعض امام مقیم کے ساتھ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر کر امام سے پہلے فارغ ہو جاتے ہیں اور بعض دو رکعت پڑھ کر بیٹھے رہتے ہیں' جب مقیم امام باقی دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرتا ہے تو اس کے ساتھ سلام پھیر دیتے ہیں۔ بعض آخر کی دو رکعت میں اقتداء کر کے امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دیتے ہیں۔

ان کے پاس کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔ یہ نماز خوف کی صورتوں سے مسئلہ استنباط کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ معذوری اور مجبوری کی حالتیں ہیں' جو امن کی صورتوں سے جدا ہیں' ان پر قیاس درست نہیں ہے۔ پھر اس صورت کے لیے خاص دلائل آگئے تو اب قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

(۳) کتب حدیث میں یہ حدیث مشہور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: من ادرک رکعة من الصلوٰة مع الامام فقد ادرک الصلوٰة (منتقی) یعنی "جس شخص نے ایک رکعت نماز کی امام کے ساتھ پالی' اس نے وہ نماز پالی۔"

اس سے ثابت ہوا کہ جب مسافر نے مقیم امام کی نماز سے ایک رکعت پالی تو اس نے مقیم امام کی نماز پالی۔ اب اس کو دوگانہ پڑھنا جائز نہ ہو گا بلکہ مقیم امام کی نماز اس کو پوری پڑھنی واجب ہو گی۔ ہاں اگر پوری رکعت نہیں پائی اور وہ آخری رکعت کے رکوع کے بعد اگر شامل ہوا ہے تو پھر اس کو دوگانہ پڑھنے کا اختیار ہے کیونکہ اب اس نے امام کی نماز نہیں پائی' صرف جماعت کا ثواب پایا ہے۔ امام کی نماز پوری رکعت پانے سے شمار ہوتی ہے۔

اس کی نظیر مسئلہ جمعہ ہے کہ اگر مقتدی مسبوق نے ایک رکعت نماز جمعہ کی امام کے ساتھ پالی تو اس نے جمعہ پالیا اور اگر ایک رکعت سالم نہ پائی تو اس نے جمعہ نہ پایا' اب اس کو نماز ظہر پڑھنی ضروری ہو گی۔

سنن کبریٰ جلد۔۳' ص۔۲۰۳ میں ہے: ان لفظ الحدیث فی الصلوٰة مطلق وانها بعمومها تتناول الجمعة کما تتناول غیرها من الصلوات۔ یعنی حدیث من ترک الصلوٰة میں لفظ صلوٰة اپنے عموم سے نماز جمعہ وغیرہ سب نمازوں کو شامل ہے کہ جس شخص نے کسی نماز کی ایک رکعت پالی' اس نے وہ نماز پوری پالی۔

سنن کبریٰ جلد۔۳' ص۔۲۰۳ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت آئی ہے کہ من ادرک من الجمعة رکعة فلیصل الیها اخری۔ یعنی "جو شخص جمعہ کی ایک رکعت پالے' وہ دوسری اس کے ساتھ ملا لے۔"

اس حدیث کے کئی طرق ہیں اور حدیث اصح من ادرک الصلوة اس کی مؤید ہے' لہذا یہ حجت ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: قال اذا ادرکت من الجمعة رکعة فاضف الیها اخری وان ادرکتم جلوسا فصل اربعا۔ یعنی "جب تم جمعہ

کی ایک رکعت پالو تو دوسری اس کے ساتھ ملا لو اور اگر لوگوں کے ساتھ تشہد میں ملو تو پھر چار رکعت ظہر پڑھو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ قال عبداللہ بن مسعود من ادرک من الجمعة رکعة صلی الیها اُخری ومن فاته الرکعتان صلی اربعا۔ یعنی "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص نے ایک رکعت جمعہ کی پالی تو وہ دوسری اس کے ساتھ پڑھ لے اور جس سے دونوں رکعتیں فوت ہو جائیں (وہ سجدہ یا تشہد میں ملے) تو پھر چار رکعت ظہر پڑھے۔"

پس مسئلہ جمعہ کی بنا اس حدیث پر ہے جو پہلے ذکر ہوئی کہ "جس نے ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی۔" اور بھی اس کے نظائر ہیں جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اسی طرح مسافر کی نماز سمجھ لیں۔

(۴) فتاویٰ ابن تیمیہ جلد۔۲، ص۔۳۳۶ میں ہے : ان المسافر اذا ائتم بمقیم وادرک معه رکعة فما فوقها فانه یتم الصلوٰة وان ادرک معه اقل من رکعة صلاها مقصورة نص علیه الامام احمد فی احدی الروایتین عنه وهذا لانه بادراک الرکعة قدائتم بمقیم فی جزء من صلوٰة فلزمه الاتمام واذ لم یدرک معه رکعة فصلوته صلوة منفرد فیصلیها مقصورة۔ یعنی "مسافر نے جب مقیم کی اقتداء کی تو اگر اس کے ساتھ ایک رکعت یا اس سے زیادہ نماز پالی تو پھر مسافر پوری نماز پڑھے اور اگر رکعت سے کم نماز پائی ہے تو نماز قصر پڑھے۔"

امام احمد رحمہ اللہ نے ایک روایت میں اس کی صراحت کی ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ایک رکعت پانے سے مقتدی نے مقیم کی نماز کا ایک حصہ پالیا، تو اب اس کو باقی نماز کا اتمام لازم ہوا اور جب رکعت نہ پائی تو اس کی نماز اکیلے کی نماز کی طرح ہو گئی، اس لیے وہ قصر کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ اسی حدیث من ادرک الصلوٰة پر مبنی ہے جو بالکل صحیح ہے۔ اور وہ حدیث اہل حدیث کے لیے ایک جامع اصول ہے، جس پر کئی احکام متفرع ہوتے ہیں، اس لیے اس اصول کو چھوڑنا نہ چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کو علمائے احناف حنفی قرار دیتے ہیں۔ اس اصول

حدیث کی رو سے وہ بھی حنفی مذہب کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے چنانچہ ان کا فیصلہ درج ذیل ہے:

(۵) مصفی شرح موطا جلد۱، ص۱۳۵ میں شاہ صاحب رقمطراز ہیں: "گفتہ اند کہ اگر یک لحظہ اقتداء بہ مقیم واقع شود بر ماموم اتمام لازم مے آید و فقیر گوید در ایں جا نظر است بحدیث من ادرک رکعۃ فقد ادرک الصلوٰۃ و مسئلہ اقتدا در نماز جمعہ بلکہ ظاہر آں مے نماید کہ اگر یک رکعت با امام یافتہ است اتمام کند والا قصر" یعنی "حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر مسافر نے مقیم کی ایک لحظہ بھی اقتداء کر لی تو اس پر اتمام لازم ہوا، لیکن فقیر یہ کہتا ہے کہ یہاں غور کا مقام ہے کہ حدیث میں یہ وارد ہے کہ جس نے ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی اور نماز جمعہ کی اقتداء کا مسئلہ بھی اس کا شاہد ہے کہ ایک رکعت پانے سے جمعہ ہوتا ہے ورنہ ظہر ہو جاتا ہے، پس ظاہر یہ بات ہے کہ اگر مسافر ایک رکعت امام مقیم کے ساتھ پالے تو وہ پوری نماز پڑھے اگر کم پائے تو نماز قصر پڑھے۔"

یہ دو محدث ہمارے شاہد ہیں، پس صحیح مسلک یہ ہے کہ مسافر ایک رکعت پانے سے دوگانہ نہیں پڑھ سکتا لہٰذا اس مسافر مولوی صاحب نے سخت غلطی کی ہے اور اسی طرح ایک گروہ اہلحدیث کا اس غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس پر کوئی دلیل ناطق نہیں ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور، جلد۔۳، شمارہ۔۳۰، مورخہ ۱۴/ نومبر سنہ۔۱۹۲۰

کیا امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدی کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے؟

کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ بندہ سائل نے نماز عصر کی بغیر وضو پڑھائی، بایں صورت کہ سائل نماز ظہر پڑھا کر غلبہ نیند سے لیٹ گیا تھا، آدھا گھنٹہ کے بعد بیدار ہوا تو پھر لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف ہو گیا۔ عام عادت ہے کہ مسجد میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں اور ایک وضو سے دو نمازیں پڑھتا اور پڑھاتا ہوں۔ اس روز عصر کی نماز کی

اقامت ہوئی تو حسب عادت نماز پڑھا دی اور اپنے سو کر اٹھنے کا واقعہ بھول گیا اور خود ورد وظائف میں مصروف ہوا اور نمازی لوگ جنھوں نے میری اقتداء میں نماز پڑھی تھی' اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بندہ کو پھر یاد آگیا کہ نماز ظہر کے بعد میں تو سو گیا تھا پھر وضو نہ کیا؟ یہ بغیر وضو نماز باطل ہوئی' اس لیے اس کو لوٹانا چاہیے۔ چنانچہ سائل نے نماز کا اعادہ کر لیا لیکن مقتدیوں کو علم نہ ہوا اور نہ انھوں نے اعادہ کیا۔ جب نمازی لوگ دوسری نماز مغرب کے لیے آئے تو ان کو اپنے بھولنے کا واقعہ بتایا گیا مگر انھوں نے نماز کا اعادہ نہ کیا۔ اسی نماز پر اکتفا کری جو امام نے بغیر وضو پڑھائی تھی۔ اب استفسار یہ ہے کہ مقتدیوں نے اس نماز کا اعادہ نہ کیا تو کیا یہ درست ہے؟ یا ان کے ذمہ نماز مذکورہ کا اعادہ لازم ہے؟

ہدایہ باب الحدث فی الصلوٰۃ میں ہے ان صلوٰۃ المقتدی بناء علی صلوٰۃ الامام جوازا او فسادا یعنی مقتدی کی نماز کی بنیاد امام کی نماز پر ہے' اگر امام کی نماز جائز ہوئی تو مقتدی کی بھی ہو جائے گی اور اگر امام کی نماز فاسد ہوئی تو مقتدی کی بھی فاسد ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ اقتداء سے امام کے ساتھ شرکت اور موافقت لازم ہو گئی تو دونوں کی نماز میں اتحاد پایا گیا۔

اس لیے حنفی مذہب میں امام اور مقتدی ہر دو پر اعادہ لازم ہے' پس از روئے شریعت محمدیہ کے اس کا فیصلہ صادر کیا جائے کہ شریعت حنفیہ ہمیں منظور نہیں ہے۔

(سائل عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری)

نوٹ :۔ سوال وجواب کی نقل مطابق اصل ہے۔

الجواب بتوفیق الوہاب' الحمد للہ رب العالمین' اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔

واضح ہو کہ صورت مذکورہ میں مقتدیوں پر اعادہ لازم نہیں ہے' آپ کے مقتدیوں نے جو عمل کیا ہے وہ درست ہے' کیونکہ شریعت محمدیہ کا اصول یہی ہے۔ چنانچہ منتقی الاخبار مع نیل الاوطار جزء ثالث ص۔۱۴۳ میں ہے : عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلون بکم فان اصابوا فلکم ولهم وان اخطا والکم وعلیهم رواہ احمد والبخاری۔ یعنی "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ جو ائمہ تم کو نماز پڑھاتے ہیں'

اگر انھوں نے درست نماز پڑھائی تو تم کو بھی اجروثواب ملے گا اور ان کو بھی ملے گا اور اگر انھوں نے نماز میں خطا کی تو تم کو اجروثواب ملے گا اور خطا ان کے ذمہ ہو گی۔"

نیل الاوطار میں اس حدیث پر یہ لکھا ہے : قال ابن المنذر هذا الحديث يرد على من زعم ان صلوة الامام اذا فسدت فسدت صلوة من خلفه۔ یعنی "امام ابن المنذر نے یہ فرمایا ہے کہ یہ حدیث رد کرتی ہے ان لوگوں کا جو یہ کہتے ہیں کہ جب امام کی نماز فاسد ہو گئی تو مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہو گئی۔"

نیز یہ بھی لکھا ہے : واستدل البغوى على انه يصح صلوة المامومين اذا كان امامهم محدثا وعليه الا عادة یعنی "امام بغوی حسین بن مسعود محی السنۃ فقیہ محدث ؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب امام نے بغیر وضو نماز پڑھا دی تو مقتدیوں کی نماز صحیح ہو گئی اور امام پر اعادہ لازم ہے۔"

سنن دار قطنی ص۱۳۹ میں یہ حدیث ہے : عن البراء بن عازب رضى الله عنه قال صلّى رسول الله صلى الله عليه وسلم بقوم وليس هو على وضوء فتمت للقوم واعاد النبى صلى الله عليه وسلم۔ یعنی "حضرت براء بن عازب ؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر وضو لوگوں کو نماز پڑھا دی (بھول کر) تو لوگوں کی نماز تو پوری ہو گئی اور نبی اکرم ﷺ نے اپنی نماز کا اعادہ کر لیا۔"

یہ حدیث فعلی ہے' اب قولی ملاحظہ فرمایئے :

عن البراء بن عازب رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال ايما امام سهى فصلى بالقوم وهو جنب فقد تمت صلوتهم ثم يغتسل هو ثم ليعد صلوته وان صلى بغير وضوء فمثل ذلك۔ یعنی "حضرت براء بن عازب ؓ نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا کہ فرمایا نبی اکرم ﷺ نے کہ جس امام نے بھول کر اپنی قوم کو نماز پڑھا دی اور وہ جنبی تھا تو قوم کی نماز درست واقع ہوئی اور امام کو چاہیے کہ وہ غسل کر کے اپنی نماز کو لوٹائے' اسی طرح کسی نے بغیر وضو بھول کر نماز پڑھائی تو اس کا حکم بھی اسی کی مثل ہے۔"

یہ دو احادیث فعلی اور قولی ہمارے مدعا کو ثابت کرتی ہیں کہ امام کو اعادہ کرنا لازم ہے اور مقتدیوں کی نماز پوری ہو جاتی ہے۔ یہ دو روایتیں اگرچہ ضعیف ہیں مگر حضرت ابوہریرہ ؓ کی حدیث مذکورہ بالا سے ان کو تقویت حاصل ہے' ان احادیث کے علاوہ مندرجہ ذیل آثار

سے ان کی تائید پائی جاتی ہے۔

سنن دار قطنی کے ص ۳۶۹ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ہے کہ شرید ثقفی نے روایت کیا کہ ان عمر رضی اللہ عنہ صلی بالناس وھو جنب فاعاد ولم یامرھم ان یعیدوا۔ یعنی "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بھول کر نماز پڑھا دی اور وہ جنبی تھے' پس جب اس کا علم ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اپنی نماز لوٹائی اور لوگوں کو نماز لوٹانے کا حکم نہ دیا (کیونکہ نماز ان کی صحیح ہو گئی)۔

دوسری روایت محمد بن عمرو بن حارث سے مروی ہے: ان عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ صلی بالناس وھو جنب فلما اصبح نظر فی ثوبہ احتلاما فقال کبرت واللہ الا اراني اجنب ثم لا اعلم ثم اعاد ولم یامرھم ان یعیدوا۔ یعنی "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی درانحالیکہ وہ جنبی تھے' جب صبح روشن ہوئی تو آپ نے اپنے تہبند پر نظر کی تو احتلام کا نشان دیکھا' تب فرمایا اللہ کی قسم! میں بوڑھا ہو گیا ہوں' اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ احتلام ہو گیا ہے پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی نماز کا اعادہ کر لیا اور دیگر لوگوں کو (جنھوں نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی تھی) اعادہ کا حکم نہ دیا۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ مقتدیوں کی نماز اپنی اپنی ہے اور امام کی نماز اپنی ہے۔ مقتدیوں کی نماز امام کی نماز پر موقوف اور معلق نہیں ہے' خواہ اپنے میں سے کسی کو امام بنا کر نماز پڑھ لیں' خواہ سب الگ الگ پڑھ لیں ہر دو طرح جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کی اسناد کی بابت تعلیق مغنی میں یہ لکھا ہے: رواۃ ھذا الحدیث کلھم ثقات "کہ اس روایت کے راوی سب ثقہ ہیں۔" اور دار قطنی کے ص ۱۳۰ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اس شخص کے بارے میں یہ فرمایا کہ جس نے لوگوں کو بغیر وضو نماز پڑھائی تو امام اعادہ کرے' مقتدی نماز کا اعادہ نہ کریں۔ تعلیق مغنی میں ہے: سندہ صحیح جدا "کہ اس کی سند بالکل کھری ہے۔"

امام ابن مہدی نے سفیان سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ کسی کا یہ فتویٰ ہو کہ امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدیوں کی بھی فاسد ہو جاتی ہے' ان کو اپنی نماز لوٹانی چاہیے؟ امام سفیان نے کہا کہ کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا' سوائے حماد کے (جو ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاد ہیں) عبدالرحمن راوی نے بیان کیا کہ ھذا المجتمع علیہ الجنب یعید ولا یعیدون ما اعلم

فیه اختلافا "یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر علمائے سلف کا اجماع ہے یعنی امام نماز کا اعادہ کرے اور مقتدی نہ کریں۔ اس میں سلف سے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حماد اہل رائے ہے' وہ اس مسئلہ میں منفرد ہے اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد کی تقلید سے یہ مسئلہ اپنے مقلدین میں جاری کیا ہے جو حدیث اور سنت خلفاء اور اجماع ائمہ کے خلاف ہے۔ یہ لوگ اہل کوفہ اور اہل رائے ہیں' ان کو علم حدیث کم تھا' اس لیے اپنی قیاسی فقہ سے احادیث کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

سنن دار قطنی کے ص ۴۸۶ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: قال ایاکم واصحاب الرائی فانھم اعداء السنن اعیتھم الاحادیث ان یحفظوھا فقالوا بالرائی فضلوا او اضلوا یعنی "رائے قیاس والوں سے بچے رہو' یہ احادیث کے دشمن ہیں' یہ احادیث نبویہ یاد کرنے سے تو عاجز ہیں' رائے اور قیاس سے فتوے دیتے رہے' خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگو کو بھی گمراہ کیا۔"

مولانا نعمانی حنفی نے سیرۃ النعمان کے ص ۱۸۳ میں ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ہم جس کام میں مشغول رہتے ہیں وہ رائے وقیاس کا علم ہے لیکن ہم کسی کو مجبور نہیں کرتے کہ اس پر عمل کرے اور نہ کہتے ہیں کہ ہماری بات کی تقلید کرنی واجب ہے۔

تاریخ الخلفاء مصری کے ص ۱۰۵ میں ہے کہ دیگر علمائے اسلام نے تو حدیث وغیرہ علوم کو جمع کیا اور اس میں کتابیں تصنیف کیں' وصنف ابو حنیفۃ الفقہ والرای "اور امام ابوحنیفہ نے فقہ اور رائے کو تصنیف کیا۔" یہ حقیقت ہے کہ اہلحدیث مذہب کی کتابیں دیکھ لو جو درس گاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ بخاری' مسلم' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' مشکوٰۃ وغیرہ ہیں اور مدارس حنفیہ میں جو فقہ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان پر ان کا عمل ہے' وہ یہ ہیں: کیدانی' منیۃ المصلی' قدوری' کنز الدقائق' شرح وقایہ ہدایہ' نور الایضاح' درمختار اور بہشتی زیور وغیرہ۔ ان میں رائے قیاس بھرا ہوا ہے' اس لیے کتب فقہ کے مسائل قابل اعتبار نہیں ہیں' موجب گمراہی ہیں۔ ان میں جو یہ مسئلہ ہے کہ مقتدیوں کی نماز کی بناء امام کی نماز پر ہے' اگر وہ فاسد ہو گئی تو مقتدیوں کی بھی فاسد ہو جائے گی اور سب کو اعادہ کرنا واجب ہے' یہ سراسر باطل ہے۔

منتقی میں ہے: وقد صح عن عمر انہ صلی بالناس وھو جنب ولم یعلم فاعاد ولم

یعیدوا وکذلک عثمان وروی عن علی من قوله رضی اللّٰہ عنہم۔ یعنی "حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت میں آچکا ہے کہ انہوں نے بے علمی میں جنابت کی حالت میں لوگوں کو نماز پڑھا دی تو خود اپنی نماز کا اعادہ کر لیا اور لوگوں نے اعادہ نہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا قول اسی طرح مروی ہے۔"

علامہ امام شوکانی نیل الاوطار میں لکھتے ہیں : فیه ان الامام اذا کان مسیئا کان یدخل فی الصلوۃ مخطئا فهو الم ولا شئی علی المؤتمین من اسائته۔ یعنی "اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ جب امام نے نماز میں خطا کی تو وہی خطاوار ہے' مقتدیوں پر کوئی جرم نہیں ہے۔"

نیز مجمع الزوائد میں ہے : عن انس رضی اللّٰہ عنه ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم دخل فی صلٰوته وکبرنا معه فاشار الی القوم ان کما انتم فلم نزل قیاما حتی اتانا نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قد اغتسل وراسه یقطر ماء رواه الطبرانی فی الاوسط ورجاله رجال الصحیح (جلد۔۲' ص۔۶۹) یعنی "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں تکبیر کہہ کر داخل ہوئے' ہم نے بھی آپ کے ساتھ تکبیر کہی اور نماز میں داخل ہو گئے' پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کی طرف اشارہ کیا کہ تم اسی حال میں ٹھہرے رہو' چنانچہ ہم اسی طرح نماز میں کھڑے رہے' یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس غسل کر کے تشریف لے آئے اور پانی آپ کے سر سے ٹپک رہا تھا۔"

ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین جو کبار اولیاء اللہ میں شمار ہوتے تھے' نہ ذاتی غیب دان تھے اور نہ عطائی ورنہ نماز جیسی اہم چیز میں ایسی غلطیاں بھول کر نہ کرتے۔ جب نبی اور ولی غیب دان نہ ہوئے تو بعض مسلمانوں کے ظنی اولیاء' ذاتی یا عطائی غیب کیسے جانتے تھے' یہ فرقے گمراہ اور ضال ہوئی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو ان کی تقریروں اور تحریروں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور امام کی نماز فاسد ہو جائے تو وہ اعادہ کرے' مقتدیوں کی نماز پوری ہو جاتی ہے' وہ اعادہ نہ کریں۔

مجمع الزوائد ج۔۲' ص۔۶۸ میں ہے کہ ابو علی مصری تابعی بیان کرتے ہیں کہ ہم عقبہ بن عامر جہنی صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ہم پر نماز کا وقت آگیا' ہم نے ارادہ کیا کہ

عقبہ رضی اللہ عنہ آگے ہو کر ہم کو نماز پڑھائیں۔ چنانچہ ہم نے ان سے کہا تو انہوں نے یہ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے: من ام قوما فان اتم فله التمام ولهم التمام ولن لم یتم فلهم التمام وعلیه الاثم۔ (رواہ احمد والطبرانی' رجاله ثقات) یعنی "جو شخص کسی قوم کا امام ہوا' پس اگر اس نے نماز پوری پڑھائی تو سب کو پورا ثواب ملا اور نماز پوری ہو گئی اور اگر اس نے پوری نہ پڑھائی ناقص پڑھائی تو مقتدیوں کی نماز پوری ہو گئی اور نقصان کا بوجھ امام پر پڑے۔"

مقلدین کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ اگر امام کی نماز فاسد ہو گئی تو مقتدی کی بھی فاسد ہو جاتی ہے۔ بعض مقلدین یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ ابو جابر بیاضی نے سعید بن مسیب سے روایت کیا' سعید نے نبی کریم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: انه صلی بالناس وهو جنب واعاد واعادوا۔ یعنی "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت جنابت بھول کر نماز پڑھائی پھر یاد آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں نے نماز کا اعادہ کیا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ تابعی ہے صحابی نہیں ہے۔ پس جو روایت تابعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرے' وہ روایت مرسل حدیث قسم مردود میں داخل ہے۔ پس مقلدین کی یہ دلیل دو وجہ سے مردود ہے۔ ایک مرسل ہونے کے سبب سے' دوسرا ابو جابر بیاضی ضعیف ہے۔ فتح الربانی جلد۔۵' ص۔۲۰۰ میں امام نووی سے یہ نقل کیا ہے: حدیث ابو جابر البیاضی انه مرسل وضعیف بالاتفاق اهل الحدیث۔ یعنی بیاضی کی حدیث مرسل ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر آئمہ اہل حدیث کا اتفاق ہے کہ اس کی سند میں بیاضی راوی کذاب اور متروک ہے۔ دوسری دلیل عمر بن خالد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی روایت ہے' اس کو بھی ضعیف بتایا ہے کہ عمر بن خالد کذاب اور متروک ہے اور طحاوی نے یہ اثر پیش کیا ہے: عن همام بن الحارث ان عمر نسی القراۃ فی صلوۃ المغرب فاعاد بهم الصلوۃ۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مغرب کی نماز میں قرأت بھول گئے تو پھر لوگوں کے ساتھ نماز کا اعادہ کیا۔

میں کہتا ہوں اس کے معارض طحاوی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دوسرا قول نقل کیا ہے:

عن محمد بن ابراهیم ان عمر قال له رجل انی صلیت صلوۃ لم اقرا فیها شیئا فقال له عمر الیس قد اتممت الرکوع والسجود قال بلی قال تمت صلوتک۔ یعنی "ایک

شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ کہا کہ میں نے نماز پڑھی ہے تو اس میں کوئی چیز نہیں پڑھی' اس کا کیا حکم ہے؟ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سائل کو فرمایا کہ کیا تو نے رکوع سجود ٹھیک کیا ہے یا نہیں؟ اس سائل نے کہا ہاں تو فرمایا تمت صلوتک کہ تیری نماز پوری ہو گئی۔

پس پہلی روایت اور یہ روایت دونوں تعارض سے ساقط ہو گئیں اور ہماری حدیث واقعہ عمر و عثمان رضی اللہ عنہما اپنے مقام پر مضبوط ہیں۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن مبارک تابعی جن کو امام بخاری نے اعلم فی زمانہ فرمایا ہے' یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں : قال لیس فی الحدیث قوۃ لمن یقول اذا صلی الامام محدثا یعید اصحابہ والحدیث بان لا یعیدوا اثبت لمن اراد الاتقان بالحدیث۔ (الفتح الربانی شرح مسند احمد بحوالہ بیہقی جلد۵' ص۳۰۲) یعنی "اس حدیث میں کہ امام نے جب نماز بغیر وضو پڑھا دی تو اس کے ساتھی نماز کا اعادہ کریں' کوئی قوت نہیں ہے جس سے مسئلہ ثابت ہو سکے اور جس حدیث میں ہے کہ مقتدی لوگ نماز نہ لوٹائیں وہ بہت زیادہ ثابت اور قوی ہے' اس شخص کے لیے جو احادیث کے ساتھ معاملہ منصفانہ رکھتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ حکم شرعی یہ ہے کہ جب کوئی تمہارا نزاع یا اختلاف ہو تو اس مسئلہ متنازعہ کو اللہ و رسول کی طرف لوٹا کر فیصلہ کر لو' چنانچہ ہم احادیث نبویہ کے ساتھ اس مسئلہ کا فیصلہ درج کر چکے ہیں۔ مزید دلیل ان دلیلوں کو مضبوط کرنے والی اور پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے' مسند احمد جلد۵' ص۲۵۲ میں یہ حدیث ہے : عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استفتح الصلوۃ فکبر ثم او مالیھم ان مکانکم ثم دخل فخرج ورأسہ یقطر فصلی بھم فلما قضی الصلوۃ قال انما بشر وانی کنت جنبا (وفی روایۃ بطریق ثان ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل فی صلوۃ الفجر الحدیث)۔ یعنی "ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز شروع کر دی اور تکبیر کہہ کر نماز فجر میں داخل ہو گئے پھر ہماری طرف اشارہ کیا کہ تم اپنے مقام پر ٹھہرے رہو پھر اپنے گھر گئے اور غسل کر کے واپس آ گئے کہ آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا' پس لوگوں کو نماز پڑھا دی' جب نماز پوری کر لی تو فرمایا کہ میں بشر ہوں' جنبی ہو گیا تھا' غسل کرنا بھول گیا تھا پھر غسل کر کے آیا تھا۔"

مجمع الزوائد میں طبرانی کی صحیح روایت میں یہ الفاظ ہیں : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم دخل فی صلوته فکبرنا معه "کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں داخل ہوئے' تکبیر کہی اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ تکبیر کہہ دی۔" اس حدیث سے یہ صاف ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ جنبی تھے' غسل کرنا بھول گئے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں داخل ہو گئے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں داخل ہو گئے تھے پھر سب نے پوری کرلی اور کسی نے اعادہ نہ کیا۔

فتح الربانی میں اس حدیث پر لکھا ہے: واذا جاز جزء من الصلوٰۃ حتی یصح البناء علیہ جاز سائر اجزائھا یعنی جب نماز کی جزء بھول میں جائز رکھی گئی اور اس پر بنا کرنا صحیح ہوا تو سب اجزاء بھی جائز رکھے گئے۔ بھول میں اعادہ مقتدیوں پر نہ ہوا' پس یہی مسلک حق اور صحیح ہے جو حدیث سے ثابت ہے۔ والسلام

کتبہ عبدالقادر العارف الحصاری غفرلہ الباری

اہلحدیث لاہور جلد ۶' شمارہ ۲۸' مورخہ ۱۱ و ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۷۵ء

انتباہ! مخفی نہ رہے کہ اس مندرجہ بالا مضمون میں سائل اور مجیب شخص واحد ہے۔ یہ صورت نفس مسئلہ پیش آمدہ کی وضاحت کے لیے اختیار کی گئی ہے' اس پر تنقید کرنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔

امام سری نماز میں سجدہ والی سورۃ پڑھے تو کیا وہ سجدہ کر سکتا ہے اور کیا مقتدی بھی سجدہ کریں؟

سوال: کیا حکم ہے شرع محمدی کا دریں مسئلہ کہ سری نماز میں امام کوئی سورہ سجدہ کی پڑھے تو کیا وہ سجدہ کر سکتا ہے؟ اگر امام سجدہ کرے تو کیا مقتدی بھی اس کے ساتھ سجدہ کریں؟ شرعی دلیل سے جواب دیا جائے کیونکہ ہمارا امام گاہے گاہے ایسا کرتا ہے۔

(السائل ماسٹر علی محمد صاحب)

الجواب واللہ الموافق للصواب' الحمد للہ رب العالمین' اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔

واضح ہو کہ آپ کا امام جو عمل کرتا ہے وہ درست ہے' کیونکہ عموم ادلہ اس کے جواز پر

والی ہیں اور سری نماز میں کوئی ممانعت وارد نہیں ہوئی لیکن تاہم خاص سری نماز میں سورہ سجدہ پڑھنے سے سجدہ کرنا بھی ثابت ہے۔ چنانچہ مشکوۃ جلد اول' باب سجود القرآن کی فصل ثانی میں یہ حدیث ہے : عن ابن عمر ان النبي صلى الله عليه وسلم سجد في صلوة الظهر ثم قام فركع فرأوا انه قرأ تنزيل السجدة (رواه ابوداؤد) یعنی "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ظہر میں سجدہ تلاوت کیا پھر کھڑے ہو گئے اور رکوع کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے معلوم کیا کہ آنجناب نے سورہ سجدہ الم تنزیل السجدہ پڑھی تھی۔"

ظاہراس حدیث کا دلالت کرتا ہے کہ سری نماز میں سورہ سجدہ والی پڑھے اور سجدہ کرے تو یہ جائز ہے۔ امام شوکانی عالم ربانی اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں : والحديث يدل على مشروعية سجود التلاوة في الصلوة السرية۔ یعنی "یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ سری نماز میں سجدہ تلاوت کرنا جائز ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ بظاہر یہ معلوم ہوا کہ سورہ سجدہ آیت سجدہ تک پڑھی پھر سجدہ کر کے کھڑے ہو گئے اور سجدہ کے بعد کھڑے ہو کر پھر سورہ نہ پڑھی' یہ جائز ہے۔ امام جب سجدہ کرے تو مقتدی لوگوں کو بھی سجدہ کرنا چاہیے' کیونکہ حدیث میں ہے : انما جعل الامام ليوتم به۔ یعنی "امام نماز میں اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کرے۔" اور دوسری حدیث میں یہ ہے کہ فاصنعوا كما صنع الامام۔ "کہ امام جس طرح کرے' مقتدی لوگ اسی طرح کریں۔"

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث جلد ۲۹' شمارہ ۳۲' مورخہ

امام مسجد کیسا ہونا چاہیے؟

امامت دو قسم کی ہے' کبریٰ اور صغریٰ۔ کبریٰ تو وہ ہے جو جملہ اہل اسلام کے روساء اور اکابر کے انتخاب سے قائم ہوتی ہے اور تمام ملک کے مسلمانوں کا انتظام کرنے اور ان میں قوانین شرعیہ نافذ کرنے کی غرض سے قائم کی جاتی ہے' یہ امامت عامہ ہوتی ہے جس میں

امام کو اتنا اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماتحت مسلمانوں میں حدود واحکام شرعیہ نافذ کرنے کا کلی اختیار رکھتا ہے۔ اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بہ نیابت رسول اپنی رعایا سے بیعت اور عہد اطاعت لے کر احکام شرعیہ کی تنفیذ اور حدود الٰہی کا اجراء کرے۔ اگر ایسا نہ کرے تو وہ ملکی اور دنیوی بادشاہ ہو سکتا ہے' امام شرعی جس کو خلیفہ اسلام کہتے ہیں' نہیں کہلا سکتا ہے۔

چنانچہ آج کل اسلامی ممالک کے بادشاہ اور نواب تو بہت ہیں لیکن خلیفہ اسلام مفقود ہے۔ ہاں کہا جاتا ہے کہ نجد وحجاز کے بادشاہ حدود الٰہی کا اجراء کرتے اور عدالتوں کے فیصلے آئین شرع محمدی کے مطابق کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع ایسا ہے تو وہ خلیفہ اسلام کہلانے کے حقدار ہیں۔ پھر تمام مسلمانوں پر ان کی بیعت کرنا فرض ہے۔

دوسری امامت صغریٰ ہے جس کو شہر یا گاؤں یا محلہ کے خاص لوگ اہل اسلام افضل العبادات نماز' روزہ وغیرہ ارکان اسلام کے بجالانے کی غرض سے اپنے مرکزی مقام "مسجد کے لیے کسی لائق شخص کا انتخاب کر کے قائم کرتے ہیں۔ یہ امامت خاصہ ہوتی ہے جس میں امام کو اپنی قوم کے مرکزی مقام کی دینی عبادت کی پیشوائی حاصل ہوتی ہے اور وہ ان کا اس میں ضامن ہوتا ہے اور اپنے مقتدیوں کا اللہ تعالیٰ کے سامنے نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ عہدہ جلیلہ دینے کے لیے بھی کسی ایسے شخص کا انتخاب کرنا ضروری ہے جو قوم میں سب سے افضل' اقراء اور اعلم ہو' نہ تمام علماء سے زیادہ علم رکھنے والا شرط ہے اور نہ اس کا ایسا بے گناہ ہونا شرط ہے کہ تمام متقیوں سے بڑھ کر اتقی ہو' کیونکہ اس کو صرف ایک مسجد کی امامت سپرد کرنی ہے نہ کہ خلافت عامہ یا امامت کبریٰ بلکہ خلافت کبریٰ کے لیے بھی عصمت شرط نہیں ہے۔

ہاں نبوت اور رسالت میں شرط ہے جس کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ وہی ہر شخص کے ظاہر وباطن کو خوب جانتا ہے کہ اس کی صفت عالم الغیب والشہادت ہے۔ دیگر کسی انسان کو یہ صفت حاصل نہیں ہے۔ حتی الوسع قوم کو امامت کے انتخاب میں شرعی دستور اور تجربہ اور عقلی معیار سے کام لے کر اپنے مرکزی مقام مسجد کے لیے امام بنانا چاہیے۔ اس قوم کے تمام افراد سے اس کو قرآن زیادہ یاد ہو' قوم سے زیادہ وہ احکام شرعیہ اور امور مسنونہ کو جانتا ہو اور اس میں مکارم اخلاق' صفات محمودہ' خصائل پسندیدہ اور خدا

تر ی کے اوصاف قوم کے افراد سے زیادہ پائے جاتے ہوں تو وہ اس قوم کی پیشوائی کرنے کا حقدار ہے۔

حدیث اجعلوا ائمتکم خیارکم کا یہی مطلب ہے۔ جب مسلم قوم کسی ایسے شخص کا انتخاب کرلے تو اب اس کو اپنا امیر اور مقامی حاکم سمجھے کہ حدیث میں آیا ہے: اذا امکم فهو امیرکم (او کما قال) (رواہ البزار) یعنی "جو شخص تمہاری امامت کراتا ہے' وہی تمہارا امیر ہے۔" جب امام مسجد اپنے مقتدیوں کا امیر قرار پایا تو ان کی اصلاح اس پر واجب ہوئی اور مقتدیوں پر امام کی اطاعت نماز میں بوجہ امام ہونے کے اور نماز سے باہر بوجہ امیر ہونے کے واجب ہوئی اور جس آیت سے اولی الامر کی اطاعت واجب ثابت ہوتی ہے' اسی سے امام مسجد کی اطاعت بھی واجب ثابت ہے۔

تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں اولی الامر کی مراد میں اختلاف بیان کرتے ہوئے اس کو عام رکھا ہے اور عینی نے یہ نقل کرکے اس کی تصدیق کی ہے۔ عینی فرماتے ہیں: عام فی کل شئی من ولی امر شئی وهو الصحیح۔ یعنی "یہ حکم اور لفظ عام ہے' ہر اس شخص کو شامل ہے جو کسی چیز کا متولی بنایا جائے' یہی مراد صحیح ہے۔"

شارح ترمذی علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قلت الصحیح عندی هو ما صححه العینی ومال الیه البخاری من ان المراد باولی الامر کل من ولی امر شئی۔ ومن الظاهر ان ذالامر لا یکون الا من ولی امر شئی۔ یعنی "جو مراد عینی نے صحیح کی ہے میرے نزدیک بھی وہی صحیح ہے اور اسی طرف امام بخاری کا رجحان ہے کہ اولی الامر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی چیز کے کام کا والی بنایا گیا ہو اور متبادر الی الذہن یہی بات ہے کہ صاحب امر وہی ہوتا ہے جو اس کام کا ولی ہو۔"

میں کہتا ہوں کہ شرح معانی الآثار للطحاوی جلد ۱' ص ۳۳۵ میں ایک حدیث مرفوع وارد ہے جس میں یہ ارشاد نبوی ہے کہ آپ نے صحابہ سے خطاب فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کیوں نہیں' ہم سب یہ گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے میرے رسول کی اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہاں

ہم سب یہ گواہی دیتے ہیں کہ جس نے آپ کی اطاعت کی اس نے عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ پھر آپ نے یہ فرمایا : ولن من طاعتی ان تطیعوا ائمتکم فان صلوا قعودا فصلوا قعودا اجمعین۔ یعنی "میری طاعت میں یہ طاعت شمار ہے کہ تم اپنے اماموں کی اطاعت کرو کہ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔" (اگرچہ قیام کی قدرت ہو)

دیگر یہ کہ حدیث میں آیا ہے : ان امر علیکم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا واطیعوا۔ (مسلم) یعنی "اگر تم پر کوئی غلام ناک کان کٹا بھی امیر بنایا جائے اور وہ تم کو کتاب اللہ کی تابعداری کی طرف کھینچے تو اس کی بات سننا اور اطاعت کرنا۔" عہد نبوی اور عہد صحابہ میں یہ تعامل رہا ہے کہ جہاں کوئی امام نماز پڑھا رہا ہے' وہی اس جماعت کا امیر رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم بھی جہاں رہے ہیں' وہاں ہی خود امام نماز رہے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ امام اپنے مقتدیوں کا امیر ہوتا ہے اور مسجد اس کی امارت کا مرکز ہوتا ہے اور تمام مقتدیوں پر اس کی تعظیم اور اطاعت واجب ہوتی ہے۔

حضرت ابو ذر صحابی رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر اور عالم باعمل تھے' ان کو بعض وجوہ کی بنا پر ربذہ میں رہنے کا حکم دیا گیا' وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک غلام امیر تھا' وہی اس گاؤں کا امام تھا۔ جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ وہاں اقامت پذیر ہوئے تو انہی کی ماتحتی میں جمعہ جماعت ادا کرتے رہے اور ان کی اطاعت بجالاتے رہے۔

محلی ابن حزم میں یہ لکھا ہے : صح انه کان لعثمان عبد اسود امیر له علی الربذة یصلی خلفه ابوذر وعشرة من الصحابة الجمعة وغیرها (بحوالہ کبیری شرح منیہ ص۔۵۱۰) یعنی "صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک غلام سیاہ فام ربذہ میں حکومت کی طرف سے امیر تھا' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور دیگر دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس غلام امام کے پیچھے جمعہ وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔"

دارقطنی جلد ۱' ص۔۱۶۶ میں ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ عادل نے عدی بن عدی کندی کو لکھ بھیجا کہ ہر ایسے گاؤں کو دیکھو جہاں کے لوگ کسی جگہ مستقل طور پر رہائش رکھتے ہیں اور خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے نہ ہوں' اس گاؤں والوں پر ایک امیر مقرر کر دو جو ان کو جمعہ جماعت پڑھاتا رہے۔

ایسے کئی دلائل ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام المسجد اپنے مقتدیوں کا امیر ہوتا ہے' اس لیے اس کی اجازت کے بغیر اس کی زیر امامت مسجد میں کوئی دوسرا شخص جماعت اور امامت نہیں کرا سکتا تھا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: لا یوم الرجل الرجل فی سلطانہ یعنی کوئی شخص کسی شخص کی حکومت میں امامت نہ کرائے بلکہ اذن دینے پر بھی بہتر یہ ہے کہ دوسرا امامت نہ کرائے۔ امام القوم کو امامت کرانا اور نماز پڑھانا افضل ہے۔

تلخیص الجبیر ص ۱۲۵ میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے گفتگو کرتے رہے' اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ جب نماز کے لیے تیار ہوئے اور اقامت ہو گئی تو ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے تاکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ امامت کرائیں' نماز پڑھائیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لقد علمت ان من السنۃ ان یتقدم صاحب البیت۔ (رواہ الطبرانی) یعنی "آپ یہ مسئلہ جانتے ہیں کہ گھر والا امامت کرائے تو یہ سنت ہے۔"

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: رواہ الاثرم وقال لا یعارض ھذا الصلوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی بیت انس لانہ کان الامام حیث کان۔ اس اثر کو امام اثرم نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کے ساتھ اس حدیث کا معارضہ نہ کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے تو آپ نے ان کو نماز پڑھائی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو جہاں جائیں آپ تمام لوگوں کے امام ہیں' لیکن دوسرا شخص یہ درجہ نہیں رکھتا۔

چنانچہ مشکوۃ میں ابو عطیہ عقیلی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ہماری مسجد میں ہمارے پاس تشریف لایا کرتے تھے اور گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن نماز کا وقت آگیا' ابو عطیہ نے کہا کہ تقدم فصل آپ آگے تشریف لے جائیے اور ہم کو نماز پڑھائیے۔ مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قدموا رجلا منکم یصلی بکم۔ یعنی "آپ لوگ اپنے میں سے کسی شخص کو آگے کریں' وہ تم کو نماز پڑھائے۔" میں تم کو نماز کیوں نہیں پڑھاتا؟ اس بارہ میں تم کو میں حدیث سناتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے: من زار قوما فلا یومھم ولیومھم رجل منھم۔ یعنی "جو شخص کسی قوم کی ملاقات اور زیارت کے لیے جائے تو ان کی امامت نہ کرائے اور یہ چاہیے

کہ کوئی آدمی ان میں سے امامت کرائے۔"

اس حدیث پر مرعاۃ المفاتیح میں لکھا ہے: والحدیث دلیل علی ان المزور احق بالامامۃ من الزائر وان کان اقرا واعلم من المزور۔ یعنی "یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ مزور امامت کا زائر سے زیادہ حق رکھتا ہے اگرچہ زائر زیادہ قاری قرآن اور عالم بالشریعۃ ہو۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اگر امام اور لوگ اذن دے دیں تو اس کو امامت کرانی روا ہے اور امام اسحاق نے اس بارہ میں سختی کی ہے' فرمایا ہے کہ اگرچہ لوگ اذن دیں تب بھی جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کو لوگ اذن دے رہے تھے' انہوں نے تب بھی قبول نہ کیا اور امامت نہ کرائی۔ چنانچہ مرعاۃ المفاتیح میں ہے: وامتنع مالک من الامامۃ مع وجود الاذن منہم عملا بظاہر الحدیث۔ یعنی "مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے امامت کرانے سے ہٹ گئے حالانکہ ان کو اذن مل چکا تھا۔"

مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث عام ہے' گھر ہو یا مسجد۔ چنانچہ ترمذی میں ہے: وکذالک فی المسجد اذا زارہم یقول لیصل بہم رجل منہم۔ یعنی "گھر کی طرح مسجد کا حکم ہے' صاف یہ کہہ دے کہ تم میں سے جو شخص امام ہے' وہ ان کو نماز پڑھائے۔

الرحمۃ المہداۃ فصل رابع مشکوۃ ص۔۵۱ میں ہے' ریان راسی بنی راسب کے اشیاخ سے روایت کرتے ہیں کہ ابو طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما دونوں بنی راسب کی بعض مسجدوں میں گئے تاکہ وہاں نماز پڑھیں' ہم نے کہا کہ آپ صحابہ رسول میں سے ہیں' آپ میں سے کوئی صاحب ہم کو نماز پڑھائے تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہارا امام کہاں ہے؟ فجاء الامام فصلی بہم "پس امام آگیا اور اس نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔"

ان روایات سے صاف ظاہر ہے کہ امام اپنے مرکز کا امیر اور کار مختار ہوتا ہے' اس کے ہوتے ہوئے کسی عالم فاضل کو امامت کرانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب امام تمام نمازیوں کا امیر اور ان کی طرف سے عدالت الٰہی میں نمائندہ ہے تو نمازیوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی صالح' عامل' عالم' قاری قرآن کو امام بنائیں جو شرک و کفر و بدعت کو مٹائے رسومات مروجہ کو ہٹائے' قرآن مجید اور ادعیہ مسنونہ کی تعلیم دے' اخلاق حسنہ سکھائے' فرقہ

بندی سے زجر و توبیخ کرے' جماعت کو منظم کرے اور عشر و زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے بیت المال بنائے۔ جماعت کے غرباء مساکین' یتامیٰ' بیوگان کی خبر گیری کرے۔ دنیا داروں' سرکشوں' متکبروں اور قوم کے چودھریوں سے مرعوب نہ ہو بلکہ پوری حق گوئی سے کام لے۔ اوباش' بدمعاش اور شریر لوگ تمسخر اور استہزاء مذاق اڑائیں تو کچھ پرواہ نہ کرے۔ حرام اور ناجائز نکاح نہ پڑھے اور کسی کافر' مشرک اور منافق کا جنازہ نہ پڑھے۔ فاسقوں اور گناہ کے عادیوں کی دعوت کو ٹھکرا دے' نماز وقت پر سنت کے مطابق پڑھائے' جس میں بیماروں اور حاجت مندوں کا دھیان کرے' مسجد آباد رکھے' جمعہ اور عید کا خطبہ قوم کی زبان میں پڑھے وغیرہ' امام قوم کے لیے یہ امور ضروری ہیں۔

پاکستان میں آکر۔ بفضلہ تعالیٰ بندہ نے جہاں کہیں امامت کی ہے اسی حیثیت اور اسی طریق سے کی ہے اور کر رہا ہوں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

میرے احباب اہل علم مجھے متشدد کہتے ہیں اور بد اخلاق قرار دیتے ہیں حالانکہ ان کی امامتوں کا معاملہ میرے برعکس ہے۔ یہ کمترین خلائق اپنے خیال اور مشاہدے میں ایسے حضرات کی اکثریت کو گورو نانک کے مسلک پر صلح کل"

حاشا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

ہر چکڑے کے بیل' ہر منڈیر کے کوے اور ہر جیب کے رومال تصور کرتا ہے کہ وہ ہر ہادی و مہدی' ضال و مضل سے یکساں ہیں۔ نہ وہ کسی شرک کو مٹا سکتے ہیں اور نہ کسی بدعت کو مٹا کر وہاں سنت زندہ کر سکتے ہیں۔ ایسے ملا مولوی مجاہد نہیں ہیں بلکہ نہایت کمزور طبیعت جو جہلاء و اشرار اور عادی بدکاروں کے سامنے حوا بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے والے ہیں۔ نکاح نہ ہو تو وہ پڑھ دیں' بے نماز کافر مرے تو اس کا جنازہ کر دیں۔ موحد اہلحدیث لوگوں کی لڑکیوں کے نکاح اہل بدعت مشرکوں سے پڑھ پڑھا دیں' فاسقوں فاجروں کی دعوتوں کو قبول کر لیں' حقہ بازوں کی مجلسوں کو زینت بخشیں' طوطے کی طرح آیات اور احادیث بیشمار پڑھیں لیکن تنفیذ و اجراء احکام شریعہ نہ کریں' گناہ گاروں کو زجر و توبیخ تو کجا ان سے خندہ پیشانی سے ملیں' احقاق حق و ابطال باطل کرنے کو مصلحت کے خلاف سمجھیں۔ مداہنت' چاپلوسی' خوشامد' لحاظ داری' کتمان حق کو اخلاق حسنہ تصور کریں۔ ایسے لوگ رسمی امام تو کہلا سکتے ہیں' شرعی امام نہیں ہو

سکتے۔ ہاں دنیا داروں کے پیشوا ہو کر دنیا کما رہے ہیں ~

سرکشوں پر کس طرح ہو نصیحت کارگر
رنگ عصیاں سے دل ان کا سخت پتھر ہو گیا
کس طرح پاویں خدا کی راہ بیچارے عوام
مولوی درویش ہر اک طالب زر ہو گیا

پنجاب کے اکثر دیہات میں تو اماموں کا بہت برا حال ہے کہ ان کی امامت بطور پیشہ و معاش ہے اور ان کی آمدنی رسمی طور پر کمین لوگوں کی شکل ہے۔ بچہ کی ولادت پر ایک روپیہ' سوا سیر آٹا' پاؤ گڑ۔ جنازہ پر روپیہ اسقاط' فطرانہ عید الفطر' عید قربانی کی کھالیں' جمعرات کی روٹیاں' شبرات کو حلوہ' محرم کو چاول' شربت' حلوہ وغیرہ۔ منگنی پر ایک روپیہ' نکاح خوانی پر دو روپیہ' فصلانہ مقرر شدہ' عیدین کی نمازوں کے بعد نقدی خدمت' رسمی دعوتیں' تیجا' ساتا' چہلم' جمعرات کا ختم' گیارہویں کی کھیر اور دودھ۔

جب مسجد کے اماموں کا عوام کے ہاتھوں رزق مقرر ہو گیا تو وہ تبلیغ حق' اصلاح مفسدین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کس طرح کر سکتے ہیں اور حرام نکاح اور ناجائز جنازہ کرنے سے کس طرح باز آسکتے ہیں۔ جس کسی کے خلاف حکم نافذ کیا تو اسی کی طرف سے رزق بند اور امامت کا خطرہ لاحق ہو جائے گا جس کو حق مسئلہ بتا کر ذرا ڈانٹا' وہی ناراض ہو جائے گا اس لیے فلاں مسجد بہت جگہ بمصداق الساکت عن الحق شیطان اخرس "گونگے شیطان بن کر بیٹھے ہیں' کچھ اظہار حق نہیں کرتے" بلکہ خاموش ہو کر لوگوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ بعض دنیا داروں کے دلال بن کر صرف کلمہ سے ان کا منہ صاف کر رہے ہیں کہ کلمہ کے فضائل بیان کر کے یہ کہتے ہیں کہ کلمہ گو سب جنتی ہیں اور یہ حدیث سناتے ہیں کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ "جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ زبان سے کہہ دیا وہ جنتی ہو گیا" کوئی زیادہ صاحب علم ہوا تو اس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث سنا دی: وان زنی وان سرق۔ یعنی "کلمہ گو جنتی ہے اگرچہ زانی اور چور ہو۔"

تو بس یہ حدیث سن کر چودھری صاحبان جو اکثر بے نماز' زانی اور چور وغیرہ ہوتے ہیں' خوش ہو جاتے ہیں' جس سے امام صاحب کی امامت مضبوط ہو جاتی ہے اور اس کا بڑا قدر ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہاں کوئی عالم تبلیغ حق کرنے جائے اور ان کو ارکان اسلام کے ترک کرنے

کی وعید اور تارکان کو تہدید سنائے تو اس واعظ کو متشدد اور اس کی تقریر کو شدید کہنے لگیں گے۔

اور اگر کوئی عالم ان کی دلجوئی کے لیے رحمت کی احادیث سنائے اور یہ کہے کہ درود شریف پڑھنے سے سب گناہ بخشے جاتے ہیں اور آنحضرت ﷺ قیامت کے دن درود پڑھنے والوں کی شفاعت کرائیں گے اور گنہگاروں کو حضور ﷺ کی شفاعت کا پختہ یقین رکھنا چاہیے۔ نمازیں پڑھنے والے' روزہ رکھنے والے' حج زکوٰۃ ادا کرنے والے جو اعمال صالحہ کی دوسروں کو دعوت دیتے پھرتے ہیں' یہ اپنے عملوں پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہیں' ہم کو صرف اللہ کی رحمت اور رحمۃ للعالمین کافی ہیں جو ہم گنہگاروں کی شفاعت کرائیں گے۔ ایسے عالم واعظ کی بڑی قدر ہوتی ہے اور اس کو بڑا خلیق' شفیق اور حلیم اور اخلاق حسنہ کا واحد مالک ٹھہرایا جاتا ہے کیونکہ عوام اہل ہوئی ہیں اور تبع شہوات ہیں۔ جو ملا' مولوی' عالم ان کی خواہشات کے مطابق وعظ کرے' مسئلہ بتائے اور ان کی تعظیم بجالائے اور ان کو ان کے برے کردار پر طعن' ملامت اور تذکیر نہ کرے' وہ ان کی نظروں میں بڑا حلیم اور بلند اخلاق متصور ہو کر مقبول ہوتا ہے اور جو ان کو وعظ و تذکیر کر کے ان کو کبیرہ گناہوں سے روکے اور ارکان اسلام کی پابندی کی تاکید کرے اور ترک پر وعید شدید سنائے اور اتباع ہوئی پر تہدید کرے تو اس سے نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مولوی سخت ہے' بے رحم ہے' بد اخلاق ہے جو مسلمانوں کو کافر کہتا ہے۔

مثلاً ایک عالم بے نماز کو کافر اور مشرک کہتا ہے کیونکہ ترک نماز کے بارہ میں احادیث صحیحہ میں کفر شرک کا اطلاق آیا ہے اور صاف یہ الفاظ ہیں: من ترکھا فقد کفر' من ترکھا فقد اشرک۔ جس نے نماز ترک کر دی اس نے کفر کیا اور شرک کیا۔ اور بے نماز کے کفر پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے اور یہ کفر بواح ہے جس سے بے نماز ملت اسلامیہ سے خارج ہے اور فرعون وقارون وغیرہ کفار کا ہمراہی ہے جس کا جنازہ جائز نہیں اور مسلمان پابند نماز سے اس کا نکاح حرام ہے۔ تو بس اس مسئلہ سے تمام تارکین صلوٰۃ اس عالم مبلغ کے خلاف ہو جائیں گے اور اس کو متشدد کہہ کر اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے اور اس کی کچھ خدمت نہ کریں گے اور اگر امام ہوا تو اس کو امامت سے ہٹانے کی کوشش کریں گے اور زمانہ ساز علماء سے فتویٰ طلب کریں گے اور سوالات یوں کریں گے کہ جس امام پر

لوگ ناراض ہوں' اس کی امامت درست ہے یا نہیں؟ اور جو امام بد اخلاق ہو اور مسلمانوں کو کافر کہے اس کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟ تو وہ علماء تحقیق سے کام نہیں لیں گے کہ وہ خود بھی بے نمازوں سے برتاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ وہ یہ فتویٰ دیں گے کہ ایسے امام کو امامت سے معزول کر دینا چاہیے' کیونکہ وہ بد اخلاق ہے اور مسلمانوں کو کافر کہتا ہے اور قوم اس سے ناراض ہے اور حدیث میں ہے کہ جس پر لوگ ناراض ہوں اس کی نماز نہیں ہوتی۔

ان مولویوں کے ایسے غلط فتویٰ سے عوام جہلاء ناجائز فائدہ اٹھا کر اس عالم حق گو کا مقابلہ کرتے ہیں' حالانکہ فتویٰ اس طرح تمام شقوں کی صراحت سے ہونا چاہیے کہ اگر وہ مولوی ایسے لوگوں کو کافر کہتا ہے جن کو قرآن وحدیث میں کافر نہیں کہا گیا اور صحابہ ومحدثین نے کافر نہیں کہا پھر تو اس کا تشدد ہے۔ علماء کے پاس بلا کر اس کو اس تشدد سے روکنا چاہیے اور اگر وہ ایسے لوگوں کو کافر کہتا ہے جن کو احادیث میں اور اقوال صحابہ میں کافر کہا گیا ہے' جیسے تارک نماز ہیں تو پھر مسئلہ صحیح ہے' اس کا قصور نہیں ہے۔ اسی طرح جو لوگ ناراض ہیں' اگر وہ اس عالم سے اس لیے ناراض ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف مسائل بیان کرتا ہے اور حق گو ہے تو پھر ان کی ناراضگی قابل اعتبار نہیں بلکہ ان کے حق میں موجب کفر ہے کہ وہ حق بات اور مسئلہ شرعی کے منکر ہیں اور اگر اس لیے ناراض ہیں کہ ان کو ذاتی طور پر برا بھلا کہتا ہے اور اس میں کئی عیوب ہیں جن کی رُو سے مسلمان لوگ اس کو مجرم قرار دیتے ہیں اور ناراض ہیں تو پھر اس کی نماز نہیں ہوتی اور اس کو امامت سے برطرف کر دینا چاہیے۔ اس طرح تفصیل کرنے سے عوام کالانعام دھوکہ نہیں کھا سکتے اور نہ ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسا کوئی امام نہیں جس کے بارہ میں کوئی شکایت نہ ہو کیونکہ لوگوں کی طبائع مختلف' ایمانی حالت مختلف' مالی حالات مختلف' کوئی پرہیزگار عالم کو پسند کرتا ہے' کوئی خوش آواز واعظ کو' کوئی قاری کو' کوئی حافظ قرآن کو' کوئی نابینا کو' کوئی بصیر اور بینا کو' کوئی مجرد کو' کوئی شادی شدہ کو' کوئی سید یا قریشی کو' کوئی پٹھان اور راجپوت کو' کوئی عالم بلاغت کو' کوئی شاعر کو' الغرض لوگوں کے نظریئے مختلف ہیں۔ بعض لوگ سخت مزاج' حق گو کو پسند کرتے ہیں جو لوگوں سے مرعوب نہ ہو اور اہل عصیان کو تہدید کر سکے اور اپنا اثر ڈال کر مسئلہ منوا سکے اور مالی پرواہ نہ رکھے اور مردہ مسائل کو زندہ کر دے' بعض نرم مزاج مصلحتی مولوی کو

پسند کرتے ہیں "جو چلے اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" اور سب کو خوش رکھ سکے
پھر یہ بھی دیہات میں لوگوں کا نظریہ ہے کہ جو گناہ عام لوگوں میں رائج ہیں' ان کا امام ارتکاب کرے تو اس کو برا نہیں جانتے۔ مثلاً عام لوگ دیہات میں عورتوں کو پردہ نہیں کراتے تو ان کا امام بھی اپنی عورت کو پردہ نہ کرائے تو کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا حالانکہ وہ دیوث ہے۔ اسی طرح بعض امام مسجد فصل کاٹنے میں مصروف دیکھے گئے اور انھوں نے نماز چھوڑ دی تو یہ کوئی جرم نہ سمجھا گیا کہ وہاں بے نماز عام تھے' اسی طرح جماعت چھوڑ دے' جمعہ ترک کر دے' حقہ نوشی کرے' ڈھون کھاتا ہو' جھوٹ بولے' غیبت کرے اور سنے' قرآن غلط پڑھے' بنک سے سودی روپے لائے وغیرہ تو دیہات کے اکثر لوگ ایسے اماموں سے نفرت نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ میاں! جیسے ہم ہیں ویسا ہمارا امام ہے۔ بڑے عالم اور متقی کا کیا کرنا ہے' وہ ہم کو تنگ کرے گا اور کہے گا یہ کام کرو' وہ کام کرو' یہ نہ کرو' وہ نہ کرو۔ یہ غریب ملا اچھا ہے۔ لیکن اگر اسی امام پر کسی عورت یا حیوان سے بد فعلی کا الزام لگ جائے تو پھر فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں' اس کو خود ہی معطل کر دیں گے اور جہاں کسی عالم امام حق گو سے ذرا قصور ہو تو اس کو بدنام کرنا شروع کریں گے اور فتویٰ لائیں گے کہ اس کو معزول کرنا چاہیے۔

میں نے ایک امام کو دیکھا کہ وہ اپنے مقتدیوں کی بھینس دم کرواتا ہے اور ختم وغیرہ پڑھ دیتا ہے۔ نماز اور جماعت کی اس کو کچھ پرواہ نہیں ہے اور ایک امام پر صرف اس لیے لوگ ناراض ہو گئے کہ اس نے ایک جنازہ پر سے بے نمازوں کو صف سے نکال دیا کہ تم فرض عین کے تارک ہو اور جنازہ میں لوگوں کو دکھانے اور لحاظ رکھنے کے لیے شامل ہو جاتے ہو اور پھر نہ دعا جانتے ہو' نہ درود پڑھتے ہو۔ اس بات سے وہ ناراض ہو کر امام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے لگے' حالانکہ اس امام نے شرم دلانے اور عبرت دلانے کے لیے ٹھیک کیا۔

اسی طرح قیاس کر لیا جائے کہ اکثر لوگ ذاتی طور پر اماموں سے رسوخ رکھنے والے اماموں کے عیوب کو نظر انداز کر کے امامت پر بحال رکھتے ہیں اور علماء اہل حق میں ان کی حق گوئی کی وجہ سے کینہ بغض رکھ کر ذرا عیب دیکھ لیں تو ان کے حق میں فتوے تلاش کرتے ہیں اور پھر مفتیان دین اپنے عیوب اور اپنے معاصرین علماء کے معاملات پر غور و فکر نہیں کرتے اور نہ وہاں کے ماحول کو سوچتے ہیں۔ بس یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ فلاں امام کو

معزول کر دینا چاہیے' کیونکہ اس میں فلاں فلاں عیب ہیں۔
آنحضرت ﷺ نے ایک امام کو قبلہ کی طرف تھوکنے پر امامت سے معزول کر دیا تھا لیکن کیا اس حدیث کے پیش نظر ہر امام' مولوی' عالم کی امامت کی سکریننگ اور اہلیت اور تحقیق بھی ہونی چاہیے۔ بعض ایسے امام بھی ہیں جو نزلہ کا عذر کر کے افیون کھاتے ہیں' یہ حرام ہے۔ پھر بعض غیبت کرتے اور سنتے ہیں' یہ کبیرہ گناہ اشد من الزنا ہے۔ بعض جعلی مدرسے کے نام پر چندے لے کر کھا رہے ہیں' یہ حرام ہے۔ بعض وعدہ خلافی کے عادی ہیں' یہ نفاق کا ایک حصہ ہے۔ بعض نے اپنی غرض اور طمع میں آ کر مقتدیوں میں پھوٹ ڈال دی جس سے دو فریق ہو گئے۔ حدیث میں ہے: من فرق فلیس منا "کہ جو تفریق ڈال دے وہ میری جماعت سے خارج ہے"
بعض باوجود وسعت مال کے حج نہیں کرتے۔ حضرت عمر ﷜ نے ایسے لوگوں پر جزیہ لگانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ بعض بے نماز کافروں کے جنازے پڑھتے ہیں' حالانکہ مشرکین کے حق میں بخشش اور کافر کے حق میں دعا جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ بعض داڑھیوں کو سیاہ خضاب سے رنگے ہوتے ہیں جو حرام ہے۔ ایسے مولوی قیامت کو جنت کی خوشبو نہ پائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ بعض داڑھی منڈاتے اور کٹاتے ہیں جو حرام ہے۔ بعض کتمان حق کیے بیٹھے ہیں' جو موجب لعنت ہے۔ بالغرض ایسے گناہوں میں آلودہ امام کئی جگہ موجود ہیں' ان کے سب مقتدی لوگ انہی کے پیچھے نمازیں پڑھ رہے ہیں۔
اس کے ساتھ ہی غور و فکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسی سکریننگ اور بال کی کھال والی تحقیق کے پیش نظر سب گناہ گار اماموں کو معزول کر کے دیہات میں سے دیگر لوگوں کو امام بنایا جائے تو ان میں بھی کوئی عیب ہو گا جن میں معزول شدہ امام نکتہ چینیاں کرے گا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ مسجدیں بغیر اماموں کے بے آباد ہو جائیں گی اور سب لوگ تارک جماعت ہو جائیں گے۔ ایسی صورتیں کئی دیہات میں دیکھی گئی ہیں کہ ان کو مخلص اور متقی امام نہ ملا' کوئی مولوی یہ کہہ دیتا کہ میں تو امامت کے لائق نہیں ہوں۔ کوئی یہ کہتا کہ میں مقتدیوں کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا' کوئی مولوی کھڑا ہوتا تو دوسرا کہتا کہ میں اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا کہ اس میں فلاں فلاں عیب اور گناہ ہیں۔

ایک گاؤں میں مولوی اور خواندہ لوگ بکثرت تھے' وہاں امامت کوئی نہ کر سکتا تھا۔ ان پر آنحضرت ﷺ کی یہ پیشین گوئی صادق آگئی جو مشکوۃ میں وارد ہے۔ سلامہ بنت حر رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کی علامات میں ایک یہ علامت بھی ہے کہ اہل مسجد اپنے نفس کو یا ایک دوسرے کو امامت سے دھکیلیں گے' حتیٰ کہ کوئی شخص امام بنائے جانے والا نہ پائیں گے۔ (رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجہ) یعنی کوئی یہ کہے گا لست اھلالھا لما ترک تعلم ما تصح بہ الامامۃ ولجھلھم بما یجوز ولا یجوز۔ کہ میں اس کے لائق نہیں ہوں کیونکہ اس کو اتنی تعلیم حاصل نہ ہو گی جس سے ان امور کا علم ہو جاتا جن سے امامت صحیح قائم ہوتی ہے اور ان کو یہ خبر نہ ہو گی کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے۔ اور دوسرا یہ معنی کہ یدفع کل من اھل المسجد الامامۃ عن غیرہ الی نفسہ فیحصل بذالک النزاع فیودی ذالک الی عدم الامامۃ (مرعاۃ المفاتیح جلد ۲ ص ۴۰) یعنی "اہل مسجد سے ہر ایک دوسرے کو دھکیل کر اپنے آپ کو امامت کے لائق بنائے گا جس سے نزاع پیدا ہو گا اور یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ مسجد میں کوئی امام نہ ہو گا" بعض جگہ یہی حال ہے۔

اب مفتیان عہد حاضر جو یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ فلاں امام میں یہ یہ عیوب اور جرم ہیں' اس کو امامت سے معزول کر دیں' اس کا غلط انجام ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس امام کو امامت سے ہٹا دیتے ہیں کہ پھر بغیر جماعت کے نمازیں پڑھنے لگتے ہیں۔

میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ بعض اماموں کو امامت سے ہٹا دیا گیا اور دوسرا امام عرصہ تک نہ ملا اور لوگ انفرادی طور پر نمازیں پڑھتے رہے۔ مسجد میں اذان اور جماعت دونوں مسدود ہو گئیں' جس کا بار مفتیان پر پڑا۔ فتویٰ یوں دینا چاہیے تھا کہ کسی متقی عالم امام کی تلاش کرو' جب اس فاسق امام سے بہتر مل جائے تو اس کو باتفاق سب مقتدی مل کر معزول کر دو۔ جب تک دوسرا امام اس سے بہتر میسر نہ ہو یا اس کے معزول کرنے پر سب کا اتفاق نہ ہو تو پھر تفرقہ نہ ڈالیں' اسی امام فاسق کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہیں کہ بغیر جماعت کے نماز پڑھنا درست نہیں ہے اور مسجد کو بے آباد کرنا گناہ ہے۔ یا دوسرا امام کم علم ملتا ہے اور اس کو قرآن بھی زیادہ یاد نہیں تو بھی اسی عالم فاسق کے پیچھے نماز پڑھتے رہنا چاہیے کہ عالم فاسق کا درجہ متقی جاہل سے بہتر ہے۔ جب حالات ناگزیر ہوں تو امام فاسق کے پیچھے نماز

درست ہے۔

چنانچہ امام الفقہاء امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مذہب اہل سنت کی تعریف یہ کی ہے جو شرح فقہ اکبر ص ۹۰ میں درج ہے: وفي المنتقى سئل ابو حنيفه عن مذهب اهل السنة والجماعة فقال ان نفضل الشيخين اي ابا بكر وعمر ونحب الختنين اي عثمان وعليا وان نرى المسح على الخفين ونصلي خلف كل بر وفاجر۔ یعنی "منتقی میں ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مذہب اہل سنت والجماعت کی تعریف پوچھی گئی تو آنجناب نے یہ ارشاد فرمایا کہ ہم اہل سنت تب ہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سب امت پر فضیلت دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو دامادوں عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کو دوست رکھیں اور موزوں پر مسح کیا کریں اور اس کو جائز جانیں اور ہر نیک اور برے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کریں۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ جو لوگ فاسق امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور اپنی علیحدہ نمازیں پڑھ کر جماعت کے تارک ہیں' وہ مذہب اہل سنت سے خارج ہیں۔ شرح فقہ اکبر میں اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ جو شخص جمعہ اور جماعت امام فاسق کے پیچھے پڑھنا ترک کر دیتا ہے' وہ اکثر علماء کے نزدیک بدعتی ہے۔ پھر یہ لکھا ہے: كان ابن مسعود وغيره يصلون خلف الوليد بن عقبة بن ابي معيط وكان يشرب الخمر حتى انه صلى لهم الصبح مرة اربعا ثم قال ازيدكم فقال بن مسعود ما زلنا معك منذ اليوم في زيادة۔ یعنی "ابن مسعود وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ولید بن عقبہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے' حالانکہ وہ بڑا شرابی تھا اس قدر نشہ میں رہتا کہ ایک دن اس نے صبح کی نماز دو کے بجائے چار رکعت پڑھا دی اور پھر کہتا ہے کیا اور زیادہ کروں؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم بھی تیرے ساتھ ہی پڑھتے رہتے جب تک تو زیادتی کرتا رہتا۔" (تیرا اور ہمارا گناہ تجھ پر ہی ہے)

جیسے اجعلوا ائمتکم خیارکم والی روایت ضعیف ہے' ویسے ایک روایت بحوالہ ابوداؤد مشکوۃ میں ہے جس کے یہ الفاظ ہیں: والصلوة واجبة عليكم خلف كل مسلم برا كان او فاجرا۔ یعنی "تم پر ہر مسلمان نیک اور برے کے پیچھے نماز پڑھنا واجب ہے۔"

اس کی تائید دیگر احادیث اور آثار سلف سے بھی ہوتی ہے جس کی تفصیل کی اب گنجائش نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حجاج کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے جو مشہور فاسق بلکہ افسق الفاسقین تھا اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مروان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے، وہ بھی فاسق تھا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عہد اول بقیہ صحابہ اور تابعین کا اجماع فعلی اس بات پر قائم ہے کہ فاسقین کے پیچھے نماز درست ہے کہ وہ فاسق اماموں کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ فاسق فاجر کو جب کہ متقی امام مل سکے امام بنانا جائز نہیں۔ اگر بنائیں گے تو سب گنہگار ہوں گے مگر نماز اس کے پیچھے ہو جائے گی' ہاں ثواب کم ملے گا اور اگر صالح اور متقی جان کر امام بنایا پھر اس کے عمل سے فسق فجور ظاہر ہو گیا تو جب تک کوئی متقی صالح امام نہ ملے تب تک اس کے پیچھے نماز جائز ہے کہ ترک جماعت گناہ ہے۔ جب بہترین امام مل جائے تو فاسق کو معزول کر دینا چاہیے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم وعلمہ اتم

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

الاعتصام لاہور' جلد ۲۱' شمارہ ۱۷' ۱۸' مورخہ ۲۰' ۲۷ نومبر و ۴ دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء

نماز کی اہمیت

اسلام میں توحید کے بعد پہلا حکم نماز کا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: یاایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر یعنی "اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور ہوشیار ہو اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔" نماز کی بنیاد تکبیر تحریمہ سے شروع ہوتی ہے۔ حدیث جبرائیل میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال ہوا کہ اخبرنی عن الاسلام "کہ مجھے اسلام کے متعلق خبر دیجئے کہ وہ کیا ہے؟ تو آنجناب نے توحید و رسالت کے بعد فرمایا کہ وتقیم الصلوٰۃ' دوسرا رکن اسلام کا یہ ہے کہ تو نماز پڑھے۔ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں اسلام کی بنیاد پانچ ارکان پر قرار دیتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید و رسالت کے اقرار کے بعد دوسرا رکن یہ ذکر فرمایا واقام الصلوٰۃ "کہ وہ نماز کو قائم کرتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

نماز کی نگہداشت: قرآن مجید میں ہے: حافظوا علی الصلوات "کہ نمازوں کی نگہداشت کرو" اس آیت میں نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے حفاظت کرنے

کا حکم ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ نماز دن رات میں ایک نہیں ہے بلکہ کئی نمازیں ہیں جن کی نگہداشت کا حکم وارد ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں بروایت بخاری و مسلم یہ حدیث وارد ہے کہ ایک شخص آیا' فاذا ھو یسأل عن الاسلام۔ "وہ اسلام کے بارہ میں سوال کرتا تھا۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمس صلوات فی الیوم واللیلۃ "فرمایا اسلام یہ ہے کہ دن اور رات میں پانچ نمازیں ادا کی جائیں۔" اس سے ثابت ہوا کہ بعض نفس پرست جو صرف ایک نماز صبح کی یا دن رات میں کسی وقت کی پڑھ کر حکم الٰہی کی تعمیل سے سبکدوش ہو جانے کا خیال کرتے ہیں یہ غلط ہے' جب تک پانچوں نمازیں دن رات میں حسب دستور ادا نہ کریں گے' کبھی فرض الٰہی کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکیں گے۔

واقعہ معراج میں آنحضور ﷺ نے بیان فرمایا کہ فامرت بخمس صلوات کل یوم فرجعت الی موسٰی فقال بما امرت قلت امرت بخمس صلوات کل یوم قال ان امتک لا تستطیع خمس صلوات کل یوم وانی قد جربت الناس قبلک وعالجت بنی اسرائیل اشد المعالجۃ فارجع الی ربک فاسئلہ التخفیف لامتک قال سألت ربی حتی استحییت ولکنی ارضی واسلم قال فلما جاوزت نادی منادٍ امضیت فریضتی وخففت عن عبادی۔ (متفق علیہ) یعنی "اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے ہر دن پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا اور دربار الٰہی سے واپس ہو کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کتنی نمازوں کا حکم دیئے گئے ہیں؟ میں نے کہا میں ہر دن میں پانچ نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ کی امت ہر دن ہمیشہ پانچ نمازیں ادا نہیں کر سکے گی' کیونکہ میں نے آپ سے پچھلے لوگوں کا خوب تجربہ کیا ہے اور اپنی قوم بنی اسرائیل کا ہر ممکن طریق سے بڑی سختی سے علاج کرتا رہا (وہ نمازیں ادا نہ کر سکے) آپ دربار الٰہی میں امت کے لیے پھر واپس جا کر نمازوں کی تعداد میں تخفیف کی درخواست کریں۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو بار بار تخفیف کی بابت سوال کرنے سے شرمسار ہوں' اب اپنی امت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اور اتنی ہی نمازوں پر راضی ہو جاتا ہوں' یہ کہہ کر آپ رخصت ہوئے تو دربار الٰہی سے ندا آئی کہ میں نے اپنے فرض کو جاری کر دیا اور اپنی حکمت پر جو تخفیف مناسب تھی' وہ اپنے بندوں سے کر دی ہے۔ (مشکوٰۃ)

اس حدیث متواتر سے ثابت ہوا کہ تمام بندوں پر ایک دو نمازیں نہیں' بلکہ پانچ نمازیں فرض ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اجمالی طور پر اور احادیث میں مفصل طور پر ان پانچ نمازوں کا ذکر موجود ہے اور قرناً بعد قرنٍ عہد نبوی سے اب تک اہل اسلام میں ان پر تعامل چلا آرہا ہے اور قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی انہی پانچ کی حفاظت کا حکم وارد ہوا ہے۔ حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطی۔ "کہ چار نمازوں کی اور ان چار کے بیچ میں جو نماز (پانچویں) ہے' ان کی نگہداشت کرو۔"

لفظ صلوات جمع ہے جس کا اقل درجہ تین ہیں۔ لیکن واؤ عاطفہ مغایرت کو چاہتی ہے' جس کے آگے صلوٰۃ درمیانی کا ذکر ہے تو لفظ صلوات سے چار مراد ہیں' تاکہ پانچویں ان کے درمیان آجائے' پس صبح اور ظہر کی دو نمازوں اور مغرب اور عشاء کی دو نمازوں کے درمیان عصر کی نماز پڑتی ہے جو پانچویں ہے اور اس کی حفاظت کا علیحدہ حکم فرمایا ہے۔ احادیث صحیحہ میں بھی صلوٰۃ وسطی کی تفسیر نماز عصر ہی سے کی گئی ہے' انہیں پانچ نمازوں کی حفاظت کرنا مومنوں کی پہچان ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ والذین ھم علی صلواتھم یحافظون "کہ کامیاب وہ مومن ہیں جو پانچوں نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وامر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیھا "کہ اپنے اہل اور امت کو نماز کا حکم کرو اور خود نماز کے ہمیشہ پابند رہو۔" چنانچہ آپ اپنے اہل اور امت کو یہ حکم بار بار فرماتے رہے : صلوا صلوا "کہ نماز پڑھو' نماز پڑھو۔" حتیٰ کہ آخری وصیت بھی موت کے وقت نمازی کی کرتے ہوئے رخصت ہوئے ﷺ۔

قرآن کریم میں اصلی نمازیوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ الذین ھم علی صلوتھم دائمون۔ "نمازی وہ لوگ ہیں جو اپنی نماز کو ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔" تفسیر جامع البیان اور دیگر تفاسیر میں دائمون کی تفسیر یہ وارد ہے کہ لا یترکون فریضۃ "کہ کوئی فرض نماز بھی نہیں چھوڑتے۔" اس سے ثابت ہوا کہ بغیر عذر شرعی کے نماز کو محض نفسانی یا دنیوی بہانوں سے چھوڑنے والے اصلی نمازی نہیں ہیں' اصلی نمازی وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

ایک واقعہ : حضرت ربیعہ صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی کریم رؤف رحیم ﷺ کی خدمت میں رات کو رہا کرتا اور تہجد کے وقت وضو کا پانی اور مسواک مصلی وغیرہ دیگر

ضروریات مہیا کرتا تھا۔ ایک دن جناب رسول اللہ ﷺ نے میری خدمات سے خوش ہو کر فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ میں جنت میں آپ کی رفاقت کی درخواست کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اور کچھ مانگ؟ عرض کیا کہ بس یہی چیز مطلوب ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا سجدوں کی کثرت سے میری مدد کیجئے۔ (ابوداؤد)

یعنی محض میری دعا پر بھروسہ نہ کرنا بلکہ اس میں عمل کی بھی ضرورت ہے اور اعمال میں نماز سب سے اہم چیز ہے کہ جتنی اس کی کثرت ہو گی' اتنے ہی سجدے زیادہ ہوں گے اور میں نے بھی کثرت سجدوں ہی سے قرب الٰہی حاصل کیا ہے' تو میری رفاقت بھی کثرت سجدوں سے ہی مل سکتی ہے' سو سجدوں کی کثرت بغیر ہمیشہ نماز پڑھنے کے حاصل نہیں ہو سکتی' لہٰذا ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ نماز ہمیشہ پڑھے بلکہ بکثرت پڑھے۔ بروایت طبرانی کبیر آیا ہے کہ آپ نے حجتہ الوداع کے موقعہ پر ایک طویل خطبہ دیا جس میں نماز' روزہ' زکوٰۃ اور چند کبیرہ گناہوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ لا یموت رجل لم یعمل ھؤلاء الکبائر ویقیم الصلوٰۃ ویؤتی الزکوٰۃ الا رافق محمدا صلی اللہ علیہ وسلم فی بحبوحۃ الجنۃ ابوابھا مصاریع الذھب۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر) یعنی "نہیں مرے گا کوئی شخص کہ جس نے وہ کبیرہ گناہ (شرک' قتل مومن' جنگ میں بھاگنا' پاک دامن کو بہتان لگانا' جادو' یتیم کا مال کھانا' سود کھانا' والدین کی نافرمانی' بیت اللہ کی بے حرمتی) نہ کئے اور نماز کو ہمیشہ قائم رکھا اور زکوٰۃ ادا کی' مگر یہ کہ وہ محمد رسول اللہ کے ہمراہ جنت کے اعلیٰ درجہ میں ہو گا جس کے دروازے سونے کے ہیں۔ (طبرانی)

اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ رفاقت نبوی ﷺ ربیعہ رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ جو شخص بھی کبیرہ گناہوں سے بچ کر ارکان اسلام خصوصاً نماز کی پابندی اور حفاظت تادم زیست کرے گا' وہ بھی آنحضور ﷺ کی رفاقت حاصل کر سکے گا۔

بے نمازی کی رفاقت: جو لوگ نماز کی حفاظت نہیں کرتے بالکل ہی نہیں پڑھتے یا کبھی پڑھتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں یا دن رات میں کوئی پڑھ لی' کوئی چھوڑ دی' وہ فرعون' قارون' ہامان وغیرہ کفار کے ہمراہ ہوں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس نے نماز کی محافظت کی' قیامت کے دن اس کے لیے وہ نماز نور اور دلیل اور نجات یعنی جنت میں جانے کا وسیلہ ہو گی اور جس نے نماز پر محافظت نہ کی' اس کے لیے نہ نور ہو گا اور نہ دلیل

مسلمانی اور نہ نجات بلکہ وہ قیامت کے دن قارون' فرعون' ہامان' ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا (احمد' داری' بیہقی' مشکوۃ ص۔۵۸)

پہلے تین کافر قارون' فرعون' ہامان تو حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے جانی دشمن تھے اور متوخر الذکر ابی بن خلف ہمارے پیغمبر ﷺ سے سخت عداوت رکھتا تھا جو معرکہ احد میں آنحضور ﷺ ہی کے ہاتھوں قتل ہو کر داخل فی النار ہوا۔

اس حدیث نبوی میں یہ نکتہ ہے کہ جو بادشاہ اور گورنر جنرل ہو کر نماز چھوڑے گا وہ فرعون کے ساتھ ہو گا اور جو وزیر اعظم ہو کر نماز چھوڑے گا وہ ہامان کے ساتھ ہو گا اور جو رئیس' مالدار اور دولت مند ہو کر نماز چھوڑے گا وہ قارون کے ساتھ ہو گا اور جو عام جاہلا زمیندار' سوداگروں میں سے کوئی چھوڑے گا وہ ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔ اسی طرح کوئی عالم' مولوی' حافظ ہو کر نماز چھوڑے گا وہ بھی قارون کے ساتھ ہو گیا کیونکہ جامع البیان میں ہے: وهو كان اقراه بني اسرائيل واحفظهم بالتوراة (جامع البیان یعنی "وہ سب بنی اسرائیل میں سے زیادہ قاری تھا اور ان سب سے زیادہ تورات کا حافظ تھا۔"

کس قدر خطرناک مقام ہے اور کتنی خوف کی بات ہے کہ بے نمازوں اور نماز کی پوری نگہداشت نہ کرنے والوں کا حشر بڑے بڑے کفار کے ساتھ ہوا۔ اب پاکستان کے حکام اور ملازموں اور لیڈروں اور زمینداروں اور رئیسوں' چوہدریوں کو فکر کر لینا چاہیے جو کہ خواہشات نفسانیہ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ذاتی' عداتی' دنیوی کاروبار میں مشغول ہو کر نمازوں کو ضائع کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم امت محمدی میں اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنت میں جائیں گے "ہیں خیال است ومحال است وجنوں۔" حضرت محمد رسول اللہ ﷺ صادق مصدوق نے خود فرما دیا ہے کہ وہ میرے ہمراہ نہیں ہو گا بلکہ بڑے بڑے کافروں' فرعون' قارون وغیرہ کے ساتھ ہو گا کیونکہ وہ کافر ہے۔ چنانچہ دیگر احادیث میں صاف آیا ہے کہ عن بريدة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال بكروا بالصلوة في يوم الغيم فانه من ترك الصلوة فقد كفر رواه ابن حبان في صحيحه یعنی حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابر کے دن سویرے پہلے وقت ہی نماز پڑھ لیا کرو کیونکہ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔" (ابن حبان)

اس لیے حضرت علی اور ابن عباس اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ جو نماز نہ

پڑھے' وہ کافر ہے۔ اب پاکستان والے غور کر لیں کہ پاکستان میں کتنے مسلمان ہیں اور کتنے کافر ہیں اور پھر اکثریت مسلمانوں کی ہے یا کافروں کی ہے اور عدالتوں کی کرسیوں پر مسلمان بیٹھے ہیں یا کافر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک قانون اسلام نافذ نہیں ہوا اور نہ آئندہ امید ہے کیونکہ اکثر لوگ بے نماز کافر ہیں' اس لیے میرا دعویٰ ہے کہ نہ ہمارا ملک پاک ہے اور نہ حکومت اسلامی ہے۔ جب حکومت اسلامی ہو جائے گی' اس وقت ایک بھی بے نماز نہ ملے گا۔

(عہد نبوی اور عہد خلفاء میں ایک بھی بے نماز نہ تھا)

اصل اسلامی ملک اور اسلامی ریاست عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدین میں تھی کیونکہ اس وقت داعی اور رعایا' امیر اور مامور' حاکم اور محکوم ایک بھی بے نماز نہ تھا۔ اگر کوئی دعویٰ کرے تو ثبوت پیش کرے۔ تاریخی بلکہ احادیثی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی نماز نہ چھوڑتے تھے اور سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی وہ نماز ترک نہ کرتے تھے۔ چنانچہ چند واقعات عرض کرتا ہوں ان پر ہمارے ناظرین غور کریں۔

(۱) ایک صحابی کو آنحضرت ﷺ نے کسی پرخطر کام کے لیے کہیں روانہ کیا' جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچا تو عصر کا وقت ہو چکا تھا' ان کو خوف ہوا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا انتظام کیا گیا تو وقت نکل جائے گا اور نماز عصر میں تاخیر ہو گی تو حکم الٰہی (والصلوٰۃ الوسطیٰ) کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی۔ اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ چلتے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھتے جاتے تھے۔ (تفصیل ملاحظہ ہو ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب۔ خاطت ہو تو لی ہو۔)

(۲) مدینہ اسلام کا مرکز ہے۔ صبح کا وقت ہے' حضرت خلیفۃ المسلمین عمر فاروق رضی اللہ عنہ امام نماز ہیں' ان کے پیچھے صحابہ کرام کی صفیں ہیں' ناگہانی طور پر ایک بدبخت خنجر بکف ہو کر آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ راشد پر حملہ آور ہو کر آپ کے شکم مبارک کو چاک کر دیتا ہے' جس کی وجہ سے آپ بیہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔ خون کا فوارہ جاری ہے' باایں ہمہ نماز کی صفیں اپنی جگہ پر بدستور قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کے لیے آگے ہو جاتے ہیں اور صبح کی نماز پوری کرنے کے بعد خلیفہ وقت کو سنبھالا جاتا ہے۔ (بخاری) یہ تھا اسلام اور یہ تھی ان کی مسلمانی۔

آج ایک معمولی حادثہ ہو جائے تو گھروں کے گھر اور محلوں کے محلے نمازیں چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس خونی انقلاب میں جو مہاجرین آئے ہیں' ان میں سے ایک لاکھ میں سے کسی نے نماز پڑھی ہو گی ورنہ یہ مثل صادق آ رہی تھی کہ "بھول گئی نماز ماری روزے دی۔"

(۳) جس صبح کی نماز میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ حادثہ ہوا' اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نماز کے لیے بیدار کیا تو فرمایا کہ جو شخص نماز چھوڑ دے' اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس حالت میں کہ آپ کے زخم سے خون جاری تھا' آپ نے نماز ادا فرمائی۔ (موطا امام مالک)

اب ان حکاموں' ملازموں کی حالتوں پر غور کریں اور پٹواری سے لے کر ڈپٹی کمشنر اور فائنل کمشنر تک طائرانہ نظر کرتے جائیں کہ معمولی زکام اور سر درد سے نماز چھوڑ دیتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں کہ سرے سے پڑھتے ہی نہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ ہمارا ملک اسلامی ہو گیا ہے' حالانکہ اسلامی اس وقت ہو گا جب گھروں میں اور عدالتوں میں اسلام پر عمل ہو گا۔

(۴) حضرت امام حسین مظلوم کربلا رضی اللہ عنہ میدان جنگ میں ہیں' عزیزوں کی لاشیں سامنے پڑی ہیں' ظالموں نے آپ کو نرغہ میں لیا ہوا ہے' اسی اثناء میں نماز ظہر کا وقت آ گیا' آپ دشمنوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اتنا موقعہ دے دیں کہ آپ نماز ظہر ادا کر لیں۔ (تاریخ طبری کبیر جلد ے' ص ے ۳۴) اب تعزیہ پرست عاشقان حسین جو ماتم کرتے کرتے لہولہان ہوتے ہیں' وہ بتلائیں کہ ماتم کرنے کے دنوں میں کتنی نمازیں قضا کرتے ہیں اور شیعہ اور رافضی بے نماز بتلائیں کہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کتنی پیروی کرتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ سب جھوٹے عاشق ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ من لم یصل فھو کافر "کہ جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔" لہٰذا سب شیعہ بے نماز کافر ہیں اور اسلام سے خارج ہیں۔

(۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی آنکھ میں پانی اتر آیا' نظر بند ہو گئی' آنکھ بنانے والے حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حکم ہو تو آنکھ بنائیں لیکن شرط یہ ہے کہ پانچ دن تک آپ کو یہ احتیاط کرنی پڑے گی کہ سجدہ بجائے زمین کے کسی اونچی لکڑی پر کرنا ہو گا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ واللہ! میں ایک رکعت بھی اس طرح نہیں پڑھ سکتا۔ حضور کا ارشاد ہے کہ جو شخص ایک نماز بھی جان کر چھوڑ دے' وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی طرح

ملے گا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس پر ناراض ہوں گے۔ (در منثور)

اگرچہ مجبوری کی حالت میں اس طرح نماز جائز تھی لیکن انہوں نے اپنی جان سے زیادہ نماز کو اہمیت دی کہ وہ پورے ارکان مسنونہ اور آداب شرعیہ پر ادا ہو' ایک آنکھ کیا نماز پر تمام جان بھی قربان ہے۔ لیکن آج بدمعاشوں' اوباشوں' دنیا داروں' رئیسوں' چودھریوں' نئے فیشن کے آدمیوں پر غور کرو کہ وہ نماز اور نمازیوں پر بھی کیسی باتیں بناتے ہیں اور کس طرح بے حیا ہو کر مذاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نمازوں میں کیا رکھا ہے؟

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ تابعین وغیرہم بزرگان دین کے واقعات تواریخ میں موجود ہیں کہ وہ کسی نازک سے نازک حالت میں بھی نماز نہ چھوڑتے تھے۔ قرآن مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ فان خفتم فرجالا او رکبانا فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم۔ "کہ اگر تم دشمنوں کا خوف کرو تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر نماز پڑھ لو پھر جب تم کو امن ہو جائے تو اللہ کو اسی دستور سے یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھلایا ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ معرکہ جنگ میں بھی نماز چھوڑنے کا حکم نہیں ہے' حالانکہ وہ بڑا خطرناک وقت ہے' اب جو شخص اپنے گھروں میں بحالت امن نماز نہیں پڑھتے' وہ مسلمان کس طرح ہو سکتے ہیں؟

نماز کی حفاظت کرنے اور نہ کرنے کا انجام: ابوداؤد باب المحافظۃ علی الصلوۃ میں ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خمس صلوٰت افترضھن اللہ عزوجل من احسن وضوء ھن وصلاھن لو قتھن واتم رکوعھن وخشوعھن کان لہ علی اللہ عھد ان یغفرلہ ومن لم یفعل فلیس لہ علی اللہ عھد ان شاء غفرلہ وان شاء عذبہ۔ "یہ پانچ وقت کی نمازیں ہیں' ان کو اللہ نے فرض کر دیا ہے' جس شخص نے ان کا وضو اچھی طرح کیا اور ان نمازوں کو ٹھیک وقتوں پر پڑھا اور رکوع' سجدے کو اچھی طرح ادا کیا' اس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کا عہد ہے کہ اس کو بخش دے گا اور جس نے اس طرح ادا نہ کیا (بلکہ خراب طریقہ سے پڑھا) تو اللہ تعالیٰ کا اس کے لیے کوئی عہد نہیں ہے' چاہے بخش دے چاہے عذاب کرے۔"

لیکن دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عذاب کرے گا

چنانچہ ترغیب وترہیب ص-۸۳ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ حدیث ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے نماز ٹھیک وقت پر پڑھی اور وضو بھی ٹھیک کیا اور اس کا قیام اچھا کیا اور حضوری دل سے پڑھا اور رکوع سجود بھی اچھی طرح تسلی سے ادا کیا تو وہ نماز اس نمازی کے پاس سے جب رخصت ہوتی ہے تو وہ چمکتی ہوئی ہوتی ہے اور نمازی کے حق میں دعا کرتی ہے کہ تجھ کو اللہ سلامت رکھے' جس طرح تو نے مجھے حفاظت سے ادا کیا اور جس نے نماز کو اس کا وقت ٹال کر پڑھا اور وضو بھی ٹھیک طور پر نہ کیا اور دل بھی حاضر نہ رکھا اور رکوع سجود کو بھی تسلی سے ادا نہ کیا تو جب وہ رخصت ہوتی ہے تو کالی چکٹی ہوتی ہے اور وہ اس نمازی کے لیے بددعا کرتی ہے کہ جس طرح تو نے مجھے برباد کیا' اللہ تجھے برباد کرے' یہاں تک کہ جب تھوڑی سی اونچی ہوتی ہے' جس قدر کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے' پھر وہ پرانے کپڑے کی طرح لپیٹی جاتی ہے اور اس نمازی کے منہ پر ماری جاتی ہے۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

اس سے ظاہر ہوا کہ خراب نماز جس کی پوری حفاظت نہیں کی گئی وہ موجب عذاب ہے' کیونکہ وہ برباد ہونے کی دعا کر چکی ہے اور دعا نماز کی منظور ہے پس وہ نمازی برباد ہو گا اس لیے آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ صلوا کما رأیتمونی اصلی "کہ تم اس طرح نماز پڑھا کرو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

شرعی نماز کے لیے سات ضروری احکام: صحیح شرعی نماز جو عنداللہ مقبول ہے' اس کے لیے سات ضروری حکم ہیں' بغیر ان کے نماز صحیح نہیں ہے۔ (۱) اقامت (۲) اخلاص (۳) خشوع (۴) قنوت (۵) حفاظت (۶) مداومت (۷) پابندی جماعت۔ ساتوں حکم قرآن کریم سے ثابت ہیں:

(۱) چنانچہ اقامت کے متعلق ارشاد ہے: اقیموا الصلوٰۃ "کہ نماز کو (اس کے فرائض اور سنن اور آداب کے ساتھ) ادا کرو۔" جس طرح ادا کرنے کی کیفیت احادیث میں وارد ہے۔

(۲) واقیموا وجوھکم عند کل مسجد وادعوہ مخلصین له الدین "کہ تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور اللہ کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔"

(۳) الذین ھم فی صلوتھم خاشعون "کہ کامیاب مومنین وہ ہیں جو نماز میں خشوع کرنے والے ہیں" یعنی دل میں خوف اور عاجزی' بدن میں جھکاؤ' آواز پست' آنکھیں نیچی سجدہ گاہ پر رکھتے ہیں' اللہ کے سامنے مسکینی ظاہر کرتے ہیں۔

(۴) قنوت' فرمایا وقوموا للّٰہ قانتین "کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے فرمانبردار ہو کر چپ چاپ کھڑے رہو" یعنی تکبیر' قرأت' تسبیح' تحمید' تشہد' درود' دعا کے اور کوئی کلام نہ کرو اور لغو حرکات اور انسانی ضرورتوں سے باز رہو۔

(۵) حفاظت' فرمایا : حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطی "کہ چار نمازوں اور درمیان کی پانچویں نماز کی خوب حفاظت کرو۔"

حدیث میں ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چوروں سے بڑا چور وہ شخص ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے۔ صحابہ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے؟ فرمایا رکوع' سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہو۔ (مسند احمد' ابن خزیمہ وغیرہ) ایک شخص نے جلدی جلدی نماز پڑھی تو آپ نے فرمایا اے شخص اپنی نماز پھر پڑھو تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے دوبارہ اسی طرح پڑھی تو آپ نے پھر اسی طرح فرمایا کہ نماز پھر پڑھو تو نے نماز نہیں پڑھی۔ جب تیسری دفعہ ایسا ہوا تو اس نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! کیسے پڑھوں' تب آپ نے قیام' قومہ' جلسہ' رکوع' سجود اطمینان اور تسلی سے کرنا بتلایا۔ غرضیکہ نماز کی ظاہری اور باطنی حفاظت رکھنے کا حکم وارد ہے۔ اگر امور مذکورہ میں کوتاہی کی تو نماز ضائع ہو جائے گی۔

(۶) مداومت' قرآن میں ہے : الذین ہم علی صلوٰتہم دائمون "کہ اصلی نمازی وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور کبھی چھوڑتے نہیں ہیں۔"

(۷) فرمایا' وارکعوا مع الراکعین "کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔" یعنی نمازیوں سے مل کر نماز پڑھو۔ اس سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم ثابت ہوا۔ اسی لیے مسجدیں بنائی گئی ہیں اور اذان اور مؤذن مقرر کئے گئے ہیں اور امام نماز کا تقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان باہم مل کر نمازیں پڑھیں۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ہمیشہ جماعت سے نماز پڑھتے رہے' بغیر عذر شرعی انہوں نے کوئی نماز نہیں چھوڑی۔

حدیث میں ہے : من سمع النداء فلم یجب فلا صلوٰۃ لہ الا من عذر "کہ جس شخص نے اذان سن لی اور پھر اس اذان کو قبول کر کے جماعت میں نہیں آیا تو اس کی نماز نہ ہو گی مگر ساتھ عذر کے۔" اگر عذر ہو گیا بیماری یا قضا حاجت وغیرہ کا تو پھر اکیلے کی نماز ہو جائے گی۔ جماعت کی احادیث میں سخت تاکید آئی ہے۔ ایک نابینا شخص نے اپنے گھر نماز پڑھنے کی اجازت مانگی تھی' آپ نے اس کو بھی اذان سن لینے کے بعد اجازت نہ دی اور فرمایا

کہ اس منادی کی ندا کو قبول کرے۔

یہ سات امور مذکورہ جس شخص نمازی میں ہوں گے وہ اصلی نمازی ہے' جس کی نماز عدالت الٰہی میں قبول ہے اور اس کو شرعی نماز کہتے ہیں' جس کے ادا کرنے کا حکم قرآن میں ہے اور جس کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دی ہے اور وہ امت محمدی سے مطلوب ہے۔ باقی لوگوں نے جو اپنی خواہشوں سے نمازیں بنا رکھی ہیں' وہ سب مردود ہیں۔

زمانہ حاضرہ کے نمازی: زمانہ حاضرہ میں جو عام طور پر نمازی دیکھے گئے ہیں' ان کی نمازیں کئی قسم کی ہیں۔ (۱) اصلی شرعی (۲) فصلی (۳) نقلی (۴) ریائی (۵) آتشی (۶) اجماعی (۷) تین سو ساٹھی یا عیدی (۸) تساہلی (۹) تعجیلی (۱۰) میتی (۱۱) قضا عمری (۱۲) مذہبی (۱۳) الفی (۱۴) رجبی (۱۵) احتیاطی (۱۶) معکوسی (۱۷) تصوری (۱۸) مطلبی یا ضرورتی (۲۰) فیشنی (۲۱) بے وقتی (۲۲) انفرادی (۲۳) رمضانی (۲۴) کشتی (۲۵) ضیوفی (۲۶) کی مدنی (۲۷) خوفی' یہ سب اقسام ملکوں میں موجود ہیں۔

اب ہر ایک کی مختصر تعریف ذکر کی جاتی ہے تاکہ ناظرین اس تعریف کے مطابق ہر ایک نماز اور نمازی کا پتہ لگا سکیں اور ان کو نصیحت کر سکیں کہ یہ نماز مقبول نہیں ہے' مردود ہے۔ تم شرعی نماز پڑھو جس کا حکم قرآن و حدیث میں آیا ہے۔

اصلی نماز: اصلی نماز وہ ہے جس کا ذکر (اصلی نماز) پہلے بیان ہو چکا ہے' اسی کو شرعی یا صلوٰۃ نبوی یا نماز محمدی کہا جاتا ہے' اسی کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین وائمہ دین و سلف صالحین نے ہمیشہ ادا کیا ہے اور یہی شرعاً مطلوب ہے اور اسی سے فلاح ہو گی اور اسی کا اس حدیث میں حکم ہے کہ صلوا کما رأیتمونی أصلی "کہ (اے میری امت) تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح میں نے نماز پڑھی ہے۔" کیونکہ میں نے اسی طرح پڑھی ہے جس طرح جبرائیل نے پڑھائی ہے اور جبرائیل نے اسی طرح پڑھی اور پڑھائی جس طرح ہمارے معبود خداوند کریم نے سکھلائی تھی۔

بس اس طرح نماز پڑھنے والا فلاح حاصل کرے گا اور اس کی نماز اصلی کہلائے گی اور بارگاہ الٰہی میں قبول' باقی فضول ہے۔

فصلی نماز: یہ وہ نماز ہے جو فصل کاٹنے کے وقت چھوڑ دی جاتی ہے' باقی دنوں میں پڑھی جاتی ہے' اسی طرح فصل کاشت کرنے کے وقت بھی چھوڑ دی جاتی ہے' پھر فارغ ہو

کر شروع کی جاتی ہے۔ یہ زمیندار لوگ نماز پڑھتے ہیں' اپنی فصل کا اور فصلی کام کا نقصان سمجھتے ہیں اور دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں' حالانکہ متاع الدنیا قلیل ہے' قرآن مجید میں ہے: بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقی "کہ تم زندگانی دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے" اور وہاں کی نعمتیں ابدی ہیں اور یہاں کی سب چیزیں فانی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایمانداروں کو تنبیہہ فرمائی ہے کہ لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ "کہ تم کو تمہارے مال اور اولادیں ذکر الٰہی سے غافل نہ کر دیں۔"

چونکہ انسان کی پیدائش کی غرض وغایت عبادت الٰہی ہے' اس لیے اس کو اپنی زندگی کا نصب العین عبادت کو سمجھ کر کسی موقعہ پر بھی نماز نہیں چھوڑنی چاہیے' کیونکہ نماز عبادت الٰہی کا جزو اعظم ہے اور سب عبادات سے مقدم ہے' اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نماز پر اپنی جائیدادیں قربان کر دی تھیں اور نماز میں کسی قسم کا نقص نہیں آنے دیا تھا۔

چنانچہ حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اپنے باغ پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آکر چہچہانا' اچھلنا اور کودنا شروع کیا۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا نماز میں اس کی طرف خیال چلا گیا اور وہ ادھر دیکھتے رہے' پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی۔ دل میں خیال آیا کہ اس باغ نے یہ خرابی پیدا کی ہے اور نماز میں فتنہ ڈالا ہے' پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ باغ راہ الٰہی میں وقف کرتا ہوں۔ (موطا امام مالک)

اسی طرح ایک صحابی کا اور واقعہ ہے کہ وہ بھی اپنے باغ میں نماز ادا کر رہے تھے' کھجوریں پکنے کا زمانہ تھا' خوشے کھجوروں کے بوجھ اور کثرت سے جھکے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہ خوشوں پر پڑی اور وہ کھجوروں سے بھرے ہوئے اچھے معلوم ہوئے خیال ادھر لگ گیا' جس کے سبب سے یاد نہ رہا کہ نماز کی کتنی رکعتیں ادا کی ہیں اور کتنی باقی ہیں؟ افسوس اور رنج پیدا ہوا اور دل میں ٹھان لی کہ اس باغ کو بھی اب نہیں رکھوں گا جس کی وجہ سے نماز کا یہ نقصان ہوا۔ عہد عثمانی کا یہ واقعہ ہے' وہ انصاری عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا کہ یہ باغ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں' اللہ نے اس کی وجہ سے مجھے فتنہ میں ڈالا ہے' آپ اس کو جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس باغ کو پچاس ہزار میں فروخت کر

دیا اور اس کی قیمت دینی کاموں میں خرچ کر دی۔ (موطا)

یہ اسلام تھا ان سچے پکے مسلمانوں کا جن کو ان کی زندگی ہی میں جنت کی خوشخبریاں مل جاتی تھیں' رضی اللہ عنہم وارضاھم۔ آج ہم ہیں جو صرف فصلی کاروبار میں نمازوں کو بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں اور دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

نقلی نماز: یہ وہ نماز ہے جو کبھی کبھی کسی کے خوف دلانے سے یا لحاظ وملاحظہ سے ادا کی جاتی ہے۔ اس کو پڑھنے کا کچھ علم نہیں ہوتا' وہ صرف ساتھ نمازیوں کی طرف دیکھ کر نقل اتارتے جاتے ہیں جس طرح وہ پکے نمازی کرتے ہیں' اسی طرح یہ ناقل نقل اتارتے جاتے ہیں۔ جہاں وہ ہاتھ باندھتے ہیں' وہاں یہ ناقلین باندھتے ہیں' جہاں وہ ہاتھ اٹھاتے ہیں وہاں یہ یار لوگ بھی ہاتھ اٹھا لیتے ہیں' آنکھ کے گوشہ سے ان کو دیکھتے رہتے ہیں' خود نہ نماز جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور نہ ان کو فرضوں اور سنتوں کی رکعتوں کا پتہ ہے' سو ایسے لوگوں کی کوئی نماز نہیں ہے۔ ان کو چاہیے کہ دستور شرعی کے مطابق نماز سیکھیں اور ہمیشہ نماز پڑھیں اور اللہ تعالیٰ کا فرض جان کر اس کو ادا کیا کریں۔ اس طرح جھوٹ موٹ نقل اتارنے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا جب تک مستقل طور پر خود نماز نہ سیکھو گے۔

ریائی نماز: یہ نماز منافقوں کی ہے کہ وہ محض لوگوں کے دکھاوے اور ریا ونمود کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے اچھی طرح پڑھتے ہیں' اکیلے ہوں تو بالکل چھوڑ دیتے ہیں یا خراب کر کے پڑھتے ہیں۔ جامع البیان تفسیر قرآن میں ہے کہ فویل للمصلین الذین ہم عن صلوتھم ساھون○ ای التزموا بالصلوۃ علانیۃ ویترکونھا بالسر الذین ہم یراؤن یصلون فی العلانیۃ لاجل ان یظن فیھم الاسلام۔ یعنی "فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ ان نمازیوں کے لیے ویل ہے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں' کہ انھوں نے یہ عادت کر رکھی ہے کہ لوگوں کے سامنے ہوتے ہیں تو نمازیں پڑھ لیتے ہیں تاکہ لوگ ان کو مسلمان نمازی خیال کریں اور بڑے مسلمان سمجھیں اور اکیلے ہوں تو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ظاہر میں دکھلاوا کرتے ہیں اور لوگوں سے پوشیدہ ہوں تو نماز چھوڑ کر اپنے باطنی کفر پر رہتے ہیں۔"

یہ نمازی بھی مردود ہیں اور یہ دو وجہ سے مشرک ہیں۔ ایک تو نماز چھوڑنے سے کہ

حدیث شریف میں آیا ہے' جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لیس بین العبد والشرک الا ترک الصلوۃ فاذا ترکھا فقد اشرک۔ (رواہ ابن ماجہ) "کہ بندہ اور شرک کے درمیان کوئی چیز (بعد از توحید) فارق نہیں ہے مگر نماز کا ترک کرنا پس جب نماز ترک کر دے گا بلاشبہ مشرک ہو جائے گا" دوم ریا شرک ہے' حدیث میں ہے کہ من صلّی لیرائی فقد اشرک "کہ جس نے لوگوں کے دکھلاوے کے لیے نماز پڑھی وہ مشرک ہوا۔"

ایک حدیث میں یہ وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا زیادہ خوف ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند' سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگے گی بلکہ اللہ کے علاوہ اور لوگوں کے لیے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔ (ابن ماجہ) یہ نمائش کے طور پر نماز پڑھنے والے دکھاتے ہوئے نماز پڑھتے ہیں۔ دل لگا کر خوف الٰہی سے نماز نہیں پڑھتے' ان کو نماز پڑھنی بڑی گراں اور بھاری معلوم ہوتی ہے۔ نماز سے راحت' خوشی' لذت ان کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ہے: اذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی یراء ون الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا۔ "کہ منافق لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست دل' لوگوں کے دکھلاوے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور یونہی تھوڑا سا اللہ کو یاد کر لیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف آور ہوئے اور فرمایا کہ میں تم کو وہ چیز بتلاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ صحابہ نے کہا ہاں فرمائیے۔ آپ نے فرمایا کہ "شرک خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو اور اس کو خوب سنوار کر ادا کرے اس لیے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔ (ابن ماجہ)

خلاصہ یہ کہ عام طور پر نیک نامی' شہرت' عزت' نام و نمود کے لیے جو نمازیں پڑھتے ہیں' سب مردود ہیں' بارگاہ الٰہی سے ان کا کچھ ثواب نہ ملے گا' بلکہ عذاب ہو گا۔"

یہ ہے سرکار کا ارشاد صادق
ملے گا اجر نیت کے مطابق

نماز کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ یہ اسلام کا رکن ہے اور عملی فرائض میں سب سے اول فرض ہے اور روز قیامت میں بھی سب سے پہلے اسی کا حساب ہو گا اور دن کے چڑھنے

پر بھی سب سے پہلے اسی کا حساب ہو گا اور دن کے چڑھنے پر بھی سب سے اول اس کے ادا کرنے کا حکم ہے' باقی کاروبار بعد میں' دن میں اور رات چھا جانے پر بھی سب سے اول نماز ہے' کھانا پینا وغیرہ کام اس کے بعد میں۔ زوال شمس پر بھی اول نماز ہے' باوجود اتنی اہمیت کے اور اسلام اور کفر میں فارق ہونے کے پھر بھی عموماً لوگ نماز میں سستی کرتے ہیں اور اکثر انسان اس فرض سے غافل ہیں۔ گلیوں کے گلیوں اور محلوں کے محلے اس کے تارک نظر آرہے ہیں۔ خصوصاً اس انقلاب کے بعد تو کئی نمازی بھی بے نماز ہو گئے۔

چنانچہ کفار کے دیہات میں جو مسلمان کہلانے والے آکر آباد ہوئے ہیں وہ مہاجر کہلاتے ہیں اور نمازیں نہیں پڑھتے جیسے وہ مہاجر وطن ہیں' ویسے وہ مہاجر نماز بھی ہیں' جس سے ثابت ہوا کہ یہ شرعی مہاجر نہیں ہیں' صرف ہندوؤں کے ساتھ قلب مکانی کر لی ہے کیونکہ شرعی مہاجر کی تعریف یہ ہے: والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه "کہ ہجرت کرنے والا وہ ہے جس نے چھوڑ دی وہ چیز کہ منع کیا ہے اللہ نے اس سے۔" پس ممنوعات و منہیات کو چھوڑنے والا مہاجر شرعی ہے۔ ایسے مامورات و فرائض کے تارک اور ممنوعات کے فاعل مہاجرین بن رہے ہیں جو مہاجر شرعی نہیں' ہاں رسمی رواجی نمازیں اکثر لوگ پڑھتے ہیں' جن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ چنانچہ ان میں سے چند اقسام کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے' اب باقی عرض کرتا ہوں' غور سے سنیں اور ان سے بچ کر اصلی نمازی بنیں۔

میت کی نماز: میتی نماز وہ ہے جو کسی رشتہ دار یا محلہ والے کے مرنے پر جنازہ کے وقت اور ماتم کے دن پڑھی جاتی ہے' پھر ضرورت نہیں۔ اس دن نماز پڑھنے کی کچھ وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ جنازہ میں شامل ہونا ہے' اگر کوئی نماز بھی نہ پڑھی تو لوگ یہ کہیں گے کہ بے نماز جنازہ میں تو شامل ہو جاتے ہیں' دوسری نمازیں پڑھتے نہیں' اس لیے اس دن یا اس سے ایک دن پہلے نماز شروع کر دیتے ہیں (کیونکہ بعض لوگ بے نمازوں کو جنازہ کی نماز کے وقت صفوں سے نکال دیتے ہیں) پھر ماتم کے دنوں تک پڑھتے رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ اس دن موت کا نظارہ دیکھا ہوتا ہے' دل میں کچھ خوف اور افسوس عارضی سا پیدا ہوا' جس سے متاثر ہو کر نماز شروع کر دی۔ یہ افسوس ماتم کے ایام تک رہتا ہے۔ کفی بالموت واعظا "کہ موت نصیحت کے لیے کافی ہے۔" جب ماتم کے دن گذر گئے تو اس واعظ کی نصیحت بھی بھول گئی اور نماز ترک کر دی۔ جب موت پھر وارد ہوئی تو پھر شروع کر دی۔

چنانچہ ایام وبا میں جب موت مسلسل حملے کرتی ہے تو بہت سے بے نمازی' نمازی بن جاتے ہیں۔ جب موت کی طرف سے کچھ عرصہ امن ہو جاتا ہے تو پھر نماز چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ یہ عارضی نمازی ہوتے ہیں' ان کو نماز سے محبت نہیں ہوتی۔ حقیقت میں یہ بے نماز ہوتے ہیں حالانکہ جس نبی کے امتی کہلاتے ہیں ان کا فرمان عالی شان یہ ہے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔

تیسری وجہ اس ماتمی نماز کی یہ ہے کہ میت کو کلام بخشی ہوتی ہے' اگر نماز نہ پڑھی گئی تو بے نماز کا ہاتھ اٹھا کر کلام بخشنا اور فاتحہ خوانی کرنا عوام اور خواص میں ایک بے ڈھب سا معلوم ہوتا ہے اور وہ بے نماز شرمساری محسوس کرتا ہے کہ نمازی لوگ کہیں گے کہ نماز تو پڑھتا نہیں' فاتحہ خوانی کرتا ہے اور دعا مانگتا ہے' یہ کلام اور دعا میت کو کیسے اور کیونکر پہنچے گی؟ وہ یہ خیال کرتا ہوا نماز پڑھنی شروع کر دیتا ہے۔ جب تک کلام بخشنے کا رواج جاری رہتا ہے' یہ ماتمی نمازی بھی نماز پڑھتا رہتا ہے۔ جب یہ رواجی ایصال ثواب ختم ہوا' تب یہ نماز بھی ختم ہو گئی کیونکہ عارضی اور سببی تھی مستقل اور دائمی نہ تھی۔

سو واضح ہو کہ یہ نماز ناقابل قبول ہے اور بالکل فضول ہے اور یہ نمازی بھی مردود اور صاف نامقبول ہے۔ اصلی نمازی وہ ہے جو ہمیشہ نماز پڑھے اور طریقہ نبویہ کے مطابق ادا کرے۔ صحت میں' بیماری میں' خوشی میں' غمی میں' امیری میں' فقیری میں' حضر میں' سفر میں' کسی حال میں ترک نہ کرے۔ یہ نماز اور نمازی دونوں مقبول ہیں۔ موت اور میت اور قبر کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے عبرت حاصل کرنی چاہیے' جس دنیا میں مست اور غافل ہو کر نماز ترک کرتے ہیں یہ دنیا ساتھ نہ جائے گی۔ جب قبر میں رہائش ہو گی تو اس وقت انسان کو اس دنیا غدارہ' مکارہ کے مقابلہ میں نماز بہتر معلوم ہو گی۔ حدیث میں ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک قبر کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ اس قبر والے کو تمہاری دنیا سے دو رکعتیں زیادہ پیاری ہیں۔ نعم ما قال الشاعر ؎

پڑھتے ہیں خوف حق سے جو باچشم تر نماز
ان کے لیے بجائے گی نار سقر نماز
اے بے نمازو! سنگدلو! سر کو جھکا کے تم
دیکھو تو پھر دکھاتی ہے کیا کیا اثر نماز

تھوڑی سی زندگی پہ تو غافل ہے کس قدر
آنے کو ہے قضا تو قضا اب نہ کر نماز
انکے لیے بنائے گی یہ گھر بہشت میں
دنیا میں جن کے دل میں بناتی ہے گھر نماز
مومنو! نار جہنم سے بچاتی ہے نماز
گلشن فردوس کی راہیں دکھاتی ہے نماز

حدیث شریف میں وارد ہے کہ مرنے والے شخص کے ساتھ تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کا اہل وعیال اور مال اور عمل۔ جب میت روانہ ہو کر قبر میں داخل ہو جاتی ہے تو اہل عیال اور مال تو اس کو چھوڑ کر واپس ہو جاتے ہیں اور عمل اس کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ علامہ ابن القیم نے کتاب الروح میں ایک طویل حدیث متعلقہ ان اعمال صالحہ کے جو قبر میں مفید اور کارآمد ہوں گے ذکر کی ہے جس میں سے بقدر ضرورت ان الفاظ کو ذکر کرتا ہوں جو میرے موضوع سے متعلق ہیں :

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ان المیت اذا وضع فی قبرہ انہ یسمع خفق نعالھم حین یولوا مدبرین فان کان مومنا کانت الصلوۃ عند رأسہ ۔ فیوتی من قبل رأسہ فتقول الصلوۃ ما قبلی مدخل (الی اخر) فیقال لہ ارأیتک ھذا الذی کان قبلکم ما تقول فیہ وما ذا تشھد علیہ فیقول دعونی اُصلی فیقولون انک ستفعل۔ (الحدیث) یعنی "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تحقیق مردہ جس وقت قبر میں رکھا جاتا ہے تو اپنے ان ہمراہیوں کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے جو اس کو دفن کر کے واپس پھرتے ہیں۔ پس اگر وہ مومن (نمازی) ہو تو نماز اس کے سر کے پاس ہو جاتی ہے (کیونکہ نماز دین کا سر ہے) پس جب سر کی طرف فرشتے آتے ہیں تو نماز ان کو کہتی ہے کہ میری طرف سے داخل ہونے کی کوئی جگہ نہیں ہے (اسی طرح سے دیگر اعمال دائیں' بائیں اور پاؤں کی طرف سے جواب دیتے جاتے ہیں) پھر وہ بھلا کر دریافت کرتے ہیں کہ وہ شخص جو تم سے پہلے ہو چکا ہے اس کے متعلق تو کیا شہادت دیتا ہے؟ وہ مردہ کہتا ہے کہ ذرا چھوڑ دو مجھے کہ میں نماز پڑھ لوں۔ وہ فرشتے کہتے ہیں کہ بیشک تو ایسا ہی کرے گا لیکن ہم کو ہمارے سوال کا جواب دے۔

اس حدیث سے اس کی رفاہیت حال ظاہر ہوئی اور ثابت ہوا کہ نمازی شخص عالم برزخ میں خوشحال ہو گا اور گویا کہ وہ اپنے گھر والوں میں بیٹھا ہے اور ہنوز دنیا میں ہے اور سویا ہوا تھا' اب بیدار ہوا ہے۔ دنیا میں چونکہ بڑا مضبوط اور علی الدوام نماز پڑھنے والا تھا' اس لیے اس کو وہاں بھی بحسب عادت نماز ہی اول یاد آئی۔ چونکہ دنیا میں وہ سب کاروبار چھوڑ کر نماز کو مقدم رکھتا تھا' اس لیے وہ فرشتوں کو بھی یہی کہتا ہے کہ میں اول نماز پڑھ لوں پھر جو چاہو پوچھو' بعد فراغت کے بات چیت کروں گا۔ چنانچہ نوری فرشتے بھی اس کے اس نیک عمل پر شہادت دیتے ہیں کہ بیشک تو نمازی آدمی ہے اور ہمیشہ نماز پڑھتا رہا ہے' اب بھی تو ایسا ہی کرے گا لیکن اب ان اعمال کا وقت گزر چکا ہے' اب تو ہمارے حساب کا وقت ہے۔ لہٰذا ہمارے سوال کا جواب دیجئے تاکہ ہم اپنی کارروائی پوری کریں۔

اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اعمال صالحہ انسان کی اعانت کرتے ہیں۔ خصوصاً نماز نمازی کی حفاظت کرتی ہے اور عذاب الٰہی اور عذاب کرنے والوں کی مدافعت کرتی ہے۔ موت اور میت کے دنوں میں اور قبرستان میں جا کر اس منظر سے دائمی عبرت حاصل کرنی چاہیے اور نماز کو کسی وقت بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

ایک حدیث میں یہ وارد ہے کہ آنحضور ﷺ نے منجیات عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ورایت رجلا من امتی قد استوحشتہ ملائکۃ العذاب فجاءتہ صلوتہ فاستنقذتہ من ایدیھم۔ (کتاب الروح) "کہ میں نے اپنی امت میں سے ایک مرد کو دیکھا کہ اس کو عذاب کے فرشتوں نے گرفتار کر لیا ہے' پس اس کے پاس نماز پہنچی اور اس کو فرشتوں کے ہاتھوں سے چھوڑا لیا۔" یہ اجر وثواب ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے نماز کی حفاظت کی ہے کہ نماز ان نازک موقعوں پر ان نمازیوں کی حفاظت کرے گی۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ ہر نماز کے وقت ایک فرشتہ آواز دیتا ہے کہ اے بنی آدم اٹھو اور آگ کو نماز کے ساتھ بجھاؤ۔ لیکن افسوس ہے کہ دنیا کی خاطر نماز سے غفلت کرنے والے اس خیر خواہ فرشتہ کی اس آواز کی کچھ قدر نہیں کرتے اور اس کی بات نہیں مانتے۔

قضا عمری "نماز کی قضا کا مسئلہ": بعض لوگ تیس سال یا کم وبیش عمر تک نماز نہیں پڑھتے' پھر شروع کر دیتے ہیں اور بعض کبھی پڑھتے رہے' کبھی چھوڑتے رہے پھر پختہ نمازی بن گئے تو وہ ہر نماز کے وقت اسی وقت کی گزشتہ نماز ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں اور اسی

طرح پانچوں وقت میں یہ عمل کرتے ہیں اور احتیاطاً نیت کر لیتے ہیں کہ یہ گزشتہ نماز کی قضا ہے اور بعض ایک ہی وقت میں لگاتار نمازیں ادا کئے جاتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ گزشتہ عمر میں جو نمازیں چھوڑی تھیں' یہ ان کی قضا ہے۔ بعض کسی سخت کام یا مصیبت یا بیماری کے وقت عمداً نماز چھوڑ دیتے ہیں پھر کسی دن آرام اور تسلی کے بعد ان کو پڑھتے ہیں' یہ سب صورتیں قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہیں بلکہ اختراعی ہیں جن سے ترک نماز کا گناہ دور نہیں ہو سکتا دیدہ دانستہ نماز چھوڑنے والا کافر ومرتد ہے' اس کو پھر نئے سرے سے کلمہ پڑھ کر اور توبہ خالص کر کے مسلمان ہونا چاہیے۔ قرآن میں ہے: فخلف من بعدهم خلف اضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا الا من تاب وامن وعمل صالحا فاولئك يدخلون الجنة۔ یعنی "نیکوں کے بعد ایسے نالائق لوگ ان کی جگہ آئے کہ انہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشوں' مزوں کے پیچھے لگے پس شتاب ملیں گے وہ گمراہی کو مگر وہ لوگ کہ توبہ کی انہوں نے اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے (نماز وغیرہ کے پابند ہوئے) پس یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔"

جامع البیان میں ہے کہ عن بعضهم انهم من هذه الامة فى اخر الزمان۔ بعض علماء سلف نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایسے لوگ اسی امت کے ہوں گے جو آخر زمانہ میں ہوں گے۔ یہ تفسیر حضرت مجاہد رحمہ اللہ امام المفسرین کی ہے' جنہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اعلم بتفسير القرآن سے تیس دفعہ قرآن مجید پڑھا اور سمجھا تھا جن کے متعلق امام سفیان ثوری کا فرمان ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کے باب میں جب مجاہد کا قول معلوم ہو جائے تو پھر کسی دوسرے کے قول کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے ابواب تفسیر میں جابجا حضرت مجاہد رحمہ اللہ ہی کے قول کو معتبر ومعتمد علیہ قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بیشمار شاگردوں میں سے جو خداداد شہرت حضرت مجاہد رحمہ اللہ کو نصیب ہوئی ہے' وہ کسی دوسرے کو میسر نہیں ہوئی۔

فتح البیان سے حاشیہ جامع البیان میں منقول ہے کہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ هم من هذه الامة يتراكبون فى الطرق كما تراكب الانعام لا يستحيون من الناس ولا يخافون من الله فى السماء۔ (ص۔۲۴۳) "کہ وہ لوگ جو نماز کو ضائع کریں گے اور

خواہشوں کی پیروی کریں گے' وہ اس امت محمدیہ سے ہوں گے' وہ راستوں میں ایک دوسرے پر اس طرح چڑھیں گے جس طرح چارپائے حیوان ایک دوسرے پر چڑھتے ہیں' وہ لوگوں سے شرم و حیا نہیں کریں گے اور نہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں گے جو آسمان پر ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ کی تفسیر کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو حمائل امرتسری کے ص-۲۹۸ میں اس آیت کے حاشیہ پر نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اپنی امت پر دو باتوں کا خوف ہے' قرآن اور کچی لسی تو یہ ہے کہ بری چیز اور کھوئی یا کھوٹی چیز کے پیچھے لگیں گے اور پیچھے پڑیں گے مزوں کے اور چھوڑ دیں گے نماز کو اور رہا قرآن تو وہ یہ کہ اس کو منافق سیکھ کر ایمان والوں سے جھگڑا کریں گے (جیسے اب گمراہ فرقے چکڑالوی' مرزائی کر رہے ہیں) روایت کیا اس کو احمد نے۔ (ابن کثیر)

یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی' آج شہروں اور دیہات میں یہی حال ہے کہ لچے' لفنگے' لفنگے' بدمعاش اسی طرح بے حیا اور ڈھیٹ بن کر خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور بے شرمی کے کاموں سے لطف اور مزے اڑا رہے ہیں اور تارک نماز ہیں۔ اگر پورا نظارہ دیکھنا ہو تو سینما وغیرہ تماشا گاہوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بہرکیف اس آیت کے ظاہر متبادر الی الذھن مفہوم اور تفسیر مذکور سے ثابت ہوا کہ نماز کا تارک اور خواہشات پرست بالکل گمراہ ہے اور ایسا گمراہ ہے کہ جس کو توبہ اور ایمان اور عمل صالح کے بغیر جنت نصیب نہیں ہے۔ جامع البیان تفسیر قرآن میں ہے کہ ھذا یدل علی ان الایۃ فی الکفرۃ الا عند من یقول تارک الصلوۃ کافر و علیہ کثیر من السلف۔ "کہ توبہ اور تجدید ایمان کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ یہ آیت کافروں کے بارہ میں ہے لیکن جو شخص بے نمازوں کو کافر کہتا ہے وہ اس کو ان پر محمول کرے گا۔" بہت سے سلف صالحین کا یہی مذہب ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب الصلوۃ میں اس آیت کو ذکر کر کے تارک الصلوۃ کا کافر ہونا ثابت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ بروئے حدیث غی ایک کنواں ہے جس میں طبقہ علیا کے دوزخیوں کا نچوڑ بہہ کر گرے گا' اس میں بے نماز جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بے نماز کفار میں شامل ہیں' اگر وہ مسلمان گنہگار ہوتے تو دوزخ کے اس طبقہ علیا میں نہ ہوتے' جہاں سے وہ سزا کے بعد نکالے جائیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ احادیث صحیحہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ بے نماز کافر و مشرک ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے کہ بے نماز کافر ہے۔

قال محمد بن نصر المروزی سمعت اسحاق یقول صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تارک الصلوۃ کافر وکذالک کان رائی اہل العلم من لدن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تارک الصلوۃ عمدًا من غیر عذر حتی یذھب وقتھا کافر۔ (ترغیب) امام محمد بن نصر مروزی نے فرمایا کہ میں نے امام الائمہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث صحیح طریق سے ثابت ہو چکی ہے کہ نماز کا تارک کافر ہے اور اسی طرح تمام اہل علم کی رائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہی رہی کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے۔ اسی طرح اجماع صحابہ کا ترمذی اور کتاب الصلوۃ ابن القیم وغیرہ میں منقول ہے جب بے نماز کافر اور مرتد ہے تو پھر اس کو نمازوں کی قضا دینی فضول ہے' اس کو توبہ کر کے تجدید ایمان کرنی چاہیے اور نماز کا پابند ہو جانا چاہیے۔ پس قضا عمری مروجہ بدعت اور گمراہی ہے' جس کا کوئی ثواب اور درجہ نہیں ہے اور نہ ہی شرع میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ جو عام طور پر عادت عوام الناس کی ہو گئی ہے کہ دیدہ ودانستہ عمداً فرض نماز کو چھوڑ دیتے ہیں اور پھر دوسرے تیسرے دن اس کی قضائی دے لیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اس گناہ سے پاک وصاف ہو گئے۔ یہ خیال خام اور عقیدہ باطل ہے۔ جو نماز اپنے وقت پر فرض ہے' اس کو اسی وقت پر ہی ادا کرنا فرض ہے۔ قرآن میں ہے: ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتبا موقوتا "کہ نماز مومنوں پر وقت پر لکھی گئی اور مقرر کی گئی ہے"

تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ص ۱۶۹ میں ہے کہ نوفل بن معاویہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ من فاتتہ الصلوۃ فکانما وتر اھلہ ومالہ اور بطریق عبدالرزاق یہ الفاظ مروی ہیں کہ لان یوتر لاحدکم اھلہ ومالہ خیر لہ من ان یفوتہ وقت صلوۃ۔ یعنی جس کی نماز فوت ہو گئی گویا اس کا گھربار اہل وعیال سب لوٹ لیا گیا اور کسی کا گھربار اہل وعیال لوٹ لیا جانا نماز کے فوت ہونے سے بہتر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نماز چھوڑنے سے سب اعمال باطل ہو جاتے ہیں اور اس کا دفتر خالی ہو جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من ترک صلوۃ متعمدا احبط اللہ عملہ وبرات منہ ذمۃ اللہ حتی یرجع الی اللہ عزوجل توبۃ۔

(رواہ الاصبہانی' الترغیب) کہ جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو ضائع کر دیتا ہے' یہاں تک کہ وہ توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں نماز عصر کا ذکر آیا ہے کہ جس شخص نے عصر کی نماز چھوڑ دی' اس کے عمل حبط ہو گئے۔ اعمال حبط ہونے سے معلوم ہوا کہ وہ کافر مرتد ہو گیا کیونکہ مرتد ہونے سے عمل حبط ہو جاتے ہیں جیسے فرمایا اللہ عزوجل نے: ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ وھو فی الاخرۃ من الخسرین۔ "جو شخص کفر کرے ساتھ ایمان کے پس تحقیق ضائع ہوئے عمل اس کے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا" قرآن کے پارہ دوم میں نماز کو لفظ ایمان سے تعبیر فرمایا ہے۔ پس نماز کو چھوڑ دینا ایمان کو چھوڑ دینا ہے جیسے ایمان چھوڑ کر مرتد ہونے سے عمل ضائع ہو جاتے ہیں' اسی طرح نماز چھوڑنے سے عمل ضائع ہو جاتے ہیں جس طرح نسیان پر تجدید ایمان اور توبہ ضروری ہے' اسی طرح تارک نماز پر توبہ اور تجدید ایمان ضروری ہے۔ قضائی دینے سے تدارک نہیں ہو سکتا۔ پس اصلی نمازی وہ ہے جو نماز عمداً قضا نہ کرے۔

جس کی نماز کوئی بھی ہوتی نہیں قضا
اس کو سمجھنا چاہیے کامل نماز میں
آنے نہ دو دنیا کے بکھیڑوں کو اپنے پاس
اللہ کی طرف رہو مائل نماز میں
دنیا میں یہ نماز ہے معراج مومنین
یارب کبھی کوئی نہ ہو غافل نماز میں

قرآن مجید میں ہے: یایھا الذین امنوا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ ومن یفعل ذلک فاولئک ھم الخاسرون○ یعنی "اے ایمان والو! تمہارے مال اور اولاد تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں' جو لوگ مال' اولاد میں مشغول ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو جائیں گے وہ نقصان پانے والوں سے ہوں گے۔"

جامع البیان وغیرہ میں ذکر اللہ کی تفسیر الصلوات الخمس پانچ نمازیں ذکر کی گئی ہیں۔ آیت اقم الصلوۃ لذکری سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ خسران اصلی کفار کے لیے قرآن میں وارد ہے جو سورہ عصر وغیرہ میں مذکور ہے' پس ثابت ہوا کہ دنیا میں مشغول ہو کر

نماز چھوڑنے والے خسران میں ہیں اور وہ کافر ہیں' اس لیے آنحضور ﷺ نے ابر کے دن موسم برسات میں نماز سویرے پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ بکروا بالصلوۃ فی یوم الغیم فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر- (رواہ ابن حبان فی صحیحہ) "کہ ابر کے دن نماز جلدی سویرے ہی پڑھ لیا کرو کیونکہ جس نے نماز چھوڑ دی' وہ کافر ہوا"

دیکھو اور غور کرو کہ اگر تغافل دینے کا مسئلہ ہوتا تو ابر کے دن جبکہ عذر بھی ہو سکتا ہے' تارک نماز کو کافر نہ کہتے۔ ترک نماز فی الواقع کفر تھا' اس لیے آپ نے ابر وغیرہ کی پرواہ نہیں کی اور سویرے پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ چھوڑ دی تو کافر ہو جائے گا۔ حضرت علی بڑھنے کو آپ نے فرمایا تھا کہ ثلث لا تؤخرھا "کہ تین چیزوں میں دیر نہ کرنا الصلوۃ اذا اتت "ایک نماز جس وقت آجائے تاخیر نہ کریں۔" اس سے معلوم ہوا کہ تاخیر کرنا نماز کا گناہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ لا تؤخروا الصلوۃ "نماز میں تاخیر نہ کرو۔" پھر چھوڑنا تو اکبر الکبائر یعنی کفر ہے' اس لیے آنحضور ﷺ نے حضرت عبادہ بڑھنے کو یہ وصیت کی تھی کہ لا تترکوا الصلوۃ متعمدین فمن ترکھا متعمدا فقد خرج من الملۃ- (ترغیب) "کہ تم جان بوجھ کر نماز کو نہ چھوڑو کیونکہ جو شخص جان بوجھ کر نماز کو ترک کرے' وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔"

جنگ خندق میں جبکہ نماز خوف کا حکم نہ اترا تھا' کفار سے گھمسان کا رن پڑا تو اس وقت اس شرعی حکم کی وجہ سے نماز عصر رہ گئی' تب آنحضرت ﷺ نے بددعا فرمائی کہ ملاء اللہ بیوتھم وقبورھم نارا- "کہ اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھرے' انہوں نے ہم کو نماز عصر پڑھنے سے باز رکھا۔"

آنحضرت ﷺ کو کفار کی طرف سے جانی مالی نقصانات بہت پہنچے ہیں۔ آپ ایسے رحمتہ للعالمین تھے کہ کفار کے حق میں بددعا نہیں کی۔ لیکن نماز کا معاملہ ایسا نازک تھا کہ اس کا ترک ہو جانا مستلزم کفر تھا اور یہ اپنا حق نہ تھا بلکہ اللہ پاک کا حق تھا جو کفر اور اسلام میں فارق تھا' اس لیے بددعا فرمائی اور بہت افسوس کیا۔ اس سے ناظرین سمجھ لیں کہ نماز کی کتنی اہمیت ہے"

اپنے نبی کے ساتھ بغاوت ہے سر بسر
اگر نہیں جو ہوتے ہیں شامل نماز میں

دنیا کے غموں سے نہ گھبرایا دل کبھی
پڑ جاتی ہے جنگ کو مشکل نماز میں
اٹھنے کی اگرچہ تاب نہیں جسم زار میں
ہو جائے بیٹھے بیٹھے ہی شاغل نماز میں

اگر قضائی کا مسئلہ ہوتا تو جنگ میں نماز ترک کر دی جاتی پھر بعد میں پڑھ کر قضائی دی جاتی لیکن اس خطرناک حالت میں بھی نماز کم کر دینے کا حکم تو ہے ترک کر دینے اور قضا کر دینے کا حکم نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ اذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا۔ یعنی "جب تم زمین میں چلو (سفر کرو) تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے' یہ کہ تم نماز کم پڑھو' اگر تم ڈرو کہ کافر لوگ فتنہ میں ڈالیں گے۔" اس سے ثابت ہوا کہ سفر میں اور خوف میں نماز قصر ادا کرنے کا حکم ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے تو مشرکین (لڑنے والوں) نے کہا کہ لھٰؤلاء صلوۃ ھی احب الیھم من آبائھم وابنائھم وھی العصر فاجمعوا امرکم فتمیلوا علیھم میلۃ واحدۃ "کہ ان مسلمانوں کے لیے ایک نماز ہے کہ ان کو اپنے باپ بیٹوں سے بھی وہ زیادہ پیاری اور محبوب ہے اور وہ عصر کی نماز ہے (جس کو وہ ضرور پڑھیں گے) پس اپنے حملہ کی تیاری کر لو (جب وہ نماز پڑھنے لگیں تو) ان پر یکدم ہی حملہ کر دو۔" پھر جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور صورت حال سے آگاہ کر کے حکم دیا کہ صحابہ کی فوج کے دو گروہ بنا دیئے جائیں۔ ایک کو آپ نماز پڑھائیں اور دوسرا گروہ ہتھیار پکڑ کر کھڑا رہے۔ پہلا گروہ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے تو دوسرے کو دوسری رکعت پڑھا دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح نماز پڑھائی تو صحابہ کرام کی ایک ایک رکعت ہو گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو رکعت ہو گئیں۔

نماز خوف کی بہت سی صورتیں احادیث میں آئی ہیں۔ مصلحت کے لحاظ سے جس پر چاہیں عمل کر لیں۔ اگر نازک حالت ہو تو یہ فرمایا کہ صلوۃ الخوف رکعۃ علی ای وجہ کان "کہ خوف خطرہ کی نماز ایک رکعت ہے جس طرح ہو سکے پڑھ لیں۔" حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ولم یقضوا "کہ کسی نے ان میں سے قضا نہیں کی۔" جب ایسے نازک اور خطرناک حالات میں بھی نماز نہ ترک کی گئی اور نہ قضا کی گئی تو پھر بحالت امن اور آرام

گھروں میں رہتے ہوئے نماز ترک کرنا اور اس کی قضائی دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟
صرف جنگ خندق میں چار نمازیں دشمن کے ساتھ پھنس جانے پر رہ گئیں جن کو بعد میں ادا کیا گیا۔ اس وقت تک نماز خوف کا حکم نہیں اترا تھا۔ بعد ازاں نماز خوف کی مختلف صورتیں تعلیم کی گئیں اور ترک کا حکم نہیں دیا گیا۔ اب جس طرح ممکن ہو حتیٰ کہ اشارہ وغیرہ سے بھی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا' پیدل یا سوار جس طرح ہو سکے پڑھ لو۔ اسی طرح سفر میں بھی ترک کا حکم نہیں ہے' قصر کا حکم ہے کہ نو (۹) میل یا اس سے زائد کی مسافت پر جانا ہو تو دوگانہ نماز پڑھ لے۔ اگر سفر میں سخت مشکلات کا سامنا ہو یا جلدی چلنا ضروری ہو تو نمازیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ ظہر سے عصر ملا کر پڑھی جا سکتی ہے اور عصر سے ظہر ملا کر پڑھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مغرب سے عشاء کو ملا کر' عشاء سے مغرب کو ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ عذر شرعی سفر ہی کی وجہ سے ہے۔ جمع نماز کی پہلے نیت کر لی جائے گی۔ یہ شارع کی طرف سے انعام اور رخصت ہے لیکن ترک نماز اور قضاء کا حکم کسی جگہ نہیں ہے جیسے کہ آج کل ریل میں بہت بھیڑ بھاڑ ہو تو نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ پھر کل پرسوں گھر جا کر یا کسی جگہ پہنچ کر نماز کی قضائی دے لیں گے' یہ خیال باطل اور غلط ہے۔

نماز میں کمی ہو سکتی ہے اور تخفیف بھی ہو سکتی ہے کہ صرف ایک ایک تسبیح رکوع اور سجدہ میں اطمینان سے پڑھ لے۔ سورہ فاتحہ کے ساتھ صرف ایک آیت یا چھوٹی سورت کا ضم کرے' یہ سب کچھ جائز ہے لیکن نماز ترک کر کے کل قضائی دے دینا یہ حکم کسی جگہ نہیں ہے۔ ہاں ایک وقت میں فرصت نہ ہو تو دوسرے وقت کے ساتھ نماز جمع کر لینی درست ہے' کما مر۔

دیکھو بیمار کو بیماری کی حالت میں کیسی تکلیف ہوتی ہے' اس کو بھی یہ حکم ہے کہ صل قائما فان لم تستطع فقاعدا فان لم تستطع فعلی جنب "کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھ' اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر نماز پڑھ پس اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی قدرت نہ ہو تو ایک پہلو پر پڑھ لے یعنی لیٹ کر۔" (بخاری) ترک نماز کا حکم بیمار کو بھی نہیں ہے۔ اگر نماز چھوڑ کر پھر کسی وقت قضا دینی روا ہوتی تو بیمار اس کا مستحق تھا' لیکن اس کو بھی یہ اجازت نہیں دی گئی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیدہ دانستہ نمازیں چھوڑ کر قضا پڑھنی کسی دلیل شرعی ونص

صریح سے ثابت نہیں ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص جان کے خوف یا کسی صدمہ پہنچنے کی حالت پر مضطر اور بے قرار ہو کر تیمم اور اشارہ سے بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو یا مجبور اور مکرہ ہو کہ دشمن کے اکراہ میں گرفتار ہو گیا ہو اور نمازوں کا وقت جاتا رہا ہو تو وہ پھر ان عذرات کے مرتفع ہونے پر نماز پڑھ لے تو اللہ سے امید ہے کہ اس کو معافی مل جائے گی اور پکڑ نہ ہو گی' کیونکہ قرآن میں ہے : لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا "کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر بقدر وسعت اس کی کے۔" اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم "کہ ڈرو تم اللہ سے جس قدر کہ تم طاقت رکھتے ہو۔" حدیث میں ہے' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر سمع وطاعت پر یعنی احکام شریعت کی پابندی پر بیعت کرتے تو آپ فرمایا کرتے فیما استطعتم "کہ یہ پابندی تمہاری حسب استطاعت ہے۔"

ہاں یہ جو رواج ہو رہا ہے کہ جہازوں میں اڑتے ہوئے اور موٹروں' ریلوں میں سفر کرتے ہوئے کئی کئی نمازیں چھوڑ دیتے ہیں پھر بعض قضائی دے لیتے ہیں اور بعض کچھ پرواہ ہی نہیں کرتے' جو رہ گئی سو رہ گئی اور جو پڑھ لی سو پڑھ لی' یہ سب بروئے احادیث نبویہ واجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گنہگار ہیں۔ البتہ شرعی عذر جیسے نیند یا بھول جانا' تو جس وقت بیدار ہو یا یاد آئے' اسی وقت نماز پڑھ لے' اس کی نماز کا وہی وقت ہے۔ یہ نماز قضا کی نیت سے نہیں پڑھی جائے گی بلکہ ادا کی نیت سے پڑھی جائے گی۔ ہاں حتی الوسع نیند اور نماز کے بھولنے میں بڑی احتیاط رکھنا ضروری ہے' کیونکہ نماز معمولی چیز نہیں ہے' یہ شعار اسلام سے ہے۔ دنیا میں بھی مسلمانوں کی پہچان نماز سے ہے اور حشر میں بھی اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہو کر نماز پر حفاظت کرنے والا ہی ملے گا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ من سرہ ان یلقی اللّٰہ غدا مسلما فلیحافظ علی ھٰذہ الصلوات الخمس حیث ینادی بھن۔ (مشکوۃ) "کہ جس شخص کو خوش لگے کہ کل کو اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہو کر ملاقات کرے تو اس کو چاہیے کہ پانچ نمازوں پر نگہبانی رکھے جس جگہ کہ اس کو ان نمازوں کی دعوت دی جائے۔" (یعنی اذان دے کر بلایا جائے) اسی طرح حشر میں آنحضرت ﷺ بھی اپنی امت کو وضو اور نماز ہی سے پہچانیں گے اور گنہگار نمازیوں کی شفاعت ہو گی اور وہ دوزخ سے نکالے گئے' تب بھی نماز ہی کے نشانوں سے پہچانا

جائے گا۔ پس نماز دنیا اور آخرت میں اسلام کا شعار ہے' لہٰذا اس کو ترک نہ کرنا چاہیے' فاعتبروا یا اولی الابصار۔

شیعہ مذہب کا فتویٰ' شیعہ لوگوں کے لیے مقام عبرت: موجودہ حکومت میں ایک عنصر مذہب شیعہ کا ہے' لہٰذا ترک نماز اور نماز کو عاشورہ کے دن ضائع کرنے کے متعلق ان کے مذہب کا فتویٰ یہاں درج کرنا ضروری ہے تاکہ ناظرین کو ظاہر ہو کہ شیعہ لوگ اپنے مذہب کے مطابق مسلمان ہیں یا نہیں۔ چنانچہ سراج العباد مصنفہ حاجی آقا مرزا حسن مجتہد شیعی جو کہ شیعہ حضرات کے نزدیک نہایت ہی معتبر کتاب ہے اور نواب نوازش علی خان کے حکم سے لکھی گئی ہے' اس میں ص ۴۲۸ پر گناہ کبیرہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "و در ارشاد القلوب مسطورست ایں حدیث کہ کسے کہ بسوزد ہفتاد قرآن را و بکشد ہفتاد ملک وزنا کند باہفتاد دختر باکرہ نزدیک ترست برحمت خدا از کسیکہ ترک کند نمازے را عمداً موافق حدیث پیغمبر اسلام کہ من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر وکلام پروردگار کہ رسد اقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین پس تارک الصلوۃ وبت پرست در یک سلک خواہند بود و در جامع الاخبار است کہ ہر کہ اعانت کند تارک الصلوۃ را بلقمہ یا بلباسے گویا کشتہ است ہفتاد پیغمبر را کہ اول ایشاں آدم وآخر ایشاں محمد ﷺ است حدیث ست از حضرت رسول کریم کہ اگر کسی تبسم کند بر روئے تارک الصلوۃ چناں ست کہ ہفتاد مرتبہ خانہ کعبہ را خراب کردہ باشد وہفتاد ملک را کشتہ باشد واگر یک شربت آب کسی اعانت کند بتارک الصلوۃ محاربہ ومجادلہ کردہ است با من وباجمیع پیغمبرا انتہی۔

یعنی ارشاد القلوب میں حدیث لکھی ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر نماز چھوڑتا ہے وہ ستر قرآن مجید جلانے اور ستر ملک تباہ کرنے اور ستر کنواری لڑکیوں سے زنا کرنے سے برا ہے۔ اس حدیث کے موافق کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جان بوجھ کر نماز کا تارک کافر ہے اور قرآن مجید میں فرمایا کہ نماز ادا کرو اور مشرک نہ بنو۔ پس تارک نماز اور بت پرست یکساں ہیں اور کتاب جامع الاخبار میں ہے کہ جو تارک نماز کی ایک لقمہ یا کسی کپڑے کے ساتھ مدد کرے تو گویا اس نے ستر نبیوں کو قتل کیا کہ ان میں پہلے حضرت آدم اور آخر جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہوں اور حدیث میں ہے کہ اگر کوئی تارک نماز سے ہنسی اور خندہ پیشانی سے پیش آئے تو ستر دفعہ کعبہ گرا دینے اور ستر ملک تباہ کرنے کے برابر ہے اور اگر بے

نمازی کو ایک گھونٹ پانی پلائے تو گویا اس نے میرے اور تمام پیغمبروں کے ساتھ جنگ کیا۔"
یہ شیعہ مذہب کا حکم ہے کہ بے نماز کافر ہے اور بڑے بڑے گناہگاروں سے بدترین ہے۔ بایں ہمہ بہت لوگ شیعہ مذہب کے بے نماز ہیں اور قاتلان حسینؓ سے بدترین قاتلان پیغمبراں ہیں۔
اب اہل سنت اور شیعہ کے بے نماز لوگوں کو نکال کر باقی پر غور کریں کہ پاکستان میں کتنے مسلمان رہ گئے اور کیا ملک صحیح معنوں میں پاکستان ہے اور جو نمازی لوگ وہ بے نمازوں سے برتاؤ رکھتے ہیں تو سب بقول شیعہ وہ پیغمبروں سے جنگ کرنے والے ہیں۔ اب شیعہ مذہب کے حکام عبرت حاصل کریں جو خود بے نماز ہیں یا بے نمازوں سے دوستانہ برتاؤ کر کے اسلام سے خارج ہو رہے ہیں۔ خصوصاً وہ شیعہ عبرت پکڑیں جو محرم کے مہینہ میں عاشورہ کے دن تعزیہ نکالتے ہوئے اور ماتم کرتے ہوئے نمازیں ضائع کرتے ہیں کہ وہ اہل بیت کی محبت کے ثواب حاصل کرنے کی بجائے کنواری لڑکیوں سے زنا کرنے اور قرآن جلانے کے برابر گناہ حاصل کرتے ہیں اور یزیدیوں پر تبرا کا اجر لیتے لیتے خود ستر دفعہ کعبہ گرا دینے اور پیغمبروں کے قتل کر دینے کے برابر گناہ پا کر قاتلان حسینؓ سے بدترین ٹھہرتے ہیں' کیونکہ یا خود نماز ترک کرتے ہیں یا بے نمازوں کو شربت پلاتے ہیں اور ان سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ شیعہ مذہب کے مرد عورتیں اور حاکم محکوم اس وعید اور ان گناہوں سے بچ نہیں سکتے۔ قاتلان حسینؓ کو برا کہتے کہتے خود ان سے بھی بدترین ہو گئے' عاشورہ کے دن نمازیں ضائع کرنے کی شہادت خود شیعہ مذہب کے لوگ دے رہے ہیں۔
چنانچہ کتاب المنہج مصنفہ سید محمد رضی الرضوی القمی بن علامہ سید علی الحائری شیعی صاحب تفسیر لوامع التنزیل ص۔۱۲۹ میں ہے' افسوس ہے عاشورہ کو جن اعمال کے کرنے کا حکم مذہب حق نے دیا ہے' بہت کم اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ سید الشہداء نے تو عین ظہر روز عاشورہ کو خاص بوقت شہادت بھی ایسی سخت مصیبت کے وقت نماز کو ادا کر کے قوم کو تعلیم دے دی ہے کہ نماز جیسی ضروری عبادت مفترضہ کسی وقت میں کسی طرح بھی ترک نہیں کی جا سکتی' مگر بعض عزا داروں کا یہ حال ہے کہ وہ عاشورہ کے روز بھی نماز نہیں پڑھتے اور اسی طرح وہ اس روز کے اپنے تمام اعمال کو باطل کر دیتے ہیں' نماز نہ پڑھنے سے عاشورہ کے سب عمل باطل ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے : الصلٰوۃ ان قبلت قبل ما سواھا

وان ردت ردما سواھا۔ "اگر نماز قبول ہو گئی تو پھر دوسرے اعمال بھی قبول ہو سکیں گے' ورنہ تمام عمل باطل اور رد ہو جائیں گے' انتہی۔"

یہ شیعہ مذہب کا فیصلہ ہے جس کو تسلیم کرنا شیعہ لوگوں کا فرض ہے۔ اب چاہیے کہ کوئی شیعہ عاشورہ اور عین عاشورہ کے دنوں میں بے نماز نہ رہے اور کسی سخت مصیبت میں بھی نماز ترک نہ کرے ورنہ ان کے سب اعمال مردود ہیں۔

تصوری نماز: تصوری نماز یہ ہے کہ بعض مرید اپنے پیر اور مرشد کی صورت اپنے دل میں حاضر رکھ کر نماز پڑھتے ہیں بلکہ نماز ہو یا کوئی ذکر ہو ہر عبادت کے وقت مرید اپنے شیخ کی صورت خیالیہ ذہن میں رکھ کر عبادت کرتا ہے جس طرح صورت قرطاسی یعنی تصویر سامنے رکھ کر بعض لوگ پوجا کرتے ہیں اور بت پرست' بت کو سامنے رکھ کر بت پرستی کرتے ہیں' اسی طرح بدعتی اور مشرک کلمہ گو اپنے شیخ کی صورت خیالی کو ذہن میں رکھ کر نماز پڑھتے ہیں' وہ بت پرست ظاہری بت پرست ہیں' یہ تصور شیخ والے باطنی بت پرست ہیں۔ دونوں مشرک یکساں ہیں' کیونکہ تصور شیخ بحالت عبادت نماز وغیرہ میں اپنے مرشد کا تقرب حاصل کرنا یا مرشد کے تصور فی العبادت کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ بنانا شرک ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایمان اور اسلام کی تعریف کرتے ہوئے احسان کی تعریف یہ فرمائی کہ ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک "کہ احسان یہ ہے کہ بندگی کرے تو اللہ کی گویا کہ تو اس کو دیکھتا ہے پس اگر تو نہیں دیکھ سکتا اس کو پس تحقیق وہ دیکھتا ہے تجھ کو۔" یعنی اس طرح توجہ الی اللہ سے عبادت کر کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے اور وہ مالک معبود تیرے سامنے ہے اور تو اس کے حضور میں کھڑا ہے۔ اگر ایسی حالت عبادت میں تجھے حاصل نہیں ہے تو یہ تصور بلکہ یقین کر لے کہ وہ حاضر ناظر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس میں بھی خوف وخشیت پیدا ہو گی' حرکات وسکنات میں عابد احتیاط کرے گا۔ مدار دین کا ایمان اور اسلام اور احسان (یعنی اخلاص' تصوف) پر ہے۔ احسان سے مراد توجہ الی اللہ اور حضور قلب ہے۔ جب تصور شیخ کیا گیا تو ایک تو احسان نہ رہا' دوم بجائے توجہ الی اللہ کے توجہ الی الشیخ ہو گئی' یہی شرک فی العبادت ہے۔ قرآن میں فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملا صلحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا۔ یعنی "جو شخص امید کرتا ہے اپنے پروردگار کے

ملنے کی پس اس کو چاہیے کہ اچھے عمل کرے اور عبادت الٰہی میں کسی کو شریک نہ کرے۔" اس آیت سے قبولیت عمل اور ملاقات الٰہی کا حصول دو چیزوں سے ثابت ہوا۔ اول یہ کہ عمل صالح ہو اور عمل صالح وہ ہے جو مطابق کتاب وسنت ہو۔ دوم اخلاص یعنی عمل کا خالص اللہ کے لیے ہونا' کسی غیر کا لگاؤ' کسی طرح بھی نہ ہو۔ نہ ظاہراً نہ باطناً نہ قولاً نہ فعلاً' نہ حالاً نہ خیالاً' اس آیت سے تصور شیخ یا ربط قلب بالشیخ شرک ثابت ہوا کیونکہ اس سے غیر اللہ سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے"

ایک سے جب دو ہوئے تو لطف یکتائی نہیں
اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھچوائی نہیں

بعض لوگ یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ عبادت اور اعمال صالحہ میں آنحضرت ﷺ کا خیال بایں طور آجایا کرتا ہے کہ اس کام کی بابت آپ نے یہ حکم دیا ہے یا یہ کام آپ نے یوں کیا ہے اور آپ کا اسوہ حسنہ جان کر عمل کیا جاتا ہے بس یہی تصور شیخ ہے تو یہ خیال باطل اور عقیدہ فاسد اور قول کاسد ہے' کیونکہ اس کو تصور اصطلاحی متنازعہ سے کچھ تعلق نہیں ہے' کیونکہ صحابہ کرام یا دیگر مسلمین قصد کر کے عبادت میں آنحضرت ﷺ کا تصور نہیں رکھا کرتے تھے بلکہ احیاناً جب آنحضرت ﷺ کا ذکر آیا یا عمل کی کیفیت اور اس کے کرنے کا طریقہ خیال میں آتا تو آپ کی مبارک صورت بھی پھر جاتی کہ آپ نے یہ کام اس طرح کیا یا اس کا حکم اس طرح دیا' یہ اور بات ہے اور صورت مرشد اور شیخ کی صورت خواہ مخواہ نفس خیال میں باندھنا اور ذکر الٰہی کے وقت یہ تصور کرنا کہ فیض الٰہی شیخ کے سینہ میں سے نکل کر مرید اور طالب کے سینہ میں آتا ہے اور اس کے وسیلہ سے میری یہ عبادت قبول ہوتی ہے اور اس پر جدوجہد اور مشق کرنا اور اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھنا یہ اور چیز ہے' جس کو فقراء مجددیہ کرتے ہیں اور بہت اہل بدعت عمل میں لاتے ہیں اور پیر ان کو سکھلاتے ہیں اور یہ ان میں کیسی اور مشق چیز ہو گئی ہے اور مسئلہ شرعی بن گیا ہے' جو قرون ثلاثہ میں نہ تھا۔ اس کے شرک خفی اور بدعت ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے' کیونکہ نہ دلیل شرعی سے یہ ثابت ہے اور نہ عہد صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین میں اس پر تعامل پایا گیا ہے

فکل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة لہٰذا یہ عین گمراہی ہے۔

جو لوگ نماز وغیرہ عبادت تصور شیخ سے کریں گے وہ سب مشرکانہ ہو گی' اصلی موحدانہ

عبادت نہیں ہو گی' جیسے مشائخ چشتیہ کرتے ہیں' موحدین کو اس سے بچنا واجب ہے' فلا علیک ان لا تتوجه الا الی الله ولا ترتبط قلبک الا به ولا بالتوجه الی العرش وتصور النور الذی وضعه علیه وهو اظهر اللون کمثل لون القمر او بالتوجه الی القبلة یعنی "تجھ کو اللہ کے علاوہ کسی طرف توجہ اور دل کا ربط نہ کرنا چاہیے' خواہ نور عرش ہو یا کچھ اور اللہ کے سوا قبلہ توجہ کچھ نہ ہونا چاہیے۔ (بحوالہ قول جمیل)

پس اصلی نمازی وہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھے اور اس کی نماز عین سنت نبویہ کے مطابق ہو' غیر کی طرف خیال اور توجہ کر کے نماز پڑھنے والا اصلی نمازی نہیں ہے بلکہ وہ نقلی ہے اور اس کا یہ عمل شرک خفی پر مبنی ہے اور بدعت سیئہ پر اس کی بنیاد ہے' ہرگز ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

چک ۵۷ ضلع منٹگمری (ساہیوال)

ہفت روزہ اہلحدیث سوہدرہ جلد ۲' شمارہ ۱۸ تا ۲۸ مورخہ ۸ مئی سنہ ۱۹۵۰ء تا ۲۳ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

اہمیت نماز

بے نماز کے کفر و اسلام پر محققانہ بحث

اخبار "اہلحدیث" دہلی میں اس موضوع پر بنارس کے ایک مولانا صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے' انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ بے نماز مسلمان ہے' اسے پڑھ کر حسب ذیل مضمون لکھا گیا ہے۔ (حصاری)

حضرات! یہ مسئلہ کہ بے نماز مومن اور مسلمان ہے یا کافر و مشرک اور خارج از اسلام؟ علمائے اسلام خصوصاً علمائے اہلحدیث میں معرکتہ الآراء بنا ہوا ہے۔ علماء عہد حاضر کے علاوہ زمانہ ماضیہ میں جو اکابر علمائے اہلحدیث ہو چکے ہیں' ان میں بھی اس مسئلہ میں سخت اختلاف رہا ہے کہ بعض بے نماز کو مسلمان گنہگار تصور کرتے رہے اور بعض کافر خارج از اسلام قرار دیتے رہے۔ یہ اختلاف نہایت مذموم ہے' کیونکہ کتاب و سنت میں صاف صاف دلائل

آچکے ہیں کہ بے نماز کافر و مشرک ہے۔ واضح دلائل کے بعد اختلاف کرنا علمائے یہود کا شیوہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے : ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاء ھم البینات واولئک لھم عذاب عظیم۔ "اے اہل ایمان! تم مت ہو مانند ان لوگوں کے کہ متفرق ہوئے اور اختلاف کیا انہوں نے پیچھے اس بات کے کہ آئیں ان کے پاس دلیلیں اور یہ لوگ واسطے ان کے عذاب ہے بڑا۔"

جب کسی مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہو تو ان میں ایک طرف ہی حق ہو سکتا ہے۔ سب کی طرف نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ : فماذا بعد الحق الا الضلال۔ "کہ حق کے بعد گمراہی ہے۔"

اگر دونوں فریق حق پر قرار دیئے جائیں تو حق میں تعدد لازم آئے گا حالانکہ حق صرف ایک ہے اس میں نہ تعدد ہے اور نہ تضاد ہے' ورنہ سب گمراہ فرقوں کا حق پر ہونا لازم آئے گا جو بالاتفاق باطل ہے۔ جب یہ ثابت ہو کہ افتراق کے وقت حق ایک طرف ہو گا تو مسئلہ تارک الصلوۃ میں مسلک حق یہ ہے کہ بے نماز کافر مشرک اور خارج از اسلام ہے۔ اور اسی پر صحابہ کا اجماع ہے۔ جو لوگ بے نماز کو مومن اور مسلمان کہتے ہیں' وہ سراسر جھوٹے اور سخت غلطی میں مبتلا ہیں اور وہ اہل رائے کی طرح احادیث نبویہ ﷺ کی بے جا تاویلیں کرتے ہیں اور وہ اصول: النصوص تحمل علی ظواھرھا کے تارک ہیں۔ اور جب گمراہ فرقوں سے بحث ہو تو اس سے کام لیتے ہیں جو بڑی غلطی ہے۔

پھر ان حضرات کی دوسری غلطی یہ ہے کہ دعویٰ خاص پر دلائل عامہ لاتے ہیں' جو اصول مناظرہ کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ دعویٰ خاص پر دلیل خاص لانے کا حکم ہے۔ دعویٰ خاص پر دلیل عام اس وقت لائی جاتی ہے جب دلیل خاص موجود نہ ہو۔

فتاویٰ نذیریہ ج۔۲' ص۔۳۲۱ میں بحوالہ فتح الباری یہ لکھا ہے : ان حکم الشئی الخاص الذی لم یذکر فیہ نص داخل تحت حکم دلیل أخر بطریق العموم۔ یعنی "وہ شے خاص جس میں کوئی نص وارد نہ ہو' عام دلیل کے تحت وارد ہوتی ہے۔" اس سے ظاہر ہوا کہ جس خاص مسئلہ پر نص وارد ہو اس کو عام دلیل کے تحت لانا سراسر تحکم ہے۔ خصوصاً ایسی دلیل عام کے تحت کہ جس دلیل خاص کی تردید یا تاویل لازم آئے' صاف طریقہ باطل ہے۔ جو علماء بے نماز کو اپنے مسلمان بھائی سمجھتے ہیں' ان کو انتباہ کیا جاتا ہے کہ وہ بے

نماز کو مومن اور مسلمان ثابت کرنے کیلئے دلائل عامہ پیش کر کے اپنا عجز اور جہالت ظاہر نہ کریں بلکہ اس موضوع خاص پر دلیل خاص پیش کر کے اپنا دعویٰ ثابت کریں۔

موضوع بحث یہ ہے کہ (۱) بے نماز مومن ہے یا مشرک؟ (۲) بے نماز مسلمان ہے یا کافر؟

فریق غیر مکفرین کا دعویٰ یہ ہے کہ بے نماز مومن اور مسلمان ہے۔

اور فریق مکفرین کا دعویٰ یہ ہے کہ بے نماز کافر و مشرک ہے۔

اب ہر فریق کو اپنے اپنے دعویٰ پر ایسی دلیل پیش کرنا لازم ہے جس پر صریح تارک الصلوٰۃ کا ذکر ہو' ورنہ کسی فریق کی دلیل قابل سماعت نہ ہو گی اور دلیل خلاف آداب مناظرہ پیش کرنے والے کو جاہل تصور کیا جائے گا۔

اب ہو رہے گا عشق و ہوس میں خود امتیاز
آیا تو ہے مزاج تیرا امتحان پر

اس تمہید کے بعد راقم الحروف (حصاری) کی غرض یہ ہے کہ میرا موضوع بحث یہ ہے کہ "بے نماز کافر و مشرک' خارج از اسلام ہے وہ نہ مومن ہے نہ مسلمان۔"

بے نماز کے کافر ہونے پر دلائل: قرآن مجید سورہ روم میں یہ آیت ہے: واقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین۔ یعنی "تم نماز کو قائم کرو اور مشرک نہ بنو۔" اس آیت میں ایک حکم ہے کہ نماز کو قائم کرو۔ پس نماز کو قائم کرنا فرض ہوا۔

دوسری نہی ہے کہ "تم مشرک نہ بنو۔" اس جملے کا پہلے جملے سے تعلق یہ ہے کہ اگر نماز نہ قائم کی تو شرک لازم آئے گا' قرآن مجید میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم۔ یعنی "اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے عملوں کو ضائع نہ کرو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ اور رسول کی اطاعت کے بغیر اعمال کرو گے تو وہ ضائع ہو جائیں گے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے کہ "اے مومنو! تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ بطور تجارت کے ہو جو آپس کی رضامندی سے ہوتی ہے۔" پھر فرمایا: ولا تقتلوا انفسکم "اور تم اپنے نفسوں کو ہلاک نہ کرو۔" اب اس جملے کا جوڑ اور ربط پہلے جملے سے یہ ہے کہ اگر تم باطل طریقہ سے مال کھاؤ گے تو نار جہنم میں جا

کر ہلاک ہو گئے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے کہ ولن اقم وجھک للدین حنیفا ولا تکونن من المشرکین۔ یعنی "سیدھا کر اپنے منہ کو دین حنیف کے لئے اور مت ہو مشرکوں سے۔" (یعنی اگر دین حنیف قائم نہ کیا تو شرک لازم آئے گا) ٹھیک اسی طرح آیت سورہ روم میں اقامت صلوۃ کے بعد مشرکین میں ہونے سے ممانعت کی گئی ہے۔ تو اس کا جوڑ اور ربط بھی یہی ہے کہ اگر نماز قائم نہ کی تو مشرکین میں شمار ہو گے۔ چنانچہ حدیث میں بھی اسی کی تفسیر یہی آئی ہے۔

حضرت ثوبان بنٹھ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے یہ سنا ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے: بین العبد وبین الکفر والایمان الصلوۃ واذا ترکھا فقد اشرک۔ (رواہ الطبری وقال اسنادہ صحیح علی شرط مسلم' کتاب الصلوۃ محقق ابن القیم) یعنی "بندے' کفر اور ایمان کے درمیان نماز فرق ہے' پس جب اس کو چھوڑ دے گا مشرک ہو جائے گا"

اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے وہ مومن ہے ورنہ اس کا ایمان نہیں اور اس کو مومن نہیں کہ سکتے۔ قرآن مجید (پارہ۔۲) میں نماز کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے' جس سے ثابت ہوا کہ بے نماز' بے ایمان ہے۔

محقق ابن القیم فرماتے ہیں کہ بے نماز کو مسلمان اور مومن نہیں کہ سکتے۔

تفسیر حسینی میں تفسیر بسیر سے منقول ہے کہ "شیخ محمد بن اسلم طوسی نے کہا کہ میں نے چاہا کہ حدیث من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر کی ممانعت قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت کروں' پس میں نے کئی سال غور کیا تو یہ آیت پائی یعنی یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے: فاعتبروا یااولی الابصار۔ آیات تو اور بھی ہیں مگر بندہ نے بحث میں کئی امور علیحدہ ذکر کرنے ہیں' اس لئے اختصار سے کام لیتا ہوں۔

بے نماز کے مشرک ہونے کی دوسری دلیل: بروایت جابر بنٹھ مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلوۃ۔ یعنی "بندے' کفر اور شرک کے درمیان صرف نماز چھوڑنے کا فرق ہے" یعنی اگر نماز چھوڑے گا تو (شرک میں پڑ کر) مشرک ہو جائے گا

چنانچہ ابن ماجہ کی حدیث' اس حدیث کی شرح اور تفسیر ہے جو حضرت انس بنٹھ سے

مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لیس بین العبد والشرک الا ترک الصلوۃ فاذا ترکھا فقد اشرک۔ یعنی "نہیں ملاپ ہے درمیان بندہ اور شرک کے مگر نماز کا چھوڑنا' جب کسی نے نماز کو چھوڑ دیا تو وہ مشرک ہو گیا"

پس قرآن وحدیث سے بے نماز مشرک ثابت ہوا اور ترک نماز میں شرک اجتماع ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: اورایت من اتخذ الھہ ھواہ۔ یعنی "کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔" چنانچہ سورہ مریم کی یہ آیت بھی اسی مطلب کی موید ہے: اضاعوا الصلوۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا۔

بے نماز کافر ہے: حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ فرماتے تھے: العھد الذی بیننا وبینھم الصلوۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ یعنی "وہ عہد جو ہمارے اور کافروں کے درمیان ہے وہ نماز کا ہے اور جس نے نماز ترک کر دی وہ کافر ہوا۔"

اس حدیث سے صاف ثابت ہوا کہ بے نماز کافر ہے اور یہ کفر حقیقی ہے کیونکہ یہ عہد کفار سے ہے' جو کفر حقیقی رکھتے ہیں۔ اگر ھم کی ضمیر منافقین کی طرف راجع ہے تو بھی یہ کفر حقیقی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین سے یہ عہد تھا کہ اگر تم نماز پڑھو تو ہمارے ساتھ ہو اور اگر چھوڑ دو گے تو کفار میں شمار ہو گے۔ کفار اور منافقین کا کفر حقیقی تھا۔ نماز کے تارک کو بھی ان کے ساتھ شمار کیا گیا کہ اس کا حکم بھی کافروں کا ہے۔

بے نماز کے کفر پر دوسری دلیل: ترغیب میں یہ حدیث بروایت صحیح ابن حبان ہے کہ بریدہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بکروا بالصلوۃ فی یوم الغیم فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ یعنی "ابر والے دن نماز کو سویرے پڑھو' کیونکہ جس نے نماز ترک کر دی وہ کافر ہوا۔" اس حدیث میں ابر والے دن نماز کو سویرے پڑھنے کا حکم دے کر اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ نماز ترک ہو گئی تو کافر ہو جائے گا۔

اس سے یہ تاویل بھی باطل ہوئی کہ یہ حکم تہدیداً و تغلیظاً ہے' کیونکہ تہدیدی حکم ترہیب کے لئے ہوتا ہے' دوسرے حکم کی علت نہیں بنتا۔ علت وہی حکم ہوتا ہے جو واقعی ہو۔ اسی طرح امام طاجیون کی تاویل بھی باطل ہوئی کہ وہ کہتے ہیں کہ نھایۃ کا حکم بدایۃ پر لگایا گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ابر کے دن نماز ترک ہونے پر کفر کا حکم نہ لگایا جاتا۔ اس حدیث

میں نماز کی اس قدر اہمیت اور عظمت بیان کی گئی ہے کہ اگر ابر کے دن بھی نماز ترک کر دی تو کافر ہو جائے گا۔ یہاں کسی معمولی کی تاویل نہیں چل سکتی۔

بے نماز کے کفر پر تیسری دلیل: عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر جھارا۔ (رواہ طبرانی فی الاوسط باسناد لاباس بہ) یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز قصداً چھوڑ دی وہ کھلم کھلا کافر ہوا۔" (جس میں کوئی شبہ نہیں)

اس حدیث سے بھی بے نماز کا کافر ہونا ثابت ہوا اور عمداً کی قید پائی گئی کہ آج کل قصداً نمازیں چھوڑ کر کافر بنے ہوئے ہیں۔ جن کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی بھول گیا ہو یا بیہوشی طاری ہو گئی ہو' یا کسی دشمن نے اسے روک دیا ہو اور اس پر صورت اکراہ پیدا کر دی جس سے اس نے تقیہ کر لیا جیسے ہمارے خونی انقلاب میں ہندوستان میں کئی مقامات پر ایسا ہوا تھا تو ان تمام صورتوں میں کفر عائد نہیں ہوتا۔ خود ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے غطفان کی جنگ میں نماز عصر چھوڑ دی تھی کہ کفار نے نماز پڑھنے کا وقت ہی نہ دیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے رات کو قضائی دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ترک نماز وہی موجب کفر ہے جو قصداً واقع ہو' جیسے آج کل عادت ہے۔

بے نماز کے کافر ہونے پر چوتھی دلیل: امام محمد بن نصر نے کتاب الصلوۃ میں ایک حدیث روایت کی ہے جس کو امام منذری نے ترغیب میں نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بین العبد والکفر او الشرک ترک الصلوۃ فاذا ترک الصلوۃ فقد کفر۔ یعنی "بندہ' کفر اور شرک کے درمیان میں فرق نماز کا ترک کرنا ہے' پس جب نماز چھوڑ دی تو بیشک وہ کافر ہوا۔"

اس حدیث سے بھی بے نماز کا کافر ہونا ثابت ہوا۔ کفر اور شرک ہر دو کا اطلاق کفر حقیقی پر ہوتا ہے۔ (کما لا یخفی علی اھل العلم)

بے نماز کے کافر ہونے پر پانچویں دلیل: ترغیب میں ہے' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: عری الاسلام وقواعد الدین ثلاثۃ علیھن اسس الاسلام من ترک منھن واحدۃ فھو بھا کافر حلال الدم شھادۃ ان لا الہ الا اللہ والصلوۃ المکتوبۃ وصوم رمضان وفی روایۃ عن ابن عباس مرفوعا من ترک منھن

واحدة فهو باللّٰہ کافر ولا یقبل منه صرف ولا عدل وحل دمه وماله یعنی "اسلام کی رسیاں اور دین کے قاعدے جن پر اسلام کی بنیاد ہے' تین ہیں۔ جس نے ان میں سے ایک کو بھی ترک کر دیا وہ کافر باللہ حلال الدم ہے' جس کا خون اور مال لوٹنا حلال ہے اور جس کا کوئی نیک کام فرض نفل وغیرہ قبول نہیں ہے اور وہ یہ ہیں گواہی دینا کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں ہے اور فرض نماز اور رمضان کے روزے۔"

اس روایت نے مؤولین کی تمام تاویلوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس حدیث کو ابو یعلی نے باسناد حسن روایت کیا ہے۔ کما قال المنذری فی الترغیب۔ اگر یہ روایت ضعیف ہو تب بھی کفر کی تاویل باطل کرنے کے لیے یہ کافی ہے' کیونکہ روایت ضعیف بھی رافع احتمال ہو جاتی ہے۔

بے نماز کے کافر ہونے پر چھٹی دلیل: عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کا ذکر فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ جس نے نماز کی حفاظت کی اس کے لئے نماز بروز قیامت روشن دلیل اور نجات کا باعث ہو گی اور جس نے حفاظت نہ کی (یعنی بالکل ترک کر دی یا کبھی پڑھی اور کبھی چھوڑ دی) تو اس کے لئے نہ نور ہو گا اور نہ دلیل ایمان نہ نجات ہوگی اور وہ قیامت کے دن قارون' فرعون' ھامان' ابی بن خلف کے ساتھ شامل ہو گا۔ (رواہ احمد فی مسندہ ورجاله ثقات) اس حدیث پر حضرت علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب ھدایة المسائل فی ادلة المسائل (ص-۷۹) میں فرماتے ہیں۔

> "دریں جا دلیل است بر آنکہ ترک نماز کفر شنیع است زیراکہ اشتبا اشد نارانند در عذاب و نیز دلیل است بر تخلید تارک نماز در نار مثل تخلید مذکور این کہ ہمراہ شان او عذاب النار۔"

یعنی یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ بے نماز کا کفر انتہائی درجہ کا کفر ہے کیونکہ جن کے ہمراہ ہو گا وہ سخت ترین عذاب میں مبتلا ہیں۔ نیز یہ دلیل ہے کہ بے نماز ہمیشہ جہنم میں رہے گا جیسا کہ کفار فرعون وغیرہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ اس حدیث نے مؤولین کی تمام تاویلوں کا کچومر نکال دیا ہے کہ کوئی تہدید و تغلیظ پر محمول کرتا تھا اور کوئی کفر دون کفر قرار دیتا تھا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بے نماز کا کفر حقیقی اور سخت درجہ کا کفر ہے۔ جس کی بنا پر وہ بڑے بڑے کفار کے ساتھ قیامت کو شامل کیا جائے گا اور اس سے

جہنم میں رہے گا۔

اور اس شخص کی تاویل بھی باطل ہوئی جو کہتا ہے کہ بے نماز کا کفر ایسا ہے جس سے آخر کار جہنم سے باہر آجائے گا حالانکہ نہ فرعون' ہامان وغیرہ جہنم سے نکلیں گے اور نہ بے نماز ان کا ساتھی نکلے گا سب ہی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی یہ ذکر ہے کہ جنتی لوگ دوزخیوں سے دریافت کریں گے۔ ما سلککم فی سقر "کہ تم کو دوزخ میں کس چیز نے ڈال دیا ہے۔" لم نک من المصلین "کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

یہ دوزخی چار قسم کے ہوں گے۔ ایک بے نماز' دوم تارک زکوۃ' سوم خائضین' چہارم مکذب یوم الدین۔ ان چاروں کے بارے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: وما تنفعھم شفاعۃ الشافعین "کہ ان لوگوں کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کوئی نفع نہ دے گی۔" پس یہ دوزخ سے خارج نہ ہوں گے۔

تفسیر خازن اور معالم میں ہے' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ملائکہ' انبیاء' شہداء' صلحاء اور سب مومنین گنہگاروں کی شفاعت کرائیں گے۔ جن کی شفاعت سے لوگ دوزخ سے سزا بھگت کر نکلیں گے۔ فلا یبقی فی النار الا اربعۃ ثم تلا قالو الم نک من المصلین۔ یعنی "دوزخ میں ہمیشہ چار قسم کے لوگ رہ جائیں گے۔ پھر یہ آیت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے روایت کی۔ اسی طرح عمران ابن حصین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الشفاعۃ نافعۃ لکل واحد دون اربعۃ الذین تسمعون۔ یعنی "شفاعت ہر ایک گنہگار کو نفع دے گی سوائے ان چار قسم کے لوگوں کے جن کو تم سن چکے ہو۔" اس لئے ثابت ہوا کہ یہ چار قسم کے لوگ علیحدہ علیحدہ بیان ہے۔ یہ نہیں کہ ایک ہی قسم کے لوگوں کی یہ چاروں خصائل مراد ہوں۔ ان میں ایک بے نماز ہیں جو کسی قسم کی سفارش سے محروم ہیں اور وہ مخلد فی النار ہیں۔

فتح البیان وغیرہ بعض تفسیروں میں بھی یہ لکھا ہے: ان تارک الصلوۃ یخلد فی النار۔ یعنی "تارک نماز ہمیشہ کا جہنمی ہے۔" نیز جب بے نماز مشرک اور کافر ثابت ہوا تو اس کے ہمیشہ جہنمی ہونے میں کیا شبہ ہے۔

<u>بے نماز ملت اسلامیہ سے خارج ہے:</u> عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کرو۔ ولا

تعرکوا الصلوۃ عمدا فمن ترکھا عمدا متعمدا فقد خرج عن الملۃ (رواہ ابن ابی حاتم فی سننہ والطبرانی باسنادین لاباس بھما) یعنی "نماز کو جان بوجھ کر نہ چھوڑنا ہو گا کیونکہ جس شخص نے قصداً نماز کو چھوڑ دیا وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا۔"

اس حدیث نے بھی تمام تاویلوں پر پانی پھیر دیا' اور وہ باطل ہو گئیں کیونکہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ تارک الصلوۃ ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔ جب ان تمام احادیث کے مجموعہ سے یہ ثابت ہوا کہ بے نماز مشرک' کافر اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے اور وہ قیامت کو فرعون وغیرہ کفار کے ساتھ ہو گا تو پھر اب کون سی تاویل ہے جو دور منقول طریقہ میں پہلے نصوص کو ظاہر سے پھیر کر اسلام کی طرف لا سکے۔ ان گمراہ فرقوں کی طرح ایسی تاویل کی جائے جسے معنوی تحریف کہا جائے تو یہ اور بات ہے لیکن یہ شیوہ یہود کا ہے اہلحدیث کا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بے نماز تو کجا رہا' جو نماز کا چور ہے اور نماز کو خراب طریقہ سے پڑھتا ہے جس سے ارکان نماز ادا نہیں ہوتے اور وہ نماز صحیح شمار نہیں ہوتی' وہ بھی ملت محمدیہ سے خارج ہے۔ چنانچہ ترغیب میں حدیث ہے جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں رکوع سجود پورا ادا نہ کرتا تھا تو اس کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا : لو مات ھذا لمات علی غیر ملۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ طبرانی و رواہ ثقات) یعنی "اگر یہ شخص اس حالت میں مر گیا تو ملت محمدیہ پر نہیں مرے گا۔"

یہ ظاہر بات ہے کہ غیر ملت محمدیہ کفر ہے تو وہ کافر ہو کر مرا' کیونکہ اس کی نماز صحیح نہ ہوئی تو وہ بے نماز ہوا اور بے نماز کافر ہے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بری طرح نماز پڑھی تھی' اس کو آپ نے یہ فرمایا : ارجع فصل فانک لم تصل۔ یعنی "لوٹ کر آؤ پھر نماز پڑھو' تم نے نماز نہیں پڑھی۔"

اس سے ظاہر ہے کہ خراب نماز کو آپ نے شمار نہیں کیا تو وہ بے نماز رہا اور بے نماز کافر ملت محمدیہ سے خارج ہے۔

اگر کوئی غیر مقلدی اہلحدیث یہ کہے کہ یہ بلال رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو ہمارے لئے حجت نہیں ہے' تو اس کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس بیان اور فتویٰ میں منفرد

نہیں ہیں۔ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔ چنانچہ امام الدنیا فی الحدیث نے باب اذا لم یتم الرکوع کے تحت اپنی جامع صحیح بخاری میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا کہ وہ رکوع سجود پورا نہیں کر رہا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ما صلیت ولو مت علی غیر الفطرۃ التی فطر الا محمد صلی اللہ علیہ وسلم "اے شخص تو نے نماز نہیں پڑھی (بے نمازی رہا) اور اسی حالت پر رہا تو غیر ملت محمدیہ پر مرے گا یعنی کافر ہو کر مرے گا۔"

اس حدیث کے حاشیہ پر ہمارے اہلحدیث علماء کی طرح مولانا احمد علی صاحب حنفی سہارن پوری نے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں اور نہایت ردی تاویل سے کام لیا ہے' مگر سب بے سود باتیں ہیں۔ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے کہ بے نماز اور نماز کو خراب کر کے پڑھنے والے سب ملت محمدیہ سے خارج ہیں۔

اگر کوئی مولوی صاحب یہ کہیں کہ یہ حدیث بھی موقوف ہے اور موقوف حجت نہیں ہے تو ان کے وہم کا بھی ہم ازالہ کئے دیتے ہیں۔ سنئے! ترغیب میں ایک حدیث حضرت عبداللہ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رای رجلا لم یتم رکوعہ و ینقر فی السجود وھو یصلی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو مات ھذا علی حالہ ھذا مات علی غیر ملۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (الحدیث) یعنی "رسول ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ وہ رکوع پورا نہ کرتا تھا اور سجدوں میں ٹھونگ مارتا تھا پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ شخص اپنی اسی حالت پر مر گیا تو ملت محمدیہ پر نہیں مرے گا۔" (ملت کفریہ پر مرے گا)

جب خراب نماز پڑھنے والا ملت محمدیہ سے خارج ہے تو بے نماز بالاولیٰ ملت محمدیہ سے خارج ہے۔ ملت اسلامیہ اور ملت محمدیہ ایک ہی چیز ہیں' اس سے خارج ہو کر مرنے والا بالاتفاق کافر ہے۔ پس ہمارا دعویٰ ثابت ہوا کہ بے نماز مشرک کافر اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔

بے نماز بے ایمان ہے: نماز کو قرآن میں ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے' جیسے ارشاد ہے: وما کان اللہ لیضیع ایمانکم "یعنی اللہ تمہاری نماز کو ضائع نہیں کرے گا۔"

سورہ فاتحہ کو صلوۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے گا اس کی نماز نہ

ہو گی اور وہ بے نماز تصور ہو گا۔ اسی طرح نماز کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص نماز نہ پڑھے گا اس کا ایمان قبول نہ ہو گا اور وہ بے ایمان متصور ہو گا۔

آنحضرت ﷺ سے ایمان باللہ کا مطلب دریافت ہوا' تو آپ ﷺ نے کلمہ توحید کے ساتھ فرائض الٰہی نماز وغیرہ کو بیان کیا' ملاحظہ ہو مسلم شریف۔ امام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا ہے جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا اقراری ہو اور یہ فرائض الٰہی (نماز) وغیرہ ادا نہ کرے تو لا یسمی مومنا "وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔" ترمذی میں حدیث ہے۔ اذا رایتم الرجل یعاهد المسجد فاشهدوا له بالایمان۔ یعنی "جب کوئی شخص مسجد کی حفاظت کرتا ہو تو تم اس کے ایمان کی گواہی دو' کیونکہ مسجد کی حفاظت نمازی ہی کر سکتا ہے۔"

<u>بے نماز بے دین ہے:</u> ترغیب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا سهم فی الاسلام لمن لا صلوة له ولا صلوة لمن لا وضوء له (رواه البزار) یعنی جو شخص نماز نہیں پڑھتا" بے نماز ہے اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے اور جو وضو نہیں کرتا اس کی نماز نہیں ہے۔"

دوسری حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' جس میں یہ ہے: ولا دین لمن لا صلوة له انما موضع الصلوة من الدین کموضع الراس من الجسد۔ (رواہ طبرانی فی الاوسط) یعنی "جو شخص نماز نہیں پڑھتا اس کا کوئی دین نہیں ہے' بیشک نماز کا دین سے ایسا تعلق ہے' جیسا سر کا بدن سے ہے۔" اگر کسی انسان کا سر اتار دیا جائے تو وہ انسان زندہ نہیں رہتا مر جاتا ہے۔ ایسا ہی بے نمازوں کا دین مر گیا ہے۔ تو وہ صاف طور پر بے دین ہیں' جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

امام ابن القیم نے کتاب الصلوۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ملک کے اطراف میں امراء کو لکھ کر بھیجا تھا: ان اهم امورکم عندی الصلوة فمن حفظها حفظ دینه ومن ضیعها فهو لما سواها اضیع ولا حظ فی الاسلام لمن ترک الصلوة۔ یعنی "تمام امور دینیہ میں سے میرے نزدیک نماز کی زیادہ اہمیت ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی اس نے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کر دیا' اس نے اس کے سوا باقی دین کو بالاولی ضائع کر دیا اور جس نے نماز ترک کر دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب شہید کیا گیا تھا تو انہوں نے اس وقت ہوش آنے پر لوگوں

سے دریافت کیا : ھل صلی الناس؟ قال فقلنا نعم فقال لا اسلام لمن ترک الصلوۃ (کتاب ابن القیم) "کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں پڑھ لی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے نماز ترک کر دی اس کا اسلام نہیں ہے۔"

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ بے نماز مسلمان نہیں ہے اور وہ صاف بے دین ہے۔ امام ابن القیم نے امام احمد سے نقل کیا : "فلیس بعد ذھاب الصلوۃ اسلام ولا دین۔ تجزیہ لکھا ہے : فاذا ذھبت صلوۃ المرء ذھب دینہ۔ یعنی "نماز جس شخص کی چلی گئی اس کا دین بھی رخصت ہوا' وہ بے دین ہے۔" بے نماز کو مسلمان اور دین دار کہنا سراسر احادیث کے خلاف ہے۔

بے نماز مسلمانوں کا بھائی نہیں ہے: علماء بے نمازوں کو اپنا دینی بھائی جانتے اور کہتے ہیں' یہ قرآن حدیث کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ہے : فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین۔ یعنی "اگر وہ (کفر و شرک سے) تائب ہو کر نماز اور زکوۃ کے پابند ہو جائیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔"

کتاب الصلوۃ میں ہے : "فعلق اخوتھم بفعل الصلوۃ فاذا لم یفعلوا لم یکونوا اخوۃ للمومنین" یعنی "اخوت اسلامی نماز پڑھنے پر معلق کی گئی ہے۔ جب نماز نہ پڑھیں گے تو مومنوں کے بھائی نہ ہوں گے۔" اس سے ظاہر ہوا کہ بے نماز مومن نہیں ہے' ورنہ مومنوں کا بھائی ہوتا کہ قرآن میں ہے : انما المومنون اخوۃ۔ یعنی "سب اہل ایمان آپس میں بھائی ہیں۔" اگر اس آیت کی رو سے بے نماز کو مومن کہہ کر نمازی مومنوں کا بھائی قرار دیا جائے تو دو نص آیات میں تعارض واقع ہو جائے گا حالانکہ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر ہیں' معارض نہیں ہیں۔ جب نماز ایمان ہے تو بے نماز مومن کس طرح ہو سکتا ہے؟ حدیث میں ہے : المسلم اخ المسلم "کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔" بے نماز مسلمان نہیں ہے جیسا کہ اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ بے نماز کسی طرح مسلمان کا بھائی نہیں ہو سکتا۔ بے نماز کو اپنا بھائی کہنا منع ہے۔ ہاں بے نماز علماء غیر مکفرین کا بھائی ہے' کیونکہ ان کے مذہب فاسد میں بے نماز مومن ہے۔

بے نماز کا کوئی عمل قبول نہیں: جیسے کافر و مشرک کا کوئی عمل قبول نہیں ہے' ایسا ہی بے نماز مشرک و کافر کا کوئی عمل قبول نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

سے ایک حدیث مرفوعاً گزر چکی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں : ولا یقبل منہ صرف ولا عدل۔ یعنی "بے نماز کا کوئی نیک عمل فرض' نفل قبول نہیں ہے۔"

ترغیب میں حضرت ابوہریرہ بڑالٹو سے روایت ہے کہ نماز کی تین تہائیاں ہیں۔ طہارت ایک تہائی ہے اور رکوع دوسری تہائی ہے اور سجود تیسری تہائی ہے۔ جس نے نماز کو اس کے حق کے ساتھ ادا کیا تو اس کی نماز قبول ہو گی اور سب عمل اس کے تابع قبول ہوں گے اور جس کی نماز مردود ہو گی تو اس کے سب اعمال رد کئے جائیں گے۔ اس حدیث کی اسناد حسن ہے' دیگر احادیث میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

کتاب الصلوۃ ابن القیم میں ہے : فقبول سائر الاعمال موقوف علی قبول الصلوۃ فاذا ردت ردت علیہ سائر الاعمال۔ یعنی "تمام اعمال کا قبول ہونا نماز کی قبولیت پر موقوف ہے' اگر نماز رد کی گئی تو اس کے دیگر اعمال ضائع کر دیے جائیں گے۔"

نماز کا بھی وہی حکم ہے جو توحید اور کلمہ شہادتین کا حکم ہے۔ اگر یہ اقرار شہادت تصدیق قلبی کے ساتھ ہو اور شرک نہ پایا جائے تو اعمال صالح قبول ہوں گے' ورنہ قبول نہیں مردود ہوں گے۔ نماز کو شہادتین کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ عین عبادت الٰہی ہے' جو توحید اور اقرار بالرسالت سے بھرپور ہے۔ اگر یہ ترک ہو گئی تو تمام اعمال برباد ہو جائیں گے اور وہ شخص عاملۃ ناصبۃ تصلی نارا حامیۃ" یعنی "کئی چہرے عمل کرنے والے دہکتی ہوئی آگ میں داخل کیے جائیں گے" کے تحت داخل ہو جائے گا اعاذنا اللہ تعالٰی منہا۔

بے نماز کے تمام اعمال برباد ہیں : کافر مشرک کے حق میں قرآن نے یہ خبر دی ہے کہ "فحبطت اعمالہم" "ان کے اعمال برباد ہیں۔" یہی خبر بے نماز کے بارہ میں حضرت محمد ﷺ نے دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے : "من ترک صلوۃ العصر فقد حبط عملہ۔ "جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے عمل حبط ہو گئے۔" جیسے قرآن میں ہے : ومن کفر بالایمان فقد حبط عملہ وھو فی الاخرۃ من الخسرین۔ "جس شخص نے ایمان کے ساتھ کفر کیا' اس کے عمل حبط ہوئے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا۔" یہی بے نماز کا حال ہے کہ نماز بھی ایمان ہے۔ جس نے اس کے ساتھ کفر کیا یعنی اس کو چھوڑ دیا تو اس کے عمل حبط ہوئے اور وہ خسارہ پانے والوں میں ہوا۔

چنانچہ ترغیب میں حدیث ہے کہ : ان اول ما یحاسب بہا لعبد یوم القیامۃ من عملہ

صلوۃ فان صلحت فقد افلح وانجح وان فسدت فقد خاب و خسر۔ "قیامت کو اول حساب نماز کا ہو گا اگر وہ درست پائی تو بندہ نے فلاحیت پائی اور وہ دوزخ سے بچ گیا اور اگر نماز فاسد ہوئی تو وہ ذلیل اور خاسر ہوا۔"

یہ خسارہ نماز خراب ہونے پر ہے اور جس نے بالکل نہیں پڑھی تو وہ خسران مبین میں پڑا۔ ترغیب میں نوفل بن معاویہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ومن فاتتہ صلوۃ فکانما وتر اھلہ ومالہ۔ "جس کی ایک نماز فوت ہوئی پس گویا اس کا مال اور اولاد فنا ہو گئے" بعض روایتوں میں نماز عصر کا خصوصی ذکر ہے یہ عصر کی شرافت کی وجہ سے ہے۔ یہ قید احترازی نہیں کہ صرف عصر کی نماز سے ہی احباط ہو گا اور دوسری نماز سے نہ ہو گا جیسے کتاب الصلوۃ میں ہے : لم یعف الحبوط بغیر العصر الا بمفہوم للقب وھو مفہوم ضعیف جدا وتخصیص العصر لشرفھا من بین الصلوٰت

ترغیب میں حدیث ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : من ترک الصلوۃ متعمدا احبط اللہ عملہ وبرئت منہ ذمۃ اللہ حتی یراجع اللہ عزوجل توبۃ۔ "جس شخص نے قصداً نماز چھوڑ دی اس کا عمل برباد ہوا اور اس سے اللہ عزوجل کا ذمہ بری ہوا۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے توبہ کرے۔"

خلاصہ یہ کہ تارک الصلوۃ کے اعمال میں احباط ہے جیسے شرک و کفر سے اعمال کا احباط ہے اور یہ احباط حقیقی ہے کیونکہ ترک نماز پر کفر و شرک کا اطلاق آ چکا ہے۔ "کما مر بیانہ"

فتاویٰ ثنائیہ جلد اول' ص ۳۳۰ میں ایک سوال ہے کہ تارک الصلوۃ جو ماہ رمضان میں نماز پڑھتا ہے پھر نہیں پڑھتا' اس کو رمضان کی عبادت نماز' روزہ کا ثواب ملتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب مولانا ثناء اللہ نے یہ لکھا ہے : "تارک نماز جب تک توبہ کر کے پابند نماز نہ ہو جائے رمضان شریف کے ثواب موعودہ کا حقدار نہیں۔"

بے نماز کا کفر' کفر بواح ہے : مشکوۃ میں امرا اور حکام کی ماتحتی اور مطاوعت میں رہنے کی متعدد حدیثیں وارد ہیں اور وہ فسق و فجور امور منکرہ کے مرتکب ہوں اور ظلم کریں جب بھی رعایا اور ماتحتین کو صبر سے کام لے کر ان کی اطاعت کرنی چاہیے' بغاوت کرنی حرام اور گناہ ہے۔ چنانچہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیعت

لی اور امرا کی اطاعت کا عہد لیا : علی ان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا۔ "اور یہ عہد اور شرط لیا کہ امرا سے منازعت نہ کریں گے' مگر یہ کہ ان میں کفر ظاہر صریح دیکھیں تو پھر ان کی اطاعت سے نکل کر ان سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

دوسری حدیث میں ہے' صحابہ کرام ﷺ نے سوال کیا کہ کیا ائمہ اشرار کے ساتھ ہم مقابلہ اور مدافعت نہ کریں؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا : لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ "مقابلہ اور منازعت نہ کریں جب تک کہ وہ تمہارے میں نماز قائم رکھیں۔"

ایک اور حدیث میں ہے : "لا ما صلوا لا ما صلوا۔ اطاعت سے ہاتھ کھینچ کر مقابلہ اور منازعت نہ کریں' جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔ ان دونوں روایتوں کے مجموعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ترک نماز کفر بواح ہے۔ اس لئے حاشیہ پر یہ لکھا ہے : فیہ ان ترک الصلوۃ موجب لمنا بزتھم ۔ ونزع الید من طاعتھم لان الصلوۃ عماد الدین والفارق بین الکفر والایمان بخلاف سائر المعاصی۔ (حاشیہ مشکوۃ ص ۱۹) "نماز چھوڑ دینا امرا خلفاء کی اطاعت سے نکلنے اور ان سے مقابلہ کرنے کا موجب ہے' جو کفر اور ایمان کے درمیان فرق ہے' دیگر تمام معاصی ایسا درجہ نہیں رکھتے۔"

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بے نماز کا کفر دون کفر نہیں ہے بلکہ یہ کفر بواح حقیقی ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اگر کم درجہ کا کفر ہوتا اور اس سے ملت سے نہ نکلتا تو امرا سے بغاوت اور مقابلہ کا حکم نہ دیا جاتا۔

شیخ عبدالرزاق امام ثانی حرم مکی نے ایک رسالہ "الصلوۃ" لکھا ہے جس میں آیات قرآنیہ' احادیث نبویہ اور آثار صحابہ لا کر بے نماز کو کافر و مشرک ثابت کیا ہے۔ اس کے حاشیے ص ۔۶ پر ایک عربی عالم محشی لکھتے ہیں : لقد تظاھرت النصوص الصحیحۃ الصریحۃ فی کفر تارک الصلوۃ وخروجہ من الملۃ۔ یعنی "بیشک نصوص صریحہ صحیحہ وارد ہیں' جو ایک دوسری کی تائید اور تقویت کرتی ہیں کہ بے نماز کافر اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔"

بے نماز پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہے : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بصارت چلی گئی اور وہ نابینے ہو گئے تھے۔ حکیموں' ڈاکٹروں نے علاج کرنا چاہا اور کہا کہ آپ کو کئی

روز تک نماز ترک کرنی پڑے گی۔ (جیسے آج کل موتیا کا آپریشن کرانے والے نمازیں ترک کرتے ہیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے علاج کروانے سے انکار کر دیا اور فرمایا : ان رسول اللہ قال من ترک الصلوۃ لقی اللہ وھو علیہ غضبان۔ رواہ البزار وطبرانی فی الکبیر واسنادہ حسن (کتاب الصلوۃ للشیخ عبدالرزاق حمزہ ص۔۵) یعنی "تحقیق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے نماز چھوڑ دی تو وہ جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا (یعنی قیامت کے روز پیش ہو گا) تو اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہو گا" کیونکہ وہ کافر ہے اس لئے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا : من سرہ ان یلقی اللہ غدا مسلما فلیحافظ علی ھولاء الصلوت حیث ینادی بھن۔ یعنی "جس شخص کو یہ خوش لگے کہ میں کل کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کروں تو مسلمان ہو کر کروں تو اس کو چاہئے کہ ان پانچ نمازوں کی حفاظت کرے جن کے لئے مسجدوں میں ہمیشہ منادی ہوتی ہے۔"

اگر حفاظت نہ کرے گا تو فرعون' قارون' ہامان وغیرہ کفار کا ساتھی ہو گا جن پر اللہ تعالیٰ سخت غضب ناک ہو گا پس جس نے مسلمان بننا ہو اس کو نمازوں کی پابندی کر لینی چاہئے۔

نماز جنت کی کنجی ہے : جنت قیامت کے دن مقفل ہو گا اور اس کے ہر دروازہ پر پہرے دار فرشتے ہوں گے۔ جس شخص کے پاس جنت کے جانے کا پاسپورٹ اور کنجی ہو گی وہ جنت میں داخل ہو سکے گا' دوسرا ہرگز داخل نہ ہو گا۔ حدیث سلمان فارسی رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ داخل نہ ہو گا کوئی جنت میں مگر بذریعہ اس پروانہ کرامت نشانہ کے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ھذا کتاب من اللہ فلاں بن فلاں ادخلوہ جنۃ عالیۃ قطوفھا دانیہ" رواہ طبرانی رسالہ ھادی القلب السلیم' ص۔۳ یعنی "یہ پروانہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فلاں بن فلاں شخص کے لیے ہے کہ اس کو جنت میں داخل کر دو۔ یہ پروانہ پل صراط پر دیا جائے گا۔

مسند ابوداؤد طیالسی ج۔۱' ص۔۲۴۰ میں یہ حدیث ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا : مفتاح الصلوۃ الوضو ومفتاح الجنۃ الصلوۃ یعنی "نماز کی کنجی وضو ہے کہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہے اور جنت کی کنجی نماز ہے کہ نماز کے بغیر جنت میں داخلہ نہ ہو گا۔"

حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ لا الہ الا اللہ مفتاح جنت ہے۔ دونوں میں تطبیق یہ ہے

جو بخاری میں وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ان سے کہا گیا کہ کیا یہ کلمہ جنت کی کنجی نہیں ہے؟ کہا ہاں لیکن ہر کنجی کے دندانے ہوتے ہیں۔ پس اگر تو کنجی دندانوں سمیت لایا تو جنت کا دروازہ تیرے لیے کھول دیا جائے گا اور اگر بغیر دندانوں کے لایا تو دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔ پس نماز وغیرہ فرائض کلمہ کی کنجی کے دندانے ہیں۔

<u>بے نماز کے کفر پر صحابہ اکرام کا اجماع ہے:</u> احادیث نبویہ صریحہ سے ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بے نماز کافر' مشرک خارج از ملت محمدیہ ہے' جس کا کوئی عمل صالح قبول نہیں ہے اور یہ کفر بواح ہے' جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بے نماز پر سخت غضبناک ہو گا اور بے نماز کے پاس جنت کی کنجی نہ ہوگی اور جنت کا دروازہ اس کے لئے نہ کھولا جائے گا اور فرعون ہامان وغیرہ کے ساتھ جہنم رسید ہو گا چنانچہ تنقیح الرواۃ میں ہے : کنایہ عن دخول النار ای کان معھم فی النار الخ۔ یعنی "یہ کنایہ ہے دوزخ میں داخل ہونے سے یعنی بے نماز آگ میں ان کے ساتھ ہو گا" لیکن کیا اب بھی بے نماز کے کفر سے انکار کیا جا سکتا ہے

چنانچہ مشکوٰۃ میں ہے کہ عبد اللہ بن شقیق نے بیان کیا : کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ (رواہ ترمذی) یعنی "سب صحابہ رسول بے نماز کے کفر پر متفق ہیں۔"

تنقیح الرواۃ میں ہے : والظاہر من الصیغہ ان ھذا المقالۃ اجتمع علیہ الصحابہ" یعنی "صیغہ جمع سے یہ ظاہر ہے کہ سب صحابہ کا بے نماز کے کفر پر اجماع ہے۔"

مرعاۃ المفاتیح جلد اول' ص ۳۸۱ میں ہے : والحدیث فیہ دلیل ظاہر علی ان الصحابہ کانوا یعتقدون ان ترک الصلوٰۃ کفر" یعنی "اس حدیث میں دلیل ہے کہ صحابہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ نماز کا تارک کافر ہے۔" نیز یہ لکھا ہے : والظاہر من الصیغہ ان ھذہ المقالۃ اجتمع علیھا الصحابۃ لان قولہ کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مضاف وھو من المشعرات بذلک۔ یعنی "صیغہ جمع مضاف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب صحابہ رسول کا بے نماز کے کفر پر اجماع ہے۔"

امام ابن حزم نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر اور عبدالرحمٰن بن عوف و معاذ بن جبل و ابوہریرہ وغیرہم صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ : ان من ترک صلوٰۃ فرض واحد متعمدا

حتی یخرج وقتها فھو کافر' مرتد ولا نعلم لھولاء من الصحابۃ مخالفا۔ "جس شخص نے قصداً ایک نماز ترک کر دی کہ اس کا وقت چلا گیا تو وہ کافر مرتد ہے اور ہم کو ان صحابہ کے مخالف کوئی صحابی معلوم نہیں ہوا۔"

میں کہتا ہوں کہ کسی صحابی سے یہ مروی نہیں ہے کہ بے نماز مومن یا مسلمان ہے۔ یہ تہدید کے طور پر عائد کیا گیا ہے' یا کفردون کفر ہے' یا کفران نعمت ہے بلکہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ مذہب تھا کہ بے نماز کافر ہے۔ اب اس سے تمام تاویلیں فاسد ہو گئیں کہ صحابہ کرام کا بے نماز کے کفر پر اجماع پایا گیا ہے بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے بے نماز کو کافر کہنا اور بے دین کہنا مروی ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : قال من لم یصل فھو کافر۔ یعنی "جو شخص نماز نہیں پڑھتا وہ کافر ہے۔" اس اثر کو ابن عبداللہ اور ابن ابی شیبہ اور امام بخاری نے تاریخ میں روایت کیا ہے۔ دوسرا اثر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے : من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ "کہ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔" اس کو محمد بن نصر مروزی اور ابن عبد اللہ نے روایت کیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے : من ترک الصلوۃ فلا دین لہ "جس نے نماز چھوڑ دی اس کا دین نہ رہا۔" (رواہ المروزی) اور ابن عبدالبر نے روایت کیا ہے کہ ابوداؤد صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا : لا ایمان لمن لا صلوۃ لہ ولا صلوۃ لمن لا وضوء لہ یعنی "جس کی نماز نہیں' اس کا ایمان نہیں ہے اور جس کا وضو نہیں ہے اس کی نماز نہیں ہے۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ : من لم یصل فھو کافر۔ (رواہ عبدالبر) یعنی "جو شخص نماز نہیں پڑھتا وہ کافر ہے۔" حضرت ایوب تابعی سے منقول ہے : ترک الصلوۃ کفر لا مختلف فیہ (ترغیب) یعنی "نماز چھوڑنا کفر ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں پایا گیا۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ سلف صالحین کا بے نماز کے کافر ہونے پر اجماع اور اتفاق تھا۔ ان کے بعد تقلیدی مذاہب اور استحسانی رائے اور بعض اہلحدیثوں نے اختلاف بپا کیا اور موشگافیوں سے کام لے کر بے نمازوں کی دلجوئی کے لئے ان کو مسلمان بنانا شروع کر دیا۔ اور اکثر علماؤں اور مشائخ کا تعلق بے نمازوں سے ہے' جو اغنیاء اور رؤساء ہیں' جن کو نماز پڑھنی

دشوار ہے اور حکام ہیں جن کو نماز ایک پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ پس بے نمازوں کی اکثریت سے متاثر ہو کر ان کو مسلمان تصور کر لیا گیا۔ حالانکہ جو ترک نماز پر مصر ہیں اور یہاں تک بے خوف ہو گئے ہیں کہ نماز اور نمازیوں سے ہی نفرت کرنے لگے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نمازوں میں کیا دھرا ہے' دل صاف چاہئے۔ یہ نمازی داڑھی والے بڑے بے ایمان ہوتے ہیں۔ مسلمان نمازی نے یہ کیا اور فلاں نے یہ کیا بلکہ بعض زندیق یہ کہنے لگے ہیں کہ "

نہ رکھ روزہ نہ مر بھوکا' نہ جا مسجد نہ دے سجدے
وضو کا توڑ دے کوزہ' شراب شوق پیتا جا

کیا بے نماز کے ساتھ اسلامی برتاؤ کیا جائے؟: پس ایسے بے نمازوں کو بھی کلمہ گو مسلمان جان کر ان سے اسلامی برتاؤ کرنا اور ان سے مناکحت نہ کرنا اور ان کا جنازہ پڑھنا صریح ہٹ دھرمی اور جہالت و ضلالت ہے۔ بے نماز کے کفر پر سلف کا اجماع ہے۔ امام اسحق سے امام عبد اللہ بن نصر مروزی نے سنا' وہ فرماتے تھے : صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تارک الصلوۃ کافر وکذلک کان رای اہل العلم من لدن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی یوم ھذا ان تارک الصلوۃ عمدا من غیر عذر حتی یذھب وقتھا کافر۔ "نبی کریم ﷺ سے یہ صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ بے نماز کافر ہے اور اسی طرح نبی کریم ﷺ سے لے کر آج تک تمام اہل علم کی یہی تحقیق ہے' کہ قصداً نماز چھوڑنے والا کافر ہے۔"

امام یحییٰ بن معین نے بیان کیا کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رئیس التابعین اعلم الزمان سے دریافت کیا گیا کہ جو شخص نہ روزہ رکھے اور نہ نماز پڑھے اور ان کے فرض ہونے کا اقراری اور معترف ہو' کیا وہ مومن کامل الایمان ہے؟ حضرت عبداللہ نے فرمایا : لا نقول نحن مایقول ھولاء من ترک الصلوۃ متعمدا من غیر علۃ حتی ذھب وقتھا ودخل وقت اخر فھو کافر۔ "ہم علما اہل حق تو ایسا نہیں کہتے جیسے یہ اہل رائے اور گمراہ فرقے یہ کہتے ہیں۔ اصل حکم یہ ہے کہ جس شخص نے قصداً بغیر عذر شرعی کے نماز چھوڑ دی' کہ اس کا وقت چلا گیا اور دوسرا وقت آ گیا تو وہ کافر ہے۔" (کتاب الصلوۃ لابن القیم)

کتاب الکبائر للذھبی ص-۲۰ میں ہے : سئل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن امراۃ لا تصلی فقال من لم یصل فھو کافر۔ "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فتویٰ پوچھا گیا کہ آپ اس

عورت کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں جو نماز نہیں پڑھتی ہے' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔"

مولویین کا تعصب: بے نماز کے کافر و مشرک خارج از ملت ہونے پر اتنے صریح دلائل پیش کیے گئے ہیں جن میں کوئی تاویل نہیں چل سکتی۔ لیکن پھر بھی ہٹ دھرمی ہے کہ ان صریح دلائل کی بے جا تاویلیں کرتے ہیں۔ جیسے دیگر گمراہ فرقے متعصبین کرتے ہیں۔ علامہ ابن القیم فرماتے ہیں: وکثیر المولدة المتعصبین اذا رؤا حدیثا یخالف مذهبهم یتلقونه بالتاویل وحمله علی خلاف ظاهره وما وجدوا الیه سبیلا۔ "ایسے متعصب لوگ پیدا ہوئے کہ جب وہ اپنے مذہب کے خلاف کسی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں تو اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو بالکل خلاف ظاہر ہوتی ہے اور جب کوئی جواب نہ بن سکے تو یہ کہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔"

ولیست هذه طریق ائمة الاسلام بل ائمة الاسلام کلهم علی خلاف هذا الطریق۔ "یہ طریقہ تاویل کا ائمہ اسلام کا نہیں ہے بلکہ ائمہ اسلام اس طریقہ کے خلاف ہیں۔" اور وہ احادیث کو ظاہر پر محمول کرتے اور ان پر فتوی دیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ سلف صالحین یعنی صحابہ و تابعین کا تو بے نماز کے کافر ہونے پر اجماع تھا' پھر خلف میں جب نمازوں کی تعداد بڑھنے لگی اور وہ زبان سے مدعیان اسلام تھے' تو فقہاء اور دیگر علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کر دیا اور ان کے بعد مقلدین علماء اور بعض اہلحدیث علماء نے ان سے متاثر ہو کر یہ مسلک بنا لیا کہ بے نماز مومن اور مسلمان ہے' صرف گنہگار اور فاسق وفاجر کہنا چاہیے۔ اب اکثریت اسی مسلک پر ہے۔ مگر یہ سب ناقابل اعتنا ہیں۔ اس فضول اکثریت سے متاثر ہو کر ہم احادیث نبویہ صریحہ اور اجماع سلف کو ترک نہیں کر سکتے اور اس موہوم جمہوریت کو باطل لاشی تصور کرتے ہیں۔

امام ابن القیم کتاب الصلوۃ کے ص۔۲۴ میں ایک مسئلہ پر لکھتے ہیں: اما قولکم ان هذا قول شاذ فلعمر الله لیس شاذا او معه رسول الله صلی الله علیه وسلم وسنة الصحیحة ولو ترکها من ترکها "تمہارا یہ کہنا کہ یہ مذہب شاذ ہے' جو اکثریت کے خلاف ہے۔ قسم بخدا یہ شاذ نہیں ہے' اس کے ساتھ رسول اللہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ ہیں۔ بس یہ کافی ہیں اگرچہ چھوڑنے والے اسے چھوڑ دیں ہم کو اس کی پرواہ نہیں

ہے۔"

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں کھجور، انگور اور گندم کی قیمتوں کا اندازہ کر کے صدقہ فطر میں گندم نصف صاع کر دی، تو اکثریت نے اس کو قبول کر کے عمل شروع کر دیا لیکن ابو سعید صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر صاف کہا: تلک قیمتہ معاویہ لا اقبلھا ولا اعمل بھا۔ "یہ تو معاویہ کی قیاسی قیمت کا حساب ہے، ہم نہ اس کو مانتے ہیں اور نہ عمل کرتے ہیں۔" حضرت عائشہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی ایسا ہی کہا۔

علامہ ابن حزم اس بحث کو لکھ کر فرماتے ہیں: برھان ھو اثبات ابن عمر وعائشة رضی اللہ تعالی عنھما علی صاع صاع لا علی ما ذکروا من عمل الناس فلو کان عمل الناس عندھما حقا لما وسعھما خلافه فبطل۔ یعنی "ابن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما فطرانہ کی صاع پر قائم رہے، اور لوگوں کی اکثریت کے مطابق عمل نہ کیا۔ اگر لوگوں کی اکثریت ان کے نزدیک حق ہوتی تو ان کے خلاف عمل کرنے کی گنجائش نہ ہوتی۔

پس، جمہوریت اور اکثریت پر ملمع چڑھا کر اس کو قابل اعتماد قرار دینا باطل ہوا۔

علامہ ابن القیم اعلام ج۔۳، ص۔۴۰۹ میں فرماتے ہیں کہ: ان جمھور الجماعة ھم الذین فارقوا الجماعة ما وافق الحق وان کنت وحدك یعنی "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عمرو بن میمون کو سمجھاتے ہوئے یہ کہا کہ جب لوگ بے وقت نمازیں پڑھیں، تو تم اپنی نماز وقت پر پڑھ لیا کرنا۔"

عمرو بن میمون نے کہا کہ اس طرح تو جماعت المسلمین سے علیحدگی ہو گی اور تم جماعت میں رہنے کی ترغیب دیتے ہو۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جماعت وہ ہے جو حق پر قائم ہے، اگرچہ اکیلا ہو اور جمہوریت جو حق پر نہیں ہے وہ جماعت حقہ سے علیحدہ ہو گی وہ ناقابل اعتماد ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں: ھذا الحدیث الصحیح الصریح واذا ثبت السنة لا تترک بترک بعض الناس واکثرھم او کلھم لھا (ج۔۱، ص۔۳۰۸) یعنی "جب احادیث صریح صحیح ہے اور سنت ثابت ہے تو بعض یا اکثر یا سب لوگوں کے ترک کرنے سے ترک نہ کی جائے گی۔"

اسی بنا پر بندہ کا مسلک ہے کہ سنت المغرب گھر میں پڑھنا چاہئیں' مسجد میں ادا نہ ہوں گی کیونکہ قولی و فعلی احادیث و تعامل صحابہ سے یہ ثابت ہے کہ گھر میں مشروع ہیں۔ مسجد میں پڑھنے پر آپ ﷺ نے روکا کہ یہ نماز گھر کی ہے' اس کو گھروں میں پڑھو۔ مسجد میں پڑھنا کسی صحیح صریح حدیث نبوی اور تعامل صحابہ سے ثابت نہیں ہے' تو اب اکثر اہلحدیث اور حنفی مسجدوں میں پڑھ رہے ہیں' یہ سب ناقابل اعتماد ہیں۔ ہم ان کے تعامل کے پیش نظر حدیث اور تعامل صحابہ کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔ ٹھیک اسی طرح بے نماز کا کافر ہونا صریح احادیث سے ثابت ہے اور اس پر صحابہ ﷺ کا اجماع ہے۔ تو ہم آج کل کے علماء کی اکثریت کے پیش نظر جو بے نمازوں کو مسلمان کہتی ہے' ہرگز ہرگز بے نمازوں کو مومن اور مسلمان نہ کہیں گے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرقہ ناجیہ کی تعریف فرمائی ہے : ما انا علیہ واصحابی۔ "فرقہ ناجیہ وہ ہے جو اس طریق پر ہو جس پر میں اور میرے صحابہ ﷺ ہیں۔"

چونکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام بے نماز کو کافر' مشرک قرار دے چکے ہیں۔ اس لئے جو یہ مسلک رکھتے ہیں وہی سواد اعظم اور فرقہ ناجیہ میں شمار ہیں۔ بحکم کونو مع الصادقین۔ تمام غیر مکفرین تارک الصلوۃ کو علماء مکفرین کے ہمراہ ہو جانا چاہئے۔

امام ابن القیم فرماتے ہیں : ومن لا یکفر تارک الصلوۃ یقول ھذا مومن ومسلم یغسل ویصلی علیہ ویدفن فی مقابر المسلمین وبعضھم یقول انہ مومن کامل الایمان ایمانہ کایمان جبرائیل و میکائیل فلا یستحی من ھذا قولہ من انکارہ تکفیر من شھد بکفرہ الکتاب والسنۃ واتفاق الصحابۃ (ص۔۲۳) یعنی "جو شخص بے نماز کو کافر نہیں کہتا اور وہ یہ کہتا ہے کہ یہ مومن' مسلمان ہے۔ اس کو مرنے کے بعد غسل دے کر اس کا جنازہ پڑھا جائے اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے' بلکہ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ بے نماز پورا مومن ہے۔ (جیسے مقلدین حنفیہ مرجیہ) اور بے نماز کا ایمان اور جبرائیل' میکائیل فرشتوں کا ایمان برابر ہے۔ (فقہ اکبر میں اسی طرح ہے) یہ لوگ ایسے فتووں سے شرم وحیا نہیں کرتے اور بے نماز کی تکفیر کے منکر ہیں' حالانکہ بے نماز کے کفر پر کتاب وسنت اور اجماع صحابہ شاہد ہیں۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ اگر آج ہم مکفرین عہد حاضر کی اکثریت اور جمہوریت کے خلاف اور ان کے مسلک کے منکر ہیں' تو غیر مکفرین کی جمہوریت کتاب وسنت اور اجماع صحابہ

کے خلاف اور ان کے مسلک کے منکر ہیں۔ ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

شرعی اصطلاح کی رُو سے شرک و کفر ایک ہیں: بعض لوگ شرعی اصطلاح سے اغماض کرتے ہوئے گمراہ فرقوں کی طرح لغت کے پیش نظر کفر اور شرک میں جائز مغایرت کرتے ہیں' حالانکہ یہ غلط طریقہ ہے۔ شرعی مسائل کی بحث میں شرعی معنوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ شرعی اصطلاح میں ہر کافر مشرک ہے اور ہر مشرک کافر ہے۔ یہودی کافر ہیں اور مشرک بھی' عیسائی کافر بھی ہیں اور مشرک بھی۔ اسی طرح مجوسی' ہندو اور سورج پرست وغیرہ کافر بھی ہیں اور مشرک بھی۔ ٹھیک ان کی طرح بے نماز کافر بھی ہے اور مشرک بھی۔ دہریہ کافر بھی ہیں اور مشرک بھی۔ الغرض کافر و مشرک ایک ہی حکم میں ہیں کہ سب جہنمی مخلد فی النار ہیں۔

محلی ابن حزم ج۔۲' ص۔۳۳۵ میں ہے: فصح ان کل کفر شرک وکل شرک کفر وانھما اسمان شرعیان اوقعھما اللّٰہ تعالٰی علی معنی واحد۔ یعنی "کتاب وسنت سے یہ بات صحیح ہو چکی ہے کہ ہر کفر شرک ہے اور ہر شرک کفر ہے اور یہ دو نام شرعی ہیں' اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک ہی معنی میں وارد کیا ہے۔"

مرعاۃ المفاتیح' جلد۔ا' ص۔۳۷۰ میں بھی تسلیم کیا گیا ہے: ثم ان الشرک والکفر قد یطلقان علی معنی واحد۔ یعنی "شرک اور کفر بھی ایک ہی معنی پر بولے جاتے ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ اس وقت بولے جاتے ہیں جب وہ ملت سلامیہ سے خارج ہوں۔ مسلمان گنہگار پر یہ دونوں ایک ساتھ نہیں بولے گئے۔ اگر بولے گئے ہیں تو کوئی اہل علم کسی مسئلہ کی نظیر پیش کرے۔ ہاں بے نماز پر شرک اور کفر کے دونوں لفظوں کا اطلاق ہوتا ہے' کیونکہ یہ خارج از ملت اسلامیہ ہے۔ جیسا کہ فقد خرج عن الملۃ نص وارد ہے اور یہی بے نماز کے کفر حقیقی پر دلیل ہے۔

پہلی دلیل میں کفر و شرک پر ہر دو لفظوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسری دلیل پر خروج ملت ہے۔ تیسری دلیل یہ کہ بے نماز کا کفر احباط اعمال کا باعث ہے۔ چوتھی دلیل یہ کہ فرعون' ہامان وغیرہ کفار کے ساتھ شامل ہوگا۔ پانچویں دلیل ترک صلوۃ کفر بواح کے مقابلہ میں بیان ہوا ہے۔ چھٹی دلیل کہ صحابہ کا اجماع ہے۔ ساتویں دلیل ایمان اور اعمال صالح اس کی قبولیت پر موقوف ہیں۔

چنانچہ معجزات میں ایک حدیث معجزہ نبت میں وارد ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ جب اعرابی معجزہ دیکھ کر مسلمان ہوا تو جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الحمد للہ الذی ھداک لھذا الدین الذی یعلو ولا یعلی علیہ ولکن لا یقبلہ الا بصلوۃ۔ (الحدیث) رواہ الدار قطنی والحکام والطبرانی۔ "سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے جس نے تجھے ایسے دین کی طرف راہ دکھائی جو تمام دینوں پر بلند اور غالب ہے اور اس پر کوئی دین بلند نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس دین کو بغیر نماز کے قبول نہیں کرتا۔"

آٹھویں دلیل یہ کہ اس کفر پر کفار یا منافقین سے عہد ہوا کہ جو چھوڑ دے گا وہ کافر ہے۔ پس یہ کفر حقیقی ہے' جس پر بدلائل ثمانیہ قائم ہیں۔ فتاملوا ولا تکونوا من المعاندین۔"

نانویں دلیل یہ ہے کہ بے نماز کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ امام ابن القیم نے اس کا ثبوت متعدد احادیث سے دیا ہے۔ کتاب الصلوۃ کا ص ۲۵ تا ۲۷ ملاحظہ ہو۔ پھر یہ قتل بطور حد ہے یا مرتد؟ امام ابن القیم نے فرمایا ہے: ھذا ھو القول الصحیح لان اسوء احوالہ ان یکون کالمرتد۔ "صحیح بات یہی ہے کہ یہ قتل مرتد ہونے کی وجہ سے اس کا برا حال اسی پر دال ہے کہ بے نماز مثل مرتد کے ہے۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم نے بے نماز کو کافر اور مرتد کہا ہے۔ جیسا کہ ترغیب و ترہیب میں امام ابن حزم سے منقول ہے۔

دسویں دلیل کہ کافر اور مومن کے درمیان نماز کو فارق ٹھہرایا ہے' جو صریح کفر حقیقی پر دلیل ہے۔

یہ دس دلائل بے نماز کے کفر حقیقی پر دال ہیں۔ لہٰذا بے نماز کو کافر و مشرک اعتقاد کرنا چاہئے۔ کفر دون کفر کی طرف کوئی قرینہ صارفہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ مذہب باطل ہے' اہلحدیث علماء کو یہ مسلک ترک کر دینا چاہئے۔

بے نماز سے مناکحت نہ کی جائے: قرآن میں ہے: ولا تنکحوا المشرکات "کہ شرک والی عورتوں کو نکاح میں نہ لاؤ۔ دوسری جگہ ہے: ولا تنکحوا المشرکین "کہ مشرکین کو نکاح نہ دو۔" بے نماز چونکہ کافر و مشرک ہے' اس لئے نیک نمازی لوگوں کو چاہیے کہ بے نمازوں کو نکاح نہ دیں اور نہ ان سے نکاح لیں کہ یہ مشرک ہیں' ان سے

نکاح درست نہ ہو گا۔

بے نماز کا جنازہ کرنا حرام ہے: چونکہ بے نماز کافر و مشرک ہیں' اس لئے ان کا نماز جنازہ پڑھنا حرام ہے کہ قرآن میں ہے : ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی' الآیۃ "نبی اور مومنوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ مشرکوں کے لئے بخشش کی دعا مانگیں' اگرچہ ان کے رشتہ دار ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا' تو اس کی وجہ ان کا کفر بیان کیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے : ولا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ انھم کفروا باللہ ورسولہ' الآیۃ "ان میں سے کسی کا بھی جنازہ نہ پڑھو یعنی دعا کے لئے اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہو' کیونکہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور کفر پر ہی مرے ہیں۔" بے نماز چونکہ بروئے احادیث صحیحہ واجماع صحابہ کافر و مشرک ہے' اس لئے اس کی نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے لئے دعا کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

غنیۃ الطالبین میں شیخ المشائخ حضرت پیر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے : لا یصلی علیہ ولا یدفن فی مقابر المسلمین۔ "بے نماز کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔"

میزان شعرانی میں جمہور اصحاب احمد کا بھی یہی مسلک لکھا ہے جو بالکل صحیح ہے : انہ یقتل لکفرہ کالمرتد ویجری علیہ احکام المرتدین فلا یصلی علیہ ولا یورث ویکون مالہ فیئا۔ "بے نماز کو کفر کی وجہ سے مرتد کی طرح قتل کیا جائے اور اس پر مرتدین کے احکام جاری کئے جائیں کہ نہ جنازہ کیا جائے اور نہ اس کا ورثہ تقسیم کیا جائے' بلکہ اس کا مال فے سمجھا جائے اور بیت المال میں داخل ہو۔" ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

بے نماز کے متعلق اہل مذاہب اربعہ کا فیصلہ: بے نماز کے بارہ میں ائمہ اربعہ کے مقلدین نے اپنی اپنی کتابوں میں مختلف احکام لکھے ہیں' جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ مقلدین حنفیہ کے افادہ کے لئے یہاں مذہب حنفی کا فتویٰ درج کیا جاتا ہے جس پر مقلدین حنفیہ کو بھی غور کر کے عمل کرنا چاہئے اور جو اہلحدیث بے نماز کو اپنا مسلمان بھائی گردان کر ان سے میل جول رکھتے ہیں' ان کو عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ ضمیمہ امداد الفتاویٰ جو امداد الاحکام کے نام سے موسوم ہے' اس کے ص۔۳۳ پر ایک سوال یوں درج

ہے

سوال : جو شخص کہ تارک الصلوۃ ہو' بغیر عذر شرعی اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کو کافر کہیں گے یا نہیں اور اگر کافر ہے تو کیا اس سے بھی مشرکین جیسا تعلقات میں حکم ہے؟ یعنی جو حکم مشرکین سے ہے۔

الجواب : (فقہی عبارات لکھ کر اس کا مطلب لکھتے ہیں) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ تارک الصلوۃ عملاً بشرطیکہ وہ نماز سے استہزاء نہ کرتا ہو' حنفیہ کے نزدیک کافر نہیں بلکہ فاسق ہے' جس کی سزا یہ ہے کہ اس کو اتنا مارا جائے کہ بدن سے خون بہنے لگے' پھر قید کر دیا جائے حتی کہ مرجائے یا توبہ کرے اور امام شافعی و امام مالک واحمد رحمہم اللہ عنہم کے نزدیک اس کی سزا قتل ہے اور حنابلہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ تارک الصلوۃ عملاً کافر ہے' مگر یہ ضروری ہے کہ ان سزاؤں کا اختیار عام لوگوں کو نہیں ہے بلکہ یہ سب کام امام کے سپرد ہیں۔ البتہ نابالغ اولاد اور غلام کو باپ اور سید بھی سزا دے سکتے ہیں' مگر قتل کا اختیار ان کو بھی نہیں۔ عام لوگوں کو تارک الصلوۃ کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ کرنے چاہئیں' اس کے یہاں کھانا بھی نہ کھائیں تاکہ اجر حاصل ہو۔ چنانچہ فقہاء نے منکوحہ تارک الصلوۃ کو طلاق دے دینا مستحب لکھا ہے' حالانکہ طلاق ابغض المباحات ہے۔

پھر در مختار سے عبارت نقل کر کے ثبوت دیا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے : عن ابن مسعود لان القی اللہ تعالی وصداقها بذمتی خیر من اعاشر امراۃ لا تصلی۔ (ج-۲' ص-۳۰۷ درمختار) "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں اللہ تعالیٰ سے ملوں تو میرے ذمہ عورت کا مہر قرض ہو تو اس سے بہتر ہے کہ ایسی عورت سے معاشرت رکھوں جو نماز نہیں پڑھتی۔"

اس سے ظاہر ہے کہ حقوق العباد کے گناہ سے بے نماز عورت سے زندگی گزارنا بدترین ہے

علماء دیوبند میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی حکیم الامت مشہور ہیں۔ ان کی بات اور مسئلہ کو وہ سب پر فوقیت دیتے ہیں۔ مولانا موصوف نے بہشتی زیور بنا کر مذہب حنفیہ کی مستورات کو پہنایا۔ اس کتاب کے حصہ دوم ص-۱۷ میں نماز کا بیان لکھا ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ : "نماز دین کا ستون ہے' جس نے نماز کو اچھی طرح سے پڑھا' اس نے دین کو

ٹھیک رکھا اور جس نے اس ستون کو گرا دیا کہ نماز کو نہ پڑھا اس نے دین کو برباد کر دیا۔"
اور حضرت نے فرمایا ہے: "نمازیوں کا حشر قیامت کے دن نبیوں' شہیدوں اور ولیوں کے ساتھ ہو گا اور بے نمازیوں کا حشر فرعون' ہامان اور قارون ایسے بڑے بڑے کافروں کے ساتھ ہو گا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا؟ بے نماز کا حشر کافروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بے نماز کافروں کے برابر سمجھا گیا ہے۔"

حصہ ششم ص ۳۰ میں یہ لکھا ہے کہ بغیر عذر کے ایک وقت کی بھی نماز چھوڑنا سخت گناہ ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی وہ ایمان سے نکل گیا۔
اور حدیث شریف میں ہے کہ ایسا شخص فرعون' ہامان اور قارون کے ساتھ ہو گا۔

پس فیصلہ ہو گیا کہ بے نماز بروئے حدیث کافروں کے ساتھ ہو گا اور ایمان سے خالی اور دین اس کا برباد ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حنابلہ کا مذہب حق اور صحیح ہے اور دیگر ائمہ کا مذہب اس مسئلہ میں غلط ہے' والسلام۔

عبدالقادر عارف حصاری سلمہ الباری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد ۱۸' شمارہ ۱۲' ۱۳' ۱۴' ۱۵' ۱۶' ۱۷' ۱۸' ۱۹' ۲۰' ۲۱' ۲۲' مورخہ از ۱۹/ اگست تا ۱۸/ نومبر سنہ ۱۹۶۶ء

مذاکرہ علمیہ ---- بے نماز کا شرعی حکم

مذاکرہ علمیہ مندرجہ اخبار اہلحدیث ۲۳/ نومبر سنہ ۱۹۵۶ء کا سوال نمبر ۱۰ یہ تھا کہ بے نماز کافر ہے یا نہیں؟ اگر کافر ہے تو کفر اس کا عملی ہے یا اعتقادی؟ خلود فی النار ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عمداً تارک صلوۃ کافر و مشرک وخارج از ملت اسلامیہ ہے اور اس پر مندرجہ ذیل دلائل ناطق ہیں۔

بے نماز کافر ہے: پارہ ۱۶' سورہ مریم میں ہے: فخلف من بعدهم خلف اضاعوا الصلوة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا الا من تاب وامن وعمل صالحا (الآية) یعنی "انبیاء کے بعد پھر ایسے نالائق لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور

خواہشات کی پیروی کی' پس عنقریب یہ غی کی ملاقات کریں گے مگر یہ کہ جس شخص نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے۔"

نماز کو ضائع کرنا یوں ہے کہ بالکل چھوڑ دینا' بے وقت پڑھنا اور ایسی جلدی پڑھنا کہ ارکان نماز میں اعتدال نہ رہے۔ یہ سب لوگ مضیع صلوۃ ہیں جن کا مقام جہنم میں غی ہے اور غی ایک کنواں ہے جو دوزخ کے نیچے کے طبقہ میں ہے' جہاں دوزخ کے طبقہ علیا میں رہنے والوں کی پیپ گرتی ہے۔ رواہ محمد بن نصر والطبرانی والبیھقی وابن جریر عن ابی امامة مرفوعاً)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ نمازوں کے ضائع کرنے والے کافر ہیں اور یہ کفر متضاد ایمان ہے اور اس پر اس آیت میں دو قرینے موجود ہیں۔ ایک یہ کہ نمازوں کے ضائع کرنے والوں کے لیے مقام غی بتلایا گیا ہے اور یہ جہنم کے نیچے کا طبقہ ہے جہاں کفار ہوں گے' کیونکہ فساق' اہل کبائر کے لیے دوزخ کا طبقہ علیا ہے جہاں سے وہ شفاعت کے ذریعہ نکالے جائیں گے (کتاب الصلوۃ لابن القیم) دوسرا یہ کہ لفظ اِلاَّ سے جن لوگوں کی نجات کا وعدہ کر کے ان کو حکم مذکور سے بچایا گیا ہے' ان کے لیے تجدید ایمان کی شرط ذکر کی ہے' جس سے ظاہر ہوا کہ تارک نماز بے ایمان ہے' اس کو توبہ کر کے تجدید ایمان کرنی چاہیے ورنہ ایمان سے خارج ہے اور قرآن میں نماز کو ایمان قرار دیا گیا ہے' جیسا کہ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم سے ثابت ہوا' پس جیسے فاتحہ کا نام صلوۃ ہے کہ بغیر فاتحہ نماز کا وجود نہیں ہے' اسی طرح نماز کے بغیر ایمان کی نفی ہے' کیونکہ نماز ایمان کا رکن اعظم ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے وفد عبدالقیس سے یہ فرمایا تھا کہ تم جانتے ہو ایمان باللہ کیا ہے؟ پھر خود ہی جواب فرمایا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دینا اور نماز پڑھنا اور زکوۃ دینا اور روزہ رکھنا۔ قرآن میں ہے: انما المؤمنون اخوۃ "کہ تمام ایمان والے باہم دینی بھائی ہیں۔" اور دوسری آیت میں فرمایا: فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین۔ "یعنی اگر بے دین لوگ توبہ کر کے نماز اور زکوۃ کے پابند ہو جائیں تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔" پس بے نماز کو دینی بھائی کہنا غلط ہے اور اس آیت کے خلاف ہے اور معلوم ہوا کہ مومن وہی ہیں جو نمازی ہیں۔ اس لیے احادیث میں بے نماز کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ ٭

چنانچہ ایک حدیث میں ہے: عن بریدة قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول العھد الذی بیننا وبینھم الصلوة فمن ترکھا فقد کفر۔ (رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم) یعنی "رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان معاہدہ نماز کا ہے' جس شخص نے نماز چھوڑ دی' بیشک وہ کافر ہوا۔" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز کا تارک کافر ہے اور یہ ظاہر ہوا کہ نماز ایمان میں داخل ہے' جس کے ترک سے کفر لازم آجاتا ہے۔

بے نماز مشرک ہے: سورۂ روم میں فرمان الٰہی ہے کہ واتقوہ واقیموا الصلوة ولا تکونوا من المشرکین۔ یعنی "تم اللہ سے ڈرو اور نماز کو قائم رکھو اور مشرک نہ بنو۔" نماز کا ایمان میں داخل ہونا پہلے ثابت ہو چکا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی جامع صحیح میں "باب الصلوة من الایمان" میں نماز کو ایمان کا جزو ثابت کر دیا ہے۔ نیز محدثین کا مذہب ہے کہ اعمال داخل ایمان ہیں جن کی رُو سے نماز جو تمام اعمال سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے' ایمان کا جزو اعظم ہے' جس کا تارک مشرک ہے۔

چنانچہ آیت مذکورہ بالا میں نماز کا حکم دے کر پھر مشرکین میں داخل ہونے سے منع کیا گیا' جس سے ظاہر ہوا کہ اگر نماز قائم نہ کی تو بندہ مشرک ہو جائے گا۔ اس کی نظیر سورۂ یونس میں ارشاد باری ہے: اقم وجھک للدین حنیفا ولا تکونن من المشرکین۔ یعنی "تمام دینوں سے علیحدہ ہو کر صرف دین اسلام کی طرف اپنا منہ سیدھا رکھو اور مشرکوں سے نہ ہو۔" جس سے ثابت ہوا کہ اگر دین حنیف کی طرف منہ سیدھا نہ کیا تو انسان مشرک ہو جائے گا۔ بس اسی طرح آیت روم کو سمجھ لیں کہ اگر نماز نہ پڑھی تو بندہ مشرک ہو جائے گا۔

چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے: عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیس بین العبد والشرک الا ترک الصلوة فاذا ترکھا فقد اشرک۔ (رواہ ابن ماجہ باسناد صحیح) یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اور شرک کے درمیان ملاپ صرف نماز چھوڑ دینے سے ہے' جب نماز چھوڑ دے گا تو مشرک ہو جائے گا۔"

بے نماز ملت اسلامیہ سے خارج ہے: عن عبادة بن الصامت قال اوصانا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال لا تشرکوا باللّٰہ شیئا ولا تترکوا الصلوة عمدا فمن

ترکھا عمدا متعمدا فقد خرج عن الملۃ۔ (رواہ ابن ابی حاتم فی سننہ والطبرانی باسنادین لا باس بھما) یعنی "معاذ بن‌عن نے کہا کہ ہم کو جناب نبی کریم ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور جان بوجھ کر نماز نہ چھوڑو' جس شخص نے قصداً نماز چھوڑ دی وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا۔"

اور طبرانی نے اوسط اور صغیر میں ایک روایت حضرت عمر بن‌عن سے مرفوعاً ذکر کی ہے' جس میں یہ الفاظ ہیں: ولا دین لمن لا صلوٰۃ لہ انما موضع الصلوٰۃ من الدین کموضع الراس من الجسد۔ یعنی "جس کی نماز نہیں' اس کا کوئی دین نہیں ہے اور نماز کا تعلق اسلام سے بمنزلہ سر ٹھہرایا۔" پس جیسے سر کاٹنے سے جسم میں زندگی باقی نہیں رہتی' اس طرح نماز کے بغیر اسلام بیکار اور بے فائدہ ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بے نماز اسلام سے خارج اور بے دین ہے۔ اس لیے اس روایت کے راوی حضرت عمر بن‌عن کا یہ فتویٰ ہے کہ لا حظ فی الاسلام لمن ترک الصلوٰۃ۔ یعنی "بے نماز کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔"

اور موطا میں ہے کہ حضرت عمر بن‌عن نے عمال کو یہ حکم نامہ لکھا تھا کہ جس نے نماز کی حفاظت کی اس نے اپنے دین کی حفاظت کی اور جس نے نماز کو ضائع کیا' وہ باقی دین کو جلد ضائع کرنے والا ہے۔ میرے نزدیک زیادہ مہتم بالشان نماز کا کام ہے۔

قیامت میں بے نماز کا ساتھ: عبداللہ بن عمرو بن عاص بن‌عن سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ جس شخص نے نماز کی حفاظت کی تو نماز اس کے لیے روشنی اور ایمان کی دلیل اور نجات کا ذریعہ بن جائے گی اور جس نے نماز کی نگہبانی نہ کی اور اس کو ضائع کر دیا تو اس کے لیے نہ کوئی روشنی ہو گی اور اور نہ ایمان کی دلیل اور نہ کوئی ذریعہ نجات ہو گا بلکہ وہ قیامت کے دن قارون اور فرعون اور ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ شامل ہو گا (رواہ احمد فی سننہ وفی الزواجر سندہ جید والدارمی والبیہقی فی الشعب وابن حبان فی صحیحہ ومحمد بن نصر فی کتاب الصلوٰۃ والطبرانی فی الکبیر والاوسط وقال فی مجمع الزوائد رجال احمد ثقات) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بے نماز بڑے بڑے کافروں میں شمار ہے۔

بے نماز کا کفر' کفر بواح ہے: مشکوٰۃ کتاب الامارۃ میں حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ نے بدترین امراء اور حکام کا ذکر کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہم ان کا

عہد نہ توڑ ڈالیں یعنی ان کو معزول نہ کر دیں اور ان سے جنگ نہ کریں تو آپ نے جواب میں یہ فرمایا : لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ۔ یعنی "جب تک وہ نماز کو تم میں قائم رکھیں تو ان سے نہ لڑیں اور ان کی فرمانبرداری سے ہاتھ نہ کھینچیں۔"

اور دوسری حدیث میں یوں ہے کہ : الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔ (متفق علیہ) یعنی "جب یہ کہ دیکھو تم ان میں کفر صریح کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل ہو۔" (کہ جس کی بنا پر ان کا مقابلہ کر سکو) ان دونوں روایتوں سے جن کا مورد ایک ہے' یہ ثابت ہوا کہ ترک نماز اور کفر بواح مساوی ہیں۔ اس لیے حدیث صحیح میں یہ وارد ہے کہ : بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلوٰۃ (رواہ مسلم) یعنی "بندہ اور شرک اور کفر کے درمیان ملاپ کا ذریعہ نماز چھوڑ دینا ہے۔" جس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ نماز چھوڑے گا تو کفر و شرک میں پڑ جائے گا اور اوپر کی حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ بے نماز حکام کی اطاعت مسلمانوں پر واجب نہیں ہے' فتفکروا۔

بے نماز کا کوئی عمل قبول نہیں: قرآن میں ہے : ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ یعنی "جس نے ایمان سے کفر کیا' اس کے عمل ضائع ہیں۔" اور کفار کے بارہ میں فحبطت اعمالھم کے الفاظ وارد ہیں۔ یہی حکم بے نماز کا ہے کہ اس کے عمل بھی بیکار ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ : من ترک صلوٰۃ العصر فقد حبط عملہ (رواہ احمد والبخاری والنسائی والبیھقی وابن حبان) یعنی "جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی' اس کے عمل ضائع ہوئے۔" عصر کی قید اتفاقی ہے' یا عصر کی اہمیت جتانے کے لیے ہے ورنہ عام حکم ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں یہ ہے : من ترک صلوٰۃ متعمدا احبط اللہ عملہ (ترغیب وترھیب ص۔۔۔) یعنی "جس نے نماز قصداً چھوڑ دی' اللہ تعالیٰ اس کے اعمال بیکار کر دے گا۔" اور طبرانی کی روایت میں یہ ہے جس کو سیوطی نے صحیح قرار دیا ہے کہ اول حساب قیامت کو نماز کا ہو گا۔ فان صلحت صلح سائر عملہ وان فسدت فسد سائر عملہ یعنی "اگر نماز درست ہے تو باقی عمل بھی درست ہوئے اور اگر نماز خراب ہے تو سارے فاسد ہو جائیں گے۔"

اور طبرانی اور بیہقی میں آیا ہے' فرمایا : من ترک الصلوٰۃ فکانما وتر اھلہ ومالہ۔ یعنی

"جس نے نماز چھوڑ دی تو اس کا گویا مال و اہل برباد ہو گیا" یعنی اعمال کا سب سرمایہ تباہ ہو گیا اور بزار نے اسناد حسن سے روایت کیا ہے' آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز کے تین حصے ہیں۔ وضو ایک تہائی' رکوع ایک تہائی' سجدہ ایک تہائی۔ پس جس نے ان کا حق ادا کیا اس کی نماز قبول ہو جائے گی اور اس کے باقی اعمال بھی قبول ہو جائیں گے اور جس کی نماز مردود ہو گئی تو اس کے تمام اعمال مردود ہو جائیں گے۔

امام ابن القیم نے کتاب الصلوۃ میں ان احادیث کو نقل کر کے پھر لکھا ہے کہ اما ترکہا بالکلیۃ فانہ لا یقبل معہ عمل کما لا یقبل مع الشرک عمل (الاخر) فقبول سائر الاعمال موقوف علی قبول الصلوۃ فاذا اُردت ردت علیہ سائر الاعمال۔ یعنی "اگر بالکل نماز ترک کر دی تو اس کا کوئی عمل قبول نہ ہو گا جیسے شرک کے ہوتے ہوئے کوئی عمل قبول نہیں ہے" پس تمام اعمال کی قبولیت نماز کی قبولیت پر موقوف ہے۔ جب نماز رد کر دی جائے گی تو تمام اعمال رد کر دیئے جائیں گے۔ اس دلیل سے بھی ثابت ہوا کہ بے نماز کافر ہے' جس کے اعمال کافروں کی طرح بالکل اکارت جاتے ہیں۔

بے نماز کے کفر پر اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم: ترمذی اور مستدرک حاکم میں عبداللہ بن شقیق عقیلی سے روایت ہے کہ: کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ۔ یعنی "تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اعمال میں سے کسی عمل کے ترک کو کفر نہ جانتے تھے' سوائے نماز چھوڑ دینے کے۔" یعنی بے نماز کو سب صحابہ کافر کہتے تھے۔ شیخ ابن القیم نے کتاب الصلوۃ میں لکھا ہے کہ امام ابن حزم نے کہا کہ عمر و عبدالرحمن بن عوف اور معاذ و ابوہریرہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے تھے کہ جس شخص نے ایک وقت کی نماز چھوڑ دی کہ نماز کا وقت نکل گیا تو وہ کافر مرتد ہوا اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ان کا اس مسئلہ میں مخالف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: من لم یصل فھو کافر۔ (رواہ ابن عبد البر وابن ابی شیبۃ فی کتاب الایمان والبخاری فی تاریخہ) یعنی "جس نے نماز نہ پڑھی وہ کافر ہے" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ یعنی "جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا" رواہ محمد بن نصر المروزی وابن عبداللہ عن جابر قال من لم یصل فھو کافر۔ (رواہ

ابن عبدالبر) یعنی "بے نماز کافر ہے۔" ابودرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس کی نماز نہیں ہے' وہ بے ایمان ہے۔" (رواہ ابن عبدالبر) اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے نماز بالکل بے دین ہے' اس کا کوئی دین نہیں ہے۔ (رواہ المروزی) ترغیب کے ص۔۱۵۰ میں ہے : عن ایوب قال ترک الصلوۃ کفر لا یختلف فیہ۔ یعنی "نماز چھوڑ دینا کفر ہے جس میں صحابہ کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

پس ان تمام دلائل بینہ سے ،عبارۃ النص ثابت ہو گیا کہ بے نماز کافر و مشرک اور خارج از اسلام مرتد بے دین ہے' جس کا کوئی نیک عمل قبول نہیں ہے اور وہ بڑے بڑے کفار فرعون' ہامان' قارون وغیرہ کے ساتھ شامل ہے اور اس کا کفر صریح ہے جو متضاد ایمان ہے اور وہ جہنم کے مقام غی میں جائے گا اور ہمیشہ وہاں رہے گا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے جنتی لوگ دوزخیوں سے سوال کریں گے کہ تم کو دوزخ میں کس قصور نے داخل کرایا ہے؟ تو وہ جواب دیں گے لم نک من المصلین "کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ملائکہ' انبیاء' شہداء' صلحا تمام اہل ایمان شفاعت کریں گے' کوئی گنہگار آگ میں نہ رہے گا بجز چار قسم کے لوگوں کے پھر یہ آیت تلاوت کی گئی : قالوا لم نک من المصلین۔ اس لیے بعض تفاسیر میں اس آیت کے تحت یہ لکھا ہے کہ : ان تارک الصلوۃ یخلد فی النار۔ "کہ بے نماز دائمی جہنمی ہے

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث سوہدرہ جلد۔۹' شمارہ۔۳۸' مورخہ ۱۸/ اکتوبر سنہ۱۹۵۷ء

بے نماز کافر ہے

مولانا احمد علی لاہوری کا فتویٰ

حنفیہ کا یہ اصول مشہور ہے کہ عمل ایمان کی جزء نہیں ہے' تمام اہل ایمان کا ایمان باہم مساوی ہے' نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔ انبیاء' اولیاء' متقین' صالحین کا ایمان اور ملائکہ کا ایمان اور فساق' فجار وغیرہ تمام بے عملوں کا ایمان یکساں ہے اور وہ ایمان کے اصول کی تصدیق اور اقرار باللسان کا نام ایمان رکھتے ہیں۔ محدثین کرام تمام ان کے خلاف اعمال اور ارکان اسلام

کو جزو ایمان قرار دیتے ہیں اور وہ ایمان کی کمی بیشی کے قائل ہیں۔ تارک ارکان اسلام بے نماز وغیرہ کے کفر اور جنازہ کا حکم بھی اسی اصول پر متفرع ہے جو نماز وغیرہ ارکان اسلام کو جزو ایمان کہتے ہیں وہ تارک نماز وغیرہ کو کافر قرار دیتے ہیں اور جو نماز وغیرہ ارکان اسلام کو اصل ایمان کی حقیقت اور ماہیت سے باہر سمجھتے ہیں وہ نماز وغیرہ کے تارک کو کافر اور بے ایمان نہیں کہتے' وہ گنہگار مومن' فاسق مسلمان قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب حنفی لکھنوی اپنے مجموعہ فتاویٰ جلد ۱' ص ۳۴۳ میں فرماتے ہیں :

سوال : جس شخص نے عمر بھر نماز نہ پڑھی ہو' مرنے کے بعد اس کے جنازے کی نماز پڑھنے کی نسبت کیا حکم ہے؟

جواب : اس کا غسل اور اس کی نماز وغیرہ سب مسلمانوں کی طرح ہونی چاہیے' کیونکہ حدیث میں ہے : صلوا علی کل بر وفاجر۔ "ہر نیک اور بد پر نماز پڑھو۔"

اسی طرح مولانا اشرف علی تھانوی حنفی اپنی آخری کتاب بوادر النوادر جلد ۱' ص ۱۰۰ میں ایک وصیت نامہ کی تردید فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "اسی طرح اس میں یہ لکھا ہے کہ تارک الصلوۃ کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں' یہ حکم صاف حدیث کے خلاف ہے : صلوا علی کل بر وفاجر۔ یہ بھی قرینہ ہے' اس وصیت نامہ کے غلط ہونے کا۔"

مولانا اشرف علی صاحب نے بے نماز کے جنازہ نہ پڑھنے کو حدیث کے خلاف ٹھہرا دیا ہے بلکہ تمام احناف نے بے نماز کو فاجر ٹھہرا دیا ہے۔ چنانچہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے الہادی بابت ماہ محرم سنہ ۵۳ھ میں ایک سوال کے جواب میں تارک نماز کی بابت کتب فقہ کی عبارات نقل کر کے یہ فرمایا ہے : "ان عبارات سے یہ معلوم ہوا کہ تارک صلوۃ عمداً بشرطیکہ وہ نماز سے استہزاء نہ کرتا ہو حنفیہ کے نزدیک کافر نہیں ہے بلکہ فاسق ہے" (ص ۴۴) بلکہ الہادی بابت ماہ جمادی الثانی سنہ ۵۲ھ میں تو یہ بھی ہے کہ اگر کوئی کسی کو کہے نماز پڑھ اور وہ کہہ دے کہ "لا اصلی" میں نماز نہیں پڑھوں گا' تب بھی وہ کافر نہیں کہ یہ کلمہ بھی محتمل ہے۔ بہرصورت یہ علماء حنفیہ اور ان کے سابقین نماز کو ایمان کی جزو نہیں جانتے۔ قاضی شریک نے قاضی ابو یوسف کی شہادت اس لیے رد کر دی تھی کہ یہ گواہ نماز کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتا۔ (میزان)

اب رئیس الحنفیہ مولانا احمد علی صاحب شیخ التفسیر کا منصفانہ فتویٰ ملاحظہ فرمایئے کہ

انہوں نے کتاب وسنت کی روشنی میں تمام حنفیہ کے خلاف بے نماز کو بے ایمان کافر پکا قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا جنازہ بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اخبار خدام الدین لاہور جلد ۷' شمارہ ۲۵ مطبوعہ ۳۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ھ کے ص ۵-۶ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں' حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ : من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر۔ (ترجمہ) "جس نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑا' پس تحقیق وہ کافر ہو گیا" اس طرح جو روزہ جان بوجھ کر نہ رکھے' حج توفیق ہونے کے بعد نہ کرے' اگر مال ہو تو زکوۃ نہ دے تو وہ سب کافر ہیں۔ خواہ وہ کتنے بڑے عالم کیوں نہ ہوں (یعنی ہدایہ وغیرہ علم فقہ میں ماہر ہوں) اگر بی اے' ایم اے نماز نہیں پڑھتے تو وہ سب بے ایمان ہیں۔ سنو! میں کہا کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا نام مادھو سنگھ' گنگا رام رکھواؤ' نماز پنجگانہ ادا کرو' زکوۃ پائی پائی گن کے دو' حج فرض ہے تو کر کے آؤ' روزے رمضان کے تیسوں رکھو تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو۔

(پھر لکھتے ہیں) اگر کوئی اپنا نام محمد الدین' عبداللہ جان' اللہ رکھا' محمد جان رکھوائے نماز ایک نہ پڑھنے پائے' حج فرض ہے تو نہ کر کے آئے' روزہ ایک نہ رکھے' زکوۃ باوجود واجب ہونے کے بالکل نہ دے تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ ھذا کافر حق' "یہ پکا کافر ہے" پھر جنازہ کی بابت عبداللہ بن ابی کا واقعہ پیش کیا ہے کہ حضور ﷺ نے شفقت کر کے اس کا جنازہ پڑھا لیکن اللہ تعالیٰ نے تردید فرما دی کہ بخشش مانگ یا نہ مانگ میں ہرگز نہ بخشوں گا پھر اس دلیل کے بعد بے نماز کے جنازہ کا یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر کسی نے ساری عمر ایک نماز نہ پڑھی ہو' روزہ ایک نہ رکھا ہو تو اگر نماز جنازہ پڑھے گا بھی تو ہرگز نماز جنازہ قبول نہ ہو گی۔

مولانا احمد علی صاحب کا یہ فتویٰ درست اور حق ہے' دیگر علماء حنفیہ کو بھی ان کی تصدیق کرنی لازم ہے۔ مولوی اشرف علی صاحب نے بوادر النوادر جلد ۲' ص ۵۴۰ میں یہ فرما دیا ہے جس سے مولانا احمد علی صاحب کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ حدیث ثانی میں ترک صلوۃ اس زمانہ (نبوی) میں کفر کی علامت تھی' پس اس کا حاصل کفر ہی ہوا جیسے شد زنار کو فقہاء نے شعار کفر فرمایا ہے۔ اس سے تمام احکام (جنازہ' نکاح وغیرہ) کفر کے جاری کر دیئے جائیں گے اور اس زمانہ میں ترک صلوۃ کی علامت کفر ہونے کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے :

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین العبد وبین الکفر

ترک الصلوٰۃ۔ (رواہ مسلم) وعن بریدۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم العہد الذی بیننا وبینہم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ) وعن عبداللّٰہ بن شقیق قال کان اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یرون من الاعمال ترکہ کفرا غیر الصلوٰۃ' رواہ ترمذی۔ (مشکوٰۃ)

خلاصہ ان احادیث کا یہ ہے کہ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نماز چھوڑنے کو کفر سمجھتے تھے۔ مولانا اشرف علی کی نقل کردہ احادیث سے مولانا احمد علی صاحب کا فتویٰ صحیح ثابت ہوا کہ بے نماز کافر ہے۔ جب کافر ہوا تو کافر کا جنازہ جائز نہیں ہے اور جو حدیث فاجر کے جنازے کی ہے وہ اول تو ضعیف ہے' دوم اس میں فاجر کے جنازہ کا حکم ظاہر ہوتا ہے' کافر کا نہیں۔ بے نماز کافر ہے' کافر کا حکم اس سے علیحدہ ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد ۱۳' شمارہ ۱۹' ۲۰' مورخہ ۱۷' ۲۴/ نومبر سنہ ۱۹۶۰ء

بے نماز کافر ہے

آنجناب فیض مآب نے اہل حدیث مجریہ ۲۳/ جولائی سنہ ۱۹۵۴ء میں فتویٰ نمبر ۳۲۰ کے جواب میں دو شخصوں کے اس نزاع میں کہ بے نماز کافر خارج از اسلام ہے یا نہیں؟ یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ "بے نماز پر کفر کا فتویٰ صحیح ہے' مگر یہ کفر ایسا نہیں کہ اُسے اسلام سے خارج قرار دیا جائے' الخ۔" یہ جمہور علماء کے مذہب کے تو مطابق ہے لیکن اس جماعت اہل حدیث کے خلاف ہے جو بے نماز کو قطعی کافر خارج از اسلام قرار دیتی ہے اور حق ان کے ساتھ ہے' اس لیے کمترین بھی اس طائفہ قلیلہ میں داخل ہے۔ ہاں کفر دون کفر اور کفر اعتقادی وکفر عملی کی تقسیم بلاشبہ صحیح ہے لیکن کفر عملی دو قسم ہے۔ ایک متضاد ایمان' دوم غیر متضاد ایمان۔ چنانچہ رسالہ "حکم النبی بکفر من لا یصلی" میں اس کی پوری تفصیل ہے' مثلاً کسی قبر یا شیخ طریقت کو سجدہ تعظیم وتحیہ کرنا کفر عملی ہے لیکن یہ متضاد ایمان ہے' ٹھیک اس طرح نماز عمداً ترک کر دینا کفر عملی ہے اور متضاد ایمان ہے جس سے تارک نماز اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

جب احادیث میں لفظ کفر وارد ہو تو اس سے کفر دون کفر یا کفر حقیقی مراد لینے کے وقت دیگر قرائن اور شواہد کی ضرورت ہے۔ یہاں قیاس اور عقل کو کوئی دخل نہیں ہے کہ اپنے قیاس سے جہاں چاہا کفر مجازی مراد لے لیا اور جہاں چاہا کفر حقیقی مراد لے لیا' یہ رویہ غلط ہے۔ ہاں خارجی دلائل سے یہ واضح ہو جائے کہ یہاں فلاں قسم کا کفر ہے تو وہ بات قابل قبول ہے۔

اب یہ خادم العلماء عرض کرتا ہے کہ احادیث کفر تارک نماز میں کفر حقیقی مراد ہے جو متضاد ایمان ہے' جس سے عمداً نماز چھوڑ دینے والا اسلام سے خارج' دائمی جہنمی ہے۔ چنانچہ دلائل وشواہد اس پر یہ ہیں :

(۱) بروئے آیت انما المؤمنون اخوۃ وحدیث المسلم اخ المسلم' مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور آیت فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین سے ظاہر ہے کہ بے نماز مسلمانوں کا بھائی نہیں ہے کیونکہ اس میں اقامت صلوۃ پر اخوت فی الدین مرتب ہے' فتذکر۔

(۲) آیت فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوۃ میں الا من تاب وامن وارد ہے' اگر اضاعت صلوۃ کفر نہ ہو تو تجدید ایمان کی ضرورت اور استثناء نہ ہوتا' فتفکر۔

(۳) احادیث کفر بے نماز میں جہاں لفظ کفر وارد ہے' وہاں لفظ شرک بھی وارد ہے یعنی من ترکھا فقد اشرک "کہ جس نے نماز چھوڑ دی' اس نے شرک کیا۔" پس جہاں قرآن وحدیث میں کسی چیز پر لفظ کفر اور لفظ شرک کا اطلاق ہوتا ہے' وہاں کفر حقیقی ہی مراد ہوتا ہے۔ کما لا یخفی علی اہل العلم۔ اگر یہ بات صحیح نہ ہو تو اس کے خلاف کوئی نظیر پیش کریں تاکہ اس پر غور و فکر کیا جائے۔

(۴) کفر بے نماز ایسا ہے جس سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں' جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت ہے' تو یہ ضابطہ شرعیہ ہے کہ جس کفر سے عمل حبط ہو' وہ متضاد ایمان ہے جو کفر حقیقی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کوئی اس کے خلاف نظیر پیش کریں تاکہ اس پر غور کیا جائے۔

(۵) اہل سقر نے "لم نک من المصلین" کہا ہے جن پر حکم یہ لگایا گیا ہے کہ فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین پس بے نماز شفاعت سے محروم ہیں جس سے کفر حقیقی ظاہر

ہے' فتدبر۔

(۶) بے نمازوں کی معیت قارون' فرعون' ہامان وغیرہ کے ساتھ بروز حشر بیان کی گئی ہے' یہ قرینہ کفر حقیقی پر ہے۔

(۷) بے نمازوں کے کفر پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ظاہر ہوتا ہے' جیسا کہ بعض آثار میں منقول ہے۔ یہ دلیل بے نماز کے کفر حقیقی پر ہے' ورنہ کفر دون کفر تو دیگر چیزوں پر بھی وارد ہے۔ پھر بے نمازوں کے کفر پر صحابہ کا اجماع چہ معنی؟

(۸) احادیث و قرآن میں نماز کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے' یہ جز پر کل کا اطلاق ظاہر کرتا ہے کہ نماز ایمان کا ایسا جزء اعظم ہے کہ اس کے ضائع ہونے سے ایمان کا بالکلیہ ضائع ہونا لازم آتا ہے' جیسے فاتحہ کو صلوۃ کہا گیا ہے' تو ترک فاتحہ سے نماز بالکل ضائع ہے' جیسا کہ اہل حدیث کا مذہب ہے۔ فافہم ولا تکن من القاصرین۔

(۹) حدیث میں جیسے کلمہ طیبہ کو مفتاح الجنتہ کہا گیا ہے' ایسا ہی نماز کو بھی مفتاح الجنہ کہا گیا ہے اور اکثر احادیث میں اس کا ذکر مقرون بالشہادتین ہے' تو یہ بے نماز کے کفر حقیقی پر شاہد ہے' لیکن انصاف کی ضرورت ہے۔

(۱۰) بعض روایتوں میں تارک نماز کے بارہ میں فقد خرج من الملۃ بھی وارد ہے' یہ بے نماز کے ملت اسلامیہ سے خروج پر نص شرعی ہے' فتامل۔

(۱۱) حکام اور خلفاء سے مقاتلہ اور مباینہ اور منازعت منع ہے' الا ان تروا کفرا بواحا یعنی مگر یہ کہ تم کفر صریح معلوم کر لو تو پھر خلفاء سے مقابلہ کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح دیگر احادیث صحیحہ میں یہ وارد ہے کہ لا ما صلوا لا ما صلوا یعنی اس وقت تک ان کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچو اور ان کا مقابلہ نہ کرو کہ جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔ جس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اگر نماز چھوڑ دیں تو ان سے علیحدہ ہو جاؤ اور ان کا مقابلہ کرو۔ پس ان احادیث میں ترک الصلوۃ اور کفر بواح کو یکساں قرار دیا گیا ہے جو کفر حقیقی پر بین دلیل ہے۔ روایت احد عشر کو کہلہ میرے پاس یہ گیارہ دلائل ہیں جو احادیث کفر بے نماز میں کفر حقیقی مراد لینے پر مجبور کرتے ہیں۔

آپ علامہ ابن قیم کی کتاب الصلوۃ پر پورا غور کریں تو اس سے بھی بے نماز کا کفر حقیقی ظاہر ہے مگر تفصیل کی اس جگہ گنجائش نہیں ہے۔ اب آپ بھی ایسے ہی صریح دلائل جو

نماز کے تارک کے متعلق ہوں پیش کریں۔ مجمل دلائل یا عام دلائل جن میں تارک نماز کا صریح ذکر نہ ہو' صرف کلمہ گو یا کسی اور طرح کا ذکر ہو تو وہ دلائل وشواہد قابل التفات نہ ہوں گے۔ تحقیق حق سے کام لیں اور بے نمازوں کو کافر اور مسلمان دو متضاد طبقوں سے ملقب نہ کریں۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث سوہدرہ' جلد ۶' شمارہ ۳۱' ۳۲' مورخہ ۲۱' ۲۲' اگست سنہ ۱۹۵۳ء

اسلام میں نماز کی اہمیت اور ملک میں بے نمازوں کی کثرت

قابل توجہ حکومت پاکستان

واضح ہو کہ اخبار "الاعتصام" کے گزشتہ شمارہ میں رکن اعظم اسلام نماز کے بارہ میں حکومت کو توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ مشورہ حق اور صواب ہے جو قابل عمل ہے اور اس کو آئین اسلام کی تمام قراردادوں سے اول نمبر میں رکھنا چاہیے' کیونکہ اسلامی دستور یہ ہے کہ اگر کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کو کلمہ شہادت کے بعد سب سے پہلے نماز کی تعلیم دی جاتی ہے اور جب بچوں کو کلمہ سکھلایا جاتا ہے تو اس کے بعد ان کو نماز پڑھائی جاتی ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ سات سال کے بچوں کو پیار سے اور دس سال کے بچوں کو مار مار کر نماز کا عادی بنانا چاہیے اور قیامت کے دن توحید کے بعد عدالت الٰہی میں اول نماز کا محاسبہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص نماز کے بارہ میں فیل ہو گیا کہ بالکل نہ پڑھی یا پڑھی لیکن ناقص ہونے کی وجہ سے قبول نہ ہوئی تو اس کے دیگر اعمال بھی رد کر دیئے جائیں گے اور وہ قبول نہ ہوں گے۔ اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے نماز کی تاکید شدید اور تارک کے لیے وعید بیان فرمائی ہے اور دنیا سے رحلت فرماتے وقت بھی آخری وصیت یہ فرمائی : الصلوۃ وما ملکت ایمانکم "کہ نماز کی خوب حفاظت رکھنا اور اپنے ماتحت لونڈی غلاموں نوکروں کے حقوق ادا کرنا اور ان پر شفقت کرنا۔"

عبوری حکومت نے زکوۃ و عشر کے اہتمام کا تو اعلان کر دیا ہے لیکن اقامت نماز کی بابت کوئی اعلان نہیں کیا حالانکہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بطور اعلان تھا

واللہ لا قاتلن من فرق بین الصلوۃ والزکوۃ انھا لقرینتھا فی کتاب اللہ یعنی "اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوۃ کا حکم یکساں نہیں سمجھتے اور ان میں فرق کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوۃ دونوں کو قرآن میں ملا کر ذکر کیا ہے۔" اور عہد نبوی و عہد صحابہ میں ترک نماز کو کفر کی علامت قرار دیا گیا تھا۔

چنانچہ علماء دیوبند احناف کے مرشد جناب مولانا اشرف علی صاحب مرحوم تھانوی اپنی کتاب بوادر النوادر جلد-۲ ص-۵۴۰ میں یہ لکھتے ہیں : "ترک صلوۃ اس زمانہ میں کفر ہی کی علامت تھی پس اس کا حاصل کفر ہی ہوا جیسے شد زنار کو فقہاء نے شعار کفر فرمایا ہے' اس پر تمام احکام کفر کے جاری کر دیئے جائیں گے اور اس زمانہ میں ترک صلوۃ کی علامت کفر ہونے کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے :

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین العبد وبین الکفر ترک الصلوۃ۔ رواہ مسلم' وعن بریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العھد الذی بیننا وبینھم الصلوۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ رواہ احمد والترمذ والنسائی وابن ماجہ' وعن عبداللہ بن شقیق قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوۃ)

اور خلاصہ مطلب ان احادیث کا یہ ہے کہ بندہ اور کفر کے درمیان حد فاصل نماز ہے۔ اس کو چھوڑ دے گا تو کافر ہو جائے گا صحابہ کرام ﷺ بھی نماز کے سوا کسی عمل کے چھوڑنے کو کفر نہ جانتے تھے نماز کے تارک کو کافر کہتے تھے۔

بہشتی زیور حصہ دوم کے ص-۱۷ میں لکھا ہے : "آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے سو جس نے نماز کو اچھی طرح سے پڑھا' اس نے دین کو ٹھیک رکھا اور جس نے اس ستون کو گرا دیا یعنی نماز کو نہ پڑھا' اس نے دین برباد کر دیا اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز ہی کی پوچھ ہو گی (تا آخر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ نمازیوں کا حشر قیامت کے دن نبیوں اور شہیدوں اور ولیوں کے ساتھ ہو گا اور بے نمازیوں کا حشر قیامت کے دن فرعون اور ہامان اور قارون کافروں کے ساتھ ہو گا بے نماز کافروں کے برابر سمجھا گیا' اللہ کی پناہ' نماز نہ پڑھنا کتنی بری بات ہے۔"

نیز حصہ چھٹا ص۔۳۰ میں یہ لکھا ہے: "بغیر عذر کے ایک وقت کی بھی فرض نماز چھوڑنا سخت گناہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی' وہ ایمان سے نکل گیا اور حدیث شریف میں ہے کہ ایسا شخص فرعون' ہامان' قارون کے ساتھ دوزخ میں ہو گا۔"

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تمام علماء پاک و ہند میں ایک مسلم جید مفتی عالم خصوصاً حنفیہ کے مشہور مرشد رہنما ہو گزرے ہیں' انہوں نے احادیث نبویہ کی رُو سے نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے بے نمازوں کا حکم بیان کر دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایمان سے نکل کر کافر اور قیامت کے دن بڑے بڑے کفار کے ساتھ شامل ہو کر ان کے ساتھ جہنم میں جائیں گے اور دنیا میں ان کی علامت کفر ترک نماز ہے' باوجود اس کے اب باشندگان پاکستان پر طائرانہ نظر کی جائے تو بے نمازوں کی اس قدر کثرت ہے کہ چاروں طرف ہر قوم اور ہر محلہ اور ہر گاؤں اور ہر شہر میں بے نماز ہی بے نماز نظر آتے ہیں۔

چنانچہ میرا اپنا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ راگی سرودی اور راگ کے ساز ڈھول سارنگی بجانے والے بے نماز۔ ہیجڑے بے نماز۔ تانگوں والے بے نماز۔ نوکر' ریل چلانے والے ڈرائیور اکثر بے نماز۔ دوکاندار اکثر بے نماز۔ مراثی اور بھنڈ اکثر بے نماز۔ مصور اور فوٹو گرافر اکثر بے نماز۔ چھابڑی والے' بازار میں سبزی وغیرہ فروخت کرنے والے اکثر بے نماز۔ منڈیوں کے بیوپاری بے نماز۔ دھوبی رنگریز اکثر بے نماز۔ سکولوں' کالجوں کے ماسٹر' پروفیسر' طلباء اکثر بے نماز۔ کچہریوں کے عرائض نویس' وکلاء' مدعی' ملزم' گواہ' کلرک عدالتوں کے حکام' چپڑاسی اکثر بے نماز۔ ہوائی جہاز' بحری جہاز والے اکثر بے نماز۔ چھکڑوں والے ڈرائیور اکثر بے نماز۔ یہاں تک کہ محکمہ ریلوے میں اکثر بے نماز۔ محکمہ پولیس میں سپاہی اور حوالدار' تھانیدار' دیوان' انسپکٹر وغیرہ اکثر بے نماز۔ محکمہ تحصیل میں پٹواری' قانون گو' چپڑاسی' تحصیلدار وغیرہ اکثر بے نماز۔ محکمہ فوج میں مارچ کرنے والے' محاذ پر جنگ کی تیاری کرنے والے اور جنگ میں مشغول ہونے والے فوجی اکثر بے نماز۔ حالانکہ حالت جنگ میں بھی نماز ترک کرنے کا حکم نہیں' بلا یہ کہ گھمسان کی جنگ ہو تو پھر نماز کی دوسرے کسی وقت میں قضائی دے۔ الیکشن کے وقت امیدوار' ووٹر اور منشی اور دیگر افسر اکثر بے نماز۔ قومی اسمبلی اور صوبائی کے اراکین اکثر بے نماز۔ قانون ساز کمیٹی کے ارکان اکثر بے نماز۔ سابقہ حکومتوں کے وزیر اعظم

اور صدر اور دیگر وزراء' گورنر اکثر بے نماز۔ دیہات کے نمبردار اور چوکیدار' زمیندار اکثر بے نماز۔ کنجر بھنڈ ڈوم اکثر بے نماز۔ تھیٹر' سینما والے اور تمام کھیلوں کے کھلاڑی اور اکھاڑے والے اکثر بے نماز۔ جلسوں' میلوں' جلوسوں میں شریک ہونے والے اکثر بے نماز۔ تمام جماعتوں کے لیڈر' انگریزی دان اکثر بے نماز۔ سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے منشی' کلرک اکثر بے نماز۔ قبروں' خانقاہوں کے مجاور' پیر اکثر بے نماز۔ عرس کے میلاد کے اجلاسوں میں شریک ہونے والے اکثر بے نماز۔ لوہار' ترکھان' موچی' جولاہے' درزی اور کارخانوں کے اہلکار اور مزدور اکثر بے نماز۔ منگت' فقیر' گداگر اکثر بے نماز۔ قلندر' بندر' ریچھ سے کھیل تماشا دکھانے والے اکثر بے نماز۔ مداری' بازیگر' نٹ اکثر بے نماز۔

اگر ایک ایک گھر کی پڑتال کریں تو تمام اہل خانہ بے نماز یا ایک گھر میں دو ایک نمازی باقی بے نماز۔ کسی گھر میں خاوند نمازی تو بیوی بے نماز اور اگر بیوی نمازن ہے تو شوہر بے نماز۔ اگر خاوند بیوی نمازی ہیں تو ان کی اولاد بے نماز۔ مذہبی لحاظ سے پڑتال کریں تو اہل قرآن چکڑالوی' پرویزی اکثر بے نماز۔ بریلوی اکثر بے نماز۔ دیوبندی اکثر بے نماز۔ پیر نمازی تو مرید اکثر بے نماز۔ اہل حدیث کہلانے والے اکثر بے نماز۔ ہاں درسگاہوں کے طلباء جو دینی مدارس میں دینیات کی کتابیں پڑھنے والے نمازی ہیں اور سکولوں کے طلباء میں اکثر بے نماز۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ملک میں بے نمازوں کی اکثریت ہے۔

پس جب یہ مسلم ہے کہ نماز اسلام اور کفر میں حد فاصل ہے تو بے نماز مسلمان نہ ہوئے تب پاکستان پاک نہ رہا کہ بے نمازوں کی نجاست سے ناپاک ہو گیا اس لیے اہل حکومت کا یہ پہلا فریضہ ہے کہ نماز کے بارہ میں ایسا آئین تیار کیا جائے کہ جس سے بے نمازوں کو نمازی بنایا جا سکے اور ملک پاکستان حقیقی معنوں میں پاک ہو کر پاکستان ہو جائے کہ حدیث شریف میں یہ آیا ہے: "جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارے دروازہ پر نہر جاری ہو اور تم اس میں پانچ بار غسل کرو تو کیا تمہارے بدن پر میل کچیل رہ سکتی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ نہیں رہ سکتی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا بس اسی طرح پانچ نمازیں ہمیشہ پڑھنے سے نمازی کے گناہ دفتر سے صاف ہو جاتے ہیں اور وہ پاک ہو جاتا ہے" اس لیے حکومت کو چاہیے کہ پاکستان کے بے نمازوں کو نماز کا پابند بنا کر گناہوں سے پاک کریں' تب ملک کا نام پاکستان اسم بامسمی ہو گا ورنہ مثل ہندوستان کے ہے کہ وہاں بھی

بے نمازوں کی اکثریت ہے' یہاں بھی۔ صرف علماء کے وعظوں اور درسوں سے تارک نماز جو ترک نماز کے عادی ہو چکے ہیں' نمازی نہیں بن سکتے۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "التقاہر" کے ص۔۸ پر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یزع السلطان اکثر ما یزع القرآن۔ یعنی "حکومت وہ انسداد کر سکتی ہے جو قرآن وعظ نصیحت سے نہیں کر سکتا" حضرت مولانا یعقوب صاحب کا شعر ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ وعظ نافع ہے اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو اور سب سے بڑی واعظ تلوار ہے۔ حق تعالیٰ نے بطور امتنان فرمایا ہے کہ ہم نے لوہے کو پیدا کیا یعنی ہتھیاروں کو کہ اس سے بڑا خوف پیدا ہوتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ باشندگان پاکستان کو اس کا خوب تجربہ ہو چکا ہے کہ بھٹو کی حکومت کس قدر مظالم کرتی رہی۔ علماء اسلام اور لیڈران قوم نے اس کو بہت سمجھایا۔ جلسوں اور جلوسوں کی تقریروں سے اس پر خوب حجت قائم کرتے رہے۔ کئی سال گذر گئے' تمام مسلم رعایا نے سول نافرمانی کی اور بھٹو کی حکومت کے خلاف زبردست تحریک جاری ہوئی' تمام شہروں میں جلوس نکلے۔ بھٹو نے کوئی نصیحت نہ لی بلکہ قتل عام شروع کر دیا' تب اللہ تعالیٰ نے جنرل ضیاء الحق دام اقبالہ فوجی حکومت کے سربراہ کو القاء کیا کہ ملک پاکستان کی حفاظت کرو' تب فوجی حکومت ملک پر چھا گئی اور اپنی فوجی سیاست سے بھٹو کو حکومت سے برطرف کر دیا اور پاکستان کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت جو کام کر سکتی ہے' وہ نہ قرآن کر سکتا ہے اور نہ علماء کر سکتے ہیں۔

چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب التقاہر کے ص۔۸ پر لکھتے ہیں کہ "میرے ایک دوست کہتے تھے کہ مردم شماری کے زمانہ میں' میں نے اپنے ایک ملنے والے سے کہا جو اسی کام پر تعینات تھے کہ بڑا ثواب ہو گا اگر تم اس وقت ایک کام کر دو' وہ یہ کہ جب کسی مسلمان کے ہاں مردم شماری کرنے جاؤ تو جہاں اور خانہ پریاں کرتے ہو' یہ بھی پوچھ لیا کرو کہ نمازی ہے یا نہیں؟ انہوں نے ایسا ہی کیا' حضرت صرف اس پوچھنے کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں آدمی نمازی ہو گئے' حالانکہ کاغذ میں اس کے لیے کوئی خانہ نہ تھا۔ اس سوال ہی سے لوگ یہ سمجھے کہ حکام کو اس کی طرف توجہ ہوئی ہے' نماز نہ پڑھنے پر کوئی برا نتیجہ مترتب ہو گا۔ صرف اس احتمال اور خیال کا وہ اثر ہوا کہ کسی وعظ اور فہمائش کا نہ ہو' تو وجہ کیا ہے

کہ حکومت کی طرف ہر شخص کے اغراض و مقاصد رجوع ہوتے ہیں' ان پر اثر پڑنے کا احتمال ہو گیا۔

اسی طرح انہوں نے ایک سب انسپکٹر صاحب سے کہا تھا کہ آپ کوشش کریں تو نمازی بہت ہو جائیں' انہوں نے کہا میں کیا کوشش کر سکتا ہوں' قانوناً اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے' کہا مداخلت کچھ نہ کیجئے' صرف اتنا کیجئے کہ جو بے نمازی ملے' جھوٹ موٹ اس کا نام نوٹ بک میں لکھ لیا کیجئے اور زبان سے کچھ نہ کیجئے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ تمام علاقہ کے آدمی نمازی ہو گئے۔ غرض امارت اور حکومت کو بڑا دخل ہے۔

میں کہتا ہوں زمانہ ہند میں میرا خود تجربہ ہے کہ میں ایک گاؤں موضع گکھڑانوالہ میں مقیم تھا' وہاں بے نماز بکثرت تھے۔ بندہ نے ہر چند ان کو قرآن و حدیث سنایا' وعظ و نصیحت کی' کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں لوگوں کے فسادات کی وجہ سے پولیس کی چوکی بیٹھ گئی اور ایک درلی جتھا بھی وہاں متعین ہو گیا' وہ لوگوں سے رات کو باری باری پہرہ دینے کا کام لیتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہاں بے نماز بہت ہیں' آپ ذرا ان کو ڈانٹیں تو ثواب ہو گا۔ انہوں نے منادی کرا دی کہ بے نمازوں سے پہرہ دینے کا کام لیا جائے گا۔ میں نے بے نمازوں کی فہرست بنا کر دے دی اور عمل شروع ہو گیا۔ بس ایک دو دن میں تمام بے نماز نمازی ہو گئے اور گاؤں کی مسجدیں پر ہو گئیں۔ میں نے لوگوں کو یہ شعر سنایا۔

چار کتاباں عرشوں آیاں پنجواں آیا ڈنڈا
ڈنڈے باجھوں سجدا ناہیں بے دیناں دا کنڈا

کمترین نے بطور تبلیغ اور مشورہ کے جناب جنرل ضیاء الحق صاحب کو ایک مضمون جو بارہ صفحات پر مشتمل تھا' بذریعہ رجسٹری ارسال کیا تھا جو آیات اور احادیث سے بھرپور تھا' اس میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ اسلامی نظام کا آپ خود نفاذ کر دیں' الیکشن کا انتظار نہ کریں کیونکہ مروجہ الیکشن کوئی اسلامی اور شرعی طریقہ نہیں ہے' یہ انگریزی رسم ہے جس میں مختلف سیاسی پارٹیاں باہم لڑتی اور مقابلہ کرتی ہیں' جس میں اراکین امیدوار لائق اور نالائق ہر قسم کے ہوتے ہیں اور خلاف شرع اکثریت پر فیصلہ ہوتا ہے اور پھر قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی میں جب قراردادیں پہنچتی ہیں تو وہاں پر بھی دلائل شرعیہ سے فیصلہ نہیں کیا جاتا بلکہ کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور اکثریت انگریزی داں طبقہ کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے قوانین اسلامی کا نفاذ نہیں ہوتا اس

لیے آپ علماء اسلام اور لیڈران قوم اور روسائل و سائل کا اجلاس قائم کرکے ایک امیر شریعت کا انتخاب کریں اور قوانین اسلام اس کے سپرد کر دیں وہ عدالتوں میں نافذ کر دیں یا خود آئین اسلام نافذ کر دیں کہ اس وقت ملک پر آپ کا تسلط قائم ہے اور سب اکابر واصاغر آپ سے مرعوب ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے اپنی حکومت کے زور سے تمام فسادات اور مفسدین کا دفاع کرکے ملک میں امن قائم کر دیا ہے لیکن جب تک غیر اسلامی قوانین کو دفع کرکے اسلامی قوانین نافذ نہ کریں گے قیامت کے محاسبہ سے آپ رہائی نہ ہو سکیں گے سو الحمد للہ جنرل ضیاء الحق صاحب نے غیر اسلامی قوانین کے انسداد اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا حکم جاری کر دیا۔

جزاء اللہ تعالٰی عنی وعن سائر المسلمین احسن الجزاء۔

اسی طرح کمترین خادم الاسلام کی اب اپیل یہ ہے کہ تمام قراردادوں سے پہلے قوانین اسلام میں نماز کی قرارداد تجویز کرکے اس کو پاس کر دیا جائے اور تارک نماز کے لیے شرعی سزا تجویز کرکے نافذ کی جائے۔ شرعی سزا بعض ائمہ دین کے نزدیک قتل ہے' جیسے امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا ارشاد کتب مذہب شافعیہ میں درج ہے اور بعض کے نزدیک قید ہے کہ جب تک نماز کا پابند نہ ہو جیل میں مقید رہے۔ اگر زمانہ کی مصلحت کے لحاظ سے ان دونوں سزاؤں سے اغماض کرکے صرف کوڑوں کی سزا تجویز کی جائے تو یہ بھی کافی ہے کہ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ سات سال کے بچوں کو پیار محبت سلوک سے نماز پڑھاؤ اور جب دس سال کا ہو تو اس کو مار مار کر نمازی بناؤ۔ پس اس ارشاد سے استنباط کرکے بے نمازوں کے لیے کوڑوں کی سزا تجویز کرکے نافذ کر دی جائے تو پاکستان میں سب بے نماز نمازی بن جائیں گے اور آپ کو اجر دارین حاصل ہو گا اور یہ حکم ائمہ مساجد یا خطیبوں کے سپرد کیا جائے کہ وہ اپنے ماتحت مقتدیوں کی نگرانی کریں اور ان کی فہرست تیار کرکے رکھیں جو نماز ترک کرے' اس کی رپورٹ کر دیا کریں۔ بس اس قانون کے نافذ ہوتے ہیں انشاء اللہ تعالٰی سب بے نماز نمازی ہو جائیں گے۔ جب نمازی ہو گئے تو وہ دیگر جرائم بھی چھوڑ دیں گے کیونکہ قرآن کریم اس پر ناطق ہے: ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ "کہ نماز نمازی کو بے حیائی اور گناہوں کے کاموں سے روکتی ہے۔" وما علینا الا البلاغ۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

ہفت روزہ الاعتصام لاہور جلد ۲۹' شمارہ ۲۶' ۲۷' مورخہ ۲۷ جنوری و ۳ فروری سنہ ۱۹۷۸ء

بے نمازیوں کیلئے سزا و تعزیر کی ضرورت

ایوان صدر راولپنڈی سے ایک مکتوب صدر مملکت محمد ضیاء الحق صاحب ایدہ اللہ بنصرہ کی طرف سے شائع ہوا ہے جو پاکستان کے شہر شہر' قریہ قریہ اور محلہ محلہ تمام باشندگان کو پہنچایا گیا ہے' وہ مطبوعہ مکتوب گرامی کمترین راقم الحروف کی جماعت اہلحدیث کے پاس بھی پہنچا تھا جس کی سب نے تصدیق و تائید کی تھی۔ صدر موصوف کے جملہ امور نافذ کردہ اصلاح ملک کے لیے قابل تحسین اور وہ ذاتی طور بھی اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں' تاہم نامناسب نہ ہو گا اگر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ان کے نظام ملک و مملکت میں بعض نقائص پائے جاتے ہیں جو موصوف کی توجہ تام اور نظر ساہی کے مستحق ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے ملک پاکستان میں تارکین صلوۃ (بے نمازوں) کی اکثریت ہے' ان کے بارے میں ایوان صدر کی طرف سے کوئی تعزیری حکم نافذ نہیں ہوا حالانکہ "نظام مصطفیٰ" اور نظام خلفاء راشدین میں نماز کی اہمیت کے پیش نظر نماز کی پابندی کرنا کرانا داخل تھا' اس وقت بلکہ عہد قرون ثلاثہ میں کوئی شخص بھی بے نماز نہ تھا بلکہ منافقین بھی نمازی تھے کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد تھا : العهد الذي بيننا وبينهم الصلوة فمن تركها فقد كفر۔ رواه الامام احمد واهل السنن وقال الترمذي حديث صحيح اسناده على شرط مسلم (كتاب الصلوة ص۲۱ لابن القيم طبع جديد) یعنی "ہمارے اور کافروں کے درمیان حد فاصل نماز ہے' پس جو شخص نماز کا عمداً تارک ہوا اس کا شمار کافروں میں ہے۔" اور دن قیامت کے بھی یہی فیصلہ ہو گا کہ جن لوگوں نے نماز کی حفاظت نہ کی' كان يوم القيامة مع قارون وفرعون وهامان وابی بن خلف۔ "وہ قیامت کے دن مشہور کفار قارون' فرعون' ہامان' ابی بن خلف کے ساتھ ہوں گے۔"

پس جب بموجب فرمان مصطفیٰ ﷺ دنیا و آخرت میں بے نماز کفار میں داخل ہیں' مسلمانوں میں شمار نہیں ہیں تو پھر آج کل ان کو مسلمانوں میں شمار کر کے مسلمانوں کا سا برتاؤ اور سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟ ان پر شرعی حد اور تعزیر کیوں نافذ نہیں کی جاتی؟ مارشل لا ملک میں نافذ ہے' چوری' ڈکیتی' شراب نوشی' جوا بازی' زناکاری وغیرہ جرائم پر مجرموں کو سزائیں دی جا رہی ہیں' جس سے بہت اصلاح ملک میں ہو رہی ہے لیکن چوری' زناکاری'

وغیرہ گناہوں سے نماز کا چھوڑ دینا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ بہت سے ائمہ دین اور محدثین نے بے نمازوں کو کافر اور مشرک قرار دیا ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الصلوۃ میں بے نماز کو کافر مرتد ثابت کیا ہے اور اس کی سزا وہی لکھی ہے جو کافر مرتد کی سزا ہے' یعنی قتل۔

مشکوۃ کی شرح مرقاۃ (کتاب الصلوۃ جلد ا' ص ۳۸۷ طبع قدیم) میں ہے کہ "امام حماد بن زید' امام مکحول اور امام شافعی نے فرمایا کہ بے نماز مثل مرتد کے ہے اور امام زہری اور اصحاب الرائے نے کہا کہ بے نماز کو قید کیا جائے" اور میزان شعرانی میں لکھا ہے کہ جمہور اصحاب احمد نے کہا کہ مرتد کی طرح قتل کیا جائے اور اس پر سب احکام مرتد کے جاری کیے جائیں۔ اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے غنیۃ الطالبین میں لکھا ہے کہ پہلے اس سے توبہ طلب کی جائے' خالص توبہ نہ کرے تو اس کو تلوار سے قتل کیا جائے' وہ مثل کافر مرتد کے ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بے نماز کو قید کیا جائے' یہاں تک کہ وہ مر جائے یا نمازی بن جائے۔ شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے تو یہ بھی فرمایا کہ بے نماز کا نہ جنازہ پڑھا جائے' نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ بہرکیف سب اماموں کے نزدیک بے نماز قابل سزا ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب الصلوۃ کے صفحہ ۸ طبع جدید میں یہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اہل مکہ پر عتاب بن اسید عامل تھے' انہوں نے جمعہ کے خطبے میں اہل مکہ کو یہ خطاب کیا: یا اھل مکۃ واللہ لا یبلغنی ان احدا منکم تخلف عن الصلوۃ فی المسجد فی الجماعۃ الا ضربت عنقه وشکر له اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی ھذا الصنیع وزادہ رفعۃ فی اعینھم۔ یعنی "اے اہل مکہ سن لو! میں اللہ کی قسم! یہ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے تمہاری طرف سے یہ نہ پہنچے کہ اذان سننے کے بعد تم میں سے کوئی شخص جماعت میں شامل نہیں ہوا۔ یاد رکھو جو بھی پیچھے رہ گیا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اس وقت خطبہ میں حاضر تھے' انہوں نے یہ حکم سن کر عتاب بن اسید حاکم مکہ کا شکریہ ادا کیا اور ان کے نزدیک عتاب کا مرتبہ بلند ہوا۔"

یعنی کسی نے یہ تعزیری حکم سن کر انکار نہیں کیا بلکہ ان کی نظروں میں عتاب کا درجہ بہت بلند سمجھا گیا اور اس پر ان کا اجماع ہوا۔ یہ حکم تارک جماعت پر عائد کیا گیا تو بے نماز

تارک جماعت سے بھی بدترین ہے' اس کے لیے تعزیر اور سزا کیوں نہ ہو۔

کتاب الصلوۃ کے ص ۶ پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان منقول ہے کہ انھوں نے اپنی خلافت میں ملک عرب کے تمام اطراف میں اپنے ماتحت حکام کو یہ سرکلر جاری کیا کہ دین کے تمام امور میں نماز کی خاص اہمیت ہے۔ جس نے نماز کو ضائع کیا وہ باقی احکام اسلام کو زیادہ ضائع کرے گا' لہذا نماز کی حفاظت کرو اور کراؤ کیونکہ لاحظ في الاسلام لمن ترک الصلوۃ "جس شخص نے نماز ضائع کر دی' اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔"

پس بے نماز کے کافر ہونے پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ اس لیے صدر مملکت کا یہ فرض ہے کہ بے نمازوں پر سزا اور تعزیر مقرر کریں اور تمام ائمہ مساجد کے نام حکم نافذ کریں کہ وہ اپنے ماتحت نمازیوں کی حاضری لیا کریں' جو شخص حاضر نہ ہو' اس سے دریافت کیا جائے کہ وہ کیوں غیر حاضر ہوا۔ اگر وہ شرعی عذر پیش کرے تو اس سے درگذر کیا جائے اور جو عمداً کسی دنیاوی عذر سے حاضر نہ ہو تو اس کو سزا دی جائے۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی تمام مسجدیں یقیناً نمازیوں سے بھر جائیں گی اور ملک سے جرائم کم ہو جائیں گے کیونکہ قرآن پاک پارہ ۲۱ میں نماز کی یہ خاصیت بیان کی گئی ہے : ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ یعنی "بیشک نماز نمازی کو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔"

قید اور درے مار کر معاشرہ اور اخلاقی جرائم کی اصلاح کی جا رہی ہے' ذرا نمازی بنا کر بھی اصلاح کریں پھر ملاحظہ کر لیں کہ عام طور پر جو گناہ ہو رہے تھے' وہ نمازوں نے اپنی تاثیر سے روک دیئے۔ نماز روزہ کی خاصیت اور تاثیر اللہ تعالیٰ نے لعلکم تتقون بیان فرمائی کہ نماز روزہ کا تم کو اس لیے حکم دیا ہے کہ تم ان پر عمل کر کے پرہیزگار بن جاؤ۔ چنانچہ دربار نبوی میں ایک شخص کا یہ شکوہ کیا گیا کہ وہ چوری کرتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ نماز پڑھتا ہے تو دیکھ لینا نماز اس کو چوری کرنے سے روک دے گی۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲' ص ۴۱۵)

صدر صاحب نے ویسے تو سب سرکاری محکموں کے حکام کو نماز کی زبانی تاکید کر دی تھی جس سے چند ایام تک حکام اور ملازموں نے نمازیں پڑھ کر اپنے اپنے محکموں میں رونق پیدا کی لیکن بے نمازیوں پر تعزیر لگانے کا حکم نہ دیا تو حالت وہی پیدا ہو گئی کہ الآن کما کان۔ اگر تعزیر مقرر کر دی جاتی تو بے نمازوں کو عبرت حاصل ہو جاتی۔

کمترین کا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ بندہ راقم السطور ریاست فرید کوٹ میں ایک گاؤں موضع دیپ سنگھ والا میں جماعت غرباء اہلحدیث کا امام مقرر ہوا اور تمام جماعت کو احکام شرعیہ کی پابندی کا حکم دیا اور اعلان کرا دیا گیا کہ کوئی شخص نماز ترک نہ کرے' ورنہ سخت سزا دی جائے گی اور نہ جماعت میں کسی قسم کی تاخیر بغیر عذر کے کرے ورنہ درے لگیں گے اور نہ کوئی داڑھی منڈائے ورنہ سزا دی جائے گی۔ چنانچہ ایک درہ بنا کر رکھا گیا اور ایک حوالات تیار کر دی پس جب کوئی حکم کی خلاف ورزی کرتا تو اس کو مقررہ سزا دی جاتی۔ سب لوگ جماعت کے احکام شرعی کے پابند ہو گئے۔ کوئی نماز کا تارک اور جماعت کا تارک نہ رہا' نماز جماعت اور جمعہ کے لیے سب حاضر ہوتے۔ وہاں راجہ کی طرف سے سرکاری چوکی بھی مقرر تھی جس میں ایک حوالدار اور متعدد سپاہی تھے۔ وہ دوسرے محلہ میں رہتے تھے۔ اس طرف بے نماز وغیرہ بکثرت تھے اور وہ جماعت غرباء میں شامل نہ تھے۔ وہ سپاہی سب حیراں تھے کہ اس طرح تو ہمارے حکموں کی تعمیل نہیں' حوالات اور درے بنا رکھے ہیں' سب لوگ سزا پا کر راضی رہتے ہیں' کوئی ہمارے پاس آکر مولوی کی شکایت نہیں کرتا۔

الغرض جب حکومت اسلامیہ قائم ہو تو صدر اور حکام' خلیفہ سب کو حکم یہ ہے کہ احکام شرعیہ اور حدود شرعیہ نافذ کریں اور اپنی سیاست اور حکومت کے رعب سے لوگوں کو پابند کریں' پس صدر مملکت کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ملک میں نماز کی پابندی کرائیں۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور' جلد ۲۶' شمارہ ۲۳' ۲۴' مورخہ ۱۳ و ۲۱ صفر سنہ ۱۳۹۵ھ

بے نماز کے جنازہ کا فیصلہ

بروئے احادیث صحیحہ و اجماع صحابہ کرام بے نماز کافر و مشرک خارج از ملت اسلامیہ ہے لیکن علماء حنفیہ اور بعض علماء اہلحدیث بے نماز کو فاسق اور گنہگار مومن قرار دیتے ہیں۔ اس لیے جنازہ میں بھی یہ اختلاف ہے کہ جو علماء اہلحدیث بے نماز کو کافر و مشرک قرار دیتے ہیں' وہ بے نماز کا جنازہ نہیں پڑھتے اور جو علماء اہلحدیث اور علماء حنفیہ بے نماز کو مسلمان گنہگار کہتے ہیں' وہ اس کی نماز جنازہ پڑھنا اور بخشش کی دعاء اور شفاعت کرنا جائز جانتے ہیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانی حنفی کا فتویٰ رسالہ الہادی بابت ماہ محرم سنہ ۵۲ھ ص۔ ۳۴ میں یوں درج ہے کہ جو کتب فقہ کی عبارات لکھ کر فرماتے ہیں : "ان عبارات سے معلوم ہوا کہ تارک صلوٰۃ عمداً بشرطیکہ وہ نماز سے استہزاء نہ کرتا ہو' حنفیہ کے نزدیک کافر نہیں بلکہ فاسق ہے۔" رسالہ الہادی بابت جمادی الثانی سنہ ۵۲ھ میں یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ اگر کوئی کسی کو یہ کہے کہ نماز پڑھ' وہ کہے کہ لا اُصلی "میں نماز نہیں پڑھتا" تب بھی وہ کافر نہیں ہے' کیونکہ یہ کلمہ بھی محتمل ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اپنی آخری کتاب "بوادر النوادر" کے حصہ اول ص۔ ۱۵۵ میں کسی شخص کے وصیت نامہ کی تردید فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں : "اسی طرح اس میں لکھا ہے کہ تارک صلوٰۃ کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں' یہ حکم صاف حدیث کے خلاف ہے' صلوا علی کل بر وفاجر یہ بھی قرینہ ہے اس وصیت نامہ کے غلط ہونے کا۔"

رئیس الحنفیہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی مرحوم اپنے مجموعہ فتاویٰ کی جلد۔۱' ص۔ ۳۴۳ میں سوال وجواب درج فرماتے ہیں :

سوال : جس شخص نے عمر بھر نماز نہ پڑھی ہو' مرنے کے بعد اس کے جنازے کی نماز پڑھنے کی نسبت کیا حکم ہے؟

جواب : اس کا غسل اور اس کی نماز جنازہ وغیرہ سب مسلمانوں کی طرح ہونا چاہیے' کیونکہ حدیث میں ہے : صلوا علی کل بر وفاجر۔ "ہر نیک اور بد پر نماز پڑھو۔"

تمام علماء حنفیہ کا یہی فتویٰ ہے اور یہی کتب فقہ میں لکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ اور مسلک غلط بلکہ باطل ہے اور جس حدیث سے نماز جنازہ نیک وبد کا جائز ثابت کیا ہے' اس سے استدلال دو وجہ سے غلط ہے۔ اول یہ کہ یہ حدیث ضعیف ہے' دوم اس میں فاجر کا ذکر ہے' بے نماز تو کافر ومشرک ہے۔ سو وہ بموجب قرآن یہ ہے کہ نہ اس کا جنازہ پڑھا جائے' نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا مانگی جائے' کیونکہ اس نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اس نکتہ کو حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے باوجود مقلد حنفی ہونے کے خوب سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ آنجناب نے خطبہ جمعہ اور اپنے اخبار خدام الدین لاہور مطبوعہ ۲۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ "بے نماز کافر ہے" اور اس کا جنازہ جائز نہیں ہے۔ ان کے مضمون سے ایک دو اقتباس نقل کرتا ہوں۔

مولانا المحترم فرماتے ہیں : "حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر۔ یعنی "جس نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑا پس تحقیق وہ کافر ہو گیا" اس طرح جو روزہ جان بوجھ کر نہ رکھے' توفیق ہونے کے بعد نہ کرے' اگر مال ہو زکوٰۃ نہ دے تو وہ سب کافر ہیں' خواہ وہ کتنے ہی بڑے عالم کیوں نہ ہوں' اگر بی-اے' ایم-اے نماز نہیں پڑھتے تو وہ سب بے ایمان ہیں۔

پھر فرماتے ہیں سنو! میں کہا کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا نام ملاو سنگھ' گنگا رام رکھواؤ' نماز پنجگانہ ادا کرو' زکوٰۃ پائی پائی گن کے دو' حج فرض ہے تو کر کے آؤ' روزے رمضان کے تیسوں رکھو تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو (مگر خلاف شرع نام رکھنے اور ان کو نہ بدلنے کی وجہ سے گنہگار ہیں) اگر کوئی اپنا نام محمد الدین' عبداللہ خان' اللہ رکھا' محمد جان رکھوائے لیکن نماز ایک نہ پڑھنے پائے' حج فرض ہے تو نہ کر کے آئے' روزہ ایک نہ رکھے' زکوٰۃ باوجود واجب ہونے کے بالکل نہ دے' تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ هولا کافر حقا "کہ یہ پکا کافر ہے۔" (خدام الدین ص-۲' کالم-۱)

پھر ص-۲' کالم-۲ پر فرماتے ہیں' اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کسی نے ساری عمر نماز پڑھی ہو' روزہ ایک نہ رکھا ہو تو اگر ملا نماز جنازہ پڑھے گا بھی تو ہرگز نماز جنازہ قبول نہ ہو گی اور اس کے لیے مغفرت کریں گے تو قبول نہ ہو گی۔

میں کہتا ہوں کہ جب قبول نہ ہو گی تو پھر جنازہ کی نماز ایسے لوگوں کی جائز نہیں بلکہ لغو اور بے فائدہ ہے۔ چنانچہ مولانا المکرم' عبداللہ بن ابی کا واقعہ لکھ کر یہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی لیکن اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی۔ (خدام الدین لاہور مطبوعہ ۲۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء)

جناب محبوب سبحانی پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ "سستی سے نماز ترک کرنے والا کافر قابل قتل ہے' اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھی جائے اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔ پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر مذاہب اس بارہ میں ذکر کر کے اسی مسلک کی ترجیح کی ہے اور احادیث سے اس کو مدلل بیان کیا ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب حکیم امت حنفیہ نے "بوادر النوادر" حصہ دوم کے ص-۵۴۰ میں جو لکھا ہے' اس سے مولانا احمد علی صاحب کی تائید ہوتی ہے' آپ فرماتے ہیں ترک

صلوٰۃ اس زمانہ (نبوی) میں کفر ہی کی علامت تھی۔ پس اس کا حاصل کفر ہی ہوا' جیسے شد زنار کو فقہاء نے شعار کفر فرمایا ہے۔ اس سے تمام احکام کفر کے جاری کر دیئے جائیں گے اور اس زمانہ میں ترک صلوٰۃ کی علامت کفر ہونے کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے۔

پھر مولانا نے احادیث تکفیر بے نماز اور اجماع صحابہ کا قول نقل کیا ہے۔ اسی طرح "بہشتی زیور" میں بے نماز کا کفر ثابت کیا ہے' وھو الحق۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ' جلد۔ ۱۳' شمارہ۔ ۲' مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء

تارک نماز

واضح ہو کہ ایک شخص اہل علم سے مولانا ابو السعود نور احمد صاحب ہو گزرے ہیں' جنہوں نے ایک کتاب بنام "کوثر ابتلاء فی خمسۃ الخیار" تالیف کر کے شائع کی تھی۔ اس کے آخر میں ان کا یہ فتویٰ درج ہے' یہاں بمع سوال وجواب اس کو نقل کرتا ہوں۔ ناظرین اس کو غور سے ملاحظہ کریں۔

سوال : کیا فرماتے ہیں علمائے شریعت نبوی مقتدائے طریقت مصطفوی کہ جو لوگ عمداً نماز پانچ وقتی جو کتابا موقوتا کا شان رکھتی ہے' ادا نہیں کرتے اور کام دنیاوی میں شاغل رہتے ہیں' ان کو مشرک کہنا درست ہے یا نہ؟ بینوا توجروا۔

جواب : شرک ایک عظیم گناہ ہے کہ بلا توبہ بالکل معافی کے لائق نہیں ہے۔ یہ کتب اسلامیہ میں ہر جگہ موجود ہے۔ ہاں صاحب تحقیق کو جملہ کتب سے مستند کتاب قرآن مجید میں غور کرنا لازمی ہے' کیونکہ مولا پاک فرماتے ہیں : فان تنازعتم في شيء فردوه الى الله والرسول۔ جب قرآن مجید میں دیکھا جاتا ہے تو صریح حکم شرک کا ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ واقیموا الصلوة ولا تكونوا من المشركين۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ قائم کرنا نماز کا شرک ہے اور نبی پاک ﷺ نے فرمایا : الفرق بين المومن والكفر الصلوة دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے : ما كان للمشركين ان يعمروا مساجد الله یعمر کے معنی آبادی کے ہیں۔ چنانچہ کتب لغت میں معمورہ بمعنی آبادی کے ہوتے ہیں۔ آبادی مکان' میں اس طرح پر ہوتی ہے کہ اس میں صورت عملی کاربند ہو ورنہ بربادی اور بربادی مسجد بڑا ظلم ہے۔

چنانچہ اللہ پاک فرماتا ہے : ومن اظلم ممن منع مساجد اللّٰہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعٰی فی خرابھا۔ پس مسجد میں نماز نہ ادا کرنی گویا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بند کیا اور ذکر بھی ایسا کہ جس کو اللہ پاک نے اپنے لیے خاص کیا ہے اور فرمایا ہے : اقم الصلوۃ لذکری۔ شرک بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصیت کو اس سے چھوڑنا اور کسی اور سے پیوند کرنا' نماز نہ ادا کرنا گویا ذکر الٰہی کو اس سے دور کرنا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ نماز ادا نہ کرنا ظلم عظیم ہے جو کہ ان الشرک لظلم عظیم ہے اور ظالموں کی جگہ نار جہنم ہے۔ پس ضرور ہے کہ جملہ کافر مسلمان کلمہ گویان امام نبی آخر الزمان اس ظلم عظیم سے توبہ کر کے مساجد کی آبادی ادائے نماز پنجگانہ سے کریں۔ (نور احمد) (کوثر) ابتلاء فی خمسۃ انھار ص۔۵۷)

<u>فتویٰ پر تبصرہ:</u> مولانا نور احمد صاحب کا فتویٰ نفس مسئلہ کی رو سے توضیح ہے کہ تارک نماز مشرک ہے اور مسجد میں نمازیں پڑھنا اور اذان جماعت' جمعہ کی پابندی کرنا مسجد کی آبادی میں داخل ہے لیکن مفتی صاحب حنفی المذہب نے جو یہ روایت لکھی ہے : الفرق بین المومن والکفر ترک الصلوات۔ "کہ مومن اور کفر کے درمیان فرق نمازوں کا چھوڑنا ہے۔" یہ روایت ان لفظوں کے ساتھ کتب حدیث متداولہ میں پائی نہیں گئی۔ یہ حدیث ان لفظوں سے کتب حدیث میں پائی جاتی ہے : عن جابر بن عبداللّٰہ یقول سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلوۃ رواہ مسلم جلد۱' ص۔۶ وابوداؤد والترمذی وصححہ وابن ماجہ) یعنی "جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ فرق درمیان بندہ اور شرک اور کفر کے نماز چھوڑ دینا ہے۔" یعنی اگر بندہ نماز پڑھتا ہے تو مومن اور اگر نماز چھوڑ دی تو وہ مشرک اور کافر ہو گیا۔

امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں : ومعنی بینہ وبین الشرک ترک الصلوۃ ای الذی یمنع من کفرہ کونہ لم یترک الصلوۃ فاذا ترکھا لم یبق بینہ وبین الشرک حائل بل دخل فیہ۔ یعنی "معنی اس حدیث کا یہ ہے کہ بندہ اور شرک کے درمیان نماز کا ترک کرنا ہے یعنی کفر سے رکاوٹ نماز کا نہ چھوڑنا ہے۔ جب نماز چھوڑ دی تو درمیان کا پردہ اور رکاوٹ دور ہو گئی اور وہ شرک میں داخل ہو گیا۔"

میں کہتا ہوں یہ حدیث نبوی صریح دلیل ہے کہ بے نماز مشرک ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ کی حدیث میں اس کی صاف صراحت ہے : عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیس بین العبد والشرک الا ترک الصلوۃ فاذا ترکھا فقد اشرک۔ (رواہ ابن ماجہ باسناد صحیح) یعنی "نہیں ہے ملاپ درمیان بندہ کے اور شرک کے مگر ترک کرنا نماز کا۔ پس جب اس نے نماز چھوڑ دی تو وہ مشرک ہو گا۔"

اس حدیث کی دوسری حدیث صریح بھی موید ہے : عن ثوبان قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول بین العبد وبین الکفر والایمان الصلوۃ فاذا ترکھا فقد اشرک رواہ ھبۃ اللّٰہ الطبری باسناد صحیح۔ یعنی "حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ یہ فرماتے تھے کہ بندہ اور کفر اور ایمان کے درمیان نماز حد فارق ہے۔ جب نماز چھوڑ دی تو وہ مشرک ہو گیا۔ یہ تین احادیث اس آیت کی تفسیر ہیں کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے واقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین۔ یعنی "تم نماز کو قائم کرو اور مشرک نہ بنو۔" اس حدیث میں شرک اور کفر کے ساتھ ایمان کا ذکر ہے یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ نماز عین ایمان ہے' جب نماز چھوڑ دی تو اس نے ایمان کو چھوڑ دیا جس کی وجہ سے وہ مشرک ہو گیا۔

چنانچہ قرآن کریم کے دوسرے پارہ کے پہلے صفحہ پر ایک آیت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں : ما کان اللّٰہ لیضیع ایمانکم "کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس نماز کو ضائع نہیں کرے گا جو بیت المقدس کی طرف (قبلہ تبدیل ہونے سے پہلے) متوجہ ہو کر پڑھی گئی ہے۔" اس آیت میں باتفاق مفسرین ایمان کا اطلاق نماز پر وارد ہے کیونکہ یہ آیت بیت المقدس قبلہ کے تبدیل کر کے مسجد حرام قبلہ مقرر کرنے پر نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے خیال کیا کہ ہماری سابقہ نمازیں ضائع ہو گئیں' جب اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کو دفع کیا کہ وہ نمازیں ضائع نہیں ہوئیں بلکہ قبول ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں نماز کو ایمان فرمایا گیا ہے تو اس کے ترک سے ایمان کا ترک ہونا لازم آیا اور ایمان کا ترک بالاتفاق کفر وشرک ہے' لہٰذا تارک نماز کے کافر اور مشرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ بعض لوگ کلمہ گو بے نمازوں کو اپنا بھائی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ یہ خلاف قرآن وحدیث ہے۔

مجمع الزوائد جلد۔۳' ص۔۳۲ میں حدیث نبوی ہے' جس میں یہ الفاظ ہیں : فلان الحلام یخدمک فاذا صلی فھو اخوک۔ یعنی "غلام تمہاری خدمت کرتا ہے' جب وہ نماز پڑھے تو تمہارا دینی بھائی ہے۔" قرآن مجید اس حدیث کا موید ہے' چنانچہ قرآن ناطق ہے : فلان تابوا و اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین۔ "اگر کفر و شرک سے توبہ کر کے نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔" پس بے نماز کو دینی بھائی کہنا منع ہے' کیونکہ وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔

چنانچہ کتاب حکم النبی بکفر من لا یصلی کے ص۔۲۱ میں عبادہ بن‌اللہ کی یہ حدیث ہے' جس میں یہ الفاظ ہیں : لا تترکوا الصلوۃ عمدا فمن ترکھا عمدا متعمدا فقد خرج عن الملۃ۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم جان بوجھ کر نماز ترک نہ کرو' پس جس شخص نے نماز جان بوجھ کر ترک کر دی وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا۔" جب تارک نماز ملت اسلامیہ سے خارج ہوا تو اس کو اپنا دینی بھائی جاننا اور کہنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ بے نماز کے حق میں جیسے شرک کا اطلاق آیا ہے' ایسے ہی کفر کا اطلاق بھی آیا ہے۔

چنانچہ ترغیب و ترہیب کے ص۔۱۵۰ میں بریدہ بن‌اللہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : بکروا بالصلوۃ فی یوم الغیم فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ) "کہ ابر والے دن اول وقت نماز پڑھنے کی کوشش کرو' کیونکہ جس نے نماز چھوڑ دی' وہ کافر ہوا۔" پس جس شخص پر شرک و کفر کا اطلاق وارد نہ ہو' وہ حقیقی کافر ہوتا ہے' مجازی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو فرعون وغیرہ اکابر کے ساتھ دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عمرو بن‌اللہ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمیشہ نماز پڑھی اور اس کی حفاظت رکھی تو اس کے لیے یہ نماز قیامت کے دن روشنی بن جائے گی اور جس شخص نے نماز کی حفاظت نہ کی کہ بالکل نہ پڑھی یا کبھی پڑھی اور کبھی چھوڑ دی تو نہ اس کے لیے روشنی ہو گی اور نہ اس کے اسلام پر کوئی دلیل ہو گی اور نہ اس کی نجات ہو گی بلکہ وہ قارون اور فرعون اور ہامان اور ابی بن خلف اکابر کفار کے ساتھ معذب ہو گا۔

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوا کہ بے نماز بہت بڑے درجہ کا کافر ہے' جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اس کے اگر کوئی اعمال صالحہ کلمہ پڑھنا اور صدقہ خیرات وغیرہ ہیں تو وہ اس کفر کی وجہ سے برباد ہوئے۔ چنانچہ حدیث میں ہے : قال ابو الدرداء قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ترک الصلوۃ متعمدا فقد حبط عملہ۔ (رواہ احمد) یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی' اس کے اعمال صالحہ برباد ہوئے۔" اس حدیث سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ بے نماز کا کفر موجب حبط اعمال ہے جو حقیقی ہے' کیونکہ مجازی کفر سے اعمال حبط نہیں ہوتے۔ اس کا اسلام میں حصہ ہوتا ہے' بے نماز کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شہید ہوئے تو نماز کا ذکر سن کر یہ فرمایا : ولا حق فی الاسلام لمن ترک الصلوۃ فصلی وان جرحہ یصعب دما۔ یعنی "نماز کے تارک کا اسلام میں کوئی حق نہیں ہے' پھر خود نماز پڑھی' درحالیکہ ان کے جسم سے خون جاری رہا" (مجمع الزوائد ص-۲۹)

مجمع الزوائد جلد-۱' ص-۲۹۲ کی ایک مرفوع حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : لا سھم فی الاسلام لمن لا صلوۃ لہ ولا صلوۃ لمن لا وضوء لہ۔ "کہ جس شخص کے پاس نماز نہیں ہے اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے اور جس کا وضو نہیں ہے' اس کی نماز نہیں ہے۔" اس لیے جب کوئی شخص کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس کو سب سے پہلے نماز کی تعلیم دیتے تھے اور قیامت کو بھی اول حساب نماز کا ہو گا۔

رسالہ بے نماز کے ص-۲۰ میں حدیث ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ فرمایا نبی اکرم ﷺ نے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے بندہ سے نماز کا حساب لیا جائے گا پس اگر نماز درست ٹھیک ہوئی تو باقی اعمال بھی درست قرار دیئے جائیں گے اور اگر نماز خراب ہوئی تو باقی اعمال بھی فاسد اور خراب ٹھہرائے جائیں گے۔

علامہ امام ابن القیم رحمہ اللہ اپنی کتاب الصلوۃ میں یہ فرماتے ہیں : فقبول سائر الاعمال موقوف علی قبول الصلوۃ فاذا ردت ردت علیہ سائر الاعمال۔ یعنی "تمام اعمال کی قبولیت نماز پر موقوف ہے' اگر نماز رد کی گئی تو تمام اعمال رد کیے جائیں گے۔" پس نماز اور

کلمہ توحید کا یک ہی حکم ہے۔ جیسے توحید اور کلمہ طیبہ کا حساب ہو گا کہ جس سے وہ خالص موحد یا مشرک ظاہر ہو گا اور اسی کی بناء پر باقی اعمال صالحہ کا مقبول یا مردود ہونا ظاہر ہو گا یہی نماز کے حساب کا انجام ہو گا کہ نماز میں بھی عین توحید پائی جاتی ہے۔ جس نے نماز کو ترک کر دیا اس نے توحید الٰہی کو ترک کر دیا تو وہ مشرک ہوا۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے کہ بے نماز کافر ہے۔

ترمذی اور مستدرک حاکم میں عبداللہ بن شقیق عقیلی کا بیان ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے کہ بے نماز کافر ہے اور علامہ امام ابن قیم نے بہت سی آیات اور احادیث کو نقل کر کے بے نماز کو کافر ثابت کیا ہے اور اکابر صحابہ کرام حضرت عمرؓ عبدالرحمٰن بن عوف' معاذ' ابوہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے: ان من ترک صلوۃ فرض واحدۃ متعمدا حتی یخرج وقتھا فھو کافر مرتد قالوا ولا نعلم لھؤلاء مخالفا من الصحابۃ یعنی "صحابہ کرام (حضرت عمر اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنھما وغیرہ) یہ کہتے تھے کہ جس شخص نے ایک نماز فرض جان بوجھ کر چھوڑ دی' جہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا تو وہ کافر مرتد ہے اور علماء نے کہا کہ ہم کو ان صحابہ کرام کے خلاف کوئی صحابی ثابت نہیں ہوا۔" یعنی سب کا اتفاق ہے کہ بے نماز کافر ہے۔

اب اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد آئمہ کا اختلاف ہوا تو وہ قابل توجہ نہیں ہے' کیونکہ مولانا نور احمد صاحب نے آیت "فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول" پیش کی ہے کہ جب تمہارا کسی مسئلہ میں اختلاف اور جھگڑا ہو تو اس کو صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹا دو یعنی صرف قرآن وحدیث پر فیصلہ کرو۔

چنانچہ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اپنی اصولی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۱' ص ۸۸ میں یہ لکھا ہے: البرھان علی ان المراد لھذا الرد انما ھو الی القرآن والخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "آیت مذکورہ میں اللہ رسول کی طرف لوٹانے سے مراد قرآن وحدیث کی طرف لوٹانا ہے۔"

اور ص ۸۸ میں لکھتے ہیں: فلم یسع مسلما یقر بالتوحید ان یرجع عند التنازع الی غیر القران والخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "مسلمان کے لیے جو کلمہ توحید کا اقرار کرتا ہے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ تنازع اور اختلاف کے وقت

قرآن و حدیث کے علاوہ کسی غیر کی طرف رجوع کرے۔" اگر غیر کی طرف رجوع کرے گا تو وہ فاسق ہے اور اگر وہ غیر کی طرف رجوع کرنا جائز اور حلال سمجھے گا فهو کافر لا شک عندنا فی ذالک تو پھر وہ ہمارے نزدیک کافر ہے۔

بے نماز کے بارے میں ہم نے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کیا تو وہ کافر و مشرک ثابت ہوا۔ چنانچہ آیت واقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین اس پر ناطق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم نماز کو قائم کرو اور مشرک نہ ہو۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے' جو سورہ یونس میں ہے : وان اقم وجھک للدین حنیفا ولا تکونن من المشرکین۔ یعنی "دین حنیف کو قائم کرو اور مشرک نہ بن' پس جو شخص دین حنیف کو ترک کر دے گا وہ بالاتفاق مشرک ہے۔

تفسیر حسینی میں ہے کہ شیخ محمد بن اسلام طوسی نے فرمایا کہ میں نے چاہا کہ حدیث "من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر" کی موافقت قرآن سے کروں تو کئی سال غور کرنے کے بعد مجھے یہ آیت مذکور ملی کہ اس آیت اور حدیث کا مفہوم ایک ہی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث آیت مذکورہ کی تفسیر ہے اور اجماع صحابہ اس کا مؤید ہے اور پھر ایک حدیث صریح یوں وارد ہے جس کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابن حبان اور امام احمد اور امام حاکم نے بریدہ رضی اللہ عنہ سے اسانید صحیحہ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : العھد الذی بیننا وبینھم الصلوۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ یعنی "ہمارے اور منافقین کے درمیان نماز کا معاہدہ ہوا ہے' پس جس شخص نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔"

ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی جلد۔۳' ص۔۳۴۰ میں ہے : قال القاضی ضمیر الغائب یعنی فی قولہ بینھم للمنافقین۔ یعنی "قاضی عیاض نے فرمایا کہ بینھم میں ضمیر غائب منافقوں کی طرف لوٹتی ہے۔" فاذا ترکوا ذالک کانوا ھم والکفار سواء۔ یعنی "جب منافقوں نے نماز ترک کر دی تو وہ کفار برابر ہیں۔"

نیز یہ لکھا ہے : فاذا ترکوھا برئت منھم الذمۃ ودخلوا فی حکم الکفار نقاتلھم کما نقاتل من لا عھد لہ۔ یعنی "جب منافق لوگ نماز ترک کر دیں گے تو اللہ رسول کا ذمہ بری ہوا' پس ہم ان سے جنگ کریں گے کہ وہ حکم کفار میں داخل ہوئے۔" جیسے کفار کے ساتھ ہمارا جنگ ہوا' ان منافقوں کے ساتھ بھی اسی طرح جنگ ہوگا۔ اس عہد نامہ سے

صاف ثابت ہوا کہ تارک نماز کا کفر حقیقی ہے اور وہ کفار میں شمار ہے' جس کو قتل کر دینے کا حکم ہے اور ان بے نمازوں سے کسی مسلمان عورت کا نکاح کرنا حرام ہے کیونکہ اس پر حکم کفار کا ہے۔

نیل الاوطار جلد ۱' ص ۲۹۳ میں ہے : قد نقل جماعة الاجماع علی کفره کالمرتد وهو الظاهر۔ یعنی "علماء کی جماعت نے بے نماز کے کفر پر اجماع نقل کیا ہے کہ وہ مثل مرتد کے ہے۔"

ایک اور صحیح اور صریح حدیث وارد ہے جو مشکوٰۃ کے ص ۳۱۹ میں ہے کہ تم خلیفہ المسلمین کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچو اور بغاوت نہ کرو۔ الا ان تروا کفرا بواحا۔ "مگر یہ کہ تم انہیں کوئی کفر صریح دیکھو تو پھر ان کی اطاعت نہ کرو۔" دوسری حدیث اسی صفحہ پر یوں ہے : لا ما اقاموا فیکم الصلوة لا ما اقاموا فیکم الصلوة۔ تیسری حدیث میں ہے : افلا نقاتلهم قال لا ما صلوا لا ما صلوا۔ "کہ ان کے ساتھ مقابلہ نہ کرو جب تک کہ وہ نماز کو قائم رکھیں۔"

ان احادیث میں نماز ترک کرنے کو کفر بواح کے مساوی قرار دیا گیا ہے' لہٰذا بے نماز کافر خارج از اسلام ہے۔

تفسیر جامع البیان کے حاشیہ پر عقیدہ صابونیہ درج ہے۔ اس کے ص ۲۹۵ میں ہے :

ترک المسلم صلوة الفرض متعمدا فکفره بذلک احمد بن حنبل وجماعة من علماء السلف واخرجوه من الاسلام للخبر الصحیح بین العبد والشرک ترک الصلوة یعنی "مسلمان نماز چھوڑ دے تو اس کو امام احمد اور سلف کی ایک جماعت نے کافر کہا ہے اور اس کو اسلام سے خارج قرار دیا ہے اور ان کی دلیل یہ حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بندہ اور شرک کے درمیان حد فاصل نماز ہے وہ چھوڑ دی تو وہ کافر ہوا۔" یہی مسلک حق اور صحیح ہے۔ هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث' جلد ۵۸' شمارہ ۱۷' مورخہ یکم رمضان سنہ ۱۳۹۰ھ

تمہ

مسئلہ بے نماز پر جریدہ اہلحدیث سوہدرہ کا تعاقب

اخبار اہلحدیث سوہدرہ مطبوعہ یکم ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء کے ص۔۱۲ پر سوال وجواب درج ہیں۔ ان میں ایک سوال یہ ہے کہ بے نماز کو کھلم کھلا کافر کہہ لینا چاہیے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ اسے اپنی ذمہ داری پر کافر کہیں گے تو فساد بڑھے گا وہ آپ کو کافر بنائے گا۔ ویسے رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے: لا تکفرہ بذنب ولا تخرجه من الاسلام بعمل۔ "کسی گناہ کی وجہ سے کسی کو کافر نہ کہو اور نہ کسی ایک آدھ بد عملی کی وجہ سے کسی کو اسلام سے خارج کرو۔" اس لیے پرہیز احوط ہے' انتھی بلفظہ۔

یہ جواب آپ کا قرآن واحادیث صحیح واقوال صحابہ بلکہ اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتصریح اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کے سراسر خلاف ہے۔ آپ دلائل کی رو سے اس کی دوبارہ تحقیق کر کے اس مسلک کو بدلیں۔ پھر آپ کے جواب میں تعارض ہے کیونکہ آخر جواب میں یہ لکھا ہے کہ ویسے علیحدگی میں ہمدردانہ طور پر اسے سمجھاتے بجھاتے رہیں کہ عمداً نماز چھوڑنے والے کو حضور ﷺ کافر فرماتے ہیں۔ اس حصہ جواب نے پہلے حصہ جواب کو رد کر دیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ عمداً نماز چھوڑ دینے والا کافر ہے کیونکہ حضور ﷺ نے اس کو کافر فرما دیا ہے۔

جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ کسی گناہ کی وجہ سے کسی کو کافر نہ کہو تو پھر خود حضور ﷺ نے نماز چھوڑنے والے کو اس کے گناہ ترک نماز پر کافر کیوں فرما دیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ دو قسم ہیں۔ ایک وہ گناہ جو حد کفر تک پہنچے ہوئے ہیں اور شرع سے ان کا کفر ہونا ثابت ہے اور دوسرے وہ گناہ جو حد کفر تک نہیں پہنچے اور شارع نے ان پر کفر کا اطلاق نہیں کیا ہے۔ پس آپ کی پیش کردہ حدیث میں دوسری قسم کا گناہ مراد ہے۔ اگر ہر گناہ مراد ہو تو پھر آپ غیر اللہ کو سجدہ کرنے والے کو بھی کافر نہیں کہہ سکیں گے اور بت پرست کو بھی کافر نہیں کہہ سکیں گے یا شاید پھر آپ کا یہ مسلک ہو گا کہ کلمہ پڑھ کر پھر خواہ شرکیہ وکفریہ گناہ جس قدر کرے بالکل کافر ہوتا ہی نہیں ہے تو یہ عقیدہ مرجیہ کا ہو سکتا ہے' اہلحدیث کا نہیں اور آپ بفضلہ تعالیٰ اہلحدیث ہیں بلکہ لوگوں کو اہلحدیث بنانے والے ہیں۔ پھر یہ مان کر کہ آنحضور ﷺ نے بے نماز کو کافر کہا ہے پھر یہ کیوں فرماتے ہیں کہ گناہ کی

فیض الباری

علامہ محمد ابو الحسن سیالکوٹی

اردو ترجمہ

فتح الباری

ابن حجر العسقلانی

شرح صحیح بخاری

جلد ۱

تصدیر
محمد اسماعیل الخطیب

تقدیم
محمد اسماعیل اسد مدنی

بحسن اہتمام
عبدالطیف ربانی مدیر

مکتبہ اصحاب الحدیث
حافظ پلازہ مچھلی منڈی
نیو اردو بازار لاہور
042-37321823
0301-4227379

وجہ سے کسی کو کافر نہ کہو؟ یہ کلام میں صریح تضاد ہے' سنئے!

امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور امام ابن شیبہ نے اپنی تصنیف میں حضرت علی بڑٹنڈ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: من لم یصل فھو کافر۔ یعنی "بے نماز کافر ہے۔" یہ فتویٰ کفر کا علانیہ تھا یا علیحدگی میں خفیہ تھا' آپ ہی بتائیں؟ اور سنئے حافظ ابن عبدالبر نے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بڑٹنڈ نے فرمایا: من لم یصل فھو کافر۔ "کہ بے نماز کافر ہے"

اور سنئے محلی ابن حزم جزء دوم' ص۔۲۴۰ میں ہے: قیل لعبد اللہ بن مسعود "الذین ھم علی صلوتھم دائمون' والذین ھم علی صلوتھم یحافظون" فقال ذالک علی مواقیتھا قالوا ما کنا نری ذالک الا علی ترکھا قال ترکھا ھو الکفر۔ یعنی "ابن مسعود بڑٹنڈ سے آیات مذکورہ کا مطلب دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا نمازوں کو پابندی کے ساتھ وقتوں پر پڑھنا مراد ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو حفاظت سے مراد یہ سمجھتے تھے کہ نمازیں ترک نہ کرو' حضرت ابن مسعود بڑٹنڈ نے فرمایا کہ نماز چھوڑ دینا تو کفر ہے۔"

نیز جلد۔۲ ص۔۲۴۱ میں عمر بن عبدالعزیز خلیفہ عادل رطیٹیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: سمعت اللہ تعالٰی ذکر اقواما فقال ﴿فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ﴾ فقال اضاعوا الصلوۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیاہ ولم تکن اضاعتھم ایاھا ان ترکوھا ولو ترکوھا لکانوا بترکھا کفارا ولکن اخروھا عن وقتھا۔ یعنی "میں نے اللہ تعالیٰ سے سنا ہے کہ قرآن میں ان اقوام کی مذمت ذکر کی ہے جو نمازوں کو ضائع کرتے ہیں۔ اس ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ نمازوں کو ان کے وقتوں سے تاخیر کر کے پڑھتے ہیں اور اس سے بالکل چھوڑ دینا مراد نہیں ہے کیونکہ چھوڑنے والے تو کفار بن جاتے ہیں۔"

امام ابن القیم رطیٹیہ کتاب الصلوۃ کے ص۔۳۶ میں فرماتے ہیں کہ: انه قد صح عن سعد بن ابی وقاص فی ھذہ الآیۃ انه قال لو ترکھا لکانوا کفارا ولکن ضیعوا وقتھا۔ یعنی "حضرت سعد بن ابی وقاص بڑٹنڈ نے اس آیت اضاعوا الصلوۃ میں فرمایا ہے کہ اضاعت سے مراد وقت سے تاخیر ہے کیونکہ بالکل نماز چھوڑنے والے کافر ہیں۔"

محلی ابن حزم جلد۔۲' ص۔۲۴۲ میں ہے: وقد جاء عن عمر ومعاذ وعبد الرحمٰن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی ھریرۃ وغیرھم من الصحابۃ رضی اللہ عنھم ان ترک

صلوۃ فرض واحدۃ متعمدا حتی یخرج وقتھا فھو کافر مرتد۔ یعنی "حضرت عمرؓ معاذؓ عبدالرحمن بن عوف' معاذ بن جبل' ابوہریرہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ مروی ہے کہ جو شخص ایک فرضی نماز عمداً ترک کردے جس کا وقت نکل گیا ہو تو وہ کافر مرتد ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ چنانچہ الزواجر لابن حجر مکی کے ص ۱۲۴ جلد ۱ میں ایوب سختیانی سے منقول ہے: قال ایوب ترک الصلوۃ کفر لا یختلف فیہ۔ یعنی "نماز چھوڑنا کفر ہے' جس میں صحابہ کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔" ترمذی میں ہے کہ عبداللہ بن شقیق عقیلی نے کہا: کان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ۔ یعنی "محمد ﷺ کے تمام اصحاب کسی عمل کے ترک کو کفر نہ جانتے تھے سوائے نماز کے۔"

کتاب الصلوۃ ابن القیم کے ص ۱۴۲ میں کفر بے نماز پر اجماع صحابہ یوں ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شہید ہوئے تو انہوں نے مجمع میں قبل از موت یہ اعلان کیا کہ لا اسلام لمن ترک الصلوۃ۔ دوسرا سیاق یہ ہے کہ لا حظ فی الاسلام لمن ترک الصلوۃ یعنی "بے نماز کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔" یہ صحابہ کے اجتماع میں حکم سنایا' جس پر کسی نے انکار نہیں کیا تو بے نماز کے کافر ہونے پر سب کا اتفاق ہوا۔ علاوہ اس کے احادیث میں بے نماز کو کافر و مشرک کہا گیا ہے۔

مسند احمد میں ہے: بین الرجل وبین الکفر ترک الصلوۃ۔ مسلم میں ہے: بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلوۃ۔ ابوداؤد' نسائی میں ہے: لیس بین العبد وبین الکفر الا ترک الصلوۃ۔ ترمذی میں ہے: بین الکفر والایمان ترک الصلوۃ۔ ابن ماجہ میں ہے: بین العبد وبین الکفر ترک الصلوۃ۔

ان سب احادیث کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اور اس کے ایمان اور کفر اور شرک کے درمیان نماز چھوڑ دینے کا پردہ حائل ہے۔ جب نماز چھوڑ دی تو کفر اور شرک میں پڑ کر کافر ہو جاوے گا۔ چنانچہ دیگر احادیث میں یہ صراحت ہے کہ: من ترکھا فقد کفر (الحاکم) طبرانی میں ہے: من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر جھارا۔ یعنی "جس نے نماز عمداً جان بوجھ کر چھوڑ دی' وہ کھلم کھلا کافر ہوا۔

یہ حدیث سائل کے سوال کا عین جواب ہے۔ دیگر روایت ابن ماجہ میں ہے: فاذا

ترکھا فقد اشرک۔ "جب نماز چھوڑ دی تو وہ مشرک ہوا۔" اور حدیث سند حسن کے ساتھ ہے : فھو باللہ کافر۔ (ابو یعلی) پھر یہ شرک و کفر ایسا ہے جو اسلام سے خارج کرنے والا ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں یہ صاف ہے : فمن ترکھا متعمدا فقد خرج من الملۃ۔ "جس نے نماز عمداً ترک کر دی وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا۔" اگر آسمان پر بادل ہوں تو آپ نے نماز سویرے پڑھنے کی تاکید کی اور اس کی وجہ یہ فرمائی : فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ (ابن حبان) "جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہے۔"

امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں یہ حدیث روایت کی ہے جو صحیح ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز کی حفاظت کی تو نماز اس کے لیے نور اور نجات اور دلیل نجات کی' دن قیامت کے ہو جائے گی اور جس نے نماز کی حفاظت نہ کی تو قارون' فرعون' ہامان' ابن ابی خلف کے ساتھ شامل ہو گا اور قیامت کو اس کے لیے نہ نور ہو گا اور نہ دلیل نجات کی ہو گی۔

اس دلیل سے ظاہر ہوا کہ بے نماز کا کفر و شرک دون کفر اور دون شرک نہیں بلکہ بڑا کفر اور بڑا شرک ہے جو بڑے کفار کے ساتھ شامل کرنے والا ہے تو جیسے فرعون' قارون وغیرہ کفار کو کافر علانیہ کہنا درست ہے' بے نماز کو کافر کہنا بھی درست ہے اور بے نماز سے کلمہ کا اعتبار نہیں کیونکہ کلمہ کنجی ہے جس کے دندانے نماز ہے۔ اگر نماز ترک کر دی تو دندانے ٹوٹ گئے' کنجی بیکار ہوئی۔ اس لیے حدیث میں نماز کو بھی کنجی قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ حدیث میں مفتاح الجنۃ الصلوۃ۔ (دارمی) یعنی "جنت کی کنجی نماز ہے۔"

پس ثابت ہوا کہ بے نماز کافر اور مشرک اور خارج از اسلام ہے' جس کے لیے جنت کا دروازہ نہ کھولا جائے گا اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

کتاب الصلوۃ لابن القیم اور الزواجر لابن حجر جلد ۱' ص ۱۴۳ میں ہے : قال محمد بن نصر سمعت اسحاق یقول صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تارک الصلوۃ کافر وکذالک کان رای اھل العلم من لدن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تارک الصلوۃ عمدا من غیر عذر حتی یذھب وقتھا کافر۔ یعنی "محمد بن نصر مروزی نے کہا کہ نبی کریم ﷺ سے یہ بات صحیح ہو چکی ہے کہ بے نماز کافر ہے اور اسی طرح تمام اہل علم کا

حنفیہ فتویٰ نبی کریم ﷺ کے عہد سے اب تک چلا آیا ہے کہ بے نماز جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کر دی کہ نماز کا وقت چلا گیا اور اس کو کوئی عذر شرعی نہ تھا' وہ کافر ہے۔"

حدیث میں ہے کہ جس نے نماز چھوڑ دی' اس کے اعمال برباد ہوئے اور ایک حدیث میں ہے کہ اول حساب نماز کا ہو گا۔ اگر نماز قبول ہوئی تو دیگر اعمال قبول کیے جائیں گے اور اگر نماز رد کر دی گئی تو تمام اعمال مردود ہو جائیں گے۔ اس سے خوب ظاہر ہے کہ بے نماز کا کفر حقیقی ہے۔

دیگر حدیث میں ہے کہ نماز کا تعلق دین سے ایسا ہے جیسا سر کا تعلق باقی جسم سے ہے۔ پس اگر سر اتار دیا جائے تو باقی جسم بیکار ہے۔ اس لیے یہ فرمایا کہ : لا دین لمن لا صلوۃ لہ۔ یعنی "بے نماز بے دین ہے' اس کا کوئی دین نہیں ہے۔" اتنے صریح دلائل کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ بے نماز کو کافر نہ کہو کہ گناہ کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا ٹھیک نہیں' بالکل غلط بلکہ احادیث کی تکذیب ہے۔

علامہ ابن القیم کتاب الصلوۃ میں فرماتے ہیں : فلا یسمي تارک الصلوۃ مسلما ولا مومنہ یعنی "بے نماز نہ مسلمان ہے اور نہ مومن ہے۔" تارک الصلوۃ کافر بنص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کہ بے نماز بتصریح رسول اللہ ﷺ کے کافر ہے۔"

پھر ص۔۱۵۳ میں فرماتے ہیں : ومن العجب ان یقع الشک في کفر من اصر علی ترکھا۔ یعنی "یہ عجیب بات ہے کہ ایسے بے نماز کے کفر میں شک واقع ہو جو دائمی بے نماز ہے۔" اگر نماز کی تلقین کی جائے تو وہ حجت بازی کرتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں : ومن لا یکفر تارک الصلوۃ یقول ھذا مومن مسلم یغسل ویصلی علیہ ویدفن في مقابر المسلمین وبعضھم یقول انہ مومن کامل الایمان ایمانہ کایمان جبرئیل ومیکائیل فلا یستحي من ھذا قولہ من انکارہ تکفیرہ من شھد بکفرہ الکتاب والسنۃ واتفاق الصحابۃ واللہ الموفق۔ یعنی "جو شخص بے نماز کو کافر نہیں کہتا بلکہ اس کو اپنا مسلمان بھائی جانتا ہے اور کہتا ہے کہ مرجائے تو اس کا جنازہ پڑھایا جائے اور غسل دیا جائے اور مسلمانوں کی قبروں میں دفن بھی کیا جائے بلکہ بعض نے یہ غلو کیا کہ یہ کہا' اس کا ایمان اور جبرئیل کا ایمان اور میکائیل کا ایمان بے نماز کے ایمان کے برابر ہے' (نعوذ باللہ منہ' یہ بے ادبی اور گستاخی کا کلام ہے) اس شخص نے حیا نہیں کیا' اس بے نماز کی تکفیر سے انکار کر دیا

جس کے کفر پر قرآن اور حدیث شاہد ہیں اور اس پر صحابہ کا اجماع بھی گواہ ہے۔"
مخفی نہ رہے کہ مفتی صاحب مدظلہ نے جس روایت مشکوٰۃ سے استدلال کیا ہے وہ ابوداؤد کی ہے جس کی سند میں یزید بن ابی شیبہ واقع ہے جس کو تقریب میں مجہول لکھا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے جو احادیث تکفیر کا اور اجماع صحابہ کا معارضہ نہیں کر سکتی۔ (مشکوٰۃ کی روایت صحیح ہو یا ضعیف یہ بے نماز والی روایت کی معارض ہو ہی نہیں سکتی' اس لیے کہ مشکوٰۃ کی روایت میں تکفیر بہ ذنب سے منع فرمایا ہے اور بے نماز کی روایت میں تکفیر بہ کفر ہے جو ترک صلوٰۃ کی وجہ سے ہے۔)
ایسی ضعیف روایتیں ہمارے پاس کئی ہیں جو بے نماز کو کافر بناتی ہیں۔ ایک یہ ہے:
تارک الصلوۃ کافر۔ (رواہ ابن حبان فی الضعفاء)
نیل الاوطار جلد۱' ص۔۲۹۳ میں ہے: فقد حکی جماعۃ الاجماع علی کفرہ کالمرتد وھو الظاھر۔ یعنی ایک جماعت اہل علم نے نقل کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ بے نماز مرتد کی طرح کافر ہے' ظاہر میں یہ بات ٹھیک ہے۔" نیز فرماتے ہیں: ان ھذہ المقالۃ اجمع علیھا الصحابۃ لان قولہ کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمع مضاف وھو من المشعرات یعنی "بے نماز کے کافر ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔" ترمذی کی روایت میں لفظ اصحاب صیغہ جمع کا ہے جو مضاف ہے' اس سے سب صحابہ مراد ہیں' جب تک کسی صحابی کا استثناء ثابت نہ ہو۔
امام شوکانی عالم ربانی نے اس مسئلہ تکفیر وعدم تکفیر پر بحث کرنے کے بعد آخری فیصلہ یہ کیا ہے کہ: ونقول من سماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافرا سمیناہ کافرا ولا نزید علی ھذا المقدار ولا نتاول بشیء منھا لعدم الملجاء الی ذالک۔ یعنی "ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بے نماز کو کافر قرار دیا ہے تو ہم بھی کافر کہتے ہیں اور اس سے زائد کوئی بات تاویل سے نہیں کہتے کہ اس سے کافروں کی مثل ہونا مراد ہے یا منکر نماز مراد ہے یا یہ زجر اور توبیخ کے لیے مبالغہ ہے۔" وغیر ذالک من التاویلات الفاسدۃ کیونکہ کوئی بھی ٹھیک نہیں ہے۔
موضع پاڑی علاقہ کرنال میں ایک بار علماء اہلحدیث اور علماء دیوبند احناف کا اس موضوع پر مناظرہ ہوا تھا کہ بے نماز مسلمان ہے یا کافر؟ اہلحدیث بے نماز کے کافر ہونے کے مدعی

تھے اور دیوبندی علماء بے نماز کو مسلمان گنہگار کہتے تھے۔ علماء اہلحدیث کی طرف سے حضرت مولانا حافظ عبدالستار صاحب محدث دہلوی مفسر قرآن مدظلہ العالی مناظر تھے اور علماء احناف کی طرف سے مولانا عبدالکریم صاحب گم تھلی مقرر ہوئے۔ شرط یہ مقرر تھی کہ بے نماز کو کتاب وسنت میں مسلمان قرار دیا گیا ہے یا کافر؟

اس شرط کے مطابق اہلحدیث نے تو کتاب وسنت اور اجماع صحابہ سے دلائل بینہ صریحہ پیش کر کے بے نماز کو کافر ومشرک ملت اسلامیہ سے خارج ثابت کر دیا جس کا اثر مجمع پر بہت کافی ہوا۔ حنفی مناظر بے نماز کو مسلمان ثابت نہ کر سکے' صرف عام ادلہ سے معارضہ کرتے رہے جو شرط کے خلاف تھا۔ آخر جب بہت تنگ آ گئے کہ نماز کو ترک کر کے کوئی مسلمان رہا ہے یا نہیں اور ایسا کوئی واقعہ عہد نبوی میں ہوا ہے یا نہیں۔ اگر تارک نماز ہو کر مسلمان رہا تو اس کا ثبوت چاہیے۔ پبلک نے بھی توجہ دلائی کہ ادھر سے تو صاف تارک نماز کے کافر ومشرک ہونے پر احادیث پیش ہو رہی ہیں اور تم صاف صریح ایک دلیل بھی پیش نہیں کرتے جس پر یہ ذکر ہو کہ جس نے نماز ترک کر دی وہ مومن اور مسلمان ہے یا کسی نے نماز ترک کر دی تو وہ مسلمان رہا؟ اس پر کوئی حکم نہیں لگایا۔ تب حنفی مناظر نے تنگ آ کر یہ دلیل پیش کر دی کہ حادثہ خندق میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ ؓ نے نماز ترک کر دی تھی (نماز ترک نہیں کی تھی بلکہ شدت جنگ کے باعث جمع کر کے پڑھی تھی) پھر بھی آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ مسلمان رہے۔ اگر نماز کا تارک کافر اور مشرک ہے تو پھر اہلحدیثوں کو چاہیے کہ نبی کریم اور صحابہ کو کافر ومشرک کہیں۔ اس پر سب علماء اور مسلمانوں نے مناظر حنفی کو بہت ملامت کی کہ یہ کیا غضب کیا کہ آنحضور ﷺ اور صحابہ ؓ کو تارک نماز بنا دیا' حالانکہ نزاع اس بے نماز میں ہے جو عمداً ترک کرے اور دلیل پیش کی ہے سخت عذر اور مصیبت کے موقعہ کی کہ جب دشمنان اسلام نے نماز پڑھنے کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔ اگر یہ ترک نماز جرم ہے تو پھر حنفیہ کے نزدیک کافر نہیں تو آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ گنہگار تو قرار پاتے ہیں۔ اس پر حنفی مناظر بہت شرمندہ ہوئے کہ زمین نے گنجائش نہ دی ورنہ زمین میں دھنسنے کو تیار تھے۔

میں کہتا ہوں امام ابن حزم نے محلی جلد ۲' ص ۲۴۳ میں اس واقعہ خندق کی ترک نمازوں کو دلیل بنانے والے کے حق میں یہ فتویٰ دیا ہے: ھذا کفر مجرد ممن اجاز

ذالک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانهم مقرون بلا خلاف من احدهم ولا من احد من الامة فی ان من تعمد ترک صلوٰۃ فرض ذاکرا لها حتی یخرج وقتها فانه فاسق یجرح الشهادة مستحق للضرب والنکال ومن اوجب شیئا من النکال علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم او وصفه وقطع علیه بالفسق او بجرحه فی شهادة فهو کافر مشرک مرتد کالیهود والنصاریٰ حلال الدم والمال بلا خلاف من احد من المسلمین۔
یعنی یہ صاف کفر کا کلمہ ہے جو شخص یہ دلیل پیش کرتا ہے' وہ اس بات کا قائل تو ہے کہ بے نماز فاسق ہے' پس جو شخص آنحضور ﷺ کو فاسق اور مستحق سزا کہتا ہے وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کا کافر ہے جو اسلام سے مرتد ہوا۔ پس ایسے علماء کا یہی حال ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث جلد۔۴۲' شمارہ۔۱۹' ۲۰' مورخہ یکم و ۱۶ شوال سنہ۔۱۳۸۱ھ

تارکین نماز اور اُن کے دلائل مزعومہ

<u>دلائل مزعومہ پر تبصرہ:</u> اصل موضوع بحث بڑا کا یہ ہے کہ بے نماز اور قصداً تارک الصلوٰۃ مومن ہے یا مشرک اور مسلمان ہے یا کافر۔ یہ نزاع خاص بے نماز کے متعلق ہے اس کو دعویٰ خاص کہتے ہیں' تو بروئے فن مناظرہ اصولاً دعویٰ خاص پر دلیل خاص جو دعویٰ پر صریح ناطق ہو پیش کرنا لازم ہے۔ دلائل شرعیہ متفق علیہا تین ہیں۔ قرآن' حدیث اور اجماع صحابہ کرام۔ چنانچہ بندہ عارف حصاری نے ہر سہ قسم دلائل شرعیہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بے نماز مشرک اور کافر اور خارج از اسلام ہے' جس کی تفصیل گزشتہ مضامین میں ہو چکی ہے۔ اس کے معارضہ میں غیر مکفرین وغیرہ علما جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ عام ہیں' ان میں بے نماز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ معارضہ اصول مناظرہ کے سراسر خلاف ہے' کیونکہ دعویٰ خاص ہے اور دلائل عام۔ پس تقریب تام نہیں ہے اس لئے اس بحث میں ان دلائل کا اصولی' اجمالی' تفصیلی جواب عرض کیا جاتا ہے۔ ناظرین اہل علم اس بحث کو غور و فکر سے پڑھیں اور پھر جانبداری و عصبیت سے دور ہو کر انصاف فرمائیں کہ فریقین میں سے کون حق پر ہے' کیونکہ نزاع اور اختلاف کے وقت حق ایک جانب ہوتا ہے' ہر دو متضاد دعوے حق نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قرآن ناطق ہے: فماذا بعد الحق الا الضلال کہ حق کے خلاف

گمراہی ہے۔

اصولی جواب: دلائل پر تبصرہ کرنے سے پہلے وہ قاعدے ذکر کیے جاتے ہیں' جو اہل علم میں مسلم ہیں اور ان کا ذکر جناب مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی نے اپنی مستند کتب مستطاب شہادۃ القرآن کے حصہ دوم ص۔۴ میں کیا ہے' فرماتے ہیں۔

قاعدہ اولیٰ: پہلا قاعدہ یہ ہے کہ ایک امر صراحت کے ساتھ منطوق عبارت میں سے بطور اشارہ یا دلالت استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ مقابلے کے وقت منطوق کا اعتبار مفہوم پر مقدم ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ منطوق تو وہ ہے کہ جس کے معنی اور حکم اور حال پر الفاظ صاف صریح ناطق ہوں اور مفہوم وہ ہے کہ اس کے معنی اور حکم پر الفاظ صاف ناطق نہ ہوں۔ اشارہ اور تلویح کی جہت سے معنی اور مطلب سمجھا جائے۔ پھر اگر منطوق میں لفظ بالمطابقہ دلالت کرے تو وہ نص ہے ورنہ اس کو ظاہر کہا جائے گا اور صریح حکم' غیر صریح پر مقدم ہے' کیونکہ دلالت منطوق کی قطعی ہوتی ہے اور دلالت مفہوم کی ظنی ہوتی ہے۔

قاعدہ ثانیہ: دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ کوئی امر کسی خاص دلیل سے ثابت ہو تو اس کے خلاف عام دلیل سے تمسک کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ دونوں قاعدے نہایت معقول ہیں اور علم اصول کی کتابوں میں ان کی تصریح موجود ہے۔ (حصہ شہادت القرآن ص۔۴)

پس ان دونوں قاعدوں کی رو سے ہمارے دلائل صریحہ ان دلائل پر مقدم ہیں جو غیر مکفرین پیش کرتے ہیں' کیونکہ ہمارے دلائل سے صاف طور پر ثابت ہے کہ بے نماز کافر ہے' جو فرعون وغیرہ کا ساتھی ہے اور غیر مکفرین کے دلائل عام ہیں۔ تو عام کی بنا خاص پر رکھی جائے گی کہ بے نماز کو ان دلائل عامہ سے خاص کیا جائے گا۔ یعنی جو کلمہ گو نماز عمداً ترک کر دے گا وہ کافر سمجھا جائے گا اور غیر مکفرین کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہمارے دلائل خاصہ کے مقابلہ میں دلائل عامہ پیش کریں۔

ارشاد الفحول کے ص۔۱۴۳ میں علامہ شوکانی فرماتے ہیں: فالذی علیہ الاکثرون وغیرھم ان الخاص مخصص للعام۔ یعنی "اکثر علما کا یہ مسلک ہے کہ خاص عام کا مخصص ہے۔" مثلاً حنفیہ عام دلائل پیش کرتے ہیں کہ امام کی قرأت مقتدی کو کافی ہے اور امام جب قرأت کرے تو مقتدی خاموش رہے اور اہل حدیث دلائل سے یہ ثابت کرتے ہیں

کہ مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنا لازم ہے' کیونکہ فاتحہ کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی۔ تو یہ دلائل خاصہ حنفیہ کے دلائل عامہ پر مقدم ہیں۔ اس لئے فاتحہ امام کے پیچھے پڑھی جائے گی اور فاتحہ کو عام قراۃ سے مخصوص کر لیا جائے گا۔ چنانچہ انہاء السکن کے ص۔۷۰ میں علامہ ظفر احمد عثانی رکن جماعت دیوبند لکھتے ہیں : العام والعمل به فیما وراء الخاص الخ۔ یعنی "عام اور خاص میں تعارض ہو تو خاص سے عام کی تخصیص کی جائے گی اور عام پر ماوراء خاص عمل کیا جائے گا" علامہ شوکانی ارشاد الفحول کے ص۔۱۴۳ میں ارشاد فرماتے ہیں : وقد تقرران الخاص اقوی دلالۃ من العام والاقوی ارجح۔ یعنی "یہ اصول مقرر ہو چکا ہے کہ خاص دلیل کی دلالت عام دلیل کے مقابلہ میں بہت قوی ہے۔ اور زیادہ قوی' راجح ہے قوی پر۔" پھر لکھتے ہیں : اجراء العام علی عمومه اهمال للخاص واعمال الخاص لا یوجب اهمال العام۔ یعنی "اگر عام کو اس کے عموم پر رکھا جائے تو اس سے دلیل خاص بیکار ہو جائے گی اور اگر خاص پر عمل کیا جائے تو عام بیکار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باقی افراد میں جاری رہتا ہے۔"

اسی طرح دلائل تکفیر بے نماز کے کفر پر صریح الفاظ ناطق ہیں اور دلائل غیر مکفرین کے اشارہ اور دلالت کے طور پر استدلال میں پیش کیے جاتے ہیں' تو منطوق یعنی دلائل صریحہ مفہوم دلائل غیر صریحہ پر مقدم ہیں۔ مثلاً ہم نے صریح دلائل پیش کیے کہ اعمال صالح ایمان کی حقیقت میں داخل ہے اور غیر مکفرین نے امنو وعملوا الصلحات آیت پیش کی جس سے یہ مفہوم ہوا کہ عمل صالح ایمان سے مغائر ہے' تو ہمارے دلائل منطوق اس مفہوم پر مقدم ہیں کہ مغائرت لفظی اور معمولی فرق معنوی سے بھی ایک لفظ کا دوسرے لفظ پر عطف آجاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے : وکرہ علیکم الکفر والفسوق والعصیان۔ پس ہر کفر فسوق ہے اور ہر فسوق عصیان ہے۔ کما لا یخفی علی اهل علم۔ تو یہ دلیل شرعی نہیں ہے وجدانی اور مفہومی ہے۔

دیگر یہ کہ فتاوی نذیریہ ج۔۲' ص۔۳۲۱ میں ہے : قال الحافظ فی فتح الباری ان حکم شیئ الخاص لم یذکر فیه نص داخل تحت حکم دلیل اخر بطریق العموم۔ یعنی "حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں یہ لکھا ہے کہ اس خاص شے کا حکم جس کے بارہ میں کوئی نص وارد نہ ہو عام دلیل کے تحت داخل ہوتا ہے۔" اس اصول سے ظاہر ہوا کہ جس

خاص شے کے بارہ میں نص وارد ہو گئی ہو تو اس کو عام دلیل کے تحت داخل کر کے مومن مسلمان کہنا جائز نہیں ہے۔ تفسیر کبیر رازی میں ہے: الخاص مقدم علی العام۔ "کہ خاص عام پر مقدم ہے۔" (ص-۳۹۵)

اجمالی جوابات: (۱) احادیث شہادت توحید و کلمہ طیبہ مقید ہیں ساتھ دیگر احادیث متعلقہ فرائض واجتناب کبائر کے۔

(۲) خود کلمہ طیبہ میں ہی بجا آوری احکام الٰہی داخل ہے اور ایمان بالرسول میں اطاعت رسول داخل ہے۔ اس لیے حدیث میں ارشاد ہے: لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ (مشکوٰۃ وغیرہ) یعنی "کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش اس کی شریعت کے طابع نہ ہو جس کو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔" اسی ایمان بالکتاب سے مراد احکام قرآن پر عمل کرنا ہے۔ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالقرآن' ایمان بالرسول اس تصدیق جازم کا نام ہے جس میں انقیاد ہو۔ پس جو شخص کہتا ہے کہ اللہ' رسول' قرآن پر ایمان کا مطلب صرف تصدیق ہے' انقیاد نہیں وہ کافر ہے۔ کما ھو الظاھر۔

(۳) جن صحابہ رضی اللہ عنہم سے احادیث کلمہ طیبہ وغیرہ مروی ہیں' وہی صحابہ بے نماز کو کافر کہتے ہیں۔ جس سے ثابت ہے کہ اقرار توحید میں عبادت اور اقرار رسالت میں اطاعت داخل ہے۔

(۴) احادیث عامہ متعلقہ شہادت وکلمہ طیبہ وغیرہ محمول ہیں اور ان صورتوں پر' توبہ وندم پر' ان لوگوں پر جن کو فرائض ادا کرنے کا وقت نہ ملا' یا ان لوگوں پر کہ ان کو سوائے کلمہ کے احکام شریعت سے آگاہی نہ ہوئی' یا ان پر جو ہوش وعقل نہیں رکھتے جیسے نابالغ اور مجنون وغیرہ یا ان لوگوں پر جو کلمہ پڑھتے ہی فوت ہو گئے' یا ان موحدین پر جو بوجہ اندراس شرائع واحکام سے بے خبر رہے۔

چنانچہ ایک حدیث سے جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس سے بھی ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مٹ جائے گا اسلام' جیسے پرانے کپڑے کا نشان مٹ جاتا ہے ایسی حالت ہو جائے گی کہ نہ جانا جائے گا کہ کیا ہے روزہ' کیا ہے نماز اور زکوٰۃ اور حج' چلی جائے گی اللہ کی کتاب ایک رات میں' ایک آیت بھی باقی نہ رہے گی اور باقی رہیں گے لوگ

ان میں سے بہت بوڑھا مرد اور بڑھیا عورت کہیں گے کہ ہمیں اور کچھ خبر نہیں ہم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو اس کلمہ پر پایا کہ وہ کہتے تھے لا الہ الا اللہ پس ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت حذیفہ بڑاٹھ کے شاگرد نے کہا کیا کفایت کرے گا ان کو لا الہ الا اللہ حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ نماز کیا ہے' اسی طرح روزہ' حج اور زکوۃ۔ پس حضرت حذیفہ بڑاٹھ نے کچھ جواب نہ دیا پھر بار بار مکرر سوال کرنے پر فرمایا کہ اے صلہ! خلاصی دے گا ان کو دوزخ کی آگ سے یہ کلمہ' تین بار ایسا ہی کہا۔ (رواہ ابن ماجہ باسناد حسن)

(۵) یہ احادیث محمول ہیں ان لوگوں پر جن کے پاس اعمال صالح تھے' لیکن بوجہ غلبہ عصیان طالبان حقوق کے بدلہ دینے پر ان کے سوائے توحید کے کوئی نیکی نہ رہی بلکہ لوگوں کے گناہوں کو لے کے جہنم کو گئے لیکن کافر' مشرک نہ تھے آخر نجات پا گئے۔

(۶) احادیث عامہ محتملہ ہیں اور آیات تکفیر صریحہ ہیں اس لئے وہ مقدم ہیں۔

(۷) کلمہ کی فضیلت والی روایتیں قبل از نزول فرائض کی ہیں۔

(۸) خاص عام کا بیان ہوتا ہے' اس لئے ان کو خاص احادیث کے ساتھ تخصیص کرنی لازم ہے۔ یہ توضیحات کتاب الصلوۃ ابن قیم' جامع العلوم والحکم ابن رجب' ترغیب منذری' زواجر للہیثمی وکتب شروح احادیث وتفاسیر سے ماخوذ ہیں جن کی بنا پر عام اور خاص میں مطابقت ہو سکتی ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے: من انفق زوجین فی سبیل اللہ دخل الجنۃ یعنی "جس شخص نے جوڑا کسی چیز کا راہ خدا میں دیا وہ جنت میں داخل ہوگا"

اب اس حدیث کے لفظ "من" حروف عامہ سے ہے جو من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ میں آیا ہے تو اس عموم میں ہنود' یہود' عیسائی' مرزائی' مسلمان سب داخل ہیں۔ مگر یہ عام دوسری حدیث خاص سے مخصوص ہے اور وہ یہ ہے: لا یدخل الجنۃ الا نفس مسلمۃ۔ یعنی "مسلمان کے بغیر کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا" اور آیت احادیث سے یہ ثابت ہے کہ کافروں کے اعمال حبط ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ "جس شخص نے ایمان کے ساتھ کفر کیا اس کے عمل بیکار ہو گئے" اور حدیث میں ہے: من ترک صلوۃ العصر فقد حبطہ عملہ "جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے عمل برباد ہو گئے" پس دونوں یکساں کافر ہیں۔

اگر سخاوت میں کسی چیز کا جوڑا فی سبیل اللہ دیں گے تو جنت میں نہ جائیں گے بے نماز

پر تو اللہ تعالیٰ سخت غضبناک ہو گا وہ جنت میں کیسے جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی اور پتلی آنکھوں کی صحیح وسالم تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا آپ چند روز کے لئے نماز ترک کر دیں ہم آپ کا علاج (آپریشن وغیرہ سے) کرتے ہیں' اس میں سجدہ کرنے سے علاج بگڑ جاتا ہے۔ تب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا نماز تو میں کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا' آنکھیں درست ہوں یا نہ ہوں۔ کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: من ترک الصلوۃ لقی اللّٰہ وھو علیہ غضبان۔ (رواہ البزاز والطبرانی) یعنی "جس شخص نے نماز ترک کر دی تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہو گا" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان باللہ صحیح تھا کہ عذر کی وجہ سے بھی نماز ترک نہ کی کہ اللہ ناراض نہ ہو اور ایمان بالآخرۃ تھا کہ آخرت کے حساب سے ڈر گئے۔ لیکن بے نمازیوں کے حامی ایسے کہتے ہیں کہ صرف دل اور زبان سے اللہ اور آخرت کو مان لو' یہ کافی ہے۔

تفصیلی جوابات

مناقشہ: حامیان بے نماز' نمبر اول میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جو شخص شہادت دے کہ اللہ وحدہ لا شریک کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اور عیسیٰ بھی اس کے بندے اور اس کی طرف سے ایک نشان ہیں' جسے مریم میں ڈالا گیا اور جنت اور دوزخ حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے بالآخر جنت میں داخل کر دے گا خواہ اس کے عمل جیسے بھی ہوں۔ اس دلیل پر غیر مکفرین نے خودی منع وارد کر دیا کہ اس میں قیامت کا ذکر نہیں۔ اس لئے یہ جزئیات ایمان کا مکمل اور جامع بیان کرتی ہے۔
پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ جنت اور دوزخ پر ایمان دراصل قیامت پر ایمان کے مترادف ہے۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان قرآن پر ایمان کو متضمن ہے اور اللہ پر ایمان فرشتوں نیز تقدیر پر ایمان کو متضمن ہے۔ ٹھیک یہی جواب ہماری طرف سے سمجھ لیں کہ نماز وغیرہ عبادت ایمان باللہ اور اللہ کو معبود جاننے کے ضمن میں آگئی ہے۔ پھر بے نماز کو' جو عبادت الٰہی نہیں کرتا جس کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ اس سے خارج ہو کر جنت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے؟

چنانچہ ہماری تصدیق میر سیالکوٹی مولانا ابراہیم صاحب یوں فرماتے ہیں اور ایک اشکال کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ' یہ سب امور شرعی ایمان باللہ میں داخل ہیں۔ جیسا کہ وفد عبدالقیس والی حدیث سے ظاہر ہے' جو صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو ایمان باللہ کی تشریح میں یہ سب امور اور دیگر کئی ایک دینی فرائض بھی بتلائے تھے۔

سوم یہ کہ ایمان بالآخرۃ کا علم اور اعمال صالحہ کی فہرست بغیر پیغمبر برحق کی زبان مبارک کے اور کتب الٰہیہ کے بیان کے معلوم نہیں ہو سکتی اور پیغمبر برحق کے پاس وحی الٰہی کا بنا ذریعہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ہے۔ پس ایمان بالآخرۃ اور ایمان صالحہ کے ضمن میں ایمان بالرسل اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب سب امور آجاتے ہیں۔ (تبصیر الرحمن تفسیر پارہ اول' ص۔ ۴۲)

اور تاریخ اہلحدیث کے ص۔ ۴۲ کے حاشیہ میں یہ فرماتے ہیں کہ تصدیق' اقرار و شہادت اور اعمال صالحہ ہر سہ پر خدا نے نجات کا وعدہ کیا ہے۔ پس ایمان کی شرعی ماہیت میں تینوں امر داخل ہیں۔ اس صورت میں سب دلائل جمع ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا میر سیالکوٹی نے ہمارے حق میں بہت اچھا فیصلہ کر دیا ہے۔ اچھا اب اس دلیل پر مناقشہ دیکھئے کہ اس دلیل کی رو سے قبر پرست فرقہ عریسہ اور مرزائی لاہوری' قادیانی اور منکرین حدیث چکڑالوی' پرویزی وغیرہ گمراہ فرقے جن کی اہلحدیث تکفیر کرتے ہیں' جنت کے مستحق ہو گئے۔ بے نماز کے حمائتیوں نے اہلحدیثوں کی علمی محنتوں پر پانی پھیر دیا کہ اب تک فرقہ اہلحدیث کو ناجیہ جان کر باقی گمراہ فرقوں کو جہنمی بتایا کرتے تھے۔ مگر بے نمازیوں کے حمائتیوں نے سب کو جنتی بنا دیا کہ اس حدیث کے بیان کردہ امور پر یقین رکھ کر تعزیہ پوجے یا قبر پر سجدہ کرے اور مرزا غلام احمد کو نبی مانے آخر وہ جنتی ہے۔

اگر بے نماز کے حامی یہ کہیں کہ ایسے لوگوں کا گمراہ ہونا تو دیگر دلائل سے ثابت ہے' ایسے فرقے مستثنیٰ ہیں تو یہی ہمارا جواب ہے کہ ایمان باللہ میں عبادت الٰہی اور ایمان بالقرآن سے ارکان اسلام کی ادائیگی اور ایمان بالرسل میں اطاعت رسول داخل ہے' صرف مان لینا مراد نہیں کہ انقیاد سب میں شامل ہے۔ جو شخص صرف مان لینا مراد لیتا ہے اور انقیاد کو ایمان سے خارج کرتا ہے وہ کافر ہے' کیونکہ وہ اصل مقصد سے منکر ہے۔ ایمان سے تصدیق جازم مستلزم انقیاد مراد ہے۔ جیسا کہ علما اور فقہاء محدثین نے اس کی تشریح کی ہوئی ہے۔

دوسری دلیل: بے نمازی کے حمایتی نے میری دلیل پیش کردہ آیت لیضیع ایمانکم پر جو خامہ فرسائی کی ہے' اس کا جواب میری طرف سے مع تصدیق سیالکوٹی سابقہ مضامین میں گزر چکا ہے۔ پس اس کی جرح مردود ہے اور سورہ انفال سے ان کی ہدایت کے لئے دیگر آیات بھی پیش کر دی ہیں جو کافی ہیں۔ اب ان کی دوسری دلیل پر توجہ کی جاتی ہے کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ جو بندہ لا الہ الا اللہ کہے اور اسی عقیدے پر مرے وہ بالآخر جنت میں جائے گا اگرچہ اس نے زنا اور چوری جیسے جرائم کا ارتکاب کیا ہو۔

اس دلیل کو اس حد تک تو ہم بھی مانتے ہیں کہ جو شخص کلمہ توحید اور صحیح ایمان شرعی رکھتا ہوا مرا وہ جرائم زنا وغیرہ کی سزا بھگت کر آخر جنت کو چلا جائے گا۔ اس لئے مثال میں ارکان اسلام کے ترک کو پیش نہیں کیا۔ دیگر کبائر زنا' سرقہ وغیرہ کو پیش کیا ہے' لیکن اس بات کے ہم قائل نہیں کہ کلمہ توحید پڑھا اور سابقہ کفر سے توبہ نہ کی اور وہ مر گیا اور اس نے ارکان اسلام کو ادا نہ کیا تھا' وہ جنتی ہو گیا۔ کیونکہ یہ دیگر نصوص کے خلاف ہے۔ پھر اس میں صرف لا الہ الا اللہ کا ذکر ہے' اگر اس نے یہ کہہ لیا اور محمد رسول اللہ ﷺ پر عقیدہ نہ رکھا اور نہ یہ کہا تو اس کا یہ نصف کلمہ پڑھنا مردود ہے۔ اسی طرح کسی مرزائی نے آخری وقت میں کلمہ پڑھا اور مرزا کی نبوت سے انکار کر کے اقرار سے توبہ کی تو وہ بھی کفر پر مرا' اس کے لئے جنت نہیں ہے۔ اسی طرح کسی ایسے شخص نے کلمہ پڑھا اور آنحضرت ﷺ کو خدا کے نور سے پیدا شدہ مجسم نور مانتا تھا اور اس نے اس عقیدہ سے توبہ نہ کی تو وہ بھی اس حدیث کا مصداق نہیں ورنہ دیگر دلائل کی تکذیب لازم آئے گی۔ ٹھیک بے نماز مشرک بھی اس حدیث کا مصداق نہیں جب تک ترک نماز سے خالص توبہ کر کے نماز پڑھنے کا اقرار نہ کرلے' اگر توبہ کر کے نماز پڑھنے کا اقرار کر لے پھر وہ کلمہ توحید و رسالت پڑھ کر مرے اور پھر کفر سے توبہ کرے تب وہ جنتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایسی محتمل اور مجمل دلیل کے ساتھ دیگر دلائل شرعیہ کو ملا کر مطلب لینا چاہئے کہ ایسی احادیث کے ساتھ سابقہ کفر سے توبہ کر کے کلمہ پڑھنا مراد ہے یا ایسا شخص مراد ہے جو اسلام کا مدعی کافر نہ تھا' بلکہ اسلام سے باہر کسی دوسرے دین ہنود' یہود' عیسائی وغیرہ کا قائل تھا۔ اس نے کلمہ توحید و رسالت پڑھ لیا' تو وہ ناجی ہو گیا کیونکہ کلمہ سے تمام ضروریات شرعیہ پر مجمل ایمان ہو گیا اور اعمال صالحہ کا اس کو وقت نہ ملا تو ایسے

شخص کو کلمہ مفید ہے۔

تیسری دلیل پر بحث: تیسری دلیل بھی اسی قسم کی ہے' جس میں بے نماز کا خاص ذکر نہیں ہے۔ یہ بھی عام ہے جو مرزائی' بریلوی' چکڑالوی' پرویزی' رافضی تعزیہ پرست وغیرہ مشرکین کو شامل ہے جب تک وہ اپنے سابقہ عقیدہ کفر سے علانیہ توبہ کر کے یہ کلمہ نہ پڑھیں تو صرف کلمہ سے ان کے ایمان کو تسلیم نہ کیا جائے گا۔ ورنہ دیگر دلائل کی تکذیب لازم آئے گی۔ میں بے نمازی کے حمائتیوں سے پوچھتا ہوں کہ اس حدیث میں صرف لا اله الا الله کا ذکر ہے' اب اگر محمد رسول اللہ نہ کہے اور وہ مذہب یہودی' عیسائی رکھتا ہو' تو کیا تم اس کا اسلام قبول کر لو گے اور اس کو جنتی قرار دو گے یا نہیں؟ اگر جنتی کہو گے تو تم نے رسالت سے ایمان کو خارج کر دیا' یہ کفر ہے۔ اگر نہیں کہو گے کہ جب تک پورا کلمہ پڑھ کر سابقہ کفر سے توبہ نہ کرے صرف لا الہ الا اللہ اس کے لئے مفید نہیں' تو یہی ہم کہتے ہیں کہ بے نماز سابقہ کفر سے توبہ کرے۔ جب تک پورا کلمہ نہ پڑھ لے گا تو جنتی نہیں ہو سکتا۔

اچھا بندہ حصاری یہ پوچھتا ہے کہ مرزائی' بریلوی' قبر پرست' رافضی تعزیہ پرست اپنی زندگی میں یہی کلمہ پڑھتا رہا اور وہ اپنے مذہب باطل اور عقیدہ فاسد پر قائم رہا' تو کیا یہ کلمہ اس کو مفید اور باعث نجات ہے یا نہیں؟ اگر باعث نجات ہے تو آپ کا مذہب اہل حق کے خلاف صاف گمراہی پر ہے۔ پھر آپ سے ایسے مسائل پر بحث ہی فضول ہے پھر جماعت اہلحدیث کو چاہئے کہ آپ کو صحیح عقائد کی تعلیم دے کر مسلمان کریں کہ آپ بالکل لا مذہب ہیں اور اگر آپ ان گمراہ فرقوں کو کفریہ اور شرکیہ عقائد کی وجہ سے مسلمان نہ سمجھتے ہوں تو پھر موت کے وقت شرکیہ عقائد سے توبہ کیے بغیر کلمہ پڑھنا مفید کیسے سمجھ لیا۔ چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی۔

اگر شرکیہ عقائد سے توبہ کرنے اور پھر کلمہ پڑھنے کو آپ باعث نجات کہیں تو پھر یہی عقیدہ بے نماز کافر کے متعلق بھی رکھ لیں کہ وہ سابقہ کفر سے توبہ کر کے کلمہ توحید پڑھتا ہوا مرا تو جنتی ہے' پس آپ کی دلیل ٹوٹ گئی۔

چوتھی دلیل پر بحث: بے نمازیوں کے حمایتی' بے نماز کافر کی نجات کے لئے چوتھی دلیل بہت عجیب پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ گنہگاروں کے جہنم میں جانے کے بعد بھی

ملائکہ ' انبیاء ' مومنین کی شفاعت وسفارش کا سلسلہ جاری رہے گا اور بالآخر اللہ جل شانہ ارشاد فرمائیں گے کہ اب ارحم الراحمین کا رحم ہی باقی ہے۔ سو جہنم سے اللہ کی رحمت کا ہاتھ ایسے لوگوں کو کھینچ نکالے گا جنہوں نے کوئی نیکی بھی نہیں کی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں : فیخرج منها اقواما لم یعملوا خیرا قط۔ اس پر چونکہ بے نمازیوں کے حامیوں کو بڑا فخر اور ناز ہے' اس لئے اس کے جوابات متعدد لکھے جاتے ہیں' تاکہ ان کا استدلال اس حدیث سے بیکار ہو جائے۔

جواب اول : اس دلیل پر سوال یہ ہے کہ جن کو ارحم الراحمین جہنم سے نکالے گا ان کو معرفت الٰہی حاصل ہو گی یا نہیں؟ اگر نہیں تو کفار اور مشرکین کا دوزخ سے نکلنا لازم آیا۔ یہ عقیدہ آپ کے خلاف ہے اور اگر معرفت الٰہی ان کو حاصل ہو گی تو یہ عمل القلب ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں امام بخاری نے لکھا ہے : ان المعرفة فعل القلب یعنی "اللہ کو پہچاننا اور یقین کرنا دل کا فعل ہے۔" پھر اس پر یہ آیت پیش کی ہے جس میں کسبت قلوبکم وارد ہے۔ جب اس عمل کا ہونا ضروری ہو گیا تو اس جملہ سے استدلال ساقط ہو گیا۔ لم یعملوا خیرا قط۔ کیونکہ دل کا عمل موجود ہے۔ امام بخاری نے اس قسم کے مولویوں کا رد کرنے کیلئے یوں باب منعقد کیا ہے۔ باب من قال ان الایمان هو العمل لقول اللہ تعالٰی تلک الجنة التی اورثتموها بما کنتم تعملون۔ یعنی "بلا شبہ ایمان عمل کا نام ہے' کیونکہ اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ اے میرے بندو! جس جنت کے تم وارث بنائے گئے ہو یہ تمہارے عمل کا بدلہ ہے۔" پھر امام بخاری فرماتے ہیں کہ وقال عدة من اهل العلم فی قوله تعالٰی فوربک لنسئلنهم اجمعین عما کانوا یعملون○ من قول لا الٰه الا اللہ وقال لمثل هذا فلیعمل العاملون۔ یعنی "کئی علماء نے اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اللہ تعالٰی نے جو یہ فرمایا ہے کہ تیرے رب کی قسم ہم ان سب سے حساب لیں گے کہ انہوں نے کیا عمل کیے تھے' اس سے مراد کلمہ لا الٰه الا اللہ کہنا ہے کہ اس کلمہ کی بابت باز پرس ہو گی۔ اس لئے یہ ارشاد ہے کہ چاہیے کہ عمل کریں عمل کرنے والے۔"

حضرت انس' ابن عمر رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ سے یہی تفسیر منقول ہے' فتح الباری وغیرہ ملاحظہ ہو۔ جب کلمہ پڑھنا اور دل میں اس کی معرفت رکھنا عمل میں داخل ہے اور دلیل پیش کردہ میں ان لوگوں کو نکالنے کا ذکر ہے' جنہوں نے کوئی

عمل خیر نہیں کیا تو اس سے ان لوگوں کا ناجی ہونا ثابت ہوا' جنہوں نے کلمہ بھی نہیں پڑھا اور دل میں اس کی معرفت بھی نہ رکھی تو یہ خود ان مولویوں کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے ایمان کے بعد کے الفاظ بڑھائے' مگر ان کے بڑھانے سے کیا فائدہ کہ دلیل اپنے عموم پر ہے تو سب کو شامل ہوگی' اگر کلمہ اور دیگر ضروریات ولائل ایمان سے اس کو خاص کرو گے تو پھر یہ عام مخصوص منہ البعض ہوگا تو پھر اس سے نمازی گنہگار بھی داخل ہو کر مراد ہو سکیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے فرائض الٰہی کے سوا کوئی عمل خیر تطوع نہ کیا ہوگا۔ فافہم وتدبر ولا تکن من المعاندین۔

<u>دوسرا جواب</u>: مشکوۃ میں حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ الایمان بضع وسبعون شعبة فافضلها قول لا اله الا الله وادناها اماطة الاذی عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان۔ (متفق علیه) یعنی "ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں' بڑی شاخ کلمہ لا اله الا الله کہنا ہے اور چھوٹی سی شاخ تکلیف کی چیز راستہ سے دور کرنا ہے اور حیا اور شرم کرنا بھی ایمان کی شاخ ہے۔"

امام بیہقی نے شعب الایمان کے نام سے کتاب لکھ کر اعمال کا ایمان میں داخل ہونا ثابت کیا ہے' تو اب ہم حامیان بے نمازیان سے سوال کرتے ہیں کہ اس حدیث کی رو سے اس قوم میں جن کو ارحم الرحمین نکالے گا اس ستر شاخوں میں سے کوئی ایک شاخ ہوگی یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں دو گے تو ایمان کو ستر شاخوں میں منحصر کرنا بیکار جاتا ہے اور بیکار کرنا نص کا ناجائز ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہے کہ ان شاخوں میں سے کوئی شاخ ضرور ہوگی' تو پھر ہر شاخ عمل خیر ہے۔ پھر اس حدیث سے کون سی قوم مراد ہے' جنہوں نے کوئی عمل خیر بھی نہ کیا' شاید یاجوج ماجوج کی قوم ہوگی کہ ان میں ان شاخوں میں سے کوئی شاخ بھی نہ ہوگی۔

اس بات کا جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو گی مبارک تمہیں

<u>تیسرا جواب</u>: ائمہ محدثین اور سلف صالحین کا یہ مذہب ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان اور عمل بالارکان کے مجموعہ کا نام ہے۔ جو شخص اعمال کو ایمان سے خارج رکھتا ہے وہ گمراہ ہے۔ چنانچہ کتاب السنۃ جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ رئیس اہل سنت کے

خلف الرشید حضرت عبداللہ رحمہ اللہ نے تالیف کی ہے' اس کے ص ـ ۱۰۳ میں ہے : وقال اصحاب الرای لیس الصلوة ولا الزکوة ولا شئی من الفرائض من الایمان افتراء علی اللہ وخلافا لکتابہ وسنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ولو کان القول کما یقولون لم یقاتل ابوبکر اھل الردۃ یعنی "فرقہ اہل رائی نے کہا ہے کہ نماز اور زکوۃ اور دیگر فرائض ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے افتراء باندھا ہے اور ان کا یہ عقیدہ اور قول خلاف کتاب وسنت ہے۔"

پھر لکھتے ہیں : وقال فضیل یقول اھل البدع الایمان الاقرار والایمان واحد وانما یتفاضل الناس بالاعمال ولا یتفاضلون بالایمان فمن قال ذالک فقد خالف الاثر ورد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قولہ لان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الایمان بضع وسبعون شعبۃ الحدیث و تفسیر من یقول الایمان لا یتفاضل ویقول فرائض اللہ لیس من الایمان فمیز۔ اھل البدع العمل من الایمان وقالوا ان فرائض اللہ لیس من الایمان۔ یعنی "امام فضیل امام اہل سنت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہل بدعت کا یہ قول ہے کہ ایمان اقرار کلمہ کا نام ہے اور ایمان سب کا ایک ہی ہے' وہ بڑھتا نہیں ہے۔ لوگ اعمال میں ایک دوسرے سے بڑھتے ہیں' جو شخص ایسی بات کہتا ہے وہ حدیث نبوی کے خلاف کہتا ہے اور اس نے فرمان نبوی کا رد کر دیا' جو آپ نے فرمایا ہے کہ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں اور اس نے فرمان نبوی کو بدل دیا' جب یہ کہا کہ ایمان بڑھتا نہیں ہے اور فرائض الٰہی ایمان میں داخل نہیں تو اہل بدعت نے عمل کو ایمان سے جدا کر دیا۔" (یہ گمراہی ہے)

اب بندہ حصاری بے نمازیوں کے حمائتیوں سے دریافت کرتا ہے کہ آپ سلف صالحین اور محدثین کرام کے گروہ میں داخل ہیں اور فرائض وغیرہ اعمال کو ایمان میں داخل سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں سمجھتے تو آپ اہل بدعت میں شمار ہیں۔ پھر اہلحدیث ہونے کا دعویٰ چھوڑ دیں اور اگر مولانا میر سیالکوٹی کی طرح اعمال کو ایمان کی ماہیت میں داخل سمجھتے ہیں' تو پھر آپ اور ہم آپ کی پیش کردہ دلیل کے جواب میں یکساں ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اس دلیل سے مراد وہ لوگ ہیں' جن کو کوئی مبلغ نہ پہنچا اور اسلام اور شرح محمدی کا کوئی علم نہ ہوا۔ چنانچہ دنیا پر طائرانہ نظر کرو تو ایسے ممالک اور جزائر پائے جائیں گے جن کو اسلام اور پیغمبر اسلام کی کچھ خبر نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے شرک نہ کیا اور وہ جاہلیت میں رہے' ہاں

وجہ کہ انہوں نے گھروں سے نکل کر علم دین کیوں نہ حاصل کیا؟ اور آخری نجات اس لئے کہ انہوں نے شرک نہ کیا اور وہ ایک حد تک معذور رہے یا وہ لوگ جاہلیت کے مراد ہو سکتے ہیں' جو رسالت محمدی سے قبل حالت فترۃ میں رہے اور مر گئے اور انہوں نے فطرت سے توحید پر عقیدہ رکھا اور شرک نہ کیا۔ بغیر ان صورتوں کے کسی دیگر صورت پر یہ حدیث محمول نہیں ہو سکتی۔ ہاں بعض علما نے کلمہ توحید پڑھنے والوں اور تصدیق بالقلب رکھنے والے گنہگاروں پر محمول کیا ہے' مگر اس صورت میں یہ حدیث دیگر دلائل قطعیہ کے معارض ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ ہم کو پسند نہیں ہے۔

چوتھا جواب: قرآن میں جنت کے متعلق یہ وارد ہے: اعدت للمتقین "کہ جنت متقین کے لئے تیار کی گئی ہے" اور دوزخ کے بارہ میں یہ وارد ہے: اعدت للکافرین "کہ دوزخ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔" بے نماز متقین میں داخل نہیں ہیں' کیونکہ متقین کی تعریف جس قدر قرآن میں آئی ہے ان میں نماز اور ایسی تصدیق جازم مستلزم بالانقیاد کا ذکر ہے' جس میں سے بے نماز شامل نہیں ہے۔ اور ایسی احادیث صحیحہ وارد ہیں' جن میں بے نماز کو کافر قرار دیا گیا ہے' تو پھر بے نماز کافر اس دلیل کا مدلول کس طرح بن سکتا ہے۔ اگر محض کلمہ زبان سے ہی کہہ لینا ہی کافی ہے اور وہ ارحم الرحمین کے قبضہ میں آجائے گا تو پھر منافقین سب اس دلیل کے مصداق ہو جائیں گے۔ حالانکہ قرآن خبر دے چکا ہے کہ وہ درک اسفل میں ہوں گے۔

پانچواں جواب: قرآن ناطق ہے کہ ان رحمة الله قريب من المحسنين۔ یعنی "تحقیق رحمت الٰہی احسان اور نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔" دیگر ارشاد ہے: ورحمتي وسعت كل شيئ فساكتبها للذين يتقون ويوتون الزكوة۔ (الآیۃ) "میری رحمت وسیع ہے' جس نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے' مگر عنقریب یہ ان لوگوں کے لئے لکھ دی جائے گی' جو متقی ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں" اور تبع رسول ہیں اور آیات الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان آیات سے جو قطعیہ ہیں' ثابت ہوتا ہے کہ بے نماز رحمت الٰہی کا مستحق نہیں ہے۔ ہاں نمازی گنہگار رحمت الٰہی کا مستحق ہے۔ تو پھر بے نماز جو کافر ہے ارحم الراحمین کے قبضہ میں کیسے آئے گا۔ حالانکہ قرآن وحدیث ناطق ہیں کہ کافروں پر جنت حرام ہے اور ان کو کوئی شفاعت نفع نہ دے گی اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اگر بے نماز جو

فرعون کا ساتھی ہے' آخری وقت کے کلمہ سے جہنم سے باہر آ جائے گا کہ آخری وقت اس نے بھی کلمہ کہہ لیا تھا۔ ابن العربی کا یہی مذہب ہے' جو ان کی کتاب فتوحات میں درج ہے۔

چھٹا جواب: حامیان بے نمازیان کی پیش کردہ روایت بخاری شریف میں ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: فیشفع النبیون والملائکۃ والمومنون فیقول الجبار بقیت شفاعتی فیقبض قبضۃ من النار فیخرج قوما الحدیث۔ "شفاعت کریں گے انبیاء اور فرشتے اور مومن اپنے اپنے درجہ پر' پھر کہے گا اللہ جبار کہ اب میری شفاعت باقی رہ گئی ہے۔ پھر ایک مٹھی بھر کر دوزخ سے ایسی قوم کو نکالے گا جو کوئلہ ہو گئے ہوں گے' تو ان کو نہر حیات میں ڈالا جائے گا۔" اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کی شفاعت اور اس کا شفیع ہونا اور شافع ہونا ثابت ہوا اور بے نماز کے متعلق قرآن ناطق ہے: فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین۝ یعنی بے نماز وغیرہ چار قسم کے لوگوں کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع نہ دے گی' تو بے نمازوں کو اللہ تعالیٰ مٹھی میں نہ لائے گا ورنہ یہ حدیث اس آیت کے معارض ہو جائے گی اور معارضہ قرآن وحدیث میں پیدا کرنا منع ہے۔

ساتواں جواب: تمام احادیث شفاعت پر غور کیا جائے' تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلمہ گو توحید والے اور نمازی گنہگار تمام کے تمام جملہ شافعین انبیاء اور ملائکہ اور مومنین وغیرہ کی شفاعت سے باہر نکالے جائیں گے۔ رائی برابر ایمان والا اور ذرہ بھر ایمان رکھنے والا' کلمہ گو' توحید والا دوزخ میں کوئی نہ رہے گا۔ صرف وہی باقی رہ جائیں گے جن پر دوزخ میں دخول واجب ہے۔ چنانچہ بعض احادیث کے الفاظ صریح وارد ہیں کہ آنحضرت ﷺ سب کو شفاعت کر کے دوزخ سے نکال لیں گے' پھر یہ فرمائیں گے: فاقول یا رب مابقی فی النار الا من حبسہ القرآن و وجب علیہ الخلود وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وکان فی قلبہ من الخیر ما یزن شعیرۃ ثم یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وکان فی قلبہ ما یزن من الخیر ذرۃ یعنی "میں شفاعت کراؤں گا تو دوزخ سے ایسے لوگ نکلیں گے' جنہوں نے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا اور ان کے دل میں جو برابر ایمان تھا پھر ایسے کلمہ گو کو دوزخ سے نکالوں گا' جن کے دلوں میں گیہوں کے دانے کے برابر نیکی ہو گی پھر ایسے لوگوں کو نکالوں گا جن کلمہ گو لوگوں کے دلوں میں ذرہ بھر نیکی ہو گی۔" دیگر روایتوں میں ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے کہوں گا کہ بس یا اللہ اب تو دوزخ میں وہی باقی رہ گئے ہیں' جن کو قرآن نے روک لیا ہے اور

ان پر دوزخ میں ہمیشہ رہنا واجب ہے۔
حامیان بے نمازیان یہ بتائیں کہ انبیاء' ملائکہ اور مومنین کی شفاعت کے بعد دوزخ میں کوئی کلمہ گو اور ذرہ بھر خیر دل میں رکھنے والا کوئی نہ رہا اور وہی رہے جن پر دخول واجب ہوا اور وہ کلمہ گو نہ تھے' کیونکہ ہر کلمہ گو تو آنحضور ﷺ کی شفاعت کا مستحق تھا' جس کو آنحضور ﷺ نے بار بار شفاعت کر کے دوزخ سے باہر نکل لیا اور کوئی کلمہ گو باقی نہ رہا تو پھر ارحم الراحمین کی مٹھی میں نکلنے والے کون ہیں؟ بعض نے کہا کہ وہ غیر مومنین اور جملہ مجرمین ہیں' خواہ وہ مشرکین ہوں یا کافرین کہ اللہ ارحم الرحمین تمام ایسے لوگوں کو بھی اپنی مٹھی سے باہر نکال دے گا' جنہوں نے کوئی عمل خیر نہیں کیا' کیونکہ وہ نہایت رحیم ہے۔ اپنے بندوں کو غیر محدود عذاب نہ کرے گا' ایک نہ ایک دن جہنم کو بالکل خالی کر دے گا۔
حدیث مذکورہ پر بخاری کے حاشیہ پر لکھا ہے :تمسک به بعضهم فی تجویز اخراج غیر المومنین من النار۔ یعنی "بعض نے اس حدیث سے دلیل لی ہے کہ غیر مومنین بھی دوزخ سے نکل لیے جائیں گے" بظاہر بات بھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ مومنین گنہگاروں کو تو دیگر شافعین نے بالکل نہ چھوڑا۔ آخر وہی رہے جن پر خلود واجب تھا' تو پھر ارحم الراحمین نے ان کو نکل کر جہنم خالی کر دیا۔ بے نمازیوں کے حمایتی مولوی صاحب نے یہ اچھی دلیل پیش کی ہے کہ ایک بے نماز کیا سب کافروں مشرکوں کو جہنم سے باہر نکال دیا اور ان کو خدا تعالیٰ کی مٹھی میں داخل کر کے جنتی بنا دیا اور جہنم کو صاف خالی کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مٹھی سے کوئی باہر نہیں رہ سکتا' وہ تمام جہنمیوں کو اٹھا لے گی اور جہنم خالی رہ جائے گی۔
چنانچہ زواجر ہندی کے ص۔۳۲ میں ایک ضعیف روایت نقل کی ہے کہ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس میں کوئی نہ رہے گا اور اس کے دروازے خالی پڑے آواز دیں گے پھر اس کا ضعف بیان کر کے علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں : نعم نقل غیر واحد هذه المقالة عن ابن مسعود وابی هريرة وقال ابن تيميه وهو قول عمر بن الخطاب وابن عباس وابن مسعود وابی هريرة وانس وذهب اليه الحسن البصری وحماد بن سلمة وبه قال علی بن ابی طلحة الوالبي وجماعة من المفسرين۔ یعنی "ہاں یہ بات ہے کہ اس مسلک کو بہت سے لوگوں نے نقل کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر ابن عباس' ابن مسعود' ابوہریرہ اور انس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حسن بصری اور حماد وغیرہ

تابعین سے نقل کیا ہے۔ اور ایک جماعت مفسرین کی' اس مسلک کی قائل ہے۔"

پھر فخرالدین رازی سے نقل کیا ہے : قال قوم ان عذاب الکفار منقطع وله نهاية واستدلوا بهذه الاية لابثين فيها احقابا وبان معصية الظلم متناهية فالعقاب عليها بما لا يتناهى ظلم۔ یعنی ایک قوم اہل علم نے یہ کہا ہے کہ کفار کا عذاب ایک دن' بعد مدت مدید کے ختم ہو جائے گا' اس کی انتہا ہے۔

یہ لوگ اس آیت سے دلیل لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق یہ فرمایا ہے :

خالدين فيها ما دامت السموٰت والارض الا ماشاء ربک ان ربک فعال لما يريد۔ یعنی "کفار جہنم میں ہمیشہ رہیں گے' جب تک آسمان اور زمین رہیں گے' مگر یہ کہ تیرا رب چاہے تو اس سے پہلے روک سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ارادے کو جس طرح چاہے پورا کرے۔"

اور اس آیت سے دلیل لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کفار کئی حقبے جہنم میں رہیں گے۔ یہ بھی ایک معین مدت پر دال ہے اور اس کی دلیل عقلی و قیاسی سے استدلال کرتے ہیں کہ گناہوں کی مدت محدود اور متناہی ہے' تو سزا بھی اس کی محدود اور متناہی ہونی چاہیے۔ متناہی جرائم پر غیر متناہی اور غیر محدود سزا ظلم اور شان الٰہی کے خلاف ہے' کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے۔

میں کہتا ہوں شیخ الاسلام ابن القیم نے اپنی کتاب مستطاب کتاب التقدیر میں اس مسئلہ پر بہت بحث کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کئی آثار مروی ہیں۔ طبرانی نے باسناد ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ دوزخ پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ وہ ایک سرخ پتے کی مانند ہو گا' کوئی شخص اس میں باقی نہ رہے گا اور اس کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ حرب نے اپنے مسائل میں کہا ہے کہ میں نے احمد نے اللہ عزوجل کے قول خالدين فيها ما دامت السموات والارض الا ماشاء ربک کا مطلب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ قرآن کریم کی تمام آیات وعید پر حاکم ہے اور اس سے سب کا مطلب معلوم ہو گیا کہ خلود ابدی مراد نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا استثناء موجود ہے یعنی اگر وہ چاہے گا تو اہل دوزخ کفار کو دوزخ سے نکال کر بہشت میں داخل کر دے گا۔ (ص ۲۵۱)

پھر ص ۲۵۲ پر نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دوزخ پر ایک

ایسا روز آئے گا کہ اس میں اس کے سب دروازے بند کیے جائیں گے اور ایک شخص بھی اس میں نہ رہے گا۔ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے استدلال کے طور پر آیت فاما الذین شقوا ففی النار تا آخر پڑھی اور اسناد کے ساتھ حسن سے مروی ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر اہل دوزخ اتنا دراز عرصہ (طویل زمانہ) دوزخ میں باقی رہیں گے' جن کے سالوں کا شمار کرنا دشوار ہے۔ ایسا دشوار جیسا کہ ایک بڑے ٹیلے کے ریگ کے دانوں کا شمار کرنا دشوار ہے' تب ایک ایسا روز آئے گا جس میں وہ سب کے سب دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ ایک دوسری سند کے ساتھ بھی اسی طرح مروی ہے اور اس اثر کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں اور ائمہ حدیث ہیں اور حسن نے بعض تابعین سے بھی سنا اور بغیر انکار ان کو روایت کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث ائمہ میں متداول تھی اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ایک مسلک ہے' جو علما میں مشہور ہے اور امام ابن القیم نے اس کے ثبوت میں نقلی اور عقلی دلائل سے پرزور بحث کی ہے' لیکن جمہور علماء اسلام اس کے خلاف ہیں۔ اب اگر حامیان بے نماز اس مسلک کے پیش نظر حدیث لم یعملوا خیرا فقط سے استدلال کر کے تمام کفار کو جہنم سے نکالنا جائز جانتے ہیں' تو بے نماز کو بھی جو کافر ہے ان کفار کے ساتھ نکالنا جائز سمجھ لیں۔ پھر آپ سے دوسری طرح مقابلہ کریں گے اور اگر یہ مسلک سلفی آپ کو پسند نہیں اور آپ فرعون اور قارون (جو حافظ تورات تھا) اور ہامان' ابوجہل' ابولہب وغیرہ کفار کو ابدی جہنمی جانتے ہیں' تو پھر بے نماز کافر بھی ان کا ساتھی ہے وہ بھی مٹھی وغیرہ میں داخل نہ ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مٹھی کافروں کو نہ پکڑے گی۔

<u>آٹھواں جواب</u>: مولانا مرحوم سیالکوٹی نے ایک رسالہ بنام "خصائل ایمان" تالیف فرمایا ہے' جس کے اول آخر پڑھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان اعمال کا نام ہے۔ چنانچہ انہوں نے الگ الگ عنوان قائم کیے ہیں۔

اعمال قلب (ص ۳): اس عنوان کے تحت توحید الٰہی' رسالت' ملائکہ' تقدیر' خیر و شر' یوم حساب پر ایمان' محبت الٰہی' نیت' توبہ' خوف' رجا' شکر وغیرہ امور کو دل کے اعمال قرار دیا ہے۔

دوسرا عنوان "اعمال زبان" قائم کیا ہے (ص ۱۸): اس کے تحت توحید و رسالت وغیرہ کا زبان سے اقرار کرنے کو زبان کا عمل ٹھہرایا ہے۔

پھر اعمال بدن کا عنوان قائم کیا ہے (ص ۱۸): اس کے تحت نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ وغیرہ

اعمال بدن کا ذکر کیا ہے' جس پر نجات کا دارومدار ٹھہرایا ہے۔ اگر حامیان بے نماز کی دلیل ارحم الراحمین کے قبضہ والی پیش نظر رکھی جائے تو اس میں یہ وارد ہے: لم یعملوا خیرا قط کہ اللہ ارحم الراحمین اپنی مٹھی سے ان کو دوزخ سے باہر نکال لے گا' جنہوں نے دل' زبان' بدن سے کوئی عمل خیر نہیں کیا۔ تو مولانا ابراہیم مرحوم کا اعمال' دل' زبان' بدن پر نجات کا دارومدار ٹھہرانا غلط ہو گیا۔ پہلے میر کے کلام کو دوسرے میر کے کلام نے رد کر دیا۔

اگر حامیان بے نماز یہ تاویل کریں کہ ہماری پیش کردہ حدیث میں نفی عمل سے بدن کے اعمال کی نفی مراد ہے' تو میں کہوں گا کہ یہ مطلق کو مقید کرنا اور عام کو خاص کرنا بغیر دلیل کے ہے جو جائز نہیں ہے۔ اگر آپ کوئی دلیل لائیں گے تو ہم بھی لے آئیں گے' یہ دلیل بہرصورت آپ کو غیر مفید رہے گی۔

نواں جواب: دلیل حدیث لم یعملوا خیرا قط سے اعمال بدنی کی نفی مراد لے کر محض کلمہ گو کو اس حدیث کا مصداق بنایا جاتا ہے' جو غلط ہے۔ کیونکہ محض زبان سے کلمہ میں زبانی شہادت کے علاوہ دو شرطیں اور ہیں تب کلمہ مفید ہے' ورنہ غیر مفید' بلکہ منافقت ہے۔ ایک شرط صدق واخلاص ہے چنانچہ کلمہ کی احادیث میں یہ قید وارد ہے: ما من احد یشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ صدقا من قلبہ الا حرم اللہ علی النار۔ (بخاری ومسلم) یعنی "جو شخص سچے دل سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دے گا۔"

دوسری شرط یہ ہے کہ کلمہ پر عمل کرے۔ چنانچہ ترغیب میں یہ حدیث بروایت ترمذی منقول ہے: عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من عبد قال لا الہ الا اللہ قط مخلصا الا فتحت ابواب السماء حتی یفضی الی العرش ما اجتنبت الکبائر۔ یعنی "رسول ﷺ نے فرمایا کہ جو بندہ خالص دل سے لا الہ الا اللہ کہتا ہے' تو آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور وہ کلمہ عرش تک پہنچ جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ شخص کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔"

دیگر حدیث ترغیب میں ہے جو کہ زید بن ارقم سے مروی ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الہ الا اللہ مخلصا دخل الجنۃ قیل وما اخلاصھا قال ان تحجزہ عن محارم اللہ۔ رواہ طبرانی فی الاوسط وفی الکبیر الا انہ قال ان تحجز'

عما حرم اللہ علیہ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے خالص دل اور اخلاص سے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا تو وہ جنت میں داخل ہوا۔ دریافت کیا گیا کہ حضور! اخلاص سے مراد کیا ہے تو فرمایا کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں ان سے کلمہ روک دے اور کلمہ گو رک جائے۔"

ان دو احادیث سے ثابت ہوا کہ کلمہ کہنے سے صرف زبانی کہہ لینا مراد نہیں ہے بلکہ قلب واخلاص سے پڑھ کر اس پر عقیدہ رکھنا اور عمل کرنا مراد ہے کہ اوامر کو بجالائے اور نواہی سے بچے۔ جب اس طرح کلمہ پڑھے گا تو عمل پایا گیا پھر کلمہ گو لوگ قبضہ میں آنے کے کس طرح مصدق ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں یہ واقعہ ہے کہ ایک شخص اعرابی اونٹنی سوار آیا اور جنگل میں صحابہ کی رفاقت میں آنحضرت ﷺ سے آکر ملا اور ایمان لایا اور اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور پھر اونٹنی کو واپس کرکے جانے لگا' تو اونٹنی کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ گر پڑا اور گرتے ہی اس کی جان نکل گئی' تب آنحضور ﷺ نے فرمایا : عمل قلیلا و اجر کثیرا یعنی "تھوڑا سا عمل کیا اور بہت سا اجر لے گیا" کلمہ صدق دل سے پڑھ لینا بھی عمل ہے' تو حدیث قبضہ اس پر کیسے صادق آسکتی ہے۔

<u>دسواں جواب</u>: قرآن ناطق ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت والوں سے یوں خطاب فرمائے گا : تلک الجنة التی اورثتموھا بما کنتم تعملون۔ "یہ وہ جنت ہے جس کے تم اس سبب سے وارث بنائے گئے ہو کہ دنیا میں تم عمل کرتے رہے تھے۔" اب اگر قبضہ والے بے عمل جنت میں گئے تو یہ خطاب صحیح نہ رہے گا۔ فتامل فیہ۔

<u>گیارھواں جواب</u>: ہر نفس کے لئے قرآن نے یہ قانون بنایا ہے : لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت یعنی واسطے نفس کے وہی چیز ملے گی جو اس نے نیکی کمائی ہے اور ہر نفس پر وہی سزا اور عذاب مسلط ہے جو اس نے برائی کمائی ہے۔ اگر روایت لم یعملوا قط کے پیش نظر بے عمل لوگ جنتی ہو گئے تو یہ قانون قائم نہ رہا۔

<u>بارھواں جواب</u>: قرآن مجید اس بات پر صریح ناطق ہے کہ کئی کلمہ گو اور ایمان باللہ رکھنے والے بھی مشرک ہوتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے : ما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون۔ یعنی "اکثر ایمان باللہ رکھنے والے مشرک ہیں۔" مثلاً اہل کتاب میں سے یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے ہیں اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے

ہیں۔ آج بھی ہمارے کلمہ گو مدعیان اسلام آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور کہہ کر احد اور احمد میں فرق نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں۔

وہی جو مستوی تھا عرش پہ خدا ہو کر
اتر پڑا مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اسی طرح مرزائی وغیرہ ختم نبوت کی مہر توڑ کر آنحضرت ﷺ کے بعد غلام احمد قادیانی کو نبی اور مسیح موعود اعتقاد رکھتے ہیں اور سب کلمہ گو ہیں۔ دریں حالات عارف حصاری دریافت کرتا ہے کہ یہ کلمہ گو کافر اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں آکر دوزخ سے نکلیں گے یا نہیں؟ اگر نفی میں جواب ہے تو بے نماز کلمہ گو کافر بھی خدا تعالیٰ کی مٹھی میں آکر دوزخ سے نہیں نکلے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مٹھی کافر کو نہ پکڑے گی۔ ماھو جوابکم فھو جوابنا۔

اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر آپ کا عقیدہ اجماع علماء اسلام اہل حق کے سراسر خلاف ہے' آپ تجدید ایمان کریں۔ یہ انگریزی تعلیم کا اثر ہے کہ ان کے عقائد کتب وسنت اور اجماع امت کے خلاف اور اپنے اختراعی ہیں۔ سائل کے بارہ سوال ہیں' اس لئے بندہ راقم الحروف بارہ جوابات پر اکتفا کرتا ہے۔

<u>دعویٰ پر ناقص استدلال:</u> حامیان بے نماز نے ایک دلیل یہ پیش کی ہے کہ جو شخص شہادت دے کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کے سوا کوئی معبود نہیں' محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور عیسیٰ بھی اس کے بندے اور اس کی طرف سے ایک نشان اور روح ہیں' جسے مریم میں ڈالا گیا تھا اور جنت اور دوزخ حق ہیں۔ اللہ بالآخر اسے جنت میں داخل کرے گا خواہ اس کے عمل جیسے بھی ہوں۔

یہ دلیل پیش کر کے بڑے نخرے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے مضمون ومدعا میں بالکل صاف ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مومنین اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔

اول تو حامیان بے نماز نے رسول اللہ ﷺ پر صریح جھوٹ بولا ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ مومنین اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ اس حدیث میں یہ مضمون نہیں ہے بلکہ اپنی طرف سے اس حدیث میں اختراع اور تحریف ہے۔ چنانچہ اصل عبارت حدیث کی اور اس کا ترجمہ درج ذیل

ہے : عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من شهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک له وان محمداً عبده ورسوله وان عیسی عبدالله ورسوله وابن امته وکلمة القاها الی مریم وروح منه والجنت والنار حق ادخله الله الجنة علی ما کان من العمل۔ (مشکوٰۃ) یعنی "عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور تحقیق محمد بندے ہیں اس کے اور رسول ہیں' اس کے اور عیسیٰ بندہ ہے اللہ کا اور رسول ہے اس کا اور بیٹا ہے بندی اس کی کا اور کلمہ ہے اس کا جس کو ڈالا طرف مریم کے اور روح ہے اس کی طرف سے اور بہشت اور دوزخ حق ہیں' داخل کرے گا اللہ اس شخص کو جنت میں خواہ وہ کسی عمل پر ہو۔"

یہ لفظی ترجمہ ہے جس میں یہ کوئی ذکر نہیں ہے کہ مومنین اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں داخل ہوں گے۔ بلکہ یہ ذکر ہے کہ جب وہ ان چیزوں پر شہادت دیں گے' تو خواہ ان کے عمل کیسے ہوں وہ جنت میں جائیں گے۔ اگر عملوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا تو پھر علی ما کان من العمل کتنا بیکار ہو جاتا ہے۔ اگر بے نمازیوں کے حمایتی یہ کہیں کہ یہ مطلب ہم نے اس لیے بنایا ہے کہ دیگر دلائل کے ساتھ مطابقت ہو جائے کہ اگر اس شخص نے ان چیزوں کا مان کر پھر زنا' چوری' سود خوری' شراب نوشی' جوابازی وغیرہ گناہ کیے جن پر جہنم کی سزا کا وعدہ ہے' تو پھر اس شخص کو سزا بھگت کر جنت میں جانا ہو گا' تو پھر آپ کا اس دلیل کی بابت یہ کہنا کہ یہ حدیث اپنے مضمون اور مدعا میں بالکل واضح اور صاف ہے' غلط ہو گیا۔ بلکہ اس حدیث کے ساتھ دیگر دلائل شرعیہ موجبہ عذاب کو ساتھ ملا کر مطلب لینا پڑا اور خود یہ دلیل اپنے مدعا پر صاف ناطق نہ رہی' تو اب ہم بھی اس کے ساتھ دلائل تکفیر بے نماز ملا کر یوں مطلب بیان کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ان چیزوں پر ایمان رکھنے والے جب عبادات الٰہی نماز وغیرہ حق اللہ ادا کریں گے' تو پھر وہ کسی بد عملی میں علاوہ شرک وکفر کے مبتلا ہوں گے' تو سزا بھگت کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

اب اس مطلب پر وہ دلائل ناطق ہیں' جس سے ہم نے ثابت کیا کہ فرائض الٰہی ایمان باللہ میں داخل ہیں اور دیگر دلائل مثلاً یہ حدیث جو مشکوٰۃ میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے اور بندوں کا حق اللہ کے ذمہ کیا

ہے؟ پھر خود ہی یہ جواب ارشاد فرمایا : فان حق اللّٰہ علی العباد ان یعبدوہ ولا یشرکوا بہ شیئا۔ یعنی "تحقیق اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اللہ کی عبادت (نماز وغیرہ) بجالائیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔" پھر اللہ پر حق یہ ہے کہ اس کو عذاب نہ کرے۔ اسی طرح رسالت پر ایمان لانے سے مراد محبت رسول اور اطاعت ہے۔ چنانچہ اس پر دیگر احادیث ناطق ہیں : لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ یعنی کوئی فرد تمہارا مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ ہوں میں (محمد ﷺ) بہت پیارا اس کو' اس کے والد اور اولاد اور سب لوگوں سے۔" اور یہ حدیث من اطاعنی دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابی۔ "جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی وہ انکاری ہوا۔" اس طرح یہ حدیث کہ من ترکھا فقد اشرک "جس نے نماز ترک کی وہ مشرک ہوا۔"

ان دلائل سے ملا کر مطلب ٹھیک کر لیں' بلکہ تمام دلائل شرعیہ کو ملا کر ہر حدیث کا مطلب سمجھیں' تب حق اور صواب کو پہنچ سکتے ہیں ورنہ آپ کا اس حدیث سے اور دیگر احادیث عامہ سے جن کو مشہور اور متواتر قرار دے رہے ہیں' جنت میں داخلے کا اور ایمان دار ہونے کا استدلال ناقص ہے۔ چنانچہ حدیث زیر بحث میں نہ ملائکہ پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور نہ آخرت کا اور نہ قرآن اور دیگر کتب آسمانی پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور نہ تقدیر خیر و شر کا ذکر ہے۔ جن پر ایمان لائے بغیر مومن ہرگز نہیں ہو سکتا' تو یہ استدلال ناقص ہے۔ جس میں دعویٰ اور دلیل میں تقریب تام نہیں ہے' اس دلیل پر ہر طرح نقض ہو سکتا ہے۔ اسی طرح آپ کے دلائل کا حال ہے کہ آپ نے ایسی احادیث پیش کی ہیں جن میں صرف لا الہ الا اللّٰہ کہنے پر ٹکٹ مل گیا' اس میں محمد رسول اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں اور کسی میں یہ ذکر ہے۔ من مات وھو یعلم انہ لا الہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ۔ کہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ لا الہ الا اللّٰہ کہنے سے وہ جنت میں داخل ہو گا اب نہ زبان سے کہنے کی ضرورت رہی اور نہ ایمان بالرسالت کی اور نہ ایمان ختم نبوت کی اور نہ ایمان بالقرآن کی۔

پس کیا عمدہ دلائل مثبت مدعا ہیں کہ صرف تارک الصلوۃ کیا بہت سے کافر فرقوں کو جو لا الہ الا اللّٰہ کہتے ہیں جنتی بنا دیا۔ یہ انگریزی دانوں کا حال ہے' جو نصوص شرعیہ کی غلط تعبیر کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی انگریزی دان یہ حدیث دیکھ لے کہ من انفق

زوجین دخل الجنة یعنی جس شخص نے کسی چیز کا جوڑا راہ خدا میں خرچ کیا وہ جنت میں داخل ہوا۔ پھر یہ کہے کہ اس حدیث میں لفظ "من" حروف عامہ سے ہے' جو سب لوگوں کو شامل ہے۔ لہٰذا ہنود' یہود اور نصاریٰ وغیرہ جو شخص بھی کسی چیز کا جوڑا فقیر' مسکین پر صدقہ کرے گا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ اب کلمہ کی بھی ضرورت نہ رہی۔

اسی طرح بعض انگریزی داں صرف دو نمازیں صبح' شام پڑھتے ہیں' وہ یہ حدیث پیش کر سکتے ہیں۔ من صلی البر دین دخل الجنة۔ حامیان بے نمازان نے یہ اچھا طرز استدلال سیکھا اور سکھلایا ہے کہ مطلب کی ایک حدیث لی' جس پر جنت کے داخلہ کا ذکر ہو' تو اس کو جنتی بنا دیا۔ بس دائمی دوزخی کوئی بھی نہ رہا' یہ طریقہ باطل ہے۔ پھر دلیل شرعی سے استدلال دوسرے شرعی دلائل کو ملحوظ رکھ کر کرنا چاہئے۔ ورنہ دیگر دلائل کی تکذیب لازم آئے گی۔ مثلاً کوئی مرزائی فوت ہوا اور وہ لا الہ الا اللہ پڑھتا تھا اور جانتا تھا اور اس نے مرتے وقت بھی یہ کلمہ پڑھا' لیکن اس نے اپنے کفریہ عقیدہ سے توبہ اعلانیہ نہ کی اور یہ نہ کہا کہ میں ختم نبوت کا قائل ہو گیا ہوں اور مرزائی قادیانی کو نبی و رسول کہنے سے توبہ کرتا ہوں اور اس کو مسیح موعود نہیں جانتا' تو اس کلمہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہاں اگر اس عقیدہ سے توبہ کی اور پھر کلمہ پڑھا تو اس کے بارہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ جنت میں داخل کیا جائے گا اور کہیں گے کہ اس کے سرائر خدا تعالیٰ کے سپرد ہیں۔

ٹھیک اسی طرح بے نماز بروئے دلائل شرعیہ کافر و مشرک اور فرعون کا ساتھی ہے۔ وہ ترک نماز سے توبہ کر گیا اور وعدہ کیا کہ اب میں آئندہ نماز پڑھوں گا پھر کلمہ پڑھا اور گناہوں سے تائب ہو کر مرا' تو کہیں گے کہ ایسا شخص جنت میں داخل ہو گا۔ چنانچہ امام حسن بصری اور رئیس ائمہ بخاری نے ایسی حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خان مرحوم هداية السائل الى ادلة المسائل کے ص۔۳۴۲ میں رقم طراز ہیں : وتووی از بعض حکایت کردہ کہ ایں احادیث مجملاں محتاج شرح انہ من قال الکلمة و ادی حقها وفريضتها وهذا قول الحسن البصری وقال البخاری ان ذلک لمن قالها عند الندم والتوبة ومات علی ذلک ذکره فی کتاب اللباس۔ یعنی کلمہ والی احادیث مجمل ہیں' جو شرح کی محتاج ہیں' ان کا معنی یہ ہے کہ جس شخص نے کلمہ پڑھا اور اس کا حق ادا کیا اور فرض بجا لایا تب وہ جنتی ہے۔ یہ قول حسن بصری کا ہے اور امام بخاری یہ فرماتے ہیں کہ

کلمہ سے دخول جنت اس کے لئے ہے جس نے یہ کلمہ پڑھا اور گناہوں سے نادم ہو کر توبہ کی اور پھر مرگیا تو وہ جنتی ہے۔

اسی طرح امام بخاری حدیث ما من عبد قال لا الہ الا اللہ ثم مات علی ذلک الا دخل الجنۃ کے تحت یہ فرماتے ہیں : ھذا عند الموت او قبلہ اذا تاب وندم وقال لا الہ الا اللہ ومات علی ذالک غفرلہ وادخل الجنۃ یعنی "یہ حدیث موت کے وقت پر محمول ہے کہ اس وقت جو شخص نادم ہو کر توبہ کرے گا اور پھر کلمہ پڑھ کر مرگیا' تو وہ جنت میں داخل کیا جائے گا" امام بخاری نے بے نمازیان کے حامیوں کے دلائل پر پانی پھیر دیا اور وہ انگریزی کا ماتم کریں' جس نے کتاب وسنت کے اسرار سمجھنے سے محروم رکھا۔

امام منذری ترغیب میں کلمہ کی احادیث نقل کر کے پھر یہ لکھتے ہیں : قد ذھب طوائف من اساطین اھل العلم ای ان مثل ھذا لا طلاقات التی وردت فیمن قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ او حرم علیہ النار ونحو ذلک انما کان فی ابتداء الاسلام حین کانت الدعوۃ الی مجرد الاقرار بالتوحید فلما فرضت الفرائض وحدت الحدود نسخ ذالک والدلائل علی ذلک کثیرۃ متظاھرۃ یعنی "اہل علم میں جو یگانۂ روزگار تھے ان میں کئی گروہ اس طرف گئے ہیں کہ جن احادیث میں یہ اطلاق وارد ہے کہ جس شخص نے کلمہ طیبہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہوا۔ اس پر دوزخ حرام ہوئی' یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا' جب کہ دعوت صرف کلمہ توحید کی طرف تھی۔ پھر جب فرائض اسلام نازل ہوئے اور اسلام کی حدیں مقرر کی گئیں تو یہ حکم منسوخ ہوا اور کلمہ کے ساتھ فرائض الہی کی ادائیگی اور حدود اسلام کی پابندی شامل کی گئی' اس پر بہت سے دلائل ظاہرہ موجود ہیں۔"

نیز یہ لکھا ہے : قال طائفۃ اخری الخ' یعنی دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ دعویٰ نسخ کی حاجت نہیں ہے اصل توجیہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز جو ارکان دین سے ہے اور فرض ہے وہ اقرار بالشہادتین میں ہی داخل ہے کہ اس نے اللہ اور رسول کا جب اقرار کر لیا' تو ساتھ ہی ان کے احکام کی تعمیل کا اقرار کر لیا۔ بعد اقرار کے جب فرائض الہی سے روگردانی کرے گا تو حکمنا علیہ بالکفر ہم اس پر کفر کا حکم نافذ کر دیں گے' خواہ وہ عناد وانکار سے کرے یا سستی اور غفلت سے کرے۔ بہرصورت اس پر حکم کفر جاری ہو گا اور کہا جائے گا کہ ایسا شخص جو تارک فرائض ہے جنت میں نہ جائے گا وقالت طائفۃ اخری یعنی دوسرا گروہ یہ

کہتا ہے کہ کلمہ توحید کے ساتھ بروئے دیگر دلائل کے یہ شرط ہے: ان یاتی بالفرائض ویجتنب الکبائر کہ کلمہ پڑھ کر فرائض الٰہی بھی ادا کرے اور کبیرہ گناہوں سے بھی بچے اگر کلمہ پڑھ کر اس نے فرائض الٰہی ادا نہ کیے اور کبیرہ گناہوں سے نہ بچا تو محض کلمہ پڑھنا اس کو دوزخ میں داخل ہونے سے نہ بچا سکے گا۔

میں کہتا ہوں کہ ان تمام محدثین کی توجیہات کا متفقہ نتیجہ یہ ہے کہ دوزخ سے بچ کر جنت میں داخل ہونے کے لئے صرف کلمہ کفایت نہ کرے گا بلکہ دیگر ضروریات دین پر ایمان رکھ کر احکام شرعیہ پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً کلمہ کہا اور پھر شرک کیا تو کلمہ ہرگز کافی نہ ہو گا بلکہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ کہا اور پھر آپ کو خاتم النبیین نہ مانا اور کسی دوسرے شخص کو بعد آنحضور ﷺ کے نبی بنا لیا تو وہ مشرک فی الرسالت ہوا اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اسی طرح کسی مقدمہ کا شرعی فیصلہ کیا اور اس نے اس کو نہ مانا تو آیت فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک الایۃ کے کافر ہوا' جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اسی طرح کسی سے کہا کہ اس نزاع اور مقدمہ کا حاکم شرعی کے پاس جا کر فیصلہ کراؤ' تو اس نے ادھر جانے سے انکار کیا اور وہ طاغوت کی طرف چلا گیا۔ تو بروئے آیت الم تر الی الذین یزعمون انھم امنوا بما انزل الیک وہ کافر ہوا' اسی طرح کسی مقدمہ اور نزاع کا مسلمان فریقین نے شرعی فیصلہ چاہا اور اس حاکم نے خلاف قانون الٰہی کے قانون طاغوت پر فیصلہ کر دیا تو بحکم آیت ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ وہ کافر ہوا جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اس پر ساجد میر صاحب نے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ لیس کمن یکفر باللہ یہ ظاہر قرآن کے خلاف حدیث موقوف ہے اور موقوف احکام شرعیہ میں حجت نہیں (اصول حدیث کی کتابیں ملاحظہ کریں) ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع۔ کی رو سے دیہات سے جمعہ رخصت کرنا پڑے گا اور حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی موقوف روایت کی بنا پر رکوع والی رکعت بھی حامیان بے نماز کو ماننی پڑے گی۔ جس کا مولانا میر سیالکوٹی مرحوم نے تفسیر فاتحہ میں انکار کیا ہے۔

قرآن کے نصوص صریحہ ناطق ہیں کہ تنازعات کا احکام شرعیہ کی طرف نہ لے جانا بلکہ

طاغوت سے فیصلہ کرانا اور حاکم مسلمان کا فیصلہ شرعی نہ کرنا بلکہ قانون طاغوتی پر فیصلہ کرنا کفر ہے اور اس کفر کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور اس کا کلمہ منافقانہ کالعدم ہے' وہ نافع نہ ہو گا بچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون۔ یعنی "اکثر لوگ مومن کہلاتے ہیں' مگر وہ مشرک ہیں۔" پس محض کلمہ کی روایات مجملہ کی رو سے ان کلمہ گو لوگوں کو جن کو شارع نے دیگر احادیث میں کافر و مشرک قرار دیا ہے' مومن اور جنتی نہیں کہا جا سکتا' ورنہ دیگر نصوص صریحہ کی تکذیب لازم آئے گی اور پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ قائل کذب کا متبع ہے۔ جن کو قرآن میں یوں خطاب کیا گیا ہے: افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض "کہ بعض کتاب کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔"

جناب نواب صاحب ہدایۃ السائل ص۔۴۴۲ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ احادیث وارد در دخول جنت قائل لا الہ الا اللہ مقید اند بعدم اخلال سائر فرائض موجب خدا وعدم فعل کبیرہ از کبائر فاحش ازاں توبہ نکردہ و مجرد شہادت موجب جنت نیست پس ایں ادلہ حجت بر مطلوب نیستند۔ یعنی کلمہ گو کے لئے دخول جنت کا جن احادیث میں ذکر ہے وہ مقید ہیں ساتھ فرائض و واجبات کے۔ اگر کسی فرض الٰہی میں خلل واقع ہو' یا مرتکب گناہ کبیرہ نے توبہ نہ کی تو صرف کلمہ شہادت موجب دخول جنت نہ ہو گا پس جو لوگ اس قسم کے دلائل سے معارضہ کرتے ہیں' وہ اس مقصد کے لئے قابل حجت نہیں ہیں۔

اگرچہ اہل باطل نے بہت خاک چھانی
مگر ہوا دودھ کا دودھ پانی کا پانی

بے نمازیوں کے حاجی صاحب نے جن احادیث کو نقل کر کے ان میں کفر دون کفر بتایا ہے' ان میں دیگر دلائل صریحہ کا معارضہ مسلمہ طور پر موجود ہے۔ اس لئے ان سے کفر حقیقی نہیں مراد لیا گیا' جو موجب خروج از ملت ہو۔ لیکن ان پر احادیث موجب تکفیر تارک صلوٰۃ کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ ان میں کفر حقیقی کے قرائن صحیحہ اور دلائل صریحہ موجود ہیں' جن میں کسی تاویل کو چلنے نہیں دیتے' جیسا کہ میں نے اپنے مضمون تکفیر بے نماز میں اس کی خوب وضاحت کر دی ہے کہ ان دلائل میں کفر ایمان کے مقابلہ میں وارد ہے اور اس کے ساتھ لفظا کفر کا بھی اطلاق ہے اور اس کفر سے اعمال کا حبط ہو جانا

مذکور ہے اور ایسا کافر فرعون وغیرہ کے ہمراہ بتلایا گیا ہے۔ اور بے نماز کا کفر کفریوں کے ساتھ ذکر ہے اور اس کفر پر اجماع صحابہ موجود ہے اور صحابہ کا بے نماز کو کافر کہنا منقول ہے اور ترک نماز کو موجب خروج از ملت بعض احادیث میں بتلایا گیا ہے اور اکابر محدثین نے بے نماز کو کافر مرتد ٹھہرا کر اس کی سزا قتل بیان کر دی ہے' تو پھر ان احادیث میں کون سے تاویل صحیح کی جا سکتی ہے۔ ہاں تاویل فاسد مثل گمراہ فرقوں کے کرے تو اس کی تاویل باطل ہو گی۔

بے نمازیوں کے حامی نے مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی مرحوم کا حوالہ دے کر یہ بھی لکھا ہے کہ احادیث تکفیر بے نماز اخبار احاد ہیں اور احادیث کلمہ موجب نجات اخبار مشہور و متواتر ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ اخبار احاد کا معارضہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اصول یہاں بیان کرنا غلط ہے۔ خاص اور عام کا معارضہ صحیح نہیں بلکہ یہاں یہ قانون علمی مأخذ ہے کہ احادیث تکفیر بے نماز خاص ہیں اور احادیث کلمہ وغیرہ کی عام ہیں' تو خاص پر عام کی بنا رکھ کر اس کو مخصوص کیا جائے گا' جیسا کہ ہم نے شروع مضمون میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ پھر احادیث کلمہ مشہور ہوں یا متواتر وہ اپنے عموم پر نہیں ہیں بلکہ عام مخصوص منہ البعض ہیں کہ دیگر دلائل قطعیہ جن سے اکثر کلمہ گو کافر حقیقی ثابت ہوتے ہیں۔ ان دلائل عامہ سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً قبر پرست' تعزیہ پرست' مدعیان نبوت' منکرین حدیث' منافقین' بے نماز منکر جو کہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا۔ یہ بالاجماع کافر ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ نماز ہمارے مخالف پڑتی ہے' ایک بار پڑھ دیکھی تھی' ہماری بھینس مر گئی تھی' تو ایسے لوگ بالاتفاق کافر ہیں' جو احادیث کلمہ سے مستثنیٰ ہیں پھر یہ احادیث ظنی ہو گئیں تو ان کی تخصیص احادیث تکفیر بے نماز سے ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ظنی نہ ہوں تب بھی خبر واحد سے عموم قرآن و حدیث قطعی کی تخصیص کرنی جائز ہے۔ کما لا یخفی علی اهل العلم۔

حامیان بے نمازیان کی انوکھی دلیل: حامیان بے نمازیان نے ایک بہت انوکھی دلیل پیش کی ہے جس سے گنہگاروں کے دوزخ میں جانے اور مسئلہ شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی مٹھی سے گنہگاروں کے نکلنے کی روایات کی تکذیب لازم آتی' وہ دلیل یہ ہے' وہ لکھتے ہیں:

"ترمذی وغیرہ نے ابن عمرو سے یہ روایت بھی کی ہے کہ لا الہ الا اللہ اور کلمہ محمدا عبدہ ورسولہ کا اقرار کرنے والے ایسے شخص کی مغفرت بھی ہو گی جس کی برائیوں کے

دفتر ننانوے ارحم الراحمین کی عدالت میں پیش ہوں گے اور دفتر بھی ایسے کہ ان میں کا ایک ایک بس حد نگاہ تک پھیلا ہوا نظر آئے گا۔"

حامیان بے نمازیان نے یہ روایت پوری نہ لکھی' جھجک گئے کہ اس سے تو تمام گنہگاروں کا بغیر سزا گناہوں کے جنتی اور مغفور ہونا لازم آیا' نہ انبیاء کی شفاعت کی ضرورت رہی اور نہ ارحم الراحمین کو دوزخ سے مٹھی بھرنے کی نوبت آئے گی' سب میدان حشر میں ہی بخشے گئے۔ چنانچہ اس روایت کے آگے کا حصہ یہ ہے کہ "فرمائے گا اللہ تعالیٰ اس شخص کو کہ کیا انکار کرتا ہے تو اس سے کہ ان طوماروں میں ہے کچھ کہ نہیں کیا تو نے اور کیا ظلم کیا ہے میرے کاتبین نے تجھ پر' تو کہے گا گنہگار کہ اے رب العالمین! میں کچھ انکار نہیں کر سکتا اور تیرے کاتبوں نے کچھ ظلم نہیں کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تیرا کوئی عذر ہے؟ تو بندہ گنہگار کہے گا کہ اے پروردگار میرا کوئی عذر نہیں ہے' تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی ہے اور آج کے دن تجھ پر کوئی ظلم نہیں ہے پھر نکالے گا اللہ تعالیٰ ایک چٹھی جس پر لکھا ہو گا : "اشهد ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا عبده ورسوله" اور فرمائے گا حاضر ہو تو اپنے وزن پر۔ وہ شخص کہے گا اے پروردگار! کیا مناسبت ہے وزن میں اس چٹھی کی بمقابلہ ان گناہ کے طوماروں کے' تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھ پر ظلم نہیں ہو گا فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ پھر ایک پلڑے میں گناہوں کے طومار ننانویں رکھے جائیں گے اور دوسرے پلڑے میں وہ بطاقہ رکھی جائے گی۔ جب وزن کیا تو ہلکے ہوں گے وہ طومار اور بھاری ہو گی وہ چٹھی' کیونکہ نام الٰہی کے ساتھ کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔" (مشکوٰۃ)

اس حدیث بطاقہ کے ظاہر کو پیش نظر رکھا جائے تو کوئی گنہگار بھی جو کلمہ گو ہوا جہنم میں نہ جائے گا اور یہ حدیث اُن تمام احادیث کے معارض ہو جائے گی جن میں کبیرہ گناہوں پر جہنم کی وعید آئی ہے۔ مثلاً زناکار' سود خوار' شراب نوش' خائن' لوگوں کے حقوق دبانے والے' علماء بے عمل' مصور' نوحہ کرنے والی عورتیں' چغل خوری' قاطع رحم وغیرہ بطاقہ کے ذریعہ دوزخ سے محفوظ رہیں گے۔ پس جو جواب حامیان بے نمازیان اس معارضہ کا دیں' وہی ہماری طرف سے تصور کر لیں۔

انوکھی دلیل کا دوسرا جواب : ہم حامیان بے نمازیان سے دریافت کرتے ہیں کہ ان ننانویں دفتروں میں کفر و شرک کا کوئی دفتر بھی ہو گا یا نہیں؟ اگر ہو گا تو اس سے یہ لازم آیا

کہ جو کلمہ گو مشرک و کافر ہیں' مثلاً مرزائی' قبر پرست' تعزیہ پرست وغیرہ سب جنتی ہوں گے اور ان کی مغفرت ہو جائے گی۔ یہ عقیدہ نصوص قطعیہ اور اجماع امت کے خلاف ہے' کما ھو الظاھر۔

اور اگر ان دفتروں میں کفر و شرک داخل نہیں' دوسرے گناہ مراد ہیں تو پھر بے نماز اس سے خارج ہوا' وہ بھی داخل نہیں کیونکہ وہ بموجب دلائل صریحہ کافر و مشرک ہے۔ چنانچہ تارک نماز کے بارہ میں فقد کفر اور فقد اشرک الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ننانویں دفتروں میں بے نمازی کا کفر و شرک داخل نہیں تو پھر نمازی گنہگار داخل ہوئے تب بطاقہ کے ساتھ نماز وغیرہ اعمال بھی نیکیوں کے پلڑا میں شامل ہونے ضروری تھے۔ حالانکہ ان کا ذکر نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو ان نیکیوں کو اہل حقوق لے گئے ہوں گے یا کسی گناہ کی وجہ سے قبولیت کو نہ پہنچی ہوں گی' صرف فرض ذمہ سے ساقط ہو گیا ہو۔ جیسے احادیث میں آیا ہے کہ فلاں گناہ کرنے والے کا نماز وغیرہ کوئی نیک عمل قبول نہیں ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے : فلا یقبل عمل قاطع رحم۔ "کہ قطع رحم کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہے۔" دیگر حدیث میں ہے : لا تقبل صلوۃ امرأۃ تطیبت للمسجد۔ "کہ جس عورت نے مسجد کو جانے کے لیے خوشبو لگائی' اس کی نماز صحیح نہیں ہے۔"

اسی طرح جس امام پر قوم ناراض ہو اس کی نماز قبول نہیں اور جس عورت پر خاوند ناراض ہو' اس کی نماز قبول نہیں ہے اور جو غلام مالک سے بھاگ جائے اس کی نماز قبول نہیں اور جو مسلمان باہم ناراض ہو کر کینہ بغض رکھیں' ان کی نماز قبول نہیں' وغیرہ ذلک۔ کئی لوگ ہیں جن کی نماز وغیرہ اعمال قبول نہیں یعنی ان کے ذمے سے فرض تو ساقط ہیں' تارک فرائض شمار نہیں' لیکن دیگر گناہوں کی وجہ سے ان کا اجر و ثواب نہ ملے گا اور وہ حسنات کے پلڑا میں جانے کے قابل نہیں ہیں۔

ایک عجیب دلیل: بے نمازیوں کے حامی نے شرعی نصوص کے محاورات سے نادان ہونے کی وجہ سے ایک یہ حدیث بطور دلیل پیش کی ہے کہ بے نماز کافر نہیں ہے۔ یہ حدیث مشکوۃ میں یوں وارد ہے : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث من اصل الایمان الکف عمن قال لا الہ الا اللہ لا تکفرہ بذنب ولا تخرجہ من الاسلام بعمل۔ (الحدیث) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں اصل اور ایمان کی جڑیں ہیں۔ ایک

یہ کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اس کو کافر کہنے اور کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج کرنے سے باز رہنا۔ دوم جہاد کا حکم ماننا کہ یہ ہمیشہ جاری رہے گا سوم تقدیر پر ایمان لانا۔ اس حدیث میں کلمہ گو کو کافر کہنے سے روکا گیا ہے' چونکہ بے نماز کلمہ گو ہے اس لیے اس کو کافر کہنا منع ہے۔

اس دلیل کا پہلا جواب: یہ حدیث ابوداؤد کی ہے جس کی اسناد میں ایک راوی یزید بن ابی شیبہ ہے جس کو تقریب میں حافظ ابن حجر نے مجہول لکھا ہے۔ مجہول راوی کی روایت ضعیف اور ناقابل احتجاج ہوتی ہے' جس سے مجہول شخص ہی دلیل لے سکتا ہے' دوسرا عالم معتبر نہیں لے سکتا۔

دوسرا جواب: اس حدیث میں ایسے کبیرہ گناہوں سے تکفیر منع کی گئی ہے جن سے اصولاً کفر ثابت نہ ہو اور شارع نے اس گناہ پر تکفیر نہ کی ہو اور وہ اپنے کسی اختراعی عقیدہ سے تکفیر کرے۔ جیسے خوارج' معتزلہ اور مرزائی وغیرہ مسلمانوں کی تکفیر اس لیے کرتے ہیں کہ خود شارع نے تکفیر کی ہے اور اس کو اسلام سے خارج کیا ہے' جیسا کہ ہم نے بے نماز کی تکفیر کے دلائل میں اس کی صراحت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بے نماز کی تکفیر کے دلائل میں اس کی صراحت کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ بندہ اور کفر وشرک کے درمیان نماز حد فاصل ہے' جس نے نماز ترک کر دی وہ کافر ومشرک ہوا' اور صحابہ کا بے نماز کے کفر پر اجماع ہے۔ حضرت علی وجابر رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہ نے صاف یہ کہا ہے: من لم یصل فھو کافر "کہ جو شخص نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔"

پس نماز رکن اعظم اسلام کے ترک کا حکم دیگر گناہوں کی طرح نہیں ہے۔ چنانچہ خلیفہ اسلام شراب نوشی یا سود خوری کرے تو اس سے مقابلہ روا نہیں ہے' اس کی اطاعت میں رہنا پڑے گا اگر کوئی ظلم کرے تو بھی صبر کرنا پڑے گا لیکن اگر خلیفہ اسلام نماز ترک کر کے بے نماز ہو جائے تو فوراً اس کی اطاعت چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ پس ترک صلوٰۃ کے جرم کفر کو دیگر گناہوں پر قیاس کر کے بے نماز کی تکفیر سے باز رہنا سراسر حماقت ہے' کیونکہ ترک صلوٰۃ کفر بواح ہے جس سے آج کل کے علماء اہل رائے کی تقلید سے متاثر ہو کر غافل ہو رہے ہیں۔

تیسرا جواب: اس حدیث سے حامیان بے نمازیان کا رد ہو گیا بایں طور کہ اس حدیث

سے یہ ثابت ہوا کہ ایمان کی ماہیت میں عمل داخل ہے اور کلمہ گو کی تکفیر سے رکا رہنا ایک عمل ہے۔ جہاد کرنا ایک عمل ہے' یہ ایمان کی اصل ہیں۔ پس جو شخص زنا' چوری وغیرہ کسی گناہ سے کسی کو کافر اور خارج اسلام کہہ دے گا وہ خود کافر اور خارج از اسلام ہو جائے گا جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ جو کسی کو کافر کہے اور وہ کافر نہ ہو تو وہ کفر کہنے والے پر لوٹ آئے گا۔ مگر ان کا عقیدہ ان کے خلاف ہے' وہ ان اعمال کو اصل ایمان سے خارج تصور کرتے ہیں' یہ حدیث ان کا رد کر رہی ہے۔

چوتھا جواب: اچھا یہ بتائیے کہ حائضہ عورت سے جماع کرنا گناہ ہے یا نہیں؟ اسی طرح عورت کی دبر میں جماع کرنا گناہ ہے یا نہیں؟ اگر گناہ ہے تو ان گناہ کرنے والے کو کافر کہنا چاہیے یا نہیں؟ اگر شق اول ہے تو یہ آپ کی پیش کردہ حدیث لا نکفرہ بذنب کے خلاف ہوا۔ اگر کہیں کہ ان گناہوں کے عادیوں کو کافر نہ کہنا چاہیے کہ اس حدیث کی رو سے منع ہے' تو یہ بتائیے کہ اس حدیث کے بیان کرنے والے رسول اکرم ﷺ نے ان گناہوں کے مرتکبین کو خود کافر کیوں کہا؟ چنانچہ مندرجہ ذیل احادیث سے ان کی تکفیر ظاہر ہے۔

مشکوۃ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: من اتی حائضا او امراۃ فی دبرھا او کاھنا فقد کفر بما انزل علی محمد۔ یعنی "جس شخص نے حائضہ عورت سے جماع کیا یا عورت کی دبر میں کیا یا کاہن سے غیب کی باتیں دریافت کرنے لگا اور پھر اس کی تصدیق کی تو اس نے اس علم کے ساتھ کفر کیا جو حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا۔"

یہ آپ جانتے ہیں کہ ما انزل اللہ سے کفر کرنا اسلام سے خارج ہوتا ہے تو یہاں بوجہ گناہوں کے اسلام سے اخراج صادر ہوا اور آپ کی دلیل غلط ہو گئی۔ یہاں آپ کی تاویل کہ کفر دون کفر ہے' نہیں چل سکتی۔ کیونکہ کاہن کی تصدیق بالاجماع کفر ہے پھر اس کو بھی مومن ماننا پڑے گا ولم یقل بہ احد۔ اگر کہیں کہ اس روایت کے ایک راوی میں بعض محدثین نے کلام کی ہے' اس لیے اس حدیث سے الزام دینا صحیح نہیں ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی راوی میں بعض نے جرح کی تو بعض اکابر نے اس کی توثیق کی ہے' تو یہ حدیث حسن سے کم نہیں ہے لیکن ہم اس کی تائید میں ایک صحیح روایت پیش کر دیتے ہیں تاکہ شبہ نہ رہے۔

ترغیب وترہیب منذری میں یہ حدیث درج ہے: عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اتی النساء فی اعجازھن فقد کفر۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط ورواتہ ثقات، یعنی "جس شخص نے عورتوں سے لواطت کی وہ کافر ہوا" اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ اس حدیث میں گو ایک گناہ پر کفر کا ذکر ہے مگر اس گناہ کے دو ساتھی جو پہلے ذکر ہوئے، وہ اس سے بدترین ہیں، ان کا بھی وہی حکم ہے۔

پس اس کا جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو گی مبارک تمہیں

کفر دون کفر کا جواب: ساجد میر صاحب نے اپنے مضمون کفر وایمان کی حدود میں بے نمازوں کے کفر کی احادیث کا ذکر کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ بے نماز پر کفر کا اطلاق آیا ہے مگر پھر یہ کہا ہے کہ یہاں کفر حقیقی مراد نہیں ہے جو باعث خروج از اسلام ہے، بلکہ کفر دون کفر ہے، جو موجب خروج از اسلام نہیں ہے۔ جیسے دیگر احادیث میں کفر کا لفظ آیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ ایک کفر حقیقی ہوتا ہے، دوسرا مجازی یعنی کفر دون کفر۔ لیکن نصوص شرعیہ میں جو کفر وارد ہے اس کا اطلاق حقیقی کفر پر ہے۔ مجازی کفر وہاں مراد ہوتا ہے جہاں قرائن اور خارجی دلائل سے حقیقی کفر مراد لینا حرج ہو جائے۔ مثلاً حدیث میں قتالہ کفر آیا ہے کہ مسلمان سے لڑنا کفر ہے اور ادھر قرآن میں یہ ارشاد ہے: وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما الایہ یعنی "مومنوں کے دو فریق آپس میں لڑیں تو تم جو غیر جانبدار ہو ان میں صلح کرا دو۔"

اس آیت میں قتال کرنے والوں کو مومنین کہہ کر ان میں صلح کرانے کا حکم دیا ہے۔ پس حدیث میں کفر کی تاویل کرنی پڑے گی کہ یہاں کفر مجازی یعنی کفر دون کفر ہے۔ اگر اسی طرح احادیث میں بے نمازوں کو مومن کہا جاتا یا مسلم قرار دیا جاتا تو جن احادیث میں بے نمازوں کو کافر کہا گیا ہے، ان میں مجازی کفر مراد لیا جاتا۔ لیکن کسی دلیل سے یہ ثابت نہ ہو سکا کہ بے نماز مومن یا مسلمان ہے، مگر ہم نے دیگر قرائن اور خارجی دلائل سے یہ معلوم کیا کہ بے نماز کا کفر حقیقی مراد ہے جو مخرج از اسلام ہے۔

چند قرائن ودلائل یہ ہیں: بے نماز کا حشر فرعون وقارون وغیرہ بڑے کافروں کے ہمراہ بتایا گیا ہے جن کا کفر حقیقی ہے تو بے نماز کا بھی کفر حقیقی ہو گا۔ دوم، نماز کو قرآن میں لفظ

ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فاتحہ کو صلوٰۃ کے لفظ سے جیسے فاتحہ کے بغیر نماز باطل ہے۔ نماز کے بغیر ایمان نامکمل ہے۔ فاتحہ نماز کا رکن ہے اور نماز ایمان کا رکن ہے' فافهم۔ سوم' نماز ایمان واسلام کا رکن ہے جیسا کہ صحیحین کی احادیث سے ثابت ہے۔ رکن داخل فی الماهیۃ ہوتا ہے جس کے ساقط ہونے سے ماہیت نابود ہو جاتی ہے تو نماز کے ترک سے ایمان ساقط ہو گیا۔ چہارم' نماز کو احادیث میں مقرون بالشہادتین ذکر کیا ہے۔ شہادتین کے عدم سے ایمان معدوم' تو نماز کے عدم سے بھی ایمان معدوم ہو گا۔ پنجم' ایمان کے بغیر کوئی عمل صالح قبول نہیں' اسی طرح نماز کے بغیر عمل قبول نہیں۔

ششم' ترک نماز پر کفر اور شرک ہر دو کا اطلاق آیا ہے' جہاں دونوں کا اطلاق ہو گا کفر حقیقی ہو گا۔ ہفتم' حقیقی کفر سے اعمال کا حبط ہونا مسلم ہے' ترک نماز سے بھی اعمال کا حبط ہونا ثابت ہے۔ ہشتم' بے نماز کے کفر پر صحابہ کا اجماع ہے اور صحابہ نے بے نماز کو کافر کہا ہے۔ نہم' حکام اور خلفاء کی اطاعت کا حکم ہے مقابلہ کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ وہ کفر بواح کریں اور دوسری حدیث میں ہے جب تک نماز پڑھیں' اس سے ظاہر ہے کہ ترک نماز کفر بواح ہے۔ دہم' بندے اور کفر و شرک کے درمیان حد فاصل نماز احادیث میں آئی ہے' چھوڑ دی تو کافر ہوا۔

یازدہم' قرآن میں مومنوں کو دینی بھائی قرار دیا گیا ہے اور دوسری آیت میں یہ کہا گیا کہ اگر کفر و شرک سے توبہ کر کے نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تب تمہارے دینی بھائی ہیں' نماز ایمان ہے۔ دوازدہم' بے نماز کی سزا قتل ہے جس سے ظاہر ہے کہ بے نماز کا کفر' کفر ارتداد ہے۔ سیزدہم' حدیث میں ہے کہ جس نے نماز ترک کر دی وہ ملت سے خارج ہے' یہ کفر حقیقی پر دلیل ہے۔ یہ تیرہ قرائن اور دلائل ہیں جس سے غیر مکفرین بے نمازوں کے بھائیوں کی سب تاویلیں باطل ہو گئیں اور یہ ثابت ہو گیا کہ بے نماز کافر حقیقی اور مشرک خارج از اسلام ہے۔ جس سے نہ نکاح جائز ہے اور نہ اس کا جنازہ پڑھنا جائز ہے اور نہ وہ مسلمانوں کا وارث ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری ثم منٹگمری (ساہیوال)

صحیفہ اہلحدیث کراچی' جلد۔۵۰' شمارہ۔۳' ۴' ۵' ۱۷' ۱۸' ۲۰' مورخہ یکم و ۱۶ رجب' یکم شعبان ویکم رمضان' یکم و ۱۶ شوال سنہ ۱۳۸۹ھ

شریعت میں تارک نماز کا حکم

کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ اس عہد ضلالت میں بے نمازوں کی کثرت ہے۔ بعض لوگ تو بالکل ہی نماز نہیں پڑھتے۔ پانچوں نمازوں کے بالکلیہ تارک ہیں اور بعض دس بیس دن پڑھ لیتے ہیں' پھر دس بیس دن چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض صرف عید' جنازہ کی نماز پڑھ لیتے ہیں اور باقی صلوات خمسہ نہیں پڑھتے۔ بعض یہ اقرار کرتے ہیں کہ واقعی نماز فرض ہے اور نہ پڑھنا گناہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نمازوں میں کیا دھرا ہے۔ اللہ رحیم ہے اور وہ اپنی رحمت سے بخش دے گا بعض کہتے ہیں کہ نماز تو ظاہر لوگوں کے لئے ہے۔ ہم اہل باطن ہیں' دل میں ہی اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یہ نمازی لوگ مسجدوں میں فرش پر ہوتے ہیں اور ہم تصور شیخ سے عرش پر پہنچتے ہیں۔ کئی پیر لوگ نمازیں نہیں پڑھتے' وہ کہتے ہیں نماز معرفت ویقین حاصل ہونے تک ہے۔ جب کامل یقین اور معرفت حاصل ہو گئی تو نماز ساقط ہو گئی۔ قرآن کریم میں ہے : واعبد ربک حتی یاتیک الیقین۔ "کہ یقین حاصل ہونے تک اللہ کی عبادت کر۔" جب یقین حاصل ہو جائے تو پھر خدا کا تصور کافی ہے' نمازوں کا محض رواج ہے۔ بعض بھنگ نوش کہتے ہیں۔

نہ مر بھوکا نہ جا مسجد نہ دے سجدہ
وضو کا توڑ دے کوزہ شراب شوق پیتا جا

اب استفتاء یہ ہے کہ نمازوں کی بابت شرعی حکم کیا ہے۔ کیا وہ کافر خارج از اسلام ہیں یا کلمہ گو مسلمان؟ ان کا جنازہ پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ اور بے نماز کا نمازی عورت سے نکاح ہو جاتا ہے یا نہیں؟ آج کل خاوند نمازی ہے تو عورت بے نماز ہے اور عورت نمازن ہے تو خاوند بے نماز ہے۔ بعض گھروں میں دونوں بے نماز ہیں۔ اکثر علماء بے نماز کو مسلمان گنہگار قرار دیتے ہیں اور جنازہ ان کا پڑھ دیتے ہیں اور بعض بے نماز کو کافر' خارج از اسلام قرار دیتے ہیں نہ ان کا جنازہ کرتے ہیں اور نہ کسی نیک نمازن عورت سے اس کا نکاح پڑھتے ہیں اور نہ نمازی کو بے نماز کا وارث قرار دیتے ہیں اور نہ بے نمازوں کی اولاد صغیر کا جنازہ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافروں کی اولاد ہے۔ کافروں کی اولاد کا جنازہ جائز نہیں ہے کہ وہ کفار کے تابع ہیں۔ مسئلہ کا پورا فیصلہ بروئے قرآن وحدیث بیان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ بے

نماز پر حد شرعی ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا عنداللہ الجلیل۔

(السائل محمد سلیم سکنہ چک نمبر ۸۱ ۔ای ۔بی ضلع وہاڑی)

الجواب بعون الوہاب وھو الموفق للصواب۔ الحمدللہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ اگرچہ تارک الصلوۃ کے بارہ میں علمائے متقدمین اور متاخرین کا سخت اختلاف ہے۔ لیکن اختلاف سے کوئی مسئلہ بھی خالی نہیں ہے حتیٰ کہ ذات الٰہی اور ذات نبوی ﷺ کے بارہ میں بھی اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے ہر اختلافی مسئلہ میں حکم حق اور صواب معلوم کرنا ضروری ہے۔ پس میری تحقیق میں حق اور صواب یہ ہے کہ بے نماز کافر و مشرک خارج از اسلام ہے اور دائمی جہنمی ہے۔ نہ اس کا نکاح کسی موحد مسلمان سے جائز ہے اور نہ اس کا جنازہ پڑھنا جائز ہے اور نہ اسلامی برتاؤ سلام وغیرہ جائز ہے اور نہ بے نماز' نمازی کا اور نہ نمازی' بے نماز کا وارث ہے اور نہ بے نماز کافر کی اولاد نابالغ کا جنازہ کرنا جائز ہے اور اس پر وہی تمام احکام نافذ ہیں جو کفار کے بارہ میں کتاب و سنت میں وارد ہیں۔

اب ہر ایک حکم کی دلیل کتاب و سنت سے ملاحظہ فرمائیں اور علماء اور ملاؤں' مولویوں کے اختلافات اور مذہب کو بالکل نظر انداز کر دیں کہ وہ کتاب و سنت کے دلائل کے مقابلہ میں بالکل لاشئی ہیں۔

اول یہ حکم کہ بے نماز کافر ہے اس کے دلائل یہ ہیں۔ حضرت بریدہ صحابی رضی اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث سنی کہ آنجناب ﷺ نے فرمایا : العھد الذی بیننا وبینھم الصلوۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ (رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم باسانید صحیحۃ) یعنی "اسلام کا وہ عہد جو ہمارے مسلمانوں اور کافروں کے درمیان طے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا' جو کافروں میں شمار ہے۔" علامہ نواب صدیق حسن رحمہ اللہ نے ھدیۃ السائل الی ادلۃ المسائل کے ص ۲۹ میں یہ لکھا ہے : ایں حدیث دلیل است بر کافر شدن تارک نماز۔ "کہ یہ حدیث بے نماز کے کافر ہونے پر دلیل ہے کہ وہ کافر ہے۔"

دوسری حدیث حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : بکروا بالصلوۃ فی یوم الغیم فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ) "کہ ابر والے دن نماز سویرے اول وقت پڑھو' کیونکہ جس نے نماز ترک کر دی

وہ کافر ہوا۔" یعنی ابر والے دن نماز میں سستی ہو جاتی ہے اس کا خیال رکھو کیونکہ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔

تیسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے متعلق احکام بیان کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: من حافظ علیها کانت له نورا وبرهانا ونجاة یوم القیامة "کہ جس شخص نے ہمیشہ نماز پڑھی اور اس کی حفاظت کی اس کے لئے قیامت کے دن یہ نماز روشنی اور اس کے ایمان کی دلیل اور دوزخ سے نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔" اور جس نے حفاظت نہ کی اور نہ ہمیشہ پڑھی کبھی چھوڑ دی کبھی پڑھ لی تو اس کے لئے نہ روشنی ہو گی' نہ دلیل ایمان کی اور نہ نجات کا ذریعہ اور معذب ہو گا قیامت کے دن ساتھ قارون اور فرعون اور ہامان اور ابی بن خلف کے۔ (رواہ احمد فی سننه وفی الزواجر وسنده جید والدارمی والبیهقی فی الشعب والطبرانی فی الکبیر الاوسط وابن حبان فی صحیحه وقال فی مجمع الزوائد رجال احمد ثقات)

اس حدیث سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو بے نماز کے کفر کو معمولی کفر اور بے نماز کو عملی کافر کہتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ بے نماز کا کفر اعلیٰ درجہ کا کفر ہے' جو منافی ایمان اور مخرج من الملة اور بے نماز فرعون اور ہامان وغیرہ کی طرح دائمی جہنمی ہے' اگر دائمی جہنمی نہ ہوتا تو ان اکابر کافروں کے ساتھ معذب نہ ہوتا۔

ایک حدیث میں یہ آیا ہے جو ترغیب میں ہے کہ ایک شخص قبیلہ قضاعہ کا آیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر میں لا اله الا الله اور محمد رسول الله کی گواہی دوں اور پانچوں نمازیں ہمیشہ پڑھوں اور رمضان کے روزے بھی رکھوں اور زکوٰۃ بھی ادا کروں تو میں کن لوگوں میں شمار ہوں گا؟؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من مات علی هذا کان مع الصدیقین والشهداء کہ جو شخص ہمیشہ ان عملوں پر قائم رہا حتیٰ کہ موت آگئی' تو وہ صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ شامل ہو گا پس ان دو احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ نمازی صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ جنت میں جائے گا اور بے نماز قارون' فرعون اور ہامان وغیرہ اکابر کافروں کے ہمراہ دوزخ میں ہو گا۔

بے نماز مشرک ہے' اس کی دلیل قرآن حکیم سے ہے۔ پارہ ۲۱' سورہ روم میں ہے:

واقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین۔ یعنی "نماز کی پابندی کرو اور تم مشرک نہ بنو۔" تفسیر حسینی میں ہے کہ نماز پڑھو اور نماز ترک کر کے مشرک نہ بنو۔ تفسیر حسینی میں تیسیر سے منقول ہے کہ شیخ محمد بن اسلم طوسی نے کہا کہ میں نے چاہا کہ حدیث مَن ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر کی موافقت قرآن کی کسی آیت سے ثابت کروں۔ پس میں نے کئی سال غور کیا تو یہ آیت اس حدیث کے مطابق پائی کہ اس آیت اور حدیث کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی نماز قائم نہ کی تو کافر اور مشرک ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ آیت کی تفسیر اس حدیث سے خوب ہوتی ہے' جو ابن ماجہ میں وارد ہے : عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیس بین العبد والشرک الا ترک الصلوۃ فاذا ترکھا فقد اشرک۔ (رواہ ابن ماجہ وصححہ) یعنی "فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ نہیں ملاپ بندہ اور شرک کا مگر ترک کرنے نماز سے جب نماز ترک کر دی تو وہ مشرک ہوا۔"

یہ حدیث آیت مذکورہ کی صحیح تفسیر ہے۔ چنانچہ دوسری روایت میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے' جو کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا کہ آپ فرماتے تھے : بین العبد وبین الکفر والایمان الصلوۃ فاذا ترکھا فقد اشرک۔ (رواہ ھبۃ اللّٰہ الطبری باسناد صحیح وقال اسنادہ علی شرط مسلم۔" یعنی "بندہ کے کفر اور ایمان کے درمیان حد فاصل نماز ہے' جب بندہ نے نماز ترک کر دی تو وہ مشرک ہو گیا۔"

علماء میں نواب حضرت علامہ صدیق حسن خاں مرحوم بھوپالی ہیں۔ وہ اپنی کتاب الدین الخالص ج ۱' ص ۱۶۹ میں فرماتے ہیں : ان عاقبۃ الشرک الخلود فی النار۔ یعنی "مشرک کا انجام جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے۔" ان دلائل سے ثابت ہوا کہ بے نماز مشرک ہے۔ اس حدیث سے متاخرین کی یہ تاویل بھی باطل ہوئی کہ شرک دون شرک مراد ہے' کیونکہ حدیث مذکورہ میں ایمان اور کفر کا ذکر مقابلہ کے طور پر ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ بے نماز کے بارہ میں کفر و شرک کا اطلاق متضاد ایمان ہے' کیونکہ قرآن میں اطلاق ایمان کا نماز پر وارد ہوا ہے۔ امام الدنیا فی الحدیث نے اپنی جامع صحیح بخاری میں یوں باب منعقد کیا ہے۔ باب الصلوۃ من الایمان وقول اللّٰہ تعالٰی وما کان اللّٰہ لیضیع ایمانکم یعنی

صلوتکم عند البیت۔ یعنی نماز ایمان میں داخل ہے' قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو ایمان فرمایا ہے۔ پس جس نے نماز چھوڑ دی اس نے ایمان کو چھوڑ دیا' تو وہ حقیقی معنوں میں کافر اور مشرک ہوا۔

امام نووی نے شرح مسلم ص۳۶ میں لکھا ہے: قال اللہ تعالی وما کان اللہ لیضیع ایمانکم اجمعوا علی ان المراد صلاتکم۔ یعنی "علمائے سلف وخلف کا اجماع ہے اس بات پر کہ آیت میں ایمان سے مراد صلوۃ ہے" پس بغیر نماز کے ایمان باطل ہے۔ جیسے مسلم کی حدیث قدسی میں فاتحہ پر صلوۃ کا اطلاق آیا ہے' کیونکہ فاتحہ نماز کا رکن اعظم ہے۔ اگر فاتحہ عمداً ترک کر دی تو نماز باطل ہے۔ پس اسی طرح جس نے عمداً نماز ترک کر دی اس کا ایمان باطل ہوا اور وہ مشرک و کافر ہوا۔

قرآن کریم سورہ مریم میں ہے۔ فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوۃ واتبعوا الشھوت فسوف یلقون غیا۔ یعنی "انبیاء کے بعد ایسے نالائق پیدا ہوئے کہ انہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور پیروی کی انہوں نے اپنی خواہش کی' پس داخل ہوں گے وہ جہنم میں۔" اس آیت سے بھی بے نمازوں کا مشرک ہونا اور دوزخی ہونا ظاہر ہوا کہ دنیا دار لوگ اپنی نفسانی خواہشوں کے تابعدار ہو کر نمازوں کے تارک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام متعلقہ نماز کو ترک کر دینا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کرنا یہ شرک ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہ ارشاد ہے: ارایت من اتخذ الھہ ھواہ۔ یعنی "اے ہمارے نبی! کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو اپنی نفسانی خواہش کے مقابلہ میں ٹھکرا دینا شرک ہے' کیونکہ پانچ نمازیں قائم کرنا اور ان کو ہمیشہ پڑھنا رکن اسلام ہے۔ تارک نماز نے اس رکن نماز کی پروا نہ سمجھی اور اپنے نفس کے تابع ہوا' یہ شرک ہے۔

حدیث میں آیا ہے: لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔ یعنی "کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے نفس کی خواہش کو اس شریعت کے تابع نہ کر دے جو میں خدا تعالیٰ کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔" اس آیت مذکورہ سے آگے یہ آیت ہے: الا من تاب وامن وعمل صلحا فاولئک یدخلون الجنۃ۔ "مگر جن لوگوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے (نمازیں پڑھیں) پس یہ لوگ جنت میں جائیں گے۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ نفسانی خواہشوں کے تابع ہو کر جنھوں نے نمازیں ضائع کیں وہ اسلام اور ایمان سے خارج ہوئے مگر جب توبہ کر کے از سرنو ایمان لائے اور نماز وغیرہ اعمال صالح کے پابند ہو گئے' تو وہ بہشت میں جائیں گے۔ اگر نمازوں کو ضائع کرنے والے مسلمان اور مومن ہوتے تو ان کو از سرنو ایمان لانے کی حاجت نہ ہوتی' صرف گناہوں سے توبہ کافی ہوتی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے مرض موت کے آخری وقت صحابہ کرام کے مجمع میں یہ ارشاد فرمایا : لا اسلام لمن ترک الصلوۃ "کہ جس شخص نے نماز ترک کر دی وہ مسلمان نہیں ہے" (وہ کافر ہے)۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صلوۃ میں امام ابن حزم سے یہ نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام عمر رضی اللہ عنہ' عبدالرحمن بن عوف' معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہم نے فتویٰ دیا ہے کہ : من ترک الصلوۃ فرضا واحدا متعمدا حتی یخرج وقتھا فھو کافر مرتد "جو شخص ایک نماز فرض عمداً چھوڑ دے کہ اس کا وقت چلا جائے وہ کافر مرتد ہے" اس روایت سے یہی ظاہر ہوا کہ بے نماز کافر و مشرک اور اسلام سے خارج ہے۔

چنانچہ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب الصلوۃ ص ۱۲ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اوصانا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لا تشرکوا باللہ شیئا ولا تترکوا الصلوۃ عمدا فمن ترکھا عمدا متعمدا فقد خرج من الملۃ (رواہ ابن ابی حاتم فی سننہ) یعنی "جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ وصیت کی کہ تم شرک نہ کرنا اور جان بوجھ کر نماز کو ترک نہ کرنا' کیونکہ جس نے نماز کو جان بوجھ کر قصداً ترک کیا' وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا" پس اس حدیث سے ان لوگوں کی تاویل باطل ہوئی جو یہ کہتے ہیں کہ کفر سے دون کفر مراد ہے یا کفران نعمت مراد ہے یا کفر عملی مراد ہے۔

اس حدیث کے صاف صریح الفاظ سے یہ ثابت ہوا کہ بے نماز کے بارہ میں جو احادیث وارد ہیں' جن سے کافر ہونا ثابت ہے' اس سے وہ کفر مراد ہے جو اسلام سے خارج کرتا ہے۔ اسی وجہ سے بے نماز اکابر کفار فرعون وغیرہ کے ساتھ شامل ہو گا جو اسلام سے خارج تھے۔ اسی وجہ سے بے نمازوں کے تمام اعمال صالح برباد ہیں کہ یہ شرک و کفر حقیقی ہے' مجازی نہیں ورنہ تمام اعمال صالحہ برباد نہ ہوتے۔

قرآن ناطق ہے : ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ یعنی "جس شخص نے ایمان

کے ساتھ کفر کیا اس کے تمام اعمال صالحہ برباد ہیں۔" ترغیب ص ۱۰۰ میں نماز کے بارہ میں یہ حدیث وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: من ترک صلوۃ متعمدا احبط اللہ عملہ یعنی "جس شخص نے جان بوجھ کر نماز ترک کر دی اس کے عمل کو اللہ تعالیٰ نے برباد کر دیا۔" اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو صحاح ستہ' بخاری' نسائی کتابوں میں موجود ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے من ترک صلوۃ العصر فقد حبط عملہ "کہ جس شخص نے عصر کی نماز ترک کر دی اس کے عمل باطل ہوئے۔"

طبرانی وبیہقی میں یہ حدیث ہے: من ترک الصلوۃ فکانما وتر اھلہ ومالہ۔ یعنی "جس شخص نے نماز چھوڑ دی گویا اس کا اہل وعیال' مال ودولت سب لٹ گیا۔"

پس ان احادیث سے ثابت ہوا کہ بے نماز کا کفر ویسا ہے' جیسا کہ آیت میں کفر وارد ہوا ہے جو موجب حبط اعمال ہے کہ یہ کفر ارتداد ہے۔ اس لیے اس کی سزا یہی دی ہے' جو مرتد کی ہے۔

مرقاۃ میں ملا علی قاری نے لکھا ہے: قال حماد وابن زید ومکحول والشافعی تارک الصلوۃ یقتل کالمرتد۔ یعنی "حماد' مکحول اور امام شافعی نے فرمایا کہ بے نماز کو مرتد کی طرح قتل کیا جائے۔"

قنیہ میں تاج الاولیاء نے فرمایا: قتل بالسیف لکفرہ "کہ بے نماز کو تلوار سے قتل کیا جائے کیونکہ وہ کافر ہے۔" اور یہ لکھا ہے کہ اس کا مال لوٹ کر بیت المال میں رکھا جائے اور اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اور صحابہ کا بے نماز کے کفر پر اجماع ہے۔

امام ترمذی نے اپنی جامع میں اور امام حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے: کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ کہ تمام صحابہ کرام بے نماز کے کفر پر متفق تھے۔

ترغیب ص ۱۰۰ میں ہے کہ ایوب تابعی نے کہا کہ بے نماز کے کفر میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب الصلوۃ کے ص ۱۲ میں لکھا ہے: وقد دل علی کفر تارک الصلوۃ الکتاب والسنۃ واجماع الصحابۃ۔ یعنی "بے نماز کے کافر ہونے پر قرآن اور حدیث اور اجماع صحابہ دلالت کرتے ہیں۔" پھر امام ابن القیم رحمہ اللہ نے قرآن سے آیت اور

احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ نقل کر کے اپنے دعویٰ کو ثابت کیا ہے کہ بے نماز کافر ہے۔
دیگر یہ کہ بے نماز کے بے دین اور کافر ہونے پر حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : لا دین لمن لا صلوۃ لہ انما موضع الصلوۃ من الدین کموضع الراس من الجسد۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط والصغیر) یعنی "بے نماز کا کوئی دین نہیں ہے اور نماز کا تعلق دین سے بمنزلہ سر کے ہے جسم سے۔" یعنی جس طرح کسی شخص کا سر اتار دیا جائے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا' ایسے ہی نماز ترک کرنے سے اس شخص بے نماز کا دین اسلام ختم ہو جاتا ہے۔
اسی حدیث کی بنا پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں آخری وقت یہ ارشاد فرمایا : لا حظ فی الاسلام لمن ترک الصلوۃ "کہ بے نماز کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔" اور دوسری روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یوں آئی ہے : الصلوۃ عماد الدین فمن ترکھا فقد ھدم الدین۔ (رواہ البیھقی) یعنی "نماز دین کا ستون ہے' جس نے نماز ترک کر دی اس نے اپنے دین کو ہدم کر دیا۔" انہی روایات کی رو سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ مذہب تھا کہ بے نماز کافر مرتد ہے۔ جو اسلام سے خارج ہے۔ کما تقدم
حضرت علی اور جابر رضی اللہ عنہما نے صاف لفظوں میں یہ فرمایا : من لم یصل فھو کافر۔ "کہ بے نماز کافر ہے" اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہ فرمایا : من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ یعنی "جس شخص نے نماز چھوڑ دی بیشک وہ کافر ہے" یہی مسلک ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے' وہ فرماتے ہیں : من ترک الصلوۃ فلا دین لہ "کہ جس نے نماز ترک کر دی اس کا دین اسلام نہیں۔" اور حضرت ابوداؤد صحابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا : لا ایمان لمن لا صلوۃ لہ ولا صلوۃ لمن لا وضوء لہ۔ یعنی "بے نماز مومن نہیں ہے اور وضو کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے۔"
امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الصلوۃ کے ص-۲۵۳ میں یہ لکھا ہے : فلا یسمی تارک الصلوۃ مسلما ولا مومنا۔ یعنی "بے نماز کو مومن اور مسلمان نہیں کہا جائے گا۔" اور ص-۱۰۰ میں یہ نقل کیا ہے کہ امام یحییٰ ابن معین نے حضرت عبداللہ بن مبارک رئیس التابعین سے پوچھا کہ لوگ (اہل رائے) یہ کہتے ہیں کہ جو شخص نماز نہ پڑھے اور روزہ نہ رکھے اور ویسے ان حکموں کا صحیح ہونے کا اقرار کرتا ہے' وہ مومن کامل ایمان والا ہے۔ تو

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارا یہ مذہب نہیں ہے۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ جو شخص بغیر کسی عذر کے نماز جان بوجھ کر ترک کر دے اور اس کا وقت چلا جائے فھو کافر وہ کافر ہے۔

حضرت ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اہلحدیث تھے۔ ان کا مسلک اہل رائے کوفیہ کے خلاف تھا۔ امام اسحاق بن راہویہ کی شہادت یہ ہے کہ تمام اہل علم کا عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمارے زمانہ تک یہ مذہب چلا آرہا ہے کہ جو شخص عمداً نماز کا تارک ہے وہ کافر ہے۔ مجھے حیرانگی اور تعجب ہے اس زمانہ کے اہلحدیث علماء پر کہ وہ اہل رائے کوفیوں کا مذہب اختیار کیے ہوئے ہیں کہ بے نماز مومن اور مسلمان ہے' لیکن گنہگار ہے۔ کافر خارج از اسلام نہیں کہتے اور بے نمازوں کا نکاح' جنازہ کر دیتے ہیں۔ البتہ علماء خاندان روپڑ اور علماء جماعت غربا اہلحدیث بے نماز کو کافر کہتے اور جانتے ہیں۔ نہ ان کا نکاح کرتے ہیں اور نہ جنازہ پڑھتے ہیں۔ جیسا بے نماز کے بارہ میں بحث ہو تو اہل کوفہ کے مقلدین کی طرح بے نمازوں کے وکیل بن کر مقابلہ میں آ جاتے ہیں۔ ملک میں بے نمازوں کی اکثریت مقلدین' اہل رائے اور نام نہاد اہلحدیث وکلاء کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ جب بے نمازوں کی تردید تحریراً یا تقریراً کی جائے' تو بے نمازوں کے وکلاء ان کی حمایت کریں گے۔ ان کو مسلمان اور مومن ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور جنتی بنائیں گے اور ایسے دلائل عامہ پیش کریں گے' جن کی رو سے مرزائی وغیرہ بھی مومن اور جنتی ثابت ہو جائیں گے' جو بالاتفاق کافر اور خارج از اسلام ہیں۔

جب کوئی عالم بے نماز کا جنازہ نہ پڑھے تو یہ بے نمازوں کے وکیل ان کا جنازہ پڑھ دیں گے۔ اس وجہ سے کوئی دائمی بے نماز بھی بغیر جنازہ کے دفن نہیں ہوا' حالانکہ بے نمازوں کے کافر اور مشرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے' کیونکہ بے نماز کا کفر' کفر بواح ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب الامارت ص ۳۱۹ میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں امیر کی اطاعت اور بیعت کا حکم ہے کہ امارت کے مستحق سے امارت نہ چھینیں گے مگر یہ کہ (الا ان تروا کفرا بواحا) ان میں کفر صریح دیکھیں جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعی دلیل موجود ہے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث بروایت عوف بن مالک اشجعی وارد ہے' اس میں اسی

مسلم کے سلسلہ میں یہ الفاظ وارد ہیں : قلنا یارسول اللہ افلا ننابذھم عند ذلک قال لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ "ہم نے کہا یا رسول اللہ کیا ہم اس وقت ان سے بیعت نہ توڑ دیں؟ فرمایا نہ جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں' نہ جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں۔"

پہلی حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ امیر نیک ہو یا برا ہر حال میں اس کی اطاعت کرو اور اس کی بیعت نہ توڑو' مگر یہ کہ قطعی دلیل سے اس کا صریح کفر ثابت ہو تو پھر اس کی بیعت توڑو' اس کا مقابلہ کرو اور دوسری حدیث میں یہ فرمایا ایسے امیر کی تابعداری بہرحال ضروری ہے۔ مگر یہ کہ نماز قائم نہ کریں تو ان سے علیحدہ ہو جاؤ اور ان سے جنگ کرو۔ دونوں احادیث میں استثنا سے حصر ثابت ہے تو ترک نماز کفر صریح ثابت ہوا اور ترک نماز کفر بواح ہے' ورنہ دونوں احادیث میں تعارض اور تضاد پیدا ہو گا جو سراسر باطل ہے۔ جب کہ ترک نماز پر کفر دیگر احادیث میں وارد ہو چکا ہے تو یہاں بھی ترک نماز کو کفر بواح قرار دینا ضروری ہے' تاکہ دونوں احادیث میں مطابقت قائم رہے۔

مشکوۃ کے حاشیہ پر لکھا ہے : وفیہ ان ترک الصلوۃ موجب لمنابذتھم ونزع الید من طاعتھم لان الصلوۃ عماد الدین والفارق بین الکفر والایمان بخلاف سائر المعاصی۔ (حاشیہ نمبرے' ص-۳۲۰) یعنی اس حدیث میں یہ ثبوت ہے کہ نماز ترک کرنا بیعت توڑنے اور اطاعت چھوڑ کر امیر کا مقابلہ کرنے کا موجب ہے' کیونکہ نماز اسلام کا ستون ہے' جو کفر اور ایمان کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ یعنی نماز پڑھتا ہے تو مومن ہے اگر نماز نہیں پڑھتا تو کافر ہے۔ دیگر گناہوں کا یہ درجہ نہیں ہے اور بے نماز کے کفر حقیقی ہونے پر یہ بھی ایک دلیل ہے کہ انسان کے تمام اعمال صالحہ کا قبول ہونا نماز پر موقوف ہے' جیسے کلمہ توحید پر موقوف ہے۔

علامہ ابن القیم کتاب الصلوۃ میں فرماتے ہیں : فقبول سائر الاعمال موقوف علی قبول الصلوۃ فاذا ردت ردت علیہ سائر اعمالہ یعنی "سب اعمال صالحہ کی قبولیت نماز کی قبولیت پر موقوف ہے' اگر نماز رد کی گئی تو اعمال رد کیے جائیں گے۔" چنانچہ اس کی دلیل میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے' جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن اول حساب نماز کا لیا جائے گا : فان صلحت صلح سائر عملہ وان فسدت فسد سائر عملہ

(رواہ الطبرانی فی الاوسط قال السیوطی صحیح) یعنی "اگر نماز درست ہوئی تو باقی اعمال بھی درست ہوں گے اور اگر نماز خراب نکلی تو تمام اعمال فاسد قرار دیے جائیں گے۔" اور دوسری روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فمن اداھا بحقھا قبلت منه وقبل منه سائر عمله ومن ردت علیه صلوته رد علیه سائر عمله۔ (رواہ البزار باسناد حسن) یعنی "جس شخص نے نماز کو کماحقہ ادا کیا اور وہ قبول کی گئی تو اس کے باقی اعمال بھی قبول کیے جائیں گے اور اگر نماز رد کی گئی تو تمام اعمال رد کیے جائیں گے۔" (ترغیب)

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اما ترکھا بالکلیة فانه لا یقبل معه عمله کما لا یقبل مع الشرک عمل۔ یعنی جو شخص نماز کا کلی طور پر تارک ہے تو اس کا کوئی نیک عمل قبول نہیں' جیسے مشرک کا کوئی عمل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں خارج از ملت اسلام ہیں۔

ترغیب ج ۱' ص ۳۲۶ میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا' وہ نماز پڑھ رہا تھا اور رکوع سجود پورے طور پر ادا نہ کرتا تھا۔ ٹھنگورے مارتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا: لو مات علی حاله هذا مات علی غیر ملة محمد صلی اللہ علیه وسلم۔ یعنی "اگر یہ شخص اسی طرح نماز پڑھتا ہوا مر گیا تو ملت محمدیہ ﷺ پر نہ مرے گا' بے دین ہو کر مرے گا" اس حدیث کے حاشیہ پر ایک عالم رحمہ اللہ نے لکھا ہے: لانه لایتم ارکان صلوته فبطلت فانهدم رکن من اسلام فخرج منه۔ یعنی "چونکہ وہ ارکان نماز پورے طور پر ادا نہ کرتا تھا تو اس کی نماز باطل ہو گئی۔ فرض ادا نہ ہوا تو اس سے اسلام کا رکن گر گیا۔ پس وہ اسلام سے خارج ہوا۔"

دوسری روایت ص ۳۳۷ میں ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو یہ فرمایا کہ لومات هذا لمات علی غیر ملة محمد صلی اللہ علیه وسلم۔ یعنی "یہ شخص اس حالت میں نماز پڑھتے ہوئے مر گیا تو ملت محمدی ﷺ پر نہ مرے گا اس سے خارج ہو کر مرے گا۔" ایک صحیح حدیث میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور رکوع سجود پورا نہ کیا' جب جانے لگا تو آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا: ارجع فصل فانک لم تصل۔ یعنی "اے شخص واپس لوٹ کر نماز پڑھ' تو نے نماز نہیں پڑھی۔" اس طرح تین دفعہ اس سے نماز پڑھوائی۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہوا کہ بے نماز کافر' مشرک' خارج از ملت اسلامیہ ہے اور اس کا کوئی نیک عمل قبول نہیں اور وہ فرعون'

قارون وغیرہ کے ساتھ دوزخ میں جائے گا اور وہ دائمی جہنمی ہے۔

قرآن میں ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے دریافت کریں گے کہ تم جہنم میں کیوں گئے' تو وہ یہ جواب دیں گے کہ لم نک من المصلین۔ "ہم بے نماز تھے۔"

نواب العلماء نے "ھدیۃ السائل" کے ص-۳۸۸ میں تارک نماز کے بارہ میں مالہ وما علیہ مکمل بحث کی ہے اور آخر میں یہ فیصلہ دیا ہے: نقول من سماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافرا سمیناہ کافرا ولا نزید علی ھذا المقدار ولا نتاول شیئا کہ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ نے کافر کہا ہے ہم بھی کافر کہیں گے' اس مقدار سے زائد کچھ نہیں کہتے اور ہم ان احادیث کی تاویل نہیں کرتے جن میں بے نماز کی تکفیر کی گئی ہے۔ اور یہ نقل کیا ہے: کان اصحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ اور فرماتے ہیں: ظاہر ازیں صیغہ آں است کہ ایں مقالہ مجمع علیہ صحابہ است۔ "یعنی صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ بے نماز کافر ہے۔"

منکرین کفر بے نماز کو اپنا بھائی بنانے کے جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ عام اور مجمل ہیں' جو دلائل خاصہ کے مقابلہ میں قابل استدلال نہیں ہیں کہ اصول کے خلاف ہے اور یہ طرز استدلال مرزائیوں کا ہے کہ وہ حیات و رفع مسیح کے دلائل کو نظر انداز کر کے عام دلائل موت مسیح پر پیش کرتے ہیں۔ مجدد ملت بریلویہ احمد رضا خاں بریلوی کو وہ اصول مسلم ہے۔ چنانچہ احکام شریعت حصہ اول کے ص-۴۹ پر لکھا ہے۔

"بعض جہل بدست یا نیم ملا شہوت پرست یا جھوٹے صوفی بادہ بدست" کہ احادیث صحیحہ مرفوعہ محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقع یا متشابہ پیش کرتے ہیں' انہیں اتنی عقل نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضعیف اور متیقن کے آگے محتمل محکم کے حضور متشابہ واجب الترک ہے۔

اسی طرح مولانا میر سیالکوٹی مرحوم نے اپنی کتاب "شہادۃ القرآن" حصہ دوم کے ص-۳۶ میں قاعدہ نمبر۱ میں لکھا ہے کہ کوئی امر کسی خاص دلیل سے ثابت ہو تو اس کے خلاف عام دلیل سے تمسک کرنا جائز نہیں۔

علمائے کرام کی تائیدات: میرے اس مسلک کی تائید کہ بے نماز کافر خارج از اسلام ہے دیگر علمائے کرام سے بھی پائی جاتی ہے۔ بندہ اس مسلک میں متفرد نہیں ہے۔ اگرچہ

صحابہ کرام کے ہوتے ہوئے کسی کی تائید کی ضرورت نہیں ہے خصوصاً حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کے فرمان کے ہوتے ہوئے کسی کی حاجت نہیں ہے۔

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطان جہاں با است امروز

تاہم عوام کی تسلی اور اطمینان کے لیے چند محققین علمائے عظام کی تائیدات پیش کرتا ہوں۔

تاج الاولیاء شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ: غنیۃ الطالبین میں ہے کہ بے نماز خواہ نماز کی فرضیت کا قائل ہو اور سستی اور غفلت سے نماز چھوڑ دے: کفر وقتل بالسیف لکفرہ۔ "وہ کافر ہوا' اس کو تلوار سے قتل کیا جائے۔" کیونکہ اس نے کفر کیا ہے۔ یکون مالہ فینا یوضع فی بیت المسلمین۔ "اور اس کا مال لوٹ کر مسلمانوں کے بیت المال میں رکھا جائے" لا یصلی علیہ ولا یدفن فی مقابر المسلمین۔ "کہ نہ بے نماز کا جنازہ پڑھا جائے اور نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے"

کشف الغمہ ص-۳ میں علامہ سید ابوبکر بن حسن بن اسد اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بے نماز کا حشر کفار کے ساتھ ہو گا۔ ایسے شخص کا جنازہ نہ پڑھنا چاہیے اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے "ترجمان القرآن" میں اور امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الصلوۃ میں تصریح کی ہے' بے نماز کافر ہے' اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔

جامع البیان کے حاشیہ پر عقیدہ صابونیہ مطبوع ہے جس میں مسلک اہلحدیث اور ان کے عقائد درج ہیں۔ ص-۲۹۵ میں یہ لکھا ہے۔ واختلف اھل الحدیث فی ترک المسلم صلوۃ الفرض متعمدا فکفرہ بذلک احمد بن حنبل وجماعۃ من علماء السلف واخرجوہ من الاسلام للخبر الصحیح بین العبد والشرک ترک الصلوۃ فمن ترک الصلوۃ فقد کفر۔ یعنی "اہلحدیث کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ مسلمان شخص عمداً نماز ترک کر دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ امام احمد اور علمائے سلف کی ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ وہ کافر ہوا اور اسلام سے خارج ہوا' کیونکہ صحیح حدیث میں یہ وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اور مشرک میں حد فاصل نماز ہے۔ اگر کسی شخص نے نماز چھوڑ دی تو وہ کافر ہوا۔" امام شافعی اور ایک جماعت سلف کی بے نماز کو کافر نہیں سمجھتے اور اس حوالہ

سے یہ ظاہر ہوا کہ امام احمد اور علمائے سلف کی ایک جماعت بے نماز کو خارج از اسلام کہتے ہیں۔ ازروئے دلائل یہی حق اور صواب ہے' باقی خطا ہے۔

علامہ محقق مولانا محمد عبدالرزاق حمزہ امام ثانی حرم مکہ شریف نے اپنی کتاب الصلوۃ ملحقہ کتاب الصلوۃ امام احمد و امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ میں تارک الصلوۃ کو احادیث نبویہ واقوال صحابہ نقل کر کے کافر مرتد ثابت کیا ہے۔ یہی ان کا مسلک ہے۔ اس کتاب کے ص ۹ پر حاشیہ مولانا ابراہیم نے لکھا ہے' اس میں وہ فرماتے ہیں :

قد تضافرت النصوص الصحیحة الصریحة فی کفر تارک الصلوة وخروجها من الملة یعنی "تارک الصلوۃ کے کافر ہونے اور ملت اسلامیہ سے خارج ہونے پر احادیث صحیحہ صریح وارد ہیں' جو ایک دوسری کی تائید و تقویت کرتی ہیں۔" پھر بعض احادیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں : کما ان الشهادتین شرط فی صحة الاسلام وهما من ارکان الاسلام ولا یقبل عمل الا بالاتیان بها ترک الصلوة لانها الرکن الاکبر الفعلی والاتیان بها شرط فی قبول الاعمال الاخری۔ یعنی جس طرح کلمہ شہادت اسلام کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے اور وہ رکن اسلام ہے اور اس کے بغیر کوئی عمل صالح قبول نہیں ہے۔ اسی طرح نماز بھی رکن اکبر فعلی ہے جس کا بجالانا اعمال صالح کے قبول ہونے کی شرط ہے' اس لئے اس کے ترک پر کفر کا اطلاق آیا ہے اور یہ کفر دیگر بعض اعمال صالحہ پر اطلاق کفر کا آج کی طرح نہیں ہے' کیونکہ اس کا ترک رکن اسلام کا ترک ہے۔

"مجموعۃ الرسائل والمسائل نجدیہ" کے ص ۳۷ میں تارک الصلوۃ کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے : وقال ابن رجب رحمه الله تعالى ظاهر كلام احمد وغيره من الائمة الذين يرون كفر تارك الصلوة ان من تركها يكفر بخروج الوقت عليه ثم استدل لذالك بالاحاديث التي فيها ذكر كفر تارك الصلوة۔ یعنی امام ابن رجب نے کہا کہ ظاہر کلام امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان ائمہ کا جو تارک الصلوۃ کو کافر کہتے ہیں' یہ ہے کہ جب نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔ جبکہ اس نماز کا وقت چلا گیا۔ پھر ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو بے نمازوں کے کافر ہونے پر دلیل ہیں۔

ہمارے پنجاب کے علاوہ مشاہیر میں سے حضرت العلامہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی مفتی پاک و ہند مشہور محدث رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں' نماز کا تارک کافر ہے۔ حدیث میں ہے :

من ترک الصلوۃ متعمداً فقد کفر۔ (ترغیب وترہیب ص۔۱۵) یعنی "جو دیدہ دانستہ نماز کا ترک کردے وہ اعلانیہ کافر ہے۔" جس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے اور جب کافر ہوا تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ (عبداللہ امرتسری از روپڑ ۱۵/ ذلقعدہ سنہ۔۵۳ھ منقول از فتاویٰ اہل حدیث ج۔۲' ص۔۴۸)

اور ص۔۴۹ پر بے نماز کے بارہ میں یہ لکھا ہے۔ بے نماز کا جنازہ نہ پڑھا جائے۔ جس کی دو وجہیں ہیں' ایک یہ کہ بے نماز کافر ہے اور کافر کی نماز جنازہ نہیں ہوتی۔ دوم بے نمازوں کو تنبیہہ ہو جائے گی جیسے خود کشی کرنے والے پر اور مقروض پر رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ حالانکہ خود کشی اور قرض سے ترک نماز بڑا گناہ ہے۔ پس اس کی وجہ سے بطریق اولیٰ نماز جنازہ ترک ہونی چاہئے۔

رہا بے نماز کی اولاد کا مسئلہ تو اس کے متعلق ظاہراً بحکم حدیث "هم من اباء هم" وہ اپنے باپوں میں سے ہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ نماز جنازہ نہ پڑھے کیونکہ کافروں کی اولاد ظاہری احکام میں ماں باپ ہی کے تابع ہیں۔ انتهى بقدر الحاجة۔

جناب مناظر اسلام حضرت العلام مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری بے نماز کے بارہ میں یہ فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ سائل نے سوال کیا کہ ہم نے گزشتہ جمعہ میں مولوی عبدالتواب صاحب غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک حدیث سنی کہ حافظ قرآن جنت میں بغیر حساب جائیں گے۔ اب وہ حفاظ جو تارک الصلوۃ ہیں ان کے لئے کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں یہ ارشاد ہے کہ تارک الصلوۃ کے لئے وہی حکم ہے۔ فقد کفر یہ حکم تو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔ (فتاویٰ ثنائیہ ج۔۱' ص۔۳۲۵) فقد کفر جملہ حدیث نبوی کا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ بے نماز کافر ہے پس جب تک وہ توبہ کرکے نمازی نہ ہو کافر رہے گا۔

اور ص۔۳۳۰ میں ایک سائل کا یہ سوال درج ہے۔

سوال : حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسلمانوں کو غیر رمضان میں ایک رکعت نماز پڑھنے کا ثواب رمضان المبارک میں ستر رکعت نماز پڑھنے کا ثواب ملتا ہے' تو زید تارک صلوۃ ہے اور دنوں میں کبھی بھول کر بھی ایک وقت کی نماز نہیں پڑھتا البتہ ماہ صیام میں ایک ماہ نماز پنجگانہ باجماعت مع تراویح کے پڑھتا ہے۔ جواب طلب ہے کہ زید بھی مذکورہ بالا حدیث کی روایت کے مطابق ستر گنا کا حق دار ہو گا یا نہیں؟

جواب : اس کا جواب مولانا مرحوم نے یہ ارشاد فرمایا۔ تارک نماز جب تک توبہ کر کے پابند نماز نہ ہو جائے۔ رمضان شریف کے ثواب موعودہ کا حق دار نہیں۔

اور ص ۵۵۶ میں ایک شخص کا سوال درج ہے کہ بے نماز کا نماز جنازہ پڑھا جائے یا نہ؟ اس کا جواب جناب مولانا فاضل امرتسری رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے۔ بے نمازی کے جنازہ کا سوال اس کے کفر کی فرع ہے۔ جن علماء کے نزدیک بے نماز کافر ہے' اس کی نماز جنازہ جائز نہیں سمجھتے۔ حضرت پیر صاحب بغدادی رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ بھی اسی گروہ میں ہیں اور جو اس کو کافر نہیں فاسق سمجھتے ہیں وہ نماز جنازہ جائز کہتے ہیں۔ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔ پہلے مذہب کی دلیل قوی ہے۔ اس کی تنبیہہ بھی ہے۔

جناب مولانا عبدالوہاب صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ہدایۃ النبی کے ص ۲۱ میں ارشاد فرماتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ مخبر صادق نے یہ فرمایا کہ جس آدمی نے نماز نہ پڑھی وہ کافر ہے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے نماز کو کافر جانتے تھے۔ قتل کرنے کا حکم شرعا بے نمازی کے لیے ثابت ہے۔ اس کا مال لوٹ لینا' خون بہانا ان سبھی کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ بے نمازی کی کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ بے نماز اس لائق نہیں کہ اس کا جنازہ پڑھا جائے یا اس کو مسلمان کے گورستان میں دفن کیا جائے۔ بلکہ بے نماز کا حشر فرعون' ہامان' قارون' ابی بن خلف کفار کے ساتھ ہو گا مگر یہ کہ فی الفور سنتے ہی توبہ کر لے' نماز پر مستعد ہو جائے۔

نیز یاد رہے کہ جو شخص کسی وقت کی نماز پڑھتا ہے اور کسی وقت کی چٹ کر جاتا ہے یا جمعہ پڑھتا ہے یا رمضان ہی میں پڑھتا ہے' تو وہ بھی بے نمازی ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں مرفوعا ثابت ہے کہ بے نماز مشرک ہے۔ طبرانی میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعا ثابت ہے کہ بے نماز کا کچھ دین نہیں ہے۔

نیز طبرانی وغیرہ میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مرفوعا ثابت ہے کہ بے نماز ملت دین اسلام سے خارج ہے اور قرآن فرقان میں رب العالمین فرماتا ہے کہ "بے نماز دوزخی ہے۔" اس طرح دیگر بہت سے علمائے کرام کی تائیدات ہیں۔ بندہ انہی پر ہی کفایت کرتا ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

محدث جلد ۸' شمارہ ۳ ذوالحجہ سنہ ۹۸ھ

بے نماز اور اس کی اولاد کے جنازہ کا حکم

عہد نبوی ﷺ اور عہد صحابہ ؓ میں کوئی مدعی اسلام تارک نماز نہ تھا اور نہ کوئی تارک نماز ان کے زمانے میں فوت ہوا' جس کے جنازہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کا ذکر آتا ہو۔ بعد قرون مقدسہ کے ایسے ناخلف اور نالائق پیدا ہوئے جنہوں نے نماز ترک کرنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اسلامی حکومت چلی گئی اور ملکوں میں طاغوتی حکومت قائم ہوئی' تو ملکوں میں بے نمازوں کی کثرت ہو گئی اور ان میں اسلام برائے نام رواجا رہ گیا اور شرعا رخصت ہوا۔ تب علماء میں یہ سوال پیدا ہوا کہ بے نماز کے جنازہ کا کیا حکم ہے؟

علماء میں چونکہ افتراق پیدا ہو کر فرقہ بندی ہو چکی تھی' اس لئے بے نماز کے جنازہ کا مسئلہ بھی مختلف آراء ہو گیا۔ جس مذہب میں ہر مدعی اسلام کلمہ گو کو مسلمان سمجھا گیا' خواہ وہ تارک ارکان اسلام ہو تو اس مذہب کے علماء نے بے نماز کا جنازہ جائز قرار دے دیا۔ خصوصا وہ مذہب جو اعمال کو ایمان کا جزو نہیں ٹھہراتا' بلکہ محض اقرار باللسان وتصدیق بالقلب کو ہی کامل ایمان سمجھتا ہے۔ جیسے کہ مرجیہ کہتے ہیں اور حنفیہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ بے نماز کا جنازہ جائز کہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی اپنی کتاب بوادر النوادر جلد اول ص۔۳۸۷ میں ایک وصیت نامہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اسی طرح اس میں لکھا ہے کہ تارک الصلوۃ کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں۔ یہ حکم حدیث کے صاف خلاف ہے : صلوا علی کل بر وفاجر۔ یعنی "ہر نیک اور برے شخص پر جنازہ پڑھو۔" چونکہ مقلدین اور ان کے ائمہ اہل رائے کو بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدیما وحدیثا علم حدیث سے شغل کم رہا ہے' اس لئے اختلافی مسائل میں جب یہ لوگ احادیث سے استدلال کرتے ہیں تو سخت غلطیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب نے جو امت حنفیہ کے حکیم تصور کئے جاتے ہیں' حدیث مذکورہ سے دلیل لانے پر دو طرح سے غلطی کی ہے۔

اول یہ کہ حدیث ضعیف ہے جس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ درایہ تخریج ہدایہ ص۔۱۴۷ میں لکھا ہے کہ امام دار قطنی نے فرمایا کہ اس روایت میں ایک راوی مکحول ہے' جو ابو ہریرہ ؓ سے روایت کرتا ہے۔ لیکن اس نے ابو ہریرہ ؓ سے سنا نہیں ہے۔ جب

مکحول کا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہ ہوا تو یہ روایت منقطع ہوئی جو قسم ضعیف ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے مولانا اشرف علی کا استدلال باطل ہوا۔

دوسری غلطی یہ کہ یہ درایۃً اس حدیث سے استدلال باطل ہے' کیونکہ حدیث میں لفظ فاجر آیا ہے جو بر کے مقابلہ میں ہے اس سے مراد گنہگار مسلمان ہے' کافر مراد نہیں ہے' کیونکہ کافر کا جنازہ بالا جماع جائز نہیں ہے۔ اب بے نماز کے جنازہ کا حکم اس مسئلہ کی تحقیق پر مبنی ہے کہ بے نماز کافر ہے یا مسلمان ہے۔ ہمیں کسی نص شرعی میں یہ حکم نہیں ملا کہ تارک الصلوۃ مومن یا مسلمان ہے۔ من ادعی فعلیہ البیان بالبرھان۔ ہاں تارک الصلوۃ کے کافر و مشرک ہونے پر دلائل کثیر وارد ہیں۔ چنانچہ ابن ماجہ میں ایک حدیث مروی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: فاذا ترکھا فقد اشرک یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز چھوڑ دے گا تو مشرک ہو جائے گا" اور صحیح ابن حبان میں یہ حدیث ہے ہے کہ ابر کے دن نماز سویرے پڑھا کرو۔ فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ "کیونکہ جس شخص نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔" اس جملہ میں لفظ فا تعلیلیہ یا سببیہ ہے کہ نماز کو ابر کے دنوں میں سویرے جلدی پڑھنے کی کوشش کرو' کیونکہ نماز چھوٹ گئی تو کفر لازم آجائے گا۔

اس طرح کفر اور شرک ہر دو کا اطلاق تارک نماز پر وارد ہوا ہے۔ اس لئے صحابہ کا اس پر اجماع ہے کہ بے نماز کافر ہے۔ مشکوۃ میں عبداللہ بن شقیق سے روایت آئی ہے: کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ۔ (رواہ ترمذی) یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سوائے نماز کے کسی عمل کے چھوڑنے کو کفر نہ سمجھتے تھے۔"

اس حدیث کی شرح مرعاۃ المفاتیح میں یوں ہے کہ اس حدیث میں لفظ اصحاب صیغہ جمع کا ہے جو لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ سب صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ بے نماز کافر ہے اور سب صحابہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب الصلوۃ میں ایوب تابعی سے نقل کیا ہے: قال ترک الصلوۃ کفر لا یختلف فیہ کہ بے نماز کے کفر میں کسی صحابی کا اختلاف نہیں ہے۔ پھر شرح مشکوۃ میں امام ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر اور عبدالرحمٰن بن عوف اور معاذ بن جبل اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہم سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ کہتے تھے کہ جس نے جان بوجھ کر ایک فرضی نماز چھوڑ

دی وہ کافر مرتد ہوا۔ صحابہ میں سے کوئی بھی اس عقیدہ کے خلاف کہنے والا نہیں پایا گیا بلکہ حضرت علی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے تو صاف لفظوں میں اعلان کیا: من لم یصل فھو کافر۔ "کہ جس نے نماز نہ پڑھی وہ کافر ہے"

علامہ عبید اللہ محدث مبارکپوری رحمہ اللہ نے کفر کی تاویلیں نقل کرنے کے بعد یہ اعتراف کیا ہے: والحق عندی ان تارک الصلوۃ عمدا کافر ولو لم یجحد وجوبھا لصحۃ الاحادیث فی اطلاق الکفر علیہ۔ یعنی حق بات یہ ہے کہ بے نماز کافر ہے۔ اگرچہ نماز کے فرض ہونے کا منکر نہ ہو' کیونکہ کفر کے اطلاق میں احادیث صحیحہ وارد ہو چکی ہیں۔ باوجود اس قدر قطعی ثبوت کے مولانا مبارک پوری نے دیگر علماء کی طرح لٹیا ڈبو دی اور یہ لکھا کہ اس سے مراد کفر دون کفر ہے۔

چنانچہ لکھا ہے: کفر غیرالکفر المخرج من الملۃ یعنی "اس کفر سے کم درجہ کا کفر مراد ہے جو ملت اسلامیہ سے تارک کو نہیں نکالتا ہے" نعوذ باللّٰہ من ھذہ العقیدۃ الفاسدۃ افسوس ہے مولانا نے باوجود محقق ہونے کے بعض علماء کی طرح ان احادیث پر غور نہ کیا جو بے نماز کو ملت سے خارج ظاہر کرتی ہیں۔

اول یہ مشکوۃ میں حدیث ہے کہ بے نماز فرعون' قارون وغیرہ اکابر کفار کے ہمراہ دن قیامت کے جہنم میں ہو گا۔ مولانا نے شرح میں لکھا ہے: ای کان معھم فی النار۔

دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار اور منافقین سے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ فمن ترکھا فقد کفر۔ جو نماز چھوڑ دے وہ کافر شمار ہو گا جب وہ کفار ملت سے خارج تھے تو جو حسب عہد نماز چھوڑے گا وہ بھی انہی جیسا کافر شمار ہو گا ورنہ عہد لغو ہو جائے گا پس یہ کفر مخرج ملت ہے۔

سوم یہ کہ کفر کے علاوہ بے نماز پر شرک کا اطلاق بھی ہوا ہے۔ جب کسی کے حق میں کفر اور شرک ہر دو لفظوں کا اطلاق ہو تو وہ مخرج ملت ہوتا ہے' فتذکرو۔

چہارم ایک حدیث بروایت طبرانی وابن ابی حاتم باسناد لا باس بہ وارد ہے: لا تترکوالصلوۃ عمدا فمن ترکھا عمدا متعمدا فقد خرج عن الملۃ یعنی "نماز کو جان بوجھ کر نہ چھوڑو کیونکہ جو شخص نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دیتا ہے وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے" اس حدیث میں صاف تصریح خروج ملت کی ہے۔ پس تاویل باطل ہوئی۔

پنجم یہ کہ اس میں وہ کفر مراد ہے جو موجب حبط اعمال ہے چنانچہ فرمایا آنحضور ﷺ نے من ترک صلوۃ العصر فقد حبط عملہ جس کفر سے عمل حبط ہوں وہ مخرج ملت ہوتا ہے۔

ششم یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ایسے امام اور خلیفہ ہوں گے کہ تم ان کو دشمن رکھو گے وہ تم کو دشمن رکھیں گے اور تم ان کو لعنت کرو گے وہ تم پر لعنت بھیجیں گے' وہ شریر امام ہوں گے۔ صحابہ ؓ نے کہا کہ یارسول اللہ! کیا ہم بیعت توڑ کر ان سے الگ نہ ہو جائیں؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا جب تک وہ نماز پڑھیں اس وقت تک بیعت توڑ کر ان سے الگ نہ ہونا۔

دوسری حدیث میں ہے: الا ان تروا کفرا بواحا یعنی "مگر یہ کہ صریح کفر دیکھو تو الگ ہو جاؤ" اس سے ثابت ہوا کہ ترک نماز کفر بواح ہے ورنہ حصر غلط ہو جائے گا۔ جب ترک نماز کفر بواح ہے تو پھر وہ مخرج بلاشبہ ہے۔

ہفتم یہ کہ بے نماز کے کفر پر صحابہ کا اجماع ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ کفر مخرج ملت ہے۔

یہ سات دلائل صریحہ ہیں کہ احادیث کفر بے نماز میں کفر دون نہیں بلکہ حقیقی کفر مراد ہے' جو ملت سے خارج کرنے والا ہے۔ اس لئے ایسے کافر مشرک کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ قرآن میں ہے: ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی (الآیۃ) یعنی "نبی کریم ﷺ اور اہل ایمان کے لئے یہ لائق نہیں ہے کہ مشرکوں کے لئے بخشش کی دعا کریں' اگرچہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔" دوسرے مقام پر یہ آیت ہے: ولا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ انھم کفروا باللہ ورسولہ وماتوا وھم فاسقون۔ (پارہ۱۰سورہ توبہ) یعنی "مت نماز جنازہ پڑھو ان میں سے کسی کا بھی اور مت کھڑے ہو ان کی قبر پر (دعا کیلئے) کیونکہ وہ کافر ہوئے ہیں ساتھ اللہ اور رسول کے اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ نافرمان اور بے حکم تھے۔"

ان دونوں آیتوں سے کافر و مشرک کے لئے دعا کرنا اور اس کا جنازہ پڑھنا ممنوع ثابت ہوا۔ بے نماز چونکہ بروئے احادیث صحیحہ واجماع صحابہ کافر و مشرک ثابت ہے۔ اس لئے وہ اس حکم ممانعت میں داخل ہے۔ یہی فتویٰ بعض اکابر علماء کا ہے' چنانچہ میزان شعرانی میں جمہور اصحاب احمد کا بھی یہی مذہب لکھا ہے: انہ یقتل بکفرہ کالمرتد ویجری علیہ احکام المرتدین فلا یصلی ولا یورث ویکون مالہ فیئا۔ یعنی "بے نماز کو کفر کی وجہ

سے مثل مرتد کے قتل کیا جائے اور اس پر مرتدوں کے احکام جاری کئے جائیں نہ جنازہ پڑھا جائے اور نہ ہی وارث کیا جائے بلکہ اس کا مال لوٹ لیا جائے۔"

اسی طرح غنیہ میں شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔

اسی اصول سے یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ بے نماز کی اولاد مر جائے تو اس کا جنازہ پڑھنا درست ہے یا نہیں۔ پس جن لوگوں کے نزدیک بے نماز مسلمان اور مومن ہے ان کے نزدیک تو اس کی اولاد پر نماز جنازہ جائز ہے اور جن کے نزدیک بے نماز کافر و مشرک ہے ان کے نزدیک اس کی اولاد صغار کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔

آنحضور ﷺ نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے اور فرمایا ہے: صلوا علی اطفالکم "کہ اپنے بچوں پر تم نماز جنازہ پڑھو۔" (ابن ماجہ) کسی حدیث یا اقوال سلف صالحین میں یہ واقعہ نہیں آیا کہ آنحضرت ﷺ یا صحابہ رضوان اللہ علیہم کسی مشرک یہودی' عیسائی وغیرہ کفار کے بچوں پر نماز جنازہ پڑھی ہو۔ باقی رہا یہ معاملہ کہ مشرکین کی اولاد جنت میں جائے گی اور وہ گناہوں سے معصوم ہیں اور ملت اسلامی پر پیدا ہوئے ہیں تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اخروی معاملہ ہے اور اس بارہ میں احادیث مختلف وارد ہیں۔ اصل فیصلہ یہ ہے جو امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین جلد۔۴' ص ۔۳۳ میں لکھا ہے: واتفق علیہ اهل الحدیث انهم یمتحنون یوم القیامة فمن اطاع دخل الجنة ومن عصی دخل النار۔ یعنی "کل حدیث اطفال مشرکین کے بارہ میں اس بات پر متفق ہیں کہ قیامت کو ان کا اللہ امتحان لے گا جو اس امتحان میں پاس ہوئے وہ جنت میں جائیں گے اور جو فیل ہوئے وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ اخروی معاملہ ہے۔ دنیا میں یہ قانون ہے کہ مسلمانوں کی اولاد مسلمان تصور کی جاتی ہے۔ ان پر مسلمانوں کے احکام نافذ ہوتے ہیں اور کفار مشرکین کی اولاد کافر و مشرک شمار ہوتی ہے۔ ان پر کفار کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔

ہدایہ جلد۔۱' ص۔۱۶۱ میں ہے: واذا صبی جنی مع احدا بویه ومات لم یصل علیه لانه تبع لهما۔ یعنی "اگر کفار کا بچہ اپنے والدین میں سے کسی کے ساتھ قید ہو کر دار الاسلام آگیا اور وہ مر گیا تو اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے گا" کیونکہ وہ اپنے والدین کے تابع اور ملحق

ہے۔" ہاں اگر رشد حاصل ہو اور وہ ایمان لے آیا تو پھر کفار سے لے کر اس کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ جیسے آنحضرت ﷺ مدینہ میں ایک یہودی کے گھر گئے' اس کا لڑکا بیمار تھا۔ آپ نے اس کی عیادت کی اور پھر اس کو تبلیغ کی تو وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد مر گیا تو آپ نے یہود سے اس لڑکے کی نعش کو لے لیا اور اس کا جنازہ پڑھا۔ اگر کفار کی اولاد ایمان نہ لائے تو کفار کے تابع سمجھی جائے گی۔

جیسے صحیح حدیث میں ہے کہ صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا کہ کیا ہم مشرکین کی اولاد کو موقع جنگ میں حملہ کرنے کے وقت قتل کر دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں۔ هم منهم کہ وہ انہی میں شمار ہیں۔ الغرض کفار کی اولاد کفار کے تابع ہے تو بے نماز کافر مشرک کی اولاد بھی اس کے تابع ہے۔ اس لئے بے نماز کی اولاد کا جنازہ بھی نہ پڑھنا چاہئے۔ ہاں مسلمان نمازی کی اولاد اس کے تابع ہے اس کا جنازہ پڑھنا چاہئے۔

ایک نصرانی عورت کسی مسلمان کے نکاح میں تھی' جس کو حمل ہوا اور وہ مر گئی' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کافرہ کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرایا' کیونکہ وہ مسلمان سے حاملہ ہوئی' اس کے شکم میں مسلمان کا بچہ تھا۔ یہ مناکحت شرعیہ سے ہوا اس لئے اس کا اعتبار کیا گیا۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ کفار کی اولاد کفار کے تابع ہے اس اصول کی بنا پر بے نماز کافر کی اولاد کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔ ہاں اگر توبہ کر کے مسلمان ہو جائے تو پھر اس کی اولاد کا جنازہ بھی جائز ہو جائے گا۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر حصاری

صحیفہ اہل حدیث

جلد نمبر ۴۲' شمارہ ۱۸' مورخہ ۲۱/ رمضان سنہ ۱۳۸۶ھ

نماز کے چور

پاکستان میں بے نمازوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن لوگوں کا اختراعی اصول یہ ہے کہ اکثریت کا فیصلہ نافذ اور اکثریت حق پر ہوتی ہے' تو پھر سب کو بے نماز ہو جانا چاہئے۔ لیکن یہ اصول غلط بلکہ باطل ہے۔ فرعون نے اپنے لشکر اور قوم کثیر کے گھمنڈ میں آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت کو یہ کہا تھا: ان ھؤلاء لشرذمة قليلون۔ "کہ یہ چند لوگوں کا گروہ تھوڑا سا ہے۔"

لیکن پھر یہ معلوم ہے کہ اس نافرمان باغی اکثریت کا انجام دنیا میں غرق اور آخرت میں نار ہوا۔ شیطان اور رحمان میں جو عہد آدم میں معاہدہ ہوا' اس میں شیطان کا عہد یہ تھا کہ میں اولاد آدم کو اپنی کوشش سے گمراہ کروں گا ولا تجد اکثرھم شاکرین۔ اکثریت اولاد آدم کی تیری نمک حرام اور باغی ہو گی جو تیری نعمتیں کھا کر ناشکری کرے گی۔ سجدہ نہ کرنے سے میں نمک حرام ہوا اور سجدہ والی عبادت سے میں ان کو روکوں گا۔ لاحتنکن ذریته الا قلیلا۔ "کہ میں اولاد آدم کو گمراہی سے ہلاک کروں گا مگر تھوڑے سے مجھ سے بچیں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : قال اذھب فمن تبعک فان جھنم جزاؤکم جزاء موفورا۔ یعنی "جاؤ جو کچھ کرنا ہو کرو۔ پس جو شخص تیرے تابع ہو گا تم سب کو جہنم کی سخت پوری پوری سزا دوں گا" اور یہ بھی قرآن میں ارشاد ہے : بل اکثرھم لا یعلمون الحق فھم معرضون۔ یعنی "اکثر لوگ حق نہیں جانتے بلکہ حق سے اعراض کرتے ہیں" اور ارشاد ہے : وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون۔ یعنی "اکثر لوگ مومن ہونے کے دعوے دار مشرک ہوتے ہیں" اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو یہ حکم فرمایا : وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ "اگر آپ زمین میں رہنے والے اکثر لوگوں کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو سیدھے راستے سے بھکا دیں گے۔"

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی نے اپنی کتاب حکایات اولیاء کے ص۔ ۳۴۳ پر لکھا ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی نے کہا کہ اگر سارے علماء میرے خلاف ہوں تو انشاء اللہ حق میری جانب ہو گا۔ اس کے حاشیہ پر مولانا اشرف علی نے یہ فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ مولانا کے نزدیک کثیر کے مقابلہ میں واحد حق پر ہو سکتا ہے۔

حدیث میں بھی آیا ہے کہ دن قیامت کے اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ فرمان دے گا کہ تیری اولاد میں سے ایک ہزار کا گروپ ہے۔ ایک شخص جنتی ہے باقی سب دوزخی ہیں' تو بے نمازوں کی اکثریت جہنم کا ایندھن ہیں' جب تک کہ توبہ کر کے نمازی نہ بنیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جنتی دوزخیوں سے دن قیامت کے یہ سوال کریں گے کہ تم جہنم میں کیوں پڑے ہو تو وہ یہ جواب دیں گے کہ لم نک من المصلین۔ کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے' بے نماز تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بے نماز دوزخی ہے۔

ایک طبقہ بے نماز پیروں کا ہے۔ جس کا ذکر فتاویٰ عبدالحی لکھنوی جلد دوم' ص۔ ۳۷۸

میں ہے کہ ایک شخص مولانا عبدالحی سے سوال کرتا ہے کہ اگر کوئی بظاہر نماز فرائض اور نوافل و عیدین اور جمعہ اور تراویح نہیں پڑھتا اور اعتکاف نہیں کرتا اور منہیات میں مشغول رہتا ہے یعنی رنڈیوں کا ناچ اور گانا اور غنا اور مزامیر سنتا ہے اور اجنبیہ عورتوں کے پاس خلوت میں بیٹھتا ہے اور باوجود ان تمام باتوں کے لوگ اسے ولی کامل اور غوث وقت سمجھتے ہیں۔ ہزاروں اس شخص کے مرید ہیں اور اس کے مرید کہتے ہیں کہ ہمارے پیر کو ظاہری نماز کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ ہمارا پیر باطنی نماز پڑھتا ہے اور اجنبیہ عورتوں کے پاس خلوت میں بیٹھنا ہمارے پیر کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ قواعد شرعیہ کی رو سے ایسا شخص ولی کامل اور غوث وقت ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب مولانا عبدالحی صاحب نے یہ دیا ہے کہ دینی اور دنیاوی دونوں کمال اتباع شریعت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جو شخص شرع کے سیدھے راستے پر نہیں وہ نہ ولی ہو سکتا ہے نہ غوث نہ قطب اور جو شخص کہے کہ مجھے ظاہری شریعت سے کچھ کام نہیں' میں ارباب باطن سے ہوں' تو وہ شخص زندیق ہے (یعنی بے دین) اور ایسے شخص کا معتقد اور مرید ہونا ہرگز درست نہیں ہے۔ (تا آخر) یہ لوگ شرع شریعت سے باہر اور راہ مستقیم سے ہٹے ہوئے اور مراتب علمائے شریف سے خارج ہیں۔ ایسے لوگوں اور ان کے متبعین کے لئے سخت ہلاکت ہے۔ کیونکہ یہ لوگ خدا کے راستے پر ڈاکے ڈالتے ہیں' حق کو باطل سے پوشیدہ کرتے ہیں اور دیدہ دانستہ سچ کو چھپاتے ہیں۔ یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ جو شرع کا پابند نہ ہو اس کی بیعت نہ کرنا چاہئے اور اس سے اعتقاد نہ رکھنا چاہئے' بلکہ وہ خود گمراہ اور خلق اللہ کو گمراہ کرنے والا ہے۔ اللہ ایسی باتوں سے ہم سب کو بچائے۔ (آمین)

اس سے ثابت ہوا کہ ایسے پیروں اور مریدوں کا گروہ بھی بے نماز ہے۔

ایک گروہ ملنگوں' مجاوروں کا ہے' جو بھنگ میں مست رہتے ہیں اور لوگ ان کو اللہ تعالیٰ کے درویش کہتے ہیں اور فقراء نام رکھتے ہیں۔ وہ بھنگ کو حلال جان کر پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

جنہاں بھنگ بوٹیاں وٹیاں
انہاں اللہ نال گلاں کیتیاں

اور کہتے ہیں ؎

نہ رکھ روزہ نہ مر بھوکا نہ جا مسجد نہ دے سجدہ
وضو کا توڑ دے کوزہ شراب شوق پیتا جا

یہ کہتے ہیں کہ لوگ فرش پر نماز پڑھتے ہیں اور ہم عشق الٰہی میں رہ کر عرش پر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ بالاتفاق کافر اور مشرک ہیں اور بے نماز ہیں۔

حکومت کے تمام شعبوں پر طائرانہ نظر کریں۔ محکمہ پولیس' کپتان' انسپکٹر' تھانے دار' حوالدار' جمعدار سپاہی وغیرہ لوگوں میں بے نماز اکثر ہیں اور نمازی اقل قلیل ہیں۔ محکمہ تحصیل میں پٹواری' قانون گو' تحصیل دار وغیرہ اور محکمہ عدالتوں میں مجسٹریٹوں' ججوں' کمشنروں' سیشن ججوں اور ہائیکورٹ کے ججوں وغیرہم میں نمازوں کے پابند نظر نہیں آتے۔ الا ماشاء اللہ کوئی قلیل حاکم عدالت نمازی ہو گا' ورنہ طبقہ حکومت میں اکثر بے نماز پائے جاتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہے' لیکن یہ پتہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کیا چیز ہے۔ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو اسلام کے قوانین اور احکام نافذ ہوتے۔ تب حکام خود ہی نمازی ہوتے اور تمام رعایا میں نماز کے احکام جاری کر کے سب کو نمازی بناتے۔

جیسا کہ قرآن میں حکم ہے : الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ یعنی "وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو وہ قائم رکھیں گے نماز کو اور ادا کریں گے زکوۃ کو اور حکم کریں گے اپنے ماتحتوں میں نیک کاموں کا اور روکیں گے گناہوں سے۔"

اس آیت میں لفظ مکنا کا وارد ہے۔ جس کے معنی تمکین اور اقتدار کے ہیں۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے : مکنا لیوسف فی الارض۔ "کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو مصر کی زمین میں حکومت بخشی" اور ذوالقرنین بادشاہ کی بابت سورہ کہف میں وارد ہے : انا مکنا لہ فی الارض۔ "کہ ہم نے ذوالقرنین کو زمین میں اقتدار بخشا۔"

حضرت یوسف علیہ السلام اور ذوالقرنین دونوں بادشاہ اپنے وقت میں ہوئے ہیں۔ ان دونوں نے اسلامی اصولوں پر حکومت کی تھی۔ اس طرح خلفاء راشدین کو اللہ تعالیٰ نے تمکین اور حکومت بخشی' تو انہوں نے بھی اس آیت کے چار حکموں پر عمل کیا کہ خود بھی نمازی بنے اور رعایا کو بھی نمازی بنایا اور دیگر امور صالحہ کا سب کو حکم دیا اور سب برائیوں اور علانیہ گناہوں کا انسداد کیا۔ لیکن حکومت پاکستان کے احکام جو اسلام کے دعویدار ہیں نہ خود احکام

اسلام کی پابندی کرتے ہیں اور نہ رعایا سے کراتے ہیں' حالانکہ ان کو اقتدار حاصل ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے جو مشکوۃ وغیرہ میں ہے کہ جو حکام کفر بواح کریں یا نماز نہ پڑھیں تو ان کی اطاعت نہ کرو۔ لیکن حکومت پاکستان اپنے تسلط سے جبری اطاعت کرا رہی ہے۔ شرعاً بے نماز قابل اطاعت نہیں ہے اور نہ فواحش سے نہ روکنے والے بلکہ گناہوں کے لائسنس اور دستاویز دے رہے ہیں اور نہ قوانین اسلامی نافذ کرتے ہیں تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکومت اسلامی ہے۔

پاک پتن میں ایک بہشتی دروازہ اختراعی ہے جو مال دولت کمانے کی بڑی دوکان ہے اس کا ایک الگ دروازہ ہے' جو سال کے بعد کھلتا ہے۔ اہل بدعت کے علماء اور عوام جہلا اس سے گزرتے ہیں' ہجوم بہت ہوتا ہے' سپاہی گزرنے والوں کو سوٹے مارتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ جو شخص اس دروازے سے گزرا وہ بہشتی ہو گیا۔ یہ عقیدہ سراسر باطل ہے۔ کتاب وسنت اور شرع محمدی کی کسی کتاب میں اس کا ذکر اور ثبوت نہیں ہے۔ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو اس کو روک دیتی جیسا کہ سعودی حکومت نے ایسے شرکیہ کاموں کا انسداد کر دیا ہے اور اب بھی امام حرم مکہ ان رسموں کو شرک قرار دے گیا ہے۔ جب لوگوں کا یہ عقیدہ اور عمل ہو گیا کہ بہشتی دروازے سے گزرے تو وہ بہشتی ہو گئے' وہ نماز روزہ کی پرواہ نہیں کرتے کہ عملوں کی اب ضرورت نہیں ہے' یہ سب لوگ بے نماز ہیں۔ اگر محض کسی دروازے سے گزرنے پر انسان بہشتی ہو جاتا تو قرآن حدیث نازل ہونے اور کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ پھر اب اگر دروازہ بنتا تو مکہ شریف اور مدینہ منورہ میں بنتا جہاں انبیاء اور اولیاء ہوئے اور اپنی مرقدوں میں پڑے ہیں۔ پاک پتن میں ایک چشتی بزرگ کی قبر پر کیا بنتا تھا۔ جس کی ولایت اور اسلام محض ظن ہے' پھر وہ بعد قرون مقدسہ کے ہوئے' جبکہ شریعت کے احکام سب مکمل ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ اختراع ہے۔

ایک گروہ عورتوں کا ایسا ہے جو فرض نماز کو بیٹھ کر پڑھتا ہے۔ یہ پنجاب کے دیہات میں اکثر رواج ہے۔ یہ سب بے نماز ہیں کیونکہ قیام نماز میں بالاتفاق رکن نماز ہے بغیر کسی شرعی عذر کے ساقط نہیں ہو سکتا۔ بیٹھ کر مرد اور عورتیں نماز پڑھنے والے سب بے نماز ہیں۔ نماز کسی کی نہیں ہوتی' کیونکہ وہ رکن کے تارک ہیں۔ اسی طرح سورہ فاتحہ اکیلا امام مقتدی جو لوگ عمداً نہیں پڑھتے ان کی نماز نہیں ہوتی کیونکہ متواتر حدیث سے سورہ فاتحہ کا رکن

نماز ہونا ثابت ہے اور نماز کی ہر رکعت کی سورہ فاتحہ رکن ہے جس کا تارک بے نماز ہے۔

جو لوگ تہ بند اور پاجامہ ٹخنے سے نیچے رکھ کر نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز بھی نہیں ہوتی' وہ بے نماز ہیں۔ عہد نبوی ﷺ میں ایک شخص نے تہ بند ٹخنہ سے نیچے کر کے نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے اس کو فرمایا کہ دوبارہ وضو اور نماز کا اعادہ کرے نماز اور وضو دونوں فاسد ہو گئے۔

سنہ ۱۹۵۷ء کو بندہ حصاری جب حج کرنے گیا تو مکہ مکرمہ میں پہاڑ کے قریب ایک مسجد تھی' جس کے نزدیک ہمارا رہائشی مکان تھا۔ بعض نمازیں ہم قافلے والے اس مسجد میں ادا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جماعت قائم ہے' امام نماز پڑھا رہا ہے اور اس کا اور اس کے تمام مقتدیوں کے پاجامے ٹخنوں سے نیچے تھے۔ میں نے اس امام کی اقتدا نہ کی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے امام صاحب کو مخاطب کر کے یہ کہا : یاایہا الشیخ قد فسد وضوء کم وفسدت صلوٰتکم۔ وہ میرے منہ کی طرف جھانکنے لگے' لیکن کسی نے کچھ نہ کہا۔ بندہ اپنی نماز میں مصروف ہو گیا۔ لوگ سب چلے گئے لیکن امام صاحب ایک دو لڑکوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ جب راقم السطور نماز سے فارغ ہوا تو وہ امام میرے قریب آکر کہنے لگے۔ یا شیخ بای دلیل ووجہ فسد وضوء نا وصلوٰتنا "کہ کس وجہ اور دلیل سے ہمارے وضو اور نماز فاسد ہو گئے تھے؟" میں نے کہا۔ ایہا الامام ھذا فی سنن ابی داؤد ولیس عندی ھذا الکتاب۔ اس نے ایک لڑکے کو بھیجا وہ اس کے گھر کے مکتبہ سے سنن ابوداؤد مع عون المعبود لے آیا۔ راقم الحروف نے کتاب الصلوٰۃ اور کتاب اللباس میں جو حدیث مسبل ازار والی تھی کتاب سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے دونوں مقام کی روایتوں کو غور سے پڑھا اور شرح میں اس کی اسنادی اور متنی تفصیل دیکھی تو جواب سے عاجز ہوا' کیونکہ اسناد صحیح اور مطلب حدیث کا شرح میں دعویٰ کے مطابق تھا۔ اس امام نے بہت خوش ہو کر میرے کندھوں پر ہاتھ سے تھاپ لگائی اور یہ کہا۔ جزاک اللہ یاشیخ مرحبا مرحبا۔

بہرکیف یہ بیماری اسبال ازار وپاجامہ کی سب ملکوں میں ہے جو بنفسہ ایک گناہ بھی ہے اور نماز میں ہو تو وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے علماء جو منکرین حدیث کے چھوٹے بھائی ہیں وہ فاسد نہیں کہتے اور احادیث کی فاسد تاویل کرتے ہیں۔ اس طرح

مولانا عبداللہ صاحب لکھنوی جو بیت اللہ کے باب العمرہ کے قریب وعظ کیا کرتے تھے' ان سے پوچھا گیا کہ حج تمتع میں حاجی کو حج کے احرام کے بعد صفا مروہ کی سعی کا کیا حکم ہے؟ وہ کہتے تھے کہ عمرو والی سعی ہی کافی ہے' حج کے لئے دوبارہ سعی نہیں ہے۔ ان سے تحریری مناظرہ ہوا' جس کا فیصلہ جناب حضرت تلمیذ الشیخ مولانا عبدالحق صاحب محدث ملتانی مرحوم سے کرایا گیا جو اس وقت حرم میں شیخ الحدیث تھے۔ الحمد للہ اس مسئلہ میں شیخ الحدیث نے بندہ حصاری کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ یہ بحث سنہ ۱۳۸۵ھ کے کسی صحیفہ میں مع فیصلہ شائع ہو چکی ہے۔ بے نمازوں کی فہرست اور تفصیل کے بعد اب بے نمازوں کی بابت حکم شرعی معلوم کریں اور پھر غور کریں کہ پاکستان میں مسلم آبادی کس قدر ہے۔

اسلام کا مفہوم سمجھنا ہے ضروری
اے شخص تجھے دعویٰ اسلام سے پہلے
دیکھے گا خدا کام کو انعام سے پہلے
ملتا نہیں کبھی انعام کام سے پہلے

بے نماز کا شرعی حکم: پہلے حضرت تاج الاولیاء شیخ مولانا عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔ غنیہ مترجم جلد دوم ص ۲۸ میں لکھا ہے کہ نماز ستون اسلام ہے۔ اس کے ضائع کرنے کے بعد نہ دین اور نہ اسلام باقی رہتا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا اول چیز جو تمہارے دین سے کم ہو گی' امانت ہے۔ (لوگ خیانت کریں گے) جابر بن عبداللہ نے روایت کی کہ رسول ﷺ نے فرمایا کافر اور مسلمان کے درمیان نماز فرق ہے اور عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ہمارے اور تمہارے درمیان ترک نماز کا تفاوت ہے۔ پس جس شخص نے نماز ترک کر دی وہ کافر ہے۔ صفحہ ۲۷ میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے ایک دن مسئلہ نماز کا بیان کیا کہ جس نے اپنی نماز کی حفاظت کی اس کے واسطے وہ نماز باعث روشنی قبر اور بہشت کی راہ روشن کرنے والی اور دلیل روشن اوپر ایمان کے وسبب رستگاری عذاب سے قیامت کے دن ہو گی اور جس نے محافظت نہ کی اس کے واسطے نہ روشنی نہ دلیل باعث رستگاری عذاب دوزخ سے اور قیامت کے دن اس کا ساتھ قارون' فرعون' ہامان' ابی بن خلف کے ہو گا

اور ص ۸۲۹ میں ہے' جو شخص نماز کو محض سستی وکاہلی کے باوجود فرض سمجھنے کے ترک کرے تو اس کو نماز کے وقت نماز پڑھنے کے لئے بلانا چاہیے۔ اگر وہ شخص باوجود بلانے نماز کے واسطے حاضر نہ ہو اور وقت تنگ ہو تو وہ کافر ہے۔ اس کو تلوار سے قتل کرنا اس وقت جائز ہے کہ تین دن تک توبہ اس سے کرائی جائے' وہ نہ کرے یہ دونوں حال میں مرتد کی مانند ہے۔ اس کا مال لوٹ کر بیت المال مسلمانوں میں داخل کریں اور اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جاوے نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں داخل کرنا چاہیے۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث جلد ۵۱' شمارہ ۲' مورخہ ۱۶ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۸ھ

مولانا ثناء اللہ صاحب مفتی امرتسری رحمہ اللہ کا فتویٰ اجتہادی

بابت تارک نماز اور اس پر محدثانہ نظر

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مناظر اسلام نے مئی ۲۷ کے پرچہ اہلحدیث میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ نماز ایمان میں داخل نہیں فرع ہے۔ (ص ۳) اور اس پر اپنی رائے سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ امنوا یقیموا الصلوۃ "یعنی اے نبی ﷺ ایمان دار بندوں کو کہہ کہ نماز قائم کریں۔" تقریر استدلال یوں ہے کہ اللہ نے اس آیت میں بندوں کو ایماندار قرار دے کر پھر نماز کا حکم دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ نماز ایمان میں داخل نہیں ہے۔ اس فتویٰ سے یہ معلوم ہوا کہ آپ عمل کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتے' ورنہ نماز تو سب عملوں سے بڑا عمل ہے۔ اس کو تو ضرور ہی ایمان میں داخل سمجھتے۔ جب آپ عمل کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتے تو ایمان کی کمی بیشی کے بھی قائل نہیں ہیں۔ پس یہ اہلحدیث کا مذہب نہیں ہے' بلکہ مرجیہ اور بعض حنفیہ کا ہے۔ پھر جب اخبار اہلحدیث مطبوعہ ۲۹ جولائی سنہ رواں میں کسی نے تعاقب کیا تو آپ فرماتے ہیں۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ جن کو خدا مومن کہے ان کو غیر مومن یا منافق کہوں۔(صفحہ ۳) یعنی محض اقرار وتصدیق توحید ورسالت وغیرہ کافی ہے اور وہ مومن ہے' عمل خواہ کرے یا نہ کرے' غیر مومن نہیں ہو سکتا۔ سو یہ مذہب اہلحدیث کے خلاف ہے اور اہل رائے کے مطابق ہے۔

چنانچہ اہلحدیث اور اہلسنت کی تعریف اس حدیث سے نکل جاتی ہے' جس میں یہ جملہ ہے : ما انا علیہ واصحابی۔ اب مولنا مفتی صاحب کا یہ فتویٰ دربار رسالت اور دربار صحابہ میں پیش کیا جاتا ہے۔

عمل ایمان میں داخل ہے یا نہیں؟: بعض فرقوں کا اعتقاد ہے کہ عمل ایمان میں داخل نہیں ہے' کیونکہ قرآن میں امنوا وعملوا الصلحات آیا ہے یعنی ایمان اور عمل جداجدا وارد ہیں۔ اس واسطے کہ معطوف اور معطوف علیہ مغائر ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض حنفیہ اور مرجیہ کا یہی مذہب ہے اور بعض متکلمین بھی اسی طرف گئے ہیں' حالانکہ عمل ایمان میں داخل ہے' بلکہ عمل کے سبب جنت ملے گی۔ لقولہ تعالیٰ تلک الجنۃ التی اورثتموھا بما کنتم تعملون۔ یعنی "بسبب عمل کرنے کے تم جنت کے وارث بنائے گئے ہو۔" دیگر جگہ قرآن میں حکم ہے : فلیعمل العاملون یعنی "چاہیے کہ عمل کریں' عمل کرنے والے۔" سورہ ذاریات میں فرمایا ہے : وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ یعنی "جن اور انس کو میں نے بندگی کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔"

بندگی تین قسم کی ہے۔ قولی' بدنی' مالی۔ سو یہ سب اقسام بغیر عمل کے ممکن نہیں ہیں۔ اگر عمل نہ کیا جائے تو عبادت نہ ہوگی' حالانکہ غرض پیدائش کی عبادت ہے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ اعراب نے امنا کہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا : انما المومنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ جو کہا گیا ہے' اس سے عمل میں داخل ثابت ہوا۔ گویا ایمان کے تین اجزاء اس سے ثابت ہو گئے۔ اقرار' تصدیق' جان ومال سے اللہ کی راہ میں کوشش کرنا' یعنی عمل۔ پس یہی اہلحدیث کا مذہب ہے۔ فتح الباری میں امام بخاری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ قال ما لقیت احدا منھم یختلف فی ان الایمان قول وعمل ویزید وینقص' انتھی۔ یعنی "میں ہزار سے زیادہ علماء کو شہروں میں ملا ہوں' کسی نے اس بات میں اختلاف نہیں کیا کہ ایمان قول وعمل ہے اور کم وبیش ہوتا ہے۔" فتح الباری کو غور سے ملاحظہ کریں۔ جملہ سلف صالحین کا یہی مذہب ہے۔

امام زہری عظیم الشان تابعی ہیں۔ مشکوۃ باب قسمۃ الغنائم والغلول فیھا میں ہے : قال الزھری فنری ان الاسلام الکلمۃ والایمان العمل الصالح' انتھی۔ یعنی "امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسلام کلمہ ہے اور ایمان عمل صالح ہے۔" امام بخاری رحمہ اللہ ودیگر محدثین

نے اپنی اپنی کتابوں میں مرجیہ فرقہ کا جو عمل کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتی' باب مستقل باندھ کر تردید کی ہے اور احادیث صحیحہ لا کر ثابت کیا ہے کہ عمل ایمان میں داخل ہے۔ چنانچہ بخاری میں عمر بن عبدالعزیز خلیفہ کا ارشاد ہے جو انہوں نے عدی بن عدی کی جانب لکھا تھا' یوں منقول ہے : ان للایمان فرائض وشرائع وحدودا وسننا فمن استکملھا استکمل الایمان ومن لم یستکملھا لم یستکمل الایمان "یعنی تحقیق واسطے ایمان کے اعمال مفروضہ ہیں اور عقائد دینیہ ہیں اور حدود ممنوعہ ہیں اور مسنون باتیں ہیں۔ پھر جو شخص ان کو پورا کرے اس نے ایمان کو پورا کیا اور جس نے پورا نہ کیا اس نے ایمان کو پورا نہ کیا۔"

یہی حدیث مرفوع میں وارد ہے۔ فرمایا آنحضور ﷺ نے الایمان بضع وسبعون شعبة والحیاء شعبة الایمان۔ "یعنی ایمان کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی شاخ ہے۔" ان شاخوں کی تعداد شعب الایمان اور فتح الباری میں ملاحظہ فرمائیں جو صحیح احادیث سے ثابت ہے اور بخاری شریف میں امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی آیتوں اور احادیث سے ثابت کیا ہے۔ مفصل بحث مطولات میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہلحدیث کا اس میں اتفاق ہے کہ عمل ایمان میں داخل ہے۔

<u>ایمان بڑھتا گھٹتا ہے یا نہیں؟:</u> اس سے یہ مسئلہ بھی متفرع ہوا کہ ایمان بڑھتا گھٹتا ہے یا نہیں؟ جو لوگ ایمان میں عمل داخل جانتے ہیں وہ تو کمی بیشی کے قائل ہیں' چنانچہ اہلحدیث کا یہی مذہب ہے اور جو لوگ عمل کو ایمان میں داخل نہیں جانتے' جیسے فرقہ مرجیہ اور بعض حنفیہ اور بعض متکلمین تو وہ بڑھنے اور گھٹنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ بلکہ جملہ انبیاء عظام واولیاء کرام ومومنین صالحین وفرشتگان کا ایمان اور فاسقین وفاجرین وتارکین ارکان اسلام جو زبانی کلمہ گو ہیں۔ ان کا ایمان یکساں جانتے ہیں۔ فقہ اکبر وغیرہ ملاحظہ ہو۔ اسی لیے شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے ایسے حنفیہ کو فرقہ مرجیہ میں شمار کیا ہے۔ قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ایمان کا کم وبیش ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سلف صالحین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے صاف منقول ہے کہ ایمان بڑھتا گھٹتا ہے' بلکہ سلف کا اس پر اجماع ہے' چنانچہ امام احمد کا فیصلہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اپنے رسالہ عقیدہ اہل سنت میں فرماتے ہیں : ھذہ مذاھب اھل العلم

واصحاب الاثر واهل السنة المتمسكين بعروتها المعروفين بها المقتدى بهم فيها من لدن اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم الى يومنا هذا وادركت من علماء الحجاز والشام وغيرهم عليها فمن خالف شيئا من هذه المذاهب او طعن فيها او عاب قائلها فهو مخالف مبتدع وخارج من الجماعة زائل عن منهج السنة وسبيل الحق فكان قولهم ان الايمان قول وعمل ونية تمسک بالسنة والايمان يزيد وينقص يستثني في الايمان غير ان لا يكون الاستثناء شكا انما هو سنة منقولة عن العلماء فاذا سئل الرجل امومن انت فانه يقول انا مومن ان شاء الله او مومن ارجو ويقول امنت بالله وملائكة وكتبه ورسله ومن زعم ان الايمان لا يزيد ولا ينقص فقد قال بقول المرجئة ومن زعم ان ايمانه كايمان جبرائيل اوالرسول صلى الله عليه وسلم اوالملائكة فهوجهمي ومن زعم ان الايمان قول بلا عمل فهو مرجئ۔ انتهى

(ص۔۳۰۳) یعنی منجملہ اہل علم اور اہلحدیث اور اہلسنّت کا جو کہ سنت کی رسی مضبوط پکڑنے والے ہیں اور اس کے ساتھ مشہور ہیں' جن کی اس بابۃ میں اقتدا اور پیروی کی جاتی ہے اصحاب رسول ﷺ سے لے کر آج تک یہ مذہب ہے اور اسی مذہب پر میں نے حجاز اور شام اور دوسری جگہ کے علماء کو پایا ہے۔ پس جو کوئی شخص ان عقیدوں میں سے کسی ایک کا بھی خلاف کرے یا اس پر طعنہ دے یا اس قائل پر عیب گیری کرے' وہ مخالف بدعتی اور اہلسنّت والجماعت اور اہلحدیث سے خارج ہے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ ایمان نام ہے قول اور عمل اور نیت اور عمل بالسنۃ کا اور ایمان میں انشاء اللہ کہہ سکتے ہیں اور یہ شک کے لئے نہیں ہوتا' بلکہ علماء سلف کا طریقہ ہے کہ جب کسی شخص سے سوال کیا جائے کہ تو مومن ہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ ہاں میں انشاء اللہ مومن ہوں یا مجھے امید ہے کہ میں مومن ہوں اور کہے کہ میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور جو شخص کہے کہ ایمان بڑھتا گھٹتا نہیں' اس نے مرجیہ کی بات کی اور جو شخص یہ کہے کہ اس کا ایمان جبرائیل یا رسول یا ملائکہ کے ایمان کے برابر ہے' وہ جہمی ہے اور جو شخص کہے کہ فقط قول کا نام ہے' بغیر عمل کے وہ مرجیہ ہے۔"

نیز ص۔۳'۴ پر فرمایا ہے : والمرجئة وهم الذين يزعمون ان الايمان مجردالتصديق وان الناس لا يتفاضلون في الايمان وان ايمانهم وايمان الملائكة

والانبیاء صلوات اللہ علیہم واحد وان الایمان لا یزید ولا ینقص وان الایمان لیس فیہ استثناء وان من امن بلسانہ ولم یعمل فھو مومن حقا ھذا کلہ قول المرجئۃ وھو اخبث الاقاویل انتھی۔ یعنی "مرجیہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اور لوگ ایمان میں ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتے اور ان کا ایمان اور فرشتوں اور نبیوں کا ایمان یکساں برابر ہے اور ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا اور ایمان میں انشاء اللہ نہیں کہہ سکتے اور جو شخص فقط زبان سے ایمان لائے' اگرچہ کوئی عمل نہ کرے' تاہم وہ پکا مومن ہے۔ یہ کل مرجیہ کا عقیدہ ہے اور یہ بڑا خبیث عقیدہ ہے۔"

نماز ایمان میں داخل ہے یا نہیں؟: اگر عمل داخل ایمان ہے تو نماز سب سے اول نمبر داخل ہو گی' کیونکہ یہ سب عملوں سے عظیم الشان ہے۔ جو بندہ اور کفر کے درمیان فرق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے نماز کو ایمان میں داخل قرار دیا ہے اور ثبوت میں آیت پارہ نمبر ۲ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم پیش کی ہے۔ جس کی حدیث براء سے تفسیر کی ہے کہ ایمان سے نماز مراد ہے۔ اب غور کریں کہ اس آیت میں نماز کو ایمان کیوں قرار دیا؟ دیگر علماء اہلحدیث تو یہی کہتے ہیں کہ نماز چونکہ ایمان کی جزو اعظم ہے اس لئے کل بول کر جزء مراد لیا گیا ہے۔ جیسے سورہ فاتحہ نماز کا جزا اعظم ہے کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس واسطے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قسمت الصلوۃ میں فاتحہ کو نماز قرار دیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فاتحہ کو ایمان کہہ سکتے ہیں' کیونکہ فاتحہ نماز ہے اور نماز ایمان ہے۔

نتیجہ صاف ہے کہ فاتحہ نماز ہے' کیونکہ اس میں تمام اجزا ایمان کا مجملاً ذکر ہے۔ جس کی تفصیل تمام قرآن ہے۔ اسی واسطے اس کو ام القرآن کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ صاف ارشاد ہے: انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم یتوکلون الذین یقیمون الصلوۃ ومما رزقناھم ینفقون اولئک ھم المومنون حقا۔ یعنی "مومن وہ لوگ ہیں جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈرتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ کرتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور مال خرچ کرتے ہیں' یہ لوگ سچے مومن ہیں۔" اس آیت میں مومنوں کی صفت اقامت نماز وغیرہ قرار دی گئی ہے۔

پارہ نمبر ۱۸ میں ہے: قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوتھم خاشعون۔ یعنی

"فلاح پائیں گے مومن جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔" اس آیت سے آگے ایمانداروں کے دیگر اعمال شمار کر کے پھر فرمایا : الذین ھم علی صلواتھم یحافظون۔ یعنی "وہ مومن نجات پائیں گے' جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔"

پس ان آیتوں میں نماز ہی کو دو دفعہ ایمانداروں کا وصف قرار دیا ہے۔ سورہ حجرات میں صاف وارد ہے : انما المومنون اخوۃ۔ یعنی "سب مومن بھائی بھائی ہیں" اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا : فان تابوا واقامو الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین۔ یعنی "اگر توبہ کر کے نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے بھائی ہیں۔" پہلی آیت میں جملہ مومنین کو بھائی قرار دیا ہے اور دوسری آیت میں توبہ اور اقامت نماز اور دینے زکوۃ پر اخوت کو معلق کیا ہے۔

اب صریح طور پر سنئے سورہ سجدہ میں ہے : انما یومن بایاتنا الذین اذا ذکروا بھا خروا سجدا وسبحوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون۔ یعنی "ہماری آیتوں پر وہی ایمان رکھتے ہیں کہ جب ان کو نصیحت ان آیتوں سے کی جائے' تو سجدہ میں گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح پڑھتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔" اور اس سے آگے پھر دوسری آیت بھی ملا لیں اور پھر سوچیں کہ ایمان کون سا معتبر ہے؟ اور ایماندار کی کیا صفت ہے؟ اور کیا بے نماز ایماندار ہو سکتا ہے؟

اب صریح سنئے حدیث وفد عبدالقیس میں یوں وارد ہے : قال اتدرون ما الایمان باللہ وحدہ قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ وصیام رمضان وان تعطوا من المغنم الخمس۔ (الحدیث) "آنحضور ﷺ نے دریافت کیا کہ جانتے ہو تم اللہ پر ایمان لانا کس طرح ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور رسول خوب جانتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز پڑھنا اور زکوۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور غنیمت کے مال سے پانچواں حصہ دینا۔" اس حدیث میں ایمان کی تعریف جو کی گئی ہے' اس میں اقامت نماز بھی داخل ہے اور یہی اسلام کی تعریف ہے۔ اسلام اور ایمان کا استعمال شرع میں عموماً ایک چیز ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے : لا یدخل الجنۃ الا نفس مسلمۃ۔ یعنی "جنت میں مسلمان ہی جائے گا۔" دوسری جگہ وارد ہے : لا یدخل

الجنۃ الا المومنون۔ یعنی "جنت میں مومن ہی جائیں گے۔"

نیز سنئے' آنجناب نے فرمایا کہ امنوا اور کفروا دو متضاد لفظ ہیں۔ یعنی جو لوگ مومن ہیں وہ کافر نہیں ہیں اور جو کافر ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔ سو جاننا چاہئے کہ بے نماز منطوق آیات قرآنی واحادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ کے کافر ہے اور آپ صاحبان جو بے نماز کو مومن بنانا چاہتے ہیں' اس کے ایمان پر کوئی دلیل نہیں رکھتے' جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ سب مفہوم ہے اور مفہوم پر منطوق مقدم ہوتا ہے۔ پس اب صریح حدیثیں سنئے

بے نماز کافر ہے: عن بریدۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول العھد الذی بیننا وبینھم الصلوۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ (رواہ اربعۃ) یعنی "بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اور ان (مشرکین) کے درمیان جو عہد ہے' وہ نماز ہے۔ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔" دیکھو یہ حدیث بے نماز کے کفر صریح پر دلیل ہے اور اس میں کفردون کفر کی تاویل بھی نہیں ہو سکتی' کیونکہ کفردون کفر کا عہد کرنا کافروں سے چہ معنی؟ عن انس رضی اللہ تعالی عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس بین العبد والشرک الا ترک الصلوۃ فاذا ترکھا فقد اشرک۔ (رواہ ابن ماجۃ) یعنی "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اور مشرک کے درمیان نماز چھوڑ دینے کا فرق ہے۔ جب نماز چھوڑ دے گا تو مشرک ہو جائے گا۔" یہ حدیث بھی صریح دلالت کرتی ہے کہ بے نماز مشرک ہے۔ یہاں بھی شرک دون شرک کی تاویل نہیں چلتی۔ عن بریدۃ الحصیب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکروا بالصلوۃ فی یوم الغیم فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ) یعنی "بریدہ حصیب سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بادل کے دن نماز جلدی پڑھا کرو' کیونکہ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا۔"

یہ حدیث بھی صاف دلیل ہے کہ بے نماز حقیقی کافر ہے مجازی نہیں۔ اصلی کافر ہے' نقلی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابر کے دنوں میں سویرے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور پھر اس کی علت بھی بیان کر دی کہ اگر نماز نہ پڑھی اور چھوڑ دی تو وہ کافر ہو جائے گا۔ نماز ایک ایسی عظیم الشان چیز ہے کہ جس کیلئے ابر کے دنوں میں بھی احتیاط کی گئی ہے اور اس کے سویرے پڑھنے کا حکم دیا کہ کہیں غفلت سے ترک نہ ہو جائے' کیونکہ ترک سے انسان کافر

ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں وارد ہے : من ترک صلوۃ العصر فقد حبط عملہ (او کما قال) طبرانی اور تاقی میں یوں وارد ہے۔ من ترک الصلوۃ فکانما وتر اهله وماله۔ اور اصفہانی نے اس طرح روایت کیا ہے : من ترک الصلوۃ متعمدا احبط اللہ عملہ۔ روایت نمبر ۱ میں عصر کی نماز چھوڑ دینے سے عمل کا بیکار ہو جانا ثابت ہوتا ہے اور حدیث نمبر ۲ سے ایمان اور عمل کا لٹ جانا ثابت ہوتا ہے' خواہ کوئی نماز چھوڑ دے۔ اسی طرح روایت نمبر ۳ سے ہر نماز کے چھوڑ دینے سے عملوں کی چھٹی ثابت ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جن احادیث میں بے نماز کو کافر کہا گیا ہے ان سے کفر دون کفر مراد نہیں ہے' ورنہ عمل حبط نہ ہوتے' کیونکہ حبطت اعمالهم فلا نقیم لهم یوم القیمة وزنا۔ تو حقیق کافروں کے حق میں وارد ہے۔ اگرچہ علاوہ کفر کے دیگر کبیرہ گناہوں پر بھی حبط عمل کی خبر ہے۔ جیسے نبی کی آواز پر آواز بلند کرنا' لیکن وہ ایک وقتی بات تھی۔ نیز ان پر اطلاق کفر کا نہیں ہے۔ فتامل

علاوہ ان دو احادیث کے اور سنئے : عن انس رضی اللہ تعالی عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیه وسلم اول ما یحاسب به العبد یوم القیمة الصلوۃ فان صلحت صلح له سائر عمله وان فسدت فسد سائر عمله۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط) یعنی "فرمایا پیغمبر ﷺ نے کہ پہلی چیز جس کا دن قیامت کو حساب کیا جائے گا وہ نماز ہے۔ پس اگر درست ہے تو سب عمل درست ہیں اور اگر خراب ہے تو سب عمل خراب ہیں۔

بزار نے باسناد حسن یوں روایت کیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز تین حصہ ہے۔ وضو ایک تہائی اور رکوع ایک تہائی اور سجدہ ایک تہائی۔ جس نے کما حقہ ادا کی اس کی قبول کی جائے گی اور اس کے باقی اعمال بھی مقبول ہوں گے' ورنہ نماز رد کی جائے گی اور اس کے تمام عمل بھی مردود ہوں گے۔

دیگر حدیث عن عبادۃ بن الصامت قال اوصانا النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال لا تشرکوا باللہ شیئا ولا تترکوا الصلوۃ عمدا فمن ترکها عمدا متعمدا فقد خرج عن الملة۔ (رواہ عبدالرحمن بن ابی حاتم فی سننه والطبرانی نحوہ باسنادین لا باس بهما) یعنی "کہا عبادہ ؓ نے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو وصیت فرمائی۔ پس فرمایا کہ مت شریک کرو ساتھ اللہ کے کسی شے کو اور مت چھوڑو نماز کو قصدا جان بوجھ کر۔ پس جس

نے چھوڑ دی نماز جان بوجھ کر وہ نکل گیا دین سے۔" غور کریں کہ جب بے نماز کو کافر' مشرک' بے دین اور باطل شدہ عمل والا قرار دیا گیا تو پھر وہ مومن کہاں رہا۔ جب امنوا اور کفروا ہر دو متضاد ہیں اور صحیح احادیث سے بے نماز کفروا میں داخل ہے تو پھر اس کو مومن قرار دینا حدیث بلکہ قرآن کے خلاف ہے۔

یہاں وہ حدیث بھی نقل کر دینا ضروری ہے کہ جس سے مولانا ابوالقاسم صاحب بنارسی نے اخبار محمدی میں بے نماز کے مومن ہونے پر استدلال پکڑا ہے۔ تو وہ یہی عبادہ سے مروی ہے : عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول خمس صلوات کتبهن الله علی العباد من اتی بهن لم یضیع منهن شیئا استخفافا بحقهن کان له عندالله عهدان یدخله الجنة ومن لم یات بهن فلیس له عندالله عهدا ان شاء علیه وان شاء غفرله۔ (احمد' مالک وغیرہ) یعنی "عبادہ بڑاٹھ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ پانچ نمازیں اللہ نے بندوں پر فرض کی ہیں۔ جس نے ادا کیا ان کو نہ ضائع کی ان سے کوئی چیز اس کا حق خفیف جان کر اس کے لئے عہد ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ کہ داخل کرے جنت میں اور جس نے ادا نہ کیا۔ ان کو پس نہیں عہد ہے چاہے عذاب کرے چاہے بخشے۔"

تقریر استدلال یوں ہے کہ کافر کی بخشش مطلقاً نہیں ہے۔ وہ دائمی جہنمی ہے اور بے نماز کے لئے بخشش کی امید ہے' کیونکہ وہ خدا کی مشیت میں ہے۔ پس وہ کافر نہ ہوا گنہگار مومن ہوا۔ سو واضح ہو کہ یہ استدلال مخدوش ہے۔ اس حدیث میں لفظ لم یات بهن محل استدلال ہے۔ پس اس میں دو احتمال ہیں' اول یہ کہ نفس نماز ادا نہ کرے' دوم یہ کہ کماحل علی وجه المطلوب شرعاً ادا نہ کرے' ورنہ استدلال باطل ہے۔

ہم اس حدیث میں احتمال ثانی کو متعین کرتے ہیں کہ مراد اس سے یہ ہے کہ کماحل علی وجه المطلوب شرعاً ادا نہ کرے گا اور نوافل سے اس کا تدارک بھی نہ ہو سکے۔ تب وہ مشیت ایزدی میں ہے۔ ہم اپنی توجیہ کے لئے انہی عبادہ بڑاٹھ کی دوسری حدیث پیش کرتے ہیں : عن عبادة قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول خمس صلوات افترضهن الله تعالی من احسن وضوئهن وصلهن لوقتهن واتم رکوعهن وسجودهن وخشوعهن کان له علی الله عهدان یغفرله ومن لم یفعل فلیس له علی

الله عهدا ان شاء غفرله وان شاء عذبه (ابوداؤد' بیہقی) "عبادہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا پانچ نمازیں اللہ نے فرض کی ہیں۔ جو شخص اچھا وضو کرے اور ان کو وقت پر پڑھے اور رکوع و سجود پورا کرے اور خشوع بھی پورا کرے اس کے واسطے نزدیک اللہ کے عہد ہے کہ بخشا جائے گا اس کو اور جس نے یہ نہ کیا پس نہیں ہے واسطے اس کے عہد نزدیک اللہ کے خواہ بخشے اور خواہ عذاب دے۔"

یہ حدیث عبادہ بڑھو کی پہلی حدیث کی تفسیر ہے کہ کامل نماز ادا نہ کرے گا تو مشیت الٰہی میں ہے۔ اگر احتمال اول لیا جائے تو عبادہ بڑھو کی اس حدیث کے جس میں فقد خرج عن الملة وارد ہے' خلاف ہو گا اور علاوہ اس کے ان احادیث کے بھی خلاف ہو گا' جس میں بے نماز کے کافر ہونے کی تصریح ہے۔ ہاں اس حدیث کی تفسیر کے لئے ایک حدیث اور بھی لیجئے' تاکہ مطلب بالکل صاف ہو جائے۔

ابن ماجہ ص ۱۰۲ باب ماجاء فی فرض الصلوة الخمس والمحافظة علیها میں اسی عبادہ بڑھو سے یوں مروی ہے : قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول خمس صلوت افترضهن اللّٰہ علی عباده فمن جاء بهن لم ینتقص منهن شیئا استخفافا بحقهن فان اللّٰہ جاعل له یوم القیامة عهدا ان یدخله الجنة ومن جاء بهن قد انتقص منهن شیئا استخفافا بحقهن لم یکن له عنداللّٰہ عهد ان شاء عذبه وان شاء غفرله۔ اس حدیث میں لفظ ومن جاء بهن ہمارے احتمال کی تائید کرتا ہے اور مولانا سیف بنارسی کی تردید کرتا ہے۔ بس یہی ایک صریح دلیل کچھ قدر مطلوب پر ہو سکتی تھی' جو مقصود ہو گئی' باقی سب مفہوم ہیں۔ اسی صفحہ ابن ماجہ میں حدیث قدسی وارد ہے۔ جس کے یہ الفاظ ہیں : وعهدت عندی عهدا انه من حافظ علیهن لوقتهن ادخلته الجنة ومن لم یحافظ علیهن فلا عهدله عندی۔ یعنی اللہ نے فرمایا جو ان نمازوں کی وقت پر محافظت نہ کرے اس کے لئے عہد بخشش کا نہیں ہے' جو محافظت کرے اس کے لئے ہے۔ الغرض اس حدیث عبادہ سے مطلقا نماز چھوڑنے پر مشیت مغفرت کی ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس شخص کے لئے ہے جو نماز کو وقت پر اچھی طرح ادا نہ کرے اور اس میں قصور کرے اور یہ بھی اس وقت ہے' جبکہ نوافل سے تدارک نہ ہو' ورنہ نوافل سے تدارک نقص کا کیا جائے گا۔

چنانچہ ابن ماجہ وغیرہ میں ہے: عن تمیم الداری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اول مایحاسب بہ العبد یوم القیمۃ صلوتہ فان اکملہا کتبت لہ تامۃ فان لم یکن اکملہا قال اللہ سبحانہ لملائکتہ انظروا ھل تجدون لعبدی من تطوع فاکملوا بہا ما ضیع من فریضۃ ثم توخذ الاعمال علی حسب ذالک (ص-۱۰۴) یعنی آنحضور ﷺ نے فرمایا' اول حساب نماز کا ہو گا۔ اگر بندے نے اس کو کامل ادا کیا تو پوری لکھی گئی' اگر کامل ادا نہ کیا تو اللہ فرشتوں کو حکم دے گا کہ میرے بندے کا نفل دیکھو اور اس فرض کو پورا کرو جو ضائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح دیگر اعمال (زکوۃ' حج' روزہ) کو لیا جائے گا۔

سبل السلام جلد دوم ص-۱۲ میں یہی روایت متصل ہے۔ اس کے آخر میں یہ جملہ ہے: فیوخذ ذلک علی فرائض اللہ وذلک برحمۃ اللہ وعدلہ فان وجدلہ فضل وضع فی میزانہ وقیل لہا ادخل الجنۃ مسرورا وان لم یوجد لہ شئی من ذلک امرت الزبانیۃ فاخذت بیدیہ ورجلیہ ثم قذف فی النار۔ (اخرجہ الحاکم) یعنی پکڑا جائے گا' یہ اوپر فرائض اللہ کے اور یہ بہ سبب رحمت الٰہی اور عدل اس کے ہے۔ پس اگر زیادہ اعمال (سنت مستحب وغیرہ) ہیں تو وہ ترازو میں رکھے جائیں گے اور اس کو حکم دیا جائے گا کہ خوش ہو کر جنت میں داخل ہو جاؤ اور اگر کوئی شے نہ پائی گئی (جو فرائض کی کمی پورا کرے) تو فرشتگان دوزخ کو حکم ہو گا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر دوزخ میں پھینک دو' حاصل کلام یہ ہے کہ جو شخص فرائض جن میں نماز اول نمبر ہے' پورا نہ کرے گا وہ مشیت الٰہی میں ہے عذاب کرے جیسے یہ حدیث بتا رہی ہے' یا بخش دے جیسے عبادہ کی حدیث کہہ رہی ہے۔ باقی رہا مطلقاً چھوڑ دینا' سو یہ کافر ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

بے نماز کے کافر ہونے پر صحابہ کا اجماع: اب بے نماز کے کفر پر صحابہ کرام اور دیگر سلف صالحین کا حکم سنئے۔

اگرچہ آپ صحابہ کرام کے اقوال کو شرع میں حجت نہیں سمجھتے (حالانکہ محدثین باب منعقد کر کے پہلے سلف صالحین کے اقوال نقل کرتے ہیں' تاکہ ثابت ہو جائے کہ یہ مسائل اسلام کے طبقہ اولیٰ مشہودلہا بالخیر میں معمول بہا چلے آئے ہیں اور اسی طرح کا حکم ان پر جاری رہا ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری وغیرہ) لیکن دیگر اہلحدیث جو حقیقی معنوں میں اہلحدیث ہیں اور ما انا علیہ واصحابی پر کامل عامل ہیں' وہ اب بھی مانتے ہیں کہ صحابہ کرام کا عمل

والتوفی بالخصوص جب کہ احادیث صحیحہ سے مؤید ہو چکا ہو ضرور قابل تسلیم ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام میں اخلاص اور اتباع سنت زیادہ تھی اور تقویٰ کامل تھا جن کی بابت قرآن نے شہادت دی ہے کہ اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوی۔ یعنی "جن کے دلوں کا اللہ نے تقویٰ میں امتحان کیا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ اللہ ان پر راضی ہوا اور وہ اللہ پر راضی ہیں۔ جزا یہ ملی۔ لھم مغفرۃ واجر عظیم ان کے لئے بخشش اور بڑا ثواب ہے' بدرجہا فائق ہیں' اس لئے ان کا قول معتبر ہو گا۔ چنانچہ بے نماز کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عن علی رضی اللہ تعالی عنہ قال من لم یصل فھو کافر۔ (رواہ ابن ابی شیبہ والبخاری فی تاریخہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: عن جابر رضی اللہ عنہ قال من لم یصل فھو کافر۔ (رواہ عبدالبر) معنی دونوں کا ایک ہے کہ جو شخص نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سید المفسرین جن کے حق میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ اللھم علمہ الکتاب' وہ فرماتے ہیں: عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ من ترک الصلوۃ فقد کفر (رواہ محمد بن نصر وابن عبدالبر) یعنی جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عن ابی الدردا قال لا ایمان لمن لا صلوۃ لہ ولا صلوۃ لمن لا وضوء لہ (رواہ ابن عبدالبر) یعنی "کہا ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہ جس کی نماز نہیں ہے اس کا ایمان نہیں ہے اور جس کا وضو نہیں ہے اس کی نماز نہیں ہے۔" اس حدیث سے بھی بے نماز کا بے ایمان ہونا ثابت ہوا اور اس میں لا نفی جنس کا شمار ہو گا نہ نفی کمال کا ورنہ وضوء کے بغیر بھی نماز درست ہو گی۔ کیا کوئی شخص بے وضو نماز پڑھنے والے کو نمازی کہے گا اور اس کی نماز کو کارآمد اور مقبول خیال کرے گا۔ اگر کوئی کرے تو اس کا فہم اس کے ساتھ ہے' لیکن شرع کا واقف کار عقلمند تو نہ کرے گا تو پھر بے نماز کو مومن کون عقلمند متقی کہے گا؟ فافھم۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو قرآن کا علم خوب جانتے ہیں: عن ابن مسعود قال من ترک الصلوۃ فلا دین لہ۔ (رواہ محمد بن نصر) یعنی "جس نے نماز چھوڑ دی اس کا دین نہیں ہے۔" یہ مضمون مرفوع احادیث میں بھی آیا ہے: عن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ولا صلوۃ لمن لا طھور لہ

ولا دین لمن لا صلوۃ لہ وموضع الصلوۃ من الدین کموضع الراس من الجسد (رواہ طبرانی) "آنحضور ﷺ نے فرمایا نہیں ایمان ہے اس شخص کا جس کی امانت نہیں ہے اور نہیں نماز اس شخص کی جس کا وضو نہیں ہے اور نہیں دین ہے اس شخص کا جس کی نماز نہیں ہے۔ نماز کا تعلق دین سے ایسا ہے جیسا کہ سر کا جسم سے۔ اسی واسطے جس شخص کو جان سے مار دینا ہو تو اس کا سر اتار دیتے ہیں' تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی زندہ نہیں کہتا اور نہ وہ زندہ رہتا ہے۔ پس اس طرح نماز کو چھوڑنے والا صاف کافر اور بے دین ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر روح ایمان باقی نہیں رہتا۔"

حضرت عمر بڑٹھ پر واقعہ شہادت گزرا ہے' تو آپ نے فرمایا: هل صلی الناس۔ "کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟" لوگوں نے کہا ہاں۔ آپ بڑٹھ نے فرمایا: لا اسلام لمن ترک الصلوۃ (وفی سیاق آخر) لا حظ فی الاسلام لمن ترک الصلوۃ۔ یعنی "اسلام میں کوئی حصہ نہیں اس شخص کا جس نے نماز چھوڑ دی۔" اسی لیے حضرت عمر بڑٹھ نے خود اسی نازک حالت میں نماز گزاری۔ ہر فرض کسی نہ کسی عذر سے ترک ہو سکتا ہے۔ لیکن نماز بجائی ہوش وحواس آنکھ کے اشارہ تک پڑھی جانی ضروری قرار دی گئی ہے۔ حضرت عمر بڑٹھ نے یہ فتویٰ صحابہ کرام کے مجمع میں دیا ہے جس پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ پس یہ دلیل اول اجماع کی ہے۔

(دوئم) قال الشیخ ابن القیم فی کتاب الصلوۃ قال ابو محمد بن حزم وقد جاء عن عمر وعبدالرحمٰن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی ہریرہ وغیرہم من الصحابۃ رضی اللّٰہ عنہم ان من ترک الصلوۃ فرضا واحدا متعمدا حتٰی یخرج وقتھا فھو کافر مرتد قالو اولا نعلم لھولاء مخالفا من الصحابۃ انتھی۔ یعنی "کہا ابن حزم نے کہ تحقیق عمر اور عبدالرحمٰن بن عوف اور معاذ اور ابوہریرہ وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ چلا آیا ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر ایک نماز چھوڑ دے کہ اس کا وقت نکل جائے' پس وہ کافر مرتد ہے اور صحابہ سے کوئی شخص اس کا مخالف معلوم نہیں ہوا۔"

سوئم دلیل یہ ہے کہ روایت کیا اس کو ترمذی نے عن عبداللّٰہ ابن شقیق العقیلی قال کان اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفرا غیر الصلوۃ۔ (رواہ الحاکم فی المستدرک صحیحۃ علی شرطھا) یعنی "عبداللہ بن

شقیق سے روایت ہے کہ کہا اس نے تھے اصحاب رسول نہ دیکھتے عملوں میں سے چھوڑنا کسی عمل کا کفر سوائے نماز کے" یعنی نماز چھوڑ دینا سب کے نزدیک کفر تھا۔ نماز کے سوا باقی عملوں کا ترک ان کے نزدیک حقیقی کفر نہ تھا۔ اس کے کفر دون کفر کی دلیل صاف طور پر باطل ہوئی' کیونکہ کفر دون کفر تو بے شمار عملوں میں وارد ہے' جو صحابہ کرام اور دیگر علما ان عملوں میں کہتے ہیں پھر حصر کا فائدہ ہوا؟ اس میں لفظ اصحاب جمع وارد ہے جو مضاف واقع ہے اور راوی نے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا ہے۔ جیسے مسئلہ رفع الیدین میں کان اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانما ایدیھم المراوح یرفعونھا الی آخرہ میں امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں : فلم یستثنی الحسن وحمید بن حلال احدا من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم دون احد' انتھی۔ یعنی "امام حسن وغیرہ نے کسی صحابی کو استثناء نہیں کیا۔ سب کو ہی رفع یدین کرنے والے قرار دیا" تو یہ رفع یدین پر اجماع صحابہ ہوا۔"

میں کہتا ہوں کہ رفع یدین کے بارہ میں تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے کوئی ٹوٹی پھوٹی روایت عدم رفع کی آئی ہے' بے نماز کے بارہ میں ایک بھی نہیں ہے' سوائے مفہوم مخالف کے' فتامل۔

چہارم دلیل اجماع کی یہ ہے : عن ایوب قال ترک الصلوۃ کفر لا یختلف فیہ (کتاب الصلوۃ لابن القیم) یعنی "ایوب تابعی فرماتے ہیں کہ نماز چھوڑنا کفر ہے کہ اس میں اختلاف نہیں کیا گیا۔" امام محمد بن نصر مروزی نے امام اسحاق سے سنا ہے۔ آپ شہادت دیتے تھے کہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تارک الصلوۃ کافر وکذلک کان رای اہل العلم من لدن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی یومنا ھذا ان تارک الصلوۃ عمدا من غیر عذر حتی یذھب وقتھا کافر' انتھی۔ یعنی "جناب رسول ﷺ خدا سے صحیح ہو چکا ہے کہ بے نماز کافر ہے اور جناب رسول خدا سے لے کر اب تک اہل علم کی یہی رائے رہی ہے کہ بے نماز جو بلا عذر نماز ترک کرے کہ اس کا وقت چلا جائے وہ کافر ہے۔" علاوہ ازیں تابعین اور محدثین سے بے نماز کا کافر ہونا صریح منقول ہے۔

الغرض نماز ایمان میں داخل ہے اور جو شخص نماز چھوڑ دے گا وہ کافر مرتد ہے۔ چنانچہ آیات قرآن و صحیح روایات اور سلف کے مقالات سے یہ امر بین طور پر ثابت ہو گیا ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہے' الا من سفہ نفسہ۔ اب جو دلائل بے نماز کے مومن ہونے پر

پیش کیے جاتے ہیں' وہ ایسے ہی بے مقصد ہیں۔ جیسے حنفیہ مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر عدم قرأت کے دلائل پیش کرتے ہیں' جن میں تقریب تام نہیں ہے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب کی دلیل اجتہادی: اب ذرا مولانا مفتی صاحب کی دلیل اجتہادی پر غور کرنا چاہیے۔ مولانا صاحب کی عادت مبارک ہے کہ کسی مسئلہ میں خواہ صریح حدیث اور اقوال صحابہ موجود ہوں' آپ ان سب کو چھوڑ کر کسی مجمل یا عام یا مطلق آیت سے مجتہدانہ استدلال ضرور فرمایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے اب آپ کو مجتہد پنجاب کا خطاب مل گیا ہے اور اسی وجہ سے اہل رائے مجتہد مشہور ہو گئے تھے' کیونکہ وہ بھی سارے کو سونا ثابت کرتے تھے۔ بہرحال مولانا صاحب کی پیش کردہ دلیل پر ناظرین غور فرماویں وہ یہ ہے: قل لعبادی الذین امنوا یقیموا الصلوۃ وینفقوا مما رزقنھم (الآیۃ) یعنی "اے نبی میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہ دے کہ وہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس سے خرچ کریں۔" اس آیت میں آپ نے یہ رائے نکالی ہے کہ اللہ نے بندوں کو ایماندار قرار دے کر پھر نماز کا حکم دیا ہے' اگر نماز ایمان میں داخل ہوتی' تو ایماندار قرار دے کر جدا حکم نہ کیا جاتا ہے۔ یہ ہے آپ کی رائے عالی جو بالکل غلط ہے اور ان کی فاضلیت کے نامناسب ہے۔

باوجود اہلحدیث ہونے کے اس قرآن دانی پر مجھے بہت تعجب آیا ہے کیونکہ قرآن مجید میں جابجا یایھاالذین امنوا کہہ کر اللہ تعالیٰ ایسے ایسے کاموں کا حکم فرماتا ہے کہ ایمان کی جڑ ہیں اور ایسے ایسے کاموں سے منع کرتا ہے جو ایمان کے سراسر منافی ہے۔ چنانچہ چند مقامات پیش کیے جاتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیں۔ سورہ صف میں فرمایا: یایھاالذین امنوا ھل ادلکم علی تجارۃ۔ یعنی "اے ایمان والو تم کو تجارت بتاؤں جو عذاب سے نجات دے۔" آگے فرمایا: تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم۔ (الآیہ) یعنی "وہ تجارت یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں' جانوں سے فی سبیل اللہ جہاد کرو۔" دیکھئے آیت اول میں ایماندار قرار دے کر دوم میں ایمان باللہ ورسول کا حکم ہو رہا ہے' تو کیا یہ جزو ایمان ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ایمان چیز کیا ہے؟ اگر ہے تو پھر جداگانہ حکم کیوں کیا جاتا ہے' جبکہ ایماندار قرار دیا گیا تھا۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا

اسی طرح قرآن مجید میں ایک جگہ یوں ہے: یایھاالذین امنوا امنوا دیکھئے ایماندار قرار

دے کر پھر ایمان کا حکم ہو رہا ہے۔ کیا دوسرا ایمان پہلے کی جز ہے یا غیر؟ اگر جز ہے تو پھر پہلے ایماندار کیوں قرار دیا گیا اور پھر ایمان کا حکم دیا گیا؟ ماھو جوابکم فھو جوابنا۔ اگر غیر ہے تو اس کی تفصیل مطلوب ہے۔

ایک جگہ قرآن میں سورہ حدید میں یوں ہے : یایھاالذین امنوا اتقوا اللہ وامنوا برسولہ۔ یعنی "اے ایماندارو اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔" پہلے ایماندار قرار دیا جا رہا ہے' پھر ایمان بالرسول کا حکم ہو رہا ہے۔ حسب قاعدہ مفتی صاحب معلوم ہوا کہ ایمان بالرسول اصل میں داخل نہیں فرع ہے' ورنہ ایماندار قرار دے کر پھر ایمان کا حکم نہ ہوتا۔ فتامل

ایک جگہ یوں ہے : یایھاالذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول۔ (الآیہ) ایماندار قرار دے کر پھر جداگانہ حکم اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کا ہو رہا ہے۔ کیا اطاعت اللہ اور اطاعت رسول ایمان میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر داخل ہے تو جدا حکم کیوں کیا گیا؟ جیسے قل لعبادی الذین امنوا یقیموا الصلوۃ (الآیہ) آپ کی پیش کردہ آیت میں ہے اگر اطاعت رسول داخل ایمان نہیں ہے تو آیت فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک۔ (الآیہ) یعنی "تیرے رب کی قسم کبھی مومن نہ ہوں گے' جب تک تجھے حاکم بنا کر فیصلہ تسلیم نہ کر لیں۔" اور آیت انما قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون۔ یعنی مومنوں کا قول سمعنا اور اطعنا ہے ان کا کیا مطلب ہے؟

یعنی اسی طرح قرآن میں ہے : یایھاالذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین۔ یعنی "اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ہمراہی ہو جاؤ۔" تو کیا تقویٰ اور صدق داخل ایمان ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو تمام دین کا صفایا ہو گیا اور احکام تقویٰ فضول ہوئے۔ اگر داخل ایمان ہیں تو وہی ایراد وارد ہوتا ہے۔

دیگر جگہ ہے : یایھاالذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین۔ یعنی "اے مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔" اب بتایئے دخول فی السلم جزو ایمان ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو خوب

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اگر داخل ایمان ہے تو وہی اعتراض ہے۔ ایک جگہ وارد ہے: یاایھا الذین امنوا آگے فرمایا ہے: فلا تتبعوا الھوی تو کیا اتباع ہوا منافی ایمان ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہی اعتراض کہ ایماندار قرار دے کر جدا نہی کیوں فرمائی؟ اگر نہیں تو افرأیت من اتخذ الٰھه ھواہ کا کیا مطلب ہے؟

اسی طرح وارد ہے: یاایھا الذین امنوا اتقوا اللّٰہ وذروا مابقی من الربو ان کنتم مؤمنین۔ کیا ترک ربوا جز ایمان اور کھانا سود کا منافی ایمان ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہی اعتراض ہے۔ اگر نہیں تو ان کنتم مومنین سے مشروط کیوں کیا گیا؟ کیا یہ فضول ہے؟ فافھم وتدبر ولا تکن من المعاندین۔

الغرض اس طرح قرآن مجید میں جابجا اللہ نے مومن قرار دے کر کئی ایک احکام بیان فرمائے ہیں جو ایمان کی جز بلکہ عین ایمان ہیں۔ پس مولوی ثناء اللہ صاحب مفتی امرتسری کا یہ خیال غلط ہے کہ ایماندار قرار دے کر پھر نماز کا حکم دیا ہے' تو اس سے ثابت ہوا کہ نماز ایمان کی جز نہیں ہے۔ جب نماز جز نہیں ہوئی تو انفاق مال بھی جز نہ ہوا۔ جو ینفقوا سے ثابت ہے' کیونکہ ہر دو لفظ آیت پیش کردہ میں یکے بعد دیگرے وارد ہیں۔ جب انفاق مال جز ایمان نہیں تو زکوٰۃ بھی ایمان میں داخل نہ ہوئی جس کے لئے حضرت ابوبکرؓ وغیرہ صحابہ نے لڑائی کا حکم جاری فرمایا تھا حالانکہ اللہ نے قرآن میں مومن کی یہ صفت قرار دی ہے: الذین یقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ وھم بالاخرۃ ھم یوقنون۔ یعنی "ایماندار وہ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔" اور مشرک کی یہ صفت بیان کی ہے: وویل للمشرکین الذین لا یوتون الزکوٰۃ وھم بالاخرۃ ھم کافرون۔ یعنی "جو مشرک زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے ساتھ بھی کافر ہیں' ان کے لئے ویل ہے۔"

اب ناظرین غور کریں کہ نماز زکوٰۃ داخل ایمان ہے یا نہیں؟ بہرحال یہ سب کچھ قلم فرسائی ناظرین کی خاطر کی گئی ہے' تاکہ وہ قرآن وحدیث کے احکام پر غور فرمادیں۔ ورنہ خواص اہل علم تو سب کچھ جانتے ہیں۔ ھذا ما عندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

(تنظیم اہلحدیث روپڑ' جلد ۱۵' شمارہ ۲۱' ۲۲ مورخہ یکم نومبر و یکم دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء)

شرعی نماز اور رسمی نماز

نماز دو قسم ہے۔ ایک شرعی اور دوم رسمی یا رواجی' شرعی نماز وہ ہے جس کا ثبوت شریعت محمدیہ میں ہے۔ مثلاً پانچ وقتی فرضی نماز جو عام طور پر مساجد میں اذان اور جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے جو شعائر اسلام ہے' جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔ یا نفلی نماز' جیسے نماز اشراق وچاشت' نماز تہجد' نماز حاجت' نماز استخارہ' نماز توبہ' تحیۃ الوضو' تحیۃ المسجد وغیرہ جو شارع ﷺ سے ثابت ہیں اور احادیث میں وارد ہیں اور ان کی کیفیت اور پڑھنے کے مسنون طریقے احادیث میں موجود ہیں۔ جس بھائی تبع سنت نے دیکھنا ہو وہ کتب احادیث ملاحظہ کریں۔

دوسری رسمی اور رواجی نمازیں ہیں' جن کا ثبوت نہ شارع ﷺ سے ہے اور نہ وہ احادیث میں وارد ہیں بلکہ وہ لوگوں نے اپنی طرف سے ایجاد اور اختراع کی ہیں اور اہل بدعت میں ان کا رواج ہو گیا ہے اور رسم پڑ گئی ہے اور عوام کالانعام انہیں شرعی نمازیں تصور کرنے لگے ہیں' حالانکہ شرع میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور ان کو شرعی سمجھنا ہی ان کے بدعت ہونے کی دلیل ہے' کیونکہ بدعت کی تعریف یہ ہے کہ: ان البدعة المذمومة هو المحدث في الدين من غير ان يكون في عهد الصحابة والتابعين ولا دل عليه الدليل الشرعي۔ (شرح مقاصد' كذا في كشف البزدوي) یعنی "بدعت سیئہ وہ چیز ہے جو دین میں نئی پیدا کی جائے اور دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو اور عہد سلف صالحین' صحابہ وتابعین میں اس پر تعامل نہ پایا جائے"

پس جو چیز شرع میں ثابت نہ ہو اور اس کو شرعی سمجھ کر کیا جائے تو وہی بدعت ہے کیونکہ بدعتی لوگ تمام بدعات کو کار ثواب اور شرعی کام سمجھ کر کرتے ہیں' حالانکہ شرع میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا' جب شرع میں ان کا ثبوت نہیں تو ان کے کرنے کا ثواب بھی نہیں ہے۔ چنانچہ مجمع البحرین کے مصنف نے اپنی شرح میں بیان کیا ہے اور صاحب مجالس الابرار نے اس کو نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے عید کے دن نماز سے پہلے عیدگاہ میں نفل پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو منع کیا۔ اس شخص نے کہا کہ اے امیر المومنین! میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے پر عذاب نہیں کرے گا' حضرت علی

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی کام پر ثواب نہیں دیتا جب تک کہ اس کو رسول اللہ ﷺ نے نہ کیا ہو' یا اس کے کرنے کی ترغیب نہ دی ہو۔ پس تیری یہ نماز عبث ہو گی اور عبث کام حرام ہے۔ پس شاید کہ تجھ کو اللہ اس پر عذاب کرے کہ تو نے اس کے نبی کا خلاف کیا' کہ انہوں نے کبھی عیدگاہ میں نفل نہیں پڑھے تھے۔

علاوہ بریں صلوٰۃ غوثیہ' صلوٰۃ فاطمہ' صلوٰۃ الاولیاء' صلوٰۃ العاشقین' بدعات میں داخل ہیں۔ شرع میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ الفیہ جو نوافل رجب میں پڑھی جاتی ہے اور اس کا ثواب ہزار نمازوں کے برابر شمار کیا جاتا ہے' یہ بھی صاف بدعت ہے' نہ شارع علیہ السلام نے اس کے پڑھنے کا حکم دیا اور نہ شرع میں اس کے ثواب دینے کا وعدہ کیا' یہ لوگوں کی قیاس کردہ ایجاد ہے اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اور سن سنا کر رواج سا بن گیا ہے۔

صلوٰۃ رجبی: اسی طرح صلوٰۃ رجبی ہے جو ۲۷ رجب کو پڑھی جاتی ہے اور اس دن روزہ بھی رکھا جاتا ہے۔ بعض رسمی حنفی یہ گمان کرتے ہیں کہ اسی رات رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوا تھا' اس لیے یہ نماز پڑھی جاتی ہے کہ اس کا بڑا ثواب ہے۔ اول تو معراج کے متعلق مہینوں میں اختلاف ہے' چنانچہ مہینہ کی تعیین کے متعلق ارباب سیر کے پانچ اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ ربیع الاول میں ہوا' دوم یہ کہ ربیع الآخر میں ہوا' بعض نے کہا رجب میں ہوا' بعض نے کہا رمضان میں ہوا' بعض نے کہا کہ شوال میں۔ پھر صحیح دن اور تاریخ کا پتہ لگانا اور بھی دشوار ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جبکہ تاریخ اور سن کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ ہاں یہ قرآن سے ثابت ہے اور حدیث سے واضح ہے کہ رات کا وقت تھا جبکہ معراج ہوئی' اب ان پانچ اقوال کے مطابق پانچ نمازیں پڑھنی چاہئیں۔ ربیعی' رجبی' رمضانی' شوالی وغیرہ۔

دوم تاریخ کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۱۲ ربیع الاول' بعض نے کہا کہ ۲۷ رجب تھی۔ سوم جس نبی کو معراج ہوا' نہ اس نے یہ نماز پڑھی اور نہ پڑھنے کا حکم دیا' من ادعی فعلیه البیان۔ چہارم نہ صحابہ کرام اور تابعین نے صلوٰۃ رجبی یا صلوٰۃ المعراج پڑھی۔ پنجم نہ ائمہ اربعہ اور فقہاء عظام اور محدثین کرام نے پڑھی اور نہ اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا۔ پس اس کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

صلوٰۃ الرغائب: اسی طرح صلوٰۃ الرغائب ہے کہ یہ نماز بھی رجب کی ۸ تاریخ کو

پڑھی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معراج میں پچاس نمازوں کا حکم ہوا تھا' پھر بعدازیں کی معافی ہوئی اور پانچ کا حکم رہا' لہٰذا شکرانہ واجب ہے' اس لیے یہ نماز بطور شکرانہ کے پڑھی جاتی ہے۔

یہ نماز بھی رسمی اور رواجی ہے' شرعی نہیں ہے۔ شرع میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر اس شکریہ میں یہ نماز مشروع ہوتی تو سب سے پہلے سید الانبیاء صاحب اسرار محمد مصطفیٰ ﷺ پڑھتے جن کو معراج ہوئی تھی۔ پھر صحابہ کرام کو یہ نماز پڑھنی چاہیے تھی' جنہوں نے معراج کا قصہ سنا اور اس پر ایمان لائے اور یقین کیا' بعد ان کے تابعین' تبع تابعین' ائمہ دین' محدثین کو پڑھنی چاہیے تھی' جو ہم سے اور تم سے زیادہ متبع شریعت اور شکرگذار تھے جب انہوں نے یہ شکرانہ کی نماز نہ پڑھی تو پھر بعد کے لوگوں کو اس طرح شکرانہ ادا کرنے کی تعلیم کس نے دی؟ وحی الٰہی تو بند ہو گئی تھی اور شریعت الٰہی مکمل ہو چکی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ یہ قیاسی ایجاد ہے' شرعی نہیں ہے' لہٰذا بدعت اور گمراہی ہے۔

جو عبادات حضور ﷺ کے روبرو عمل میں لائی گئیں ہیں اور آپ کے مبارک زمانہ میں ان کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو آنجناب ﷺ سے سیکھا اور صحابہ سے ان کے شاگردوں تابعین نے دیکھا' علی ہذا القیاس۔ وہ اسلام میں مروج چلی آئی ہیں' وہ تو مشروع ہیں۔ مثلاً رمضان میں روزہ رکھنا اور جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھنا ابتداء اسلام سے آج تک ہر ایک مسلمان ان کو دیکھتا چلا آیا ہے' ان میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہو سکتا کہ روزہ رمضان کی بجائے ربیع الاول یا شعبان میں رکھا جائے اور نماز جمعہ سنیچر (ہفتہ) کو پڑھی جائے' تواتر عملی بھی اسلام میں ایک زبردست دلیل ہے۔ معراج کے متعلق برسوں اور مہینوں اور تاریخوں کے اختلاف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد نبوی اور زمانہ سلف میں معراج شریف کے نام سے کوئی عبادت یا تقریب منانے کا کوئی اہتمام نہ تھا جس میں خورد ونوش یا لباس یا کوئی عبادت کسی خاص مہینے' خاص دن یا رات میں ادا کی جاتی ہو۔ اگر کوئی خاص عبادت معراج کے نام سے کسی مہینہ یا تاریخ میں مشروع اور مروج ہوتی اور اس کا خاص اہتمام کیا جاتا جیسا کہ اب اہل بدعت کر رہے ہیں تو یہ ناممکن تھا کہ معراج شریف کے متعلق اس قدر اختلاف ہوتا' جس قدر کہ اختلاف روایات سے ثابت ہوتا ہے۔

امت محمدیہ میں کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جسے آنحضور ﷺ کی اس عزت افزائی

سے فرحت و مسرت نہ ہو جو آنجناب کو معراج کی رات میں دربار الٰہی میں نصیب ہوئی ہے۔ لیکن اس خوشی کے اظہار کا وہ طریقہ بھی پسندیدہ نہیں ہے جس پر عدالت محمدیہ کی مہر ثبت نہیں ہے اور یہ تصدیق نہیں ہے کہ یہ طریقہ تمہارے لیے جائز ہے اور یہ عبادت تمہارے لیے موجب ثواب ہے۔ اس زمانہ پرفساد اور پرفتن میں جو شب معراج ۲۷۔ رجب کو منائی جاتی ہے' رنگا رنگ کھانے پکائے جاتے ہیں اور رنگین کاغذوں کی جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں اور آتشبازی چلائی جاتی ہے' رات کو درودیوار پر چراغاں کیا جاتا ہے' صلوٰۃ رغائب پڑھی جاتی ہے۔ ۲۷' ۲۸ کو بہت خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور پھر اس بدعت اور گمراہی اور اسراف اور تبذیر کو عبادت الٰہی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ باطل اور اس پر عمل گناہ عظیم ہے اور شر الامور میں داخل ہے۔

اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں عرب کے جہلاء کا یہ دستور تھا کہ ماہ رجب میں عتیرہ کی رسم کیا کرتے تھے اور اس کو رجبیہ کہتے تھے' جس کو خاتم النبیین ﷺ نے مراسم نازیبا کی تردید کرتے ہوئے ولا عتیرة فی الاسلام کہہ کر اس رجبیہ کو بھی مٹا دیا۔ اگر اس کی بجائے کچھ اور مشروع ہوتا کہ صلوٰۃ الرغائب پڑھ لو یا صلوٰۃ رجبی ادا کر لو تو آپ اس کا حکم دے دیتے لیکن آپ نے ایسا نہ کیا بلکہ رجبیہ کو بالکل مٹا دیا تو اب کفار اور جہلاء عرب کی مشابہت پیدا کرنے کے لیے رجبی قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ جلد ۹' شمارہ ۳۹' مورخہ ۲۱/ اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء

عبادت واستعانت لغیر اللہ --- صلوٰۃ غوثیہ

تمام اہل اسلام کے نزدیک یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ عبادت کے تمام اقسام لسانی' بدنی' مالی معبود حقیقی کے ساتھ خاص ہیں۔ چنانچہ تشہد پڑھتے وقت اسی بات کا اقرار کیا جاتا ہے اور شہادت دی جاتی ہے اور ہر رکعت میں قیام کی حالت میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہی کہا جاتا ہے کہ : ایاک نعبد وایاک نستعین "کہ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔" قرآن میں فیصلہ الٰہی بھی یہی ہے کہ : وقضی ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ "کہ اے میرے حبیب! تیرے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ سوا اس کے کسی کی

عبادت نہ کرے" ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ : واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا "کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔"

دعا کرنا اور حاجت وقرب اور تقرب حاصل کرنے کے لیے پکارنا بھی عبادت ہے۔ حدیث میں ہے : الدعاء مخ العبادۃ "کہ دعاء عبادت کا مغز ہے" اور حکم ہے کہ ادعونی "تم مجھے ہی پکارو۔" وادعوہ خوفا وطمعا "خوف اور طمع رکھتے ہوئے اسی کو پکارو۔" ولا تدعوا مع اللہ احدا "اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔"

استعانت بھی اللہ وحدہ لا شریک لہ سے چاہیے۔ ارشاد ہے : واستعینوا باللہ "اللہ ہی سے مدد مانگو" حدیث میں ہے کہ اذا استعنت فاستعن باللہ "کہ جب مدد طلب کرنی ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے کرے۔"

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ عبادت خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور استعانت بھی عبادت میں داخل ہے۔ غیر اللہ کو ان امور میں شریک کرنا شرک صریح اور کفر قبیح ہے۔ پس جب منافع اور سلب مضار وجلب فراخی وتنگی وصحت ومرض وطلب رزق وفرزند ودیگر حاجات غیر اللہ سے چاہنا اور غیر اللہ کو پکارنا شرک ہوا اور کرنے والے مشرک ہوئے جو اللہ تعالیٰ کا حق غیر کو دیتے ہیں۔

بطریق صلوٰۃ غوثیہ اور خانقاہوں اور بزرگوں کے مزاروں پر نمازیں پڑھنا اور ان کا تقرب چاہنا شرک ہوا اور کرنے والے مشرک ثابت ہوئے۔ علامہ محمد طاہر حنفی فتنی مجمع البحار میں فرماتے ہیں : من قصد لزیارۃ قبور الانبیاء والصلحاء ان یصلی عند قبورھم ویدعوا عندھا ویسئلھم الحوائج فھذا لا یجوز عند احد من علماء المسلمین فان العبادۃ وطلب الحوائج والاستعانۃ حق للہ وحدہ یعنی "جو لوگ انبیاء اور اولیاء کی قبروں کی زیارت کا قصد کرکے ان کی قبروں کے پاس نمازیں پڑھتے ہیں اور ان کو پکارتے ہیں اور ان سے حاجتیں مانگتے ہیں یہ علماء دین میں سے کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے کیونکہ عبادت اور حاجت طلب کرنا اور مدد مانگنا یہ محض اکیلے اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ قبروں میں غیر اللہ سے فیض حاصل کرنے کی غرض سے نمازیں پڑھنا اور بغداد کی طرف منہ کرکے اور گلے میں کپڑا ڈال کر دست بستہ گیارہ قدم چلنا اور شیخ المشائخ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو پکارنا اور ان سے استعانت کرنا ناجائز ہے۔

مبتدعین مشرکین طریقہ قادریہ کا معمول بنا ہے کہ وہ بعد نماز مغرب بغداد کی طرف محبوب سبحانی کی قبر کی نیت کرتے ہوئے مثل آداب نماز دست بستہ گیارہ قدم چلتے ہیں اور پھر انہی قدم اسی آداب سے واپس لوٹتے ہیں۔ اس کو ان مبتدعین کی اصطلاح میں صلوٰۃ غوثیہ اور ضرب الاقدام کہتے ہیں' جو صریح شرک ہے اور اس میں کئی افعال شرکیہ وبدعیہ کا ارتکاب ہے۔ نیت تقرب غیر اللہ کی کرنا' قبر کو قبلہ توجہ بنانا اور اس طرف چلنا' غیر اللہ کو پکارنا اور ان سے استعانت کرنا' ہاتھ باندھ کر قیام غیر اللہ کے لیے کرنا' اسماء الٰہی کی طرح ان کے نام کی تلاوت کرنا یہ سب امور شرکیہ وبدعیہ ہیں اور بحکم حدیث من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد "کہ جو شخص ایسا کام کرے جس پر ہمارا حکم وارد نہیں ہے' وہ مردود ہے۔" یہ عمل اور عاملین درگاہ الٰہی میں مردود ہیں۔

یہ اغواء عوام کے لیے بھجۃ الاسرار وغیرہ کا حوالہ دے کر اس عمل کا جواز ثابت کیا جاتا ہے' یہ سراسر جہالت اور گمراہی ہے۔ یہ کتابیں غیر معتبر اور غیر مستند ہیں۔ کتب دینیہ متداولہ سے نہیں ہیں اور ان میں مبتدعین' فاسقین' ملوین' مفترین کا تصرف کیا ہوا ہے اور ان خرافات کا الحاق' بدمذہبوں کی طرف سے ہے' ورنہ ان بدعات کا ارتکاب بزرگان دین کی طرف لازم آتا ہے جو ان کے شان توحید وسنت کے سراسر خلاف ہے' حالانکہ توحید وسنت میں ان کی جلالت شان مسلم ہے۔

مدارج السالکین میں ہے کہ: ضرب الاقدام الی العراق کفر کما ھو دأب بعض المفترین علی المشائخ الکرام قدس اللہ ارواحھم "کہ عراق کی طرف گیارہ قدم چلنا کفر ہے جیسا کہ بزرگان دین پر افتراء باندھنے والوں کا طریقہ ہے۔" مشارق شرح رقیہ میں ہے کہ: من ضرب الاقدام بعد الصلوۃ علی زعم ان ھذا زیارۃ فھو کافر وعلیہ الفتوٰی۔ "کہ نماز کے بعد گیارہ قدم چلنا اس خیال سے کہ یہ قبر کی زیارت ہے' ایسا کرنے والا کافر ہے' اسی پر فتویٰ ہے۔"

بلوغ المرشدین میں ہے کہ: ضرب الاقدام نحو العراق من انواع الکفر لانہ عبادۃ والعبادۃ لغیر اللہ کفر۔ "کہ عراق کی طرف گیارہ قدم چلنا اقسام کفر سے ہے' کیونکہ یہ عبادت ہے اور عبادت غیر اللہ کی کفر ہے۔" شرح منازل السالکین میں ہے کہ: ومن اعتقد بتحلیل ضرب الاقدام بعد الصلوۃ للشیخ عبدالقادر الجیلانی قدس سرہ فھو کافر

وعلیہ الاعتماد "کہ جو لوگ نماز کے بعد شیخ جیلانی کی طرف متوجہ ہو کر گیارہ قدم چلنے کے جائز ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں' وہ کافر ہیں۔ اسی فتویٰ پر اعتماد ہے۔"

اس تصریح سے ثابت ہوا کہ صلوٰۃ غوثیہ پڑھنا اور ہر قدم پر پیر جیلانی کا نام لے کر ان کو قاضی الحاجات' دافع البلیات' کاشف الکربات کے الفاظ سے ندا کرنا شرک اور بدعت ہے اور ایسا عمل کرنے والے مشرک اور کافر ہیں۔ مسلمان موحدین کو چاہیے کہ ایسی مشرکانہ مبتدعانہ نمازوں سے بچیں اور اصلی نمازیں پڑھیں! والسلام۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ' مورخہ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء

دو نمازوں کا مسئلہ

اخبار اہلحدیث کی کسی اشاعت میں یہ سوال چھپا ہے کہ دو نماز پڑھنے کی شرط پر کوئی شخص مسلمان ہوا تھا؟ جس کا جواب نفی میں دیا گیا ہے' حالانکہ ایسا واقعہ کتب میں موجود ہے۔ منتقی مع نیل الاوطار جلد ۷' ص ۲۱۱ مصری میں یہ باب درج ہے: باب صحة الاسلام مع الشرط الفاسد "یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ باوجود شرط فاسد کرنے کے اسلام صحیح ہے۔" اس مسئلہ کے ثبوت میں یہ حدیث درج ہے: عن نصر بن عاصم الليثي عن رجل منهم انه اتى النبي صلى الله عليه وسلم فاسلم على ان يصلي صلاتين فقبل منه (رواه احمد) یعنی نصر بن عاصم لیثی اپنے قبیلہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور اس شرط سے اسلام لایا کہ وہ صرف دو نمازیں پڑھا کرے گا' آپ نے اس کا اسلام قبول کر لیا۔"

اس حدیث پر علامہ شوکانی یمانی لکھتے ہیں کہ: هذه الاحاديث فيها دليل على انه يجوز مبايعة الكافر وقبول الاسلام منه وان شرط شرطا باطلا۔ یعنی "ان احادیث میں اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ کافر کو بیعت کرنا اور اس کا اسلام قبول کرنا جائز ہے' اگرچہ وہ شرط فاسد کرے۔" اس حدیث پر امام شوکانی رحمہ اللہ نے کوئی جرح نہیں فرمائی' حالانکہ نیل میں ان کی عادت تنقید روایات ہے۔ پس یہ روایت صحیح یا حسن ہے جو اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ کا ایک اصول یہ ہے کہ نئی قوم یا کسی نئے شخص کو دعوت

اسلام دیتے وقت تمام احکام کا ایک ہی دفعہ اس پر بوجھ نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ احکام پیش کیے جائیں۔ مثلاً پہلے توحید و رسالت کو پیش کیا جائے' جب اس پر پختہ ہو جائے تو پھر عبادات کو ترتیب وار بتدریج پیش کیا جائے۔ ایک حدیث ابوداؤد کی منتقی کے اسی باب میں موجود ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ قبیلہ ثقیف کے لوگ اسلام لائے تو انہوں نے اس شرط قاصد سے اسلام قبول کیا کہ: ولا صدقة ولا جهاد یعنی "نہ وہ زکوٰۃ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔" آنحضرت ﷺ نے اس شرط پر بیعت لے لی' جب وہ بیعت کر چکے تو فرمایا: سيتصدقون ويجاهدون۔ یعنی "عنقریب یہ لوگ زکاتیں بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا' بس اسی طرح دو نمازوں کے واقعہ کو سمجھ لیں کہ آپ نے یہ شرط اس لیے قبول کر لی تھی کہ جب یہ دو نمازیں پڑھنے لگے گا اور اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل حکم پانچ نمازوں کا ہے تو پھر وہ پانچ ہی پڑھنے لگے گا کیونکہ تمام اہل اسلام کا تعامل پانچ کا ہے۔ اگر شروع میں اس پر پانچ کا حکم نافذ کیا جاتا تو وہ تکلیف محسوس کر کے سرے سے اسلام ہی قبول نہ کرتا۔

اصول یہ ہے کہ: مالا يدرك كله لا يترك كله "کہ جو چیز تمام کی تمام حاصل نہ ہو سکے تو وہ تمام کی تمام بھی نہ چھوڑ دی جائے۔" بلکہ جتنی حاصل ہو جائے اس وقت وہی غنیمت ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو بذریعہ وحی یا الہام ربانی خاص اسی کے لیے اس وقت دو نمازوں کا ہی حکم ہوا ہو اور تین اس کو اس وقت معاف کر دی گئی ہوں تو پھر یہ شخص مستثنیٰ ہو گا جیسے حائضہ اور نفاس والی کو پانچوں ہی اس میعاد خون تک معاف ہیں مگر روزہ معاف نہیں ہے کہ اس کی بہرحال قضا ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں قضا دیں۔

اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کہ ایک راوی مجہول ہے' یعنی اس میں رجل مبهم کا پتہ نہیں کہ یہ کون ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شخص صحابی مجہول ہے' جس سے نصر بن عاصم لیثی تابعی روایت کرتے ہیں جو ان کے قبیلہ کے ہیں اور یہ تابعی طبقہ ثالثہ کا ہے' جس کی ملاقات صحابہ سے ثابت ہے اور یہ ثقہ ہے جو اپنے قبیلہ کے صحابی سے ان کا بیان نقل کرتا ہے کہ میں نے دو نمازیں پڑھنے کی شرط پر اسلام قبول کیا تھا میری شرط کو دربار رسالت میں منظور رکھا گیا۔

مقدمہ شیخ دہلوی کے ص۔۔۔۔ میں ہے: حديث المبهم هو مقبول الا ان يكون

صحابتنا لانهم عادل۔ یعنی "حدیث مبہم راوی کی قبول نہیں ہے مگر یہ کہ صحابی ہو تو پھر قبول ہے' کیونکہ صحابہ سب عادل تھے۔"

احکام الآمدی جلد ۲' ص ۱۲۸ میں ہے: اتفق الجمہور من الائمۃ علی عدالۃ الصحابی۔ یعنی "جمہور ائمہ اس پر متفق ہیں کہ صحابی عادل ہوتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ قاعدہ مقرر ہو کہ مبہم صحابی کی روایت نہیں لی جائے گی تو صحیحین کی بعض احادیث سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا حالانکہ ان کی قبولیت اور صحت پر اجماع ہے۔

مولانا فضل احمد صاحب غزنوی نے بھی مرسل صحابی کے قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب "ایک اسلام ایک قرآن" کے ص ۱۰۰ پر فرماتے ہیں: "محققان فن حدیث سے یہ امر مخفی نہیں کہ ایسے الفاظوں سے احادیث نبوی کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ علم اصول حدیث سے ناواقفی پر مبنی ہے۔ مرسل صحابی سے ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ امام بخاری اپنی کتاب "کتاب القراءۃ خلف الامام" کے ص ۱۲ میں ایک حدیث عن رجل من الصحابۃ پر فرماتے ہیں: ولو رجل من الصحابۃ لا یکون الا ثقۃ یعنی "صحابہ سے شخص مبہم صرف ثقہ ہی ہو گا۔" اسی طرح سب محققان فن نے لکھا ہے۔

کتاب الکفایہ امام خطیب بغدادی کے ص ۵۱ میں ہے کہ امام بخاری نے فرمایا کہ جس شخص نے نبی کریم ﷺ کی صحبت پائی یا آنحضور ﷺ کو اس نے دیکھا تو بشرطیکہ وہ مسلمان ہو' صحابی ہے۔ پھر صحابی ہونے کا ثبوت جن لفظوں سے ہوتا ہے' وہ کتاب الکفایہ میں درج ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے: اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم "کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا" صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم "اس نے نبی کریم ﷺ کی صحبت پائی" لہ صحبۃ "اس کو نبی ﷺ کی صحبت حاصل تھی۔" اسی طرح اور الفاظ لکھے ہیں جن سے اس کا صحابی ہونا ثابت ہے۔ جب اس کی صحبت اور روایت ثابت ہو گئی تو اب وہ صحابی کہلائے گا اور اس کی روایت معتبر ہو گی' جس سے انکار کرنا جائز نہیں' خواہ منکر حدیث حنفی سے جنگ ہو یا کسی سے' اصول حدیث چھوڑنا نہیں چاہیے' ورنہ خود منکر ہو جائے گا فتفکر و۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نصر بن عاصم کی روایت رجل مبہم سے صحیح ہے' پھر اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن فضالہ اپنے باپ

فضالہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے اسلام اور احکام اسلام کی تعلیم دی' ان میں سے ایک یہ حکم تھا کہ : حافظ علی الصلوات الخمس "کہ تم پانچ نمازوں کی حفاظت کرو" میں نے معذرت کی کہ مجھے ان وقتوں میں بہت شغل ہے' آپ مجھے کوئی ایسا جامع امر ارشاد فرمائیں جس کو میں کر سکوں اور وہ مجھے کفایت کرے۔ فقال حافظ علی العصرین "کہ تم دو عصروں کی حفاظت رکھو۔" یہ عصرین کا محاورہ ہماری زبان میں نہ تھا اس لیے میں نے دریافت کیا کہ وما العصران؟ "دو عصروں سے کیا مراد ہے؟" فقال صلوة قبل طلوع الشمس وصلوة قبل غروبها "آپ نے فرمایا کہ اس سے صبح کی نماز اور عصر کی نماز مراد ہے۔" (ابوداود' کتاب الصلوة جلد ۱' ص ۶۱)

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ وہ شخص جدید الاسلام تھا آپ نے اس کو تعلیم دینی شروع کی تو دو نمازوں پر حفاظت اور مداومت رکھنے کا حکم دیا' تاکہ یہ پختہ ہو جائے تو پھر پانچوں کو قائم کرنے لگے پرانے مسلمانوں کے لیے یہ احکام نہیں ہیں۔

عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

اہلحدیث سوہدرہ' جلد ۱۵' شمارہ ۱۷' مورخہ یکم ستمبر سنہ ۱۹۶۲

کیا نبی اکرم ﷺ نے صرف دو نمازوں کی شرط پر کسی کا اسلام قبول فرمایا تھا؟

بندہ کے نام کسی گمنام شخص کا کارڈ آیا ہے جس کی نقل درج ذیل ہے :

بخدمت جناب مولانا عبدالقادر صاحب (حصاری)

السلام علیکم جناب! آپ اخبار "تنظیم اہلحدیث" میں تارک صلوة پر مضمون لکھ رہے ہیں۔ اس حدیث کا جواب بھی لکھ دیں : عن نصر بن عاصم عن رجل منهم انه اتی النبی صلی اللہ علیه وسلم فاسلم علی انه لا یصلی الا صلوتین فقبل منه ذالک۔ (الفتح الربانی مسند احمد جلد ۱' ص ۲۴۰) "نصر بن عاصم سے روایت ہے' وہ انہی میں سے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس شرط پر اسلام لایا کہ وہ صرف دو نمازیں پڑھا کرے گا آنحضرت ﷺ نے اس کی یہ شرط قبول کر

لی۔"

سائل نے اپنے سوال کی وضاحت نہیں کی۔ بظاہر اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اس نے دو نمازوں کی شرط کی اور آنحضرت ﷺ نے اس شرط کو قبول کر لیا تو وہ باقی نمازوں میں تارک الصلوۃ رہا' جس پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں کیا گیا تو اس سے ظاہر ہوا کہ بے نماز علی الاطلاق کافر نہیں ہے۔

اگر سائل کو بتانا ہو تو مختصر جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے دو نمازوں پر اس کا اسلام قبول کر لیا تو یہ دو وجوہ سے خالی نہیں۔ ایک یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے ازخود مصلحت کی بنا پر تین نمازیں اس کو معاف کر دیں اور دو پر اس کو قائم رکھا' یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ پر وحی نازل کر دی ہو کہ اس کی دو نمازیں کافی ہیں' تین اس کو معاف ہیں۔

اگر شق اول ہے تو یہ آیت ... وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحی ... یعنی "ہمارا نبی اپنی خواہش اور رائے سے کچھ نہیں بولتا' صرف وہی بات کہتا ہے جس کی وحی نازل ہوتی ہے" کے خلاف ہے' اس لیے یہ صحیح نہیں۔ اگر شق دوسری ہے تو پھر اس پر نمازیں ہی دو فرض ہیں اور یہ شخص دیگر لوگوں سے مستثنیٰ ہے۔ اب اگر دو میں سے کسی کو عمداً ترک کرے گا تو کافر ہے ورنہ نہیں۔ لیکن بندہ اس حدیث کا تفصیلی جواب دینا چاہتا ہے تاکہ فائدہ تمام حاصل ہو۔ سنئے اور غور فرمایئے :

اول یہ کہ پانچ نمازوں کی فرضیت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے جس سے انکار کی کسی کو گنجائش نہیں ہے' اس لیے اس پر علماء اسلام کا اجماع ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں صرف دو نمازیں پڑھوں گا' پانچ نہیں پڑھوں گا تو وہ بالاجماع کافر ہے۔ اس میں منکرین کفر بے نماز بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ بھی ایسے شخص کو مومن مسلمان نہ کہیں گے بلکہ کافر کہیں گے۔ پس آج کل اکثر حکام' وکلاء' عیاش لوگ' پرویزی' (منکرین حدیث) اور دیگر چکڑالوی یعنی اہل قرآن نے اپنی خواہش کا دین بنا رکھا ہے کہ صرف صبح کی نماز پڑھ لیتے ہیں یا ایک صبح کی اور ایک شام کی اور باقی کو عمداً ترک کر کے پانچ نمازوں کی فرضیت سے منکر ہیں۔ ایسے لوگ بالاتفاق کافر ہیں' کیونکہ یہ براہین قطعیہ کے منکر اور تارک ہیں مندرجہ بالا حدیث جو دلائل قطعیہ کے خلاف ہے' حجت نہیں ہے کیونکہ یہ ضعیف ہے اور اس کی دو

وجہیں ہیں :

(۱) یہ کہ اس میں ایک راوی قتادہ ہے جو مدلس ہے۔ حافظ ابن حجر نے طبقات المدلسین میں فرمایا ہے : وھو مشھور بالتدلیس "وہ تدلیس میں مشہور ہے۔" علامہ ماردینی نے جوہر النقی میں لکھا ہے : قتادہ مدلس "قتادہ مدلس ہے۔"

اسی طرح دیگر کتب اسماء الرجال میں ہے اور قتادہ تیسرے طبقہ کے مدلسین سے ہیں اور ان کا حکم یہ ہے کہ : الثالثۃ من اکثر من التدلیس فلم یحتج الائمۃ من احادیثھم الا بما صرحوا بالسماع۔ "طبقہ ثالثہ کے وہ مدلسین ہیں جنہوں نے کثرت سے تدلیس کی ہے۔ اسی وجہ سے ائمہ محدثین نے ان کی ان احادیث سے احتجاج نہیں کیا جن میں انہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی' جن میں سماع کی تصریح کی ہے' ان کو قبول کیا ہے۔"

روایت پیش کردہ میں قتادہ نے راوی نصر بن عاصم سے بہ لفظ "عن" روایت کیا ہے اور سماع کی تصریح نہیں کی' لہٰذا یہ حدیث قابل احتجاج نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ اس روایت میں ایک راوی "رجل منھم" کے لفظوں سے ذکر کیا گیا ہے' یہ راوی مجہول ہے۔ بہ ظاہر یہ صحابی معلوم ہوتا ہے' تب صحابی کا مجہول ہونا گو جمہور کے نزدیک مضر نہیں ہے مگر جب ادلہ قطعیہ کے معارض ہو تو پھر مخدوش ہو کر ایسی روایت ساقط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اول تو امام ابن حزم وغیرہ صحابی کے مجہول ہونے کو علی الاطلاق مضر قرار دے کر باعث ضعف بتلاتے ہیں۔

چنانچہ احکام فی اصول الاحکام جزء ۲' ص ۳۵ میں ہے : وقد کان فی عصر الصحابۃ رضی اللہ عنھم منافقون ومرتدون فلا یقبل حدیث قال راویہ عن رجل من الصحابۃ .. الخ۔ "عہد نبوی میں آنحضور ﷺ پر جھوٹ بولنے والے بھی تھے اور منافق اور مرتد لوگ بھی تھے تو جب تک کسی صحابی کا نام ظاہر نہ ہو' اس کی حدیث قابل قبول نہ ہو گی۔"

ابوداؤد میں ایک روایت مجہول صحابیہ کی ہے : عن امراۃ من بنی عبد الاشھل قالت قلت یارسول اللہ الحدیث۔ اس پر علامہ خطابی فرماتے ہیں : والحدیث فیہ مقال لان امراۃ من بنی عبد الاشھل مجھولۃ والمجھول لا تقوم بہ الحجۃ "اس حدیث میں جرح ہے کہ اس میں ایک مجہولہ عورت ہے اور مجہول راوی کی حدیث سے دلیل قائم نہیں ہوتی۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ بعض ائمہ علی الاطلاق مجہول الاسم صحابی کی روایت کو مجروح کہتے ہیں مگر جمہور ائمہ اس کی روایت کو قبول کرتے ہیں لیکن یہ شرط کرتے ہیں کہ وہ اپنے سے اصح کے معارض نہ ہو۔ چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں : فترک ذکر اسمائھم فی الاسناد لا یضر اذا لم یعارضه ما ھو اصح منه (معرفة السنن والاثار للبیہقی) "صحابی کا مجہول ہونا مضر نہیں جب تک اس کے معارض اصح حدیث نہ ہو۔"

چونکہ پیش کردہ روایت کے معارض احادیث قطعیہ موجود ہیں جو پانچ نمازوں کو سب پر فرض عین ثابت کر رہی ہیں تو یہ دو نمازوں والی روایت ان کے مقابلہ میں مردود ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث کسی کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے مصلحت وقتی پر مبنی ہے' اس کا عام حکم نہیں ہے۔ چنانچہ منتقی میں یہ باب منعقد کیا گیا ہے : "باب صحة الاسلام مع الشرط الفاسد" یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ شرط فاسد کر کے کسی کو اسلام میں داخل کیا جائے تو اس کا اسلام صحیح ہے۔" پھر امام ابن تیمیہ نے اول اسی حدیث نصر بن عاصم کو ذکر کیا ہے جس میں دو نماز پڑھنے کی شرط ہے۔ پھر دوسری حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ بیان ہے کہ وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ ثقیف کا حال اور واقعہ کس طرح ہے تو انہوں نے فرمایا کہ جب انہوں نے بیعت کی اور اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط کی کہ لا صدقة علینا ولا جھاد "نہ ہم زکوۃ صدقہ دیں گے اور نہ جنگ جہاد کریں گے۔" تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔ جب وہ چلے گئے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سیتصدقون ویجاھدون یعنی "جب ان کے دلوں میں اسلام جاگزیں ہو گیا تو عنقریب یہ لوگ زکوۃ صدقات بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔"

تیسری حدیث یہ ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا کہ تو اسلام قبول کر لے اور مسلمان ہو جا' اس نے کہا : اجدنی کارھا "کہ میں اپنے دل میں اسلام کو مکروہ خیال کرتا ہوں" تو کیا یہ خیال ہوتے ہوئے اسلام کو قبول کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اسلم وان کنت کارھا یعنی "اسلام قبول کر لے اگرچہ دل نہ چاہے۔"

ان تین احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ شریعت اسلامیہ کا مسلمہ قانون یہ ہے کہ جب غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنا ہو تو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے' خواہ شرط فاسد قبول کرنی

پڑے کیونکہ جب وہ اسلام میں داخل ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ اسلام اس کے دل میں مضبوط ہوتا جائے گا اور اس کو استقامت حاصل ہو جائے گی۔ پھر اس کو احکام الٰہی سنائے جائیں گے اور ترغیب دی جائے گی اور جنت کے انعامات اور دیدار الٰہی کا ہونا اور حساب اعمال ہو کر جزا و سزا کا ملنا اور دوزخ کا عذاب دردناک ہونا اس کو سمجھایا جائے گا اور پھر نماز کی تعلیم دی جائے گی اور تالیف قلوب کے اصول پر اس کی مالی امداد بھی کی جائے گی تاکہ اس کو اسلام اور مسلمانوں سے محبت ہو جائے اور ان کی صداقت کا یقین حاصل ہو جائے۔ جب اس کو پورا یقین حاصل ہو کہ احکام الٰہی کا علم ہو گیا تو پھر ان احکام کی خلاف ورزی پر جرم عائد کرنا شروع کیا جائے گا۔

اب اگر نماز کا حکم مان کر نماز پڑھنے لگا اور اس کو یقین ہو گیا کہ نماز اسلام اور کفر کے درمیان فارق ہے تو اب اگر وہ عمداً ترک کرے گا تو اس پر جرم کفر لگا کر توبہ کی طرف بلایا جائے گا۔ اگر تائب ہو کر نماز پر قائم ہو گیا تو فبہا ورنہ اس پر حجت پوری ہو چکی اور اب اس کو سزا دیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔

الغرض جس حدیث میں دو نمازوں کی شرط قبول کرنے کا ذکر ہے وہ غیر مسلم کے لیے اسلام میں داخل کرنے کی غرض سے مصلحتی قانون ہے اور وقتی حکم ہے۔ اس حدیث سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ جو شخص تین نمازوں سے منکر ہو کر صرف دو نمازیں اختیار کرے تو وہ مسلمان ہے اور اس کے لیے یہ جائز ہے یہ مطلب اور مراد اجماعاً باطل ہے اور اہل حق میں سے کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

امام شوکانی ان احادیث کی شرح میں فرماتے ہیں : هذه الاحادیث فیها دلیل علی انه یجوز مبایعة الکافر وقبول الاسلام وان شرط شرطا باطلا انه یصح اسلام من کان کارها "ان مذکورہ احادیث میں اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ کافر کو اسلام قبول کرانے کے لیے بیعت کرنا جائز ہے اگرچہ شرط باطل کرنی پڑے اور اگرچہ دل میں اسلام کو برا سمجھے تب بھی اس کو اسلام میں داخل کرنا جائز ہے"

ایسے مسائل بہت ہیں جن سے احکام بدل جاتے ہیں۔ مثلاً دوران جنگ اگر کسی مجاہد سے کوئی جرم زنا، شراب وغیرہ سرزد ہو جو موجب حد یا تعزیر ہو تو وہ اس پر نافذ نہ کی جاوے گی کہ یہ مصلحت جنگی ہے' منہ۔

اسی طرح جھوٹ سخت کبیرہ گناہ ہے' جس پر لعنت وغیرہ کی وعید آئی ہے مگر مصالح دنیوی اور اخروی کے پیش نظر جھوٹ بولنا جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے۔ چنانچہ کسی ظالم سے بھاگ کر مظلوم کسی شخص کے پاس پناہ گزیں ہو جائے اور ظالم پناہ دہندہ کے پاس پہنچ کر اس سے دریافت کرے تو پناہ دہندہ انکار کر دے کہ مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ ایسا ہی کوئی کسی کے پاس اپنا مال امانت رکھ دے تاکہ فلاں ظالم اس سے غصب نہ کر لے اور پھر وہ ظالم اس امین سے دریافت کرے کہ فلاں شخص کا مال تیرے پاس امانت ہے؟ تو اگر اس کو خوف ہو کہ وہ اس سے بالجبر چھین لے گا تو وہ صاف انکاری ہو جائے تو جائز بلکہ واجب ہے۔ اگر بیوی ناراض ہو کر گھر سے جانا چاہے تو خاوند کوئی جھوٹ بول کر اس کو خوش کر لے تو یہ جائز ہے۔

اسی طرح دوران جنگ جب دشمن حملہ آور ہو تو اس وقت کسی جھوٹ سے اس کے حملہ کو روک کر پھر دھوکہ سے اپنا حملہ کر کے اس کو ہلاک کر دے تو یہ جائز ہے۔ دو شخصوں کے درمیان مصالحت کرانے کی غرض سے جبکہ وہ کسی جھوٹی تجویز کے بغیر صلح نہ کرتے ہوں تو جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اسی طرح شرک وکفر بصورت اکراہ جائز ہے جبکہ دل مطمئن بالایمان ہو۔ اسی طرح کسی کا عیب اس کے منہ پر ظاہر کر کے اس کی بے عزتی کرنا حرام ہے لیکن جب عدالت میں کوئی شخص گواہی دے رہا ہو اور اس کی گواہی جھوٹی ہو تو اس پر اس کے عیوب ظاہر کر کے حاکم کی عدالت میں جرح کرنا جائز ہے۔ اسی طرح غیبت اور جر بالسوء حرام ہیں مگر مظلوم ظالم کی بابت اس کے ظلم کا اظہار عدالت یا پنچایت میں کرے تو یہ جائز ہے۔ محدثین نے راویوں پر جرح بھی اسی مصلحت شرعیہ کی بنا پر جائز بلکہ ضروری قرار دی ہے۔

رفع مفاسد کے لیے کئی گناہ جائز قرار دیئے گئے ہیں اور مصالح عباد کے لیے بھی کئی گناہ جائز رکھے گئے ہیں تو دو نمازوں کی شرط بھی اسی مصلحتی قانون کی بنا پر قبول کی گئی تھی۔

ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ وفد ثقیف نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر بیعت کرتے وقت یہ شرط کی کہ وہ نماز بالکل نہ پڑھیں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا لا خیر فی دین لیس فیہ رکوع "کہ اس دین میں کوئی بھلائی اور نیکی نہیں ہے جس میں نماز نہیں ہے۔" آپ نے ان کی یہ شرط قبول نہ کی اور انہوں نے بیعت کر لی اور یہ شرط کی کہ زکوۃ اور

جہاد نہ کریں گے' جس کو آپ نے وقتی طور پر اس لیے قبول کر لیا کہ جہاد کا تو وہ وقت ہی نہ تھا اور زکوٰۃ سال کے بعد ادا کرنی پڑتی ہے' اس لیے آپ نے اس وقت یہ شرط اس خیال سے قبول کر لی کہ زکوٰۃ اور جہاد کے وقت آنے تک ان میں اسلام مستقر ہو جائے گا پھر یہ خود ہی ان فرائض پر عمل کر لیں گے جیسے یہ ارشاد اس پر دال ہے: سیتصدقون ویجاھدون "کہ یہ لوگ عنقریب صدقہ جہاد کا فریضہ ادا کرنے لگیں گے۔"

اور راقم الحروف حصاری نے جن بے نمازوں کی تکفیر کی ہے' اس سے وہ مدعیان اسلام مراد ہیں جو پیدائشی ہیں جن کو اسلام کے سب احکام کا علم ہے اور وہ نماز وغیرہ فرائض کو ادا کرنا اللہ اور رسول کا حکم سمجھتے ہیں اور قرآن اور نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر وہ عمداً غفلت اور نفسانی خواہش کی اتباع سے نماز کو چھوڑے ہوئے ہیں اور شیطان نے ان کو یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے۔ اس کو نمازوں کی کیا حاجت ہے' ہم گنہگاروں کو اپنی رحمت سے بخش دے گا۔ اگر اس نے خود رحمت نہ کی تو ہم کلمہ گو ہیں' ہم کو ہمارے نبی کریم ﷺ شفاعت کر کے رہائی دلا دیں گے۔

اور بعض اپنے پیروں پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ ہم کو بخشوا لیں گے اور بعض پنجابی بے دین یہ کہتے ہیں کہ گنہگاراں نوں رب بخشے گا تے نیکاں دی لاہوے گا کھل ۔ یعنی ہم گنہگاروں کو تو اپنی رحمت سے بخش دے گا اور نیک نمازیوں کا حساب لے گا کہ تم نے جب میری عبادت کا بھار بوجھ اٹھایا تو اس کو ٹھیک طور پر ادا کیوں نہ کیا اور اپنی نمازوں پر فخر اور گھمنڈ کیوں کیا؟ اس لیے قرآن میں فویل للمصلین آیا ہے اور ہم صرف رحمت پر بھروسہ رکھتے ہیں تو ہم کو اللہ تعالیٰ بخش دے گا۔ یہ عوام پنجابی ہندی ملحدوں کا خیال ہے۔ اس لیے نماز کی اہمیت ظاہر کر کے اس کا حکم شرعی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کافر اور مشرک اسلام سے خارج ہیں۔

اب اگر کسی عالم کے پاس کوئی دلیل صحیح صریح جس میں صاف ذکر تارک الصلوۃ کا ہو اور یہ حکم ہو کہ وہ مومن اور مسلمان ہے تو اس کی دلیل پر غور کیا جائے گا۔ یہی شرط ہم نے مناظرہ ہابڑی ضلع کرنال میں دیوبندی علماء مولوی خیر محمد صاحب مہتمم خیر المدارس ملتان اور مولوی عبدالکریم صاحب خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون وغیرہ پر پیش کی تھی جبکہ ان کا مناظرہ مولانا عبدالستار مرحوم دہلوی سے بے نماز کے کفر پر ہوا تو وہ بھی لاجواب ہو کر رہ گئے اور

آخر لاچار ہو کر ایک واقعہ ترک نماز کا پیش کیا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فلاں جنگ میں نماز عصر ترک کر دی تھی۔ اگر ترک نماز کفر ہے تو حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی کفر کا جرم عائد ہوتا ہے۔ اس کا دندان شکن جواب دیا گیا جس سے دیوبندی علماء کی ایسی حالت ہوئی کہ عوام بھی ان سے متنفر ہو گئے کہ ان مولویوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بے نماز بنا دیا' نعوذ باللہ منہم اور کئی لوگ اہلحدیث ہو گئے (اس مناظرہ میں بہت سے علماء اہلحدیث شامل تھے جو سب اس واقعہ کے گواہ ہیں اور جناب مولانا عبدالجلیل صاحب محدث سامرودی خاص کر قابل ذکر اور شاہد عدل ہیں) فللہ الحمد۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' جلد ۱۸' شمارہ ۲۵' مورخہ ۲۵ نومبر سنہ ۱۹۶۶ء

رسول اللہ ﷺ کا طریقہ نماز

آپ ذرا حضور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی حیات مقدسہ پر نظر ڈالیں کہ آنجناب ﷺ کا ایک ایک لمحہ کس قدر مصروف و منہمک دکھائی دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص آنحضور ﷺ کو دنیوی امور میں مشغول پاتا تو وہ حیران رہ جاتا کہ جب دنیا کے کاموں سے آپ کو فرصت نہیں تو آپ دین کے فرائض کیونکر سرانجام دیتے ہوں گے اور اگر کوئی آدمی حضور ﷺ کو امور دین میں محو دیکھتا تو وہ یہی سمجھ لیتا کہ آپ تارک دنیا ہیں اور دینی امور کے علاوہ دنیوی کاموں کو حضور ﷺ ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے اپنے مقررہ وقتوں میں سبھی کام سرانجام دیتے۔ دین کے بھی اور دنیا کے بھی!

منجملہ دیگر فرائض اللہ کی ادائیگی کے' آنحضور ﷺ عبادت و ریاضت کے التزام کا خاص اہتمام فرماتے اور پابندی وقت کے ساتھ خالق اکبر کی بندگی کا فرض ادا کرتے۔

حضور ﷺ کے عہد مبارک میں پابندی نماز کا پتہ اسی سے چلتا ہے کہ حضور ﷺ نماز کے وقت سب سے اول اٹھتے تھے' اپنے خاندان کے افراد کو اس کے لیے تیار کرتے' پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھروں میں آوازیں دیتے اور مسجد میں وقت پر حاضر ہونے کی تاکید فرماتے ایک رات حضور ﷺ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے حضور ﷺ نے دیکھا کہ علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما سو رہے ہیں۔ آپ نے انہیں آواز دی اور

فرمایا کیا تم تہجد نہیں پڑھا کرتے؟ حضرت علی بڑھتے اس وقت جوانی کی بہاریں دیکھ رہے تھے' بیدار ہو کر کہنے لگے حضور! اللہ تعالیٰ جب ہمیں اٹھانا چاہے گا اٹھ بیٹھیں گے کیونکہ ہماری جانیں اسی کے قبضہ میں ہیں۔ آنحضور ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو ناراضگی میں واپس لوٹ آئے اور اپنی ران پر ہاتھ مار مار کر سخت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے جاتے تھے کہ وکان الانسان اکثر شيء جدلا۔ یعنی "آدمی بہت سی باتوں میں جھگڑالو واقع ہوا ہے۔" الغرض آنحضور ﷺ ہر مسلمان کو نماز کی سخت تاکید فرماتے۔ حضور ﷺ کی آخری وصیت بھی یہی تھی کہ الصلوٰۃ الصلوٰۃ! یعنی نماز کو ہر حالت میں قائم کرو اور اس کی ادائیگی میں غفلت نہ برتو۔

حدیث شریف کی متعدد مستند کتب سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ مسجد میں نماز باجماعت ادا فرماتے اور نماز باجماعت پڑھنے کی سختی سے تاکید کرتے' نماز پڑھتے وقت آپ سینے پر ہاتھ باندھتے' رفع یدین کرتے اور جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھ کر بلند آواز سے آمین کہتے۔ علاوہ بریں مقتدیوں سے فرماتے کہ وہ جہری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھیں' کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

حضور انور علیہ الصلوٰۃ نماز کو بہت ٹھہر ٹھہر کر' خشوع و خضوع کے ساتھ ادا فرماتے۔ نماز تہجد کی اکثر گیارہ رکعات پڑھتے اور اس نماز کو خوب ذوق کے ساتھ اس طرح کہ گویا فنا فی اللہ ہو جاتے اور دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اکثر اوقات حضور ﷺ کی نماز اس قدر طویل ہوتی کہ ایک ایک سجدہ میں پچاس آیات پڑھنے کے برابر دیر لگاتے۔ قیام اس قدر دراز ہوتا کہ حضور ﷺ کی پنڈلیاں سوج جاتیں اور سردی کی وجہ سے پاؤں متورم ہو جاتے۔

حضور ﷺ ایک ایک رات میں تین تین چار چار بار اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں ایک شب مجھے آنحضرت ﷺ کے پاس سونے کا اتفاق ہوا' ابھی تھوڑی ہی نیند آئی تھی کہ حضور ﷺ اٹھ بیٹھے اور وضو کر کے نماز شروع کر دی اور اپنے قیام' رکوع اور سجود کو بہت ہی لمبا کیا پھر سو گئے پھر اٹھے اور وضو کر کے ویسی ہی طویل نماز ادا فرمائی' اس کے بعد پھر لیٹ گئے اور خراٹے بھرنے لگے۔ بعد ازاں تیسری مرتبہ بھی اٹھ کر وضو کیا اور بہت لمبی نماز پڑھی۔ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی کا بیان ہے کہ ایک رات میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر کے کھڑے ہو گئے اور قیام اس قدر لمبا کیا کہ مجھے سخت گھبراہٹ پیدا ہوئی اور میرا یہ ارادہ ہو گیا کہ یا تو بیٹھ جاؤں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رمضان شریف کے آخری دس دنوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام شب عبادت میں مصروف رہتے اور افراد خانہ کو جگا کر عبادت بجالانے کی تاکید فرمایا کرتے۔

مشہور صحابی رسول اللہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شب میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھکر سورہ بقر کی تلاوت شروع کر دی۔ میں نے سمجھا کہ غالباً سو آیات پڑھ کر رکوع فرمائیں گے' لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورہ بقر ختم کر کے سورہ نساء پڑھنے لگے' میں نے پھر خیال کیا کہ سورہ نساء پڑھ کر رکوع کریں گے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ نساء کے بعد سورہ آل عمران شروع کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا یہ حال تھا کہ سرتاپا آپ ورتل القرآن ترتیلا کی تصویر نظر آتے تھے' یعنی کلام اللہ بہت آہستگی سے مزے لے لے کر پڑھتے' جہاں تسبیح کہنی ہوتی' تسبیح کہتے' جس جگہ دعاء مانگنا ہوتی دعاء مانگتے' پس سورہ آل عمران ختم کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع فرمایا اور اسے قیام ہی کی طرح لمبا کیا پھر تسبیح کہہ کر طویل قیام کیا پھر سجدہ میں گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدہ بھی قیام ہی کے مانند خوب دراز تھا۔

اللہ اللہ! یہ تھی اس شاہ دو جہاں کی عبادت' جو اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین اور برگزیدہ بندہ تھا جو شافع محشر' وارث جنت اور قاسم کوثر تھا' مگر حالت یہ تھی کہ روز و شب عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے اور خوب تضرع و خضوع سے بندگی کرتے' مغفرت چاہتے اور بار بار چاہتے' دعائیں مانگتے اور آہ و زاری سے مانگتے ___ اور ___ ادھر ہم ہیں کہ ایک رکعت میں پانچ پانچ سورتیں پڑھنا تو درکنار' پانچ آیات پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ حسن اتفاق سے کبھی نماز پڑھتے بھی ہیں تو بھاگے بھاگے مسجد میں آئے' دو ٹکریں ماریں' نماز پڑھی' مگر اتنی مختصر اور جلدی کہ آنکھ جھپکنے میں ختم کر کے یہ جا' وہ جا۔ غور کیجئے! ہماری عبادت کیسے مقبول ہو؟ ہمیں کیونکر اس کا ثواب ملے؟ ہماری دعائیں کس طرح قبول ہوں؟ اور ہم مولائے کریم کا قرب اور رضا کیسے حاصل کریں؟

ایک بار حضور ﷺ نے جو لمبی نماز پڑھی تو پاؤں متورم ہو گئے' کسی نے عرض کیا آپ اتنی لمبی نماز کیوں پڑھتے ہیں اور کیوں اتنی تکلیف اٹھاتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت کا وارث اور حوض کوثر کا مالک بنا دیا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا: افلا اکون عبدا شکورا "کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔" جتنے وہ مجھ پر زیادہ احسان کرتا ہے' اتنا ہی میرا فرض ہے کہ اس کی زیادہ عبادت کروں' نہ کہ الٹا اس سے بے نیاز ہو جاؤں۔

حضور پرنور کا ارشاد ہے کہ جو مسلمان میری طرح وضو کرے' میری ہی طرح نماز پڑھے' رزق حلال کھائے اور اللہ تعالیٰ کو دل سے وحدہ لاشریک لہ مانے' تو میں اس کو جنت دلانے کا ذمہ دار ہوں۔ حضور ﷺ کے اس فرمان پر غور کیجئے کہ آج شاید ہی کون مسلمان ہو گا جو وضو کرنے اور نماز پڑھنے میں آنحضرت ﷺ کے طریق و مسلک پر چلتا ہو گا ورنہ یہاں تو قدم قدم پر بدعتیں رائج ہیں' شرک و ضلالت کی آگ کو ہوا دی جا رہی ہے' حضور ﷺ کے چلائے ہوئے طریقوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے' سنت نبویہ کی توہین و تضحیک کی جا رہی ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ نمازوں میں رفع یدین کرو' ہم کہیں گے کیوں؟ یہ تو ہمارے مذہب کے خلاف ہے' وہابیوں کی نشانی ہے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ جہری نمازوں میں جب امام سورۃ فاتحہ پڑھ لے تو تم بلند آواز سے آمین کہا کرو' احناف کہتے ہیں ہم نمازوں میں کیوں چلائیں اور شور مچائیں' کیا ہمیں کوئی درد ہو رہا ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے' سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی' جہری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا لازم ہے۔ حنفی کہتے ہیں' فاتحہ پڑھنی ہرگز جائز نہیں' جو پڑھتا ہے وہ دشمن اللہ اور رسول ہے اور کشتنی و گردن زدنی ہے۔

الغرض دور حاضر کے مسلمان کی زندگی کچھ عجیب قسم کی زندگی ہے کہ نہ اللہ کا ڈر ہے نہ رسول سے محبت ہے نہ قرآن کا ادب ہے' نہ حدیث و سنت کا احترام ہے' قرآن و سنت کے خلاف چلنا اور اللہ و نبی کے احکام سے روگردانی و سرتابی کرنا آج اس کا طغرائے امتیاز ہے' نماز ہی کو لیجئے کہ اول تو مسلمان پابندی سے پڑھتے نہیں۔ اگر پڑھتے ہیں تو کتاب و سنت کے احکام کے مطابق نہیں پڑھتے۔ یہ عوام کا قصور نہیں' ان علمائے سوء کی خطا ہے جو اپنے طبع نفسانی کے لیے عامۃ المسلمین کو غلط تعلیم دیتے اور غلط راستے پر چلاتے ہیں۔ پس اہل اسلام کا فرض ہے کہ وہ ہر بات میں کتاب و حدیث کی پیروی کریں۔ جس کام سے

اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے' اس سے رک جائیں اور جس کا حکم دیا ہے' اس پر عمل کریں کہ یہی صحیح اسلام ہے۔ وما علینا الا البلاغ!

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ' جلد ۹' شمارہ ۳۸' مورخہ ۱۸/ اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء

کیا فرض نماز سواری پر پڑھنی جائز ہے؟

سوال : کیا فرض نماز ازروئے شریعت سواری پر پڑھنی جائز ہے؟ (حافظ محمد ایوب)

الجواب بعون الوھاب' الحمد للہ رب العالمین' فاقول و باللہ التوفیق۔

قرآن مجید سورہ بقرہ' پارہ ۲ میں ہے : قوموا للہ قانتین فان خفتم فرجالا او رکبانا فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم مالم تکونوا تعلمون۔ یعنی "عاجزی سے دنیا کی باتوں سے چپ چاپ ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے نماز میں کھڑے ہو جاؤ۔ پس اگر تم کو خوف ہو تو پاپیادہ یا سواری پر جس طرح ہو سکے نماز پڑھ لو' پس جب بے خوف ہو جاؤ تو پھر تم اسی طرح اللہ تعالیٰ کو یاد کرو یعنی نماز پڑھو جس طرح اس نے تم کو اپنے نبی (ﷺ) کے ذریعے تعلیم دی ہے' جس کو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔"

پہلی آیت میں نماز میں قیام کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ نماز کے فرائض میں سے ہے جو بغیر کسی سخت عذر کے ساقط نہیں ہوتا' حسب استطاعت اس کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ سنن دار قطنی کی ایک حدیث مرفوعاً ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : یصلی المریض قائما ان استطاع فان لم یستطع ان یسجد اوما وجعل سجوده اخفض من رکوعه فان لم یستطع ان یصلی قاعدا صلی علی جنبه الایمن مستقبل القبلة فان لم یستطع ان یصلی علی جنبه الایمن صلی مستقلیا رجلاه مما یلی القبلة۔ یعنی "مریض کو چاہیے کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرے جب تک کہ اس کو کھڑے ہونے کی طاقت رہے۔ اگر کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہے تو پھر بیٹھ کر نماز ادا کرے اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے میں سجدہ کرنا مشکل ہو' طاقت نہ رہے تو اشارہ سے رکوع وسجدہ کرے۔ لیکن سجدہ بہ نسبت رکوع کے زیادہ جھک کر کرے اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی استطاعت نہ ہو تو پھر دائیں کروٹ پر لیٹ کر نماز پڑھے اور قبلہ کی طرف متوجہ رہے اور اگر کروٹ پر نماز ادا کرنے کی طاقت نہ ہو تو پھر سیدھا

چت لیٹ کر پڑھے اور اپنے دونوں پاؤں قبلہ کی طرف کر دے۔"

اسی طرح دیگر روایات سے بھی یہ ثابت ہے کہ فرضی نمازوں میں حسب استطاعت نماز کے ارکان کو ادا کرے۔ اس سے ایک تو نماز کی اہمیت ثابت ہوئی کہ یہ انسان پر ایسا فرض ہے کہ جب تک ہوش و حواس قائم ہوں اور اس کو جس صورت سے بھی ادا کر سکے' ضرور ادا کرے۔ ترک نہ کرے کہ یہ سخت جرم ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ نماز کے جس قدر ارکان ہیں۔ قیام' رکوع' سجود وغیرہ حسب استطاعت ضرور ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ اس وقت ساقط ہوتے ہیں جب طاقت نہ رہے۔ چنانچہ منتقی میں باب باندھا گیا ہے کہ : باب الصلٰوۃ فی السفینۃ (یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ کشتی جہاز وغیرہ جو پانی پر چلتے ہیں' ان میں نماز کا وقت آجائے تو نماز کس طرح پڑھے) اس کی کیفیت ثابت کرنے کے لیے یہ حدیث پیش کی ہے :

عن ابن عمر قال سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم کیف اصلی فی السفینۃ قال صل فیھا قائما الا ان تخاف الغرق۔ (رواہ الدارقطنی والحاکم) یعنی "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اگر میں کشتی میں سوار ہو جاؤں تو نماز کیسے ادا کروں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نماز کھڑے ہو کر ادا کرے' ہاں اگر کشتی ایسی ڈگمگائے کہ انسان کو کھڑے ہونے میں گر کر غرق ہونے کا ڈر ہو تو پھر بیٹھ کر ادا کرے۔"

اس حدیث پر عالم ربانی امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : فیہ ان الواجب علی من یصلی فی السفینۃ القیام ولا یجوز القعود الا لعذر مخافۃ غرق او غیرہ لان مخافۃ الغرق تنفی عنہ الاستطاعۃ قد قال اللہ تعالٰی فاتقوا اللہ ما استطعتم وثبت من حدیث ابن عباس رضی اللہ عنھما اذا امرتم بامر فاتوا منہ ما استطعتم وھی ایضا علو اشد من العرض۔ "یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کشتی میں نماز کھڑے ہو کر ادا کرنی واجب ہے اور بیٹھ کر پڑھنی جائز نہیں ہے مگر یہ کہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہو یا اور خوف ہو۔ کیونکہ غرق ہونے کے خوف سے استطاعت نہ رہی اور فرض کی ادائیگی حسب استطاعت فرض ہے جیسے فرمایا اللہ تعالٰی نے جس قدر طاقت رکھتے ہو اللہ سے ڈرو۔"

اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں ارشاد ہے کہ جب تم کسی چیز کا حکم کیے جاؤ تو حسب طاقت اس کو بجا لاؤ۔ کشتی میں غرق ہونے کا خوف بیماری سے بڑھ کر ہے۔ جب بیمار

کو حسب طاقت قیام وغیرہ ارکان ادا کرنے پڑتے ہیں اور طاقت نہ ہو تو نہیں۔ اسی طرح کشتی کا معاملہ ہے۔

نیل الاوطار میں اسی باب کے تحت بزار اور بیہقی کی ایک روایت درج ہے جو جابر بن عبداللہ سے مرفوعاً آئی ہے۔ اس میں یہ ارشاد ہے: صل علی الارض ان استطعت الا فاؤم ایماء واجعل سجودک اخفض من رکوعک۔ یعنی "حسب استطاعت نماز زمین پر ادا کرے۔ اگر طاقت نہ ہو تو پھر بیٹھ کر اشارہ سے ادا کرے' لیکن سجدہ بہ نسبت رکوع نیچے ہو کر ادا کرے۔"

ان دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ قیام نماز میں فرض ہے۔ یہ حسب استطاعت ادا کرنا واجب ہے۔ لہذا اونٹ' گھوڑا' ریل' موٹر' کشتی اور بحری جہاز وغیرہ پر نماز فرض بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں اور نہ بیماری میں جائز ہے جیسا کہ عام لوگ پڑھتے ہیں کہ معمولی بخار' معمولی ٹانگوں میں تکلیف ہو یا آنکھوں میں تکلیف ہو تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے ہیں' حالانکہ وہ قیام کی استطاعت رکھتے ہیں۔ تو ان کے لیے جائز نہیں' نماز نہ ہو گی۔ ہاں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو' یا خوف غالب ہو دشمن کا یا غرق ہونے کا' یا ہوائی جہاز پر سے گرنے کا تو نماز بیٹھ کر سواری پر جائز ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے کہ میدان جنگ میں جبکہ دشمن مقابلہ پر ہو تو جس طرح ممکن ہو سوار یا پیدل کھڑے یا چلتے قبلہ رخ ہو یا نہ ہو' نماز ادا کر لے۔

مسلم شریف میں ہے کہ سخت خوف کے وقت اشارہ سے ہی نماز پڑھ لیا کرو گو سواری پر سوار ہو۔ ابن ماجہ میں ہے' نماز خوف کی کیفیت بیان کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا: فان کان خوف اشد من ذلک فرجالا او رکبانا۔ یعنی "اگر خوف سخت لاحق ہو تو جس طرح ممکن ہو دشمن کے مقابلہ کے وقت پیدل یا سواری پر نماز پڑھ لو۔"

یہ سب فرضی نماز کا حکم بیان ہوا ہے کہ بغیر عذر شدید سواری پر جائز نہیں ہے۔ ہاں نفلی نماز اپنے اختیار سے سواری پر پڑھنی جائز ہے۔ چنانچہ سنن نسائی کے ص-۸۶ میں یہ حدیث درج ہے: عن سالم عن عبداللہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی علی الراحلۃ قبل ای جھۃ توجہ بہ ویوتر علیھا غیر انہ لا یصلی علیھا المکتوبۃ۔ یعنی "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جناب سید الانبیاء ﷺ نفل نماز سواری پر ادا کر لیا کرتے تھے۔ خواہ سواری کسی طرف متوجہ ہو کر چلتی اور نماز

وتر بھی سواری پر ہی پڑھ لیا کرتے تھے مگر یہ کہ فرض نماز سواری پر نہ پڑھتے تھے۔"
یعنی فرض نماز زمین پر ہی ادا فرماتے تھے جیسا کہ بیہقی اور بزار کی روایت میں گزرا کہ آنحضرت ﷺ نے حسب استطاعت فرض نماز زمین پر ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے
ہاں نفل نماز ہلکے درجہ کی نماز ہے' یہ سواری پر بھی جائز ہے۔ چنانچہ سنن نسائی کے ص۷۵ میں یہ حدیث وارد ہے : كان يسبح على الراحلة قبل اى وجه توجه ويوتر عليها غير انه لا يصلى عليها المكتوبة یعنی "نبی اکرم ﷺ سواری پر نفل نماز پڑھ لیتے تھے' خواہ سواری کسی طرف متوجہ ہوتی مگر فرض نماز سواری پر نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ وتر پڑھ لیا کرتے تھے۔" (کیونکہ یہ نماز بھی مسنون ہے)
سواری کے علاوہ بھی نفل نماز زمین پر بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیام اس میں فرض نہیں ہے۔
سنن نسائی جلد اول' ص۱۹۲ میں ہے :عن ام سلمة قالت ما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى كان اكثر صلوته جالسا الا المكتوبة یعنی "حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے رحلت نہ فرمائی تھی یہاں تک کہ آخری وقت آپ کی نفلی نماز اکثر اوقات بیٹھ کر ہوتی تھی مگر فرض نماز آپ نے بلا عذر کبھی بیٹھ کر نہیں پڑھی۔"
دوسری حدیث یوں ہے :عن ام سلمة رضى الله عنها ما مات رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى كان من اكثر صلوته قاعدا الا الفريضة یعنی "حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے وفات نہ پائی یہاں تک کہ آخری عمر میں نفلی نماز اکثر آپ بیٹھ کر پڑھتے رہے مگر فرض نماز بغیر عذر کے آپ نے بیٹھ کر نہیں پڑھی۔"
آپ بھی اگر کوئی نفلی نماز بیٹھ کر پڑھ لیں تو جائز ہے لیکن بغیر عذر کے پڑھیں گے تو نصف نماز کا ثواب ملے گا۔ مثلاً چار رکعت بیٹھ کر پڑھیں یا دو رکعت تو چار میں ثواب دو رکعت کا اور دو میں ایک رکعت کا ثواب ملے گا۔
آنحضرت ﷺ کو نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے پر پورا ثواب ملتا تھا' یہ شان نبوت کی وجہ سے آپ کا خاصہ تھا۔ لیکن فرضی نماز نبی کی ہو یا غیرنبی کی' زمین پر یا سواری پر بیٹھ کر نہیں پڑھ

مسئلہ اب جو لوگ ریل اور موٹروں میں بیٹھ کر فرض نمازیں بیٹھ کر ادا کرتے ہیں' یہ سراسر باطل ہے۔ کیونکہ یہ خشکی کی سواریاں ہیں' جن میں سے اتر کر زمین پر نماز پڑھنا ضروری ہے' کیونکہ قیام اور قبلہ رخ ہونا فرض ہے۔ ہاں اگر ریل وغیرہ میں قیام سے اور قبلہ رخ ہو کر نماز ادا ہو سکے تو پھر ادا کر لے ورنہ نمازوں کو جمع کر کے پڑھے' یا زمین پر اتر کر نماز کو اس کے وقت پر ادا کرے کہ ریل اور موٹر پر دوسرے وقت سوار ہو کر جا سکتا ہے۔ ایک ہی وقت لگاتار ریل یا موٹر پر سفر کرنا فرض نہیں ہے۔ نماز فرض ہے' نہ اس کو ترک کرنا جائز ہے کہ یہ کفر بواح ہے اور نہ اس کے کسی فرض اور رکن کو استطاعت کے ہوتے ہوئے ترک کرنا جائز ہے۔

عہد حاضر میں عوام بلکہ خواص بھی نماز کے بارے میں سخت غفلت اور کوتاہی کر رہے ہیں' یا صاف ترک کر دیتے ہیں وہ تو کافر ہو جاتے ہیں' یا نماز کے ارکان کو اپنے قیاسی عذر سے گرا کر نمازیں پڑھتے ہیں' یہ بھی جرم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت فرمائے اور شرعی احکام کی پابندی کی توفیق بخشے' آمین۔

اگر سفر میں بارش کا عذر لاحق ہو کہ سواری سے نیچے اتر کر نماز پڑھنی مشکل ہو جائے تب بھی اونٹ' گھوڑا وغیرہ سواری پر فرض نماز پڑھنا جائز ہے۔ چنانچہ سنن دارقطنی و ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث وارد ہے۔ یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: انتھینا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی مضیق السماء من فوقنا والبلة من اسفلنا وحضرت الصلوة فامرا لمؤذن فاذن واقام او اقام بغیر اذان ثم تقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصلی بنا علی راحلته وصلینا خلفه علی رواحلنا وجعل سجوده اخفض من رکوعه یعنی "ایک موقع پر سفر کا یہ واقعہ ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بارش کے میدان میں تکلیف و تنگی میں پہنچے کہ اوپر سے بارش ہو رہی تھی اور نیچے زمین پر کیچڑ تھی۔ نماز کا وقت آگیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤذن کو حکم دیا' اس نے اذان دے کر اقامت کہی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر سامنے ہو کر ہم کو نماز پڑھائی اور ہم نے اپنی اپنی سواریوں پر آپ کے پیچھے (سواریاں کھڑی کر کے) نماز پڑھی۔ آپ اشارہ سے نماز پڑھتے تھے کہ سجدہ کو رکوع سے بہت پست کرتے تھے۔"

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر بارش وغیرہ کا کوئی عذر ہو کہ زمین پر اتر کر نماز

پڑھنے میں دشواری اور تکلیف ہو مثلاً بیمار ہو تو سواری پر فرض نماز پڑھنی جائز ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب باندھا ہے: باب ماجاء فی الصلوٰۃ علی الدابۃ فی الطین والمطر۔ یعنی "باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ اگر بارش اور کیچڑ ہو تو سواری پر نماز جائز ہے۔" پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث مذکور پیش کر کے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ: العمل علی ھذا عند اھل العلم وبه یقول احمد واسحاق۔ یعنی "اہل علم کا خصوصاً امام احمد اور اسحاق کا اسی پر عمل اور فتویٰ ہے۔"

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور، مورخہ ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء

نمازی کے سامنے جوتے رکھنے کیسے ہیں؟

سوال: مسجدوں میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی جوتیاں سامنے رکھ کر نمازیں پڑھتے ہیں۔ بعض علماء اس سے منع کرتے ہیں اور بعض جائز کہتے ہیں۔ اس کے متعلق اصل تحقیق کیا ہے؟ (ایک سائل)

جواب: الجواب بعون الوھاب۔ اصل تحقیق یہ ہے کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ کپڑے وغیرہ سے ڈھانک دی جائیں ورنہ نمازی کے آگے رکھنا یا دائیں طرف رکھنا منع ہے جیسا کہ معجم صغیر طبرانی کی ایک روایت میں صراحتاً موجود ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں: عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال اذا خلع احدکم نعلیه فی الصلوٰۃ فلا یجعلھما بین یدیه فیاثم بھما ولا من خلفه فیاثم بھما اخوہ المسلم ولکن لیجعلھما بین رجلیه یعنی "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لیے جوتیاں اتارے تو ان کو اپنے سامنے نہ رکھے کہ پھر نماز میں ان کی اقتدا کرے گا اور نہ پیچھے رکھے کہ اس کا بھائی مسلمان ان کی اقتدا کر بیٹھے گا لیکن ان کو دونوں پاؤں کے درمیان رکھ لے۔"

ابوداؤد کی روایت لیجعلھما بین رجلیه او لیصل فیھما سے ظاہر ہے کہ جوتیاں پاؤں کے درمیان ہوں یا ان میں نماز پڑھو' اس حدیث پر کوئی بھی عمل نہیں کرتا۔ اگر پاؤں کے درمیان رکھیں گے تو جوتیاں پچھلے نمازیوں کے سامنے ہو جائیں گی اور اس سے سامنے کا جواز نکل آئے گا۔ ہاں یہ یاد رہے کہ پاؤں کے درمیان رکھنے کے حکم سے دوسری جگہ رکھنے

کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی ورنہ سب کو ہی کسی دوسری جگہ جوتی رکھنی ممنوع ہو گی۔ ولم یقل بہ احد فتذکر' ھذا ما عندی واللہ اعلم۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہلحدیث کراچی جلد۔۳۴' شمارہ ۵ بابت یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۸۵ھ

نماز میں سلام کا جواب دینا

اخبار "الاعتصام" جلد۔۲۰' شمارہ ۳۷ بابت ۱۳/ محرم ۱۱/ اپریل سنہ ۱۹۶۹ء باب الفتاویٰ میں چند سوال وجواب شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو قابل تنقید و تبصرہ ہیں' وہ نمبروار درج ذیل ہیں۔

سائل نے مفتی صاحب سے سوال کیا تھا "کیا نماز اور قرآن پڑھتے وقت سلام نہیں کہنا چاہیے؟"

مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ: "نماز اور قرآن پڑھتے وقت سلام نہیں کہنا چاہیے۔"

سائل کی درخواست تھی کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے لیکن مفتی صاحب نے بلا دلیل اہل الرائے کی طرز پر جواب دیا ہے۔ جس میں قرآن وحدیث کی روشنی کی بجائے قول بالرائے کا اندھیرا ہے۔

نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ مفتی صاحب کا جواب مذکورہ غلط ہے اور صحیح جواب یہ ہے کہ قاری قرآن اور نمازی کو سلام کہنا جائز ہے۔ قرآن مجید کا یہ حکم ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا۔ (الایۃ) "جو چیز تم کو رسول (ﷺ) دے دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے تم کو منع کریں' اس سے باز رہو۔"

اب حکم رسول کریم ﷺ ملاحظہ فرمایئے کہ "مسلمان کے مسلمان پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: ویسلم علیہ اذا لقیہ۔ اور دوسری حدیث میں یہ ارشاد ہے: اذا لقی احدکم اخاہ فلیسلم علیہ "جس وقت کوئی تمہارا اپنے مسلمان بھائی کو ملے تو اس پر سلام کہے۔" اور تیسری حدیث میں ہے: واذا دخلتم بیتا فسلموا علی اھلہ

یہ تینوں احادیث مشکوٰۃ کے باب السلام میں درج ہیں۔ ان ارشادات عام سے یہ ثابت ہوا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو جب ملے تو اس کو ہر حال میں سلام کہے بغیر اس

حالت کے جس کی ممانعت شارع سے ثابت ہو چکی ہو۔

جب کوئی قاری قرآن اور نمازی پر وارد ہو تو اس کو سلام کہے' کیونکہ اس کی ممانعت کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ من ادعی ذلک فعلیه البیان بالبرهان۔

بلکہ اس کے برعکس عہد نبوی اور عہد صحابہ کرام میں سلام کہنا عملاً ثابت ہے۔ چنانچہ منتقی الاخبار مع شرح نیل الاوطار ج۲ ثانی' ص۳۲۵ میں ایک باب یوں منعقد ہے : باب الاشارة فی الصلوٰة لرد السلام او حاجة تعرض۔ "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ اگر نماز میں کوئی سلام کہہ دے یا کوئی حاجت پیش آجائے تو نمازی اس کو ہاتھ کے اشارہ سے جواب دے۔"

پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے : وعن ابن عمر قال قلت لبلال کیف کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یرد علیهم حین کانوا یسلمون علیه وهو فی الصلوٰة قال یشیر بیده۔ (رواہ الخمسة) "حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے اس وقت جو لوگ آپ کو سلام کہتے تھے تو اس کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح دیا کرتے تھے؟ تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا کہ آپ اپنے ہاتھ سے اشارہ فرما دیا کرتے تھے۔"

پس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بحالت نماز صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا کرتے تھے تو آپ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی بلکہ ہاتھ کے اشارہ کے ساتھ جواب دے دیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ نمازی کو بحالت نماز سلام کہنا جائز ہے۔ اس لیے قاری قرآن کو بھی سلام کہنا ثابت ہو گیا بلکہ بالاولیٰ ثابت ہوا کیونکہ وہ نماز سے باہر ہے' جو زبان سے بھی جواب دے سکتا ہے' اس کو اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دیگر روایت میں یہ ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا : مررت برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یصلی فسلمت فرد الی اشارة "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا' اس حال میں کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ پس میں نے آپ کو سلام کہا تو آپ نے اشارہ سے جواب دیا۔"

اس سے ثابت ہوا کہ نماز پڑھتے ہوئے شخص کو سلام کہنا جائز ہے اور اس کا جواب سنت یوں ہے کہ ہاتھ سے اشارہ کر دے۔ مخفی نہ رہے کہ حدیث اول میں الفاظ کانوا

بمضمون وارد ہیں جو استمرار پر دلالت کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوا کہ عہد نبوی میں بحالت نماز سلام لینے کا عام معمول تھا۔

ان احادیث پر امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: والاحادیث المذکورة تدل علی انه لا بأس ان یسلم غیر المصلی علی المصلی لتقریره صلی الله علیه وسلم من سلم علیه علی ذلک وجواز تکلیم المصلی بالغرض الذی یعرض لذلک وجواز الرد بالاشارة۔ "احادیث مذکورہ اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہیں کہ غیر مصلی' مصلی (نمازی) کو سلام کہہ دے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ نے سلام کہنے والوں کے سلام کو برقرار اور جائز رکھا ہے اور منع نہیں فرمایا۔"

اور یہ بھی جائز ثابت ہوا کہ نمازی کسی حاجت لاحق ہونے پر اشارہ سے جواب دے سکتا ہے۔ اس پر دیگر محدثین نے بھی صراحت کی ہے' اہلحدیث کا یہی مذہب ہے۔

حاشیہ نسائی تعلیقات سلفیہ جلد اول' ص-۱۳۰ حاشیہ نمبر-۴ میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب محدث بھوجیانی' حدیث رد السلام پر یہ ارشاد فرماتے ہیں: ای رد اشارة یرید انه رد علیه بالاشارة هذا فعل قلیل لا ینافی الصلوة وقد صرح به العلماء قاله السندی ویستحب رد السلام فی الصلوة بالاشارة قال الشافعی والجمهور استدلوا باحادیث الباب الحنفیة منعوه۔ "حدیث میں جو سلام کا جواب دینا مذکور ہے' اس سے اشارہ سے جواب دینا مراد ہے۔ یہ فعل قلیل ہے جو نماز کے منافی نہیں ہے جیسا کہ علماء اہلحدیث نے اس کی تصریح کی ہے۔ علامہ سندھی نے حاشیہ نسائی میں یہ فرمایا ہے کہ نماز میں سلام کا جواب اشارہ سے دینا مستحب ہے اور امام شافعی اور جمہور علماء محدثین نے احادیث مذکورہ سے استدلال کرتے ہوئے جائز کہا ہے اور علماء احناف نے اس سے منع کیا ہے۔"

اس مسئلہ میں اہلحدیث اور احناف کا مشہور اختلاف ہے' جس کی مکمل بحث کتاب "ابکار المنن" مصنف حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے ص-۲۳۱ سے ص-۲۷۰ تک درج ہے۔ جس میں مسلک اہلحدیث کو حق اور صحیح ثابت کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تحقیق حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور جلد-۲۲' شمارہ-۲۳ مورخہ ۲۹/ اگست سنہ-۱۹۶۹ء

ننگے سر نماز اور فاتحہ خلف الامام کے بارے میں استفسار

سوال: (۱) جان بوجھ کر ننگے سر نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟
(۲) فاتحہ خلف الامام کے بارے مفصل تحریر کریں۔ وإذا قرئ القرآن تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہوا ہے کہ یہ آیت فی الصلوٰۃ سورہ فاتحہ کو منع کرتی ہے۔

جواب: (۱) ننگے سر نماز پڑھنی جائز ہے کیونکہ سر ستر میں داخل نہیں ہے۔ ناف سے گھٹنوں تک اور دونوں کندھوں کو ڈھانکنا واجب ہے۔ آنحضور ﷺ نے کپڑے پاس ہوتے ہوئے ایک کپڑے میں نماز پڑھی ہے اور سر ننگا تھا۔ چنانچہ مسند ابو عوانہ جلد ۲، ص ۶۳ میں ہے: عن جابر انه رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي في ثوب واحد مخالفا بين طرفيه على عاتقيه وثوبه على المشجب۔ یعنی "حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے تھے جس کی دونوں طرفیں کندھوں پر تھیں اور آپ کے دوسرے کپڑے تپائی پر رکھے ہوئے تھے۔"

اس صورت میں سر ننگا تھا جس سے ثابت ہوا کہ ننگے سر نماز جائز ہے۔

(۲) فاتحہ خلف الامام فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہو گی۔ حدیث کتاب القراۃ بیہقی میں ہے: عن عبادة ابن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا صلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب خلف الامام۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہ ہو گی۔"

باقی آیت وإذا قرئ القرآن میں فاتحہ کی ممانعت نہیں ہے۔ یہ آیت جس نبی کریم ﷺ پر اتری تھی اس نے فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہے، اس لیے فاتحہ مقتدی کو پڑھنی پڑے گی۔ اگر فاتحہ کا مسئلہ پورا دیکھنا ہو تو رسالہ فاتحہ خلف الامام کراچی جنس روڈ مکتبہ سعودیہ سے منگوا لیں۔ اس میں سب دلائل ہیں اور مخالفین کے پورے جواب ہیں۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری
فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم، ص ۱۰۲-۱۰۳

مرد کو مہندی لگانا اور ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال : (۱) بخاری شریف کے ص۔ ۵۰' پارہ نمبر ۲۱ میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی جس وقت شادی ہوئی تو انہوں نے مہندی لگائی ہوئی تھی اور رسول اللہ ﷺ سے ملے تو آپ نے فرمایا کہ مہندی کیوں لگائی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ایک انصار عورت سے شادی کی ہے۔ آپ اس حدیث کو پڑھیں اور نتیجہ نکالیں کہ آیا مہندی لگانا جائز ہے؟

(۲) مشکوٰۃ شریف حصہ اول' نمبر ۔ ۱۴' حدیث نمبر ۱۰۷ کے حوالہ سے بتائیں کہ ننگے سر نماز جائز ہے؟ حدیث سے حوالہ دیں۔ ان سوالات کا تفصیلاً جواب ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

سائل : محمود الحسن حلوائی' ڈھڈیال تحصیل چکوال ضلع جہلم

جواب : (۱) بخاری شریف میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ والی حدیث ملاحظہ کی گئی ہے' اس میں مہندی لگانے کا کوئی ذکر نہیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں : عن انس ابن مالک ان عبدالرحمٰن بن عوف جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم به اثر صفرۃ فسأله رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فاخبره انه تزوج امراۃ من الانصار۔ (الحدیث) یعنی "انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے' ان پر زردی کا نشان تھا۔ آپ نے اس کی وجہ پوچھی' انہوں نے کہا کہ میں نے ایک انصاری عورت سے نکاح کیا ہے۔"

اس حدیث میں مہندی لگانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مہندی کو عربی میں "حناء" کہتے ہیں۔ اس حدیث میں زردی کا ذکر ہے جس سے مراد زرد خوشبو ہے جو عرب میں عورتیں بنا کر لگاتی ہیں اور اس وقت بھی لگاتی تھیں۔ اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یوں باب باندھا ہے : باب الصفرۃ للمتزوج یعنی "زرد خوشبو نوشہ کو لگانے کا حکم" پھر اس کے ثبوت کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی ہے۔ وہ زرد خوشبو جسم پر تھی یا کپڑوں پر تھی' اس کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر بدن پر تھی تو ہاتھ پر تھی یا چہرہ پر تھی' کچھ ذکر نہیں۔ بہرحال ہاتھ پاؤں پر مہندی نہ تھی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ زرد خوشبو مرد کو لگانا جائز ہے یا نہیں؟ حنفیہ' شافعیہ کہتے ہیں کہ جائز نہیں ہے اور اس حدیث سے جواز نہیں نکلتا کیونکہ احتمال ہے کہ ان کی دلہن کے زردی لگی ہوئی تھی' ان سے ملاپ ہوا تو ان کے لگ گئی' مرد کو خود قصداً لگانی جائز نہیں۔ حدیث میں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں کرتا جس کے زرد خوشبو لگی ہو۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ مرد کو جائز ہے۔ باب بخاری سے ظاہر ہے کہ امام بخاری نوشاہ (دولہا) کے لیے جائز رکھتے ہیں۔ بظاہر حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔

(نوٹ) میرے خیال سے یہ ابٹنہ ہو گا جیسا کہ آج کل ہندوستان وپاکستان میں رواج ہے' دولہا کے ابٹنہ ملتے ہیں جو جائز ہوا۔

(۲) مشکوۃ وغیرہ تمام کتب حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک کپڑے میں نماز پڑھنا ثابت ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ کپڑے کی مخالف طرفوں کو بغلوں کے نیچے سے نکال کر کندھوں پر ڈالنا۔ سو اس صورت سے سر ننگا رہتا ہے' پس ننگے سر نماز جائز ہے۔ سر ڈھانکنا کسی کے نزدیک واجب نہیں۔ یہ سنت زائدہ ہے' سنت ہدیٰ اور تعبدی نہیں ہے۔ اگر عمل کرے تو اچھا ہے اگر نہ کرے تو نماز ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے حاجیوں پر احرام میں سر ڈھانکنا جائز نہیں رکھا گیا کہ اس کے بغیر نماز' طواف سب عبادت روا ہے۔ جوتے سے نماز پڑھنا بھی سنت ہے مگر ننگے پاؤں روا ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص ۱۸۱ تا ۱۸۳

ننگے سر نماز اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اخبار الاعتصام ۱۴/ دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ننگے سر نماز کی تحقیق کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ جب کسی مسئلہ کے متعلق فرماتے ہیں "احب الی" تو اس سے مراد وجوب ہوتا ہے۔ اس سے یہ مقصد ظاہر کیا گیا ہے کہ امام مالک کے نزدیک سر ڈھانکنا واجب ہے' حالانکہ یہ دونوں باتیں سراسر غلط ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت المفتی مدظلہ

نے موطا میں "احب الی" والے تمام مقامات پر بالاستیعاب نظر نہیں ڈالی بلکہ ایک آدھ مقام میں یہ جملہ دیکھ کر یہ کلیہ مرتب کر لیا ہے ورنہ موطا پڑھنے پڑھانے والے یہ خوب جانتے ہیں کہ نہ امام مالک رحمہ اللہ کا اس مسئلہ ننگے سر نماز میں مذہب وجوب کا ہے اور نہ ان کی یہ اصطلاح ہے کہ "احب الی" سے مراد وجوب ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ آیت "خذوا زینتکم" لکھ کر اس پر یوں باب باندھتے ہیں : "باب وجوب ستر العورة فی الصلوٰة" یعنی "یہ باب نماز میں ستر ڈھانکنے کے واجب ہونے کے بیان میں ہے۔" اس باب کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ امام مالک کے نزدیک آیت مذکورہ میں امر وجوب کے لیے ہے اور اس سے زینت واجبہ مراد ہے اور وہ ستر عورت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ مرحوم محدث دہلوی بھی "مسوی" میں فرماتے ہیں کہ "الزینة ما واری عورتک ولو عباءة" یعنی "زینت سے مراد وہ کپڑا ہے جس سے ستر ڈھانکا جا سکے۔"

پھر امام مالک نے ایک کپڑے کی احادیث لا کر یہ ثابت کیا ہے کہ آیت سے مراد زینت واجبی ہے اور وہ کندھوں سے گھٹنوں تک ہے' باقی زینت زائد ہے۔ چنانچہ موطا میں یہ روایت ہے : ان محمد بن عمرو بن حزم کان یصلی فی القمیص الواحد یعنی "محمد بن عمرو صحابی رضی اللہ عنہ ایک کرتہ میں نماز پڑھتے تھے۔" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی جو کیفیت مروی ہے اس سے سر کا ننگا رہنا اظہر من الشمس ہے۔ جو کچھ ان روایات سے ظاہر ہے وہی امام مالک کا مذہب ہے۔

بنابریں حاشیہ ہدایہ میں ہے کہ وعادته ان لا یروی حدیثا فی الموطا الا وھو یذھب الیه ویعمل به۔ یعنی "امام مالک کی یہ عادت مبارک ہے کہ موطا میں جو حدیث لاتے ہیں وہی ان کا مذہب ہوتا ہے اور اسی پر وہ عامل ہوتے ہیں۔"

"زرقانی" سے جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہیں وہ دونوں کندھوں پر کپڑا ڈالے یا اپنے سر پر عمامہ باندھے۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور وہ کہتے ہیں میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ مجھے یہ "موطا مع مصفیٰ و مسویٰ" میں نہیں ملا زرقانی میں ہو تو واللہ اعلم' مگر اس میں پگڑی کا لفظ بالکل سیاق کلام کے خلاف ہے' کیونکہ پگڑی سے کپڑے دو ہو جائیں گے حالانکہ وہ مسئلہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا بیان کر رہے ہیں۔ پھر ایک کپڑے میں نماز کی جو کیفیت مروی ہے اس میں پگڑی کا ذکر نہیں' کندھوں کا ذکر ہے۔

امام زرقانی نے کندھے ڈھانپنے کی روایت لا کر اس کی وضاحت کر دی۔ اگر عمامہ کی روایت ایک کپڑے کی کیفیت کے ساتھ ہوتی تو اس کی بھی وضاحت کر دیتے۔ اگر احب الیہ وجوب پر دال ہوتا تو ابوہریرہ اور محمد بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایتیں نہ لاتے۔ اگر لائے تھے تو ان کا کوئی مقصد ظاہر فرماتے۔ پھر سر ڈھانکنے کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔ امام مالک ایسے جلیل القدر محدث اس کے قائل کس طرح ہو سکتے تھے۔

ہاں کندھوں کے ڈھانکنے کا وجوب ثابت ہے کہ اس بارہ میں یہ روایت آچکی ہے۔ اذا صلی احدکم فی ثوب واحد فلیجعل علی عاتقیہ منہ شیئا۔ یعنی "جب کوئی تمہارا ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اس کا کچھ حصہ کندھوں پر ضرور کرے۔" سر کے بارہ میں اس طرح کسی جگہ امر وارد نہیں ہے۔ اس لیے سر ڈھانکنا کندھوں کے ساتھ حکم میں برابر کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہاں سر ڈھانکنا مندوب ہو سکتا ہے اور یہی لغوی اور عرفی حیثیت سے اس کلمہ (احب الی) کا اقتضا ہے کہ اس کلمہ سے مسئلہ اختلافی یا ذوالوجہین میں ایک طرف اپنا رجحان ظاہر کرتے ہیں کہ یہ صورت مجھے محبوب ہے۔ اس سے وجوب مراد نہیں لیتے فضیلت مراد لیتے ہیں۔

چنانچہ موطا مع شرح مصفیٰ ص-۲۵۵ میں ہے کہ صیام الدھر کے متعلق وہ فرماتے ہیں : وذالک احب ما سمعت الی فی ذالک۔ یعنی "میں نے اس بارہ میں جو سنا ہے وہی مجھے بہت پسندیدہ ہے۔" یہ واضح بات ہے کہ صیام دہر کسی کے نزدیک واجب نہیں' البتہ ان کے جواز عدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض مطلقاً ناجائز کہتے ہیں اور بعض ایام ممنوعہ (عیدین اور ایام تشریق) نکال کر پھر ہمیشہ روزے رکھنے کے جواز کے قائل ہیں۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ یہی مسلک مجھے پسندیدہ ہے۔ اب اس کا یہ مطلب ہرگز درست نہیں کہ میں صیام الدھر کے وجوب کا قائل ہوں۔

اسی طرح موطا کے ص-۲۶۵ میں ہے : وھذا احب ما سمعت الی فی ذالک۔ یہ معتکف کے بارہ میں فرمایا ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ معتکف عید کا چاند دیکھتے ہی گھر چلا جائے یا عید کی رات مسجد میں گزارے اور مسجد سے سیدھا عیدگاہ جائے اور نماز عید سے فراغت کے بعد گھر لوٹے' امام مالک یہی پسند فرماتے ہیں۔

حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ لیلۃ العید عشرہ اخیرہ میں داخل نہیں بلکہ وہ شوال کی پہلی

رات ہے۔ یہ صرف مستحب ہے کہ نماز عید تک اعتکاف کی جگہ میں استقرار کرے اور عید کی رات کے قیام کا ثواب حاصل کرے لیکن کسی کے نزدیک واجب نہیں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ امام مالک کے نزدیک یہ واجب تھا؟ الا من سفه نفسه

پھر ص ۲۵۰ میں فدیہ صیام میں شیخ فانی کا ذکر کرتے ہوئے یہی جملہ (احب الی) ارشاد فرماتے ہیں: قال مالک ولا اری ذالک واجبا واحب الی ان یفعله ان کان قویا علیه یعنی "میں شیخ فانی پر فدیہ اطعام مسکین واجب تو نہیں سمجھتا' ہاں یہ مجھے پسندیدہ ہے کہ اگر وہ اس پر قادر ہو تو عمل کرے"

بس تین حوالے کافی ہیں اور آخری عبارت میں خود امام مالک رحمہ اللہ کا فیصلہ ہے جو اس بات پر نص ہے کہ ان کی یہ اصطلاح وجوب کے لیے نہیں محض استحباب کے لیے ہے' جیسے کہ لغت کا اقتضا ہے۔ اس سے یہ الزام رد ہوا کہ وہ اس سے وجوب مراد لیتے ہیں اور یہ الزام بھی دفع ہوا کہ وہ سر ڈھانکنے کو واجب تصور کرتے ہیں کیونکہ امام صاحب اس مقام پر اس فقرہ (احب الی) کو وجوب کے بالمقابل لائے ہیں جس سے الاعتصام کے مفتی المحترم کا کلیہ بالبداہت باطل ہوا۔

اسی طرح مجھے اس بات میں بھی سخت کلام ہے کہ مولانا غزنوی نے اپنے والد بزرگوار کے حوالہ سے یہ بیان فرمایا ہے کہ "سر اعضاء ستر سے نہیں لیکن اس کو آداب نماز کے لحاظ سے دیکھنا چاہیے' جیسے کندھے اعضاء ستر سے نہیں لیکن صحیح بخاری میں ہے کہ ایک کپڑے میں کوئی نماز نہ پڑھے جب تک اس کے کندھے پر کپڑا نہ ہو۔" گویا انہوں نے سر کو کندھوں پر قیاس کیا اور سر کو ڈھانکنا ضروری قرار دیا۔ حالانکہ یہ قیاس سراسر غلط ہے اور مجھے اس غلط بات کی ایک امام ہمام علیہ الرحمہ کی طرف نسبت کرنے میں سخت تامل ہے کیونکہ فتاوٰی نذیریہ میں بخاری کی اس روایت سے سر ڈھانکنے کے غیر ضروری ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد ۲' ص ۲۷۷ نیز ص ۲۸۴ میں اس کو سنت زائدہ بتلا کر یہ لکھا ہے کہ نفس ثواب نماز میں ٹوپی اور پگڑی وغیرہ کا کوئی دخل نہیں اور اس سے ثواب میں کمی بیشی ازروئے حدیث صحیح ثابت نہیں بلکہ ایک کپڑے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے۔

مفتی مدظلہ کے والد بزرگوار بلاشبہ ولی اللہ اور اپنے زمانہ کے مجتہد تھے لیکن حضرت

میاں صاحب مرحوم محدث دہلوی کے بلا واسطہ یا بالواسطہ شاگرد تھے وہ ان کے خلاف اس حدیث بخاری سے سر کو کندھوں پر غلط قیاس کس طرح کر سکتے تھے وہ یہ مسئلہ جانتے تھے کہ حج میں محرم کو نماز پڑھتے ہوئے کندھے ڈھانکنے ضروری ہیں اور سر وہاں ضروری کیا مستحب بھی نہیں ہے پھر سر کو کندھوں پر قیاس کرنا کیسے صحیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوار مرحوم کے خلف الرشید شاگرد حضرت مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی مفتی اعظم جماعت اہلحدیث جو ولی اللہ مرحوم کی روحانی اولاد سے ہیں' وہ حدیث بخاری مقیس علیہ سے سر ڈھانکنے کے غیر ضروری ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔

حضرت الامام غزنوی کی نسبت یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ آداب نماز (سر ڈھانکنے) کو واجبات (کندھے ڈھانکنے) پر قیاس کریں۔ طالب العلمی کے زمانہ کی روایت کو راوی کی غلط فہمی پر محمول کرنا آسان ہے لیکن ایک مسلمہ امام کی طرف کسی غلط اجتہاد کی نسبت کرنا ان کی شان کے تحت خلاف بلکہ خفت کا موجب ہے۔ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت شکار پر ایک قمیص میں نماز پڑھنے کی اجازت تو دے دی لیکن کسی شخص کو اس کی ذاتی ضرورت کی بنا پر کندھے ننگے کرنے کی اجازت نہ دی بلکہ منع کر دیا جیسا کہ حدیث بخاری لا یصلی احدکم میں ممانعت ہے اور طحاوی میں یہ روایت بھی ہے کہ نھی ان یصلی الرجل فی السراویل وحدہ لیس علیہ غیرہ یعنی اکیلے پاجامہ میں نماز پڑھنے سے آپ نے منع فرمایا' جب تک اوپر دوسرا کپڑا نہ ہو۔ فتدکرولہ

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت بزرگوار نے یہ اجتہاد کیا تھا تو پھر ہم اس کو دوسرے محکمہ میں پیش کریں گے جہاں نصوص کے مقابلہ میں ائمہ مجتہدین علیہم الرحمۃ کے اجتہادات متروک قرار دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح ان کو غیر معصوم ٹھہرا کر ان کے اجتہادات کو نظر انداز کر دیں گے جس طرح خود حضرت المفتی مدظلہ نے مسئلہ خطبہ میں ان کا اجتہاد متروک العمل قرار دے رکھا ہے کہ ان کے والد مرحوم کا یہ فتویٰ ہے کہ خطبہ جمعہ وغیرہ عربی زبان میں ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی عجمی میں کرے گا تو یہ بدعت ہے۔ (ملاحظہ ہو مجموعہ فتاویٰ غزنویہ) اب اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو مرحوم کی اولاد جسمانی اور روحانی کو عجمی زبان میں خطبہ دینے کے سبب سے اہل بدعت قرار دینا پڑتا ہے جو ہمیں کسی صورت گوارا نہیں ہے تو اس اجتہادی فتویٰ کو چھوڑ دینا بہتر ہے۔

میزان شعرانی میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان قابل عمل و یقین ہے کہ یقول ما من احد الا وما خوذ من کلامہ ومردود علیہ الا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کہ جن کی سب کلام شرعی واجب القبول ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم۔

نوٹ : سر ننگے نماز پڑھنے کے جواز وعدم جواز پر ہمیشہ سوال بلکہ نزاع ہوتے تھے' راقم الحروف نے اس موضوع پر دو رسالے لکھے ہیں۔ ایک بنام ضرب الناس علی مانع الصلٰوۃ لکاشف الراس جو زیر طبع ہے اور دوسرا بنام "دو شخصوں کا دلچسپ علمی مکالمہ" یہ مکمل ہے جس کی طباعت زیر تجویز ہے۔ ان ہردو رسالوں میں اس مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر علمی رنگ میں اس قدر مفصل بحث کی گئی ہے کہ اظہار حقیقت کے لیے بہت کافی ہے۔ اب نہ کسی اہلحدیث یا حنفی کو اس سے انکار کرنے کی گنجائش ہے اور نہ اس پر اثباتاً یا نفیاً کچھ لکھنے کی گنجائش چھوڑی گئی ہے۔ باقی ضد اور تعصب اور عناد کا علاج نہ انبیاء کے پاس تھا اور نہ اطباء کے پاس ہے۔ والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور جلد ۱۳' شمارہ ۳۱' مورخہ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۶۰ء

ننگے سر نماز پڑھنے کا مسئلہ

"خدام الدین" کے فتویٰ پر ایک نظر!

مولانا رشید احمد گنگوہی کا فیصلہ

ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور دیوبندی حنفی مذہب کا اخبار مشہور دیار ہے اس کا شمارہ ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء میں صفحہ ۱۵ پر ضروریات نماز کا نقشہ درج ہے جس کے تحت ایک عنوان "مکروہ فاسد" بھی لکھا ہے' اس میں نماز کے مفاسد اور مکروہات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات یہ ذکر کی ہے "ننگے سر نماز پڑھنا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ "خدام الدین" کے سرپرستوں کے نزدیک ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ اور مفسد نماز ہے۔ حالانکہ از روئے شریعت محمدیہ یہ خیال بالکل باطل ہے۔

بندہ نے ایک حنفی مفتی صاحب کے جواب میں اس مسئلہ کی تحقیق لکھ کر مضمون "تنظیم اہلحدیث" کو بھیجا تھا مگر خدا جانے وہ کیوں شائع نہ ہوا؟ اس لیے یہ دوسرا مضمون لکھا گیا تاکہ اس مسئلہ کے متعلق غلطی کی اصلاح ہو جائے۔ واضح ہو کہ ننگے سر نماز پڑھنا جائز اور مشروع ہے' مکروہ اور مفسد نہیں۔

چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ کے ص-۲۷۶ پر سوال درج ہے کہ "اگر امام بلا عمامہ نماز پڑھا دے تو کیا مکروہ ہو گی' تنزیہی یا تحریمی؟" اس کا جواب یہ دیا گیا ہے جو ص-۲۷۷ پر درج ہے کہ صلوۃ بلا عمامہ مکروہ نہیں' نہ تحریمہ نہ تنزیہ البتہ ترک افضل ہے۔

اس فتویٰ سے "خدام الدین" کا یہ مسئلہ کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ اور فاسد ہے' غلط ہو گیا۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا جو مرتبہ علماء دیوبند میں ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ علماء دیوبند میں ان کا ہم پایہ کوئی عالم نہیں ہے کیونکہ مولانا گنگوہی کا دعویٰ ہے کہ "حق تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری زبان سے غلط نہیں نکلوائے گا" (حکایات اولیاء ص-۳۰۸)

تمام علمائے دیوبند اول سے آخر تک ایک طرف ہوں اور مولانا گنگوہی ایک طرف تو حق مولانا گنگوہی کی جانب ہو گا۔

چنانچہ حکایات اولیاء کے ص-۳۰۳ میں ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ تخت پر جلوہ افروز ہیں اور مجھے سامنے کھڑا کیا ہے اور مجھ سے امتحاناً سو مسئلے پوچھے اور سو کے سو کا میں نے جواب دے دیا ہے اور آپ نے سب کی تصویب فرمائی اور نہایت مسرور ہوئے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس روز سے میں نہایت خوش ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اگر سارے عالم میرے خلاف ہوں گے تو انشاء اللہ حق میری جانب ہو گا۔

امیر الروایات کی روایت سے یہ حکایت مولانا گنگوہی تک پہنچی ہے جو تمام علمائے حنفیہ پر حجت ہے' ان کے مقابلہ میں "خدام الدین" یا دیگر احناف کا مسئلہ کہ برہنہ سر نماز مکروہ ہے' سراسر باطل ہے۔ حق مولانا گنگوہی کی جانب ہے کہ "ننگے سر نماز مکروہ نہیں ہے"

مولانا گنگوہی سے کسی نے پوچھا کہ "سرور عالم ﷺ سے کبھی بلا عمامہ کے بھی نماز پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟" اس کے جواب میں مولانا گنگوہی نے ارشاد فرمایا کہ "اس کا صریح ثبوت اس وقت بندہ کو معلوم نہیں مگر احرام کی حالت میں سر برہنہ نماز پڑھنا محقق ہے"

(فتاویٰ رشیدیہ ص-۲۷۶)

عارف حصاری عرض گزار ہے کہ فتویٰ نویسی کے وقت مولانا گنگوہیکو حوالہ مستحضر نہ تھا اس لیے انہوں نے حالت احرام سے استدلال کیا جو بجائے خود صحیح ہے مگر علاوہ اس کے دیگر احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

چنانچہ مسند امام اعظم (ابو حنیفہ) مترجم کے ص-۱۴۳ میں باب اس عنوان سے درج ہے کہ "ایک کپڑا میں نماز پڑھنے کے بیان میں" پھر یہ حدیث درج ہے: ابو حنیفه عن عطاء عن جابر انه امهم فی قمیص واحد وعنده فضل ثیاب یعرفنا بسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ یعنی "امام ابو حنیفہ نے عطاء سے اور عطاء نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک قمیص میں لوگوں کو امامت کراتے ہوئے نماز پڑھائی درآں حالیکہ ان کے پاس زائد کپڑے موجود تھے' وہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھلاتے تھے۔"

اس حدیث کی شرح میں مولانا سعد حسن صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ نے اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے اپنے والد (ابو بکر رضی اللہ عنہ) کو دیکھا وہ ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا ابا جان! آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہیں اور آپ کے پاس کپڑے رکھے ہوئے ہیں؟ آپ نے فرمایا بیٹی! آخری نماز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پیچھے ادا فرمائی' وہ ایک کپڑے میں تھی۔

مولانا سعد حسن نے بھی باوجود حنفی ہونے کے یہ تسلیم کیا ہے کہ "البتہ ایک کپڑا میں نماز بلا خلاف جائز ہے۔" پس مکروہ ہونے کا عقیدہ اور فتویٰ بالکل باطل ہے ورنہ تمام حاجیوں کی نمازیں مکروہ اور فاسد قرار پائیں گی' کیونکہ سر ستر نہیں۔ اگر ستر ہوتا تو حاجی لوگ ننگے سر نماز نہ پڑھتے کہ حج میں غیر حج کی نسبت زیادہ احتیاط ہے۔

پھر کتب فقہ حنفیہ' منیہ' بحر الرائق' شامی' عالمگیری وغیرہ میں بہ نیت تواضع اور خشوع ننگے سر نماز پڑھنا افضل لکھا ہے۔ اگر ننگے سر نماز مکروہ اور فاسد ہوتی تو کسی طرح جائز نہ ہوتی۔ پھر "خدام الدین" نے اپنی تردید خود ہی کر دی کہ اسی نقشہ میں "ستر عورت" کے عنوان سے یہ لکھا ہے کہ "مردوں کو ناف سے زانو تک' عورتوں کو دونوں ہاتھ پاؤں کے پنجوں کے سوا بدن ڈھانکنا۔"

عارف حصاری لکھتا ہے کہ جب مرد عورت میں یہ فرق ہے تو ثابت ہوا کہ ننگے سر نماز

جائز ہے' فاسد نہیں ہے۔ اگر ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ قرار دیا جائے تو مرد عورت میں فرق نہیں رہتا' دونوں کا ستر ایک ہو جاتا ہے۔ عورت کے لیے صاف حکم مستقل وارد ہے کہ ننگے سر بغیر اوڑھنی کے اس کی نماز نہ ہو گی۔" اسی وجہ سے حج کے موقعہ پر بحالت احرام بھی وہ سر ڈھانک کر نماز پڑھتی ہے' مرد کے لیے یہ حکم نہیں ہے' وہ آزاد ہے' ننگے سر نماز پڑھے یا سر ڈھانک کر' صرف حالت احرام میں مرد کے لیے سر ننگا رکھنا ضروری ہے اور بغیر احرام کے جائز ہے مکروہ کسی وقت بھی نہیں ہے۔

ننگے سر نماز پڑھانا: مولانا گنگوہی سے سوال ہوا کہ "امام کو باوجود قدرت ہونے عمامہ کے بغیر عمامہ نماز پڑھانا کیسا ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: "بلا عمامہ امامت کرنا درست بلا کراہت کے ہے اگرچہ عمامہ پاس رکھا ہو' البتہ عمامہ سے ثواب زیادہ ہوتا ہے۔" (فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۷۸)

میں کہتا ہوں اس سے ظاہر ہوا کہ زیادہ ثواب یا افضل کام کو ترک کرنا مکروہ نہیں جائز ہے۔ مثلاً نماز تہجد پڑھنا' تراویح میں قرآن ختم کرنا وغیرہ افضل کام ہیں۔ اگر یہ کام ترک ہو جائیں تو کوئی جرم نہیں ہے۔ حالانکہ تہجد اور تراویح میں قرآن ختم کرنا تو ایک ثابت شدہ چیز ہے اور پگڑی سے نماز ہمیشہ پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح ننگے پاؤں نماز پڑھنا جائز ہے مگر جوتی میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

مولانا گنگوہی سے سوال ہوا کہ "اگر امام کو عذر سے یا بلا عذر عمامہ میسر نہ ہو اور مقتدی باندھ رہے ہیں تو کیا نماز میں کچھ نقصان ہو گا؟" اس کے جواب میں فرمایا: "اگرچہ مقتدی سب متعمم ہوں اور امام بلا عمامہ۔ تو نماز کسی کی بھی مکروہ نہیں ہوتی۔"

پھر سوال ہوا کہ "فتاویٰ عالمگیری اور قاضی خاں میں نماز بلا عمامہ کو مکروہ لکھا ہے۔" تو اس کے جواب میں یہ ارشاد ہوا کہ کسی نے بلا عمامہ نماز کو مکروہ نہیں کہا۔ اگر کہا تو وہ قول منقول ہے' بتر کہ مذہب ورنہ مردود ہو گا۔ (ص ۲۷۷)

پس خدام الدین کا مسئلہ مردود ہے اور مولانا گنگوہی (جن کے مسائل دربار رسالت سے رجسٹرڈ ہو چکے) کا مسئلہ صحیح ہے۔

مولانا احمد رضا کا فتویٰ: دیوبندی حضرات کے علاوہ ننگے سر نماز پڑھنے پر بریلوی عقائد کے لوگ بہت زیادہ معترض ہوتے ہیں' اس لیے ان کے مجدد مولانا احمد رضا بریلوی کا فتویٰ

بھی پیش کیا جاتا ہے۔ احکام شریعت حصہ اول ص ۔۳۷ میں مولانا احمد رضا خاں لکھتے ہیں :

سوال : کیا حکم ہے اہل شریعت کا اس مسئلہ میں بعض لوگ ننگے سر پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ جل شانہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں' اس میں کوئی ہرج تو نہیں ہے اور نماز میں کسی طرح کی کوئی کراہت تو نہ ہو گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب : اگر بہ نیت عاجزی ننگے سر پڑھتے ہیں تو کوئی ہرج نہیں۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

کتبہ عبدہ المذنب ـــــ احمد رضا عفی عنہ

بمحمدن المصطفیٰ ﷺ

احکام شریعت حصہ دوم ص۔۴۳ میں ہے :

سوال : نماز کے اندر اگر ٹوپی گر جائے تو اٹھانا چاہیے یا نہیں؟

جواب : اٹھا لینا افضل ہے جبکہ بار بار نہ گرے۔ اگر تذلیل وانکسار کی نیت سے سر برہنہ رہنا چاہے تو نہ اٹھانی افضل ہے۔

امید ہے کہ یہ فتویٰ بریلوی دوستوں کے لیے اطمینان بخش ہو گا (فقط)

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' جلد۔۱۸' شمارہ۔۲۴' مورخہ ۱۲/ ۷ دسمبر سنہ۔۱۹۶۳

نماز کی زینت

عوام اور بعض خواص کے عقیدوں اور ذہنوں میں نماز کے متعلق پگڑی اور جوتی کا سخت مغالطہ ہے۔ اگر سر پر پگڑی نہ ہو اور ننگے سر نماز پڑھے تو اس کو عیب اور ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی پگڑی اتار کر رکھ دے اور ننگے سر نماز پڑھے تو اس کو مجرم ٹھرا کر سخت عیب گیری کرتے ہیں۔ اگر کوئی داڑھی منڈا رہا ہو تو اس کو کچھ نہیں کہتے۔ نماز پڑھی جا رہی ہو' اور ادھر قریب میں ریڈیو سے گانے سن رہا ہے یا تاش کھیل رہا ہے تو اس کو کچھ نہیں کہتے۔ لیکن مسجد میں ایک شخص ننگے سر نماز پڑھ رہا ہے تو رواج پرست نمازی اس کے سر چڑھ جاتے ہیں۔ اور مسجد کا لا علم ملا بھی اس کو ناجائز کہہ کر اس نمازی پر سخت خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اس نے ناجائز حرکت کی ہے' کوئی کہتا ہے اس کی نماز نہیں ہوئی۔ کوئی کہتا ہے اس کی نماز مکروہ ہو گئی۔ کوئی کہتا ہے اس کو دوبارہ نماز پڑھنی چاہیے۔

یہ سب جہالت اور مذہب سے لاعلمی کی باتیں ہیں۔ پگڑی وغیرہ سے سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا نہ فرض ہے نہ واجب نہ سنت موکدہ ہے۔ عورت کی طرح نماز میں سر ڈھانکنا شرط نہیں ہے۔ صرف جائز ہے اور اچھا ہے۔ لیکن جہاں ننگے سر نماز پڑھنے کو عیب اور گناہ شمار کرتے ہوں اور انہوں نے مسجد میں ٹوپیاں وقف کر کے رکھ چھوڑی ہوں تاکہ کوئی ننگے سر نماز نہ پڑھے کہ اگر اس کے پاس پگڑی وغیرہ نہ ہو تو ہماری مسجد سے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لے وہاں ننگے سر نماز پڑھنا افضل اور عملی جہاد ہے اور ایک شہید کا ثواب ہے۔

اب اس کے برعکس جوتی کی بات سنئے۔ کہ جوتی سے نماز پڑھنا سنت ہے اور ننگے پاؤں نماز پڑھنا گاہے بگاہے جائز اور ہمیشہ اس طرح نماز خلاف سنت اور عادت یہود ہے۔ لیکن آج اس پرفتن زمانے میں جیسے دیگر مسنون امر عوام میں متروک ہیں' جوتے میں نماز پڑھنا بھی متروک ہے۔ اور ننگے پاؤں نماز پڑھنے کا اس قدر رواج ہو گیا ہے' کہ اب کوئی جوتی سے نماز پڑھے تو اس پر سخت نکتہ چینی' عیب گیری اور جھگڑا اور جدال کرتے ہیں۔ بلکہ بعض تو جوتی میں نماز پڑھنے والے کو مسجد سے نکال دیتے ہیں۔ جو صریح ظلم ہے۔ اور بعض لاعلم ملا' مصلحت پرست مولوی اور رواج پرست لوگ اس شخص سے سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اور اس کو لعن طعن کرتے ہیں۔ اگر کوئی رفع یدین نہ کرے' آمین بالجہر نہ کہے تو ساکت عن الحق ہو جاتے ہیں۔ لیکن جوتے میں کوئی شخص نماز پڑھ لے تو اس کی طرف اس طرح گود کود کر آتے ہیں جیسے کہ اس نے بہت بڑا جرم کر لیا ہو۔

جب پگڑی اور جوتی کا نماز کے بارے میں عقائد و اعمال کا اس قدر سخت مقابلہ اور تصادم دیکھا تو احقاق حق وابطال باطل کی نیت سے یہ مضمون تیار کیا گیا' جو ہدیہ ناظرین ہے۔ نماز میں پگڑی اور جوتی کا حکم کتاب وسنت کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں اور عصبیت سے دور ہو کر اس مسئلہ پر غور کریں۔ تاکہ اصلی شرعی حقیقت کا انکشاف ہو اور ان کے متعلق جو غلط لعن طعن اور جھگڑے ہوتے ہیں وہ رفع ہو جائیں۔

سر پر پگڑی وغیرہ رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم: پگڑی وغیرہ کے متعلق محدثین کرام نے کتب حدیث میں کوئی باب نہیں باندھا جس سے اس مسئلہ کی اہمیت ظاہر ہوتی۔ اور نہ کوئی حدیث ذکر کی ہے' جس سے محض پگڑی وغیرہ سے نماز پڑھنے کا حکم ثابت ہو سکے۔ نہ قولی حدیث وارد ہے اور نہ کوئی ایسی فعلی حدیث آئی ہے جو صاف صریح طور پر اس بات پر ناطق

ہو کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے سروں پر پگڑیاں باندھ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ جمعہ اور عید کے لباس کا حکم تو ایک الگ شے ہے۔ اصل دن رات کی پانچ وقتی نماز میں پگڑی اور جوتی کا مقابلہ مقصود ہے' کہ ان دونوں میں حضرت شارع علیہ السلام اور آپ کے مقتدیوں کا کیا معمول تھا۔

بندہ نے ایک رسالہ بنام "ضرب الناس" لکھا ہے اس رسالہ کو پڑھ کر مولوی عبداللہ صاحب ڈیرہ غازی خاں والے نے ایک رسالہ بنام جواب الضرب شائع کیا۔ جو ان کے علمی بضاعت کے مزجات ہونے پر بین دلیل ہے۔ مولوی صاحب کے رسالہ کا اول سے لے کر آخر تک مطالعہ کیا۔ اس میں مجھے کوئی حدیث قولی یا فعلی نہ ملی جس سے پگڑی کا وجوب یا کم از کم سنت موکدہ ہونا ثابت ہو' صرف عید اور جمعہ کی زینت کا ذکر کرتے ہوئے پگڑی کی بعض روائتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن میں صرف جمعہ اور عید کے دنوں میں فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ جو مثبت مدعا نہیں ہے۔ آپ کا دعوی علی الاطلاق ہر نماز میں سر ڈھانکنے کے واجب ہونے کا ہے۔ ان روائتوں سے وجوب ثابت نہیں ہوتا' صرف عید اور جمعہ کے دن مخصوص زینت کرنا ثابت ہے' جس کو کوئی ہر نماز میں ضروری قرار نہیں دیتا' الا من سفہ نفسہ۔

جب مولوی صاحب کو کوئی روایت نہ ملی تو لاچار ہو کر آیت کریمہ "خذوا زینتکم عند کل مسجد" کی طرف بھاگے اور یہ ترجمہ کیا کہ "ہر مسجد میں زیب و زینت کے ساتھ نماز ادا کرو۔" (ص۔۳۴)

یہ ترجمہ سراسر غلط ہے۔ اس میں "نماز ادا کرو" کا جملہ اپنی طرف سے بڑھایا گیا ہے۔ نہ تو آیت کی شان نزول پر غور کیا اور نہ اس کا ترجمہ سمجھا کہ یہ دلیل میرے دعویٰ کے مطابق ہے یا نہیں۔ دعویٰ تو عام ہے' کہ ہر نماز میں سر ڈھانکنا ضروری ہے اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ ہر مسجد میں زیب و زینت کے ساتھ نماز ادا کرو۔ آیت میں مسجد کی قید ہے تو گھر یا جنگل میں زینت کرنے کا وجوب کیسے ثابت ہوا؟ پھر کمالین حاشیہ جلالین میں بحوالہ تفسیر کبیر یہ لکھا ہے: اجمع المفسرون علی ان المراد بالزینۃ ھھنا لبس الثوب الذی یستر العورۃ۔ "تمام مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ آیت مذکورہ میں زینت سے مراد ایسا کپڑا پہننا ہے جس سے شرم گاہ ڈھانکی جا سکے۔"

اور آیت کا شان نزول بھی اسی مطلب پر دال ہے کہ لوگ ننگے بدن طواف کرتے تھے۔

اس پر یہ آیت اتری کہ اپنی شرم گاہوں کو ڈھانکو کہ شرم گاہوں کو ننگا کرنا زینت کے سخت خلاف ہے۔ زینت تین قسم کی ہے۔ ایک زینت واجبی ہے' دوسری استحبابی' تیسری مباح۔ آیت میں واجبی زینت مراد ہے۔ جیسا کہ شان نزول اور مفسرین کے اجماع سے ثابت ہے

تفسیر جلالین میں ہے: خذوا زینتکم ماستر عورتکم عند کل مسجد عند الصلوة والطواف۔ یعنی "زینت سے مراد ستر ڈھانکنا ہے طواف اور نماز میں' مسجد کی قید مورد کے لحاظ سے ہے۔" دیگر دلائل سے یہ ثابت ہے کہ نفس نماز میں ستر ڈھانکنا واجب اور ضروری ہے۔ کمالین میں بحوالہ بیضاوی لکھا ہے کہ اس آیت سے نماز میں زینت کرنا مراد ہے۔ اور پھر یہ لکھا ہے کہ اس آیت سے نماز میں وجوب طواف کے لئے ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے' کہ نماز میں ستر کا ڈھانکنا اجماع کی دلیل سے ثابت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ احادیث سے بھی ثابت ہے۔ "کما لا یخفے علی اهل العلم" مفسرین کو تو یہ اشکال ہے کہ آیت حاجیوں کے طواف کے بارے میں وارد ہے۔ اس سے نماز میں ستر کا ڈھانکنا کیسے ثابت کریں اور مولوی عبداللہ صاحب اس کے ترجمہ میں تحریف کر کے صرف نماز کے ستر کو ثابت کر رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ آیت لفظوں میں تو عام ہے۔ لیکن اس کا مورد خاص طواف ہے۔ پس بیت اللہ کا طواف کرنے والے حجاج درجہ اول اس آیت میں داخل ہیں۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ جس صورت حال پر کوئی حکم نازل ہو وہ صورت بدرجہ اول داخل ہوتی ہے۔ جب طواف کرنے والے حجاج زینت کے مامور ہوئے تو ان کی زینت واجبی دو چادریں ہوتی ہیں۔ ایک کندھوں پر اوڑھی جاتی ہے۔ اور دوسری نیچے تہبند بنا کر باندھی جاتی ہے۔ کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک جسم طواف اور نماز میں ستر ہے۔ پس جسم کی ان جگہوں کا ڈھانکنا طواف اور نماز میں واجب ہے۔ باقی سر وغیرہ کا ڈھانکنا نہ واجب ہے اور نہ سنت ہے۔

پس یہ آیت ہماری دلیل ہے کہ سر ڈھانکنا اس میں داخل نہیں ہے۔ وہ جسم داخل ہے جو ستر ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ ننگے سر نماز درست ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ زینت دو قسم کی ہے' ایک واجبی اور دوسری استحبابی دونوں زینت کے فرد ہیں۔ تو دونوں آیتوں میں مراد ہوں گے تو اس سے سر ڈھانکنا مستحب ثابت ہو گا' جس کے تمام اہلحدیث قائل ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں صیغہ امر وارد ہے۔ اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ (جب تک

قرینہ صارفہ نہ ہو) پس دونوں (یعنی) مراد نہیں ہو سکتیں کہ یہ خلاف اصول ہے۔

چنانچہ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ اپنی بے نظیر کتاب احکام الاحکام میں فرماتے ہیں: وان وقوع لفظ الامر علی الوجوب وعلی الندب معا محال ممتنع لا سبیل الیہ۔ (احکام الاحکام ج۔۳ ص۔۳۳۰) نیز فرماتے ہیں: واما احتمال وقوع لفظۃ الامر علی الندب والوجوب معا فی وقت واحد فھذا باطل۔ یعنی "امر کا صیغہ وجوب اور ندب دونوں کے لئے اکٹھا آنا باطل ہے"

اگر وجوب مراد ہو تو استحباب مراد نہیں ہو سکتا اور اگر استحباب پر امر محمول ہو تو وجوب پر نہیں ہو سکتا دونوں کا اکٹھا ہونا محال ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ زینت سے مراد "زینت کاملہ" یعنی سارے جسم کی زینت مراد ہے۔ تو یہ اجماع اور دیگر دلائل شرعیہ کے خلاف ہے کیونکہ سر اور پاؤں کسی کے نزدیک ڈھانکنے واجب نہیں ہیں۔ اگر کوئی سر کو زینت میں داخل کرے گا' تو راقم پاؤں ڈھانکنا زینت میں ثابت کر دے گا جس کو وہ تسلیم نہیں کریں گے یہ اجماع کے خلاف ہے۔ تو یہی بات میں کہوں گا کہ نماز میں سر ڈھانکنا واجب ہونا اجماع کے خلاف ہے۔ جس کا کوئی اہل علم بھی قائل نہیں' الا من سفہ نفسہ وھو لا یعقل۔

حروف ابجد میں دو حرف ہیں مین غین
دو کو سمجھے ایک ہی ہے نور عین

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت خذوا زینتکم عند کل مسجد سے سر ڈھانکنے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس سے خاص زینت مراد ہے' جو بدن کے ضروری حصے پردہ کی جگہ (شرم گاہ) پر کی جاتی ہے۔ عام زینت تمام جسم کی مراد نہیں ہے۔ ورنہ پاؤں کا ڈھانکنا بھی واجب ہو جائے گا یہ اجماع کے خلاف ہے اس لئے سب برہنہ نمازیں پڑھتے ہیں۔

مولوی عبداللہ صاحب کو جب کوئی صریح دلیل نماز میں سر ڈھانکنے کی نہ ملی تو غیر متداولہ کتب سے موضوع روایات کی طرف دوڑے جن سے اہل باطل اپنا مواد جمع کر کے لاتے ہیں' جو سخت جرم ہے۔

موضوع اور بے ثبوت روایات سے استدلال کرنا گمراہ فرقوں کا شیوہ ہے:

اہل بدعت اور گمراہ فرقوں کا یہ شیوہ ہے کہ اپنے جھوٹے دعووں اور باطل مسائل پر

موضوع اور مردود اور بے ثبوت روایتوں کو پیش کر کے ان سے استدلال کرتے ہیں۔ جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کا مصداق ہیں۔ مثلاً اہل حدیث اگر آیت انما انا بشر مثلکم بشریت کے دعویٰ پر پیش کریں تو معارضہ میں اول ما خلق اللہ نوری والی روایت پیش کرتے ہیں' جو موضوع اور بے ثبوت ہے۔ اسی طرح مولوی عبداللہ نے شیوہ اختیار کیا ہے کہ دعویٰ یہ ہے کہ نماز میں سر ڈھانکنا واجب اور ضروری ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے۔ علیکم بالعمائم "کہ پگڑیوں کو تم لازم پکڑو۔" یہ موضوع ہے۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: لا یبنی علیه حکما شرعیا الا جاهل بادلة الاحکام۔ یعنی "موضوع روایت پر کسی حکم شرعی کا دارومدار وہی رکھتا ہے' جو جاہل ہے"

مولوی عبداللہ صاحب کا رسالہ جب شائع ہوا تھا' تو اس وقت حضرت العلام جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب فاضل روپڑی زندہ تھے۔ بندہ نے لاہور کی ایک مجلس میں وہ رسالہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ رسالہ میرے رسالہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ آنجناب موصوف الصدر نے رسالہ کے چند مقلات ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ اس رسالہ کی بابت میری رائے یہ ہے کہ یہ رسالہ کسی صاحب علم کا نہیں ہے۔ کیونکہ نہ تو اس مصنف کو حدیث کی صحت وضعف کا پتہ ہے اور نہ حدیث کے الفاظ کے صحیح معنی سمجھتا ہے طریق استدلال بھی غلط ہے۔

علامہ موصوف نے حضرت شیخ الاسلام کی تائید فرما دی ہے۔ مولوی عبداللہ نے جو موضوع روایات پیش کی ہیں تو ان کی حالت ان دو شقوں میں سے ایک پر مبنی ہے یا تو وہ ان روایات کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ یہ صحیح ہیں یا ضعیف یا موضوع۔ یا واقف ہیں مگر صحیح دلائل پیش کرنے سے لاچار ہو کر اور مضطر کی طرح مردار کھانا روا جان کر موضوع روایات سے استدلال کر رہے ہیں اور عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ ان روایتوں کے معانی رکیک پر اعتقاد رکھ کر ہمیشہ پگڑیاں باندھ کر نمازیں پڑھتے رہیں گے اور میری علمیت کا شہر میں چرچا ہو جائے گا۔

اگر شق اول ہے تو پھر وہ جاہل قرار پائے ان کو اس بحث میں نہ پڑنا چاہئے تھا۔ قرآن میں ہے: ولا تقف ما لیس لک به علم "کہ جس چیز کا پورا علم نہ ہو اس کے درپے نہ ہونا چاہئے۔"

اگر شق دوم ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت سے واقف کار ہو کر انہوں نے موضوع احادیث کو پیش کیا ہے تو پھر احد الکاذبین ہو کر جھوٹی احادیث کی وعید کے مستوجب ہیں۔ چنانچہ علامہ ملا علی قاری اپنے رسالہ موضوعات ص ۹ میں فرماتے ہیں: فمن روی حدیثا علم وضعه او ظن وضعه فهو مندرج فی الوعید۔ یعنی جو شخص کسی موضوع حدیث کے وضع کو جانتا ہوا بیان کرے وہ اس وعید میں داخل ہے جو جھوٹی حدیث بیان کرنے والوں کے بارے میں وارد ہے اور وہ یہ ہے: من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار۔ یعنی "آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں سمجھ لے"

اور جو لوگ ان احادیث کے موضوع ظاہر ہونے پر عقیدہ رکھ کر عمل کریں گے۔ وہ بمع مولوی عبداللہ کے شیطان کے خداموں میں شمار ہوں گے۔ چنانچہ تذکرہ موضوعات کے ص ۷ میں ہے: قال زید بن اسلم من عمل بخبر صح انه کذب فهو من خدم الشیطان۔ یعنی "حضرت زید بن اسلم نے فرمایا کہ جن لوگوں نے ایسی حدیث پر عمل کیا جس کا جھوٹ صحیح ہو چکا ہے تو وہ شیطان کے خادموں میں شمار ہیں۔"

حدیث علیکم بالعمائم سے احمقانہ استدلال: مولوی ڈیرہ غازی خان نے اپنے ٹریکٹ کے ص ۳۱ پر لکھا ہے' بلکہ حضور نے حکماً فرمایا: علیکم بالعمائم (مجمع الزوائد جزء ۵' ص ۱۲۰ جامع صغیر ص ۳۳) یعنی "حضور ﷺ نے فرمایا لازم پکڑو پگڑیوں کو" علیکم کا لفظ ایسا ہے جیسے علیکم بالجماعة جماعت کو لازم پکڑو۔ کوئی اعتراض کرے کہ علیکم بالعمائم میں نماز کا ذکر نہیں ہے' تو جواباً عرض ہے علیکم بالجماعة میں ہندوستان و پاکستان کا لفظ کہاں ہے کہ ہندوستان والے اور پاکستان والے جماعت کو لازم پکڑیں یہ تو صرف عرب والوں کو کہا گیا ہے۔ جواب یہ ملے گا حکم عام ہے کہیں کا رہنے والا ہو اسی طرح یہ بھی حکم عام ہے۔

اس دلیل اور استدلال سے اہل علم غور کریں کہ یہ مولوی پگڑی کو نماز میں اس طرح لازم سمجھتا ہے جس طرح علماء اسلام بموجب احادیث نبویہ کے جماعت بندی اور جماعت میں شامل رہنے کو لازم سمجھتے ہیں۔ یہ عقیدہ سراسر باطل ہے۔ پس اس بطلان کی مدافعت کے لئے یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ مولوی عبداللہ نے بہت ہاتھ پاؤں مار کر یہ قولی روایت تلاش کی

ہے اور نہایت دماغ سوزی سے اس دلیل کو دعویٰ کے مطابق بنانے میں کام لیا ہے۔

دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات
تب جا کر بنی ہے' یہ بات

مگر افسوس ہے کہ بیچارے کی محنت ضائع گئی' اب اس کی حقیقت سنئے۔

پہلا جواب: تحفۃ الاحوذی ج۔۳ ص۔۵۰ میں ہے: منها حدیث علیکم بالعمائم اخرجه ابن عدی والبیهقی فی الخلاصته وهو موضوع فقال فی اللالی لا یصح۔ یعنی "حدیث علیکم بالعمائم جس کو ابن عدی اور بیہقی نے روایت کیا ہے موضوع ہے اور اللالی میں ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔"

دوسرا جواب: اگر موضوع نہ ہو تو اس کے ضعیف ہونے میں تو شک نہیں ہے۔ علامہ ہیثمی نے اس حدیث کو ذکر کرکے پھر یہ کہا: فیه عیسی بن یونس مجهول "کہ اس روایت میں ایک راوی عیسیٰ بن یونس ہے جو مجہول ہے۔" جس روایت کا راوی مجہول ہو وہ روایت ضعیف ہوتی ہے۔ علامہ محمد طاہر ہندی فتنی تذکرۃ الموضوعات ص۔۱۵۵ میں فرماتے ہیں: وهو فی الباب وما یشبهه کله ضعیف نحو علیکم بالعمائم۔ یعنی "پگڑی کے بارے میں جو روایات وارد ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔ جیسے طبرانی کی روایت علیکم بالعمائم ہے۔" جب یہ روایت ضعیف ہے تو پگڑی کے لزوم پر استدلال باطل ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: ان کان یعرف ضعفه لم یحل له ان یحتج به فانهم متفقون علی انه لا یحتج بالضعیف فی الاحکام۔ (شرح مسلم ج۔۱ ص۔۲۱) یعنی "جب ضعف معروف ہو تو اس سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ محدثین اس اصول پر متفق ہیں کہ احکام شرعیہ میں ضعیف حدیث سے دلیل نہیں لی جائے گی۔

تیسرا جواب: معنوی طور پر یعنی درایت کی رو سے بھی اس حدیث سے دلیل لینا باطل ہے' کیونکہ ظاہر ہے اس حدیث سے پگڑی کا لزوم ثابت ہوتا ہے۔ جیسے علیکم بالجماعة سے جماعت میں رہنے کا لزوم ثابت ہوتا ہے۔ لیکن امام شوکانی نے زادالمعاد سے نقل کیا ہے: کان یلبس القلنسوة بغیر عمامة "کہ رسول اللہ ﷺ بغیر پگڑی کے محض ٹوپی پہنا کرتے تھے۔" اس سے پگڑی کا وجوب رفع ہوا۔ پھر احرام میں سب حجاج برہنہ سر ہوتے ہیں تو اس سے علیکم بالعمائم کا ہر وقت لزوم باطل ہوا۔ پھر حضرت سلمان فرماتے ہیں: رالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمسح علی خفیہ وعلی خمارہ۔ (رواہ احمد) یعنی "میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے موزوں پر اور سر کے کپڑے پر وضو میں مسح کیا۔" پس حدیث نہ روایت کی رو سے بچی ہے اور نہ درایت کی رو سے' یہ تراشی ہوئی ہے۔

چوتھا جواب الزامی: اس حدیث پر مولوی عبداللہ اور ان کے حواری بھی عامل نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ حدیث ناطق ہے۔ کہ ہروقت ہر جگہ پگڑی لازم رکھو تو پھر جب یہ لوگ رات کو سوتے ہیں تو پگڑیاں اتار کر سوتے ہیں۔ اس سے ہروقت اور ہر جگہ کا لزوم باطل ہوا۔ پھر جب غسل کرتے ہیں تو ننگے سر ہوتے ہیں۔ تو حمام اور غسل کی جگہ میں لزوم نہ رہا۔ جب احرام باندھتے ہیں تو اتار پھینکتے ہیں۔ پس عموم کا دعویٰ باطل ہوا۔ اگر کہو کہ یہ موقع دیگر دلیل سے مخصوص ہے۔ تو پھر نماز بھی دیگر دلائل سے مخصوص ہوگی۔ کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے' جو کندھوں سے زانوں تک کافی ہے۔ ماھو جوابکم فھو جوابنا

پانچواں الزامی جواب: اگر تم لفظ علیکم دیکھ کر لٹو ہو گئے تو یہ لفظ دیگر روایات میں بھی ہے۔ اب ہروقت ان پر عمل کر کے دکھاؤ۔ ایک روایت میں ہے: علیکم بغسل الدبر "کہ دبر کو دھونا لازم پکڑو"۔ اب مولوی عبداللہ کو نماز اور غیر نماز میں اور آدمیوں کے پاس اور علیحدگی میں ہروقت دبر دھوتے رہنا چاہئے کیونکہ روایت عام ہے' ہر جگہ اور ہروقت شامل ہے۔ دوسری روایت ہے: علیکم بالبصل "کہ پیاز کو لازم کر لو۔" اب مولوی عبداللہ اور ان کے دوستوں کو اپنی جیبوں میں یا ہاتھوں میں یا سر پر پیاز لازم کر لینا چاہئے۔ ایک اور روایت میں ہے: علیکم بالملح "کہ نمک کو لازم کر لو۔" اب ان لوگوں کو نمک پاس رکھنا چاہئے: علیکم بالصوم ایک حدیث ہے' تو ہروقت روزہ سے رہنا چاہئے۔ ایک حدیث یہ بھی ہے: علیکم بالسناء پس ہروقت سنا کا جلاب لئے رکھیں۔ ایک حدیث یوں آئی ہے: علیکم بلباس الصوف "کہ بالوں سے بنا ہوا لباس لازم کر لو۔" پس ململ' لٹھا وغیرہ تمام قسم کے کپڑے ترک کر دیں اور ہروقت صوف پہنیں۔ یہ احادیث علیکم بالعمائم کی طرح ہیں اور ثبوت کے لحاظ سے اس کے مساوی وارد ہیں۔ جب تم یہ سب چیزیں لازم کر لو' تب ہم کو پگڑی کی حدیث سناؤ۔ ما جوابکم فھو جوابنا

پھر علیکم بالجماعۃ کی رو سے جماعت میں رہنا لازم ہے۔ تو مولوی عبداللہ کا جماعت

غرباء سے خروج کر کے پھر کسی جماعت میں شامل ہونا اس حدیث کے خلاف ہے۔ اور وہ من شذ شذ فی النار کے مصداق ہیں۔

تو جماعت سے گیا پالا ستم گر سے پڑا
مل گئی ظالم تجھے کفران نعمت کی سزا

مولوی عبداللہ صاحب کی پیش کردہ روایت میں لفظ "علیکم" کے معنی لازم پکڑنے کا نہیں بلکہ "الزموا" فعل مقدر نکالنا ہو گا۔ تو ہم "الزموا" کے صاف کلمہ سے جو صیغہ امر ہے حدیث پیش کرتے ہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب اس پر عمل کر کے پھر ہم کو کہیں۔ وہ حدیث یہ ہے: الزموا نعلیک قدمیک "کہ اپنے قدموں میں جوتیاں لازم کر لو۔" یہ حدیث عام ہے' نماز غیر نماز ہر حالت کو شامل ہے' تو جوتیاں پہن کر ہمیشہ نماز پڑھا کر۔

اس کا جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو مبارک تمہیں

اگر کہیں کہ یہ سب روایات کہاں ہیں؟ تو عرض ہے کہ کنوز الحقائق ملاحظہ ہو جو امام مناوی کی ہے۔

پگڑی والوں کے حق میں فرشتوں کی دعا: مولوی عبداللہ صاحب نے اپنے رسالے موسومہ "جواب الضرب" کے ص۔۳۰ پر یہ عنوان باندھا ہے۔ "پگڑی سے نماز کا ثواب" پھر اس کے ثبوت میں پہلے یہ حدیث لکھی ہے: ان اللہ وملائکتہ یصلون علی اصحاب العمائم یوم الجمعۃ لیکن ترجمہ میں خیانت کی ہے' چنانچہ لکھتے ہیں' "پگڑیوں سے نماز پڑھنے والوں کے لئے فرشتے دعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ رحمت نازل کرتا ہے۔" حدیث کے لفظوں میں کلمہ یوم الجمعۃ صاف وارد ہے کہ جمعہ کے دن جو پگڑی باندھ کر آئے وہ اس ثواب کا مستحق ہے۔ مگر مولوی صاحب جمعہ کے دن کی قید کو دعوت کے حلوے کی طرح کھا گئے۔ اور مطلق نماز کا ترجمہ کر دیا' کیونکہ آپ ہر نماز میں پگڑی سر پر رکھنے کے قائل ہیں۔ یہ خیانت ہے' حدیث میں جمعہ کی قید ہے۔ کیونکہ زینت کی زیادہ فضیلت جمعہ اور عید کے دنوں میں آئی ہے' عطر لگانا' تیل لگانا' نئے کپڑے پہن کر آنا اور بہت سویرے آنا' حجامت کرانا وغیرہ امور جمعہ اور عید سے مخصوص ہیں۔ حدیث میں جمعہ کی قید ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ دیگر نمازوں میں پگڑی کا یہ ثواب نہیں ہے کہ اس کا شارع نے وعدہ

نہیں سنایا۔ اب جو شخص اپنی طرف سے کہے گا وہ مجرم ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول پر افترا باندھتا ہے۔ عام نمازوں کے بارے میں یہ روایت نہیں ہے۔ یہودیوں کی بھی یہ عادت تھی کہ وہ شرعی دلائل میں اپنی طرف سے الفاظ گھٹا بڑھا دیتے تھے۔ اب بھی گمراہ لوگ ایسا ہی کر رہے ہیں۔

اب اس روایت کو روایتی اصول سے جانچا جاتا ہے کہ بالکل ضعیف اور ناقابل احتجاج ہے۔ مجمع الزوائد جس کا حوالہ مولوی عبداللہ صاحب نے دیا ہے۔ اس میں اس روایت کے بعد لکھا ہے جس کو بدیانتی سے کتمان حق کرتے ہوئے انھوں نے چھپا لیا ہے۔ رواہ طبرانی فی الکبیر وفیہ ایوب بن مدرک قال ابن معین انہ کذاب۔ یعنی اس روایت کی سند میں ایک راوی "ایوب بن مدرک" ہے جس کو امام یحییٰ بن معین رئیس المنقدین نے کذاب کہا ہے کہ یہ بہت جھوٹ بولنے والا تھا" پس یہ روایت جھوٹی ہے۔

تذکرۃ الموضوعات ص۔۲۳۳ میں ہے : کذبہ یحیی وترکہ الدارقطنی وفی الذیل کذبہ ابن معین وقال ابن حبان روی عن مکحول نسخۃ موضوعۃ ولم یرہ۔ یعنی ایوب راوی کو امام یحییٰ نے جھوٹا قرار دیا اور امام دراقطنی نے اس جھوٹے راوی کو چھوڑ دیا اور ابن حبان نے کہا کہ اس نے امام مکحول سے ایک نسخہ روایت کا بیان کیا ہے۔ جو بالکل تراشا ہوا ہے کیونکہ مکحول کو اس نے دیکھا نہیں ہے۔

مولوی عبداللہ صاحب نے پھر تلخیص کا حوالہ دیا ہے اور اس میں بھی خیانت کی ہے کیونکہ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد صاحب کتاب نے لکھا ہے : اسنادہ ضعیف "کہ اس روایت کی سند ضعیف ہے"

میں کہتا ہوں کہ ضعیف حدیث بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ جس کا راوی کذاب اور موضوعات کا راوی ہو وہ بالکل مردود ہوتی ہے۔ تدریب الراوی ص۔۱۹۶ میں ضعیف حدیث قبول کرنے کی تین شرطیں لکھی ہیں۔ جن میں پہلی شرط یہ ہے : احدھا ان یکون الضعف غیر شدید فیخرج من انفرد من الکذابین والمتھمین بالکذب ومن فحش غلطہ "ایک شرط یہ ہے کہ اس روایت میں سخت قسم کا ضعف نہیں۔ اس شرط سے وہ ضعیف روایت خارج ہوئی جس کا کوئی راوی کذاب یا متہم کذاب ہو اور وہ روایت جس کے راوی میں فحش غلطی ہو۔" اس روایت کے راویوں میں ایوب ہے جو کذاب بھی ہے اور

اس کی فحش غلطی بھی ہے کہ موضوع روایتیں بیان کرتا تھا۔ پھر یہ روایت ایسے طبقہ کی ہے جس کی روایت ناقابل اعتبار ہیں۔

علامہ خطیب بغدادی کفایہ ص۔۳۱/۳۲ میں بعض ائمہ حدیث سے یہ بیان کرتے ہیں :
لا تقبلوا الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم الا عن ثقة "کہ ثقہ راوی کے بغیر کسی راوی کی کوئی ایسی حدیث قبول نہ کرو جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو۔"

پھر درایت کی رو سے بھی اس کی رکاکت ظاہر ہے' کہ ایک پگڑی پر حد سے زیادہ ثواب ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ جوتی وغیرہ دیگر لباس میں اس سے بھی زیادہ زینت ہے۔ اور محض پگڑی کا ذکر ہے' جس سے ظاہر ہے کہ ٹوپی یا رومال سے سر ڈھانکا جائے تو اتنا ثواب نہیں' یہ بدیہی البطلان ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پر بحث: جامع صغیر کے حوالے سے مولوی عبداللہ صاحب نے ایک روایت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی لکھی ہے' جس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ "نبی علیہ السلام نے فرمایا پچیس نمازیں بغیر پگڑی کے پڑھنی اور ایک نماز پگڑی کے ساتھ ادا کرنی برابر ہے۔ ایک جمعہ پگڑی کے ساتھ ادا کرنا ستر جمعہ بغیر پگڑی کے ادا کرنے کے برابر ہے۔" اس حدیث پر اس یتیم فی الحدیث کو بڑا ناز ہے۔ جس سے عوام کو دھوکہ دے کر نماز میں پگڑیاں باندھنی لازمی قرار دی جا رہی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ محنت برباد اور گناہ لازم کی مثل قائم ہے۔ کیونکہ یہ روایت موضوع یعنی گھڑی اور تراشی ہوئی ہے۔

چنانچہ امام شوکانی الفوائد المجموعہ کے ص۔۱۸۸ میں اس روایت پر لکھتے ہیں : ذكره في المقاصد وقال انه موضوع یعنی یہ حدیث بناوٹی ہے۔ مولوی عبداللہ کی طرح مولوی احمد رضا خاں نے بھی اپنی بدعت آلودہ کتاب "ملفوظات" ص۔۷۰ میں اس حدیث سے استدلال کر کے پگڑی والی نماز کی فضیلت کا فتویٰ دیا ہے۔ کیونکہ یہ موضوع ہے۔

تذکرۃ الموضوعات کے ص۔۱۵۵ میں لکھا ہے "موضوع" اور ص۔۱۵۶ پر لکھا ہے : قال ابن حجر موضوع "حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ یہ حدیث موضوع ہے۔" موضوعات قاری کے ص۔۳۵ میں ہے : قال المنوفي فذلك كله باطل۔ "منوفی نے کہا کہ یہ سب باطل روایتیں ہیں۔" مولوی احمد رضا خاں تو خیر ذاتی لحاظ سے علم حدیث سے ناآشنا ہیں۔ تعجب تو مولوی عبداللہ پر ہے کہ وہ اہلحدیث ہو کر موضوع روایتوں کے کنویں میں کیوں گر رہا ہے؟

ان کو تو کسی محدث سے تعلیم حاصل کر کے ان روایتوں کی جانچ کرنی چاہیے تھی۔ اب وہ اہل بدعت کے ساتھ موضوع احادیث کے ذکر کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔

مولوی عبداللہ نے نقل کیا ہے کہ "صحیح" یہ روایت صحیح ہے۔ اگر وہ سچے ہیں' تو اس کی سند پیش کر کے رواۃ کی توثیق ثابت کریں' ورنہ اس وعید میں داخل ہیں۔ جو موضوع روایتیں بیان کرنے والوں کے حق میں وارد ہیں۔ ورنہ ایسی روایت تو ایک یہ بھی ہے : صلوة بخاتم تعدل سبعین بغير خاتم۔ یعنی "انگوٹھی پہن کر جو شخص نماز پڑھے تو اس کی ایک نماز بغیر انگوٹھی والے کی ستر نمازوں کے برابر ہے" یہ حدیث موضوع ہے اگر آنجناب موضوعات لینے کے عادی ہیں' تو پگڑیوں سے ثواب لینے والوں کو انگوٹھیاں بھی بنوا کر پہنا دیں کہ یہ داخل نعمت اور فضیلت ہے۔

دس ہزار نیکیوں والی روایت پر بحث : فلاں مولوی نے ایک جھوٹی' تراشی ہوئی حدیث پر یوں عنوان قائم کیا ہے : "دس ہزار نیکیاں" پھر اس کے ثبوت میں یہ روایت گھڑی گھڑائی لکھ کر اپنے کبر اور غرور کا اظہار کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ یہ مولوی روحانی بیمار ہے۔ لکھتے ہیں : الصلوة في العمامة عشرة الاف حسنة یعنی "پگڑی سے نماز پڑھنے سے دس ہزار نیکیاں ملتی ہیں۔"

علامہ علی ملا قاری فرماتے ہیں : قال شيخ مشائخنا الحافظ جلال الدين السيوطي لا اعلم شيئا من الكبائر قال احد من اهل السنة بتكفير مرتكبه الا الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم فان الشيخ ابا محمد الجويني من اصحاب الشافعي وهو والد امام الحرمين قال ان من تعمد الكذب عليه الصلوة والسلام يكفر كفرا يخرجه عن الملة وتبعه على ذلك طائفة منهم الامام ناصر الدين المنير من ائمة المالكية قلت ويؤيدهما قوله عليه السلام ليس الكذب علي ككذب على غيري وكذا امره بقتل من كذب عليه واخره الله بعد موته وذلك لان الافتراء عليه افترا على الله فانه ما ينطق عن الهوى ان هو الا وحي يوحى ويقويه قوله في ما تقدم ما اقول الا ما نزل من السما (الى قوله) فان الكذب على غيرهما لا يخرجه عن الايمان باجماع اهل السنة یعنی شیخ الشائخ حافظ جلال الدین سیوطی نے فرمایا کہ اہل سنت میں سے کسی نے کبیرہ گناہوں کے مرتکب کو کافر نہیں کہا مگر یہ کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولے اس کو شیخ ابو محمد جوینی نے جو امام الحرمین کے والد

ہیں' کافر کہا ہے کہ جو شخص عمداً رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولے وہ کافر ہوا۔ اس کا یہ کفر مخرج عن الملۃ ہے۔ علما کا ایک گروہ اس فتویٰ پر ان کے تابع ہوا جن میں سے ایک امام ناصرالدین ہیں' جو ائمہ مالکیہ میں مشہور امام ہیں۔

علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ان دونوں مفتیوں کی تائید حدیث نبوی سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر جھوٹ بولنے والا دیگر لوگوں پر جھوٹ بولنے والے کی طرح نہیں ہے بلکہ اس پر علیحدہ حکم اور وعید ہے اور اسی طرح ان کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ پر آپ کی زندگی میں ایک مسئلہ پر جھوٹ بولا تھا' تو آپ ﷺ نے یہ حکم نافذ فرمایا تھا کہ اس کو قتل کر کے پھر اس کی لاش جلا دو۔ اور ان کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ افترا علی الرسول دراصل افترا علی اللہ ہے۔ کیونکہ قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ بغیر وحی کے کلام نہیں کرتے تھے۔ اور حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ میں دینی امور میں وہی بات کہتا ہوں' جو آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ جب یہ بات ہے قرآن ناطق ہے کہ اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے یہ کام کسی بے ایمان آدمی کا ہو سکتا ہے۔ اور اس بات پر علما اہل سنت کا اجماع ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے بغیر کسی شخص پر افترا کرنا مخرج من الایمان نہیں ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ مولوی عبداللہ کی روایت دس ہزار نیکیوں والی موضوع کذب علی الرسول ہے جیسے کہ تذکرۃ الموضوعات ص۔۱۱۲ میں ہے : فیہ ابان متھم وفی المقاصد ھو موضوع "کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی ابان ہے جو متہم بالکذب ہے۔" مقاصد حسنہ میں لکھا ہے کہ یہ روایت بناوٹی ہے۔ امام شوکانی فوائد مجموعہ ص۔۱۸۸ میں فرماتے ہیں : فی اسنادہ متھم وقال فی المقاصد موضوع کہ یہ روایت موضوع ہے۔ اگر مولوی عبداللہ مرد میدان ہیں تو اس حدیث کی اسناد بیان کر کے اس کی صحت یا کم از کم حسن ہونا ثابت کریں۔

مولوی عبداللہ کی امامت اور علماء دیوبند کا فتویٰ:

نہیں یہ قصہ دل لگی کے لئے
بلکہ عبرت ہے آدمی کے لئے

الرواۃ الثقات والمتکلم فیہم کے ص ۵۸ میں ہے' علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ متاخرین کا اس سے بڑھ کر گناہ کیا ہو گا کہ بے تحاشا اپنی کتابوں میں جعلی روایتیں نقل کیں۔ یہ گناہ اور سنن نبویہ پر بہتان اور ظلم ہے۔ فتاوی دیوبند جلد ص ۲۳۰ میں سوال اور جواب درج ہے' وہ غور سے پڑھئے۔

سوال نمبر ۲۷۰ : ایک شخص احادیث جھوٹی بنا کر بیان کرتا ہے اور خلاف عقائد بہت باتیں بیان کرتا ہے' ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور اس شخص کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب نمبر ۲۷۰ : وہ شخص کذاب و مفتری یا دیوانہ ہے۔ جھوٹی روایات بیان کرتا ہے اور حق تعالیٰ اور اس کے رسول برحق پر بہتان لگاتا ہے اور مصداق اس وعید کا ہوتا ہے: من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ یعنی "جو شخص مجھ پر جھوٹ بولتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔" وہ شخص مبتدع و فاسق ہے' اس کو امام بنانا درست نہیں ہے اور اس کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔ (فقط کتبہ عزیز الرحمٰن)

محدثین کا یہ قانون ہے کہ جھوٹی حدیث بنانے والا اور بنائی ہوئی کو آگے چلا کر اس پر عمل کرنے والا دونوں یکساں ہیں۔ بنا بریں مولوی عبداللہ کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں' تاوقتیکہ وہ اس لادینی طرز عمل اور عصبیت جاہلانہ سے خالص توبہ نہ کریں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ مجھے ان روایتوں سے موضوع کا علم نہ تھا تو اس عذر بارد پر حکم یہ ہے کہ پھر بغیر حصول علم اس بحث میں پڑنا اور جہالت سے باطل دعویٰ کرنا اور اس پر بغیر تقریب تام دلیل پیش کرنا اور اس پر لوگوں کو ابھارنا جرم عظیم ہے۔ پس ایسے شخص کو بھی امام مقرر کرنا یا اس کو خطیب جمعہ بنا کر اس کے پیچھے جمعہ پڑھنا ناجائز ہے۔

عید کی پگڑیوں سے استدلال: متنازعہ مسئلہ یہ تھا کہ نماز میں سر ستر ہے یا نہیں؟ اور اس کا ڈھانکنا واجب ہے یا مندوب یا مباح؟ مولوی عبداللہ صاحب سر ستر جان کر اس کے ڈھانکنے کو واجب کہتے ہیں۔ لیکن اس پر کوئی دلیل شرعی جو دعویٰ پر ناطق ہو پیش نہیں کرتے۔ کبھی جمعہ میں پگڑی ہونے کا ذکر کر دیتے ہیں' کبھی عید کا۔

چنانچہ ص ۳۲ میں امام بیہقی کی سنن سے یہ نقل کیا ہے: باب الزینۃ للعید یعنی "عید کے لئے زینت لگانے کا یہ باب ہے۔" پھر اس میں یہ روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ

ہر عید میں پگڑی باندھا کرتے تھے۔ اور یہ روایت ذکر کی ہے کہ حضرت علی اور چار ہزار مسلمان پگڑیاں باندھ کر عید کو جا رہے تھے۔ کہاں یہ دعویٰ کہ ہر نماز میں پگڑی کا ہونا شرط ہے اور کہاں عید اور جمعہ کے دن کی زینت کہ اس روز پگڑیاں باندھ کر جائے

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

میں کہتا ہوں کہ جمعہ اور عید کے مخصوص تہواروں میں راوی کا پگڑیاں باندھنے کا ذکر کرنا اور پانچ وقت کی عام نمازوں میں اس کا ذکر نہ کرنا یہ اس بات پر دلیل ہے' کہ یہ زینت ان مخصوص دنوں کی ہے دائمی نہیں۔ ورنہ عید کے لئے خاص طور پر ذکر کرنا فضول ہو جاتا ہے۔ پھر اس فعل وقتی سے ہر نماز میں پگڑی کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ صرف استحباب ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ ابن القیم تحفۃ الودود ص۵۸ میں فرماتے ہیں: فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدل علی الوجوب وانما یدل علی الاستحباب۔ یعنی "فعل رسول وجوب کی دلیل نہیں ہو سکتا' استحباب کی دلیل بن سکتا ہے۔" مثلاً عید الاضحیٰ میں آنحضور ﷺ نے قربانی کی تو یہ سنت ہے واجب نہیں۔ حالانکہ حضور ﷺ ہمیشہ قربانی کرتے رہے۔ تو فعل سے وجوب ثابت نہ ہوا۔ اگر واجب ہوتی تو آپ کے دربار کے دو وزیر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر قربانی نہ چھوڑتے۔ چنانچہ مرعاۃ المفاتیح ج۲ میں ہے: فانھما کانا لا یضحیان کراھتہ ان یظن من راھما انھا واجبۃ۔ یعنی "ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہر دو صاحبان قربانی نہ کیا کرتے تھے تاکہ لوگ قربانی کرنا واجب خیال نہ کر لیں۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی حالانکہ دوسرے کپڑے موجود تھے اس خیال سے کہ دوسرے کپڑے میں جبکہ کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک پورا آسکتا ہو نماز جائز ہے دو تین کپڑے ہونے شرط نہیں ہیں' جیسا عوام کا خیال ہے۔

نیل الاوطار ج۷ ص۱۰۰ میں ہے: عرف فی الاصول والواجبات والشروط لا تثبت بمجرد فعلہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "علم اصول میں یہ قانون موجود ہے کہ واجبات اور شروط حضور ﷺ کے محض فعل سے ثابت نہیں ہو سکتے۔" پھر لکھا ہے: وغایتہ الندب یعنی زیادہ سے زیادہ استحباب ہو گا وجوب نہیں۔ امام ابن حزم نے اس اصول کو احکام الاحکام میں بڑے شدومد سے ثابت کیا ہے۔ جس کو یہاں زیادہ طوالت کے خوف سے نقل نہیں کیا جا سکتا

کہ پہلے ہی مضمون طویل ہو گیا ہے کہ سر ڈھانکنے کے بارے میں کوئی ایسی قولی یا فعلی حدیث ثابت نہیں ہوئی جس میں ذکر ہو کہ آنحضور ﷺ پانچ نمازوں میں یا ہر نماز میں پگڑی وغیرہ سے سر ڈھانکا کرتے تھے۔ مگر پگڑی کا رواج عام ہو گیا' اس لئے برہنہ سر کو عام لوگ برا جانتے تھے اور سر ڈھانکنا لازم کر لیا۔ یہاں ہم اپنے ایک دوست مولانا محمد حنیف فرید کوئی کا بیان واجب الاذعان نقل کرتے ہیں تاکہ عوام کے عقیدہ کا بطلان ظاہر ہو جائے۔ "قول حق" کے ص ۳۶ میں ہے۔ کتنے کپڑوں میں نماز درست ہے۔ سر ڈھانپنے کی کوئی شرط نہیں۔

پھر لکھا ہے: قال اللہ تعالیٰ خذوا زینتکم عند کل مسجد۔ "اے بنی آدم ہر مسجد کے قریب اپنی زینت پکڑو۔" ثابت ہوا کہ مسجد میں صاف ستھرا ہو کر اور صاف کپڑے پہن کر جانا چاہئے۔ حدیث (ترجمہ) محمد بن منکدر سے روایت ہے کہ نماز پڑھی جابر رضی اللہ عنہ نے صرف ایک تہبند میں اس طرح کہ اس کے دو پلے اپنے کندھوں پر باندھے ہوئے تھے اور کپڑے اس کے کھونٹی پر رکھے ہوئے تھے پھر کہا اس کو ایک کہنے والے نے نماز پڑھتا ہے ایک تہبند میں' پس کہا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے سوا اس کے نہیں کہ میں نے نہیں کیا یہ کام مگر تاکہ مجھ کو دیکھ لے بیوقوف تجھ جیسا ہمارا کون سا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دو کپڑے رکھتا تھا۔

یہ حدیث بخاری شریف میں ہے۔ خدارا غور فرمائیں کہ اسی مسئلے نے کہ ننگے سر نماز نہیں ہوتی بہت لوگوں کو بے نماز کر دیا کیونکہ عموماً لوگوں میں فیشن رکھنے کا رواج ہے' جس کو اچھی طرح حفاظت سے پالا جاتا ہے اور تیل وغیرہ لگایا جاتا ہے۔ ان کو سر پر کپڑا معیوب سا نظر آتا ہے۔ جب نماز کا وقت ہوا' تو سر پر مانند پٹی کے جیسے درد شقیقہ کا بیمار ہوتا ہے' باندھ لی یا کہہ دیا کہ میرا سر ننگا ہے (نماز نہ پڑھی)

سوچئے تو سہی کیا سر نہ ہوا شرمگاہ ہوئی کہ پہلے تو ننگے سر پھرتے رہے۔ مسجد میں داخل ہوئے تو ننگے سر' گھر گئے تو ننگے سر' قرآن پڑھا تو ننگے سر' احرام باندھا اور تمدت اختتام حج ننگے سر نمازیں ادا کرتے رہے۔ مگر دیکھنا اگر ننگے سر نماز پڑھی تو کفر کی حد تک پہنچ جاؤ گے یہ کھلا کا ثبوت ہے کہ ننگے سر نماز نہیں ہوتی' اسی مسئلہ کے اہتمام میں مسجد کو بدعت کی ٹوکریوں سے بھر دیتے ہیں۔ کھجور کی یا کسی اور اشیاء کی بنی ہوئی ٹوپیاں بنام مسجد صفوں پر رکھی ہوتی ہیں تاکہ سر ڈھانپ لیا جائے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے پیارے رسول ﷺ کی تعلیم کو چھوڑ کر ہوس کی پیروی شروع کر دی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت کپڑوں کی تنگی تھی' اس لئے ایک کپڑے میں نماز جائز تھی۔ سنو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کی زبان پر قرآن اترتا تھا۔ ان کے فرمان کے مطابق فراخی کا مسئلہ بھی واضح کر دوں۔

بخاری شریف ص-۵۳ میں ہے : حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آکر کھڑا ہوا اور آپ سے پوچھنے لگا ایک کپڑے میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا بھلا کیا ہر ایک تمہارا دو کپڑے حاصل کر لیتا ہے۔

پھر ایک شخص نے یہی مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب اللہ وسعت دے تو بھی فراخی کرو' اکٹھا کر لے آدمی اپنے اوپر کپڑوں کو اپنوں کو تہ بند اور چادر میں نماز پڑھ لے (جیسے حجاج پڑھتے ہیں) کوئی قمیص اور تہ بند میں نماز پڑھ لے (جیسے بعض اہلحدیث غرباء پڑھتے ہیں) کوئی تہ بند اور قبا میں نماز پڑھ لے (جیسے کہ عرب میں بعض عربی لوگ پڑھتے ہیں) کوئی شلوار اور چادر میں (جیسے بعض شہری مسلمان پڑھتے ہیں) کوئی شلوار اور کرتہ میں پڑھ لے (جیسے ہندوستانی مسلمان پڑھتے ہیں) کوئی شلوار اور چوغہ میں (بعض عربی لوگ ویسے پڑھتے ہیں) کوئی پتلون یا جانگیا اور کرتہ میں (جیسے بعض فوجی یا کشتی کرنے والے پہلوان پڑھتے ہیں) کوئی پتلون اور چوغہ میں نماز پڑھ لے (جیسے اکثر انگریزی داں پڑھتے ہیں)۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فراغت کے وقت موجودہ کپڑوں میں نماز پڑھنی افضل ہے اور اس کو برا جاننے والا سنت کا منکر ہے۔ اور اسی طرح ہدایہ میں ہے : (ترجمہ) "آدمی اپنے پردے کو چھپائے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ پکڑو زینت اپنی ہر مسجد کے پاس یعنی چھپائے وہ پردے اپنے کو ہر نماز کے لئے۔"

اور عورت کے لئے خاص کر یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے : ولا صلوۃ لحائض الا بخمار البالغۃ "نماز نہیں ہوتی بالغہ عورت کی بغیر اوڑھنی کے۔"

آدمی کا پردہ جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی' دھنی (یعنی ناف) سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ واسطے فرمان عالی شان رسول اللہ ﷺ کے کہ آدمی کا پردہ دھنی اور گھٹنوں کے درمیان کا حصہ ہے۔ (ہدایہ ص-۷۸)

مذکورہ بالا بیان سے جو ہدایہ کی عبارت ہے' ثابت ہوا کہ بالغہ عورت کی بغیر اوڑھنی کے

نماز نہیں ہوتی' اگر وہ پڑھ لے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ مگر مرد بغیر پگڑی یا ٹوپی کے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز بلا کراہت ہو جاتی ہے۔ یعنی اس میں کسی قسم کا خلل نہیں ہے۔ (تا آخر) مسلمان کے لئے یقین کر لینے میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہی کافی ہے۔ ضد کا علاج بڑے سے بڑا بزرگ بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ہے : انه کان لایاتنا عنیدا

"بیشک وہ ہماری آیتوں کے ساتھ عناد رکھتا تھا' ضد ہی کرتا رہا"

لہٰذا تمام مسلمانوں کی خدمت میں عرض ہے' کہ وہ ضد کو دور کر کے قلب سلیم لے کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پکے اور سچے فرمان بردار اور تابعدار ہو جائیں۔ اس تحریر میں جو عبارت بریکٹوں میں ہے وہ راقم الحروف کی ہے۔ جو وضاحت کے طور پر لکھی گئی ہے۔ باقی مصنف قول الحق کی ہے جو بالکل صحیح اور حق ہے کہ ایک کپڑے میں نماز جائز اور دو میں وسعت کی حالت میں جائز ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پگڑی کا ذکر تک نہ کیا' کہ یہ تیسرا کپڑا ہے' جس کا جمعہ اور عید کے بغیر پہننے کا عام رواج عہد سلف میں خصوصاً نماز کے وقت نہ تھا۔ اس لئے عام نمازوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ عید اور جمعہ میں ملتا ہے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے تہوار ہیں' جن میں زیادہ زینت کی جاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اسلام کے اس دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ جب کہ مسلمانوں پر وسعت تھی اور تنگی رفع ہو گئی تھی جیسا کہ محلی ابن حزم ج-۴' ص-۷۱ میں درج ہے' ان کا بیان یہ ہے کہ انی لا ترک ثیابی فی المشجب واصلی فی الثوب الواحد یعنی "میں اپنے کپڑے تپائی پر چھوڑ آتا ہوں اور ایک کپڑے میں نماز پڑھ لیتا ہوں۔"

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان یہ ہے کہ ایک کپڑے میں نماز (واجبی) سنت ہے۔ ہم عہد نبوی میں ایسا کرتے تھے اور ہم پر کوئی نکتہ چینی نہ کی جاتی تھی۔ (مشکوٰۃ شریف)

اس سے معلوم ہوا کہ اب جو عیب گیری کر کے ملامت کرتے ہیں۔ یہ احکام شریعت سے جاہل ہیں۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ بعض صحابہ نے جو ایک کپڑے میں نماز پڑھی تھی یہ اس مسئلہ کو ظاہر کرنے کیلئے تھی' کہ جب تنگدستی ہو اور کپڑا نہ ملے تو ایک کپڑے میں نماز درست ہے۔ یہ توجیہ نہایت کمزور ہے۔ کیونکہ یہ تین وجہ سے مردود ہے

ایک یہ کہ یہ توجیہ کسی محدث اور امام نے بیان نہیں کی یہ کسی علماء کی اختراعی ہے'

بلکہ محدثین ایک کپڑے میں نماز جائز ہونے کا باب باندھتے ہیں۔

امام ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں یوں باب باندھا ہے: باب اباحة الصلوة في الثوب الواحد المتوشح به اذا اشتمل به وان كان واجد الثوب آخر ولا كفر منه یعنی "یہ باب اس مسئلے کے بیان میں ہے کہ ایک کپڑے میں بطور توشح بدن پر لپیٹ کر نماز پڑھنی جائز ہے' اگرچہ دوسرا کپڑا یا زیادہ پا سکتا ہو۔" پھر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں صراحت کر دی کہ عہد فاروقی میں اس مسئلہ پر اختلاف ہو کر پھر اجماع ہو گیا کہ یہ جائز ہے۔ ثم استقر الامر علی الجواز۔

نیز فتح الباری ج۔۳ ص۔۳۳۳ میں ہے: فلم يكلف تحصيل ثوب ثان يصلي فيه فدل على الجواز۔ یعنی "لوگ ایک کپڑے میں نماز پڑھتے تھے شارع نے دوسرا کپڑا حاصل کرنے کی تکلیف نہیں دی ورنہ وہ ضرور حاصل کر لیتے۔" اس سے ثابت ہوا کہ ایک کپڑے میں نماز جائز ہے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں نماز جائز جان کر پڑھی ہے۔ مسئلہ بتانے کی غرض سے پڑھنے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ پھر حدیث میں صاف آیا ہے: عن ابی کنا نصلی في عهد رسول الله في الثوب الواحد ولنا ثوبان۔ (کنز العمال بحوالہ صحیح ابن خزیمہ) یعنی "ابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم عہد نبوی میں ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھا کرتے تھے حالانکہ ہمارے پاس دو کپڑے ہوا کرتے تھے۔" اس روایت سے سب عذر اور تاویل اور اختراعی توجیہیں باطل ہو گئیں۔

دوسری یہ کہ ایسا مسئلہ کپڑے پاس ہوتے ہوئے ظاہر کرنا عقل ودانش کے خلاف ہے' ایسا مسئلہ اس وقت تو بتایا جا سکتا ہے کہ کپڑے پاس نہ ہوں اور پھر ایک کپڑے میں نماز پڑھے اور جب کوئی پوچھے تو یہ بتا دے کہ کپڑا نہ ہونے کی صورت میں اس طرح نماز جائز ہے۔ یہ بات تو مناسب حال ہے اور یہ بات کہ جب کپڑے پاس ہوں پھر ایک کپڑے میں نماز پڑھے' تو اس سے عدم وجدان ثوب پر نماز پڑھنا ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے کپڑے ہوتے ہوئے بھی نماز درست ہے۔ کہ نماز میں دو کپڑے یا تین شرط نہیں ہیں۔ اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: ليس كلكم يجد ثوبين "کہ تمہارے میں سے ہر ایک دو کپڑے نہیں پا سکتا" یعنی ایک کپڑے میں اس لئے نماز درست ہے کہ اگر دو کپڑے نماز کے لئے واجب اور شرط کر دیے جائیں تو پھر مشکل ہو

جائے گی۔ کیونکہ ہر شخص کو دو کپڑے میسر نہیں ہو سکتے۔ پھر اس کو دوسرے کے حاصل کرنے میں تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ کیونکہ دین آسان ہے اور ایک کپڑے سے سترڈھانپا جا سکتا ہے اس لئے ایک کپڑا ضروری ہے۔ باقی مندوب ہے۔

تیسری وجہ اس توجیہ کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ جب سرڈھانپنا واجب اور ضروری ہے' تو کپڑے پاس ہوتے ہوئے سر ننگا کر کے نماز پڑھنا گناہ ہوگا کیونکہ یہ فعل جائز ہے اس سے واجب کا ترک لازم آتا ہے جب یہ کام ناجائز اور گناہ ہوا تو اس کا ارتکاب کر کے مسئلہ بتانا اور تعلیم دینا جائز نہیں ہو سکتا یہ اصول شرع کے خلاف ہے۔ مثلاً عورت کو نماز میں سر ننگا کرنا گناہ ہے۔ تو کیا حضرت عائشہ یا کسی صحابیہ نے سر ننگا کر کے نماز دکھائی ہے' کہ کپڑا نہ ملے تو نماز جائز ہے۔ اگر کہو ہاں تو ثبوت پیش کرو۔ اگر نفی کرو تو اس سے ظاہر ہوا کہ عورت کے لئے سرڈھانپنا شرط ہے۔ خواہ تنگی ہو سرڈھانکنے کی عورت کو ضرور کوشش کرنی ہوگی۔ اور مرد کے لئے شرط نہیں اس لئے آنحضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے کپڑے پاس رکھ کر ایک کپڑے میں نماز پڑھی ہے۔ یہ مسئلہ عام مسلمان جانتے ہیں کہ پانی نہ ملے اور وضو نہ کر سکے تو تیمم درست ہے۔

اب اگر کوئی شخص جنگل میں پانی موجود ہوتے ہوئے تیمم سے نماز پڑھے اور کہے کہ مسئلہ بتانے کو ایسا عمل کر رہا ہوں تو اس عمل کو کوئی جائز نہ کہے گا بلکہ سب بیوقوف کہیں گے۔ تو مولوی عبداللہ نے بھی حضرت جابر کو بیوقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ خود بیوقوف ہیں۔ جو ناجائز کام کر کے تعلیم دینا جائز سمجھتے ہیں۔ ہاں کوئی افضل کام چھوڑ کر جائز عمل کی تعلیم دے تو یہ جائز ہے۔ مثلاً آنحضور ﷺ کی عام عادت مبارک یہ تھی کہ ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے۔ جیسے حدیث میں ہے: کان النبي صلی اللہ علیه وسلم یتوضا عند کل صلوٰۃ۔ لیکن بعض اوقات ایک ہی وضو سے کئی نمازیں پڑھ لیں تھیں۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ انک فعلت شیئا لم تکن تفعلہ "حضور! آج آپ نے خلاف معمول یہ کام کیا ہے' پہلے کبھی ایسا نہ کیا تھا" آنجناب ﷺ نے فرمایا: انی عمدا فعلته یاعمر۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے اے عمر! (کہ یہ بھی جائز ہے)

مولوی عبداللہ سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ کسی ملک کا سفر کریں اور جنگل بیابان میں پہنچیں اور وہاں آپ کو کوئی ڈاکو پہنچ کر آپ کے تمام کپڑے چھین لے اور آپ ننگے ہو

جائیں۔ اور ادھر نماز کا وقت بھی آ جائے تو کیا بیٹھ کر سر ننگے نماز پڑھو گے یا نماز ترک کر دو گے۔ تو ثبوت درکار ہے۔ اگر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر پڑھو گے تو یہ جائز ہے۔ پھر آپ نے کسی اور کو اس کی تعلیم دینی ہو تو زبانی دیں گے۔ یا کپڑے اتار کر کسی کو ننگے ہو کر نماز پڑھ کر تعلیم دو گے۔ اگر صورت اولیٰ ہے تو یہ ہمارا مسلک ہے۔ اگر صورت ثانیہ ہے تو لوگ آپ سے تعلیم لیں گے یا احمق کہہ کر آپ سے منہ پھیر لیں گے۔ پس آپ کا یہ مسلک کہ ناجائز کام کر کے مسئلہ بتاؤ۔

مولوی عبداللہ نے ہمارے دلائل سے تنگ آکر رسالہ کے ص۔ ۳۲ پر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ "ایک کپڑے میں نماز پڑھنی ثابت ہے" اگر عمل کا شوق ہے' تو اسی شکل سے جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔ عمل کرو اپنے کرتے پاجامے اتار کر رکھ دیا کرو۔ اور ایک کپڑے میں گرہ دے کر نماز پڑھو پھر واقعی حدیث کے مطابق نماز ہو گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کو سر کے ستر ہونے یا نہ ہونے کی غرض نہیں صرف کپڑوں کی ہیئت وشکل میں نزاع ہے۔ کہ کرتا' تہبند یا پاجامہ ننگے سر نماز نہ پڑھو۔ صرف جابر کی طرح بے شک شوق سے پڑھ لیا کرو۔ یہ دوسری قسم کی جہالت کا مظاہرہ ہے کیونکہ کپڑوں سے نماز میں سر ڈھانپنا مقصود ہے۔ خاص شکل اور ہیئت مقصود نہیں ہے۔ ایک چادر ہو تو اس سے بصورت توشح اس لیے نماز پڑھی جاتی ہے کہ اس سے کندھے ڈھک جاتے ہیں۔ اگر ایک قمیص گھٹنوں سے کچھ نیچے ہو تو پھر اس شکل میں توشح کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شکاری صحابی کو صرف ایک قمیص میں نماز پڑھنے کی اجازت فرمائی تھی۔ بلکہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قمیص میں نماز پڑھی اور امامت کرائی۔ (ابوداؤد ملاحظہ ہو)

صحیفہ کے حوالہ کی تردید صحیفہ سے: مولوی عبداللہ نے رسالہ کے ص۔ ۳۳ پر صحیفہ کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ ٹوپی یا عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنی افضل واولیٰ ہے۔ اس سے مولوی عبداللہ کی پوری تردید ہو گئی' کہ وہ واجب اور ضروری ہونے کے قائل ہیں۔ ناقل صحیفہ ان کے مرشد واستاد فضیلت کے قائل ہیں اور ان کا روحانی باپ (محدث سامرودی) جن کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ میں آپ کا بچہ ہوں۔ (بحوالہ صحیفہ) وہ بھی فضیلت کے قائل اور وجوب کی تردید کرنے والے ہیں' بحث وجوب میں ہے فضیلت میں نہیں تو صحیفہ کا حوالہ ان کے مضر ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ فضیلت دو قسم کی ہے۔ ایک فضیلت اصلیہ وہ یہ کہ اصل احکام کو پورا کیا جائے تو اس میں فضیلت آئی ہے۔ مثلاً فرائض کے ادا کرنے میں بڑی فضیلت وارد ہے جیسے جمعہ سے جمعہ تک سے زائد دنوں کے گناہ ایک جمعہ پڑھنے سے بخشے جاتے ہیں۔ دوسری فضیلت زائدہ ہے۔ مثلاً فرائض کے بعد نماز تطوع پڑھے تو فضیلت ہے۔ لیکن یہ فضیلت زائدہ ہے۔ اگر نماز تطوع نہ پڑھے تو فرائض نماز پوری ادا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حج کے بعد مدینہ کو مسجد نبوی کی زیارت اور نماز پڑھنے کے لئے جانا فضیلت ہے۔ اگر نہ جائے گا تو حج پورا ادا ہو جائے گا۔ حج میں نقص واقع نہ ہو گا۔ جیسا کہ گمراہ فرقوں کا خیال ہے کہ حج کے بعد مسجد نبوی اور روضہ کی زیارت کو جانا لازمی ہے۔ اگر حاجی نہ گیا تو اس کے حج میں نقصان لازم آئے گا اور اس نے آنحضور ﷺ پر ظلم کیا یہ عقیدہ باطل ہے۔ تو صحیفہ میں جو اہل صحیفہ نے پگڑی وغیرہ ڈھانکنے کی نماز کو افضل کہا ہے اس سے فضیلت زائدہ مراد ہے۔ فضیلت اصلیہ نہیں ہے۔ جو کسی واجبی اور فرضی چیز کے ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مولوی عبداللہ نے غلط فہمی سے فضیلت وجوبی سمجھ لی چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صحیفہ یکم جمادی الثانی سنہ ۔۔ھ میں کسی نے سوال کیا کہ آدمی ننگے سر نماز بغیر کسی عذر کے پڑھے تو کوئی خاص فرق تو نہیں پڑتا؟ اس کا جواب صحیفہ مذکورہ میں یہ دیا گیا۔ شریعت مطہرہ نے صافہ وغیرہ باندھ کر اور ننگے سر نماز پڑھنے میں کوئی فرق نہیں بتایا' اس لئے ہم کسی کو فضیلت نہیں دے سکتے۔

نیز اسی صحیفہ میں یہ لکھا ہے "بغیر عذر کے ننگے سر نماز ہو جاتی ہے۔ پس دونوں صحیفوں میں تطبیق یہ ہے کہ پگڑی والی نماز کی فضیلت زائدہ ہے یعنی اگر کوئی عمل کرے تو اچھا ہے۔ فضیلت اصلیہ نہیں کہ پگڑی والی نماز سے ننگے سر کی نماز ناقص ہو' یہ خیال باطل ہے شریعت نے یہ کوئی فرق نہیں بتایا۔

مولوی عبداللہ نے جس صحیفہ کا حوالہ دیا ہے' وہ سنہ ۔۔ھ کا ہے۔ بندہ نے جس صحیفہ کا حوالہ دیا ہے۔ وہ سنہ ۔۔ھ کا ہے۔ امام بخاری علیہ رحمۃ الباری نے یہ اصول بتایا ہے "یوخذ بالآخر" کہ آخری بات کو لیا جائے گا۔ پس مولوی عبداللہ نے یہ جھوٹ بولا کہ میں نے نبی ﷺ کے قول و فعل سے ثابت کر دیا کہ ٹوپی اور پگڑی سے نماز پڑھنے کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ حالانکہ بغیر موضوع روایات کے کوئی ثبوت نہیں دیا بلکہ اس کی جہالت ظاہر ہے'

کہ فضیلت زائدہ اور فضیلت واجبہ میں فرق نہیں جانتا۔ وما یعقلها الا العالمون۔

جو اصل احکام پر عمل کرے اس کو فضیلت اصلیہ ملتی ہے۔ اور جو کسی امر مندوب پر عمل کرے اس کو فضیلت زائدہ ملتی ہے۔ جس کو تطوع کہتے ہیں۔ پھر اس فضیلت سے سر ڈھانپنا واجب کیسے ثابت ہوا۔ جو چیز ثابت ہے اس کا دعویٰ نہیں اور جس چیز کا دعویٰ ہے' وہ ثابت نہیں۔ مولوی عبداللہ نے صحیفہ مطبوعہ ۱۴/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کراچی سے جو ننگے سر نماز پڑھنے کے بارہ میں فتویٰ نقل کیا ہے۔ اس میں سخت بددیانتی سے کام لیا ہے۔ پبلک عام کو دھوکہ دیا ہے کہ اس سے اپنے مطلب کے چند کلے نقل کر دیئے اور اصل فیصلہ اس نزاع کا درج نہ کیا جس سے اس کی حقیقت کھل جاتی۔ اچھا اب ہم اس کو نقل کر کے اس کی تمام جڑ کاٹتے ہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب کی نقل کردہ عبارت کے بعد اسی صحیفہ میں یہ لکھا ہے : لیکن اگر کوئی شخص بلا عذر ننگے سر نماز پڑھ لے تو جائز ہے۔ اور کوئی مضائقہ نہیں' نہ اس پر کوئی عتاب و وعید ہے' کیونکہ مردوں کے لئے نماز میں سر ڈھانکنا ضروری نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ یہ فرماتے ہیں : لا یصلی احدکم فی الثوب الواحد لیس علی عاتقه شئی۔ (بخاری) یعنی جب کسی کے کندھے پر کوئی چیز پہنی نہ ہو تو وہ ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے (کندھا ڈھکا ہو تو پڑھ لے)۔

پھر دوسری حدیث لکھی ہے' جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ابو سعید خدری نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' تو آپ نے دیکھا کہ ایک بوریہ پر سجدہ کر رہے ہیں۔ اور ایک کپڑے میں اس کو کندھوں کے اوپر سے بدن پر لپیٹ کر نماز پڑھ رہے ہیں (سر ننگا تھا)۔

پھر تیسری حدیث نقل کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے : محمد بن منکدر نے بیان کیا ہے کہ حضرت جابر ایک چادر میں اس کو گدی پر سے باندھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ (سر ننگا تھا) اور ان کے دیگر کپڑے (پگڑی' قمیص وغیرہ) تپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ ایک چادر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے اس لئے اس طرح پڑھی ہے کہ تمہارے جیسے احمق مجھے دیکھ لیں۔ بھلا عہد نبوی ﷺ میں کس کس کے پاس دو دو کپڑے ہوتے تھے؟ (جس سے ظاہر ہے شارع نے دو کپڑے ظاہر نہیں کیے) ان دلائل کے بعد مفتی صاحب فرماتے ہیں۔ ان حدیثوں سے صاف ظاہر ہے کہ نماز میں سر ڈھانکنا ضروری نہیں ہے۔ پس جو لوگ ٹوپی یا عمامہ یا رومال ہوتے ہوئے ننگے

سر نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز بلا شک و شبہ صحیح اور درست ہوتی ہے۔

کیونکہ آنحضور ﷺ نے اس بات کے بیان کرنے کے لئے کہ صرف ایک کپڑے (چادر یا تہبند) میں بھی نماز ہو جاتی ہے۔ ایک کپڑے میں ادا فرمائی۔ اور ظاہر ہے کہ جب صرف ایک تہ بند یا ایک چادر باندھ کر نماز ادا کی جائے گی۔ تو یقیناً سر کھلا ہوا ہو گا اہلحدیثوں میں سے تو غالباً جواز نماز برہنہ سر میں کسی کو کلام نہیں اور نہ ہونا چاہئے (کیونکہ عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں)۔ ہاں اکثر برادران احناف اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ (مگر ان کے عوام۔ خواص نہیں) حالانکہ فقہ حنفیہ کی کتاب فتاویٰ عالمگیری (جس کو پانچ سو علماء حنفیہ نے متفقہ طور پر عالمگیر بادشاہ کے عہد میں تیار کیا ہے۔) میں مرقوم ہے: ولا باس به اذا فعله تذللا وخشوعا بل هو حسن۔ (كذا في الذخيرة) یعنی "اگر کوئی شخص بوجہ عاجزی و انکساری کے برہنہ سر نماز پڑھے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اچھا اور افضل ہے۔" (اس سے ظاہر ہے کہ عندالحنفیہ بھی سر ستر نہیں)

میاں صاحب مرحوم قدس سرہ (یعنی حضرت سید نذیر حسین مرحوم شیخ العرب والعجم محدث دہلوی) فرماتے تھے کہ امامت نماز پنجگانہ جناب شاہ عبدالعزیز صاحب کے وقت میں مولانا شاہ اسحاق صاحب کرتے تھے۔ ایک روز ولایتی ملا (یعنی حنفی پٹھان مثل مولوی عبداللہ کے) جو شریک ہوا تو دیکھا کہ امام صاحب صرف ٹوپی اوڑھے ہوئے بغیر عمامہ کے نماز پڑھا رہے ہیں۔ اس نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے کہا کہ امام صاحب عمامہ نہیں باندھتے (وہ مولوی عبداللہ کی طرح عمامہ کا عاشق تھا) امام کے لئے عمامہ ضروری ہے۔ (یہ بھی کوئی ڈیرہ والے مولوی کی طرح عامی ہی تھا) (اہل قولہ) دوسرے وقت بھی صرف ٹوپی ہی کے ساتھ نماز پڑھائی۔ تو وہ ملا نماز کے بعد بگڑا اور جناب شاہ عبدالعزیز صاحب سے کہنے لگا کہ آپ کا پیش امام عمامہ نہیں باندھتا ہم لوگ عمامہ والوں کی نماز ان کے پیچھے مکروہ ہوتی ہے۔ تب جناب عبدالعزیز صاحب کو جلال آگیا جواب میں فرمایا کہ ابھی تو اسحاق ٹوپی سر پر رکھ کر امامت کرتا تھا۔ آئندہ اسے کہہ دوں گا کہ ننگے سر نماز پڑھائے۔ ساری دنیا کو اس کی اقتدا کرنا ہو گی۔ (بحوالہ سوانح عمری میاں صاحب مرحوم ص ۳۸) محیقہ کی اس تمام عبارت سے تین امور ثابت ہوئے۔

اول یہ کہ مولوی عبداللہ صاحب نے محیقہ سے مسئلہ نقل کرنے میں خیانت کی ہے۔

کہ اصل فیصلہ کہ ننگے سر نماز جائز ہے۔ کتمان حق کرتے ہوئے اس کو چھپالیا اور کچھ بات اپنے مطلب کی لے کر اپنا الو سیدھا کر لیا' جو کہ صحیح نہیں ہے۔ شیخ الاسلام مرحوم نے اقتضاء صراط مستقیم میں لکھا ہے کہ محدثین اہل علم نے یہ فرمایا ہے کہ علماء اہل حق عبارت نقل کرتے ہوئے موافق اور مخالف سب نقل کرتے ہیں۔ اور اہل ہوی (خواہش پرست صرف اپنی موافق بات نقل کرتے ہیں' باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے بعض لا تقربوا الصلوۃ پڑھ کر نماز کے تارک ہو جاتے ہیں۔ اور وانتم سکاریٰ نہ پڑھتے ہیں اور نہ اس پر غور کرتے ہیں۔

دوسرا امر یہ کہ عاجزی کی نیت سے ننگے سر نماز افضل اور درست ہے۔ اسی لئے احرام کی صورت میں تمام حجاج ننگے سر ہوتے ہیں۔ کہ وہاں عجزو انکساری کا زیادہ دخل ہے۔

تیسرا امر یہ ثابت ہوا کہ اجلہ محدثین کا یہی مسلک ہے کہ ننگے سر نماز جائز ہے اور برہنہ سر امام کی اقتدا درست ہے' یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی بے علم اپنے منہ سے بڑھانکے کہ سر ڈھانکنا واجب اور ضروری ہے' تو اس کی بات لائق التفات نہیں ہے۔ پس اس فیصلہ سے جو مولوی عبداللہ صاحب کے مرشدین واساتذہ نے کراچی سے شائع کیا ہے۔ اس کا رسالہ جواب المغرب مردود ہوا۔ ان کے ہادیوں کا فیصلہ ناطق ہے۔ جس سے انکار کرنا مولوی عبداللہ صاحب کو زیب نہیں دیتا۔

مفتی صحیفہ نے اس مسئلہ میں احناف کا ذکر کیا ہے۔ کہ وہ برہنہ سر نماز پڑھنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حنفیہ میں بھی ملا والاتی کی طرح ضدی اور مارو وعتمو لوگ ہی اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن حنفیہ کے اکابر علماء اعتراض نہیں کرتے۔ بلکہ ننگے سر نماز کو جائز کہتے ہیں۔ چنانچہ شیخ المشائخ حنفیہ دیوبند کے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے دو فتویٰ نقل کیے جاتے ہیں۔ تاکہ دیوبندی احناف کو آئندہ اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہے۔ فتاویٰ رشیدیہ کے ص ۲۷۲-۲۷۷ میں یہ درج ہے۔

سوال : اگر بلا عمامہ نماز پڑھائے تو کیا نماز مکروہ ہو گی' تنزیہی یا تحریمی؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ نماز عمامہ سے پڑھائی ہے۔ صرف ٹوپی کو سر مبارک پر زیب نہیں بخشا؟

جواب : صلوٰۃ بلا عمامہ مکروہ نہیں نہ تحریمی نہ تنزیہہ' البتہ ترک افضل ہے۔ آپ کے سر مبارک پر کلاہ بلا عمامہ بھی ثابت ہوتی ہے' فقط۔

سوال : جو شخص تارک عمامہ سے جنگ وجدل کرے اور عمامہ کو ضروری جانے وہ کیسا ہے؟ حالانکہ تارک عمامہ اولویت عمامہ کا نماز کے اندر قائل ہے اور جہاں امام دستار بند نماز نہ پڑھاتا ہو' وہاں سے جو شخص مسجد چھوڑ کر چلا جائے اسی وجہ سے مارنے مرنے پر مستعد ہو وہ کیسا ہے؟ (اس سوال سے ظاہر ہے کہ پگڑی کے عقیدہ کی خرابی کی نوبت کہاں تک پہنچتی ہے)

جواب : تارک عمامہ سے جدال کرنے والا جاہل ہے۔

سوال : کیا فتاوی عالمگیری اور قاضی خاں میں نماز بلا عمامہ کو مکروہ لکھا ہے؟

جواب : کسی نے بلا عمامہ نماز کو مکروہ نہیں کہا اگر کہا؟ تو باطل ہے۔ بترک ندب ورنہ مردود ہوگی فقط میں کہتا ہوں کہ مردود ہونے کا خیال درست ہے۔ میرا اس پر صاد ہے۔

سوال : اگر امام کو عذر سے یا بلا عذر عمامہ میسر نہ ہو اور مقتدی باندھے ہوں تو کیا نماز میں کچھ نقصان ہوگا؟

جواب : اگرچہ مقتدی سب متعمم ہوں (پگڑی باندھنے والے) اور امام بلا عمامہ ہو تو نماز کسی کی بھی مکروہ نہیں ہوتی۔ فقط میں کہتا ہوں کہ مولانا عبدالحی صاحب حنفی کے فتاوی ج۱' ص۲۲۰ میں ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ بغیر عمامہ کے امامت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو جواب یہ لکھا ہے : عمامہ کے ساتھ امامت مستحب ہے اور بغیر عمامہ بھی جائز ہے۔

سوال : سرور عالم ﷺ سے کبھی بلا عمامہ کے بھی نماز پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟

جواب : اس کا صریح ثبوت اس وقت بندہ کو معلوم نہیں' مگر احرام کی حالت میں سر برہنہ نماز پڑھنا محقق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مولانا مطالعہ وسیع کر لیتے تو ان کو ان کی مذہبی کتاب مسند امام اعظم سے یہ مسئلہ دستیاب ہو جاتا۔ چنانچہ اس کے ص۱۴۳ میں درج ہے جو مسئلہ متنازعہ میں فیصلہ کن ہے : ابو حنیفه عن عطاء عن جابر انه امهم فی قمیص واحد وعقده فضل ثیاب یعرفنا بسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ یعنی "امام ابو حنیفہ نے عطاء سے روایت کیا اور حضرت عطاء نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انہوں نے صرف ایک قمیص پہن کر لوگوں کی امامت کی حالانکہ ان کے پاس زائد کپڑے موجود تھے۔ دراصل وہ ہم کو یہ پہچان کرا رہے تھے کہ کپڑے میں نماز پڑھنا سنت واجبی ہے۔" (زیادہ میں استحبابی ہے)

یہ حدیث کہ آپ ﷺ نے ایک قمیص میں امامت کرائی سنن ابوداؤد میں موجود ہے اور امام طحاوی نے شرح معانی الآثار ج۱ ص۔۲۲۳ میں ایسی روایات نقل کی ہیں' جن میں یہ ذکر ہے کہ آنحضور ﷺ نے کپڑے پاس ہونے کے باوجود ایک کپڑے میں نماز پڑھائی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اور دریافت کرنے پر بتایا کہ آخری نماز حضور ﷺ نے ایک کپڑے میں پڑھی تھی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

امام طحاوی نے احادیث نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے : فقد یجوز ان یکون ذلک علی ماتسع من الثیاب خاصۃ لا علی ما ضاق منھا یعنی "ان احادیث سے یہ ظاہر ہوا کہ باوجود کپڑوں کی فراخی کے ایک کپڑے میں نماز جائز ہے' خاص کر اسی مسئلہ کا ان میں ذکر ہے۔" تنگی کپڑوں کی صورت حالات کا ذکر ان میں نہیں ہے' پھر لکھتے ہیں : ویجوز ان یکون علی کل الثیاب ما ضاق منھا وما اتسع۔ یعنی "سب کپڑوں پر ان کا حکم ہے کہ تنگی ہو یا فراخی ایک کپڑے میں نماز جائز ہے۔"

مولوی عبداللہ نے راقم الحروف حصاری کو ایک خط لکھا جس میں یہ ظاہر کیا کہ بریلویوں کے ایک اعلان سے متاثر ہو کر ان کی دلجوئی کے لئے یہ مسئلہ بیان کیا کہ ننگے سر نماز نہ پڑھو وہ بھاگ جائیں گے۔ اور میرا وعظ نہ سنیں گے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

بزم مسلم از چراغ غیر سوخت
مسجد او از شرار غیر سوخت

مولوی عبداللہ کو غیر مذہب کی کتابوں کا خصوصاً بریلوی لٹریچر کا پورا مطالعہ ہوتا' تو آپ ان سے خائف ہو کر مداہنت اور کتمان حق سے کام نہ لیتے' بلکہ اس مسئلہ کو خوب ظاہر کر کے ان کی کتابوں سے ثبوت دیتے۔ چنانچہ بریلوی فرقہ کے احکام شریعت حصہ اول ص۔۳۷ میں مولوی احمد رضا خان بریلوی عقائد کے مجدد لکھتے ہیں۔

سوال : کیا حکم ہے اصل شریعت کا اس مسئلہ میں بعض لوگ ننگے سر نماز پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ (شاید سائل نے غرباء اہلحدیث دیکھے ہوں گے) اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ جل شانہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ اور نماز میں کسی طرح کی کراہت تو نہ ہوگی؟ بینوا توجروا۔

جواب : اگر بہ نیت عاجزی ننگے سر پڑھتے ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم کتبہ

عمدۃ المذہب احمد رضا خاں حنفی عنہ نیز احکام شریعت حصہ دوم' ص۔ ۳۹ میں اسی طرح سوال وجواب ہے۔

سوال : نماز کے اندر اگر ٹوپی گر جائے تو اٹھانا چاہئے یا نہیں؟

جواب : اٹھالینا افضل ہے جب کہ بار بار نہ گرے اگر تذلل وانکسار کی نیت سے سر برہنہ رہنا چاہے تو نہ اٹھانا افضل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نماز میں خشوع رکن اعلیٰ ہے۔ اس لئے کپڑوں میں بھی خشوع کی نیت چاہئے۔ تو نماز سر برہنہ دیوبندی و بریلوی احناف کے نزدیک متفقہ طور پر جائز بلکہ افضل ہوئی۔ اور یہ اصول سب کا متفقہ قرار پایا۔ کہ سر نماز میں ستر نہیں ورنہ عاجزی کی نیت سے تمام کپڑے اتار کر برہنہ جسم نماز پڑھے تو جائز ہوگی؟ ہرگز نہیں بلکہ باتفاق باطل ہے' تو اس سے ظاہر ہوا کہ' سر ستر میں شمار نہیں ہے۔ مولانا گنگوہی نے جو یہ فرمایا ہے کہ احرام کی حالت میں آنحضور ﷺ کا ننگے سر نماز پڑھنا محقق ہے۔ اس سے بھی ننگے سر نماز پڑھنے کا مولانا نے بایں طور پر جواز نکالا ہے۔ کہ سر ستر یعنی مقام پردہ کرنے کا نہیں ہے۔ جیسا کہ ناف سے رانوں تک اور کندھے نماز میں ستر ہیں۔ کہ ان کا حالت احرام وغیر احرام میں بہرحال ڈھانکنا واجب ہے۔ مگر مولوی عبداللہ اپنی عقل کی رو سے یہ کہتا ہے کہ خدا سے ڈرو مولویو! کیا خدا کو منہ دکھلاؤ گے۔ کس طرح دنیا کو بہا رکھا ہے۔ کجا احرام کی حالت کا مسئلہ اور کجا ننگے سر نماز پڑھنے کا مسئلہ

خدا کی شان دیکھو کل چڑی تھی
بجائے بلبل بستان کے نیو تھی

مولانا گنگوہی نے ان کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی رحمۃ اللہ علیہ ملک ہندوپاک کے ایک شہرہ آفاق محقق ہیں جن کی علمی شان کے مقابلہ میں مولوی عبداللہ محیقہ یکم محرم سنہ ۱۳۸۳ھ میں ان سے خطاب کرتا ہوا یہ اقرار کرتا ہے۔ "میں آپ کے سامنے ایک بچہ ہوں" وہ اس بچے کے منہ پر طمانچہ مار کر یوں سمجھاتے ہیں۔ محرم برابر سر برہنہ نماز فرض نوافل سب ادا کرتا ہے۔ البتہ جس (حصہ بدن) کا ڈھانکنا ضروری ہے۔ وہ نہ تو حالت احرام میں کھول سکتے ہیں اور نہ غیر حالت احرام میں۔ احرام کی حالت کوئی مستثنیٰ نہیں۔ دیکھو محرم کی ہی حدیث سے ہمارے امام الائمہ رئیس المحدثین

قدوۃ المحققین طبیب المحدث محمد بن اسماعیل بخاری قدس اللہ روحہ ونور ضریحہ نے اپنی صحیح میں بے سلے کپڑوں میں نماز ثابت فرمائی ہے۔ معلوم ہوا صحیح امام الائمہ سے کہ حالت احرام کوئی علیحدہ شئی نہیں۔ غور سے ملاحظہ فرمایئے بھلا کندھے کھلے وبرہنہ ستر سے نماز پڑھ کر دکھلایئے یا شرعا قباحت تو دور کیجئے' کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ظاہر ہے کہ سر ڈھانکنا نماز سے نہیں۔ انتہی بقدر الحاجتہ یہ مضمون مولانا مرحوم کا بہت طویل ہے جو فتاویٰ ستاریہ ج ۱' ص ۔۳۳ پر درج ہے' جو نہایت محققانہ اور محدثانہ ہے۔ اور قائلین وجوب پر حجت قاطعہ ہے۔

بندہ نے اس سے صرف یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا سامرودی نے امام المحدثین امام بخاری کے طرز استدلال سے یہ ثابت کیا ہے کہ نماز کے احکام محرم اور غیر محرم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اگر نماز کے لئے مرد کا سر ستر ہوتا جیسے عورت کا سر ہے تو اس کو نماز میں ضرور ڈھانکا جاتا جیسے عورت حالت احرام اور غیر احرام میں ڈھانکے رہتی ہے' مرد عورت کا یہی فرق ہے۔ اس لئے شارع نے عورت کو تو یہ فرما دیا کہ ننگے سر نماز نہ پڑھے' مرد کو نہیں فرمایا۔ لیکن ڈیرہ غازی خاں کا مولوی کہتا ہے کہ احرام کی حالت سے استدلال کرنا دنیا کو پاگل بنانا ہے۔ معمولی علم رکھنے والا دو عالم فاضلوں کی کیا تمام اہل علم کی تکذیب کر رہا ہے۔ جس کی زد امام بخاری تک پہنچتی ہے۔ محققین علماء میں اس مولوی کی کوئی پوزیشن نہیں ہے۔

چیونٹی کو لگے پر تو یہ کہنے لگی اڑ کر
میں مثل سلیمان ہوں ہوا میں کئی دن سے ،

میں اس مولوی سے پوچھتا ہوں کہ امام بخاری نے اپنی جامع صحیح کی کتاب الصلوۃ میں ایک باب یوں باندھا ہے : باب مایستر من العورۃ۔ یعنی "یہ باب ستر ڈھانکنے کے بیان میں ہے۔" جس کا تعلق کتاب الصلوۃ سے یہ ہے کہ نماز میں ستر کسی کپڑا سے ڈھانکنا چاہیے۔ پھر اس کے ثبوت میں ایک یہ حدیث ذکر کی ہے : ولا یطوف فی البیت عریان۔ "کہ بیت اللہ کا طواف کوئی ننگے بدن نہ کرے۔" اس حدیث کا کتاب الصلوۃ اور باب سے کیا تعلق ہے' یہ تو محرم مطوف کے حق میں ہے۔ دیگر علماء تو یہ کہہ دیں گے کہ امام بخاری کا اس حدیث لانے کا یہ مطلب ہے کہ طواف میں جب ستر ڈھانکنا واجب ہے تو نماز میں بطریق اولیٰ واجب ہوا کیونکہ نماز کی اہمیت و عظمت طواف سے زیادہ ہے۔ لیکن ڈیرہ غازی خاں کا

سامرودی شاگرد یہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس طرح کہنے سے محرم کے سر ننگے نماز پڑھنے سے یہ استدلال کرنا پڑتا ہے کہ نماز میں سر ستر نہیں تو بغیر احرام کے بھی سر ننگے نماز جائز ہے۔ جب اس طرح نہ کہا تو وہی بے مقصد لکھے گا کہ کہاں حالت احرام؟ کہاں ننگے سر نماز؟ تو اس طرح امام بخاری کے حق میں سوء ادب لازم آیا۔ یہ اہل بدعت کا شیوہ ہے کہ وہ حضرت امام بخاری پر گستاخانہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

نماز میں جوتا پہننے کا مسئلہ: سر پر پگڑی باندھ کر ہمیشہ نماز پڑھنے کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں ملتا اور یہ واجب ہے نہ سنت ہے' لیکن بایں ہمہ ننگے سر نماز پڑھنے کا معیوب تصور کر کے نمازی کاشف الراس طعن وملامت بلکہ اس سے جنگ وجدال کرتے ہیں' جو سراسر جہالت کا نتیجہ ہے اور جوتے میں نماز پڑھنا قولی وفعلی احادیث صریحہ صحیحہ سے ثابت ہے اور سنت ہے اور ننگے پاؤں پڑھنا عادت ہے۔ لیکن بایں ہمہ جو شخص اس سنت پر عمل کرے تو اس کو برا جانتے ہیں اور سخت طعن وملامت کرتے ہیں۔ بلکہ اس کو مار کر مسجد سے نکال دیتے ہیں' جو سراسر حماقت ہے' جو اس سنت کی مذمت وخفت وانکار تک نوبت پہنچی ہے' جو موجب کفر ہے۔ اب جوتا پہن کر نماز پڑھنے کے مشروع ہونے کا ثبوت سنئے۔

(۱) بخاری ومسلم کی متفقہ حدیث میں ہے کہ ابو مسلمہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: أكان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي في نعليه قال نعم. یعنی "کیا نبی کریم ﷺ اپنی جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں" (پڑھا کرتے تھے) یہ حدیث فعلی ہے کہ حضور ﷺ نے جوتیاں پہن کر نماز پڑھی ہے۔ اور لفظ کان اور صیغہ مضارع یصلی استمرار اور غالب عمل واکثری عمل پر دلالت کرتے ہیں۔ سائل عادت نبوی سے سوال کر رہا ہے کہ نماز میں حضرت محمد ﷺ کی عادت کیا تھی؟ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں آپ کا تعامل یہی تھا کہ جوتیوں سمیت نماز پڑھا کرتا تھے۔

(۲) مشکوٰۃ اور منتقی میں یہ حدیث درج ہے: عن شداد بن اوس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خالفوا اليهود فانهم لا يصلون في نعالهم ولا خفافهم. (رواہ ابوداؤد) یعنی "شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم یہود کی مخالفت کرو کہ وہ اپنی جوتیوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے" (تم پڑھا کرو)۔

اس حدیث کی شرح مرعاۃ المفاتیح ج۱ص۔۔۔ میں لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ مرحوم

محدث دہلوی نے فرمایا یہود جوتوں اور موزوں میں نماز مکروہ جانتے تھے کہ اس میں تعظیم الٰہی نہیں رہتی اور لوگوں کا رویہ ہے کہ جب بڑے لوگوں' بزرگوں کے پاس جاتے ہیں تو اپنی جوتیاں اتار دیتے ہیں۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام وادی مقدس میں گئے تو حکم الٰہی ہوا کہ آپ اپنی جوتیاں اتار دو۔ حالانکہ وہاں وجہ دوسری تھی (کہ وہ جوتیاں مردار گدھے کے چمڑے کی تھیں) موزہ اور جوتا آدمی کا لباس ہے۔ اس لئے آنحضور ﷺ نے بڑے لوگوں کے پاس جانے والا قیاس چھوڑ دیا اور یہود کی مخالفت کی کہ جوتیاں پہن کر نماز پڑھی۔ (حجۃ اللہ)

پھر شرح مذکورہ میں لکھا ہے: والحدیث یدل علی مشروعیہ الصلوۃ فی النعال۔ "کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ جوتیوں میں نماز ادا کرنا مشروع ہے۔" شاہ ولی اللہ کی تشریح سے مولوی عبداللہ کا یہ قیاس بھی رد ہو گیا کہ جب عدالتوں' بازاروں' دکانوں پر جاتے ہیں تو پگڑیاں پہن کر جاتے ہیں' لیکن جب مسجد میں آتے ہیں تو پگڑیاں اتار کر آتے ہیں' یہ اللہ کی تعظیم کے خلاف ہے۔ اب جوتیوں کی بابت عام لوگوں کی بھی یہی عادت ہے جب خانقاہ میں جاتے ہیں تو جوتیاں اتار دیتے ہیں۔ لیکن آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ یہود کے خلاف کرو کہ یہ عادت یہود کی ہے کہ جب وہ اپنی عبادت گاہوں میں آتے ہیں تو جوتیاں اتار دیتے ہیں۔ تم جوتیوں سمیت نماز پڑھا کرو' یہودیوں کی مشابہت نہ کرو بلکہ ان کا خلاف کرو۔

آج کل کے مولوی مونچھوں کے کٹانے اور داڑھی کے بڑھانے پر تو بہت زور دیتے ہیں کہ یہود' مشرکین' مجوس کا خلاف کرو کہ وہ مونچھیں بڑھاتے ہیں اور داڑھی کٹاتے ہیں اور یہ حدیث سناتے ہیں: من تشبہ بقوم فھو منھم۔ یعنی "جو شخص کسی قوم کے مشابہ ہو گا وہ انہی میں شمار ہو گا۔" لیکن اب یہ مولوی اور ان کے مقتدی سب ننگے پاؤں نمازیں پڑھتے ہیں جو مشابہت یہود کی ہے' بلکہ جو جوتیاں پہن کر نماز پڑھے اس سے لڑتے ہیں' جس سے ظاہر ہے کہ یہودیوں سے بدتر ہیں کہ سنت نبوی سے جو قولی و فعلی حدیثوں سے ثابت ہے انکار کرتے ہیں۔

(۳) ابوداؤد باب الصلوۃ فی النعل میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: اذا جاء احدکم المسجد فلینظر فان رأی فی نعلیہ قذرا او اذی فلیمسحہ ولیصل فیھما۔ یعنی "جب کوئی تمہارا مسجد کو آئے تو وہ اپنی جوتیوں کو غور سے دیکھے اگر ان میں گندگی' پلیدی معلوم ہو تو ان کو زمین پر رگڑ دے اور ان جوتیوں میں نماز

پڑھے" اس پر شرح مشکوٰۃ مرعاۃ المفاتیح میں لکھا ہے : فیه دلیل علی استحباب الصلوٰۃ فی النعال وعلی ان مسح النعل من النجاسة مطهر له من القذر۔ یعنی "اس حدیث میں دلیل ہے کہ جوتیوں میں نماز پڑھنا مستحب ہے اگر جوتیوں میں نجاست ہو تو وہ زمین پر رگڑنے سے پاک ہو جاتی ہیں۔"

قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا : فیه دلیل علی ان من تنجس نعله لا ادلک علی الارض طهرو جاز الصلوٰۃ فیه۔ یعنی "یہ حدیث اس امر پر دلیل ہے کہ جس شخص کی جوتی گندگی سے ناپاک ہو جائے تو وہ جوتی کو زمین پر رگڑ دے (پانی سے دھونے کی ضرورت نہیں ہے) اور اس میں نماز پڑھ لے یہ جائز ہے۔"

اس حدیث سے مولوی عبداللہ کا خوب رد ہو گیا اور وہ اس طرح سے کہ انہوں نے اپنے رسالہ میں یہ لکھا ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنے کا محدثین نے کہیں باب نہیں باندھا۔ اگر نماز اس طرح جائز ہوتی تو محدثین باب باندھتے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ محدثین نے سر پر پگڑی باندھنے کا کہیں باب نہیں باندھا' اگر پگڑی میں نماز میں کوئی اہمیت ہوتی تو محدثین ضرور باب باندھتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نماز میں پگڑی کا ہونا نہ ضروری ہے اور نہ سنت ہے۔ ہاں جوتے میں نماز پڑھنا سنت ہے۔ اس لئے اس پر بخاری' ابوداؤد وغیرہ کتب حدیث میں باب باندھ کر اس کو ثابت کیا گیا ہے۔ پس مولوی عبداللہ کو چاہئے کہ پگڑی پہننا چھوڑ دیں کہ اس بارے میں قولی' فعلی احادیث وارد ہیں۔

میں نے ضرب القاس میں اس مسئلہ کو پیش کیا تو مولوی عبداللہ اس کو ہضم کر گیا اور بول نہ سکا کیونکہ وہ اس سنت کا تارک ہے۔ اور غیر سنت کا عامل بنا ہوا ہے۔ یہی اہل بدعت مقلدین کی عادت ہے کہ وہ بھی سنت کے تارک اور غیر سنت کے عامل ہیں۔ پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اہل سنت والجماعت ہیں۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

اسی طرح مولوی عبداللہ کا دعویٰ اہلحدیثی کا باطل ہے۔ دوسرا رد اس کا اس طور ہوا کہ اس نے قرآن کی آیت بے محل پیش کر کے یہ مثال دی ہے کہ ایک طرف متنجن' قورمہ' ولی روٹی' کھیر' زردہ پلاؤ عمدہ عمدہ غذائیں ہوں اور دوسری طرف دال' چٹنی' ساگ ہو تو جو عمدہ کھانے چھوڑ کر ناقص کھائے اس کی بدبختی ہے۔ پھر یہ لکھا ہے : "اسی طرح کپڑے کے

ہوتے ہوئے جو بہتر اور ثواب ہے اس کو چھوڑ کر ننگے سر نماز پڑھنی' جس کا ثواب نہیں اس پر عمل کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بے وقوف عمدہ کھانے چھوڑ کر ناقص غذا کی رغبت کرتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اس بے ادب نے یہ غلط مثال پیش کر کے حضرت نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام ابوبکر رضی اللہ عنہ' جابر رضی اللہ عنہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ وتابعین شریک وغیرہ کی سخت توہین کی ہے کہ' انہوں نے اپنے پاس کپڑے موجود ہوتے ہوئے صرف ایک کپڑے میں ننگے سر نماز پڑھی ہے۔ جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں۔ تاہم اس کا جوتا اسی کے منہ پر یہ کہتے ہیں کہ جوتے میں نماز پڑھنا سنت ہے۔ جو قولی وفعلی حدیث سے ثابت ہے۔ اور اس پر عمل کرنے میں ثواب ہے۔ کہ اس میں سنت پر عمل اور یہود کی مخالفت ہے۔ اب وہ شخص سخت احمق اور بیوقوف ہے جو عمدہ کھانے چھوڑ کر دال وغیرہ کھانے والے کی طرح ہے۔ کہ جوتیاں مسجد میں موجود ہیں اور پھر وہ ننگے پاؤں نماز پڑھ رہا ہے۔ اور ننگے پاؤں نماز صرف جائز ہے سنت نہیں ہے۔ کما لا یخفی علی اہل العلم بالحدیث

پس اس کا جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو مبارک تمہیں

(۳) آنحضور ﷺ ایک دفعہ مسجد میں جوتا پہن کر نماز پڑھا رہے تھے' جبرائیل نے آپ کو خبر دی کہ آپ کی جوتی میں گندگی لگی ہے' تب آپ نے نماز میں جوتی اتار دی۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی جوتیوں میں نماز پڑھ رہے تھے' انہوں نے بھی اپنی جوتیاں اتار دیں۔ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر صحابہ سے دریافت کیا کہ تم نے جوتیاں کیوں اتار دیں؟ صحابہ کرام نے کہا کہ آپ ﷺ کو جوتیاں اتارتے دیکھ کر ہم نے بھی جوتیاں اتار دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو جبرائیل نے خبر دی کہ جوتی میں نجاست ہے۔ اس لئے میں نے اتاری تھی۔ اچھا آئندہ کے لئے یہ یاد رکھو کہ جب مسجد میں آؤ تو دیکھ لیا کرو کہ اگر نجاست ہو تو اس کو زمین پر رگڑ کر اس میں نماز پڑھ لیا کرو۔ اس حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس سے ایک تو یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ جوتیاں اتارنے پر آپ ﷺ نے اعتراض کیا کہ

تم نے کیوں اتاریں؟ اس سے ظاہر ہوا کہ بغیر کسی عذر کے جوتا نماز میں نہ اتارنا چاہیے۔ تیسرا یہ کہ مسجد میں داخل ہونے کے وقت اپنا جوتا دیکھنا چاہیے' اگر نجاست معلوم ہو تو زمین میں رگڑ دیں۔ اس سے ان لوگوں کا عذر باطل ہوا جو کہتے ہیں ہم جوتیوں میں اس لئے نمازیں نہیں پڑھتے کہ ہماری جوتیاں پاک نہیں پلید ہوتی ہیں۔ پلید ہوں تو زمین پر رگڑ کر پڑھ لیا کرو۔ رگڑنے سے پاک ہو جائیں گی۔ جیسے کپڑا دھونے سے پاک ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی جوتا بند پلید ہونے پر نہ پاک کرے اور ننگا نماز پڑھے تو وہ بیوقوف ہے۔ چوتھا یہ ثابت ہوا کہ مسجد میں پاک جوتے سے داخل ہونا جائز ہے۔ پانچواں یہ کہ جوتا پہن کر امامت کرانا جائز ہے۔ چھٹا یہ کہ پرانی جوتی سے نماز جائز ہے۔ نیا ہونا شرط نہیں جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔ ہاں پاک ہونا شرط ہے جو مٹی سے ہو جاتا ہے۔ پس زمین پر رگڑ دو۔ پاک ہونا جوتے کا ہی نہیں بدن' کپڑا' زمین جہاں نماز پڑھتا ہے پاک ہونا شرط ہے۔

اسی حدیث کو امام طحاوی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور نے صحابہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا : فلا تخلعوا نعالکم "کہ تم (نماز میں) جوتیاں مت اتارو۔" اس حدیث سے جوتا اتار کر نماز پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوئی مگر یہ حدیث کہیں نہ ملے گی۔ کہ پگڑی اتار کر نماز پڑھو۔ مولوی عبداللہ اس حدیث کے خلاف عمل کرتا ہے۔ یہ حدیث بھی معانی الآثار ج ۱' ص ۲۹۳ میں موجود ہے۔ اہل حدیث اور حنفیہ سب کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔

(۵) نیز طحاوی کے اسی صفحہ پر حدیث باسناد موجود ہے کہ اوس نے کہا : کان جدی یصلی فیامرنی ان اناوله نعلیه فینقل ویقول رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی نعلیه۔ دوسری روایت میں یوں ہے : قمت عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصف شهر فرایته یصلی وعلیه نعلان مقابلتان۔ یعنی "میرے دادا صاحب نماز پڑھتے تو مجھے حکم فرماتے کہ ان کو جوتا دے دوں پس وہ اس جوتا کو پہن لیتے اور یہ فرماتے کہ میں نصف ماہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقیم رہا۔ آپ جوتا پہن کر نماز پڑھتے رہے۔ آپ کے جوتا کے سامنے دو تسمے لگے ہوئے تھے۔"

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ غالب عمل آپ کا جوتا کے ساتھ نماز پڑھنا تھا۔ اور یہی صحابہ کرام کا تعامل تھا۔ چنانچہ نیل الاوطار ج ۲' ص ۱۳۱ میں اکابر صحابہ اور اکابر تابعین کی

تعداد بائیس تک لکھی ہے۔ منتخب کنزالایمان ج ۳ ص ۱۴۳ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ تمام الصلوۃ فی النعلین۔ یعنی "جوتیوں میں نماز پڑھنا نماز کے پورا ہونے میں داخل ہے" اس سے ظاہر ہے کہ جوتے میں نماز کی بڑی تاکید ہے۔ ابو عمر شیبانی سے نیل الاوطار میں موجود ہے کہ یضرب الناس اذا خلعوا نعالھم۔ یعنی "جوتیاں اتارنے والے کو مارا کرتے تھے" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ جوتا اُتارنا برا جانتے تھے اور لوگوں پر سختی کرتے تھے۔

ابراہیم نخعی سے منقول ہے کہ انہ کان یکرہ خلع النعال "کہ وہ نماز میں جوتا اتارنا مکروہ جانتے تھے۔" نواب صدیق حسن خان صاحب دلیل الطالب ص ۸۹ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے حدیث نصف ماہ والی کا تعامل نقل فرما کر لکھتے ہیں۔

ایں صریح است در آں کہ غالب اشتغال بود در صلوۃ اگرچہ احیاناً حافیا نیز نماز ے کرد واکثر را حکم کل است ولہذا ابو زرعہ محدث مشہور حکم بدوامش کردہ۔ یعنی جس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ صحابی نے بیان کیا کہ میں آنحضور کے پاس ایک ماہ قیام پذیر رہا۔ یہ صریح حدیث ہے کہ غالب عمل آپ کا جوتا میں نماز پڑھنا تھا اگرچہ گاہے بہ گاہے (اظہار کے طور پر) ننگے پاؤں بھی پڑھ لیا کرتے تھے، مگر اکثری عمل حکم کل کا رکھتا ہے۔ اس لئے امام ابو زرعہ نے یہ حکم دیا ہے کہ نماز ہمیشہ جوتیوں سمیت پڑھنا سنت ہے۔ کیونکہ سنت کی تعریف یہ ہے کہ جو کام نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ یا اکثر اوقات کیا وہ سنت ہے۔

اور یہ تعریف اس حدیث سے مستفاد ہے جو جمع الفوائد میں درج ہے کہ آنحضور ﷺ نے پیشاب کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پانی لا کر پیش کیا تاکہ آپ وضو کر لیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ما امرت کلما بلت ان اتوضاء ولو فعلت لکانت سنۃ یعنی "مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جب میں پیشاب کروں تو وضو کروں، اگر میں اس طرح ہمیشہ کروں تو یہ سنت ہو جائے گا"

دوسری حدیث یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے یہ فرمایا: صلوا قبل صلوۃ المغرب قال فی الثالثۃ لمن شاء کراھیۃ ان یتخذہ الناس سنۃ (متفق علیہ) یعنی "نماز مغرب سے پہلے نماز پڑھو" یہ دو بار فرما کر تیسری بار فرمایا کہ جس کا دل چاہے پڑھ لے (ضروری سنت نہیں) یہ اس کراہت کی بنا پر فرمایا کہ لوگ فرض مغرب سے پہلے نفل پڑھنے کو سنت موکدہ

نہ بنالیں۔"

پس اس تعریف کی رو سے جوتا میں نماز پڑھنا سنت تاکیدی ہے کہ اس بارہ میں قولی وفعلی احادیث وارد ہیں اور تعامل صحابہ کا اس پر پایا گیا ہے۔ اور ننگے پاؤں نماز پڑھنے کو ہمیشہ یہود کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ پگڑی سر پر رکھنے اور اس کو نماز میں لازم کرنے پر نہ قولی حدیث وارد ہے نہ فعلی مگر اس کو لازم اور واجب العمل ٹھہرایا گیا ہے اور جوتا میں نماز پڑھنے کو جو سنت ہے برا سمجھا جا رہا ہے۔ یہ سنت کو ترک کر کے بدعت اختیار کی گئی ہے۔ ایک ننگے پاؤں نماز پڑھنا ہمیشہ بدعت' دوم پگڑی کا سر پر باندھنا نماز میں ضروری اور واجب تصور کرنا بدعت ہے۔

سچ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسک السنة خير من احداث بدعة (مشکوۃ) یعنی "جس قوم نے کوئی بدعت پیدا کی تو اس جیسی سنت ان سے اٹھالی گئی۔" سنت کو مضبوط پکڑنا بدعت پیدا کرنے سے بہتر ہے۔ سر کی بدعت کے لئے تو مسجدوں میں ٹوپیاں رکھ دی ہیں تاکہ کوئی ننگے سر نماز نہ پڑھ سکے اور پاؤں ننگے رکھ کر نماز پڑھتے ہیں جو فعل یہود ہے۔ اس کے لئے جوتیاں بنا کر نہ رکھیں۔

جنوں کا نام رکھ لیا خرد اور خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

عام طور پر عذر یہ کیا جاتا ہے کہ جوتا پاک نہیں رہتا۔ اس لئے ہم نے جوتا اتار کر پڑھنے کی عادت کرلی۔ میں کہتا ہوں یہ عذر بہانہ صحیح نہیں ہے۔ ابوداؤد میں یہ حدیث آئی ہے: اذا وطئی بنعله احدکم الاذی فان التراب له طهور۔ یعنی "جب کوئی تمہارا جوتیوں سے گندگی پر سے گزرے تو اس کے لئے مٹی پاک کرنے والی چیز ہے۔" حضرت شارع علیہ السلام نے اس عذر کو بھی رفع کر دیا اور یہ بتا دیا کہ جوتا کو زمین پر گھس دو وہ پاک ہو جائے گا۔

(۲) جامع صغیر میں یہ حدیث درج ہے: انه صلی الله علیه وسلم قال صلوا فی نعالکم ولا تشبهوا بالیهود۔ یعنی "نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم جوتیوں میں نماز پڑھو اور یہود کی مشابہت (ننگے پاؤں ہو کر) نہ کرو۔" پس مولوی عبداللہ صاحب پگڑی کے عاشق ہو کر جوتا سے دشمنی رکھتے ہیں کہ ننگے پاؤں ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں۔ لہذا یہ مشابہ یہود ہے۔ حدیث میں ہے: من تشبه بقوم فهو منهم "کہ جو کسی قوم کے مشابہ ہے وہ اسی میں شمار ہے۔"

احیاء العلوم میں امام غزالی نے فرمایا ہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ نماز فرض' سنت' جنازہ' سفر' حضر میں ہر طرح جوتا سے جائز ہے : بل قیل بالسنة للاتباع بلکہ سنت کہا گیا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب مدینہ کے بازاروں میں چلتے تھے۔ بلکہ گلیوں (بیت الخلا) میں جاتے تھے تب بھی ان جوتیوں میں نماز پڑھتے تھے۔

امام ابن القیم اغاثۃ اللھفان میں رقمطراز ہیں : لا تطیب قلوب الموسوسین بالصلوۃ فی النعال وھی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابه فعلا منه وامرا۔ یعنی "وہ چیز جس کے ساتھ وسوسہ کرنے والوں کے دل خوش نہیں ہوتے وہ جوتیوں میں نماز پڑھنا ہے حالانکہ یہ سنت ہے۔ آنحضور ﷺ اور اصحاب کرام سے قولاً وفعلاً ثابت ہے۔" نیز جناب محمد بن احمد عبدالسلام فرماتے ہیں کہ ہمارے اس دور میں مسجدوں میں عمدہ دریاں اور خوبصورت غالیچے بچھے ہوئے ہیں۔ اب لائق یہ ہے کہ ان کو جوتیوں سے خراب نہ کرے۔ ہاں اگر دریاں غالیچے نہ ہوں تو پھر کسی کو منع کرنے کا مجاز نہیں' کیونکہ یہ سنت ہے ہم مانع کو سنت کا ثبوت پیش کریں گے۔ اگر مان گیا' فھو المراد اور اگر نہ مانا اور اس سنت سے منکر ہوا تو ہم جوتے سے اس کا دماغ ٹھیک کر دیں گے تاکہ وہ سنت کا انکار کرنے سے باز آجائے اور مان لے۔

(۷) طحاوی ص۔ ۲۹۳ میں باسناد یہ حدیث وارد ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ابو موسیٰ اشعری کے پاس گئے وہاں نماز کا وقت ہو گیا تو ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عمر اور علم کی رو سے آپ ہم میں بڑے ہیں آگے ہو کر نماز پڑھائیں' کیونکہ ہم تو آپ کے پاس آئے ہیں' آپ زیادہ حق دار ہیں۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے جوتا اتار کر نماز پڑھائی تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا : ما اردت الی خلعھما ابالواد المقدس طوی انت لقد رائینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی الخفین والنعلین۔ آپ نے جوتا کیوں اتارا؟ کیا آپ موسیٰ علیہ السلام کی وادی مقدس میں ہیں؟ البتہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

(۸) حارث بن کعب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے' کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جوتا میں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے تو کسی کو نہیں روکا اور قسم بخدا میں کیسے روک سکتا ہوں کہ آنحضور ﷺ کو میں نے دیکھا کہ آپ

ﷺ اس مقام ابراہیم کے پاس جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جوتیوں میں نماز پڑھنے والے کو روکنا جائز نہیں ہے اور اگر کوئی جوتا کے بغیر نماز پڑھے تو اس پر اعتراض کرنا چاہیے کہ جوتا پاس ہوتے ہوئے تم نے سنت نبوی پر عمل کیوں نہ کیا کہ جوتا میں سنت ہے۔

(۹) جو لوگ سر ڈھانکنا نماز میں مستحب یا ضروری سمجھتے ہیں وہ آیت خذوا زینتکم عند کل مسجد سے دلیل لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ زینت عام ہے خواہ کسی جگہ پر ہو تو سر پر کپڑا بھی زینت ہے۔ لہذا یہ بھی مامور بہ ہے ہم اس دلیل کا تحقیقی جواب دے چکے ہیں۔ اب یہاں الزامی جواب عرض ہے کہ پھر تم کو جوتا پہن کر نماز پڑھنا چاہیے کہ یہ بھی زینت ہے اور زینت کے عموم میں داخل ہو کر یہ بھی مامور بہ ہے۔ جوتا کا زینت میں شمار ہونا بدیہی امر ہے جو عرف اور شرع سے ثابت ہے اور جوتا کے بارے میں اس آیت کے تحت مفسرین نے بعض ایسی روایتیں ذکر کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جوتا زینت میں داخل ہے۔

ابن کثیر ج۔۲' ص۔۲۱۰ میں ہے : روی الحافظ سعید بن بشیر والاوزاعی عن قتادہ عن انس مرفوعا انھا نزلت فی الصلوۃ فی النعال ولکن فی صحتہ نظر ـــــ یعنی حافظ ابن مردویہ نے سعید بن بشیر سے اور اوزاعی نے قتادہ سے اور قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ روایت کیا ہے کہ آیت "خذوا زینتکم" اس بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جوتیوں میں نماز پڑھو مگر روایت کی صحت میں کلام ہے۔

تفسیر فتح القدیر ج۔۲' ص۔۲۱۱ میں آیت زینت کے تحت یہ لکھا ہے : اخرج ابن عدی وابو الشیخ وابن مردویہ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خذوا زینۃ الصلوۃ قال البسوا نعالکم فصلوا فیھا یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں زینت پکڑو' (آیت آگئی) صحابہ نے عرض کیا کہ زینت سے کیا مراد ہے؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنی جوتیاں پہن کر نماز پڑھا کرو۔ اخرج العقیلی وابو شیخ وابن مردویہ وابن عساکر عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قول اللہ عزوجل خذوا زینتکم الآیۃ قال صلوا فی نعالکم۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے آیت زینت کی تفسیر فرمائی ہے کہ اپنی جوتیوں میں نماز پڑھو۔

امام شوکانی ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ والاحادیث فی مشروعیۃ الصلوۃ فی النعل کثیرۃ جدا واما کون ذالک ہو تفسیر الآیۃ کما روی فی ہذ بن المحدیثین فلا لا ادری اسنادھما۔ یعنی "جوتا میں نماز مشروع ہونے پر تو بہت سی احادیث وارد ہیں لیکن اس آیت کی تفسیر ٹھہرانا جیسا کہ ان روایتوں میں بیان ہوا ہے' تو میں ان کی اسناد سے واقف نہیں ہوں کہ یہ کیسی ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ موضوع نہیں ہیں ضعیف ہیں۔ لیکن احادیث کثیرہ متعلقہ نعل سے ان کی تائید ہو کر دلیل مضبوط ہو جاتی ہے کہ جوتا میں نماز مسنون ہے۔ اب حضرات اہل علم جو انصاف کا مادہ رکھتے ہیں وہ پگڑی کے دلائل مزعومہ اور جوتی کے دلائل قویہ کا مقابلہ کر کے بتائیں اور انصاف فرمائیں کہ جوتا میں نماز پڑھنے کے دلائل غالب ہیں یا پگڑی کے یا مساوی ہیں۔ اگر غالب اور قوی مساوی ہیں' تو پگڑی کی طرح جوتے کو بھی نماز میں لازم کر لیں' اگر کمزور ہیں تو اس کا ثبوت دیں۔

اب یہاں ایک ایسے مفتی صاحب کا فتویٰ پیش کیا جاتا ہے' جن کی بیعت کر کے مولوی عبداللہ صاحب نے ان کو اپنا مرشد اور امام مانا ہوا ہے۔ یہ فتویٰ' فتاویٰ ستاریہ جلد اول' ص ۹۷' ۹۸ پر موجود ہے۔

سوال نمبر ۱۵۸ : زید ننگے سر نماز پڑھتا ہے اور اس کے پاس ٹوپی یا پگڑی موجود ہے اور اس فعل کو سنت سمجھ کر دوسروں کو رغبت دلاتا ہے اور اس فعل پر عمرو لعن طعن کرتا ہے اور برا بھلا کہتا ہے۔ حتیٰ کہ فعل مذکور کے مرتکب کو بدعتی' مفسد' بددین' گمراہ وغیرہ الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ کیا اس فعل کا ثبوت قرآن وحدیث میں پایا جاتا ہے یا نہیں؟

(سائل محمد اسمٰعیل ضلع ملدہ ڈاک خانہ عین گولہ)

اب اس کا جواب سنئے' مولوی صاحب فرماتے ہیں :

جواب نمبر ۱۵۸ : فعل مذکور (یعنی ننگے سر نماز) کا ثبوت بڑے وثوق کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ بیشک ننگے سر نماز پڑھنا بھی مسنون طریقہ ہے' اس کو بدعت کہنے والا شخص خود بدعتی وغیرہ ہے۔ یہ فعل عہد نبوی کے بعد بھی تعامل صحابہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ایک صحابی نے نماز پڑھائی اور اپنی ٹوپی وغیرہ اتار کر کھونٹی پر رکھ دی اور ننگے سر نماز پڑھائی۔ بعد از فراغت نماز کسی معترض نے اعتراض کیا کہ یہ فعل آپ نے کیوں کیا؟ تو صحابی نے جوابا

فرمایا : لیرانی احمق مثلک۔ "اس لئے کیا کہ تجھ جیسے احمق (نبی کی سنتوں کو بدعت کہنے والے) دیکھ لیں کہ یہ بھی سنت ہے۔" الغرض زید بجانب حق وہدایت اور عمرو مفسد بجانب ناحق وضلالت ہے' انتہی۔

اس فتویٰ میں مولوی عبداللہ کی تردید ان کے روحانی مربی نے کر دی اور ان پر فتویٰ نافذ کر دیا کہ وہ مفسد اور بدعتی ہیں۔ جو امام مفسد اور بدعتی ہو' اس کی امامت جائز نہیں۔ اب آخر میں ہم ایک فتویٰ شیخ الکل محدث کامل رئیس المحققین جناب مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا نقل کرتے ہیں۔ جن کی علمیت وفاضلیت عرب وعجم میں مسلمہ اور شہرہ آفاق ہے۔ چنانچہ فتاویٰ نذیریہ ج۱' ص ۴۱۷ میں ایک سوال کے جواب میں یہ فرماتے ہیں :

"دستار کے ساتھ نماز پڑھنا واجب نہیں ہے کیوں کہ نماز میں صرف ستر (پردہ کی جگہ) واجب ہے اور اس کے سوا اور کپڑوں میں ہونا مستحب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک کپڑے میں نماز ادا فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ جابر رضی اللہ عنہ نے صرف ایک تہبند میں نماز پڑھی اور کپڑے الگنی پر رکھے ہوئے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ صرف ایک تہبند میں نماز پڑھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے تو صرف اس لئے ایسا کیا کہ تم جیسے احمق دیکھیں۔ ہم لوگوں میں کون ایسا شخص ہے جس کے پاس رسول اللہ کے زمانہ میں دو کپڑے تھے۔ پس جب صرف ایک کپڑے میں سر برہنہ نماز جائز ہوئی تو معلوم ہوا کہ ٹوپی یا عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا واجب نہیں۔ ہاں اس میں کلام نہیں ہے کہ عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا افضل ہے۔" (سید نذیر حسین رحمہ اللہ)

پھر فتاویٰ نذیریہ ج۱' ص ۴۲۲ میں نماز باعمامہ کی احادیث بابت فضیلت کا موضوع ہونا بیان کر کے پھر یہ لکھا ہے : عمامہ وکلاہ ہر دو سنت زوائد سے ہیں۔ (یعنی مستحب ہیں) جو من قبیل عادات نبی ﷺ سے ہیں' نہ من قبیل سنت ہدیٰ سے۔ کما فی شرح الوقایہ

فان كانت المواظبة المذكورة على سبيل العبادة فسنن الهدى وان كانت على سبيل العادة فسنن الزوائد كلبس الثياب۔

نور الانوار میں ہے : وهي نوعان اى مطلق السنة سنة الهدى كالجماعة والاذان والاقامة والثاني الزوائد كسيرة النبي صلى اللّٰه عليه وسلم في لباسه وفي التوضيح من كتب اصول الفقه والسنة نوعان سنة الهدى وتركها

یوجب اساءة وکراهة کالجماعة والاذان والاقامة ونحوها وسنة الزوائد ولا ترکها یوجب ذالک کسنن النبی فی لباسه وقیامه وقعوده۔

نفس ثواب نماز میں کوئی مداخلت عمامہ وکلاہ کو اندیا دو اختلاص نماز میں ازروئے حدیث صحیح ثابت نہیں' بلکہ ایک کپڑے میں نبی ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔ جیسا کہ روایت جامع ترمذی میں منقول ہے جو کچھ فتویٰ نذیریہ میں لکھا ہے' یہی مذہب تمام فقہاء ومحدثین عرب وعجم کا ہے۔ خصوصا ان کے اکابر تلامذہ جو بڑے بڑے علماء اہلحدیث ہوئے اور اب بھی ہیں' یہی مسلک رکھتے ہیں۔ اس اجماعی مسلک کے خلاف مولوی عبداللہ نے اپنا مسلک علیحدہ اختراع کیا ہے کہ پگڑی وغیرہ سے سر ڈھانک کر نماز پڑھنا واجب اور ضروری ہے اور ننگے سر نماز پڑھنا بدعت ہے' یہ مسلک سراسر مردود ومطرود ہے۔ یہ مسلک شقہ اعتقاد اور عمل دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ "وآخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہلحدیث جلد ۔۲' شمارہ ۔۲ تا ۲' جلد ۔۲۸' شمارہ ۲' ۲۲

مورخہ یکم و ۱۶ ذوالقعدہ سنہ ۔۸۵ھ و یکم و ۱۶ محرم یکم و ۱۶ صفر یکم و ۱۶ ربیع الاول یکم و ۱۶ ربیع الثانی' یکم و ۱۶ جمادی الاول' یکم و ۱۶ جمادی الثانی سنہ ۸۵ھ و سنہ ۸۶ھ

مسئلہ زینت نماز پر تبصرہ

ننگے پاؤں' ننگے سر نماز کا حکم

زمانوں کے انقلاب سے حسب رواج ہر ملک میں شرعی مسائل میں بھی انقلاب آگیا۔ کہیں مذہبی موشگافیوں کی وجہ سے مسائل میں تبدل وتغیر ہو گیا' کہیں فرقہ بندی میں آکر اہل ہوئی نے مسائل بدل دیئے ہیں۔ مثلاً ننگے پاؤں نماز پڑھنے کا التزام کیا گیا ہے' حالانکہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے یعنی افضل ہے۔ پھر ایک کو افضل ٹھہرا کر دوسرے پر عیب گیری کرنا اور تعصب میں آکر جوتا سے نماز پڑھنے والے کو برا کہنا اور ننگے سر نماز پڑھنے والے پر طعن کرنا تحکم ہے۔ خصوصا اہل علم بھی رواج عام سے ایسے متاثر ہوئے ہیں کہ ننگے سر نماز نہیں پڑھتے' مگر ننگے پاؤں ہمیشہ پڑھتے ہیں۔ حالانکہ تحقیق کی رو سے معاملہ اس کے برعکس ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا : اکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی نعلیہ۔ یعنی "کیا نبی کریم ﷺ اپنی جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے؟" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا : نعم "ہاں پڑھا کرتے تھے۔"

اس حدیث میں لفظ کان کے بعد یصلی صیغہ مضارع کا ہے۔ جس سے دوام اور استمرار سمجھا جاتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے : "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومنا" کہ رسول اللہ ﷺ ہماری امامت کیا کرتے تھے۔" دیگر حدیث ہے : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسکت بین التکبیر وبین القراۃ۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ تکبیر اور قرأۃ کے درمیان خاموش ہو جایا کرتے تھے۔" اور دیگر حدیث میں ہے : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکبر فی الصلوۃ۔ یعنی "آنحضرت ﷺ نماز میں ہمیشہ تکبیر کہا کرتے تھے۔" ان سب میں کان مضارع میں داخل ہو کر ماضی استمراری کے معنی دے رہا ہے۔ اگر اس استمرار اور دوام کے خلاف کوئی دلیل ناطق ہو گی تو کان کا مفہوم اکثری اور اغلب ہو جائے گا۔ کافیہ میں ہے : وکان تکون ناقصۃ لثبوت خبرھا ماضیا دائما او منقطعا یعنی کان ناقصہ زمانہ ماضی میں خبر کے ثبوت کے لئے بطور مداومت یا انقطاع کے آتا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ محض کان ناقصہ کا قول ہے کہ وہ قرینہ کی رو سے دائمہ ہو گا یا منقطع، مگر جب مضارع پر آئے گا تو مفید استمرار ہو گا۔ چنانچہ علامہ سندھی جمعہ کی نماز ہمیشہ سورج ڈھلنے پر پڑھنے کی بابت حاشیہ بخاری میں یوں رقمطراز ہیں : صیغۃ المضارع تدل علی الاعتیاد والاستمرار بعد کان۔ یعنی "صیغہ مضارع کان کے بعد آئے تو دائمی عادت پر دلالت کرتا ہے۔ یہی قاعدہ بیان کر کے علماء اہلحدیث رفع یدین متنازعہ کا دوام ثابت کیا کرتے ہیں۔ تو اب جوتا میں نماز پڑھنے کا دوام بھی مان لینا چاہئے چنانچہ اس دوام پر قرینہ بھی موجود ہے۔ کہ حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے : قال اقمت عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصف شھر فرأیتہ یصلی وعلیہ نعلان مقابلتان۔ (طحاوی ج۱ ص۳۴۳) یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پندرہ روز قیام کیا تھا میں آپ کو دیکھتا رہا کہ آپ ہمیشہ جوتیاں پہن کر نماز پڑھتے رہے۔

مرقاۃ ص۳۲۹ میں الفاظ حدیث ینادی بالصلوات پر لکھا ہے : والاظھر ان ایراد المضارع لیفید الاستمرار۔ یعنی "زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ صیغہ مضارع کا وارد کرنا استمرار

کے فائدہ کے لئے ہے۔" اس حدیث میں پندرہ دن کی تعداد اور صیغہ مضارع لا کر اوس کا بیان کرنا دلیل ہے کہ آنحضور ﷺ جوتا میں ہمیشہ نماز پڑھتے رہے اور جوتا میں نماز پڑھنے کا صیغہ امر کے ساتھ حکم بھی وارد ہے۔

چنانچہ طحاوی کے حوالہ مذکورہ میں حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اذا اتی احدکم المسجد فلینظر فی نعلیه فان کان فیهما اذی او قذر فلیمسحها ثم لیصل فیهما یعنی "جب کوئی تم میں سے مسجد میں آئے تو اس کو چاہیے کہ اپنی جوتیوں کو دیکھے' اگر ان میں کوئی گندگی یا پلیدی نظر آئے تو ان کو زمین پر گھس دے اور ان میں نماز پڑھے۔"

اور جوتا اتار کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ امام طحاوی شرح معانی الآثار کے حوالہ مذکورہ بالا میں حدیث لائے ہیں: عن عبد الله قال خلع النبی صلی الله علیه وسلم نعلیه وهو یصلی فخلع من خلفه فقال ما حملکم علی خلع نعالکم قالوا رایناک خلعت فخلعنا فقال ان جبرئیل علیه السلام اخبرنی ان فی احدهما قذرا فخلعتهما کذالک فلا تخلعوا نعالکم۔ یعنی "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی جوتیاں نماز کی حالت میں اتار دیں آپ کو دیکھ کر ان صحابہ نے بھی اپنی جوتیاں اتار دیں جو آپ کے پیچھے جوتیاں پہنے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ آنجناب ﷺ نے بعد نماز ان سے دریافت کیا کہ تم کو جوتیاں اتارنے پر کس نے مجبور کیا تھا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ نے جوتیاں اتار دیں تو آپ کو دیکھ کر ہم نے بھی اتار دیں۔ آنجناب ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے تو یہ عذر ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی کہ آپ کی ایک جوتی میں گندگی لگی ہے۔ اس لئے میں نے دونوں کو اتار دیا۔ پس تم آئندہ اپنی جوتیاں مت اتارو۔"

اس حدیث سے کئی مسائل ظاہر ہوگئے اول یہ کہ مسجد میں جوتا سمیت داخل ہونا اور مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ دوسرا یہ کہ امام اور مقتدیوں کو جوتیاں پہن کر نماز باجماعت پڑھنا چاہئے۔ تیسرا یہ بغیر احکام نماز کے امام کے ہر فعل کی پیروی مشروع نہیں مثلاً یہ کہ امام خارش ہونے پر جسم پر کھجلی کرے تو مقتدی کھجلی نہ کرے۔ چہارم یہ کہ نماز سے خارج کوئی شخص نمازی کو کوئی بات بتائے جو نماز کے متعلق ہو تو اس کو سن کر عمل کرنا جائز ہے۔

پنجم یہ کہ بغیر عذر کے جوتا اتار کر نماز پڑھنا منع ہے۔

ابوداؤد اور مسند احمد کی روایت میں جو اسی قصہ کے بارے میں آیا ہے : فاذا جاء احدکم المسجد فلیقلب نعلیه ولینظر فیهما فان رأی خبثا فلیمسحه بالارض ثم لیصل فان رأی" جب کوئی تمہارا مسجد کو آئے تو اپنی جوتیوں کو الٹ کر دیکھ لے اگر ان میں نجاست ہو تو اس کو زمین پر رگڑ دے پھر ان جوتیوں میں نماز پڑھے۔"

نجاست' رطب یا یابس زمین پر رگڑنے سے پاک ہو جاتی ہے۔ اس عذر سے جوتیوں میں نماز پڑھنا نہ چھوڑنا چاہئے کہ جوتیوں میں نماز پڑھنا مسنون ہے۔ بعض لوگ جو علم حدیث سے ناواقف ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ جوتیوں میں نماز پڑھنا مسجد سے باہر تو جائز ہے کہ یہ مسجد کے ادب کے خلاف ہے' یہ سراسر غلط ہے۔ مسجد نبوی جس کا درجہ بعد بیت اللہ کے تمام دنیا کی مساجد پر فائق ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ اور صحابہ ؓ نے اس میں نمازیں جوتیاں سمیت پڑھی ہیں۔ بلکہ حضرت علی ؓ تو مسجد میں جوتیاں سیا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو طحاوی ج ۱' ص ۳۰۸) آنحضور ﷺ نے ان کو خاصف النعل فی المسجد" کہہ کر پکارا تھا۔ ہماری مسجدیں تو کجا بیت اللہ میں بھی جوتیوں سمیت نماز جائز ہے۔

چنانچہ طحاوی ج ۱' ص ۲۹۳ میں ہے کہ بنی حارث کا ایک شخص بیان کرتا ہے کہ میں ابو ہریرہ ؓ کے پاس بیٹھا تھا ایک شخص نے ابو ہریرہ ؓ سے کہا آپ نے لوگوں کو جوتیوں میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا؟ حضرت ابو ہریرہ ؓ نے فرمایا میں نے تو ایسا نہیں کیا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں :ورب هذه الحرمة رأیت النبی صلی الله علیه وسلم صلی الی هذا المقام وان نعلیه الیه یعنی "قسم ہے رب اس عزت کے مقام کی کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اس مقام بیت اللہ کی طرف اشارہ کیا یا مقام ابراہیم کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی اور آپ جوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ بلکہ بیت اللہ میں جوتیاں پہن کر خطبہ پڑھنا بھی جائز ہے۔

طحاوی ج ۱' ص ۲۰۱ میں ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ :رأیت عبدالله بن صفوان دخل المسجد یوم الجمعه و عبد الله بن زبیر یخطب علی المنبر وعلیه ازار ورداً ونعلان وهو معتمم بعمامة فاستلم الرکن ثم قال السلام علیک یا رسول امیر المومنین ورحمة الله وبرکاته ثم جلس ولم یرکع۔ یعنی "میں نے عبداللہ بن صفوان کو دیکھا کہ وہ جمعہ کے دن مسجد حرام میں داخل ہوئے تو اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ منبر پر خطبہ

دے رہے تھے۔ انہوں نے تہبند اور چادر پہنی ہوئی تھی اور جوتیاں پہنے ہوئے تھے اور سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن صفوان نے رکن کو بوسہ دیا اور پھر السلام علیک یا امیرالمؤمنین کہہ کر بیٹھ گئے اور نماز نہ پڑھی (یعنی نفل)۔"

اس حدیث سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا جوتیوں سمیت خطبہ دینا ثابت ہے اور جوتیوں سے بیت اللہ میں جانا اور نماز پڑھنا ثابت ہوا۔ صحابہ کرام کا تعامل بھی یہی تھا کہ وہ جوتیوں میں نماز پڑھتے تھے۔ اوس بن اوس کہتے ہیں کہ میرے دادا صاحب نماز پڑھتے تو مجھے حکم فرماتے کہ جوتا لاؤ میں ان کو جوتا دے دیا کرتا' وہ ان میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے آنحضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ جوتا میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو کہا کہ چلئے نماز پڑھایئے کیونکہ آپ بلحاظ عمر کے بڑے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم آپ ہی کی مسجد اور گھر میں وارد ہوئے ہیں' آپ ہی کا حق نماز پڑھانے کا ہے' ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے جوتا اتار دیا اور نماز ننگے پاؤں شروع کر دی' سلام پھیرا تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابو موسیٰ آپ نے جوتا کیوں اتارا ہے؟ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وادی مقدس ہے؟ لقد رأينا رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي في الخفين والنعلين۔ یعنی "ہم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا کہ آپ ﷺ جوتا اور موزوں میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔" (طحاوی)

منتخب کنزالعمال ج۔۳' ص۔۲۲۲ میں ہے: عن عبد الله بن مسعود قال من تمام الصلوة الصلوة في النعلين۔ یعنی "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نماز کے پورا ہونے میں یہ بات داخل ہے کہ نماز جوتیوں میں پڑھے۔" اس طرح بہت سے صحابہ اور تابعین سے یہ تعامل مروی ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم دلیل الطالب ص۔۸۶ میں دلائل نعلین ذکر فرما کر لکھتے ہیں کہ ایں صریح است درآنکہ غالب انتعال بود در صلوۃ اگرچہ احیاناً حافیہ۔ خلاصہ تمام بحث یہ ہے کہ جوتیوں میں نماز پڑھنے کا تعامل اکثری تھا گاہے بطور جواز ننگے پاؤں پڑھی ہے مگر ہمیشہ ننگے پاؤں پڑھنا جیسا کہ آج کل رواج ہے' یہ عادت یہود ہے۔

چنانچہ صاف حدیث وارد ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ خالفوا اليهود فانهم لا

يصلون في نعالهم ولا خفافهم۔ یعنی "تم یہود کا خلاف کرو کہ وہ جوتیوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے (تم پڑھا کرو)۔

اسی لئے ابو عمر شیبانی سے منقول ہے: يضرب الناس اذا خلعوا نعالهم۔ یعنی جو لوگ جوتیاں اتار کر نماز پڑھتے تھے وہ ان کو مارا کرتے تھے اب یہ سنت متروک ہے اور عام رواج ننگے پاؤں پڑھنے کا ہو گیا ہے۔ تو اب جو شخص اس پر عمل کرتا ہے اس کو مارتے یا ملامت کرتے ہیں اور ان کے دل اس سنت پر خوش نہیں ہیں۔

چنانچہ امام ابن القیم اغاثۃ اللہفان میں فرماتے ہیں: ومما لا تطيب به قلوب الموسوسين الصلوة في النعال وهي سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه فعلا منه وامراً۔ (کتاب السنن والمبدعات ص۔۲۲) یعنی "وہ مسنون کام جن پر وسواسیوں کے دل عمل کرنے پر خوش نہیں ہیں ان میں ایک جوتیوں میں نماز پڑھنا ہے اور یہ وہ سنت ہے جس پر رسول اللہ کا حکم اور آپ کا اور صحابہ کا تعامل بھی پایا گیا ہے۔"

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم جوتیوں کو پہن کر گلی کوچوں اور ان گھروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ پھر ان میں کیسے نمازیں پڑھیں۔ اس کے جواب میں امام غزالی یوں کہتے ہیں۔ "یعنی نبی کریم اور آپ کے صحابہ کرام ﷺ مدینہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں جوتیاں پہنے ہوئے چلتے تھے بلکہ قضا حاجت کے لئے طہارت خانوں میں جاتے تھے۔ بایں ہمہ انہی جوتیوں میں نمازیں بھی پڑھتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ کوئی چلے جب اس کے پاک کرنے کا طریقہ آپ نے بتا دیا کہ زمین پر جوتیاں رگڑو' بس پاک ہو جائیں گی۔ حدیث میں ہے: اذا وطئي احدكم بنعله الاذى فان التراب له طهور۔ یعنی "جوتی کو پلیدی لگے تو اس کو مٹی پاک کر دے گی۔"

امام طحاوی نعلین کی احادیث نقل کر کے فرماتے ہیں: وقد جاءت الآثار متواترة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم بما ذكرنا عنه من صلوته في نعليه۔ (ج۔۱ ص۔۲۴۳) یعنی "حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر احادیث آئی ہیں کہ آپ جوتیوں میں نمازیں پڑھتے رہے ہیں۔" اس کے خلاف پگڑی کا لازم شدہ رواج لے لو کہ نہ اس بارہ میں کوئی قولی حدیث وارد ہے کہ سر پر پگڑی یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھو نہ ایسی فعلی آئی ہے کہ جس سے آپ ﷺ کا ہمیشہ پگڑی یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا ثابت ہو۔ صرف جمعہ اور عید کی بابت بعض احادیث میں آیا ہے

کہ سیاہ پگڑی تھی۔ مگر جمعہ اور عید کے لئے مخصوص لباس کا پہننا خاص حکم ہے۔ جب کوئی ننگے سر نماز پڑھے تو اس کو منع کرتے ہیں۔ جب وہ ثبوت طلب کرے تو آیت خذوا زینتکم عند کل مسجد پڑھ دیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے زینت واجبی مراد ہے' یعنی اس قدر زینت لباس سے ہو کہ جس سے مخصوص اعضاء نمازی کے پوشیدہ ہو جائیں بس' کیونکہ یہ آیت ننگے طواف کرنے والوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔ جس میں صیغہ امر وجوب کے لئے ہے۔ تو اس سے واجبی ستر مراد رکھا جائے گا اور وہ کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک ہے' جو نماز اور طواف میں ڈھانکا جاتا ہے۔ حاجیوں کے سر ننگے ہوتے ہیں اور آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے باوجود کپڑوں کے موجود ہونے کے ایک کپڑے میں نماز پڑھی ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے: نصلي في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم في الثوب الواحد ولنا ثوبان۔ یعنی "ہم صحابہ کرام عہد نبوی میں باوجود دو کپڑوں کے موجود ہونے کے ایک کپڑے میں نماز پڑھتے تھے۔" (ابن خزیمہ)

حضرت ابو ہریرہ متبع سنت کثیر الحدیث کا بیان موطا امام مالک اور بیہقی میں ہے کہ اني اترك ردائي على المشجب واصلي ملتحفا یعنی "میں اپنی چادر تپائی پر چھوڑ آتا ہوں اور صرف ایک کپڑے کو بدن پر لپیٹ کر نماز پڑھا کرتا ہوں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی طرح امامت کرایا کرتے تھے۔ کنز العمال میں ہے: ان عمر بن الخطاب امهم في ثوب واحد متوشحا به یعنی "عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں لوگوں کو امامت کرائی بایں طور کہ توشح کیا ہوا تھا۔" توشح میں سر ننگا رہتا ہے' کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک بدن ڈھانک لیا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور پڑھائی۔ جس سے ثابت ہوا سر ننگے نماز پڑھنا مشروع ہے۔ باقی جو احادیث پگڑی سے نماز کی فضیلت میں وارد ہیں وہ موضوع ہیں' ان سے دلیل لینا جائز نہیں۔ اگر لفظ زینت کو عام لیا جائے تو پھر سر پر تیل لگانا' جوتی پہننا وغیرہ سب ہی واجبی ہو جائے گا۔ حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آیت میں زینت سے مراد زینت واجبہ ہے۔ باقی جوتیوں میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ سر ننگے نماز پڑھنا جائز ہے یا دونوں برابر ہیں۔ پھر ایک کو ترک کر کے دوسرے کو لازم کرنا ظلم ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام جدید کراچی جلد۔۲' شمارہ۔۲۳' بابت ماہ دسمبر سنہ۔۱۹۴۳ء

ننگے سر نماز پڑھنے کا مسئلہ

آیت زینت پر بحث

جناب مولانا عبدالقدوس صاحب گزگاوی اپنے اس مضمون میں کہ نماز میں سر ڈھانپنا افضل ہے۔ اسی کے ثبوت میں مولانا نے قرآن مجید سے یہ حکم پیش کیا ہے: خذوا زینتکم عند کل مسجد۔ اس کا ترجمہ یوں لکھا ہے کہ "تم نماز کی ادائیگی کے وقت زینت اختیار کرو۔" پھر اس کی تشریح بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اس آیت قرآنی کو امام الدنیا فی الحدیث حضرت امام بخاری "باب وجوب الصلوۃ فی الثیاب" صحیح بخاری کے تحت لائے ہیں اور اسی طرح ثابت کر دیا ہے کہ کپڑوں میں نماز کی ادائیگی خدا تعالیٰ کو پسند اور باعث زینت ہے۔

مجھے مولانا کے علم پر تعجب ہے کہ انہوں نے امام بخاری کے مقصد کو نہ سمجھا اور اپنا مطلب ظاہر کر دیا۔ مولانا! آپ غور فرمائیں کہ امام بخاری نے جو باب منعقد کیا ہے اس میں لفظ وجوب کا لائے ہیں اور وجوب کا ثبوت آیت "خذوا زینتکم" سے پیش کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر کیا ہے کہ آیت میں لفظ "خذوا" امر وجوب کے لئے ہے اور اسی سے زینت واجبی مراد ہے۔ چنانچہ اس باب میں ایک حدیث کا یہ ٹکڑا ذکر کیا ہے: من صلی ملتحفا فی ثوب واحد۔ یعنی "اس شخص کا ذکر کہ وہ ایک کپڑا میں بصورت التحاف نماز پڑھے۔" التحاف کی صورت میں سر ننگا رہتا ہے اور اسی طرح بدن پر کپڑا اوڑھا جاتا ہے کہ کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک ستر ڈھانپا جاتا ہے۔

پھر باب "عقد الازار علی القفا فی الصلوۃ" لکھا ہے کہ ایک کپڑے میں اسی طرح نماز پڑھنا کہ وہ گدی پر باندھا ہوا ہو۔ پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے' جس میں یہ بیان ہے کہ ان کے کپڑے تپائی پر پڑے ہوئے تھے اور وہ ایک کپڑے میں اس کو گدی پر باندھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے فارغ ہو کر بتایا کہ میں نے ایک کپڑا میں اس لئے نماز پڑھی ہے تاکہ تم جیسے احمق دیکھ لیں کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے کیونکہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہم میں سے کون شخص تھا جس کے پاس دو دو کپڑے ہوں۔

پس امام بخاری نے ثابت کر دیا کہ آیت میں حکم وجوب کے لئے ہے اور اس سے اتنا ستر واجبی ڈھانکنا مراد ہے کہ کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک بدن لپیٹا جائے۔ پس اس سے ہمارا مدعیٰ ثابت ہوا کہ سر ستر نہیں ہے اور نماز میں سر ننگا رکھنا جائز ہے۔ جب امر وجوب کے لئے ہوا تو سر کی زینت اس میں داخل نہیں ہے' ورنہ سر کا ڈھانپنا بھی واجب ہوگا۔ اس مسئلہ کے نہ مولانا عبدالقدوس قائل ہیں اور نہ دیگر علماء کا مسلک ہے۔ تو آیت کا فضیلت کے دعویٰ پر پیش کرنا غلط ہوا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ زینت دو قسم کی ہے۔ ایک واجب دوسری مستحب' آیت میں زینت کا لفظ دونوں قسموں کو واجب ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ علمی قاعدہ ہے کہ جب کسی صیغہ امر سے ایک حکم ثابت کیا جائے تو اس سے دوسرا حکم ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا امام ابن حزم نے اپنی اصولی کتاب احکام الاحکام میں اس کی تفصیل کی ہے۔ آیت میں صیغہ امر وجوب کے لئے وارد ہے۔ تو اس سے وہی زینت مراد ہوگی' جو شرعاً واجب ہے اور وہ کندھوں اور ناف سے گھٹنوں تک زینت کرنا ہے۔ باقی بدن کی زینت اس میں داخل نہیں' ورنہ تمام بدن کا ڈھانپنا واجب ہوگا جس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

آیت زینت پر تفصیلی بحث: یہ دیکھا اور سنا گیا ہے کہ جب ننگے سر نماز پڑھنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو اکثر علماء اہلحدیث اور مقلدین حنفیہ اس آیت کو پیش کر کے نماز میں سر ڈھانپنا ثابت کیا کرتے ہیں۔ راقم الحروف عارف حصاری اس دلیل پر یہاں تفصیلی بحث درج کرتا ہے' تاکہ کوئی اہل علم شخص اس غلطی اور مغالطہ کا ارتکاب نہ کرے۔

آیت کا شان نزول: اس آیت زینت کا مطلب اور مقصد سمجھنے کے لئے پہلے اس کے مورد اور شان نزول کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور وہ تفسیروں میں یوں ذکر ہے۔ تفسیر ابن کثیر پارہ نمبر ۲ میں لکھا ہے۔ مشرکین ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جیسے ہم پیدا ہوئے ہیں اسی حالت میں ہم طواف کریں گے۔

پھر لکھتے ہیں کہ اس آیت میں مشرکین کا رد ہے وہ ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "ننگے مرد دن کو طواف کرتے تھے اور ننگی عورتیں رات کو۔" اسی طرح تفسیر خازن' فتح البیان' ابن جریر' معالم التنزیل وغیرہ میں ہے۔ حمائل غزنویہ میں اس آیت کے حاشیہ پر لکھا ہے: "ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا لوگ اللہ تعالیٰ کے گھر

کا طواف ننگے کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم زینت کا بڑھایا یعنی پوشاک کا جو ستر کو ڈھانکے یہ آیت دلیل ہے وجوب ستر عورت پر حالت نماز میں۔ یہی مذہب ہے جمہور کا بلکہ ہر حال میں نزدیک اہل علم کے چھپانا ستر کا فرض ہے۔ (ابن کثیرؒ) اس تشریح سے یہ ثابت ہوا کہ آیت مذکورہ ننگے طواف کرنے والوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔ گو مشرکین نمازیں نہ پڑھتے تھے مگر اہل اسلام طواف بھی کرتے تھے اور نمازیں بھی پڑھتے تھے' اس لئے حکم عام وارد ہوا' پھر ذکر خطاب بنی آدم کو ہوا۔ پس طواف اور نماز ہر دو میں زینت واجبی رکھنے کا حکم شرعی قرار پایا۔ یہی علماء مفسرین نے سمجھا ہے۔

جلالین میں ہے: هذه الآية استدل على وجوب ستر العورة في الصلوة۔ یعنی "اس آیت سے اس بات پر دلیل لی گئی ہے کہ نماز میں بدن کا ستر ڈھانپنا واجب ہے۔" اس پر کمالین میں یہ لکھا ہے: اخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس رضی الله تعالی عنه امر بالستر عند الطواف۔ یعنی "ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم کیا گیا ہے کہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے وقت ستر ڈھانک لیں۔" پھر کمالین میں بحوالہ تفسیر بیضاوی لکھا ہے: عند کل مسجد لطواف وصلوۃ۔ یعنی "ہر مسجد کے نزدیک طواف اور نماز میں" پھر لکھا ہے کہ اس آیت سے نماز میں ستر ڈھانکنا ثابت کرنا مشکل ہے' کیونکہ یہ حکم طواف کے لئے وارد ہوا ہے۔ پھر یہ جواب دیا ہے کہ نماز میں ستر ڈھانکنا اجماع کی دلیل سے ہے۔

نیز کمالین میں بحوالہ تفسیر کبیر لکھا ہے: اجمع المفسرون على ان المراد بالزينة ههنا لبس الثوب الذي يستر العورة۔ یعنی "مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس آیت میں زینت سے مراد اس قدر کپڑا پہننا ہے کہ جس سے بدن کا ستر ڈھک جائے۔" جلالین ص ۱۳۱ میں ہے: خذوا زينتكم ما يستر عورتكم عند كل مسجد عند الصلوة والطواف۔ یعنی "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانک نماز اور طواف کے وقت۔"

اس تشریح سے یہ واضح ہوا کہ آیت زینت طواف ننگی حالت میں کرنے کے بارہ میں نازل ہوئی اور اپنے عموم سے نماز کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ حجاج جب طواف کرتے ہیں' تو بیت اللہ میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ پس دونوں حالتوں میں بدن کا وہ حصہ جو ستر ہے ڈھانپنا واجب ہے' تو سر ڈھانکنا اس آیت کے حکم میں داخل نہ ہوا۔ اس لئے حجاج احرام باندھتے ہیں تو سر ننگا رکھتے ہیں۔ طواف اور نماز میں صرف دو کپڑے پہنتے ہیں۔ ایک تہبند جو ناف

سے گھٹنوں تک ہوتی ہے۔ دوسری وہ چادر جس سے کندھے ڈھانکے جاتے ہیں' کیونکہ کندھے نماز میں ستر ہیں۔

حدیث بخاری میں وارد ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سر ستر نہیں ہے۔ ہاں عورت کا سر ستر ہے۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ عورت ننگے سر نماز نہ پڑھے۔ عورت کو طواف اور نماز ہر دو حالتوں میں سر ڈھانکنا واجب ہے۔ مرد کے لئے کسی وقت بھی واجب نہیں ہے' تو پھر اس آیت میں سر کو شامل کر کے پگڑی وغیرہ سے سر ڈھانکنے کو ضروری کہنا سراسر باطل ہے۔ اگر اس آیت میں سر ڈھانکنا مراد ہوتا تو حجاج کو طواف و نماز میں سر ڈھانکنے کا حکم دیا جاتا۔ لیکن یہ حکم نہیں دیا گیا' بلکہ سر ننگا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ سر ڈھانپنا اس آیت کا مامور بہ نہیں ہے۔ کہ قاعدہ ہے کہ مورد اس حکم نازل شدہ میں ضرور داخل رہتا ہے تو بیت اللہ شریف کے حجاج اس حکم زینت میں بطریق اولی داخل ہیں' جو ننگے سر نمازیں ادا کرتے ہیں۔

تفسیر اتقان مطبوعہ مصر ج۱' ص۳ میں ہے : ان صورة السبب قطعية الدخول فی العام۔ یعنی "صورت سبب نزول حکم کی قطعی طور پر اس عام حکم میں داخل ہوتی ہے۔" اس قاعدہ سے مولوی عبداللہ کی جہالت ظاہر ہو گئی کہ وہ اپنے رسالہ ضلالت مقالہ میں لکھتے ہیں کہ کہاں احرام کی حالت کا مسئلہ اور کہاں ننگے سر نماز پڑھنے کا مسئلہ۔ اس نادان کو یہ سمجھ نہیں کہ حالت احرام میں بھی نمازیں ادا کی جاتی ہیں اور آیت زینت جس سے تم نے استدلال کیا ہے طواف کرنے والوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے اور ان کو زینت واجبی کرنے کا حکم دیا گیا ہے' تو وہ دو کپڑوں سے ایسی صورت سے زینت کرتے ہیں کہ اس میں سر ننگا رہتا ہے کہ جس سے ظاہر ہوا کہ سر کی زینت اس آیت کی مامور بہ نہیں ہے۔ انسان کا دنیا میں واجبی حق یہ ہے کہ جسم کا وہ حصہ جو ستر ہے۔ اس کو ڈھانک لے' خواہ ایک کپڑے سے یا دو سے' مگر دو سے افضل ہے۔

ترمذی میں یہ حدیث وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابن آدم کے لیے ان چیزوں کے بغیر کوئی حق نہیں ہے۔ ایک گھر جس میں سکونت ہو سکے اور دوسرا حق یہ ہے کہ اتنا کپڑا ہو کہ جس سے ستر ڈھانک لے' تیسرا حق روکھی روٹی۔ یہ انسان کا دنیا میں واجبی حق

ہے اس سے زائد کو مباح اور جائز ہے مگر واجبی حق نہیں اور اس کا محاسبہ ہو گا اس لئے آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ لباس اور کھانے میں عہد حاضر کی طرح تکلفات نہ کیا کرتے تھے۔ ہاں خاص دنوں کے لئے زیادہ زینت کرنا مشروع ہے۔ مثلاً جمعہ اور عید وغیرہ لیکن ابن ماجہ میں جمعہ کیلئے بھی دو کپڑے بنانے کا حکم وارد ہے' پگڑی کی زینت اصلی نہیں زائد ہے۔

زینت دو قسم کی ہے اصلیہ اور زائدہ: نصوص شرعیہ پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زینت دو قسم کی ہے' ایک اصلیہ دوسری زائدہ۔ اصلیہ ایک کپڑے سے دو کپڑوں تک ہے۔ زائدہ کی کوئی خاص حد نہیں ہے۔ امام ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں ایک باب یوں منعقد کیا ہے: باب اباحة الصلوة فى الثوب الواحد المتوشح به اذا اشتمل به المصلى وان كان واجد الثوب آخر ولا كثر منه یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ نمازی ایک کپڑے کو بدن پر لپیٹ کر بطور توشح نماز پڑھے تو یہ جائز ہے۔ اگرچہ نمازی دوسرا کپڑا یا زیادہ کپڑے پا سکتا ہو۔"

پھر حضرت جابر ؓ کی احادیث کو لا کر اس مسئلہ کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے جواز میں محدثین نے کتب حدیث میں باب باندھے ہیں اور علماء اہل حق کا اجماع ہے۔ پس مولوی عبداللہ کا یہ کہنا کہ یہ مجبوری کے وقت کپڑوں کی تنگی کی وجہ سے تھا' اب جائز نہیں سراسر غلط ہے۔ ایک کپڑے میں زینت اصلیہ جس سے ستر ڈھانکا جا سکے پائی جاتی ہے۔ اس لئے آنحضور ﷺ اور صحابہ ؓ نے ایک کپڑے میں نمازیں ادا کی ہیں' جس سے ستر واجبی ڈھک جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں: قلت الزينة ما وارى عورتك ولو عباءة (شرح موطا) یعنی "زینت سے مراد وہ چیز ہے جو تیرا ستر ڈھانک دے' اگرچہ چغہ سے ہو۔"

آنحضور ﷺ اور صحابہ ؓ کا ایک کپڑے میں نماز پڑھنا: پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ آیت زینت سے زینت واجب مراد ہے' یعنی زینت اصلیہ ہے' باقی زائدہ ہے۔ زینت اصلیہ ایک کپڑے سے جبکہ وہ کندھوں سے گھٹنوں تک لپیٹا جائے حاصل ہو جاتی ہے' جس سے آیت پر عمل ہو جاتا ہے۔ اس لئے جناب رسول اللہ ﷺ نے اور آپ کے صحابہ کرام ؓ نے ایک کپڑے میں نمازیں ادا کیں ہیں' جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔

(۱) امام ترمذی نے باب باندھا ہے' ماجاء فی الصلوۃ فی الثوب الواحد یعنی "یہ باب ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بیان میں ہے۔" پھر اس کے ماتحت یہ حدیث ذکر کی ہے کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ حضرت ام سلمہ کے گھر میں ایک ہی کپڑے سے نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر امام ترمذی نے ان صحابہ کا شمار کیا جن سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنا مرفوعاً مروی ہے' چنانچہ ان کے نام یہ ہیں :
ابو ہریرہ' جابر' سلمہ بن اکوع' انس' عمر بن سعید' ابو سلمہ' ابو سعید' ابن عباس' عائشہ' ام ہانی' عمار بن یاسر' طلق بن علی' عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہم۔ جن صحابہ کے اسماء گرامی ذکر کیے ہیں یہ چودہ ہیں' تو چودہ احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک کپڑے میں نماز پڑھتے رہے' جنہوں نے مختلف اوقات میں دیکھا۔ پھر امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث پر اکثر اہل علم صحابہ کرام و تابعین عظام کا تعامل تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ لاباس بالصلوۃ فی الثوب الواحد یعنی "ایک کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔" جب ایک کپڑے میں نماز پڑھنے پر اکثر صحابہ و تابعین کا تعامل ثابت ہوا' تو اب اس کو مکروہ اور برا سمجھنا نہایت مذموم ہے۔ ایک کپڑے سے بصورت التحاف نماز پڑھنا مسنون ہے تو اس میں سر ننگا رہتا ہے۔ پھر ننگے سر نماز پڑھنے والے پر طعن کرنا جرم عظیم ہے۔ سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا نہ واجب ہے نہ سنت ہے۔ پھر اس پر زور دینا کہ سر پر پگڑی یا ٹوپی رکھو یہ ضروری ہے' نہایت لغو بات ہے۔ پھر مسجدوں میں اس نیت سے ٹوپیاں رکھنا کہ کوئی ننگے سر نماز نہ پڑھے' اگر پگڑی نہ ہو تو ٹوپی رکھ لے یہ عقیدہ بدعت اور اس میں سراسر اسراف ہے۔ جس کا ثبوت شرع میں نہیں ہے۔

(۲) بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ کسی سائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے یہ فرمایا : اولکلکم ثوبان "کیا تمہارے میں سے ہر شخص کے پاس دو کپڑے موجود ہیں۔" یعنی اگر نماز میں دو کپڑے ضروری یا شرط ہوتے تو ہر شخص کو دو کپڑے مہیا کرنے فرض ہوتے۔ تو یہ غریبوں' مسکینوں پر مشکل ہو جاتا۔ اس لئے دین میں آسانی کے پیش نظر ایک کپڑے میں نماز درست ہے۔ ایک کپڑا ہر غریب' مسکین اور امیر غنی کو میسر آ سکتا ہے۔

(۴) مولانا عبدالقدوس صاحب بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دنوں میں آنحضور ﷺ کے سر پر پگڑی تھی۔ لیکن بخاری کی روایت میں ہے کہ ام ہانی رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ فتح مکہ کے سال میں حضور ﷺ کے پاس گئی تو آپ غسل فرما رہے تھے۔ آپ نے غسل سے فراغت پاکر آٹھ رکعت نماز پڑھی "ملتحفا فی ثوب واحد" اس حالت میں کہ اپنے بدن پر ایک کپڑے کو لپیٹے ہوئے تھے۔ ایک کپڑے کے کناروں کو کندھے پر ڈال لے یا گردن پر باندھ لے اور ناف سے گھٹنوں تک بدن کو لپیٹ لے۔ کندھے ننگے نہ رہیں۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے : کان رجال یصلون مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عاقدی ازرھم علی اعناقھم۔ یعنی "لوگ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ اس حال میں نمازیں پڑھتے تھے کہ ان کے تہبند بچوں کی طرح گردنوں پر باندھے ہوتے تھے۔" اور بخاری کی حدیث میں ہے کہ کوئی اس حال میں نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر کوئی شے نہ ہو۔ اس لئے لحاف میں یا صرف سراویل میں نماز پڑھنا منع ہے کہ اکیلی شلوار میں کندھے ننگے رہتے ہیں اور لحاف سے التحاف نہیں ہوتا۔

ایک کپڑے میں ننگے سر امامت کرانا : مولوی عبدالقدوس نے ننگے سر امامت کرانے پر طنز کیا ہے۔ حالانکہ ننگے سر امامت کرانا اور نماز پڑھنا مشروع ہے اور اس پر طعن کرنا روا نہیں ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالقدوس فرماتے ہیں : "بعض مولوی صاحبان عام طور پر ننگے سر رہنے بلکہ ننگے سر کی حالت میں نماز کی امامت تک کرا دیتے ہیں' ان سے مغرب زدہ لوگوں کے طرزِ عمل کو تقویت ملتی ہے۔"

گویا مولوی صاحب ننگے سر رہنے اور امامت کرانے کو مغربی لوگوں کی مشابہت سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مولوی صاحب کی غلطی ہے کہ بغیر کسی دلیل شرعی کے ننگے سر رہنے اور نماز پڑھنے کو مغربی لوگوں یعنی نصاریٰ کی مشابہت بتاتی ہے۔ حالانکہ یہ خیال وجدانی ہے' جو سراسر باطل ہے۔ ہاں بات سے دلیل ثابت ہے کہ بغیر جوتا یا بغیر موزوں کے ننگے پاؤں نماز ہمیشہ پڑھنا جیسا کہ مولوی صاحب اور ان کے رفقاء اور دیگر عوام کا طرزِ عمل ہے' مشابہہ یہود ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا : خالفوا الیھود فانھم لا یصلون فی نعالھم ولا خفافھم۔ (ابوداؤد) یعنی "اے میری امت تم یہود کی مخالفت کرو یعنی جوتوں کو

پہن کر نماز پڑھو کیونکہ وہ جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے (بلکہ ننگے پاؤں پڑھتے ہیں۔)"

اور سنئے کہ آنحضور ﷺ کا اکثری عمل یہ تھا کہ آپ جوتوں میں نماز پڑھتے تھے۔ اس کی بحث انشاء اللہ العزیز آگے آئے گی۔ اب پہلی ننگے سر امامت کرانے کا ثبوت سنئے اور اپنے علم دانش پر غور کیجئے۔ امام ابوداؤد نے اپنی سنن ص ۹۳ میں یوں باب باندھا ہے: باب الرجل یصلی فی قمیص واحد۔ یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں کہ کوئی شخص صرف ایک قمیص میں نماز پڑھ لے تو یہ جائز ہے۔" چنانچہ اس دعویٰ پر امام ابوداود نے دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ ایک حدیث سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ شکاری والی وہ تو منفرد کے بارہ میں ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں شکار کھیلتا ہوں مجھ پر اور کپڑا نہیں ہوتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں یہ جائز ہے۔ دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی پیش کی ہے کہ عبدالرحمن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: امنا جابر بن عبد اللہ فی قمیص لیس علیہ رداء فلما انصرف قال انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی قمیص۔ یعنی "امامت کرائی ہم کو جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے صرف ایک قمیص میں ان پر کوئی چادر نہ تھی' جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میں نے جناب رسول ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ نے ایک ہی قمیص میں نماز پڑھی ہے۔"

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ جب کرتہ اتنا بڑا ہو کہ کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک ستر ڈھک جائے تو نماز درست ہے۔ پھر دوسرے کپڑے کی ضرورت نہیں' چونکہ زینت شرعی واجبی پوری ہو چکی۔

امام ابوداؤد نے ایک باب باندھا ہے کہ کتنے کپڑوں میں نماز درست ہو سکتی ہے۔ اس باب کے تحت ایک حدیث یہ ذکر کی ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہم آئے' اتنے میں ایک شخص آیا اس نے کہا یا نبی اللہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے اپنے تہبند اور اوپر کی چادر کو ایک بنا لیا' یعنی ایک کو دوسری پر منطبق کر لیا۔ پھر بدن پر لپیٹ کر کھڑے ہوئے اور نماز پڑھائی جب نماز پڑھ چکے تو نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ کیا ہر ایک تم میں سے دو کپڑے پاتا ہے؟ (یعنی نہیں) چونکہ دو کپڑے ہر ایک کو میسر آنے دشوار ہیں' اس لئے نماز ایک کپڑے

میں درست رکھی گئی ہے۔

اس حدیث سے کئی مسائل ظاہر ہوئے ایک یہ آنحضور ﷺ دو کپڑے رکھتے تھے' ایک تہبند' دوسری چادر۔ یہ تو تواضع اور خشوع کی حالت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے' اس لئے بیت اللہ دربار الٰہی میں یہی حالت قائم رکھی گئی۔ آپ بھی عام طور پر محرم کی حالت کا لباس رکھتے تھے۔ دوسرا یہ مسئلہ تمام ہوا کہ کپڑا خواہ موجود ہو تب بھی ایک کپڑے میں عمداً نماز پڑھنا درست ہے۔ تیسرا یہ کہ زینت شرعی واجب صرف ستر ڈھانکنا ہے' باقی زینت زائدہ ہے۔ چوتھا یہ کہ جہاں لوگوں کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہو' وہاں عمل کر کے دکھانا چاہیے۔ مثلاً عوام ننگے سر نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے' بلکہ برا جانتے ہیں' تو وہاں نماز ننگے سر پڑھ کر دکھانی چاہیے' تاکہ یہ سنت مردہ زندہ ہو اور ایک شہید کا ثواب حاصل ہو جائے اور جہاں جوتا میں نماز پڑھنا عیب جانتے ہیں وہاں جوتا میں نماز پڑھ کر ایک شہید کا درجہ حاصل کرنا چاہیے۔ پانچواں یہ کہ ایک کپڑے میں خواہ چادر ہو یا قمیص ہو اقامت کرنا درست ہے۔ بندہ حصاری مولوی عبدالقدوس سے دریافت کرتا ہے کہ اگر آپ احرام باندھ کر چلیں اور آپ کے ساتھ دیگر حاجیوں کا قافلہ ہو اور نماز کا وقت آجائے' تو آپ کو لوگ امام بنا کر نماز پڑھیں اور آپ ان کی امامت کروائیں تو پھر ننگے سر امامت کروائیں تو پھر کیا یہ درست ہو گا یا نہیں؟ اگر نفی میں جواب ہو تو یہ بڑا جماع باطل ہو گا اور اگر اثبات میں جواب ہے تو پھر ننگے سر امامت آپ کی زبان سے روا ہو گئی اور آپ اپنے طرز عمل سے مخالف لوگوں کے مشابہ ہو گئے ع۔ "لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا"

اس کا صحیح جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو گی مبارک تمہیں

دوسرے کپڑے پاس ہوتے ہوئے ننگے سر امامت کرانا: اگرچہ مسئلہ ایک حد تک صاف ہو گیا کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے اور ایک کپڑے کو شرعی صورت سے پہننے سے سر ننگا رہتا ہے اور اب یہاں عوام کالانعام کا یہ خدشہ دور کر دیں کہ ایک کپڑے میں منفرد یا امام کو اس حالت میں نماز درست ہے جبکہ دوسرا کپڑا پاس نہ ہو' اگر دوسرا کپڑا پاس ہو تو پھر منفرد یا امام کو ایک کپڑے میں نماز درست نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ دوسرے کپڑے پاس ہوں تب بھی منفرد اور امام کو ایک کپڑا میں نماز پڑھنا درست ہے۔ جب

کہ اس سے واجبی ستر کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک جسم ڈھانکا جا سکے۔ چنانچہ اس بات کے دلائل پیش خدمت ہیں۔

پہلی دلیل: بخاری شریف میں یہ حدیث ہے کہ محمد بن منکدر کہتے ہیں کہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا' وہ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ جس کو کندھوں تک لپیٹا ہوا تھا اور ان کے اوپر کی چادر پاس رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ اے ابو عبداللہ! آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ کی چادر پاس رکھی ہوئی ہے' تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں ٹھیک ہے میں یہ دوست رکھتا ہوں کہ اس طرح نماز پڑھوں تاکہ تمہارے جیسے جاہل لوگ دیکھ لیں کہ اس طرح نماز پڑھنا درست ہے۔ رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی کذا "کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اسی طرح نماز پڑھتے تھے۔"

دوسری دلیل: یعنی اس طرح پاس کپڑے ہوتے ہوئے آپ نماز پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ امام طحاوی شرح معانی الآثار ج ۱' ص ۲۲۳ میں حدیث لاتے ہیں: عن جابر رضی اللہ تعالی عنہ رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی ثوب واحد مخالفا بین طرفیہ علی عاتقیہ وثوبہ علی مشجب۔ یعنی "جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ جس کے دونوں کنارے دونوں کندھوں پر تھے اور آپ کا دوسرا کپڑا تپائی پر رکھا ہوا پڑا تھا۔" اس سے دو مسئلے ثابت ہوئے ایک یہ کہ ایک کپڑے میں باوجود دوسرا کپڑا پاس ہوتے ہوئے نماز ہو جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک کپڑے میں نماز اس طرح پڑھے کہ اس کے دونوں کنارے دونوں کندھوں پر مخالف صورت سے ہوں کہ دایاں کنارہ کپڑے کا بائیں کندھے پر اور بایاں کنارہ دائیں کندھے پر ہو اس صورت سے سر ننگا رہتا ہے۔ سر ننگے نماز جائز ہے' ڈھانکنے کا حکم کہیں نہیں آیا۔

تیسری دلیل: عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میرے باپ نے بیان کیا: امنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثوب واحد متوشحا بہ۔ یعنی "ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑے میں بصورت توشح کپڑا لپیٹ کر امامت کرائی۔" اس سے ننگے سر امامت کرانا ثابت ہوا۔ دیگر حدیث انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو متکی علی اسامۃ متوشحا ببرد فصلی بھم یعنی

"رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے درآں حالیکہ اسامہ رضی اللہ عنہ پر تکیہ لگائے ہوئے تھے اور ایک چادر بدن پر لپیٹی ہوئی تھی پس آپ نے ہم کو نماز پڑھائی۔"

چوتھی دلیل: یہ کہ قعقاع بن حکیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے وہ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے تھے: وقمیصہ وردائہ فی المشجب۔ یعنی "اس وقت ان کی قمیص اور اوپر کی چادر تپائی پر پڑی ہوئی تھی۔" پس جب وہ نماز سے فارغ ہوئے' تو انہوں نے یہ فرمایا کہ میں نے یہ کام اس لئے کیا کہ تم معلوم کر لو کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے کہ نہیں؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں یہ کب ہو سکتا ہے کہ تمہارے میں ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوں۔ اس حدیث سے ایک تو یہ ظاہر ہوا کہ دوسرے کپڑے کے ہوتے ہوئے نماز ایک کپڑے میں کہ سر ننگا ہو درست ہے۔ دوسرا یہ کہ جابر رضی اللہ عنہ کے کپڑے تپائی پر تھے ان میں پگڑی یا ٹوپی نہ تھی کہ پگڑی ہر لباس میں اور ہر وقت داخل نہ تھی اور یہ کہ دو کپڑے نماز میں شرط نہیں' ایک ہی سے زینت کافی ہے۔ تیسرا یہ کہ عام طور پر عرب کے لوگ کتنے ہی کپڑے پہنتے ہوں نماز میں ان سب کا پہننا ثابت نہیں۔ لباس نماز میں اتار کر بھی نمازیں پڑھ لیتے تھے اور گھر میں بھی چھوڑ آتے تھے۔

پانچویں دلیل: احادیث مذکورہ بالا شرح معانی الآثار سے منقول ہیں۔ نیز اس میں یہ حدیث ہے ابو عامر سلیم انصاری نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سات مہینے نماز پڑھی ان کے پیچھے جو لوگ نمازیں پڑھتے تھے ان کو دیکھا گیا' اکثر ایک کپڑے میں ہی نمازیں پڑھتے تھے۔ دوسری روایت باسناد یہ ہے کہ قیس بن سعد نے بیان کیا کہ ہم کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جنگ یرموک کے دن نماز پڑھائی ایک ہی کپڑے میں اس کے دونوں کنارے مخالف کندھوں پر ڈالے ہوئے تھے' یعنی دایاں کنارہ بائیں کندھے پر اور بایاں کنارہ کپڑے کا دائیں کندھے پر تھا۔

ان دلیلوں سے واضح ہوا کہ عہد نبوی ﷺ اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا عام تعامل تھا اور یہ ان کا زہد تھا اور انکساری تھی۔ اب شوقین لوگ پگڑیاں یا ٹوپیاں اور قمیصیں اور چادریں یا شلواریں پہن کر نمازیں پڑھتے ہیں اور ننگے سر پڑھنے والوں پر فخر ظاہر کر کے مذاق کرتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عام عمل صرف ایک کپڑے میں

نماز پڑھنے کا تھا۔ چنانچہ کنزالعمال میں بروایت صحیح ابن خزیمہ یہ حدیث لکھی ہے : عن ابی کنا نصلی فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثوب واحد ولنا ثوبان۔ یعنی "ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم عہد نبوی ﷺ میں ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھا کرتے تھے' درآں حالیکہ ہمارے پاس دو کپڑے موجود ہوتے تھے۔"

اس حدیث سے مولوی عبداللہ کے رسالے کا رد ہو گیا' جس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ابتداء اسلام میں لوگوں کو کپڑوں کی تنگی تھی' اس لئے ایک کپڑے میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے بتا دیا کہ ہمارے پاس کپڑے موجود ہوتے تھے تب بھی ہم ایک کپڑے میں نمازیں پڑھتے تھے اور دوسری بات یہ ظاہر ہوئی کہ یہ عمل ان کا دائمی تھا' کیونکہ فعل مضارع پر جب فعل ناقصہ کی ماضی وارد ہو تو ماضی استمراری بن جاتی ہے کہ وہ فعل ہمیشہ یا اکثر ہوتا تھا۔ تیسری یہ بات ظاہر ہوئی کہ لفظ "کنا" اور "نصلی" صیغے جمع ہیں۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ عمل ظاہر کیا ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں سب مسلمان ایک ہی کپڑے میں نمازیں پڑھتے' اسی سے ایک کپڑے میں نماز کے مشروع ہونے پر اجماع ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر آنحضور ﷺ اور خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انکار نہیں کیا۔

ایک کپڑے میں نماز پڑھنا سنت ہے: مشکوۃ باب الستر فصل ثالث میں یہ حدیث ہے : عن ابی بن کعب قال الصلوۃ فی الثوب الواحد سنۃ کنا نفعل مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا یعاب علینا یعنی "حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا سنت ہے۔ ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نمازیں پڑھتے تو ایسا کیا کرتے تھے اور ہم پر کوئی نکتہ چینی اور عیب جوئی نہ کی جاتی تھی۔" اس روایت میں ضعف بتایا گیا مگر دیگر روایات اس کی موید ہیں' ضعف مضر نہیں ہے۔ چنانچہ صحیح ابن خزیمہ کی روایت گزر چکی ہے کہ باوجود دو کپڑوں کے ہم عہد نبی اکرم ﷺ میں ایک کپڑے سے نماز پڑھتے تھے۔

سنن بیہقی ج-۲' ص-۲۳۷ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی' کپڑے کے کنارے کندھوں پر تھے اور آپ کا دوسرا کپڑا تپائی پر پڑا ہوا تھا۔ یہ سنت فعلی ہو گئی' پہلی تقریری تھی اور قولی حدیث بھی آچکی کہ آنحضور ﷺ سے مسئلہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا دریافت ہوا تو آپ نے جائز قرار دیا۔ پس ہر سہ قسم

احادیث سے ایک کپڑے میں نماز ادا کرنی سنت ثابت ہوئی' جس سے سر ننگا ثابت ہوتا ہے۔
بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ابتداء اسلام میں تھا۔ پھر زینت کا حکم آیا تو پگڑی قمیص وغیرہ تین کپڑوں میں نماز پڑھی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات ان لوگوں کی ہے' جو تحقیق مسائل کی نہیں جانتے اور بالکل نادان ہیں۔

آیت زینت کے حکم کی سورۃ اعراف میں ہے اور سورہ اعراف مکی ہے اور دلائل سبب نزول بھی اس پر دلیل ہیں اور احادیث ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی مدنی ہیں' جس سے ظاہر ہے کہ آیت ان احادیث کے معارض نہیں ہے بلکہ احادیث نے آیت کا مقصد سمجھا دیا کہ اس سے مراد صرف ستر ڈھانکنا ہے تمام لباس کا بدن پر ہونا ضروری نہیں ہے اور ابتداء اسلام کا خیال باطل ہے کہ آخر اسلام میں بھی آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک کپڑے میں نمازیں ادا کرتے رہے' جس میں سر ننگا رہتا تھا۔ چنانچہ دلائل ذیل سے ظاہر ہے :

کنزالعمال میں ہے : عن انس رضی اللہ تعالی عنہ آخر صلوۃ صلاھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثوب واحد مخالفا بین طرفیہ خلف ابی بکر۔ یعنی "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ آخری نماز میں جو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی ہے' وہ ایک کپڑے میں تھی' جس کے دونوں کنارے ایک دوسرے کی مخالف طرفوں پر ڈالے ہوئے تھے۔" پس ابتداء سے انتہاء تک اکثری عمل ایک کپڑے پر تھا' پس یہ سنت قرار پایا۔ یہ فضیلت اصلیہ ہے' اگر دو میں پڑھے تو وہ اس سے بھی بہتر ہے۔ آنحضرت ﷺ کے قول و فعل ہر دو سے ثابت ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم باوجود دوسرے کپڑوں کے ہوتے ہوئے ایک کپڑے میں اس کو سنت سمجھ کر نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ میرے رسالہ ضرب الناس کے ص ۳۰ میں یہ روایت درج ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میرے والد ماجد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اور دوسرے کپڑے پاس موجود تھے۔ میں نے عرض کیا اباجی آپ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی ہے' حالانکہ آپ کے دوسرے کپڑے گھر میں موجود ہیں۔ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد فرمایا اے جان پدر! آخری نماز جو آنحضور ﷺ نے میرے پیچھے پڑھی تھی وہ ایک ہی کپڑے میں تھی۔

ان روایتوں نے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو یہ کہتے ہیں کہ یہ عمل ابتداء اسلام میں تھا

یا تنگی کپڑوں کی وجہ سے تھا یا صرف مسئلہ ظاہر کرنے کے لئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک کپڑے میں نماز مشروع اور سنت واجبہ ہے۔

ایک کپڑے پر مناظرہ اور فاروقی فیصلہ: کنز العمال میں یہ قصہ درج ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں بھی ہے کہ خلافت فاروقی رضی اللہ عنہ میں (جبکہ فتوحات اسلامیہ سے سب تنگیاں رفع ہو چکی تھیں) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے علی الاطلاق یہ فتویٰ دیا کہ ایک کپڑے میں نماز اختیاری طور پر جائز ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تعاقب کیا کہ یہ عمل کپڑوں کی تنگی کی وجہ سے جاری ہوا تھا' اب دو کپڑوں میں نماز افضل ہے۔ دونوں جھگڑتے رہے' باہم کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس مناظرہ کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یہ فرمایا: اختلفتما فی امر ثم تفرقتما لا یدری الناس بای ذلک یاخذون لو اتیتمانی لوجدتما عندی علی القول ما قال ابی۔ یعنی تم دو عالموں نے ایک مسئلہ پر بحث کی' پھر بغیر کسی اتفاق بحث پر متفق ہونے کے چلے گئے۔ جس سے لوگوں کو حق بات معلوم نہ ہو سکی' جس پر وہ عمل کر سکیں۔ اگر تم میرے پاس آکر فیصلہ کراتے تو میں یہ فیصلہ دیتا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا فتویٰ صحیح ہے کہ ایک کپڑے میں ہر حال میں نماز پڑھنا جائز ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ نزاع ایک کپڑے یا دو کپڑوں پر تھا' پگڑی اور تیسرے پر نہ تھا۔ اس اختلاف کا فیصلہ بھی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے حق میں کیا' اس پر سب کا اجماع ہو گیا۔

ایک کپڑے میں نماز کے جواز پر اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم: پہلے تو بعض صحابہ ابن مسعود' ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دیگر صحابہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے اختلاف کیا تھا کہ جب دو کپڑے میسر ہوں تو ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھنی چاہئے۔ لیکن جب فیصلہ فاروقی رضی اللہ عنہ ہوا تو پھر سب کا اتفاق ہو گیا۔ ثم استقر الامر علی الجواز۔ (فتح الباری)

اب تمام علماء اسلام کا اجماع ہے کہ اگر کندھے اور ناف سے گھٹنوں تک بدن ڈھانپ لیا جائے تو اس حالت میں نماز درست ہے۔ لیکن دو کپڑے ہوں جیسے قمیص و تہبند یا چادر اور تہبند تو یہ افضل ہے۔ مگر صحابہ کرام باوجود دوسرے کپڑے کے ایک کپڑے میں نماز پڑھتے تھے اور یہ بھی سنت ہونے کی وجہ سے اچھا ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابو نضرہ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ان الصلوۃ فی ثوب واحد حسن قد فعلناہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "ایک کپڑے میں نماز اچھی ہے' کیونکہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک کپڑے میں نماز پڑھتے رہے ہیں۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو عالم بالحدیث تھے یہ فرماتے ہیں کہ میں تو اپنے کپڑے تپائی پر پڑے چھوڑ آتا ہوں اور ایک کپڑے میں نماز پڑھتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں ایک ہی کپڑے میں امامت کرائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا کوئی مضائقہ نہیں' میں خود ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھا کرتا ہوں۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں اور حضر میں تندرستی میں اور بیماری میں' ابتداء اسلام میں اور انتہاء میں ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے رہے اور خلفاء راشدین کا بھی اس پر عمل پایا گیا اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی تعامل رہا' تو اس کے سنت ہونے میں کیا شبہ ہے؟ لیکن ماننے کے لئے عصبیت کا نہ ہونا شرط ہے۔

تعصب وہ ہے دشمن' نوع انسان
گھر کے گھر کئے سینکڑوں جس نے ویران

ایک کپڑا پہننے کی ہیئت: عوام یہ بحث پڑھ کر حیران ہوں گے کہ مسئلہ یہ تھا کہ ننگے سر نماز جائز ہے کہ نہیں اور بحث اس بات پر کی جا رہی ہے کہ ایک کپڑے میں نماز جائز بلکہ سنت ہے۔ اس ثبوت سے یہ کیسے لازم آگیا کہ ننگے سر نماز جائز ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نصوص کی چار قسمیں علماء نے کی ہیں۔ ایک "عبارۃ النص" دوسری "دلالۃ النص" تیسری "اشارۃ النص" چوتھی "اقتضاء النص۔" ہمارے پیش کردہ نصوص میں گو عبارت میں یہ الفاظ موجود نہیں کہ ننگے سر نماز پڑھو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگے سر نماز پڑھی ہے۔ لیکن جن دلائل میں ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا ذکر ہے اس کپڑا پہننے کی صورت اور ہیئت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ننگے سر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ کہیں دلالت سے' کہیں اشارۃ سے' کہیں نص سے' کہیں اقتضاء سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک کپڑے میں نماز کے وقت سر ننگا ہوا کرتا تھا۔

چنانچہ ایک کپڑے کو بدن پر لپیٹنے کے لئے یہ الفاظ ذکر کئے ہیں: "متوشحا ملتحفا مشتملا۔ مخالفا بین طرفیہ علی عاتقیہ" مطلب اور مراد سب کی ایک ہی ہے۔ التحاف

کا معنی اوڑھنا اور لپیٹنا اور توشیح یہ ہے کپڑے کا ایک کنارہ بائیں ہاتھ کی بغل سے لے جا کر داہنے کندھے پر ڈالنا اور دوسرا کنارہ کپڑے کا دائیں ہاتھ کے تلے سے لے جا کر بائیں کندے پر ڈالنا اور دونوں کناروں کا ملا کر گدی پر گرہ دے دینا یا سینہ پر باندھ دینا جب کپڑا واسع اور فراخ ہو تو اسی طرح باندھا جاتا ہے۔ یہی صورت مخالف بین الطرفین کی ہے۔ اس ہیئت وشکل سے سر کا ننگا رہنا بدیہی بات ہے۔ اگر گدی یا سینہ پر گرہ نہ دے اور کپڑا کے کھل جانے کا اندیشہ نہ ہو تو کپڑے کے دونوں کناروں کو مخالف طرف کے کندھوں پر ویسے بھی ڈالا سکتا ہے۔

ابوداؤد میں یہ حدیث مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی تم میں سے ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اس کے داہنے کنارے کو بائیں کندے پر ڈال لے اور بائیں کو داہنے پر' اس صورت سے بھی سر ننگا رہتا ہے اور جس حدیث میں ایک قمیص میں نماز ادا کرنے کا ذکر ہے اس صورت میں بھی سر ننگا رہتا ہے۔ پس برہنہ سر سے نماز ادا کرنا دلائل صحیحہ اور اجماع صحابہ سے جائز ثابت ہو گیا بلکہ سنت ٹھہرا کیونکہ پگڑی یا ٹوپی سے سر ڈھانپنے کا اہتمام ثابت نہیں ہے۔ مولوی عبدالقدوس صاحب کا ان روایتوں کو لکھنا جن میں اہل عرب کے کئی پگڑیوں کا ذکر ہے۔ مسئلہ ما بہ النزاع میں ان سے دلیل لینا عبث اور غیر مفید ہے' کیونکہ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کپڑوں کے پاس یا گھر میں ہوتے ہوئے بھی ایک کپڑے میں نمازیں پڑھتے تھے' یا زیادہ سے زیادہ دو کپڑوں میں کہ اس صورت میں عجز وانکساری پائی جاتی ہے۔ اس لئے محرم کو صرف دو کپڑوں کا حکم ہے۔ جس میں سر ننگا رکھنا ضروری ہے۔ نماز سے خارج کئی کپڑوں کے ہونے سے نماز میں ان تمام کپڑوں کا ہونا سمجھ لینا نصوص شرعیہ سے اور علمی قواعد سے ناواقفی پر دلیل ہے' کیونکہ نماز سے خارج حالت کا دوسری حالت پر قیاس صحیح نہیں ہے اور آیت زینت کی ہے' جس کی تفسیر احادیث مدینہ سے کرنی واجب ہے۔

دو کپڑوں میں نماز افضل ہے: اگرچہ ایک کپڑے میں بلاشبہ درست ہے۔ جس میں سر ننگا رہتا ہے بلکہ سنت ہے۔ اگر دو کپڑوں میں نماز پڑھنا افضل ہے اور یہ بھی سنت ہے۔ یہ سنت پہلی سنت کی نفی نہیں کرتی' کیونکہ بعض کام دونوں طرح ہی سنت ہوتے ہیں۔ مثلاً امام نماز سے فارغ ہو تو اس کو دائیں طرف پھر جانا بھی سنت ہے اور بائیں طرف پھر جانا بھی

سنت ہے۔ دونوں میں سے جس پر چاہے عمل کر لے گا ہے چنیں گاہے چناں۔ لیکن کسی ایک حالت کو اعتقادی اور عملی طور پر ہمیشہ کے لئے مقرر نہ کر لے' کہ دوسری متروک ہو جائے' پھر ناجائز ہو جائے گا۔ ہم لوگ دو کپڑوں میں نماز پڑھتے ہیں اور وہ قمیص اور تہبند یا چادر کندھوں تک لپٹی ہوئی اور دوسرا کپڑا تہبند ہوتا ہے اور سر ہمارا عموماً ننگا رہتا ہے۔ بعض مخصوص اوقات مثلاً جمعہ وعید وغیرہ میں پگڑی یا ٹوپی' پٹکہ' کوٹ' واسکٹ وغیرہ میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن دو سے اوپر جو کپڑا ہوتا ہے اس کی زینت زائدہ تصور کرتے ہو' کیونکہ زینت اصلیہ تو ایک سے کامل اور دوسرے سے اکمل ہو جاتی ہے' باقی زائدہ ہے۔

اب دو کپڑوں کا ثبوت سنئے! ابوداؤد باب اللبس للجمعہ میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ما علی احدکم ان وجدتم ان یتخذ ثوبین لیوم الجمعۃ سوی ثوبی مھنتہ یعنی "کیا ہے ایک تمہارے پر کہ اگر تم پا سکو تو دو کپڑے خاص جمعہ کے لئے تو بنا رکھو' سوا ان دو کپڑوں کے جو اور دنوں میں کاروبار کے وقت پہنتے ہو۔" اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوئیں' ایک یہ کہ جمعہ کا لباس کاروباری لباس سے علیحدہ بنا رکھنا چاہئے۔ دوسری یہ کہ اہل عرب کا عام لباس دو ہی کپڑے تھے۔ تیسری یہ کہ نماز دو کپڑوں میں افضل ہے۔ جمعہ ہو یا روزانہ پانچ وقتی نماز سب میں دو کپڑوں سے زینت بہت کامل ثابت ہے۔

دوسری دلیل: عن ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی احدکم فلیلبس ثوبیہ فان اللہ احق ان یزین لہ۔ رواہ طبرانی فی الکبیر واسنادہ حسن قالہ الھیثمی یعنی "ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی تمہارا نماز پڑھے تو دو کپڑے پہنے کیونکہ اللہ تعالٰی سب سے زیادہ حق دار ہے کہ اس کے لئے زینت لگائی جائے۔ اس حدیث میں صیغہ امر استحباب کے لئے ہے' کیونکہ دیگر احادیث قولیہ وفعلیہ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنا اور پڑھانا ثابت ہو چکا ہے اور وہ حدیث صحاح کی ہیں۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ زینت کامل ومکمل دو کپڑوں سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالٰی کے لئے جو زینت کا زیادہ حق دار ہے دو کپڑے ہی مقرر کیے گئے ہیں۔ باقی کپڑوں کی زینت زائدہ ہے' جو مقصود بالذات نہیں اس لئے سر ڈھانپنے کا حکم یا دائمی فعل شرع سے ثابت نہیں ہوا۔ حزب مخالف نے پگڑی کا اہتمام اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔

تیسری دلیل: اجناس دیت قتل میں اہل حلہ پر دو سو حلہ حدیث میں وارد ہے' جس کی تفصیل نیل الاوطار میں ہر حلہ کی یوں لکھی ہے: والحلة ازار ورداء او قميص وسراويل۔ یعنی جو کپڑے دو سو کی تعداد میں دیتے ہیں (مقتول کے وارثوں کو قاتل کی طرف سے) وہ یہ ہونے چاہیے' ایک چادر اور دوسرا تہبند یا یہ کہ ایک قمیص اور شلوار۔ دیت کے حلوں میں پگڑی یا ٹوپی یا رومال وغیرہ شامل نہیں کئے گئے' کیونکہ یہ اصلی ضرورت اور زینت سے زائدہ لباس ہے۔ زائد حسن لباس زہد کے خلاف ہے' اس کے ترک میں ثواب ہے۔

چنانچہ مشکوۃ میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: من ترک لبس ثوب جمال وهو يقدر عليه تواضعا كساه الله حلة الكرامة۔ یعنی "جو شخص باوجود قدرت ووسعت کے خوبصورتی کا لباس عجز وانکساری کی نیت سے ترک کر دے گا اللہ تعالی قیامت کے دن اس کو عزت وکرامت کا لباس پہنائے گا۔" اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نماز میں عجز وانکساری کی نیت سے ایک یا دو کپڑوں میں نماز پڑھی۔ پگڑی یا ٹوپی کا اہتمام نہ کیا' یہ ان کا زہد تھا۔ جو شخص اس کو مغربی طرز عمل قرار دیتا ہے' اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ شرعی طرز عمل تیرہ سو سال سے زائد عرصہ سے جاری اور مشروع ہو چکا ہے۔ مغربی طرز عمل بعد میں پیدا ہوا ہے' تو وہ شرعی عمل کو منسوخ نہیں کر سکتا' بلکہ موید ہے کہ سب انسانوں کی فطرت اس طرز عمل کو قبول کر رہی ہے' فتدکروا۔

جوتا اُتارنے کی ممانعت: آنحضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم مسجد میں جوتیوں سمیت داخل ہوا کرتے تھے اور ان میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوتیوں سمیت نماز پڑھ رہے تھے' آنحضور ﷺ کے جوتا میں نجاست لگی ہوئی تھی' جو آپ کو معلوم نہ تھی۔ جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے' انہوں نے جوتا اتارنے کا حکم دیا اور بتایا کہ ان میں نجاست ہے۔ آپ ﷺ نے اپنا جوتا نمازہی میں اتار دیا' آپ ﷺ کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنی جوتیاں اتار دیں۔ نماز سے فارغ ہو کر آنحضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم نے اپنی جوتیاں کیوں اتاریں؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور! ہم نے آپ کو دیکھ کر عمل کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تو اس لئے اتاری تھیں کہ مجھے جبرائیل نے خبر دی تھی کہ آپ کی جوتیوں

میں پلیدی ہے' تب میں نے اتار دیں۔ اچھا آئندہ یہ ہدایت ہے کہ جب مسجد کو آؤ تو اپنی جوتیاں خوب دیکھ لیا کرو' اگر نجاست لگی ہو تو زمین پر رگڑ لیا کرو اور پھر ان میں نماز پڑھ لیا کرو۔ (مشکوۃ)

اس قصہ میں طحاوی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں : فلا تخلعوا نعالکم۔ یعنی "تم اپنی جوتیاں نہ اتارو۔" (طحاوی ج ۱' ص ۲۹۳)

فعلی احادیث سے ثبوت دلیل نمبر ۵: بخاری شریف میں حضرت امام بخاری نے جوتیوں میں نماز پڑھنے کا باب باندھا ہے اس میں یہ حدیث ہے کہ حضرت انس بڑھٹر سے پوچھا گیا : "کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی نعلیہ قال نعم۔ یعنی "کیا حضور ﷺ اپنی جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں پڑھا کرتے تھے۔" اس طرح ہر محدث نے اپنی کتاب میں جوتیوں کا باب لکھا ہے مگر کسی نے پگڑی سر پر رکھنے کا باب نہیں لکھا۔

دلیل نمبر ۶: طحاوی معانی الآثار ج ۱' ص ۲۹۳ میں ایک روایت لائے ہیں کہ حضرت ابن مسعود بڑھٹر حضرت ابو موسی بڑھٹر کے پاس گئے' تو نماز کا وقت آگیا' ابو موسی بڑھٹر نے نماز پڑھائی تو جوتیاں اتار دیں جب نماز سے فارغ ہوئے تو ابن مسعود بڑھٹر نے فرمایا کہ آپ نے جوتیاں اتار کر نماز کیوں پڑھی' کیا آپ وادی مقدس طویٰ میں کھڑے ہیں؟ سنئے! لقد رأینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی الخفین والنعلین۔ یعنی "ہم نے جناب رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ موزوں اور جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔"

دلیل نمبر ۷: طحاوی کے اسی حوالہ میں حدیث درج ہے کہ ایک شخص نےحضرت ابوہریرہ بڑھٹر سے کہا کہ کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ نے لوگوں کو جوتیوں میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ میں نے تو نہیں کہا۔ ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ قسم ہے رب اس حرمت والے گھر کی کہ رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی فی ھذا المقام وان نعلیہ علیہ۔ یعنی "میں نے اس پاکیزہ مقام پر آنحضور ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور آپ جوتیاں پہنے ہوئے تھے۔" بیت اللہ اور مسجد نبوی میں جب نماز جائز ہے تو ہماری مسجدوں میں جوتیوں میں نماز کیوں جائز نہیں؟

دلیل نمبر۔۸: شرح معانی الآثار ج۔۱' ص۔۲۴۳ میں امام طحاوی نے باسناد یہ حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت اوس ثقفی صحابی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نصف مہینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقیم رہا: فرأيته يصلي وعليه نعلان مقابلتان۔ "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نماز پڑھتے تو دو جوتیاں پہنے ہوتے' جن کے سامنے تسمے ہلا کرتے تھے۔"

حدیث انس رضی اللہ عنہ میں كان يصلي استمرار پر دال ہے' اس حدیث سے مزید تائید ہو گئی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اکثری عمل یہی تھا کہ آپ جوتیاں پہن کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس سے جوتیوں سے نماز پڑھنا سنت ثابت ہوا' جس کے عام اور خاص لوگ تارک ہیں۔ پس جو شخص اس عہد میں اس سنت کو زندہ کرے گا' اس کو ایک شہید کا ثواب ملے گا پگڑی کا نہیں۔

دلیل نمبر۔۹: طحاوی نے اسی صفحہ میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ سعید بن فیروز اپنے باپ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ وفد ثقیف کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ اس وفد کا یہ بیان ہے: فرأينا رسول الله صلى الله عليه وسلم نعلان مقابلتان۔ یعنی "ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ آپ دو جوتیاں تسمے دار پہنے ہوئے تھے۔" پس عام عادت آپ کی جوتیوں میں نماز پڑھنے کی تھی۔ اس بارے میں احادیث کثرت سے وارد ہیں' پگڑی کے بارہ میں نہیں ہیں۔

دلیل نمبر۔۱۰: مولوی عبدالقدوس صاحب نے پگڑی کا ثبوت نماز میں پہننے کا یوں دیا ہے کہ وضو میں پگڑی پر مسح کرنے کی حدیث پیش کر دی حالانکہ سر پر مسح کرنے کی احادیث بکثرت ہیں۔ ہم بھی مسح کی حدیث سے جوتا میں نماز پڑھنے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار ج۔۱' ص۔۵۸ میں اس مسئلے پر احادیث لائے ہیں' ان میں ایک یہ ہے: عن ابي موسى رضي الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم مسح على جوربيه ونعليه۔ یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جرابوں اور جوتیوں میں مسح کیا کرتے تھے۔" اس سے ایک تو یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ جوتیوں اور جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے' دوسرا یہ کہ جوتیوں میں نماز جائز ہے۔

دلیل نمبر۔۱۱: کنزالعمال ج۔۳' ص۔۱۲۳ میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی رسول یہ فرماتے ہیں: من تمام الصلوة الصلوة في النعلين۔ یعنی "نماز کا پورا ہونا جوتیوں

کے ساتھ ہے۔" اس سے ظاہر ہوا کہ جوتیوں میں نماز ضروری ہے۔ یہ گیارہ دلائل نعلین کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں۔ رأیت احد عشر کوکبا۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

چنانچہ علامہ ابن القیم اپنی کتاب اغاثۃ اللہفان ج۱ میں فرماتے ہیں: ومما تطیب به قلوب الموسوسین۔ الصلوۃ فی النعال۔ وهی سنت رسول الله صلی الله علیه وسلم واصحابه فعلا منه وامرا۔ یعنی وہ چیز جس سے وسواسیوں کے دل خوش نہیں ہوتے جوتیوں میں نماز پڑھنا ہے جو نبی کریم ﷺ کی سنت قولی وفعلی ہے اور صحابہ کا تعامل ہے۔"

حافظ ابن حجر فتح الباری جزء۱ ص۳۲۶ میں ہے: فیکون استحباب ذالک حق من جهة قصد المخالفة المذکورة۔ یعنی "یہودیوں کی مخالفت کی نیت سے جوتیوں میں نماز پڑھنا مستحب ہے۔" اب مولویوں کو چاہئے کہ جوتیوں کی سنت کو زندہ کریں، تاکہ ایک شہید کا ثواب حاصل ہو اور پگڑی کی فضیلت سے باز آجائیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

یہ امر سب کو مسلم ہے کہ نماز میں خشوع ضروری بلکہ موجب فلاح ہے اور ننگے سر احرام اور نماز میں رہنا باعث خشوع وتواضع وانکساری ہے۔ اس لئے حالت احرام میں اس کو لازم کر دیا گیا ہے اور نماز میں سنت اور افضل ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ بادشاہ عالمگیر نے پانچ سو علماء کو جمع کر کے جو فتاویٰ عالمگیری مرتب کرایا اس میں یہ لکھا ہے: لا باس به اذا فعله تذللا وخشوعا بل هو حسن کذا فی الذخیرة یعنی "جب تواضع اور خشوع کے طور ننگے سر نماز پڑھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ یہ اچھا کام ہے۔" لیکن افسوس ہے کہ مولوی عبدالقدوس صاحب اس کو مغلی طرز عمل کا تقویت دہندہ بتا رہے ہیں۔

بنے کیوں کر کہ ہے سب کام الٹا
بات الٹی کام الٹا یار الٹا

بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ کیا ایک ہی کپڑے میں نماز درست ہے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا سب لوگ دو کپڑے حاصل کر سکتے ہیں؟ پھر اس شخص نے اس کو سمجھنے کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو سمجھایا اور یہ بتایا کہ اگر اللہ تعالیٰ تم کو مالی وسعت دے تو تم بھی لباس میں فراخی کرو کہ دو، دو کپڑوں کا سامان کر

لو۔ کوئی تہبند اور چادر بنا لو' اس میں نماز پڑھو۔ کوئی تہبند اور قمیص میں نماز پڑھے۔ کوئی تہبند اور قبا پہن کر اس میں نماز ادا کرے۔ کوئی چادر اور شلوار بنا کر پڑھ لے۔ کوئی شلوار اور قمیص میں ادا کر لے۔ کوئی شلوار اور قبا میں پڑھ لے۔ کوئی جانگیا اور قبا میں نماز پڑھ لیا کرے۔ کوئی جانگیا اور قمیص میں پڑھ سکتا ہے۔ کوئی کچھا اور چادر بنا لے تو اس میں نماز پڑھ لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سائل کی تفہیم کر دی کہ اگر اللہ تعالیٰ تم کو مالی فراخی دے تو دو' دو کپڑوں میں نماز پڑھ لیا کرو۔ پھر جب رواج اہل عرب جس جس قسم کے کپڑے لوگ پہنتے تھے ان کے نام لے کر سائل کو بتا دیئے کہ اس نوعیت کے دو کپڑوں میں نماز پڑھنی روا ہے۔

اسی حدیث امام بخاری علیہ رحمۃ الباری نے اپنے باب کا مسئلہ ثابت کر دیا کہ قمیص' جانگیا اور قبا وغیرہ میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وسعت کے دور میں بھی صرف دو کپڑوں کا ذکر کیا' پگڑی یا ٹوپی کا نام تک نہیں لیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ پگڑی' رومال وغیرہ اصل لباس سے زائد ہے' مقصود بالذات نہیں ہے۔ پگڑی کو تو کسی خاص موقعہ پر پہنتے تھے' عام عادت نہ تھی۔ اس لئے پگڑی کا ذکر پانچ وقت کی نمازوں میں نہیں ملتا۔ صرف جمعہ اور عید میں ملتا ہے' کہ زینت زائدہ ہے جیسے قمیص پر اچکن' قبا یا واسکٹ پہننا یا رومال رکھنا وغیرہ ہیں۔ پگڑی پہننا مامور بہ نہیں ہے۔ اگر عام لوگوں کے لباس میں ذکر آیا ہے تو وہ زینت زائدہ ہے' نماز میں اس کا ہونا نہیں پایا گیا۔ اس لئے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فالصلوۃ فی الثوبین افضل۔ (مشکوۃ) یعنی "دو کپڑوں میں نماز افضل ہے۔" ہم لوگ جو عموماً ننگے سر نماز پڑھتے ہیں' حسب الحکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین کے دو کپڑے پہنا کرتے ہیں۔ کبھی ایک قمیص اور تہبند' کبھی ایک چادر اوڑھنے کی اور دوسرا تہبند ہوتا ہے۔ اس پر بھی بعض عوام کالانعام اعتراض کرتے ہیں' جن کی ہم پرواہ نہیں کرتے اور اس حدیث پر عمل رکھتے ہیں: اذا صلی احدکم فلیلبس ثوبیہ۔ "پگڑی میں نماز پڑھنے کا حکم یا ننگے سر نماز پڑھنے کی ممانعت کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ ہاں یہ حدیث آئی ہے کہ کوئی عورت بغیر خمار کے ننگے سر نماز نہ پڑھے اور یہ بھی حکم آیا ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر کوئی چیز نہ ہو' اور یہ بھی ممانعت آئی ہے کہ ایسے لحاف میں نماز نہ پڑھے جس کو بطور توشح بدن پر لپیٹا نہ جا سکے اور یہ بھی آیا ہے کہ

صرف اکیلی شلوار میں نماز نہ پڑھے کیونکہ اس صورت میں کندھے ننگے رہتے ہیں۔ بہرکیف کسی حدیث میں مخالفت نہیں آئی کہ ننگے سر نماز نہ پڑھو۔ پس جو شخص ننگے سر نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے وہ دین الٰہی میں تنگی پھیلا کر خود شرع بناتا ہے۔

پگڑی پہننے کی کوئی فضیلت نہیں آئی: کسی حدیث صحیح یا حسن معمولی ضعیف میں پگڑی پہن کر نماز پڑھنے کی کوئی تاکید نہیں آئی۔ جو روایتیں بعض نیم عالم پیش کرتے ہیں' وہ موضوع یعنی بناوٹی ہیں یا ایسی ضعیف ہیں جن سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ مجمع الزوائد کتاب الجمعہ میں یہ روایت ہے کہ دن جمعہ کے پگڑیوں والے لوگوں پر فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرماتا ہے۔ چنانچہ مولوی عبداللہ نے اس روایت پر یہ عنوان قائم کیا ہے "پگڑی سے نماز پڑھنے کا ثواب" عوام یہ پڑھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب نے یوم الجمعہ کا ترجمہ آڑا دیا اور مطلق لکھ دیا کہ پگڑیوں سے نماز پڑھنے والوں کے لئے یہ ثواب ہے' حالانکہ یہ فضیلت یوم جمعہ کی قید سے مقید ہے اس کے بغیر نہیں کہ قاعدہ مشہور ہے: اذا زال القید زال المقید "کہ قید دور ہونے سے مقید دور ہو جاتا ہے"

دوم جس مجمع الزوائد سے یہ روایت نقل کی ہے اس میں روایت کے آخر میں یہ لکھا ہے: وفیه ایوب بن مدرک قال ابن معین انه کذاب۔ "کہ اس روایت کی اسناد میں ایک راوی ایوب بن مدرک ہے جس کو امام یحییٰ بن معینؒ رئیس المحدثین نے کذاب یعنی بہت جھوٹ بولنے والا کہا ہے۔" اور تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ امام یحییٰؒ نے اس کو جھوٹا کہا ہے اور دار قطنی نے متروک کر دیا ہے اور ابن حبان نے کہا کہ اس نے مکحول سے ایک موضوع روایات کا ایک نسخہ روایت کیا ہے۔ حالانکہ مکحول سے اس کی کوئی روایت نہیں ہے۔ پس اس جرح سے ظاہر ہوا کہ پگڑی کے ثواب والی روایت جھوٹی ہے' جس کو جھوٹے لوگ ہی قبول کر سکتے ہیں' ہمارے لئے حجت نہیں ہے۔

اسی طرح دیگر روایتوں کو قیاس کر لیں۔ مولوی عبدالقدوس نے امام حسن بصری سے یہ نقل کیا ہے کہ صحابہ پگڑیوں کے پیچ پر سجدہ کرتے تھے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان کے سروں پر پگڑیاں ہوتی تھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت سے یہ لازم نہیں آتا کہ سروں پر پگڑیاں تھیں' کیونکہ زمین گرم ہونے کی وجہ سے پگڑیاں سجدوں کی جگہ پر رکھ کر

ان کے پیچوں پر سجدہ ہو سکتا ہے۔ اگر پگڑی سر پر ہو اور پیشانی پر پگڑی آجائے تو اس حالت میں سجدہ کرنا منع ہے۔

بلوغ الامانی شرح مسند احمد ج۔۳' ص۔۲۹۰ میں ہے کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: شكونا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم حر الرمضاء الى جباهنا واكفنا فلم يشكنا۔ (رواه البيهقي واسناده جيد) یعنی "ہم (صحابہ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ شکایت پیش کی کہ گرمی کی وجہ سے تپتی ہوئی زمین پر سجدہ کرنا دشوار ہے۔ پیشانیاں' ہتھیلیاں رکھنی مشکل ہو جاتی ہیں' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری شکایت خارج کر دی۔"

امام ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں ایک عنوان یوں منعقد کیا ہے: من كره السجود على كور عمامته۔ یعنی "ان لوگوں کا ذکر جو پگڑیوں کے پیچ پر سجدہ کرنا برا سمجھتے ہیں۔" پھر دلائل ذکر کیے ہیں' جن میں ایک یہ حدیث ہے کہ عیاض بن عبداللہ قرشی نے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ پگڑی کے پیچ پر سجدہ کر رہا ہے' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ہاتھ کا اشارہ کیا کہ پگڑی کو پیشانی سے ہٹا لو۔ پھر معاذ رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ جب کوئی نماز پڑھے تو پگڑی کو پیشانی سے ہٹا لے۔ ہم پگڑی سے نماز پڑھنے کے جواز کے قائل ہیں' لیکن اس کے ضروری ہونے اور اس کے اس طرح افضل ہونے کے قائل نہیں ہیں کہ اگر ننگے سر نماز پڑھے تو اصل نماز کا ثواب کم ہو جاتا ہے' کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے ننگے سر نماز اکثر پڑھی ہے۔ ہاں جوتا پہن کر نماز پڑھنا سنت اور افضل ہے' کیونکہ اس کا ثبوت بہ نسبت پگڑی کے زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔ مصلحت پرست علماء اور نام کے اہل سنت اس سنت کے تارک اور پگڑیوں کے عادی ہیں' حالانکہ ہمیشہ ننگے پاؤں نماز پڑھنا خصلت یہود ہے۔

جوتا اور پگڑی کا مقابلہ: جوتا اور پگڑی کا مقابلہ اگر دلائل شرعی سے کیا جائے تو اس موازنہ میں جوتا کا پلڑا بھاری ہے۔ کیونکہ تفسیر ابن کثیر' فتح قدیر' فتح البیان وغیرہ میں بعض روایات ایسی ملتی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ آیت "خذوا زينتكم" جوتیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان روایتوں کو نقل کر کے بحث کرنے سے طوالت مضمون مانع ہے' اگر ان کو ضعیف تسلیم کیا جائے تو دیگر احادیث صحاح وغیر صحاح کی ان کی مؤید ہیں۔ پگڑی کے بارے میں کوئی قولی حدیث وارد نہیں' جس میں یہ حکم دیا گیا ہو کہ تم پگڑی کے ساتھ نماز ادا کیا کرو

اور نہ کوئی فعلی حدیث آئی ہے کہ آنحضرت ﷺ پگڑی پہن کر نماز پڑھا کرتے تھے بلکہ ایک کپڑا میں ننگے سر نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے' کما تقدم۔ لیکن جوتا کے بارہ میں احادیث قولیہ وفعلیہ وارد ہیں' جن سے جوتا میں نماز پڑھنا مسنون اور افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ مختصر دلائل حسب ذیل ہیں۔

دلیل اول: عن شداد بن اوس رضی اللہ تعالی عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالفوا الیھود فانھم لا یصلون فی نعالھم ولا خفافھم۔ (رواہ ابوداؤد) یعنی "شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم مسلمان یہود کی مخالفت کرو (جوتیوں میں نماز پڑھو) کیونکہ وہ جوتیوں اور موزوں میں نمازیں نہیں پڑھتے۔" اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جو درج ذیل ہے۔

دلیل دوم: شامی ص ۲۸۲ باب ما یفسد الصلوۃ میں ہے: فی الحدیث صلوا فی نعالکم ولا تشبھوا بالیھود والنصاری۔ (رواہ الطبرانی) یعنی "نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم اپنی جوتیوں میں نماز پڑھو اور یہود ونصاریٰ کی مشابہت نہ کرو۔ (کیونکہ وہ ننگے پاؤں نماز پڑھتے ہیں۔) ان دلیلوں سے ثابت ہوا کہ جو لوگ ہمیشہ ننگے پاؤں نماز پڑھتے ہیں وہ مشابہ یہود ہیں۔ مولوی عبدالقدوس صاحب ننگے سر نماز پڑھنے والوں کو مغربی لوگوں سے مشابہت دیتے تھے۔ صرف اپنے خیال سے اور ہم نے احادیث سے ثابت کر دیا کہ ننگے پاؤں نماز پڑھنے سے یہود کے مشابہ ہو گئے۔ اب ان کو حدیث "من تشبہ بقوم فھو منھم" کی بار بار تلاوت کرنی چاہئے اور یہ کہیں

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

دلیل سوم: ابوداؤد میں حدیث ہے جس کے آخر میں یہ حکم درج ہے کہ جب تم میں سے کوئی مسجد کی طرف آئے تو اپنی جوتیوں کو دیکھ لے' اگر ان میں نجاست گندگی لگی ہو تو ان کو زمین پر گھس دے۔ "ولیصل فیھما" پس چاہیے کہ ان کو پہن کر نماز پڑھ لے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ پرانی جوتیوں میں نماز جائز ہے۔ اگر نجاست لگی ہو تو زمین پر ان کو رگڑ دے اور ان میں نماز پڑھ لے۔ یہ قولی حدیث اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ جوتیاں پہن کر نماز پڑھنی چاہئے۔ عوام کا یہ عذر اور حجت بازی بھی دفع ہوئی کہ ہم ہر وقت گلی بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ ہماری جوتیاں پاک نہیں رہتی ہیں۔ اس حدیث نے یہ بتا دیا

کہ ان جوتیوں کو زمین پر رگڑ دیا کرو وہ پاک ہو جائیں گی۔ چنانچہ ابوداؤد کی دوسری حدیث میں یہ ہے کہ فاذا اوطی احدکم بنعلیه الاذی فان التراب له طهور۔ یعنی "اگر تمہارا کوئی پلیدی پر چلے تو جوتیوں کو پاک کرنے والی مٹی ہے۔" (اس پر رگڑ دے) پس پلید جوتیوں کا عذر بھی رفع ہوا' اور جوتیوں میں نماز مشروع ثابت ہوئی۔ لیکن رواج پرست مصلحت پرست علماء اس حکم پر عمل نہیں کرتے اور پگڑیوں پر زور دیتے ہیں کہ ان کو اتار کر نہ پڑھو۔

دلیل چہارم: نیل الاوطار جزء ثانی ص۔۱۳۱ میں ہے: یستحب فی النعل الطاهر لقوله علیه السلام صلوا فی نعالکم۔ یعنی "پاک جوتا میں نماز پڑھنا مستحب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ تم اپنی جوتیوں میں نماز پڑھو۔" جناب نواب صدیق حسن خاں مرحوم دلیل الطالب میں جوتیوں میں نماز پڑھنے کی سنت ثابت کرتے ہوئے ص۔۸۶ میں فرماتے ہیں: "در حدیث ابن عمر رضی الله تعالی عنه آمده قال رسول الله صلی الله علیه وسلم تعاهدوا نعالکم عند ابواب المساجد۔ اخرجه دار قطنی فی الافراد والخطیب فی التاریخ یعنی "تم اپنی جوتیوں کو مسجدوں کے دروازے پر پہنچ کر دیکھ بھال کر لیا کرو کہ اگر پلیدی ہو تو مٹی سے صاف کر لیا کرو۔"

جیسے دلیل نمبر۔۳ میں گزرا کہ مسجد کو آؤ تو جوتیوں پر نظر کرو' اگر نجاست لگی ہو تو زمین پر رگڑ دو اور ان میں نماز پڑھ لو۔ اسی طرح طحاوی ج۔۱' ص۔۲۹۳ میں ہے: اذا اتی احدکم المسجد فلینظر فی نعلیه فان کان فیهما اذی او قذرا فلیمسحها ثم لیصل فیهما۔ مطلب اس کا وہی ہے جو دلیل نمبر۔۳ میں گذر چکا ہے۔

یہ چار پانچ احادیث ہیں جو مختصر طور پر اس بات کا حکم کر رہی ہیں کہ جوتیوں کو پاک صاف کر کے نماز پڑھ لو۔ پگڑی کے بارہ میں کوئی قولی حدیث وارد نہیں ہوئی کہ تم پگڑی باندھ کر اور سر پر رکھ کر نماز پڑھو۔ پس پگڑیوں کا اہتمام کرنا اور جوتیاں اتار کر نماز پڑھنا قومی رسم ہے۔

عبدالقادر عارف الحصاری

الارشاد جدید جلد۔۱۷' شمارہ۔۵' ۶' ۳' ۴ بابت ماہ مارچ و جولائی سنہ ۱۹۶۹ء

تعاقب بر فتویٰ فاضل روپڑی

جوتا پہن کر نماز پڑھنا افضل ہے

لطیفہ : سنہ ۱۹۳۸ھ کا ذکر ہے کمترین موضع بہاں بالا ضلع منٹگمری (ساہیوال) میں مقیم تھا' وہاں ایک نامی ذیلدار موحد شخص کی وساطت سے توحید و سنت کی تبلیغ شروع کی۔ شرک و بدعت اس علاقہ میں بہت ہے' جب توحید سنت کی تبلیغ ہوئی اور سنن نبویہ کی ترویج کی گئی تو اس گاؤں کے امیر امراء بالخصوص اور ان کے ماتحتی میں کام کرنے والے جہلا اکثر مخالف ہو گئے۔ ان دنوں میں مولوی ابراہیم صاحب جیودی کمترین کے پاس پڑھتا تھا جو مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم کا بیعت شدہ تھا۔ مولوی ابراہیم صاحب نے تین آمین بالجہر' جوتا سے نماز پڑھنا وغیرہ سنن مردہ کو زندہ کرنا شروع کیا تو گاؤں میں مزید شور برپا ہوا۔ کمترین نے ایک جلسہ اسلامیہ کرنے کی تجویز پیش کی' جس کو میرے زیر اثر جماعت نے عموماً اور جناب ذیلدار صاحب نے خصوصاً منظور کیا۔ مختصر قصہ یہ ہے کہ جلسہ ہوا' جماعت اہل حدیث پنجاب کے اکابر علماء تشریف لائے جن کو کمترین نے مدعو کیا تھا۔ مولانا حافظ عبداللہ صاحب فاضل روپڑی' مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی' مولانا محمد یوسف صاحب دیا نگری' امیر سید محمد شریف صاحب گھڑیالوی خاص قابل ذکر ہیں۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد گاؤں کے سرکردہ لوگوں نے ایک اجلاس خاص منعقد کیا جس میں مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی تجویز پاس ہوئی۔ مجلس میں مندرجہ بالا بزرگان شریک تھے' مخالفین سنت نے میری شکایت کی کہ ہمارے گاؤں میں جو مولوی ضلع حصار کا تبلیغ اسلام کر رہا ہے' وہ دن بدن نئے مسئلے نکال کر لوگوں میں فساد برپا کر دیتا ہے' آپ علماء کرام اس کو ذرا تنبیہہ کریں۔ چنانچہ کمترین کو بلایا گیا' دریافت حال کے بعد تین آمین' اور جوتا سے نماز پڑھنے کا مسئلہ پیش ہوا۔ کمترین سے استفسار ہوا تو کہا گیا کہ یہ امر سنت ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ مسائل تو مولوی عبدالوہاب صاحب دہلوی کے ہیں' کہیں آپ ان کی جماعت کے فرد تو نہیں ہیں؟ میں نے کہا کہ میں خود تو اس جماعت میں شامل نہیں ہوا بلکہ مولوی عبدالوہاب کو دیکھا بھی نہیں ہے لیکن ان کی جماعت کا ایک شخص یہاں میرے پاس رہائش

پذیر ہے' وہ ان سنتوں پر عمل درآمد کرتا ہے' لوگ اس پر مزاحم ہوتے ہیں۔ میں خود ان مسائل کی تصدیق کر چکا ہوں' کیونکہ یہ امور حدیث شریف سے ثابت شدہ ہیں۔

اس پر مولانا داؤد صاحب غزنوی بولے کہ جوتا سے نماز مسجد میں پڑھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے' ہاں البتہ صحرا میں جائز ہے۔ میں نے کہا کہ حدیث شریف سے مسجد میں ثابت ہے۔ مولانا موصوف نے کہا کہ ثبوت دکھاؤ؟ میں نے کہا بہت اچھا۔ اس پر حافظ عبداللہ صاحب فاضل روپڑی نے فرمایا کہ مسئلہ کی حیثیت سے بحث نہ کرو' جوتا سے نماز پڑھنا تو بیشک جائز ہے مسجد ہو یا جنگل لیکن بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی نزاکت پر خیال کر کے مصلحت کے طور پر ایسے امر شرعی پر عمل درآمد کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس پر کعبہ کے دو دروازے بنانے کے متعلق جو حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے' وہ پیش کی گئی۔ میں نے کہا کہ جی یہ تو جدا بات ہے' مسئلہ کی حیثیت سے یہاں جھگڑا ہو رہا ہے کہ ہم تو سنت کہتے ہیں اور لوگ اس کو برا کام کہتے ہیں۔ سب علماء نے تصدیق کیا کہ اگر جوتا پاک ہو تو نماز جائز ہے پھر کہا گیا کہ جیسے چلتے پھرتے ہیں ویسے ہی آکر مولوی ابراہیم صاحب نماز پڑھ لیتے ہیں جس سے مسجد کی دریاں خراب ہوتی ہیں۔ ان علماء نے کہا کہ یہ اچھا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں جناب وہ مسجد میں آتے وقت جوتی دیکھتے ہیں' اگر کچھ آلائش ہو تو بحکم حدیث اس کو صاف کر کے پھر مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔

علماء نے متفقہ فیصلہ یہ دیا کہ بندش فتنہ کے لیے یہ کام بند کر دیں۔ اس پر انجمن اصلاح المسلمین منعقد ہو گئی۔ مولوی ابراہیم صاحب قانلاکو چلے گئے' کمترین ضلع حصار کو چلا گیا۔ جب ایک ماہ کے بعد واپس آیا تو پھر تبلیغ کی گئی اور انجمن اصلاح المسلمین کے اراکین کو بیدار کیا گیا کہ آپ حسب منشا مسلمانوں کی اصلاح کرو لیکن اس سنت کی مخالفت کی وجہ سے ایسی شامت اعمال وارد ہوئی کہ وہ انجمن حرف غلط کی طرح مٹ گئی۔

الغرض زمانہ موجودہ کے علماء زمانہ کی ہوا سے ایسے متاثر ہوئے ہیں کہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر فوراً احکام شرعیہ میں مداخلت شروع کر دیتے ہیں۔ اب دیکھئے ایک مشہور خاندان کے بزرگ نے مسجد میں جوتا کے ساتھ نماز پڑھنے سے صاف انکار کر دیا اور بعض نے مصلحت کی وجہ سے اس سنت کو مسترد کر دیا۔ بس اس وجہ سے یہ سنت اب بدعت سے بھی بدتر اور مباح سے نکل کر حرام کے درجہ کو پہنچ گئی ہے' اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شارع کے حکم کا جو ظرف مکان عام ہو اس کو خاص کر لیا جائے جو خاص ہو اس کو عام کر دیا جائے' جیسے مسائل مذکورہ میں گذرے پس یہ مداخلت فی الدین ہے۔ حکم شارع کے خلاف ظرف زمان میں مداخلت کی مثل یہ ہے کہ جمعرات یا تیجا' ساتا' چہلم کو ایصال ثواب الی الاموات کیا جائے یا جمعہ کے دن روزہ رکھ لیا جائے یا جمعرات کا قیام خاص کیا جائے یا یہ کہا جائے کہ جوتا سے نماز پڑھنا عید کے دن تو جائز ہے یا جنازہ کے وقت جائز ہے یا جس وقت جوتا نیا سلائے اس وقت جائز ہے تاکہ اس جوتا کا شکریہ ادا ہو جائے تو یہ سب صورتیں حکم شارع کے ظرف زمان میں مداخلت ہے' کیونکہ حکم شارع کا مطلق ہے' اب اس کو محض اپنی رائے سے مقید کیا جا رہا ہے۔ کوئی نص شرعی اس تخصیص اور تقیید پر وارد نہیں ہے۔

بگفتہ ندارد کے باتو کار
ولیکن چوں گفتی دلیلش بیار

چہارم صورت حکم شریعت میں ناجائز تصرف کرنے کی یہ ہے کہ حکم شرعی کے کرنے پر جو جزا وسزا مرتب ہو اس کو بدل دینا مثلاً مردہ سنت کے زندہ کرنے پر سو شہید کا ثواب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت ورفاقت جنت میں حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے : مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ یعنی "جس نے میری سنت کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے مجھے دوست رکھا وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا"

یاد رکھنا چاہیے کہ سنت کو دوست رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو دل سے اور زبان سے دوست رکھتا رہے اور عمل نہ کرے' دوست رکھنے کا معنی یہ ہے کہ اس پر عمل کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : من اکل طیبا وعمل فی سنۃ وامن الناس بوائقہ دخل الجنۃ یعنی "جو شخص حلال مال کھائے اور سنت کے مطابق عمل کرتا رہے اور لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھے تو وہ جنت میں داخل ہو گا"

پس جو لوگ سنت پر عمل کرنے کے بغیر محبت رسول اور دخول جنت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : من رغب عن سنتی فلیس منی۔ یعنی "جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میری امت سے نہیں ہے" الغرض سنت پر

عمل کرنے سے ثواب حاصل ہے' اب جو شخص یہ کہے کہ اس سنت پر عمل نہ کرو ورنہ فساد ہو گا اور لوگوں میں مخالفت پھیل جائے گی' یہ موجب گناہ نہیں۔ لہٰذا اس سنت پر عمل کرنا گناہ ہے تو کہا جائے گا کہ اس شخص نے حکم شرع جزا و سزا کو بدل دیا' سو یہی مداخلت ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ ان چار صورتوں سے حکم شرعی کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے جس سے مداخلت فی الدین لازم آتی ہے کیونکہ یہ مصلحت نہیں ہے بلکہ تغیر حکم شارع کا ہے' ایسے لوگوں کے حق میں رسول اللہ ﷺ بروز حشر فرمائیں گے: فَسُحْقًا فَسُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ او کما قال یعنی پھٹکار ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے میرے پیچھے دین میں تغیر کیا تھا۔ امام زہری نے اپنے سے پہلے تمام علماء صحابہ کرام وغیرہ سے یہ قول نقل کیا ہے: الاعتصام بالسنة نجاة۔ یعنی "سنت کو مضبوط پکڑنے ہی میں نجات ہے۔" اور عبداللہ بن دینار کا ارشاد ہے کہ اول ترک سنت سے ہی دین کا جانا شروع ہو گا یہی وجہ ہے کہ اول اول تو سنت ترک کی جاتی ہے پھر جب عام عادت ترک کی ہو جاتی ہے تو اس کو کالعدم سمجھ لیا جاتا ہے پھر کوئی شخص اس پر عمل کرے تو اس کو برا جاننے لگ جاتے ہیں۔ بس دین چلا جاتا ہے کیونکہ امر مسنون کو برا جاننا اور اس کو ہوتے ہوئے دیکھ کر ناراض ہونا یہ کفر ہے جس پر بسیار آیات اور احادیث دلیل ہیں' بوجہ اختصار صرف چند دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان پر بنظر انصاف غور فرما کر کبھی سنت سے انکار نہ کریں۔

قرآن مجید میں ہے: فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ یعنی "اے نبی تیرے رب کی قسم جب تک یہ لوگ تجھے ہر امر متنازع میں اپنا حاکم فیصلہ کن نہ بنا لیں اور پھر تیرا فیصلہ ظاہر و باطن میں برضا و خوشی منظور نہ کر لیں تب تک یہ ایماندار نہیں ہو سکتے۔"

اس آیت کی تشریح تفسیر کبیر میں یوں ہے: اعلم ان قوله تعالى فلا وربک لا یؤمنون قسم من الله تعالى على انهم لا یصیرون موصوفین بصفة الایمان الا عند الشرائط اولها قوله تعالى حتى یحکموک فیما شجر بینهم وهذا یدل على ان من لم یرض بحکم الرسول صلى الله علیه وسلم لا یکون مؤمنا الشرط الثانی قوله ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت قال الزجاج لا

تضیق صدورھم من قضیتک واعلم ان الراضی بحکم الرسول صلی اللہ علیہ وسلم قد یکون راضیا بہ فی الظاھر دون القلب فبین فی ھذہ الایۃ انہ لا بد من حصول الرضا فی القلب والشرط الثالث قولہ ویسلموا تسلیما واعلم ان من عرف بقلبہ کون ذلک الحکم حقا وصدقا قد یتمرد عن قبولہ علی سبیل العناد او یتوقف فی ذلک القبول فبین تعالی ان کما لا بد فی الایمان من حصول ذلک الیقین فی القلب فلا بد ایضا من التسلیم معہ فی الظاھر فقولہ ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت المراد بہ الانقیاد فی الباطن وقولہ یسلموا تسلیما المراد منہ الانقیاد فی الظاھر واللہ اعلم انتھی۔

یعنی امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فلا وربک لا یؤمنون فرمانا یہ اس کی اس بات پر قسم ہے کہ یہ لوگ بغیر ان تین شرطوں کے ایمان کی صفت سے موصوف نہیں ہو سکتے۔

اول یہ کہ حتی یحکموک فیما شجر بینھم یہ دلالت کرتی ہے اس امر پر کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کے حکم پر راضی نہ ہوں تب تک مومن نہ ہوں گے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت جس کے بارہ میں زجاج نے کہا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ سن کر دل تنگ نہ ہوں کیونکہ بعض وقت انسان رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر ظاہر میں تو راضی ہو جاتا ہے لیکن دل میں ناراضگی رکھتا ہے' اس آیت میں واضح کر دیا کہ دل وجان سے حکم رسول پر راضی ہونا شرط ہے۔

تیسری شرط یہ کہ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا بعض لوگ دل سے تو اس حکم کا حق اور سچ ہونا مان لیتے ہیں لیکن عناد کی وجہ سے سرکشی کرتے ہیں اور اس کو قبول نہیں کرتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ جیسے ایمان کے لیے دل میں اس فیصلہ کا یقین حاصل ہونا شرط ہے' اسی طرح ظاہر میں تسلیم کرنے سے چارہ نہیں ہے۔ پس قول الٰہی ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ سے باطن میں انقیاد مراد ہے اور يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا سے ظاہر میں فرماں بردار ہو جانا مراد ہے۔

اب جو لوگ جوتا سے نماز پڑھنے پر ناراض ہوتے ہیں' ان کا ایمان چلا جاتا ہے کیونکہ ایمان کی شرط فوت ہو گئی۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ اس آیت کے شان نزول میں

دو قصے مروی ہیں۔ ایک سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ والا' جنہوں نے ایک مسلمان کہلانے والے کو اس بنا پر قتل کر دیا تھا کہ وہ فیصلہ رسول پر راضی نہ ہوا تھا اور دوسرا سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کا ہے جو پانی کے متعلق ایک انصاری سے ہوا۔ فیصلہ نبوی زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں ہو جانے پر انصاری نے ناراضگی کا اظہار کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص فیصلہ نبوی منظور نہ کرے وہ مومن ہونے کا حق دار نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ جملہ امور دینی میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی افضل المرسلین کو اپنا حاکم بنانا ضروری ہے اور حاکم بنا لینے کے بعد آپ کا ہر ہر حکم ہر ہر فیصلہ' ہر ہر سنت' ہر ہر حدیث کو ظاہر و باطن میں حق صریح جاننا لابدی ہے' قول و فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کشادہ دلی خندہ پیشانی سے یقین کلی کے بعد عمل میں لانا واجب ہے۔ دیگر یہ کہ قرآن میں ہے: ذلک بانھم کرھوا ما انزل اللّٰہ فاحبط اعمالھم یعنی یہ بہ سبب اس بات کے کہ کافروں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکموں کو مکروہ سمجھا' پس اللہ تعالیٰ نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو لوگ کہتے ہیں اٰمنا باللّٰہ وبالرسول واطعنا یعنی ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور اطاعت کریں گے پھر جب حکم اللہ کا یا رسول اللہ کا پیش کیا جائے تو ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ یعنی پھر ایک فریق ان میں سے اعراض کر جاتا ہے۔ سو ان کے حق میں فرمایا: وَمَآ اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ یعنی وہ لوگ مومن نہیں ہیں۔

پس ان دلائل سے واضح اور صاف روشن ہو گیا کہ کلمہ گو مسلمان جب تک ہر حکم شارع کا ظاہراً و باطناً تسلیم نہ کریں گے وہ مومن نہیں ہوں گے' خواہ وہ آمین کا مسئلہ ہو یا رفع الیدین کا' سر کھلے نماز پڑھنے کا مسئلہ ہو یا جوتا پہن کر نماز پڑھنے کا سب برابر ہیں کیونکہ یہ سب حکم شارع کے ہیں' خواہ استحباب کے درجہ میں ہوں یا اباحت میں' ان کا ماننا ضروری ہے۔ جو شخص ان کو مکروہ سمجھ کر عمل نہیں کرتا یا عمل کرنے والے پر ناراض ہوتا ہے تو وہ مومن نہیں ہے کافر یا منافق ہے۔

فقہائے کرام نے بھی یہی تصریح کی ہے' چنانچہ بحر الرائق میں ہے: من لم یرض بسنۃ من سنن المرسلین فقد کفر یعنی جس شخص نے انبیاء علیہم السلام کی سنتوں میں سے کسی سنت کو ناپسند کیا تو وہ کافر ہوا۔ نیز بحر الرائق میں ہے: یکفر باستخفافہ سنۃ من السنن

یعنی جو شخص امور مسنونہ میں سے کسی سنت کو ہلکا جانے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔

فتح القدیر میں رئیس الاحناف ابن ہمام فرماتے ہیں : ھذا فعل النبی وانا لا افعله فحتیئذ یکفر یعنی جو شخص یہ کہے کہ یہ کام نبی اکرم ﷺ نے تو کیا ہے لیکن میں تو نہ کروں گا پس وہ اسی وقت کافر ہو جاتا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری جو پانچ سو علماء احناف کا مرتبہ ہے' اس میں یہ مرقوم ہے : یکفر بتحسین امر الکفار اتفاقا یعنی کفار کے کام کو اچھا کہنے سے تمام علماء دین کے نزدیک کافر ہو جاتا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ جوتا اور موزہ سے نماز پڑھنے کو اچھا نہ جاننا اور نہ ہی ان میں نماز پڑھنا یہود کی خصلت ہے' کما تقدم۔

اب جو شخص مسلمان کہلا کر یہی خصلت اختیار کرے گا استخفافا لسنۃ الرسول تو وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ اس نے سنت نبوی کو سبک جان کر سنت یہود کی تحسین کی ہے۔ ہاں اگر سنت کو ہلکا نہ جانے اور نہ ہی عمل کرنے والے پر اعتراض کرے بلکہ کبھی کبھی آپ بھی عمل کرے تو وہ کافر نہ ہو گا۔ ہاں جو شخص سنت نبوی کو ہلکا جان کر ہمیشہ ترک کر دے اور اس پر عمل کرنے کو بے فائدہ سمجھے تو وہ کافر ہے۔

چنانچہ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں : وقال ابن الھمام وقد کفر الحنفیۃ من واظب علی ترک سنۃ استخفافا بھا بسبب انھا انما فعلھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلا فائدۃ استقبحھا من اخر من جعل بعض العمامۃ تحت حلقہ او احفاء شارب قلت وقد روی ان ابا یوسف ذکر انہ علیہ السلام کان یحب الدباء فقال رجل انا لا احبھا فحکم بارتدادہ انتھی۔ یعنی کہا ابن ہمام نے کہ بیشک کافر کہا ہے حنفیہ نے اس شخص کو جس نے سنت کو ہلکی جان کر ہمیشہ ترک کر دیا ہے بہ سبب اس بات کے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بے فائدہ کیا تھا یا کسی دوسرے شخص کو سنت ادا کرتے دیکھ کر بری جانے۔ جیسے پگڑی کا ایک حصہ حلق کے نیچے کر لینا یا مونچھوں کو پست کرنا ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ تحقیق امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ انہوں نے کدو کا ذکر کیا کہ رسول اللہ ﷺ کدو کو دوست رکھتے تھے یعنی خوب خواہش سے کھاتے تھے' اس پر ایک شخص نے کہا کہ میں تو کدو کو دوست نہیں رکھتا' ابو یوسف قاضی نے حکم دیا یہ شخص مرتد ہو گیا ہے۔

اللہ اکبر یہ محبت تھی سابقہ علماء کو سنت کی اور قدر رسول اللہ ﷺ کے مرتبہ کی کہ ذرا سی سنت پر ناخوشی ظاہر کرنے پر فتویٰ ارتداد جاری کر دیا کرتے تھے۔ آج بڑے بڑے مدارس حنفیہ اور مساجد حنفیہ میں حنفی مذہب کے مقتدر علماء اور مفتیان موجود ہیں' وہ کسی کلمہ گو کو خواہ وہ کسی کفر و شرک میں مبتلا ہو یا کسی سنت کی توہین کرنے والا ہو کافر یا مرتد کہنے پر تیار نہیں ہیں بلکہ جو شخص ایسے شخص کو کافر کہے اس کو برا جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں ان کے پاس تو کفر کی مشین ہے' سب کلمہ گو لوگوں کو کفر کی گولیاں مار کر اسلام سے خارج کر رہے ہیں' جس سے دین اسلام کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے' نعوذ باللہ من ذلک۔ نام نہاد فقہاء اور زمانہ پرست علماء نے کون سا دائرہ اسلام کا تجویز کیا ہے جس میں تمام انواع کے مشرکین اور کافرین اور منافقین کو داخل ہونے کی گنجائش ہے ؎

جو کہتا ہو سو کہو لیکن سمجھ کر مرد نعمانی

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

بعض لوگ ایسی سنتوں سے انکار تو نہیں کرتے لیکن کرنے والوں پر ہنسی مذاق اڑاتے ہیں' سو یہ بھی کفر ہے۔ شرح فقہ اکبر میں ہے : والاستھزاء بحکم من احکام الشرع کفر یعنی شریعت کے حکموں میں سے کسی حکم کو ٹھٹھا کرنا کفر ہے۔

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ جوتا سے نماز پڑھنا اکثر علماء اسلام کے نزدیک سنت استحبابی ہے اور بعض کے نزدیک امور مباح شرعیہ سے ہے پس جو شخص اس سے انکار کرے گا یا اس کے فاعل پر استہزاء کرے گا اس کو استخفافاً ترک کرے گا وہ کافر ہے۔

ایک سوال جواب طلب : مقتعین صلوٰۃ فی النعال اور مجوزین بلا فضیلت علماء سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ مسجد کے اندر بوریا' دریاں صفیں ڈال کر نماز پڑھنا فرض ہے یا سنت؟ اگر فرض ہے تو نص قطعی پیش کریں۔ اگر سنت ہے تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل درآمد پیش کریں' نیز یہ بھی بیان کریں کہ مسجد کے فرش پر بغیر چٹائی وغیرہ کے نماز پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں صفیں اور چٹائیاں بچھا کر نماز پڑھنا افضل ہے؟ اگر شق اول ہے تو ثبوت درکار ہے' اگر شق دوئم ہے تو پھر جوتا سے نماز پڑھنے کو سنت قرار دے کر اس غیر سنت چیز کو جو رفع سنت ہے مسجد سے دور کرنے کا حکم صادر فرمائیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے : ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلھا من السنۃ فتمسک بسنۃ خیر

من احدثت بدعة یعنی کوئی قوم دین میں نیا امر پیدا نہیں کرتی لیکن اس کی مانند ایک سنت اٹھالی جاتی ہے' پس سنت کو مضبوط پکڑنا بدعت کے پیدا کرنے سے بہتر ہے۔

مخفی نہ رہے کہ بوریا اور کپڑے کے مصلی پر سوائے مسجد معروف کے گھر میں اور دوسری جگہ تو ثابت ہو جائے گا لیکن مسجدوں میں بطریق الآن جس کی وجہ سے جوتا وغیرہ سے نماز پڑھنے کے امور مسنونہ متروک ہو رہے ہیں دلائل شرعیہ سے ثابت کرنا مشکل ہے' من ادعی فعلیہ البیان بالبرھان۔

خلاصہ کلام یہ ہے: کہ حافظ صاحب فاضل روپڑی کی دونوں وجہ عدم فضیلت کی مخدوش ہیں' صحیح بات یہ ہے کہ جوتا سے نماز پڑھنا افضل بلکہ اس زمانہ میں اس پر عمل کرنا ضروری ہے' جو شخص عمل کرے گا اس کو سو شہید کا ثواب ملے گا اور جو شخص اعتراض کرے گا وہ فمن رغب عن سنتی فلیس منی کا مصداق ہو گا۔

مفتی روپڑی صاحب پر اظہار تعجب: جناب حافظ صاحب نے صفوں اور چٹائیوں پر جوتا سے نماز نہ پڑھنے کے لیے یہ دلیل پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اور سلف سے صفوں اور چٹائیوں پر جوتا کے ساتھ نماز پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ یہ دلیل حافظ صاحب کے علمی شان کے لحاظ سے موجب تعجب ہے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قولاً وفعلاً جوتا کے ساتھ نماز پڑھنا ثابت ہو چکا ہے تو پھر خصوصیت سے دلیل طلب کرنا بالکل غلط ہے۔ کل کو کوئی خفین پہن کر نماز پڑھنا چاہے گا یا جوربین پہن کر نماز پڑھے گا تو اس سے بھی آپ یہی مطالبہ کریں گے۔ یا سر پر پگڑی باندھ کر اور کرتا اور چادر پہن کر نماز پڑھنا چاہے گا تو اس سے بھی آپ یہی مطالبہ کر سکتے ہیں پھر سب کو خاص نص پیش کرنا مشکل ہو گا تو بس آپ کے لیے غیر افضل یا ناجائز ہونے کی دلیل کافی ہے تو اس سے بہتر یہی ہے کہ ہم پہلے ہی آپ سے یہ مطالبہ کریں کہ آپ مسجد میں بطریق معروف الآن صفیں اور دریاں بچھا کر نماز پڑھنا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت کریں' ودونہ خرط القتاد ؎

کہ مجتہد کی سب کشادہ ہیں راہیں
کریں دائرے قیاسات میں جو چاہیں

جوتا سے نماز پڑھنا افضل ہونا بنوع دیگر: اگر اس مسئلہ میں یہ اختلاف تسلیم کیا جائے کہ جوتا کے ساتھ نماز پڑھنا بعض علماء کے نزدیک مستحب ہے اور بعض کے نزدیک رخصت ہے تو بھی جوتا سے نماز پڑھنا دو وجہ سے افضل ہے۔ اول یہ کہ آج زمانہ حاضرہ میں اس شرعی مسئلہ کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ اس کو غیر مشروع جانتے ہیں اور پڑھنے والے سے مزاحم ہوتے ہیں حالانکہ یہ شرعاً جائز بلکہ مسنون ہے' کما مر۔

دوئم یہ کہ شارع نے لوگوں کی تسہیل و تیسیر مدنظر رکھتے ہوئے اس کی رخصت دی تھی اور موجودہ علماء نے شارع کے خلاف تعمق و تشدد شروع کر دیا ہے' وہ اس کو یا تو مکروہ کہتے ہیں یا غیر افضل کہہ کر اس کا انسداد کرتے ہیں اور فتوے بھی گاؤں کے نمبرداروں کو دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے گاؤں کی مسجدوں میں کسی کو اس سنت پر عمل نہ کرنے دیں حالانکہ یہ حکم اگر رخصت پر محمول سمجھا جائے تو بھی افضل ہے۔ دیکھئے روزہ رکھنا ثواب ہے لیکن سفر میں ترک کرنا رخصت ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: رخصة من الله فمن اخذ بها فحسن یعنی کسی نے دریافت کیا کہ میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں کیا یہ گناہ تو نہیں ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جو شخص اس کو قبول کرے وہ بہت اچھا ہے۔

اسی طرح سفر میں نماز کے اتمام سے قصر افضل ہے' حالانکہ اتمام سے عبادت کی زیادتی ہے جو موجب فضیلت ہے' نہ صرف شارع کی رخصت قبول کرنے پر قصر افضل ہوئی' اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا عام ارشاد ہے: ان الله تعالٰی یحب ان توتٰی رخصه کما یکره ان توتٰی معصیته یعنی اللہ تعالیٰ رخصت پر عمل کرنے کو ایسے ہی دوست رکھتا ہے جیسے اپنی نافرمانی کو مکروہ رکھتا ہے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ رخصتوں پر عمل کرنے کو اسی طرح دوست رکھتا ہے جس طرح عزیمت پر عمل کرنے کو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رخصت پر عمل کرنا بھی مستحب ہے' پس اس لحاظ سے بھی کہ لوگ اس رخصت شارع سے نفار ہیں جوتا سے نماز پڑھنا افضل ہے۔

اب ہم مولانا ابو القاسم صاحب سیف بنارسی کا فتویٰ نقل کر کے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ مولانا موصوف سے استفتاء ہوا کہ جوتا سے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ آپ جواب میں فرماتے ہیں کہ جوتا پہن کر نماز پڑھنا قرآن سے ثابت ہے۔ اللہ فرماتا ہے: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ

مسجد۔ اس آیت میں زینت سے مراد مفسرین نے نعلین لی ہے۔ نیز حدیث سے بھی ثابت ہے' رسول اللہ ﷺ و صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوتا پہن کر نماز پڑھتے جب مسجد کے قریب آتے تو جوتی کو مٹی میں خوب رگڑ لیتے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو آکر بتایا کہ آپ کے جوتے میں گندگی ہے چونکہ نماز میں جوتا کو رگڑ نہیں سکتے تھے' اس لیے آپ نے اتار کر رکھ دیا۔ لیکن جوتا سے نماز پڑھنا ان مساجد میں ہے جو بغیر فرش و چٹائی کے ہوں' ان میں دھوپ اور بارش کی کیچڑ کے بچاؤ کے لیے کوئی چھت یا شامیانہ نہ ہو جیسے عرب کی مسجدیں' ہندوستان کی مسجدوں میں ضرورت نہیں ہے۔ تاہم کوئی پاک صاف جوتا پہن کر نماز پڑھے تو اس کو منع نہیں کر سکتے۔ دیکھو مشکوۃ ص۔ ۷۳ انتہی بالفاظہ

مولانا کا فتویٰ شرعی دلیل کے لحاظ سے تو ہمارے موافق ہے کہ جوتا سے نماز پڑھنا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ مولانا کی ذاتی رائے ہے جو اہل الرائے کی رائے کی طرح مسترد کی جاتی ہے جس کی تفصیل اوپر ہو چکی ہے۔ مختصر یہ عرض ہے کہ مولانا سے چٹائی والی مسجدوں میں جوتا سے نماز نہ پڑھنے کی دلیل تخصیص مطلوب ہے' ودونہ خرط القتاد۔ نیز یہ سوال ہے کہ ہندوستان کی مسجدوں کو عرب کی مسجدوں کے خلاف بنانا جائز ہے یا نہیں؟

(نوٹ) اس مضمون کی صرف تین قسطیں دستیاب ہوئی ہیں' باقی سعی بسیار کے باوجود نہیں ملیں۔ (خلیل)

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث دہلی

جلد ۱۷' شمارہ ۱' ۳' ۱۲ ماہ محرم و ربیع الاول و ذوالحجہ سنہ ۵۳ھ

مسئلہ پردہ --- مرد عورت کے ستر کا اندازہ

نماز میں عورت کے سر اور مرد کے کندھے کا حکم

مکرم محترم جناب مولانا مفتی صاحب تنظیم اہلحدیث متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' مزاج شریف باشد۔

واضح ہو کہ آنجناب نے مورخہ یکم دسمبر سنہ [illegible] کے پرچہ تنظیم اہلحدیث جلد ۱۰ نمبر [illegible] صفحہ ۷ استفتا پر جوابات ارقام فرما کر آخر میں نوٹ دیا ہے کہ ستر مرد و عورت کے متعلق دیگر علماء کو اپنی اپنی تحقیق معرض قرطاس پر بیان کرنا چاہیے کہ مرد کے لیے نماز میں کندھے پر اور عورت کے لیے سر پر کپڑے کا حکم جو ضروری قرار دیا گیا ہے یہ بوجہ ستر میں داخل ہونے کے ہے یا بطور زینت ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق کمترین کی جو رائے ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔ درج فرما کر تنقید فرمائیں۔

نماز میں عورت اور مرد کے ستر میں تفاوت ہے۔ عورت کے لیے جو کچھ نماز سے باہر ڈھانکنا فرض ہے' وہی نماز کے اندر فرض ہے۔ چنانچہ معالم التنزیل ص ۷۵ جلد ۵ اور خازن میں ہے: فما كان من الزينة الظاهرة جاز للرجل الاجنبى النظر اليه اذا لم يخف فتنة وشهوة فان خاف شيئا منها غض البصر وانما رخص هذا القدر ان تبدو المرأة من بدنها لانه ليس بعورة وتومر بكشفه فى الصلوٰة وسائر بدنها عورة يلزمها ستره انتهى۔ یعنی جو زینت ظاہر ہے اگر فتنہ کا خوف نہ ہو تو اجنبی مرد کو نظر جائز ہے۔ اگر اندیشہ ہو تو نظر پست کرلے۔ اس مقدار کے ظاہر کرنے کی رخصت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ ستر نہیں ہے۔ نماز میں اس کے کھلے رہنے کا حکم ہے۔ اس کے علاوہ تمام بدن پوشیدہ رکھنا لازم ہے۔ اس زینت ظاہرہ سے مراد منہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔

چنانچہ علامہ بغوی صفحہ ۷۵ جلد مذکور میں فرماتے ہیں: اما المرأة فان كانت اجنبية حرة فجميع بدنها فى حق الاجنبى عورة ولا يجوز النظر الى شىء منها الا الوجه والكفين۔ یعنی اگر عورت آزاد اجنبیہ ہے تو اجنبی مرد کے حق میں اس کا تمام بدن ستر ہے۔ کسی حصہ کو اس کے بدن سے دیکھنا جائز نہیں ہے۔ صرف منہ اور ہاتھ دیکھ سکتا ہے۔

یہی آیت ولا یبدین زینتھن الا ماظہر منہا کی تشریح ہے۔ جس کو علامہ بغوی نے بیان فرمایا ہے۔ یہی مسلک فقہا حنفیہ کا ہے۔ شرح منیہ کبیری مع متن صفحہ ۲۰۸ میں ہے۔ بدن المراۃ الحرۃ کلھا عورۃ الا وجھھا وکفیھا فانھا لیست بعورۃ بالاجماع لا فی حق الصلوٰۃ ولا فی حق نظر الاجنبی حتی انہ یباح نظرہ الی وجہ المراۃ الاجنبیۃ وکفیھا اذا کان بغیر شھوۃ وذکر فی المحیط ان الاصح انھا لیست بعورۃ انتھی۔ اگر منہ اور دونوں ہاتھ کا خارج نماز میں ڈھانکنا فرض قرار دیا جائے تو نماز میں بالاولیٰ فرض ہو گا کیونکہ نماز میں زیادہ احتیاط ہے۔ اسی واسطے عورت کی صحن کی نماز سے مکان کی نماز زیادہ فضیلت رکھتی ہے اور مکان کی نماز سے اندر کی کوٹھری والی نماز زیادہ درجہ رکھتی ہے۔ فقال۔

علامہ رئیس المفسرین محمد بن جریر الطبری اپنی تفسیر کے صفحہ ۹۳ جزء ۱۸ میں فرماتے ہیں جو آیت ماظہر منہا کے ماتحت مرقوم ہے۔

و اولی الاقوال فی ذالک بالصواب قول من قال عنی بہ الوجہ والکفان یدخل فی ذالک اذا کان کذالک الکحل والخاتم والسوار والخضاب وانما قلنا ذالک اولی الاقوال فی ذالک بالتاویل لاجماع الجمیع علی ان علی کل مصل ان یستر عورتہ فی صلوٰتہ وان للمراۃ ان تکشف وجھھا وکفیھا فی صلوٰتھا وان علیھا ان تستر ماعدا ذالک من بدنھا الا ماروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ اباح لھا ان تبدیہ من ذراعھا الی قدر النصف فاذا کان من جمیعھم اجماعا کان معلوما ان لھا ان تبدی من بدنھا مالم یکن عورۃ فغیر حرام اظھارہ واذا کان لھا اظھار ذالک معلوما انہ مما استثناہ اللہ تعالٰی ذکرہ بقولہ الا ماظہر منہا لان کل ذالک ظاھر منہا انتھی۔

یعنی اقرب الی الصواب۔ قول اس شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ الا ماظہر منہا سے مراد منہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔ اس میں سرمہ اور انگوٹھی و خضاب کنگن داخل ہو جاتے ہیں۔ اقرب الی الصواب ہونے کی یہ دلیل ہے کہ سب کا اجماع و اتفاق ہے کہ ہر نمازی پر اپنی نماز میں ستر چھپانا فرض ہے۔ پس عورتوں کو منہ اور ہاتھوں کے علاوہ باقی جسم چھپانا فرض ہے۔ جب یہ سب کا اتفاق مسئلہ ہے تو اس کو اپنے بدن سے وہ حصہ ظاہر کرنا درست ہے جو کہ ستر نہیں

کہ مردوں میں ہے' انتہی ملخصاً۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پردہ دو قسم کا بیان فرمایا ہے۔ ایک حجاب' دوسرا ستر حجاب۔ تو اپنے جسم کو کسی اجنبی کے سامنے نہ ظاہر کرنا ہے۔ اور ستر جو تمام عورتوں کے لیے فرض ہے کہ منہ اور ہاتھ کے سوا باقی تمام بدن چھپا رکھنا ہے۔ حجاب تو امہات المومنین ازواج مطہرات کے لیے بحکم وقرن فی بیوتکن کہ تم گھروں میں ٹھہری رہو' فرض تھا۔ اور امت کی عورتوں کے لیے مستحب اور اولیٰ ہے۔ فرض نہیں ہے۔ اور ستر نماز کے لیے فرض ہے۔ یہ فرضیت نماز اور خارج نماز میں یکساں ہے۔ من ادعی خلافہ فعلیہ البیان۔ پردہ بدن دو قسم کا ہے۔ ایک محارم سے وہ تو پیٹ سے لے کر گھٹنا تک ہے۔ باقی بدن اگر ظاہر ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس پر وہی حدیث دلیل ہے جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی مشکوٰۃ کتاب المعجزات میں ہے۔ دوسرا پردہ غیر محرموں سے ہے۔ خواہ بیگانے ہوں یا قرابتی اور قومی جیسے چچازاد' خالہ زاد عورت کو ان سے تمام بدن بالوں سے لے کر قدموں تک چھپانا ضروری ہے۔ جس پر آیات و احادیث کثیرہ وارد ہیں۔ لیکن گھر میں خواہ محرم موجود ہوں' خواہ نامحرم ہوں خواہ کوئی بھی موجود نہ ہو' نماز میں سر ڈھانکنا ضروری ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے لا یقبل اللہ صلوٰۃ حائض الا بخمار بلکہ قدموں کی پیٹھ ڈھانکنا بھی ضروری ثابت ہے۔ جو بہ نسبت سر کے اوٰلی درجہ ہے۔ جیسے کہ آپ نے پہلے بھی اس کی وضاحت کی ہے۔ اور یہ عورت کے لیے بوجہ ستر ہے۔ نہ کہ زینت کے لیے۔ اسی واسطے عورت کی صحن کی نماز سے مکان کے اندر کی نماز افضل ہے۔ جو زیادہ ستر کی وجہ سے ہے۔ فافہم وتدبر۔ بلکہ نماز میں عورت کی آواز کو بھی ستر قرار دیا گیا ہے۔ اسی واسطے التسبیح للرجال والتصفیق للنساء (یعنی امام نماز میں بھول جائے تو مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں ہاتھ پر ہاتھ ماریں) قانون مقرر ہوا ہے۔ ورنہ نماز سے خارج اگر بغاوت سے آواز نہ ہو تو غیر محرم سے بولنا ممنوع نہیں ہے۔ بلکہ جائز ہے۔ عورتوں کے لیے مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے لیکن گھروں میں پڑھنا ستر کی وجہ سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں جو خیر صفوف النساء آخرھا وشرھا اولھا وارد ہے' اس کی علت بھی ستر ہے۔

جب حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کرائی تھی اور حضرت انس رضی اللہ عنہ جو مائی ام سلیم رضی اللہ عنہا کا محرم تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں کھڑا ہوا

تھا اور ملی ام سلیم رضی اللہ عنہا ان کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی علت بھی کمال ستر ہے۔ جو نماز سے مخصوص ہے۔ فافهم فانه دقیق۔ باریک اوڑھنی نماز اور خارج نماز میں ہر طرح پہننی ناجائز ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ کتاب اللباس میں ہے عن ابی علقمة عن امه قالت دخلت حفصة بنت عبدالرحمٰن علی عائشة وعلیها خمار رقیق عائشة وکسعتها خمارا کشیفا (موطا) آئی حفصہ بیٹی عبدالرحمن کی پاس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس حال میں کہ اس پر اوڑھنی باریک تھی تو پھاڑ دی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وہ اوڑھنی اور پہنا دی اس کو اوڑھنی موٹی اگر کسی طرح اس کا پہننا نماز میں جائز ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کو تلف نہ کرتیں۔ فتأمل۔

نیز مشکوٰۃ میں ہے عن عائشة ان اسماء بنت ابی بکر علی رسول الله صلها وعلیها ثیاب رقاق فاعرض وقال یا اسماء ان المراة اذا بلغت المحیض لن منها الا هذا او هذا واشار الی وجهه و یعنی اسماء آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اس حال میں کہ ان پر تھے کپڑے باریک پس منہ پھیر لیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اور فرمایا کہ اے اسماء نہیں جائز عورت کے لیے جب وہ بالغ ہو جائے ظاہر کرنا اس کو مگر منہ اور ہاتھ۔ علاوہ اس کے مشکوٰۃ میں وحیہ بن خلیفہ کی حدیث ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باریک کپڑے کو دو ٹکڑے کر دیا تھا ایک حصہ تو وحیہ کو قمیض کے لیے دے دیا تھا اور دوسرا عورت کی اوڑھنی کے لیے اور ساتھ ہی یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس کے نیچے اور کپڑا لگوا کر اپنی عورت کو دینا تاکہ اس کا بدن ظاہر نہ ہو۔

ان احادیث سے بصراحت ثابت ہوا کہ باریک کپڑا پہننا عورت کو مطلق جائز نہیں ہے۔ گھر میں محرم کے پاس ننگے سر ہونا اگرچہ جائز ہے اور باریک کپڑے سے بھی حرج نہ تھا لیکن نماز میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے تاکہ کوئی قریبی غیر محرم نہ آ جائے۔ اس لیے شارع علیہ السلام نے عام حکم دے دیا کہ لا یقبل الله صلوٰة حائض الا بخمار۔ بہرحال عورت کو سر پر اوڑھنی کا حکم اس لیے ہے کہ سر ستر میں داخل ہے اور اس پر مندرجہ بالا دلائل دلالت کرتے ہیں' فتدبر۔

آنجناب کے نوٹ والے مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک بدن کا ڈھانکنا دو وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک بوجہ ستر' دوم بوجہ زینت۔ کترین بھی بنا بریں جواب عرض کر دیا

ہے- ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ زینت دو قسم ہے- باطنی اور ظاہری- باطنی سے مراد جسم ہے- چنانچہ آیت ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن سے ہر دو زینت مراد ہے اور ظاہری زینت سے آنکھوں کا سرمہ' زیور' ہاتھوں وغیرہ کی مہندی مراد ہے-

چنانچہ تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے- ملاحظہ ہو ابن جریر ص-۹۳ جز-۱۸ مواضع ستر کو جو ڈھانکا جاتا ہے' ان کو بھی بطور زینت کے ڈھانکنا کہہ سکتے ہیں- اسی واسطے حضرت شیخ شیوخ الہند مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اپنے ترجمہ فارسی موسومہ فتح الرحمٰن میں فرمایا ہے- مواضع زینت دو قسم است آنچہ در ستر آن حرج است وآں وجہ و کفین بود آنچہ در ستر آں حرج نیست مانند سر وگردن وعضد وذراع وساق پس ستر وجہ و کفین از اجنبیان فرض نیست بلکہ سنت است وستر غیر آں از اجنبیان فرض است نہ از محارم انتھی- اس سے معلوم ہوا کہ سب مواضع ہی بطور زینت ڈھانکے جاتے ہیں- ہاں بعض مواضع کا ڈھانکنا ضروری اور لابدی ہے اور بعض کا مستحب ہے-

آیت یابنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد الایہ "اے اولاد آدم نماز کے وقت زینت لازم پکڑو-" آیت میں مسجد اور نماز کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہے کہ خارج نماز سے نماز میں حیا رکھنا نہایت ضروری ہے- کیونکہ نماز کے وقت دربار احکم الحاکمین میں حاضری ہوتی ہے- اسی واسطے فقہاء نے اس شخص کے لیے ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ لکھا ہے جو خارج نماز میں ننگے سر مجلس یا کسی اجلاس وکام میں جانا مکروہ اور برا جانتا ہو' فتامل-

بنابر تقریر ہذا ثابت ہوا کہ نماز میں عورت کے لیے تمام بدن ڈھانکنا ستر ہے اور یہ بطور زینت ہے- اسی طرح مرد کے لیے کندھے اور ناف سے گھٹنے تک ڈھانکنا نماز میں فرض ہے- اور باقی سر کا ڈھانکنا مستحب ہے- یہ بطور زینت کے ہے' جو نماز میں اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے- اور خارج نماز سے ناف سے موٹی ران تک ہے جو بطور زینت ہے- بہرحال ستر اور زینت باہم متضاد نہیں ہیں- ستر پر زینت کا اطلاق آسکتا ہے- ہاں ہر ایک زینت ستر نہیں ہے- پس زینت عام ہے اور ستر خاص ہے- جب باریک کپڑا پہنا گیا جس سے بدن دکھائی دیتا رہا تو ستر نہ ہوا- جب ستر نہ ہوا تو زینت بھی مکمل نہ ہوئی- اسی واسطے عورت کو باریک کپڑا پہننے سے خارج نماز میں روکا گیا ہے- تو نماز میں بالاولیٰ ممنوع ہے- اسی طرح مرد اگر باریک کپڑا ناف سے گھٹنے تک پہنے کہ بدن دکھائی دے تو بھی ناجائز ہو گا کیونکہ ممانعت

کی علت یہاں بھی موجود ہے۔ پس جس قدر بدن نماز میں ڈھانکنا ضروری ہے' اسی قدر موٹا کپڑا ہونا ضروری ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ جس قدر خارج نماز میں بدن ڈھانکنا مرد عورت کو ضروری ہے' اسی قدر پر موٹا کپڑا ہونا ضروری ہے۔

ہاں آپ کے منشاء کے مطابق میں یہ عرض کروں گا کہ عورت کا تو تمام بدن ستر ہے اور وہ نماز میں بھی ستری رہے گا۔ اس کو باریک کپڑا پہن کر نماز نہ پڑھنا چاہیے۔ چنانچہ سبل السلام جلد ۱' ص ۱۸۰ پر طبرانی سے ایک حدیث بایں لفظ منقول ہے۔

لا یقبل اللہ من امراۃ صلوۃ حتی تواری زینتھا ولا من جاریۃ بلغت المحیض حتی تختمر۔ یعنی عورت کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا جب تک اپنی زینت کو چھپا نہ لے۔ (اس کی تائید آیت لا یبدین زینتھن الا ماظھر سے بھی ہوتی ہے) اور اس لڑکی کی بھی قبول نہیں کرتا جو قریب بلوغت ہو۔ جب تک اوڑھنی نہ اوڑھے۔

یہ حدیث صاف ظاہر کرتی ہے کہ سر ستر ہے اور بوجہ ستر اوڑھنی ضروری قرار دی گئی ہے۔ چونکہ باریک کپڑے سے ستر نہ ہو گا تو نماز بھی نہ ہو گی اور مرد کے لیے ناف سے گھٹنے تک ستر ہے۔ نماز میں بھی اور خارج نماز میں بھی۔ باقی بدن نہ نماز میں ستر ہے اور نہ خارج نماز میں۔ باقی رہے کندھے' نماز میں ڈھانکنا سو یہ بطور زینت ہے بحکم خذوا زینتکم عند کل مسجد کندھے نماز میں بطور زینت ڈھانکنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ خطاب مردوں کو ہے یعنی بنی آدم کو ہے' بنات آدم کو نہیں ہے۔ ان کے لیے جدا حکم وارد ہے۔ پس مرد کی نماز باریک کپڑے سے (جو کندھے پر ہو گا) ہو جائے گی جو مواضع جسم کے خارج نماز میں ستر نہیں ہے' وہ نماز میں کس وجہ سے ستر ہو سکتے ہیں؟ عورت کا سر تو نماز میں اس لیے ستر ہوا کہ وہ محل نماز بھی ستر ہے۔ صرف محرم کے لیے رخصت ہے لیکن نماز میں یہ رخصت نہ دی گئی۔ کیونکہ احتیاط نماز میں مدنظر ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث روپڑ جلد ۲' شمارہ ۱۰ مورخہ ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۶۳ء

عورت کی نماز

مسجد کی بجائے گھر میں افضل ہے کیا بیت اللہ اور مسجد نبوی بھی اس حکم میں شامل ہے؟

سوال: حدیث میں ہے: عورت کی نماز مسجد کی بجائے گھر میں افضل ہے بیت اللہ شریف اور مسجد نبویؐ اور بیت المقدس ان تین مساجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت احادیث میں بہت بیان ہوئی ہے اس لیے ہم اہل اسلام دور دراز سے سفر کر کے ان مساجد میں نمازیں پڑھ کر ثواب حاصل کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ فضیلت مردوں کے لیے خاص ہے یا عورتیں بھی اسکو حاصل کر سکتی ہیں یعنی جب عورتیں حج کے لیے مکہ معظمہ جائیں تو ان کے لیے بیت اللہ شریف میں نماز پڑھنا بہتر ہے یا اپنی قیام گاہ میں ثواب کس جگہ زیادہ ہوگا؟ اسی طرح عورتیں مدینہ منورہ جائیں تو ان کی نماز مسجد نبویؐ میں افضل ہے یا اپنی قیام گاہ میں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے۔

(فتح محمد و بشیر احمد ضلع شیخوپورہ)

الجواب بعون الوهاب

الحمدلله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين

امابعد فاقول بالله التوفيق "خاص طور پر اس صورت مسئلہ کی وضاحت کسی دلیل شرعی میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے اصل مسئلہ (عورت کو مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا گھر میں؟) واضح کرنے سے یہ مسئلہ ظاہر ہو جائے گا پہلے یہ جاننا چاہیے کہ نفس مسئلہ میں عورت کو مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ اختلاف ما بین العلماء ہے بعض مطلقاً جائز رکھتے ہیں اور بعض نے جوان عورتوں کو منع کیا ہے اور عجائز یعنی بوڑھی عورتوں کو جائز رکھا ہے۔ بعض نے عشاء اور فجر کی نمازوں میں جائز قرار دیا ہے اور بعض نے مطلقاً جائز رکھا ہے اور بعض نے مطلقاً منع کیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ فتنہ وفساد کا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتوں کو دین سیکھنے کے لیے جانے کی ضرورت تھی، اب وہ ضرورت نہیں رہی اس لیے منع ہے۔ جب یہ مسئلہ مختلف فیہ ہوا تو اسی میں حق معلوم کرنا ضروری ہے کہ مسائل مختلفہ میں حق ایک ہی بات ہوتی ہے کیونکہ حق میں تعدد نہیں ہے قرآن ناطق ہے" فماذا بعد الحق الا الضلال "پس حق یہ بات ہے کہ عورتوں کو مسجد میں عشاء اور فجر کے وقت نماز پڑھنے کے لیے جانا جائز ہے منتقی میں یہ حدیث وارد ہے" عن ابی هريرةؓ ان

النبی ﷺ قال لا تمنعوا اماء الله مساجد الله ولیخرجن متلفعات" (رواہ احمد وابوداؤد) نبی کریم ﷺ نے فرمایا 'لوگو! تم اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے منع نہ کرو لیکن جب وہ نماز کے لیے مسجد کی طرف نکلیں تو خوشبو لگائے ہوئے نہ ہوں۔ دوسری حدیث متفق میں یہ ہے "عن ابن عمرؓ عن النبی ﷺ قال اذا استأذ نتکم نساء کم باللیل الی المسجد فاذنوا لھن" (رواہ الجماعۃ الا ابن ماجہ) یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا! جب (تمہاری عورتیں رات کو مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے اجازت طلب کریں تو تم ان کو اجازت دے دو) یہ حکم علی الا طلاق جوان بوڑھی ہر عورت کو شامل ہے کہ وہ خاوند سے اذن لے کر مسجد میں نماز پڑھنے جا سکتی ہے۔ تعامل عہد نبویؐ اور صحابہؓ میں یہی تھا کہ عشاء اور فجر میں عورتیں مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے کے لیے جاتی تھیں۔

بخاری شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ سرورِ کائنات ﷺ نے عشاء کی نماز میں تاخیر فرمائی حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو آواز دی اور فرمایا نام النساء والصبیان کہ عورتوں اور بچوں کو نیند آ رہی ہے' جلدی تشریف لایئے۔ آں حضرت ﷺ تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔

اسی طرح بخاری شریف میں یہ حدیث ہے کہ "عورتیں سلام پھیرتے ہی چلی جاتی تھیں اور رسول اللہ ﷺ اور دیگر لوگ جب تک خدا چاہتا بیٹھے رہتے' پھر جب آپ کھڑے ہوتے تو سب لوگ بھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ "لا خیر فی جماعۃ النساء الافی المسجد" یعنی مسجد کے علاوہ عورتوں کے لیے جمع ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے بیٹے بلال کو کہا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے " لاتمنعوا النساء حظو ظھن من المساجد اذا استاذنکم" کہ عورتوں کو مسجدوں میں ثواب کا حصہ حاصل کرنے سے مت روکو جب وہ اذن طلب کریں تو منع نہ کرو۔ بلالؓ نے کہا! بخدا ہم تو ان کو روکیں گے نہ جانے دیں گے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اس کی طرف متوجہ ہوئے اس کو سخت برا بھلا کہا اور سینہ میں مارا اور کہا! میں تجھے رسول اللہ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں کہ عورتوں کو مسجد سے نہ روکو اور تو کہتا ہے ہم روکیں گے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد حضرت عبداللہؓ نے اپنے بیٹے سے آخر دم تک کلام نہ کی۔

اللہ اکبر! صحابہ کرام میں اتباع رسول اللہ ﷺ کا جذبہ کتنا بلند تھا اور ان کی دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ جب اپنے بیٹے نے حدیث نبوی کا اپنی رائے سے مقابلہ کیا تو فوراً اس کا قطعی بائیکاٹ کر دیا۔ ان احادیث سے ثابت ہوا کہ عورتوں کو خاوند کے اذن سے زینت لگائے بغیر مسجد میں جانا جائز ہے۔ باقی رہا زمانہ ساز لوگوں کا یہ کہنا کہ اب فتنہ و فساد کا دور ہے' اس لیے عورتوں کو مسجد میں جانا منع ہے تو یہ خیال بھی سراسر باطل ہے۔ عہد نبویؐ میں بھی ایسا فساد ہوا تب بھی آپؐ نے عورتوں کو مسجد میں جانا منع نہ فرمایا۔ چنانچہ حدیث میں ہے " ان امرأۃ خرجت علی عهد رسول الله ﷺ ترید الصلوٰۃ فتلقھا رجل فتجللها فقضی حاجة منها"۔ (الحدیث) یعنی عہد نبویؐ میں ایک عورت اپنے گھر سے مسجد میں نماز پڑھنے کو نکلی' راستے میں ایک شخص نے اسے پکڑ کر زنا بالجبر کیا اور بھاگ گیا (مفصل واقعہ ترمذی میں ہے) اس واقعہ کے باوجود آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع نہیں فرمایا۔

تو اب مقلدین اہل الرائے حضرات کا حیلے بہانوں سے عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکنا باطل ہوا۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا گھر میں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے" عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله ﷺ لاتمنعوا نساء کم المساجد وبیوتهن خیر لهن" (رواہ ابوداؤد) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی عورتوں کو مسجدوں میں نماز پڑھنے سے نہ روکو لیکن ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں (مشکوٰۃ)۔ دوسری حدیث منتقی میں ہے "عن ام سلمة ان رسول الله ﷺ قال خیر مساجد النساء قعر بیوتهن" (رواہ احمدؒ) یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں کی بہترین مسجدیں گھروں کا اندرونی حصہ ہے۔

یہ دونوں حدیثیں اس مسئلہ پر بعبارۃ النص دلالت کرتی ہیں کہ بہ نسبت مسجد کے عورتوں کو اپنے گھروں میں نمازیں پڑھنا بہتر اور افضل ہے۔ مشکوٰۃ میں بروایت ابوداؤد یہ حدیث ابن مسعودؓ سے آئی ہے "قال النبی ﷺ صلوٰۃ المرأۃ فی بیتها افضل من صلوتها فی حجرتها وصلوتها فی مخدعها افضل من صلوتها فی بیتها" (رواہ ابوداؤد) یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عورت کی نماز اپنی کوٹھڑی میں افضل ہے اس

کے گھر سے اور اندر کی چور کوٹھڑی میں پڑھنی بہتر ہے اس کے گھر سے۔ ان احادیث میں "خیر" اور "افضل" کا لفظ صاف ناطق ہے کہ عورت کو گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے اور گھر میں بھی جس قدر اندر کی کوٹھڑیوں میں نماز پڑھی جائے گی جس سے ستر اور اخفا بڑھے گا' نماز میں فضیلت پائی جائے گی' یہ حکم عام ہے۔ خواہ مسجد حرام ہو یا بیت اللہ' مسجد نبویؐ ہو یا مسجد اقصیٰ چنانچہ نیل الاوطار جلد ثالث صفحہ ۱۳۲ میں یہ حدیث وارد ہے " اخرج احمد والطبرانی من حدیث ام حمید الساعدیة انها جاء ت الی رسول الله ﷺ فقالت یا رسول الله انی احب الصلوٰة معك فقال ﷺ قد علمت وصلوٰتك فی بیتك خیر لك من صلوٰتك فی حجرتك وصلوٰتك فی حجرتك خیر لك من صلوٰتك دارك وصلوٰتك فی دارك خیرلك من صلوتك فی مسجد قومك وصلوٰتك فی مسجد قومك خیرلك من صلوٰتك فی مسجد الجماعة قال الحافظ واسناده حسن" یعنی امام احمدؒ اور طبرانی نے ام حمید ساعدیہؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضورؐ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھا کروں۔ آپؐ نے فرمایا! تو جانتی ہے کہ تیری نماز کوٹھڑی میں بہتر ہے تیری اس نماز سے جو تو حجرے میں پڑھے اور حجرہ کی نماز بہتر ہے اس نماز سے جو گھر کے آنگن میں ادا کی جائے اور تیری آنگن کی نماز بہتر ہے اس نماز سے جو محلّہ کی مسجد میں پڑھے اور محلّہ کی مسجد میں تیری نماز بہتر ہے اس نماز سے جو جامع مسجد میں ہے۔

حافظ ابن عبداللہ نے استیعاب جلد ۲ صفحہ ۷۹۱ میں یہ روایت ذکر کی ہے اور اس کے اخیر میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "وصلوٰتك فی مسجد قومك خیرلك من صلوٰتك فی مسجدی قال فامرت فبنی لها مسجداً فی اقصی شئی من بیتها المظلمة فكانت تصلی فیه حتی لقیت الله عزوجل" یعنی تیری وہ نماز جو محلّہ کی مسجد میں پڑھی جاتی ہے اس نماز سے بہتر ہے جو میری مسجد میں پڑھی جائے۔ راوی نے بیان کیا کہ حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد سن کر ام حمید ساعدیہؓ نے حکم دیا کہ اس کے لیے گھر کے انتہائی اندرونی گوشہ میں (جہاں بہت اندھیرا تھا) مسجد بنائی جائے چنانچہ اسی مسجد میں وہ آخری دم تک نماز پڑھتی رہی حتی کہ وہ فوت ہو کر اللہ عزوجل سے ملاقی ہوئی۔

امام شوکانیؒ اس مسئلہ پر بحث کے بعد فرماتے ہیں " صلوٰتهن علی كل حال

فی بیوتھن افضل من صلوتھن فی المساجد "یعنی النصوص سے ثابت ہوا کہ ہر حال میں عورتوں کی وہ نماز جو گھروں میں پڑھی جاتی ہے اس نماز سے افضل ہے جو مسجدوں میں پڑھی جاتی ہے۔ اب اس کے بعد سائل کی صورت مسئولہ کا حکم بھی خوب ظاہر ہو گیا کہ مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ، مسجد جامع، مسجد محلہ جن میں مردوں کے لیے (بہ نسبت گھروں میں نماز پڑھنے کے کئی درجے فضیلت ہے) عورتوں کے لیے گھر میں نماز پڑھنا ان تمام مسجدوں میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور اس کی علت یہ ہے کہ عورت کے لیے ستر اور مردوں سے اخفا ضروری ہے وہ جس قدر بھی پایا جوئے گا نماز میں فضیلت پائی جائے گی۔

باقی رہا حج بیت اللہ اور زیارت مسجد نبوی کا وقتی مسئلہ سو اس میں یہ سمجھنا چاہیے کہ حج وعمرہ طواف کرنا ضروری ہے تو لا مضالہ بیت اللہ الحرام میں جانا پڑے گا تو حج اور عمرہ کرنے والی عورت کو مسجد میں جانا چاہیے اسی طرح جو عورت مسجد نبویؐ میں گئی اور اس کا ارادہ روضہ نبوی کی زیارت کا بھی ہے تو وہاں پہنچے پر اس کو مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے کا درجہ حاصل کرنا چاہیے۔ یہ ایک وقتی بات ہے ہاں جب مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں مقیم ہو جائے تو اس کی قیام گاہ ان شہروں میں کسی جگہ مقرر ہو گی۔ پھر اس کو اپنی پردہ دار قیام گاہ ہی میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ ہاں کسی وقت ان مسجدوں کا ثواب لینے کے لیے جائے تو یہ جائز ہے مگر افضل اپنے گھر اور قیام گاہ میں ہی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ام حمید ساعدیہ کو اپنے ساتھ جماعت سے مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے سے اس نماز کو افضل بتایا جو گھر کے کسی گوشہ میں پڑھی جاتی ہے جس پر ام حمیدؓ نے عمل کیا اور مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنی ترک کر دی۔

یہ میری تحقیق ہے باقی اگر کوئی عالم اس کے خلاف مسلک رکھ کر کوئی ثبوت پیش کر دے گا تو بندہ رجوع کر لے گا ورنہ مسلک یہی صحیح ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث جلد ۱۷ شمارہ ۳۲ مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۶۵ء۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر محققانہ تبصرہ

رفع الیدین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کی ہے

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث: صوفی میاں میر حسن صاحب چوہدری قوم ککوکا نے ایک پرچہ راقم الحروف حصاری غفرلہ الباری کو دیا جس پر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث بحوالہ ترمذی شریف (ص۔۵) لکھی ہوئی تھی جو بعینہ درج ذیل ہے: حدثنا هنادنا وكيع عن سفيان عن عاصم بن كليب عن عبدالرحمٰن بن الاسود عن علقمة قال قال عبدالله بن مسعود الا اصلى بكم صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم يرفع يديه الا فى اول مرة وفى الباب' الخ۔

واضح ہو کہ کاتب نے نہ اس حدیث کا ترجمہ لکھا ہے اور نہ اس سے کسی مسئلہ کا استخراج واستنباط کیا ہے اور نہ کسی دعویٰ پر استدلال ظاہر کیا ہے۔ حامل پرچہ ہذا مسمی میاں میر حسن صاحب نے زبانی حقیقت حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ حدیث فلاں مولوی نے لکھ کر دی ہے اور یہ بھی بتایا کہ رفع یدین جو اہل حدیث نمازوں میں کیا کرتے ہیں وہ اس حدیث سے منسوخ ہے۔ اس لیے عرض ہے کہ آپ اس حدیث کا جواب دیں کہ مسئلہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟

اس لیے راقم الحروف مقلدین حنفیہ کی اس دلیل کا جواب عرض کرتا ہے جس کو دیانت اور امانت سے غور فرما کر حق وباطل میں فرق کرنا چاہیے۔

مقلدین کی حالت: مسئلہ کی تحقیق سے پہلے یہ بات سن لیں کہ کسی مسئلہ کی تحقیق کرنا صرف حجت قائم کرنے کے لیے تو ہو سکتا ہے لیکن حق بات کا مقلدین سے منوا لینا اور یہ اُمید کرنا کہ دلیل شرعی ظاہر ہونے پر یہ اپنی غلطی چھوڑ کر حق مسئلہ قبول کر لیں گے' یہ بعید از اُمید ہے مگر ہم سائل کی رہنمائی کرتے ہوئے اس پیش کردہ حدیث پر تبصرہ کرتے ہیں کیونکہ سائل کے دل میں اخلاص ہے اور بیجا ضد ہی حمایت نہیں ہے۔

اہل حق کا طرز عمل: ہمارے اسلاف اہل حق میں سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ

اندھی تقلید چھوڑ کر اور تعصب سے بالاتر ہو کر تحقیق حق کیا کرتے تھے۔ جب ان کو دلیل شرعی ان کے عندیہ اور مسلک کے خلاف ظاہر ہو جاتی تو اسے فوراً قبول کر لیتے تھے۔

رفع یدین کی جائے: مسئلہ رفع یدین کے متعلق پہلے یہ ذہن نشین کر لیں کہ یہ احادیث صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے یعنی اس کا ثبوت قطعی دلائل سے ہے جن سے انکار سوائے منکرین حدیث کے کوئی نہیں کر سکتا۔ امام سیوطی نے اپنے رسالہ "الازھار المتناثرہ فی الاحادیث المتواترہ" میں حدیث رفع یدین کو متواتر احادیث میں شمار کیا ہے۔ حنفیہ میں سے مولانا عبدالحی صاحب حنفی لکھنوی نے تعلیق الممجد ص۔۸۹ اور فوائد البہیہ کے ص۔۵۰ میں اس کو متواتر تسلیم کیا ہے اور سعایہ شرح وقایہ جلد۔۱' ص۔۲۱۳ میں لکھا ہے: والحق انه لا شک فی ثبوت رفع الیدین عند الرکوع والرفع منه عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وکثیر من اصحابه بالطرق القویة والاخبار الصحیحة۔ یعنی "حق بات یہ ہے کہ رفع یدین کے ثبوت میں کوئی شک نہیں ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ اور بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سندوں اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔"

آنحضرت ﷺ نے آخری نماز بھی رفع یدین سے پڑھی: مصنف قاموس حضرت فیروز آبادی سفر السعادۃ ص۔۱۰ (مصری) میں یہ فرماتے ہیں: وبکثرة رواته تشابه المتواتر فقد صح فی ھذا الباب اربعمائة خبر واثر ورواہ العشرۃ المبشرۃ ولم یزل علی ھذہ الکیفیة حتی رحل عن ھذا العالم لم یثبت غیر ھذا۔ یعنی "کثر راویوں کی وجہ سے یہ حدیث متواترہ کے مشابہ ہے۔ اس میں چار سو احادیث اور صحیح آثار ثابت ہو چکے ہیں اور عشرہ مبشرہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور ہمیشہ اسی کیفیت سے نبی اکرم ﷺ کی نماز تھی کہ اس دنیا سے رحلت فرما گئے اور اس کے خلاف رفع یدین ترک کرنا آنحضور ﷺ سے ثابت نہیں ہوا۔"

امام شافعی رحمہ اللہ کا بیان ہے: وروی الرفع جمع من الصحابة لعله لم یرو قط حدیث بعدد واکثر من ھم۔ (تلخیص ص۔۸۲) یعنی "رفع یدین کی حدیث کو اتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے کہ اتنی اکثریت نے کسی حدیث کو بیان نہیں کیا ہے۔"

میں کہتا ہوں حنفی امت کے حکیم مولانا اشرف علی صاحب تھانوی بوادر النوادر جلد۔۱' ص۔۳۴۶ میں کہتے ہیں: والحدیث اذا روی من عشرۃ فھو متواتر علی القول المختار۔

(کما فی تدریب الراوی) "جس حدیث کو دس راوی روایت کر دیں تو مختار مذہب ہے کہ وہ حدیث متواتر ہے۔" حدیث رفع یدین کو صحابہ عشرہ مبشرہ نے اور ان کے علاوہ اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے تو اس کے متواتر ہونے میں کیا شبہ ہے؟

امام بخاری رحمہ اللہ کی شہادت کہ اهل مکه واهل المدینه واهل الیمن واهل العراق قد تواطؤا علی رفع الایدی۔ (رساله امام بخاری جزء رفع یدین) یعنی "رفع یدین علماء اہل مکہ' علمائے اہل مدینہ' علمائے اہل یمن' علمائے اہل عراق متواتر کرتے رہے ہیں اور اس پر متفق ہیں۔"

امام شافعی' امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ جو اہل حجاز سے ہیں اور ان کے مقلدین علماء سب رفع یدین کے قائل ہیں پھر اہل کوفہ کو کیسے علم ہو گیا کہ رفع یدین منسوخ اور منع ہے اور ان تمام علماء محدثین اور ائمہ کبار کو معلوم نہ ہوا۔

ع این خیال است و محال است و جنوں

حنفیہ کی پیش کردہ روایت کی تحقیق: اب ترمذی کی روایت کی حقیقت سنئے۔ یہ روایت دیگر روایت کی رُو سے ضعیف اور ناقابل قبول ہے۔ روایت کی رُو سے اس طرح کہ اس حدیث کا دارومدار عاصم بن کلیب پر ہے اور وہ اس روایت کے بیان کرنے میں منفرد ہے۔ میزان الاعتدال میں ہے: قال ابن المدینی لا یحتج بما انفرد به۔ یعنی "عاصم جب منفرد ہو تو اس کی حدیث قابل حجت نہیں ہے۔"

علامہ ابن عبدالبر تمہید میں فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث بوجہ منفرد عاصم ضعیف ہے۔"

مولوی صاحب مذکور نے ترمذیؒ سے حدیث تو نقل کر دی لیکن رئیس التابعین امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ جن کو حنفیہ اپنے مذہب میں شامل کرتے ہیں' وہ جو فیصلہ کرتے ہیں اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ ہے: قال عبداللہ بن مبارک قد ثبت حدیث من یرفع وذکر حدیث الزهری عن سالم عن ابیه ولم یثبت حدیث ابن مسعود ان النبی صلی الله علیه وسلم لم یرفع یدیه الا فی اول مرة۔ یعنی "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ثابت ہے جس میں رفع یدین کا ذکر ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ثابت نہیں ہے جس میں صرف پہلی بار رفع یدین کرنے کا ذکر ہے۔"

رئیس الناقدین حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص ص ۸۲ میں فرماتے ہیں: هذا احسن ما

روی اھل الکوفۃ فی نفی رفع الیدین فی الصلوۃ عند الرکوع وعند الرفع منہ وھو فی الحقیقۃ اضعف شیئی یعول علیہ لان لہ عللۃ تبطلہ یعنی "کوفیوں کے پاس رفع یدین نہ کرنے کی بہت بڑی دلیل ابن مسعود بڑٹھ کی حدیث ہے مگر حقیقت میں وہ نہایت ضعیف ہے جس پر اعتماد کیا جاتا ہے' کیونکہ اس حدیث میں کئی علتیں ہیں جو اس کو بیکار کر رہی ہیں۔"

یہ مختصر بحث ہے' مفصل کتاب مطولات میں ہے۔ حدیث ابن مسعود بڑٹھ میں یہ ذکر ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں تم کو رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر دکھاتا ہوں پھر پڑھی تو رفع یدین ایک بار کے سوا پھر نہ کیا۔ میں کہتا ہوں کہ ابن مسعود بڑٹھ نے اس نماز میں تطبیق کی تھی یا نہیں' اگر نہیں تو ثبوت لاؤ؟ اگر کی تھی جیسا کہ ان کا مذہب ہے تو پھر حنفیہ کو تطبیق یعنی رکوع میں دونوں ہاتھوں کو ملا کر گھٹنوں کے اندر بھی کر لینا ماننا ہو گا۔ اگر یہ ان کی غلطی یا سہو ہے تو رفع یدین کو بھی اسی طرح سمجھ لیں' ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

دیگر یہ بات ہے کہ ابن مسعود بڑٹھ نے جو نماز پڑھ کر دکھائی ہے اس کی کسی صحابی نے تصدیق نہیں کی۔ اب ہم ایک ایسی حدیث پیش کرتے ہیں جس کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تصدیق کی ہے' یہ حدیث ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہے۔ ص۔۱۰۶ ملاحظہ ہو' ترجمہ لکھتا ہوں :

"محمد بن عمرو کہتے ہیں کہ ایک جگہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے تھے جن میں ابو قتادہ بڑٹھ بھی تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھا تھا' نماز کا ذکر چھڑ گیا۔ ابو حمید بڑٹھ نے کہا میں تم سے زیادہ حضور ﷺ کی نماز کو جانتا ہوں' کیونکہ ہمیشہ خیال رکھا کرتا ہوں۔ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بولے یہ کیسے؟ تم کوئی ہم سے زیادہ حضور ﷺ کے پاس تو نہیں رہے۔ کہا کیوں نہیں' میں تو آپ کی نماز کا ہمیشہ خیال رکھا کرتا تھا یہاں تک کہ میں نے یاد کر لیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بولے' اچھا تو کہئے۔ بولے حضور اکرم ﷺ نماز کو کھڑے ہوتے وقت کندھوں تک ہاتھ اٹھاتے اور "اللہ اکبر" کہتے۔ خوب سیدھا کھڑے ہو کر کچھ قرآن پڑھتے پھر "اللہ اکبر" کہتے' کندھوں تک ہاتھ اٹھا کر رکوع کو جاتے پھر اٹھتے ہوئے کندھوں تک ہاتھ اٹھاتے اور کہتے سمع اللہ لمن حمدہ (آخر تک لمبی حدیث) سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بول اٹھے آپ نے سچ کہا۔ واقعی حضور اکرم ﷺ اسی طرح نماز پڑھا کرتے تھے۔

ابو حمید صحابی بڑٹھ کی دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تصدیق کر دی کہ یہ نماز ٹھیک ہے تو

اب اس کے مقابلے میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ضعیف روایت کیا مفید ہو سکتی ہے؟ پس رفع یدین سنت متوکدہ ہے' اس کا منکر کافر ہے اور تارک بوجہ تقلید گمراہ ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث لاہور' مورخہ ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۶۹ء

صف سیدھی کرو!

نماز میں صف سیدھی کرنے' پاؤں سے پاؤں اور کندھے سے کندھا ملانے کا حکم ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت ہی تاکید فرمائی ہے مگر افسوس ہے کہ یہ مسئلہ بھی ترک ہوتا جارہا ہے اور احناف میں تو یہ وہابیوں کا مسئلہ مشہور ہو گیا ہے کہ اہل حدیث ہی اس کے عامل ہیں اور انہی کے مخصوص مسائل میں یہ مسئلہ بھی شامل ہے مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ آج ہم اس پر مختصر سی روشنی ڈال رہے ہیں' امید ہے کہ احباب اس کی نشرواشاعت فرمائیں گے۔

ٹیڑھی صف تفرقہ کا موجب ہے: حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ برابر اور درست ہو جاؤ اور آگے پیچھے ہو کر آپس میں اختلاف نہ کرو' ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے' پھر حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ صحابی فرماتے ہیں کہ فانتم الیوم اشد اختلافا (رواہ مسلم) کہ تم آج کے دن اسی سبب سے سخت اختلاف میں مبتلا ہو گئے ہو۔ اس پر امام نووی نے فرمایا ہے کہ معناہ یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء واختلاف القلوب (الی ان قال) لان مخالفتھم فی الصفوف مخالفۃ فی ظواھرھم واختلاف الظواھر سبب لاختلاف البواطن الخ۔ یعنی صفوں میں اختلاف نہ کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ عدم اقامت صف تمہارے دلوں میں عداوت اور دشمنی ڈال دے گا مخالفت ظاہرہ موجب اختلاف باطنہ کی ہے۔ علامہ قرطبی اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ تم متفرق ہو جاؤ گے اور ہر شخص دوسرے کے خلاف طریقہ اختیار کرے گا کیونکہ صف میں دوسرے سے آگے ہونا تکبر کا موجب ہے جو مفسد قلب ہے اور

قطع کی طرف داعی ہے۔ (نیل الاوطار)

پس اگر باشندگان پاکستان اپنی حکومت اور ملک کا نظام مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور پائیدار ترقی کے خواہاں ہیں تو ان کو چاہیے کہ تمام ملک میں نماز اور اقامت صف کا اہتمام وانتظام کریں' بغیر اس کے اتفاق واتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ نسخہ مجرب ہے جو معلم ربانی حکیم روحانی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کا بتلایا ہوا ہے' کبھی خطا نہیں کیا جا سکتا' جملہ امراض افتراق سے کلی نجات حاصل ہو جائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کی اس مسئلہ کے بارہ میں عجیب عجیب حالتیں ہیں۔ عام مسجدوں میں تو نماز باجماعت میں ہر نمازی دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کھڑا ہوتا ہے جیسے کہ چھوت ہوتی ہے۔ یہ مرض تو مقلدین میں ہے اور اہلحدیث کا یہ دستور ہے کہ صرف پیر کی چھنگلی ملا کر کھڑے ہوتے ہیں' ٹخنہ نہیں ملاتے اور بعض لوگ قلیل ایسے ہیں جو ٹخنہ سے ٹخنہ تو ملا لیتے ہیں لیکن گھٹنے سے گھٹنہ اور مونڈھے سے مونڈھا نہیں ملاتے۔ جس قدر نمازی ہیں اسی قدر صفوں کے ملانے کے طریقے ایجاد کئے گئے ہیں اور طریقہ مسنون اور مشروع متروک ہے جس کی وجہ سے گھر گھر اختلاف اور نفاق گھس گیا ہے' کیونکہ جب دو نمازیوں کے درمیان شگاف اور فاصلہ رہ جاتا ہے تو وہاں یہ شیطان دشمن نوع انسان آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ آکر دلوں میں فساد اور اختلاف اور خیالات باطلہ پیدا کرتا ہے۔

شیطان کا دخل: بعض جاہل نادان اس مسئلہ سے انکار کیا کرتے ہیں کہ مسجد میں شیطان کہاں آتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صفوں کے درمیان اور نمازیوں کے درمیان شیطان کہاں ہوتا ہے؟ یہ غیر ممکن ہے اور غلط ہے۔ سو یاد رہے کہ ایسے لوگ احادیث نبویہ کے منکر ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو خبر دی ہے کہ شیطان تمہارے درمیان آکر گھس جاتا ہے۔

چنانچہ حدیث میں وارد ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ رصوا صفوفكم وقاربوا بينهما وحاذوا بالاعناق فوالذى نفسى بيده انى لارى الشيطان يدخل من خلل الصف كانها الخذف۔ (مشکوٰۃ) یعنی "صفوں کو خوب چونے قلعی کی دیوار کی طرح ملاؤ اور ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ اور گردنوں کو بالمقابل کرو۔ قسم ہے اللہ کی' میں شیطان کو دیکھتا ہوں کہ وہ صف کے شگافوں سے داخل ہو جاتا ہے گویا کہ بکری کا چھوٹا سا بچہ ہے۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ سدوا الخلل فان الشیطان یدخل فیما بینکم بمنزلة الخذف۔ یعنی "بیچ کی فاصلوں کو بند کرو' کیونکہ شیطان تمہارے درمیان بکری کے چھوٹے بچہ کی طرح داخل ہو جاتا ہے۔"

اب جو شخص نہ ملنے گا وہ حدیث نبوی اور خود نبی کریم ﷺ کا منکر ہے اور اب جو لوگ فاصلوں کو بند نہ کریں گے وہ شیطان کے دوست اور اللہ و رسول ﷺ کے دشمن بنیں گے۔
مشکوۃ ہی میں حدیث ہے' جس میں یہ ارشاد نبوی ہے کہ لینوا بایدی اخوانکم ولا تذروا فرجات للشیطان۔ "کہ اپنے بھائیوں کے سامنے نرم ہو جاؤ اور شیطان کے لیے سوراخ نہ چھوڑو۔" یعنی جب کوئی مسلمان صف میں تمہیں پکڑ کر درست کرے تو خفا نہ ہو جاؤ بلکہ نرم ہو کر بات مان لو۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ بالباری

اہلحدیث سوہدرہ' جلد ۷' شمارہ ۴' مورخہ ۸/ فروری سنہ ۱۹۵۵ء

الاستفتاء

سوال: کیا حکم ہے شرع محمدی کا اس مسئلہ میں کہ نماز باجماعت میں جب صف بندی ہوتی ہے تو اس وقت ہر نمازی کو اپنے ساتھ کے نمازی کے قدم سے قدم اور ٹخنہ سے ٹخنہ ملانا چاہیے یا صرف اس کے برابر کھڑا ہونا اور دونوں کا آپس میں فرق رکھنا ضروری ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ صف میں پاؤں سے پاؤں ملانا ضروری نہیں اور نہ ہی یہ کسی حدیث میں لکھا ہے' صرف اس کے برابر میں کھڑا ہونا کافی ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کی جائے اور اس کی دلیل شرعی لکھی جائے۔ (السائل علی حسین چک نمبر ۲۵۱' ای بی ضلع منٹگمری (ساہیوال)

الجواب بعون الوهاب وهو الموفق للصواب: الحمد للہ رب العالمین' اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ جماعت کے وقت جب صف بندی ہو تو اس وقت صف سیدھی کرنا اور باہم پاؤں سے پاؤں ملانا ضروری ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اس طرح صف باندھو جس طرح فرشتے صف باندھتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ فرشتے کیسے صف باندھتے ہیں؟ فرمایا کہ وہ پہلی صفوں کو پورا کرتے ہیں' ویتراصون فی

الصف' اور صف میں آپس میں خوب مل جاتے ہیں۔

قاموس میں یتراصون کا معنی یہ لکھا ہے : رصہ الزق بعضہ ببعض وضم۔ یعنی "بعض شخص بعض کے ساتھ خوب مل جائے"

یہ حدیث ابوداؤد میں ہے' اس کی کیفیت حضرت نعمان بن بشیر صحابی رسول ﷺ یوں فرماتے ہیں : فرأیت الرجل یلزق منکبہ بمنکب صاحبہ ورکبتہ برکبۃ صاحبہ وکعبہ بکعبہ۔ (ابوداؤد) یعنی "جب نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ صفیں درست کرو تو میں نے ہر نمازی شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے ساتھی کے کندھے سے کندھا اور گھٹنے سے گھٹنا اور ٹخنے سے ٹخنا ملا دیتا تھا۔"

لغت میں الزاق کا معنی چمٹنا آتا ہے اور لفظ یتراصون باب تفاعل سے ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ ہر نمازی دوسرے نمازی سے چمٹ جاتا تھا۔ یہی الزاق کا معنی ہے جس کی کیفیت جامع صحیح بخاری ص۔۱۰۰ میں حضرت انس ﷺ سے یوں مروی ہے : وکان احدنا یلزق منکبہ بمنکب صاحبہ وقدمہ بقدمہ۔ یعنی "رسول کریم ﷺ کا حکم سن کر ہم میں سے ہر کوئی شخص اپنے ساتھی کے کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملا دیتا تھا۔"

امام الدنیا فی الحدیث حضرت امام بخاری ﷫ نے اپنی جامع میں اس حدیث پر باب یوں منعقد کیا ہے : باب الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف۔ یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ صف میں نمازی کو دوسرے نمازی کے کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم چمٹنا چاہیے۔"

اب الزاق اور یتراصون کے لفظوں پر غور کرنے اور دو صحابیوں کی کیفیت عملی بیان کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوا کہ صف میں ہر نمازی کو دوسرے نمازی کے کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم اور ٹخنہ ملانا چاہیے۔ پس یہ مسئلہ ثابت ہو گیا ہے جس پر مومنوں کو آمنا وصدقنا کہنا فرض ہے اور کوئی حیلہ' بہانہ' رائے قیاس اپنی طرف سے چلانا یا اس پر طعن تشنیع کرنا یا کوئی حجت بازی کرنا جائز نہیں ہے۔ اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ حکم وسنت نبوی اور تعامل صحابہ پر عمل کیا جائے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ پاؤں سے پاؤں ملانا' ٹخنہ سے ٹخنہ ملانا کسی حدیث سے ثابت نہیں' وہ علم حدیث سے اور اس مسئلہ کی تحقیق عمیق سے ناواقف ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ حق قبول کرنے کی توفیق بخشے' آمین۔ اور

معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص اہل سنت نہیں ہے ورنہ اس سنت سے انکار نہ کرتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالغفور عارف حصاری

الاعتصام لاہور' جلد ۱۷' شمارہ ۳۳' مورخہ ۲۵/ مارچ سنہ ۱۹۶۶ء

نماز میں صف بندی اور اس کی اہمیت

آج کل اول تو مسلمان نماز ہی بہت کم پڑھتے ہیں اور جو پڑھتے ہیں وہ جماعت کا خیال بہت کم رکھتے ہیں اور جو جماعت میں شامل ہوتے ہیں وہ صف بندی کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت واضح کی جائے اور عوام کو بتایا جائے کہ صف بندی کا درجہ کیا ہے اور اسلام میں اس کی اہمیت کتنی ہے۔ یاد رکھئے' جناب رسول کریم ﷺ نے بذات خود صفوں کی درستگی کا کام سرانجام دیا ہے۔ آپ کا یہ دستور تھا کہ پہلے صفوں کی ہمواری ملاحظہ فرما لیتے پھر نماز شروع کرتے۔ جس شخص کو صف میں خلاف قاعدہ کھڑا دیکھتے تو اس پر خفگی کا اظہار فرماتے اور اس ناہمواری کو برداشت نہ کرتے۔ چنانچہ ایک دن آپ نماز کے لیے آئے اور مصلی پر کھڑے ہوئے' تکبیر تحریمہ کہنے کو تیار تھے کہ ایک شخص پر نظر پڑی جس کا سینہ صف سے نکلا ہوا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: عباد الله لتسون صفوفکم او ليخالفن الله بين وجوهكم (مسلم جلد ا' ص ۱۸۲) یعنی "اے اللہ کے بندو! تم صفیں درست کرو اور خوب برابر کرو یا پھر اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان مخالفت ڈال دے گا۔" یعنی نماز میں سارے دین کی مشق کرائی جاتی ہے جس میں اجتماعی زندگی اور وحدت قومی کا سبق بھی ہے۔ پس اگر تم نے اس کام دینی میں قانون شرعی کی نافرمانی کی تو وہ دلوں کی کدورت اور تاریکی کا باعث بن جائے گی' جس سے تمہارا شیرازہ سب جگہ ٹوٹ جائے گا اور تم میں سخت اختلاف پیدا ہو جائے گا۔

مشکوٰۃ میں ہے' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نماز کی اقامت کہی گئی اور آنحضور ﷺ نے ہم سے متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا کہ اقيموا صفوفكم وتراصوا۔ یعنی "اپنی صفوں کو سیدھا کرو اور آپس میں خوب مل جاؤ۔"

اقامت صف اقامت نماز میں داخل ہے: جیسے قرآن میں حکم الٰہی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ "نماز کو قائم کرو" ایسے ہی حدیث نبوی میں یہ حکم ہے کہ اقیموا صفوفکم "کہ صفوں کو قائم کرو" پس جب تک صفوں کو درست نہ کیا جائے گا نماز قائم نہیں ہو گی۔ چنانچہ حدیث میں ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سووا صفوفکم فان تسویۃ الصف من اقامۃ الصلوٰۃ "کہ صفوں کو درست کرو اور برابر کرو کیونکہ صفوں کا درست کرنا نماز کے قائم کرنے میں داخل ہے۔"

صفیں درست کرنا فرض ہے: اوپر کی حدیث سے یہ ثابت ہو چکا کہ صف درست کرنا اقامت صلوٰۃ میں داخل ہے اور اقامت صلوٰۃ بروئے قرآن وحدیث واجماع فرض ہے۔ چنانچہ بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے کہ سووا صفوفکم فان تسویۃ الصف من تمام الصلوٰۃ "کہ صفوں کو درست کرو کیونکہ صف کا درست کرنا نماز کی تکمیل میں سے ہے۔" یعنی اگر صف درست نہ کرو گے تو نماز پوری نہ ہو گی۔ اس سے صف درست کرنا فرض ثابت ہوا' کیونکہ نماز کا پورا کرنا فرض ہے اور صف درست کئے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی تو جس چیز کے بغیر فرض پورا نہ ہو' وہ بھی فرض ہے۔ لہذا صف درست کرنا فرض ہوا۔ اسی واسطے حضرت عمر اور بلال رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ صف میں پاؤں نہ ملانے والوں کو مارا کرتے تھے۔ چنانچہ نیل الاوطار میں ہے کہ روی عن عمر وبلال ما یدل علی الوجوب عندھما لانھما کان یضربان الاقدام علی ذالک۔

امام کو صفیں درست کرنے کا حکم: آنحضرت ﷺ کا یہ دستور تھا کہ صفوں کے دائیں بائیں پھر کر صفیں درست کیا کرتے تھے۔ جس سے یہ ظاہر ہوا کہ امام نماز صفیں درست کر کے پھر شروع کرے۔ مشکوٰۃ میں ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عن یمینہ اعتدلوا سووا صفوفکم وعن یسارہ اعتدلوا سووا صفوفکم۔ یعنی "آنجناب ﷺ دائیں بائیں یہ فرمایا کرتے تھے کہ برابر ہو جاؤ اور صفیں درست کرو۔" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلال رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ صفوں کو درست کرتے اور جس کے پاؤں سے پاؤں نہ ملے ہوتے تو پاؤں پر درہ مارتے۔ (فتح الباری وغیرہ) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہماری صفیں درست کرتے۔ فاذا استوینا کبر۔ (مشکوٰۃ) "کہ جب ہم درست اور برابر ہو جاتے تب تکبیر کہتے۔" بہت افسوس ہے کہ

اللان مساجد اس فرض سے غافل ہیں۔

فرشتوں کی طرح صفیں باندھنے کا حکم: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ خرج علینا فقال الا تصفون کما تصف الملائکۃ عند ربھا فقلنا یارسول اللہ وکیف تصف الملائکۃ عند ربھا قال یتمون الصفوف الاول ویتراصون فی الصف۔ یعنی "ہماری طرف رسول اللہ ﷺ آئے اور فرمایا کہ کیا تم اس طرح صف نہیں باندھتے جس طرح فرشتے بارگاہ الٰہی میں صف بستہ ہوتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ملائکہ اللہ کے حضور میں کس طرح صف باندھتے ہیں؟ فرمایا کہ وہ پہلی صفوں کو ترتیب وار پورا کرتے ہیں اور صف میں خوب باہم مل جاتے ہیں۔" پس اس طرح امت محمدی کو صف باندھنے کا حکم ہے تاکہ خاکی نوریوں کا درجہ حاصل کریں۔

نمازیوں کے درمیانی خلا کو بند کرنے کا حکم: عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توسطوا الامام وسدوا الخلل۔ (رواہ ابوداؤد) یعنی "فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ امام کو وسط میں رکھو اور اپنے درمیان کے شگافوں کو بند کرو۔"

صف کا اتصال وانقطاع: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صفوں کو سیدھا کرو اور کندھوں کے درمیان برابری کرو اور درمیان کے فاصلوں اور شگافوں کو بند کرو اور جو بھائی پکڑ کر صف برابر کریں' ان کے سامنے نرم ہو جاؤ اور شیطان کے لیے درمیان میں شگاف نہ چھوڑو جس نے صف ملائی' اس کو اللہ ملائے گا اور جس نے صف توڑی' اس کو اللہ توڑے گا۔ (رواہ ابوداؤد)

آج اس زمانہ میں لوگ اس لیے آپس میں پھوٹے اور ٹوٹے ہوئے ہیں کہ وہ یا تو سرے سے نماز اور جماعت کے تارک ہیں یا نماز باجماعت ادا کرتے ہیں تو صفوں کو درست نہیں کرتے اور باہم مل کر اور چمٹ کر کھڑے نہیں ہوتے۔

صف ملانے کا طریقہ: نماز باجماعت پڑھنے والے اکثر لوگ عوام بلکہ خواص بھی صف میں ملنے اور ملانے کا طریقہ نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ عمل نہیں کرتے اور جو اقل قلیل عمل کرتے ہیں' ان سے جاہل نادان لوگ لڑتے ہیں' اس لیے اتفاق پیدا نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آنحضرت ﷺ نے تسویہ صف اور باہم ملنے کا طریقہ سکھلایا تھا۔

چنانچہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کان رسول اللہ یسوی صفوفنا حتی کانما یسوی بھا القداح حتی رای انا قد عقلنا عنہ الحدیث (مشکوٰۃ) یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفیں اس طرح درست کرتے جیسے تیر کی پیمائش کرتے ہوئے اس کی درستی کرتے ہیں' یہاں تک کہ ہم نے صف درست کرنا اور باہم ملنا آپ سے خوب سمجھ لیا۔"

اور ابوداؤد اور نسائی میں حدیث ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتخلل الصف من ناحیۃ الی ناحیۃ یمسح صدورنا ومناکبنا ویقول لا تختلفوا فتختلف قلوبکم۔ یعنی "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صف کے درمیان ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک پھرتے اور اپنے ہاتھ مبارک سے ہمارے سینوں اور کندھوں کو درست کرتے اور فرماتے کہ جسموں کے ساتھ صفوں میں اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے دلوں میں بھی اختلاف پیدا ہو جائے گا۔"

احادیث مذکورہ بالا اور دیگر احادیث میں صف کی درستگی کے متعلق یہ احکام وارد ہوئے ہیں۔ استووا "برابر کرو" سووا "درست کرو" رصوا "چمٹ جاؤ" سدوا الخلل "درمیان کے شگاف بند کرو" تراصوا "باہم چمٹ جاؤ" اعتدلوا "برابر ہو جاؤ" قاربوا بینھا وحاذوا بالاعناق "ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ صف میں اور گردنیں بالمقابل کر لو" تماسوا تزاحموا "ایک دوسرے سے جڑ کر گتھ ہو جاؤ۔" اب صف اس طور پر ملانی ہے کہ ان سب حکموں پر عمل درآمد ہو جائے۔ اب اس کا عملی نقشہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معلوم کرو' جنہوں نے یہ احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ سنے اور سمجھے اور ان پر عمل کیا اور اللہ اور رسول کی خوشنودی حاصل کی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا صف ملانا: بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ کان احدنا یلزق منکبہ بمنکب صاحبہ وقدمہ بقدمہ۔ "کہ ہم میں سے ہر شخص یوں عمل کرتا کہ اپنے ساتھی کے مونڈھے سے مونڈھا چمٹا دیتا اور قدم سے قدم چپکا دیتا۔"

ابوداؤد وغیرہ میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی شہادت یہ ہے کہ فرأیت الرجل یلزق کعبہ بکعب صاحبہ ورکبتہ برکبۃ ومنکبہ بمنکبہ۔ "میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ہر شخص اپنے پاس والے ساتھی کے ٹخنہ سے ٹخنہ اور گھٹنے سے گھٹنہ اور کندھے سے کندھا چپکا دیتا تھا۔" یہ ان بزرگان دین کا عمل تھا' جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ فیض

حاصل کیا اور نور نبوت سے روشنی پائی اور اس معلم ربانی سے شرف تلمذ حاصل کر کے ان کی زیر قیادت نظام جماعت کا طریقہ سیکھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے اس عمل سے ان کے درمیان عدل' مساوات' اتفاق واتحاد' مئودت والفت' شفقت ورحمت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر ایثار وتراحم کرتے تھے اور باہم خیر خواہ تھے اور انہوں نے اس دینی نظام سے دنیوی نظام حیات کا سبق حاصل کر کے دنیا میں ترقی اور کامیابی حاصل کر لی اور اس طرح وہ امامت صغریٰ کے سلک گوہر میں نظم جماعت کو منظم ومنضبط کر کے امامت کبریٰ کی شاہراہ قائم فرما گئے۔

<u>پاؤں سے پاؤں' کندھے سے کندھا ملایئے:</u> امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں باب اس طرح باندھا ہے: باب الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف۔ یعنی "یہ باب صف میں کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم چپکا کر کھڑے ہونے کے بیان میں ہے۔" پھر اس کے تحت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ذکر کی ہے اور اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ نماز میں باہم مل کر کھڑا ہونا چاہیے اور یہی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی گواہی ہے۔ پس نصاب شہادت پورا ہے۔ ان ہر دو متقی عادل اور معتبر گواہاں کی شہادت سے یہ مسئلہ ثابت ہوا ہے کہ احادیث نبویہ میں جو صفوں کے درست کرنے' برابر کرنے' ملانے' قلعی چونا کرنے اور باہم چپکانے' گتھ جانے اور ایک دوسرے سے لگ جانے کا حکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صف میں ہر نمازی دوسرے نمازی سے پاؤں سے پاؤں' کندھے سے کندھا اور گھٹنے سے گھٹنا لگا کر کھڑا ہو' تب حکم کی تعمیل ہو گی اور نماز پوری ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

<u>حنفی بھائیوں کی غلطی:</u> افسوس صد افسوس ہے کہ ہمارے زمانہ کے اکثر نمازیوں نے بالخصوص احناف نے احادیث نبویہ مذکورہ کے موافق عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اور وہ اس طرح صفوں کو درست نہیں کرتے' کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ آگے پیچھے بے ترکیب' بے ترتیب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہیں سیدھے ہو کر برابر بھی کرتے ہیں تو کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنہ نہیں ملاتے بلکہ ایسا کرنے کو برا اور ناپسند سمجھتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عہد حاضر کے اماموں اور نمازیوں کو عقل عطا فرمائے کہ وہ خواہ مخواہ اس حکم شرعی سے چڑتے اور بدکتے ہیں اور یہی مجاہدین فی سبیل اللہ جن کی صفوں کا نقشہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یوں

بیان فرمایا ہے کہ کانھم بنیان مرصوص۔ "گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔" فوج میں جو کوئی قاعدہ کی پابندی نہ کرے وہ سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں فرمایا کہ معمر کی روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بطور شکایت فرماتے ہیں کہ افسوس آج کل اس سنت نبوی سے لوگ گدھے اور خچر کی طرح بدکتے ہیں۔ (فتح الباری جلد اول' ص-۴۰۰) گویا عہد نبوی کے بعد ہی اقامت صفوف میں غفلت شروع ہو گئی تھی جبکہ غیر صحابہ آکر صحابہ میں مل گئے تھے۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ بشیر بن یسار انصاری روایت کرتے ہیں' جب حضرت انس رضی اللہ عنہ بصرہ سے مدینہ منورہ آئے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے تم نے اب ہم میں کون سی بات خلاف سنت معلوم کی ہے؟ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں نے اس عہد کے خلاف کوئی بات پائی تو بس ایک یہ بات پائی کہ تم نماز میں صفیں برابر نہیں کرتے۔ جب عہد نبوی کے بعد عہد صحابہ ہی میں غفلت شروع ہو گئی تھی تو اب اس چودھویں صدی کا تو ذکر ہی کیا ہے' جو زمین سے آسمان تک شروفساد سے بھری ہوئی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عہد نبوی میں تو مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب سے صفوں میں اقامت اور تسویہ نہ رہا' تب سے مسلمانوں میں اختلاف اور افتراق پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اب امت محمدی کئی فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ سو یہ شامت اعمال اقامت صف چھوڑنے سے ہے۔

احقر عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام سوہدرہ' جلد-۵' شمارہ ۴'۵' مورخہ ۲۴/ جنوری و یکم فروری سنہ ۱۹۵۳ء

باہمی اختلافات کا صحیح حل ___ اقامت صلوٰۃ

حضرات! آج کل تمام لوگ حکام اور رعایا' عالم اور جاہل' خواص اور عوام اس امر کی عام طور پر شکایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد مفقود ہو گیا ہے اور بجائے اس کے اختلافات اور تنازع' تفرقہ اور جھگڑا اس قدر پیدا ہو گیا ہے کہ بھائی سے بھائی جدا ہے اور باپ بیٹے پر خفا ہے۔ تمام دیہات اور شہروں میں یہ عام وبا ہے اور جس قدر آج کل مسلمانوں میں جھگڑا اور فساد ہے اتنا دیگر اقوام اور مذاہب کے لوگوں میں نہیں ہے۔

پھوٹ نے ہمیں لیا لوٹ، ہوئے خوار اور ذلیل
مٹ گئے پھر بھی نہ گئی آپس کی اَن بن

ہمدردانِ قوم نے ہر چند اتفاق و اتحاد قائم کرنے کے لیے تدبیریں کیں اور بڑے کوشاں رہے کہ اختلاف اور تفرقے مٹ جائیں۔ جلسوں میں تجویزیں ہوئیں، نئی نئی انجمنیں بنیں، طرح طرح کی تحریکیں ہوئیں، کمیٹیاں اور کانفرنسیں قائم ہوئیں کہ تمام مسلمانوں کا باہم اتفاق ہو جائے اور اختلاف بالکل مٹ جائے اور تفرقہ ختم ہو جائے لیکن کامیاب نہ ہو سکے بلکہ۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اختلافات باہمی اور سیاسی دن بدن بڑھ گئے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی اور ہم اس اختلاف سیاسی اور مذہبی سے تنزل میں پڑ کر ذلیل ہو گئے۔

تنزل نے کی ہے بری گت ہماری
بہت دور پہنچی ہے نکبت ہماری
گئی گزری دنیا سے عزت ہماری
نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری
پڑے ایک امید کے ہم سہارے
توقع پہ جنت کی جیتے ہیں سارے

(حالی)

اختلافات دور کرنے کا شرعی طریق: ہمدردی قوم کا دعویٰ رکھ کر اتفاق و اتحاد کے خواہش مندوں اور سب مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجہتی سے دیکھنے کی تمنا کرنے والوں کو اگر فی الواقعہ یہی تمنا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اختلاف و افتراق کا قلع قمع ہو جائے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ مؤلف القلوب کے اس حکم پر عمل کریں:
واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین۔ "تم نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔" ان تینوں حکموں پر عمل کرنے سے اختلاف رفع ہو جائے گا اور اتفاق و اتحاد پیدا ہو جائے گا۔ نماز میں تو یہ تاثیر ہے کہ جو قرآن نے بیان کی ہے کہ یہ پچھلے گناہوں کو دور کرتی ہے اور آئندہ گناہوں سے روکتی ہے اور زکوٰۃ دینے والوں میں باہم

محبت اور الفت کا پیدا ہو جانا بدیہی امر ہے اور جماعت سے خوب صف ملا کر نماز پڑھنے سے دل سیدھے ہو جائیں گے اور باہم مل جائیں گے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ استووا تستوی قلوبکم وتماسوا تراحموا (رواہ الطبرانی فی الاوسط) یعنی "تم صف میں سیدھے اور برابر رہو' تمہارے دل بھی سیدھے اور برابر ہو جائیں گے اور تم صف میں ایک دوسرے سے مل کر گتھے ہوئے رہو۔"

اسلام منفردانہ زندگی اور انتشار اور تشتت اور اختلاف کی مذمت کرتا ہے اور اجتماعیت اور اتفاق اس کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لیے اس نے نماز جیسی عظیم الشان عبادت میں جماعت اور صف بندی کا حکم دے کر انفرادی اور افتراقی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ نماز باجماعت کے حکم میں اجتماعی زندگی کی دعوت اور عدل اور مساوات کی تعلیم ہے اور باہم منظم رہ کر زندگی گذارنے کا سبق ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو دیکھ لیتے کہ وہ جماعت میں شریک نہیں ہے تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر اس کو زجر و توبیخ فرماتے۔

چنانچہ محجن صحابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مجلس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو اذان ہوئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور نماز پڑھنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو محجن رضی اللہ عنہ اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ما منعک ان تصلی مع الناس الست برجل مسلم۔ یعنی "تجھے جماعت سے نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا ہے' کیا تو مسلمان نہیں ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں حضور! میں مسلمان ہوں لیکن میں اپنے گھر میں نماز پڑھ چکا ہوں۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا کہ اذا جئت المسجد وکنت قد صلیت فاقیمت الصلوۃ فصل مع الناس وان کنت قد صلیت۔ یعنی "جب تو مسجد کو آئے اور جماعت تیار ہو تو جماعت سے نماز پڑھ' اگرچہ تو نماز پڑھ چکا ہو۔"

اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اذان کی آواز سن کر اپنے گھروں سے نہیں نکلتے' میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر ان کے گھروں میں آگ لگا دوں۔ ایک اور حدیث مشکوۃ میں وارد ہے کہ جو شخص اذان سن کر جماعت میں حاضر نہیں ہوا' اس کی نماز نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح اور عشاء کی نمازوں پر نمازیوں کی حاضری لیا کرتے تھے۔ ایک دن صبح آپ نے حاضری لی کہ فلاں شخص حاضر ہے تو نمازیوں نے کہا کہ وہ حاضر نہیں ہے'

پھر دریافت کیا کہ فلاں شخص حاضر ہے؟ جواب دیا گیا کہ حاضر نہیں ہے۔ تب آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان ھاتین الصلوتین اثقل الصلوۃ علی المنافقین "کہ یہ دو نمازیں منافقوں پر بہت بھاری ہیں۔" الغرض نماز باجماعت کی بڑی اہمیت ہے۔

پس اس نظام وحدت اور یکجہتی کو تمام مسجدوں میں معلوم کر کے یہ بتلائیں کہ کیا یہ اتفاق واتحاد کا سبق ہے یا نہیں کہ مسلمان سب ایک قوم ہیں' ایک فوج ہیں' ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ آپ کے اغراض اور مقاصد آپ کے نقصانات اور فوائد سب مشترک ہیں اور ان کی زندگیاں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں؟

اگر نماز باجماعت میں یہ تعلیم ہے تو پھر پہلے اس کو صحیح طریقہ سے عمل میں لائیں اور اس نظام وحدت کو درست کریں۔ اگر نماز باجماعت میں صفوں کا مل جانا صحیح طریق پر ہوا تو ایک دوسرے کے باہمی تعلقات بھی ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے اور اگر نماز باجماعت میں صفوں کی درستگی صحیح طریقہ سے نہ پائی گئی تو پھر نماز سے باہر دیگر امور مذہبی' سیاسی' دینی اور دنیوی میں بھی درستگی نہ رہے گی۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم۔ (مسلم جلد۱' ص۱۸۱) "کہ تم برابر درستگی سے کھڑے رہو اور اختلاف نہ کرو ورنہ اس کا اثر تمہارے دلوں پر پڑے گا اور وہ مختلف ہو جائیں گے۔" یعنی اگر صف میں نماز کا تقدم وتاخر ہوا اور ان کے شانہ سے شانے' قدم سے قدم برابر اور ملے ہوئے نہ ہوئے تو اس ظاہری اختلاف سے باطنی اختلاف بھی پیدا ہو جائے گا اور دلوں میں منافرت اور کینہ اور وحشت نمودار ہو گی جس کا اثر شوکت اسلام اور نظام حیات پر بھی پڑے گا' جس سے مسلمانوں کے سب افراد منتشر اور پراگندہ ہو جائیں گے اور اختلافات ظاہر ہوں گے۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ' جلد۵' شمارہ۱' مورخہ یکم جنوری سنہ ۱۹۵۳ء